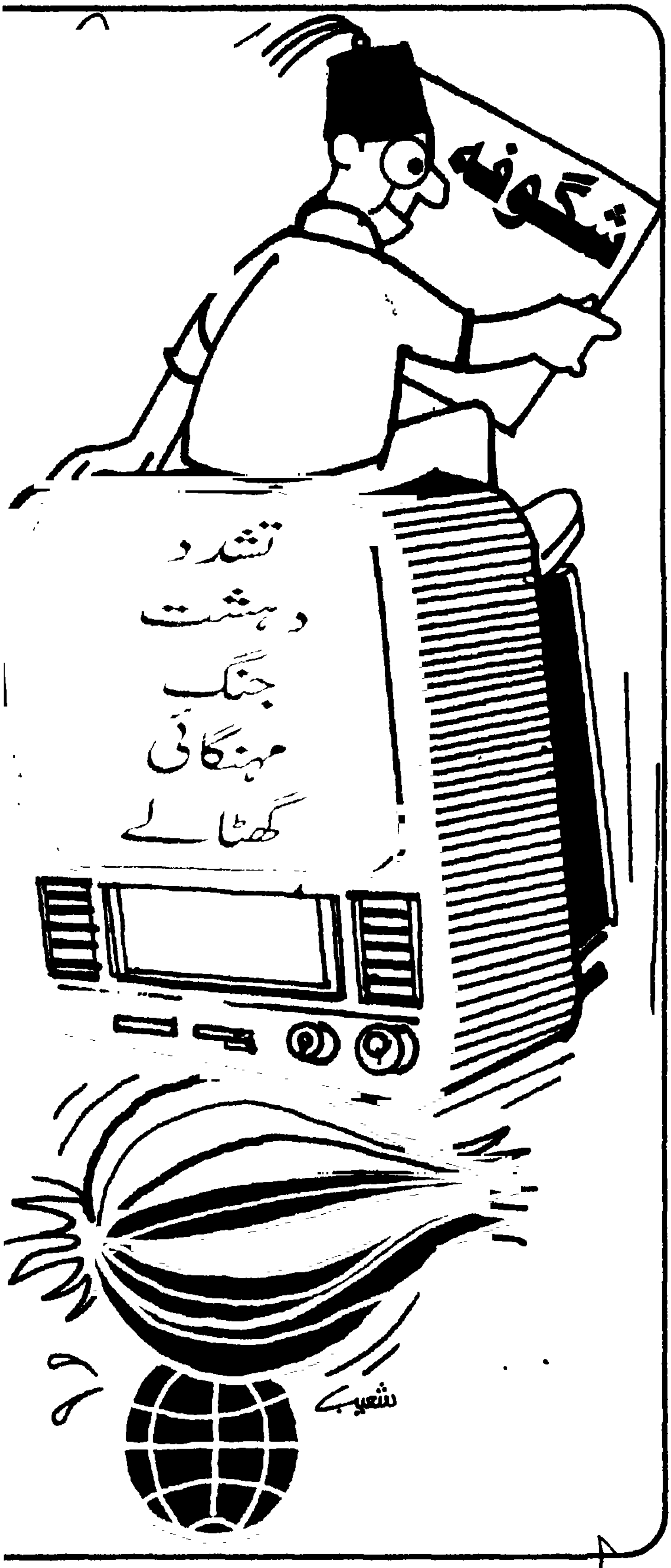
شگوفہ



☎ 371 7380
372 2045

Fax No. 371 7380

BRIGHT ENGINEERS

SHIPBUILDERS & REPAIRERS
GOVT. CONTRACTORS, MARINE
MECHANICAL AND STRUCTURAL ENGINEERS

Boat Hard Road, Coal Bunder
Opp. North B. P. T. Office,
Darukhana, Mumbai - 400 010

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد ۳۲ شمارہ ۱، ۲ حیدرآباد

سالنامہ جنوری، فبروری ۱۹۹۹ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

قیمت فی پرچہ ۲۰ روپے زر سالانہ ۱۴۰ روپے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ ۔ حیدرآباد ۔ ۱ فون (آفس) 595716
(رہائش) 4576064

Details of works taken up:

1.	Percolation Tanks	133	Rs.	101.50	lakhs.
2.	Check Dams	69	Rs.	64.73	lakhs.
3.	Rockfil Dams	262	Rs.	14.72	lakhs.
4.	Horticulture Programmes	---	Rs.	18.28	lakhs.
5.	Nurseries	---	Rs.	5.21	lakhs.
6.	Form Ponds	2	Rs.	0.80	lakhs.
7.	Bunding	---	Rs.	8.34	lakhs.
8.	Entry Point Activities	87	Rs.	35.03	lakhs.
9.	Bio-Gas Plants	100	Rs.	2.61	lakhs.

In addition to the above (532) self help groups were formed and Rs. 24.90 lakhs Revolving Fund was released.

S.S. RAWAT I.A.S
Project Director
DRDA, Khammam

A. GIRIDHAR I.A.S
Collector & Chairman
DRDA, Khammam

DISTRICT RURAL DEVELOPMENT AGENCY

(D.R.D.A)

WATERSHED DEVELOPMENT PROGRAMME

Watershed Development Programme is being taken up in Khammam district from 1995-1996.

At present (134) watershed and (98) VSS/Watersheds are under progress in the district.

1.	DPAP	-	45
2.	50% EAS	-	12
3.	40% EAS	-	27 & 98 VSS/W.S.
4.	IWDP	-	50
			134 & 98 VSS.W.S

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت (انشائیے)

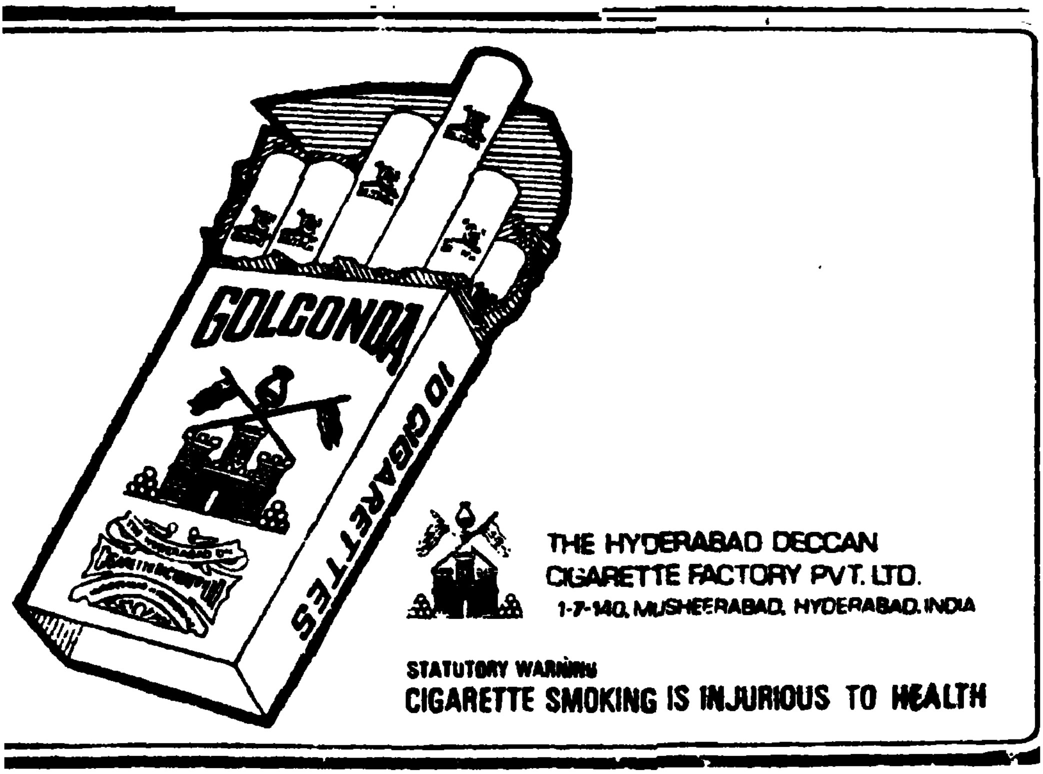
دخل در معقولات (ڈراما)

نہیں آتی تو یاد (یاد رفتگاں)

ایسی کی تیسی (تنقید)

چورن (منظومات)

☆☆☆☆☆☆☆


GOLCONDA
10 CIGARETTES
THE HYDERABAD DECCAN
CIGARETTE FACTORY PVT. LTD.
1-7-140, MUSHEERABAD, HYDERABAD, INDIA
STATUTORY WARNING
CIGARETTE SMOKING IS INJURIOUS TO HEALTH

ادارہ شگوفہ سے حسب ذیل مزاحیہ کتب حاصل کی جا سکتی ہیں

امریکہ میری عینک سے	یوسف ناظم	سفرنامہ	۵۰ روپے
البتہ	یوسف ناظم	مضامین	۳۰ روپے
واہ حیدرآباد	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
سگ گزیدہ	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
طرفہ تماشہ	مسیح انجم	مضامین	۴۰ روپے
آئی ایم ساری	مصطفیٰ علی بیگ	کلام	۸۰ روپے
سخن کے پردے میں	طالب خوندمیری	"	۱۰۰ روپے
بہ فرض محال	خواہ مخواہ	"	۷۵ روپے
شانہ بہ شانہ	اقبال شانہ	"	۵۰ روپے
کچوکے	پرویز یداللہ مہدی	"	۶۵ روپے
سفر لخت لخت	مجتبیٰ حسن	سفرنامہ	۴۵ روپے
درگت	ٹی این راز	کلام	۷۰ روپے
کیا مذاق ہے	اسمٰعیل آذر	کلام	۵۰ روپے
الف تماشہ	نریندر لوتھر	کلام	۳۰ روپے

شگوفہ کی خصوصی اشاعتیں

مجتبیٰ حسین نمبر	۵۵ روپے
ہندوستانی مزاح نمبر	۵۵ روپے
شگوفہ ۲۵ سالہ شعری انتخاب	۳۰ روپے

مجتبیٰ حسین
دہلی

غالب مست مولا شاعر

غالب کے دو سو سالہ جشنِ پیدائش کی تقاریب یوں تو رسمی طور پر ۲۷ ڈسمبر کو ختم ہونی چاہیئے تھیں لیکن رمضان المبارک کی آمد کی وجہ سے ادبی حلقوں اور اداروں نے ان تقاریب کو عملاً دس پندرہ دن پہلے ہی سمیٹ لینا ضروری سمجھا۔ رمضان کا مہینہ برکتوں کا مہینہ ہوتا ہے۔ اگر یہ جلد نہ آتا تو ادبی حلقوں کے ہاتھوں ہم جیسوں اور خود مرزا غالب کی اتنی جلدی جان بخشی نہ ہوپاتی۔ دہلی میں ۱۱ ڈسمبر سے ۱۵ ڈسمبر تک دو اداروں کی جانب سے غالب کے بارے میں دو بین الاقوامی سمینار کسی وقفہ کے بغیر یوں منعقد ہوئے کہ پہلے سمینار کے اختتام اور دوسرے سمینار کے آغاز میں چند منٹوں کی مہلت کی گنجائش بھی نہیں رکھی گئی۔ دونوں سمینار ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے پائے گئے۔ لوگ یہاں سے وہاں بھاگتے اور وہاں سے یہاں بھاگنے میں نیم جاں سے ہوگئے۔
غالب کا جو حشر ہونا تھا سو وہ ہوا ادب کے پرستاروں کا حشر بھی کچھ اچھا نہیں ہوا۔
غالب کی شاعرانہ عظمت سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے۔ لیکن عظمت کا مطلب یہ بھی تو نہیں کہ آدمی کوئی اور کام نہ کرے پورے ایک ہفتہ تک غالب کے نام کی مالا ہی جپتا رہ جائے۔ بلاشبہ غالب ہمارے ادب کا سب سے بڑا نام ہے لیکن ہم نے غالب کے ساتھ وہی رویہ اختیار کر رکھا ہے جو خود غالب نے ستم پیشہ ڈومنی کے سلسلہ میں اختیار کیا تھا۔ غالب نے اس ڈومنی کے سلسلہ میں اپنے ایک خط میں لکھا تھا "مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں۔ میں نے بھی ایک ڈومنی کو مار رکھا ہے" ہم لوگ بھی غالب پر کچھ اس طرح مرنے لگے ہیں کہ پتہ چلانا دشوار ہے کہ ہم غالب پر مر رہے ہیں یا خود غالب کو مارے جارہے ہیں۔ اس رویہ کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے غالب کے دوسرے بین الاقوامی سیمینار کا افتتاح کیا۔ تو ایک مشہور ٹیلی ویژن چینل نے اپنی خبروں میں اس سیمینار کا ذکر ان شبدوں میں کیا "پردھان منتری نے آج اردو کے مست مولا شاعر مرزا غالب کی دوسری جنم شتابدی کے سماروہ کا ادگھاٹن کیا" یقین مانئے ہمیں یوں لگا جیسے یہ جملہ غالب تقاریب کے تابوت میں آخری کیل کا درجہ رکھتا ہے اور یہ کہ "ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں" والی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ کوئی بات یا حرکت جب اعتدال کی حدوں سے تجاوز کرجاتی ہے تو یہی حشر ہوتا ہے۔ غالب کی "مست مولائی" غالب فہمی اور غالب شناسی کے باب میں ایک نئی دریافت کا

درجہ رکھتی ہے۔ غالب جیسے بے حد ذہین، وسیع النظر دور بین اور باشعور شاعر کو "مست مولا شاعر" بنادینا ہمارے اس میڈیا کا کمال ہے جو پچھلے چالیس پچاس برسوں سے فلموں اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ غالب کی ایک نئی تصویر کو پیش کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ یقین مانئے اگر غالب کو دو سو سال پہلے کسی طرح پتہ چل جاتا کہ دو سو برس بعد اسے "مست مولا" قرار دیا جانے والا ہے تو وہ ہرگز اس دنیا میں آنے کی کوشش نہ کرتا۔ آج سے ۴۲ برس پہلے سہراب مودی نے مرزا غالب کے بارے میں ایک تاریخ ساز فلم بنائی تھی۔ اس زمانہ کی مشہور اداکارہ اور مغنیہ ثریا نے اس میں ڈومنی کا کردار ادا کیا تھا اور بلاشبہ بہت اچھا ادا کیا تھا۔ غالب کی شراب نوشی کا حوالہ بھی اس فلم میں ضرور موجود تھا لیکن ان کی شراب نوشی کو اسطرح پیش نہیں کیا گیا تھا جیسے شراب غالب کی زندگی کا سب سے اہم جز ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس فلم کی کہانی سعادت حسن منٹو جیسے ادیب نے لکھی تھی جو اگرچہ خود بھی شراب کا بے حد رسیا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ شراب ایک فنکار کی شخصی زندگی کا حصہ تو بن سکتی ہے لیکن اس کے تخلیقی عمل سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لئے غالب کی شراب نوشی کو اس فلم میں اس کی زندگی کے ایک ضمنی پر تو کے طور پر ہی پیش کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کمال منٹو جیسے اہل قلم کا تھا۔ چونکہ منٹو غالب کی عظمت اور اس کی شاعری کی تہہ داریوں اور معنی آفرینی سے بخوبی واقف تھا اسی لئے غالب کی شراب نوشی کو اس کی شاعری پر غالب آنے کا موقعہ نہیں دیا۔ مگر اس فلم کے بعد ہمارے گلوکاروں اور ٹیلی ویژن پر غالب کو پیش کرنے والوں نے عصری حالات اور تقاضوں کے پس منظر میں غالب کی شراب نوشی کو کچھ اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی کہ لگتا ہے غالب شراب زیادہ پیتے تھے۔ اور شاعری کم کرتے تھے۔ چنانچہ ہمارے اکثر گلوکار غالب کی غزلیں سنانے سے پہلے کچھ ایسی تمہید باندھتے ہیں اور کچھ ایسے جملے بولتے ہیں جن سے یہ گمان گذرتا ہے کہ غالب چوبیسوں گھنٹے شراب کے نشہ میں دھت رہا کرتا تھا۔ بلکہ بعض تو اسے مجاز اور نریش کمار شاد کی ٹکر کا شاعر بھی ثابت کرنے پر تلے نظر آتے ہیں۔

ہم جگجیت سنگھ کی آواز کے سحر کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اس میں کئی بار ڈوب چکے ہیں۔ پچھلے ایک بین الاقوامی سمینار میں جگجیت سنگھ نے پورے ڈیڑھ گھنٹہ تک نہایت خوبصورت ڈھنگ سے غالب کا کلام گایا لیکن غالب کے دو ایک شعر سنانے سے پہلے یہ بھی کہا کہ غالب کو میرٹھ سے اسکاچ وہسکی مل جایا کرتی تھی۔ جگجیت سنگھ کی اس تحقیق پر ماہرین غالبیات کو ضرور غور کرنا چاہیئے کیونکہ غالب کو خود اپنی اور اس کے معاصرین کی تحریروں میں کہیں بھی اسکاچ وہسکی کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ایک پرتگیزی شراب " OLDTOM " کا حوالہ ضرور موجود ہے۔

مبادا آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم غالب کی شراب نوشی کی حمایت میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ جو ہمارے گلوکار اور فلم ساز آئے دن غالب کو "شراب، اور شباب، کباب" کا شاعر ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو اس پر کچھ روک لگنی چاہیئے ورنہ عام آدمی غالب کو سچ مچ "مست مولا شاعر" ہی سمجھ بیٹھے گا۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ اس سمینار کے کلچرل پروگرام میں سامعین کی اکثریت غالب کی وجہ سے نہیں بلکہ خود جگجیت سنگھ کی وجہ سے آئی تھی لیکن بنیادی حوالہ تو غالب کی ذات ہی تھی۔

ہم یہ کالم صرف اس لئے لکھ رہے ہیں کہ غالب فہمی اور غالب شناسی کی علمی قدریں بہت اہم ہیں اور انھیں ہر حال برقرار رہنا چاہئے۔ میڈیا اور گلوکاروں کو خدا را یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ غالب کو مزید "مست مولا شاعر" بناتے چلے جائیں۔

غالب کے اس ایک حالیہ سمینار میں ان فلمی شخصیتوں کو بھی اعزازات سے نوازا گیا جنھوں نے غالب کی زندگی کو فلم کے پردہ پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے ثریا، گلزار، نصیرالدین شاہ اور خود جگجیت سنگھ۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پرانے زمانہ کی اداکارہ ثریا نے سہراب مودی کی فلم "مرزا غالب" میں ڈومنی کا کردار ادا کیا تھا اور باقی کے تین فنکار ٹیلی ویژن کے حالیہ سیریل "مرزا غالب" سے متعلق تھے۔ ہمیں مذاق میں یہ بات سوجھی کہ سہراب مودی کی فلم کی ڈومنی (ثریا) کو تو اس سمینار میں بلایا گیا لیکن غالب کی بیوی (نگار سلطانہ) کو نظر انداز کر دیا گیا۔ شاعروں اور فنکاروں کی بیویوں کے ساتھ ہمیشہ ایسی ہی زیادتی ہوجاتی ہے۔

غالب ہمارے ادب کا سب سے محترم نام ہے۔ اس کی شاعری اور اس کی تحریروں میں اتنی تہہ داریاں ہیں کہ اس کی بات کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ اکثر مقامات پر جہاں رونا چاہئے وہاں وہ ہنس دیتا ہے اور جہاں ہنسنا چاہئے وہاں وہ رو دیتا ہے۔ اس نے زندگی کو جس طرح جھیلا تھا وہ اسی کا حصہ تھا۔ بہت سی باتیں وہ مذاق میں بھی کہہ جاتا ہے (بالخصوص اپنی ذات کے بارے میں) حد تو یہ ہے کہ اس نے تفنن طبع کی خاطر اپنا ایک فرضی استاد بھی مقرر کر رکھا تھا جس کا نام اس نے ملا عبدالصمد رکھا تھا۔ ماہرین غالبیات اب تک اس فرضی استاد کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ غالب کو اپنی زندگی میں کچھ بھی نہیں ملا سوائے نامساعد حالات کے۔ ۶۲ روپیہ کی حقیر سی پنشن کے لئے جس پر بلاشبہ اس کا حق تھا، وہ صاحبان اقتدار کے نام عرضیاں بھی لکھتا رہا لیکن اس کی شاعرانہ عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ غالب سمیناروں میں شرکت کے ذریعہ ہمارے موجودہ ماہرین غالبیات جتنا کمار ہے ہیں اس کا عشر عشیر بھی غالب کو نہ مل سکا۔

یادش بخیر! پندرہ برس پہلے ہم نے دہلی کی ایک ادبی محفل میں اپنے نام غالب کے ایک خط کی پیروڈی پڑھی تھی جس میں ہم نے غالب کی زبان سے یہ جملے کہلوائے تھے۔ "میاں! اگر دنیا میں دوبارہ پیدا ہونے کی کوئی صورت نکلے تو اب کی بار پھر سے غالب بن کر ہرگز پیدا نہیں ہوں گا۔ ماہر غالبیات بن کر پیدا ہونا پسند کروں گا کیونکہ اس میں فائدے بہت ہیں۔" مشہور ماہر غالبیات آنجہانی مالک رام جو اس محفل کی صدارت کر رہے تھے ان جملوں پر لوٹ پوٹ ہوگئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غالب اور ایک ماہر غالبیات میں کیا فرق ہے۔

غالب ایک مکمل انسان اور ایک مکمل شاعر تھا۔ خدارا اسے مست مولا شاعر بننے نہ دیجئے۔

قلمی معاونین سے التماس

ہے کہ مسودات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں۔

مرزا مصطفیٰ علی بیگ
حیدرآباد

ڈاؤٹ فل *

جس کے کارن زندگی ہے ڈاؤٹ فل
وہ حکومت آج بھی ہے ڈاؤٹ فل

دیکھ کر بدتر مجھکو یوں لگا
آج کل ہر آدمی ہے ڈاؤٹ فل

وہ جو منہ دھونے سے کترانے لگے
ان کی بیوٹی ہوگئی ہے ڈاؤٹ فل

وصل کے وعدے میں کنفیوژن بھی ہے
ہوپ فل ہے تو کبھی ہے ڈاؤٹ فل

انتظار ان کا تھا آدھی رات تک
باقی آدھی کٹ رہی ہے ڈاؤٹ فل

طنز تھا ہونٹوں پہ ان کے یا خوشی
کیا کہوں ان کی ہنسی ہے ڈاؤٹ فل

ٹو سے ہیڈ تک پورا باڈی چین ہے
ان سے ملنے کی گھڑی ہے ڈاؤٹ فل

ہنس کے بولے وہ غزل سنکر میری
دھن تو اچھی ، شاعری ہے ڈاؤٹ فل

چائے کے بدلے وہ رم دینے لگے
مہربانی شیخ کی ہے ڈاؤٹ فل

بے نمازوں میں بھی دنیا کا خیال
گویا میری بندگی ہے ڈاؤٹ فل

صاف صاف

منہ پھٹ ناگپوری

ایک دو تین چار پڑھتے ہیں
عمر میں ایک بار پڑھتے ہیں

جس سے ہوتی ہے سنسنی پیدا
وہ خبر بار بار پڑھتے ہیں

نقد علم و ہنر وہ کیا پائیں
جنکے بچے ادھار پڑھتے ہیں

شیخ اخبار کے بہانے سے
فلم کے اشتہار پڑھتے ہیں

ایک کے بعد تین "زیرو" کو
پڑھنے والے ہزار پڑھتے ہیں

مجھ کو رسوا نہ دوستو کرنا
لوگ لوح مزار پڑھتے ہیں

کچھ کیفیۂ خمار کو منہ پھٹ
استغفار پڑھتے ہیں

بچے ہوئے سیانے جب یہ خیال آیا
کچرے کی نوکری میں خط تیرے ڈال آیا

جب پہلی جنوری کو پکڑے گئے "سٹوری"
کہنے لگے کہ سنبھلو منحوس سال آیا

مولانا خاموشی سے لے آئے چھٹوں بیوی
باسی کڑھی میں لوگو کیسا ابال آیا

سنکر اذاں نہ جھوما لیکن یہ واقعہ ہے
طبلے کی ہر ٹھنک پر صوفی کو حال آیا

بسپر ذرا کی ہم نے یوں ہی ٹکٹ خریدی
قسمت نے یاوری کی ، گھر بیٹھے مال آیا

اب لئے سیدھے مصرعے کہنے لگا ہوں منہ پھٹ
برسوں غزل چرائی تب یہ کمال آیا

یوسف ناظم
۱۹ الہلال ۱۳ باندرہ ریکلیمیشن
ممبئی ۴۰۰۰۵۰

ابلیس کا معافی نامہ، خالقِ کونین کے نام

خطۂ ارض حلقۂ شرقی جنوری ۱۹۹۹

خدائے کون و مکان، ربّ ذوالجلال ایک راندۂ درگاہ کا سلام عقیدت قبول ہو اور ساتھ ہی آپ کی اس دنیا کے رواج کے مطابق نئے سال کی مبارکباد بھی ادباً پیش کرتا ہوں کہ یہ موقعہ بھی ہے اور رسم دنیا بھی۔

مالک دوجہاں، میرا عریضہ پاکر آپ کو تعجب ہوگا لیکن یقین جانیئے میں تھک گیا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ آدمیوں میں رہتے رہتے میں بھی ان ہی کی طرح بلڈ پریشر کا مریض ہوتا جارہا ہوں۔ بے انتہا پولیوشن کی وجہ سے دمہ کا الگ خطرہ ہے۔ راتوں میں اکثر خلجان کی کیفیت ہوتی ہے مرغن غذائیں تو برسوں سے چھوٹ گئی ہیں لیکن خمیرۂ مروارید خشک و تر میوے اور قوت بخش دوائیں میری توانائیوں کو بحال کرنے سے قاصر ہیں یہ چیزیں شاید خالص ہیں بھی نہیں یوں بھی اب میرے لئے کرنے کو کچھ باقی نہیں رہا ہے آپ کے خلیفۃ الارض میں مزید گمراہ ہونے کی گنجائش کہاں ہے۔ آپ تو سمیع و بصیر ہیں اس لئے میں کیا عرض کروں اور کیوں عرض کروں کہ سارے کرۂ ارض پر کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں ہورہا ہے۔ آپ نے مجھے اپنے تخلیق کردہ آدمی کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا بس یہی میری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا میں نے تو آپ کے حضور میں کھڑے ہوکر نظریں اٹھاکر آپ کو دیکھا نہیں۔ لیکن آپ کا وہ حکم سن کر میں نے نظریں اٹھاکر اس شخص کی طرف دیکھا اور حضور یقین فرمائیں پہلی ہی نظر کے ساتھ میرے ذہن میں ایک دانشمندانہ لہر دوڑ گئی (دانشمندانہ لہر سے میری مراد برین ویو BRAIN WAVE ہے) اور اسی لمحہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس تخلیق میں یعنی اس شخص میں جسے آپ نے خلیفۃ الارض بنانے کا فیصلہ کیا کوئی نہ کوئی خامی رہ گئی ہے مجھے اس کے ضمیر اور خمیر پر شبہ ہوا اور میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ اس میں برائی سے بچنے کا عزم اور مستقل مزاجی نہیں ہے۔ خادم نے اس جانب آپ کی توجہ مبذول کرانے کی بات سوچی تھی لیکن آپ کے جاہ و جلال اور عظمت کا رعب حاوی و طاری رہا۔ آپ کے حکم سے سرتابی کی البتہ مجھے اس لئے جرات ہوئی کہ آخر کار میں معلم الملکوت کی معزز خدمت پر مامور تھا فرشتے میرے طریقۂ تدریس سے خوش تھے اور میں ان کے حلقے میں بے حد مقبول تھا۔ جب صورت حال یہ ہو تو میں اپنے شاگردوں کی موجودگی میں ایک اجنبی مخلوق کے آگے کیسے سر جھکادیتا۔ میں تو مثالی استاد تھا اور انعام و اکرام کا مستحق۔ (آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج آپ کی دنیا میں وسطانی اور فوقانی

مدارس کے معلموں کو توصیفی صداقت ناموں اور رقمی انعامات سے کس فیاضی کے ساتھ نوازا جاتا ہے جو ایک لحاظ سے مستحسن اور مفید اقدام ہے) اس پوزیشن میں رہتے ہوئے کیا یہ میرے لئے مناسب تھا کہ میں آپ کے خلیفۃ الارض کو سجدہ کرنے پر رضامند ہو جاتا۔ آپ نے اس وقت میری ہراسانی اور پریشانی پر غور نہیں فرمایا اور یک لخت مجھے معزول و معتوب قرار دے دیا۔ اب میں سوچتا ہوں تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اس سے پہلے کس نے آپ کے حکم کو ٹالنے کی جرات کی تھی۔ میرا گستاخانہ عمل جو باغیانہ بھی تھا، ظاہر ہے آپ کو غیظ و غضب پر آمادہ کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کی تخلیق کردہ شخصیت یعنی خلیفۃ الارض کو بھی چند دن اور ایسی صورت حال سے گزرنا پڑا اور موصوف کے لئے بھی وہی سزا تجویز ہوئی جو میرے مقدر میں تھی میں چاہتا تو اس سانحہ پر خوش ہو سکتا تھا لیکن دنیا میں موصوف کی آمد نے تو مجھے بے حد مصروف کر دیا۔ دن رات مجھے ان ہی کے تعاقب میں گھومنا دوڑنا پڑا (بعد میں موصوف میرے پیچھے پیچھے رہے اور میرے مشن کی تکمیل میں مصروف و مشغول رہے)

اللہ میاں! مانا کہ آپ کی اس وسیع و عریض دنیا میں اب بھی کچھ بندے ایسے ہیں جن کے دل و دماغ میں خوف خدا اور یاد خدا دونوں موجزن ہیں۔ لیکن اے خالق دو جہاں اب میرے عناصر میں اعتدال نہیں رہا ہے اور میں مزید بار برداشت کرنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں پا رہا ہوں۔ ویسے بھی اگر کچھ دین دار اور پابندار لوگ اربوں کی آبادی میں باقی رہ بھی گئے تو میرے کئے ہوئے کاموں پر پانی تو نہیں پھر جاتا۔ چند حق گو اور راہ راست پر چلنے والوں کی اے خدا، دنیا کو واقعی ضرورت ہے میں نے اپنی جسمانی حالت کی بنا پر تہیہ کر لیا ہے کہ اپنا دفتر سمیٹ لوں۔ میں اپنے مشیروں اور ماتحتوں کو برطرف تو نہیں کروں گا اور نہ فی الحال اپنے عملے میں تخفیف کروں گا (یہاں اس عمل کو چھٹنی کرنا کہا جاتا ہے اور طرح طرح کے فارمولوں کی چمک دمک دکھلا کر عملے کو ہنسی خوشی رخصت ہونے کی ترغیب دلائی جاتی ہے جس میں قاضی الحاجات یعنی کرنسی کا بڑا دخل ہوتا ہے) کیونکہ دنیا میں کچھ نہ کچھ تو کم ہوتا ہی ہے اس لئے مرے دفتر کی تالہ بندی (لاک آؤٹ) صرف اس وقت ممکن ہوگی جب آپ میرے معذرت نامہ پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے (یہ ہمدردانہ غور یہاں کے ہمدردانہ غور سے مختلف ہوگا یہاں تو یہ بیدردانہ ہوتا ہے) میں صرف یہ عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ سزا کے طویل ہونے کی بھی کوئی حد ہونی چاہئیے۔ یہ میری تجویز نہیں استدعا ہے۔ میں آدمیوں کی طرح خودکشی جیسی مہمل اور بے معنی حرکت کر نہیں سکتا۔ یہ میرے منصب کے خلاف ہے میں نے ایک طویل مدت آپ کی خدمت کرنے میں گزاری ہے۔ فرشتوں کی تعلیم معہ تربیت میں اپنا سر کھپایا ہے میں اسی خدمت گزاری کے واسطے سے آپکے ترحم کو آواز دے رہا ہوں۔ آپ تو ارحم الراحمین ہیں۔ دنیا میں آدمیوں کی صحبت میں زندگی گزارنے کے بعد بھی میں نے ان افعال شنیعہ میں حصہ نہیں لیا ہے، جس سے آپ کے خلیفہ کو بے حد شغف رہا ہے۔ کام کی یکرنگی نے میرے اعصاب پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ میں بالکل اوب چکا ہوں۔ یہاں تو لوگ جو سرکاری ملازمت کرتے ہیں چند ہی برسوں میں وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش کر دیے جاتے ہیں (اس حسن خدمت کی نوعیت کیا ہے آپ دیکھ ہی رہے ہیں)۔ میں تو یہ بھی نہیں چاہ رہا ہوں کہ مجھے اپنی سابقہ خدمت پر بحال کیا جائے میں ری اپوائنٹمنٹ کا طلب گار نہیں

صرف آپ کی قربت کا خواستگار ہوں میں یقین دلاتا ہوں کہ میں آپکے پر سکون لمحات میں حارج نہیں ہوں گا ۔ میرا قصور جو قصۂ پارینہ ہوچکا ، ازراہ کرم معاف فرمایا جائے ۔ میں دنیا میں ہر قسم کے طعنے سن چکا ہوں خاص طور پر اردو علاقے میں ۔ طرح طرح کے اشعار سے مجھے نوازا گیا ۔ ایک شعر تو مجھے یاد بھی ہوگیا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

اتنا بڑا طنز اور وہ بھی خالق ارض و سما کی خدمت میں مصروف رہنے پر ۔ لیکن یہ ایک ہی شعر تھوڑے ہی ہے ۔ ایسے کتنے زہریلے تیر مرے سینے میں پیوست ہوکر رہ گئے ہیں ۔ (اور خود ان آدمیوں نے جنھیں انسان بننا میسر نہیں ہوا کہاں کہاں سجدے نہیں فرمائے ہیں) ان کی داستان تو چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے ۔ شرم ان کو مگر نہیں آتی ۔ لیکن میں اپنی طرف سے ایک پیش کش یہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ میرے اس غیر مشروط معافی نامے کو اگر آپ شرف قبولیت بخشیں اور آدمی کی ساری حرکتوں سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود مجھے از سر نو حکم دیں گے کہ میں اسے سجدہ کروں تو میں صرف اس لئے کہ آپ کی قربت نصیب ہوگی آپ کے حکم کی تعمیل میں سر جھکا دوں گا ۔ میرا دل اس شخص کی طرف سے بہر حال صاف نہیں ہے اس کا اعتراف میں اس لئے بھی کر رہا ہوں کہ آپ کس کے دل کا حال نہیں جانتے ۔ میرا یہ عقیدہ بہر حال برقرار رہے گا کہ شیطان کو راہ راست پر لانا یا خود بخود اس کا صحیح راستہ پر آجانا ممکن ہے لیکن آدمی کو ٹھیک کرنا ممکن نہیں ہے ۔

میں شرمندہ ہوں کہ میں نے ایک مرتبہ یہ دعوا کردیا تھا کہ دل یزداں میں کھٹکتا ہوں میں کانٹے کی طرح ۔ وہ صرف وہم بلکہ وسوسۂ شیطانی تھا ۔ آپ مجھے واپس بلاکر دیکھئے تو سہی ۔ میں صدق دل سے عرض کر رہا ہوں کہ آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ زیتون کے درختوں کا وہ لہلہانا میں کیسے بھول سکتا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ آپ یقین فرمائیں کہ ویسے تو عقوبت میں میری لاتعداد صدیاں گزر گئیں لیکن یہ بیسویں صدی ناقابل برداشت تھی ۔ اس کے ختم ہونے سے پہلے میری سزا کی منسوخی کا حکم صادر فرمائیں ۔

آپ کا یہ دیرینہ خادم اپنے اس معذرت نامہ کی نقول اپنی تمام ایجنسیوں کو بھیج رہا ہے تاکہ میرے شاگرد اور کارکن میرے منصوبے سے واقف رہیں اور اپنی آئندہ زندگی کے لئے کوئی لائحہ عمل سوچ لیں ۔ انھیں بے روزگار رہنے کی عادت نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ بھی آدمیوں کی طرح لوٹ کھسوٹ (اکسٹارشن) کے ذریعے روپیہ کمائیں ۔

پس نوشت : میری عرض یہ بھی ہے کہ آپ میرے عرق انفعال کے قطروں کو موتی سمجھ کر نہ چنیں لیکن اپنی شان کریمی کے صدقے مجھے معاف ضرور فرمادیں ۔۔۔

آپ کا خادم

ابلیس المعروف بہ شیطان

اقبال ہاشمی

پچھلے برس کا مرثیہ

چھاؤنی غلام مرتضیٰ فلک نما، حیدرآباد

ٹوٹ کر چھینکا گرا پچھلے برس
بلیوں کا راج تھا پچھلے برس

جو نہ ہونا تھا ہوا پچھلے برس
چور پہرے دار تھا پچھلے برس

کال تھا ہر مال کا پچھلے برس
خوش نگر دلال تھا پچھلے برس

زور تھا تجار کا پچھلے برس
ہر طرف گاہک لٹا پچھلے برس

منہ بھرا گودام کا پچھلے برس
پیاز نے پردہ کیا پچھلے برس

صرف آلو کیلئے رونا نہ تھا
سبزیوں کا کال تھا پچھلے برس

پیاز کے چھلکوں کی وقعت دیکھ کر
خود کنول مرجھا گیا پچھلے برس

پھاڑنے والے نے چھپر پھاڑ کر
چھت کو رستہ کردیا پچھلے برس

اڑگئیں نیندیں غریبوں کی مگر
رہنما سوتا رہا پچھلے برس

دھرتی ماں کی دھجیاں کرنے کے بعد
حوصلہ اپنا بڑھا پچھلے برس

پردۂ سیمیں پہ " فائر " دیکھ کر
پھر جوان ، آتش ہوا پچھلے برس

راہبائیں آسماں تکتی رہیں
خرمن عفت جلا پچھلے برس

حضرت قانون کا چاروں طرف
مضحکہ اڑتا رہا پچھلے برس

جوتیوں میں دال بھی بٹتی رہی
دھول دھپہ بھی چلا پچھلے برس

اتنی ساری آفتوں کے باوجود
ہاشمی زندہ رہا پچھلے برس

رؤف رحیم

نئے سال میں

شکر گنج حیدرآباد۔ اے پی

کھتی ہے یہ گرانی نئے سال میں
موت ہے زندگانی نئے سال میں

ہوگئی ہے جوانی نئے سال میں
اک برس کی پرانی نئے سال میں

ہم کہیں گے کہانی نئے سال میں
وہ ہوئی جو پرانی نئے سال میں

پٹ گئے ٹینک بنڈ پہ حسینوں سے پھر
کر کے ہم چھیڑ خانی نئے سال میں

بے گرانی تو شادی کی بیچیں گے ہم
دوستو شیروانی نئے سال میں

مہرباں ہو پرانے عدو پہ مرے
ہر بلا آسمانی نئے سال میں

وقت کی دھوپ سے اڑکے رہ جائے گا
رنگ یہ زعفرانی نئے سال میں

پھول کی پتیاں جھڑکے آئیں گی پھر
دیکھنا پیاز رانی نئے سال میں

دیکھئے اور کیا کیا دکھائے اثر
حسن کی حکمرانی نئے سال میں

جو تشی نے یہ ہم سے کہا ہے رحیم
کیجئے عقد ثانی نئے سال میں

پرویز ید اللہ مہدی
ممبئی

نیک پروینِ اوّل

سینما بینی، اسوقت سے ہم تیسری دنیا کے باشندوں کی تفریح و منورنجن کا واحد سستا اور آسان ذریعہ رہی ہے جب فلمیں خود تو نہیں بولتی تھیں، دیکھنے والوں سے طرح طرح کی بولی بلوایا کرتی تھیں۔ اصل میں عیاشی کے دوسرے ذرائع جو مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں ہمیشہ سے میسر ہیں ہمارے یہاں ان کا تصور بھی عنقا ہے، یوں بھی تیسری دنیا کے ملک، چیل کے گھونسلے کے مماثل ہوتے ہیں جس کے تعلق سے اگلے وقتوں کے لوگ بجافرما گئے ہیں کہ

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

دیگر مہنگی تفریحات، کے مقابلے میں سینما بینی کے لیے کم رقم پہلے بھی درکار ہوتی تھی اور آج کے دور ابتلا میں جبکہ گرانی آسمان سے منہ چڑھ کر باتیں کررہی ہے تب بھی ایک سینما بین محض پندرہ تا بیس روپے کی حقیر رقم کے عوض کسی بھی ائرکنڈیشنڈ سنیما ہال میں آرام سے بیٹھ کر پانچ سات مخرب اخلاق ناچ گانوں، ہیرو، ہیروئین کے مابین بے شمار مصافحوں معانقوں بلکہ بوسہ بازیوں، دس پندرہ مار دھاڑ اور بحری، بری و فضائی چیز۔

CHASE سینوں اور آٹھ دس عصمت ریزیوں عرف بلات کاروں سے صرف تین گھنٹہ کی قلیل مدت میں معہ فیملی کما حقہ، محظوظ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں سینما بینی کے شوق میں آدمی بچپن ہی سے یا تو از خود مبتلا ہوجاتا ہے یا زبردستی مبتلا کردیا جاتا ہے۔ اتفاق سے ہمارا شمار دوسری قسم کے سینما بینوں میں ہوتا ہے تاہم جس زمانے میں ہمیں سینما بینی کے شوق میں زبردستی مبتلا کیا گیا تب فلم سازوں و فلم بازوں یعنی فلم بنانے اور فلم دیکھنے والوں دونوں کی اخلاقیات اتنی خراب نہیں ہوئی تھیں، نتیجتاً اس زمانے کی فلموں میں صرف ایک آدھ فائیٹ، ایک دو کبیرے ہیرو، ہیروئن کو درختوں بغیچوں، کیاریوں فواروں کے اطراف دوڑانے اور ایک آدھ ریپ سین

RAPE SCENE عرف بلات کار پر اکتفا کیا جاتا تھا، ان خود ساختہ پابندیوں کے پیچھے اخلاقیات، کے علاوہ اس بورڈ کا خوف بھی کارفرما ہوا کرتا تھا جو کل بھی سنسر بورڈ، کہلاتا تھا اور آج بھی اسی نام سے موجود ہے یہ اور

بات ہے کہ پہلے اس بورڈ کی تحویل میں ایک عدد تیز دھار والی قینچی ہوا کرتی تھی جو حد سے زیادہ قابل اعتراض مناظر پر بلاخوف و خطر نہایت بیدردی سے چلاکرتی تھی جبکہ آج اس قینچی کی دھار کو رشوت اور گھونس کی مار کند کرچکی ہے۔

یادش بخیر اب سے چالیس پنتالیس برس پہلے جس فلم سے ہماری سنیما بینی ، کا مہورت ہوا وہ ایک مسلم معاشرتی فلم تھی مسلم معاشرتی فلم کیساتھ عموماً جس قسم کا تصور ذہن کے پردے پر ابھرتا ہے اس میں ایک عدد نوگزے پیر کے عرس کی خوشی میں منعقد کئے گئے میلے، حسن و عشق کے ریلے ہیرو ہیروئن کے آپسی خاندانی جھمیلے، دل پھینک نوابوں کی پلاسٹر آف پیرس کی کوٹھیاں طوائفوں کے رنگین کوٹھے ، خالص لکھنوی انداز کے فیض آبادی مجرے، چھیڑ چھاڑ، چیخ و پکار میں ڈوبی قوالیاں شرطیہ شامل ہوتی ہیں، بسا اوقات توان مسالہ جات، کی شمولیت کے باوجود مسلم معاشرتی فلم کا عالم یہ ہوتا ہے کہ یہ نہ تو پوری طرح مسلم ہوتی ہے نہ اس میں کوئی معاشرہ ہوتا ہے بلکہ یہ فلم بھی نہیں ہوتی ـــ البتہ جس مسلم معاشرتی فلم سے ہماری سنیما بینی کی بسم اللہ ہوئی وہ ایک خالص مسلم سوشل فلم تھی خالص اس لیے کہ مذکورہ فلم میں جس مسلم معاشرے کی عکاسی کی گئی تھی وہ خالص مسلم معاشرہ تھا چنانچہ فلم کے سارے مردانہ کردار یہاں تک ویلن کو بھی ٹخنوں سے اونچا پاجامہ ، اور گھٹنوں سے نیچا کرتا پہنے سر پر دپلی سجائے قرات کیساتھ ہر کس و ناکس کو سلام کرتے بلکہ بات بات میں مصافحہ و معانقہ کرتے دکھایا گیا تھا۔ یہ اور بات کہ اس کا مصافحہ فریق مخالف کا پنجہ اور معانقہ دو چار پسلیاں ضرور توڑ دیتا تھا اب رہیں فلم کی " زنانیاں" یعنی زنانہ کردار تو وہ مردانہ کرداروں سے ان معنی میں دو جوتے آگے تھیں کہ ہر زنانہ کردار کو مردوں کے پاؤں کی جوتی اور مردوں کو خواتین کے سر کا تاج تسلیم کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا جہاں تک اس خالص مسلم سوشل فلم کی ہیروئین کا تعلق ہے تو اس معاملے میں فلمساز و ہدایت کار نے اسے شرم و حیا کی دیوی اور فلم مذکور کو باطہارت بلکہ متشرع ، ثابت کرنے کے لیے منوں میک اپ کی لیپا پوتی کے باوجود سولہ ریل کی اس فلم میں کم از کم چودہ ریلوں میں ہیروئن کو باقاعدہ شرعی قسم کے برقع میں دکھلایا تھا اب رہیں بقیہ دو ریلیں جن میں ہیروئن کو برقع سے باہر دکھلایا گیا تو اس کا جواز یہ تھا کہ ان دو ریلوں میں ہیروئن کا "عہد طفلی" دکھلایا گیا تھا جسکی وجہ سے اس پر پردے کا شرعی اطلاق بالکل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس فلم میں کرامتوں عرف چمتکاروں کی اسقدر بھرمار تھی کہ اتنی کرامات تو بڑے بڑے پیر اولیاء سے بھی شاید ہی منسوب ہوں۔ ایک سین میں ہیرو ماں باپ کی نافرمانی کرتا ہے۔ نتیجتاً دونوں آنکھوں سے لاچار ہوکر فلمی پیر صاحب کے مزار کے باہر بغیر لاٹھی کے ٹھوکریں کھاتا درد بھرا نغمہ الاپتا دکھائی دیتا ہے، تو اگلے سین میں پیر صاحب کے پلاسٹر آف پیرس کے مزار کو سچے دل سے جھاڑو لگانے کے نتیجے میں اس کی بینائی واپس آجاتی ہے اور وہ شکرانے کے طور پر مزار کے روبرو دو زانو بیٹھ کر عشقیہ قوالی گانے لگتا ہے۔ ایک اور سین میں ویلن ہیروئن کی جائز شیر خوار اولاد کو کسی ناجائز مال کی پوٹلی کی طرح قطب مینار کے نقلی ماڈل کی سب سے اونچی منزل سے نیچے کی طرف پھینکتا ہے اور شیر خوار زمین پر گرکر پیوند زمین ہونے کی جگہ سیدھے پیر صاحب کے مزار پر ٹنگی چادر پر کسی گیند کی طرح گر کر ٹپ، کھانے لگتا ہے۔ تب ہی پس منظر سے باآواز بلند یہ شعر سنائی دیتا ہے۔

فانوس بن کے جسکی حفاظت ہوا کرے

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

مذکورہ شعر کے پردہ ۔ سیمیں پر گونجتے ہی سنیما ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے اور یوں فلم مذکورہ کے فلمساز و ہدایت کار دونوں فلم بینوں کے مذہبی جذبات کا استحصال کرنے میں صدفی صد کامیاب ہوجاتے ہیں ۔ !!

معاف کیجئے باتوں باتوں میں ہم اس کراماتی ، باوضو ، صوم و صلوۃ کی پابند پکی اور سچی مسلمانی وہ فلم کا نام ہی بتلا نا بھول گئے اگلے وقتوں کی اس سپرہٹ فلم کا نام تھا ، نیک پروین اول ۔ اول کا یہ خصوصی دم چھلہ ہم نے محض اپنی اور آپ کی آسانی کے لیے لگایا ہے کہ برصغیر کی فلمی صنعت کی تاریخ میں فلموں کے نام بلکہ کہانیوں کو دہرانے ، تہارنے کا چلن شروع سے عام ہے یعنی چبائے ہوئے نوالوں کو دوبارہ سہ بارہ چبانے میں فلمسازوں کو بھی مزا آتا ہے اور فلم بینوں کو بھی ، چنانچہ اسی آزمودہ فارمولے کے تحت نیک پروین اول کے بعد نیک پروین دوم ، سوم چہارم بھی وقفہ وقفہ سے بناکر پردہ ۔ سیمیں پر پیش کی گئیں ۔ پرانی شراب کو بار بار نئی بوتل میں پیش کرنے کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ مذکورہ فلم میں اتفاق سے دو عدد خصوصیات ایک ساتھ یکجا ہوگئی تھیں ، ایک طرف جہاں یہ فلم ناظرین کو نیکی کا الٹا سیدھا درس دیتی تو دوسری طرف فلمساز کا خالی پرس بھی شرطیہ بھردیتی ، نیکی کے درس اور منی پرس میں اسقدر راست تال میل فلموں کے علاوہ کسی اور شعبہ ۔ حیات میں کم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے ۔ کھلے عام نیکی کا درس دینے والی فلم نیک پروین اول سے اپنی سنیما بینی کا آغاز کرنے میں بخدا ہمارے زہد و تقویٰ کا عمل دخل بالکل نہیں تھا یقین مانئے اس زمانے میں تو ہمیں زہد و تقویٰ جیسے بھاری بھرکم الفاظ کے معنی تک معلوم نہیں تھے کیونکہ جب ہم نے فلم نیک پروین اول دیکھی تھی اتفاق سے طالب علم بھی اول جماعت ہی کے تھے اور اس عمر میں ظاہر ہے خاندان کے ہر نونہال کی پسند ناپسند خاندان کے خرانٹ قسم کے بزرگوں کی پسند ناپسند کے تابع ہوتی ہے چنانچہ خاندان کا ہر بزرگ اپنی پسند کو بچوں کی ناپسند پر مسلط کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ۔ !

صاحبو ! نیک پروین اول جیسی پارسا و پاکیزہ فلم سے ہماری سنیما بینی کا مہورت ، اپنی جگہ یقیناً ایک تاریخی واقعہ ہے ، اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ نیک پروین اول جیسی ہیروئن اورینٹیڈ ۔ HEROIN ORIENTED یعنی کہ ہیروئن کے مرکزی کردار پر مبنی فلم کا دیدار بھی ہم نے حسن اتفاق سے نیک پروین اول کی ہم قوموں ، کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر کیا ، بالفاظ دیگر نیک پروین اول کے دیدار سے ہم زنانہ کلاس ، ہی میں مشرف ہوئے اور یوں کریلا اور نیم چڑھا والا قدیم محاورہ ہماری سنیما بینی پر پوری طرح صادق آیا ۔ ہو سکتا ہے زنانہ کلاس کی اصطلاح آج کی فلم زدہ نسل کے لیے نئی اور نامانوس ہو لہٰذا ان کی معلومات کے لیے وضاحت پیش

کی ہم اسوقت بات کر رہے ہیں جب زنانے کو مردانے سے حتی الممکنہ دور رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کرتا تھا کہ آج کی طرح جب نہ تو مردانے اور زنانے کو کھلے عام اختلاط باہمی کے مواقع ملا کرتے نہ اس کے نتیجے میں سماج، معاشرے کے درخت کی شاخوں پر دھول کے پھول، بڑی تعداد میں کھلتے اور نہ کنواری مائیں اس قسم کی لوریاں گاتیں۔

تو میرے پیار کا پھول ہے کہ میری بھول ہے میں کچھ نہیں جانتی!

جب سوسائٹی کی باگ ڈور چونکہ سمجھدار اور دوراندیش لوگوں کے ہاتھوں میں ہوا کرتی تھی لہذا ماضی قریب میں زنانے کے لیے ہر جگہ ہر محفل ہر اجتماع ہر تفریح گاہ میں پردے کا معقول انتظام ہوا کرتا تھا چنانچہ اب سے تیس پینتیس سال پہلے تک حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے ہر سنیما ہال میں زنانے کے لیے ایک گوشہ مختص ہوا کرتا تھا جہاں مستورات کے لئے پردے کا اسقدر معقول انتظام ہوا کرتا تھا کہ پرندوں میں بھی وہاں نر "پرندے پر نہیں مار سکتے تھے۔

مطلب یہ کہ زنانہ کلاس میں صرف اور صرف خواتین ہی کی اجارہ داری ہوا کرتی تھی یعنی ناظرین سے لے کر بکنگ کلرک ڈور کیپر و دیگر عملہ صرف خواتین پر مشتمل ہوا کرتا یہی نہیں بلکہ اس خصوصی اہتمام و انتظام کے باوجود زنانہ کلاس و مردانہ کلاس کے بیچ ایک عدد طویل و عریض پردہ بھی دیوار کی صورت حائل ہوا کرتا جو فلم شروع ہونے سے پہلے، انٹرول کے وقفے، اور فلم کے ختم ہوتے ہی کھینچ دیا جاتا تاکہ زنانہ کلاس مردانے سے مزید محفوظ رہ سکے۔! ہمیں اچھی طرح یاد ہے پردے کا یہ معقول انتظام اکثر مردوں کو اسقدر شاق گزرتا کہ جب بھی کسی شو، کے دوران انٹرول یا فلم کے اختتام پر زنانہ کلاس کے پردے کے کھینچنے میں ذرا سی تاخیر ہوتی یار لوگ اس سے بھرپور فائدہ اٹھاکر شربت دیدار کے دوچار گھونٹ، پی کر ہی سرشار ہوجاتے بلکہ بعض دیدار کے پیاسے تو ایسے موقعوں کی آس میں، سنیما ہال میں اجالا ہونے سے پہلے ہی اپنا قبلہ، بدل لیا کرتے یعنی سنیما کے پردے کی طرف پیٹھ کرکے زنانہ کلاس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر صف بستہ ہوجاتے، ایسے تماشے اگرچہ کم ہوتے لیکن جب بھی ہوتے اصل فلم سے زیادہ مزادے جاتے اور یار لوگ ایک ٹکٹ میں دو دو شو سے لطف اندوز ہوکر اپنے گھروں کو یہی تمنا لیے لوٹتے، ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔!!

زنانہ کلاس کی اس کلیتہً زنانہ حیثیت کا اندازہ محض اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ زنانہ کلاس میں زنانہ کے ساتھ مردانہ کے نام پر صرف انہی نونہالوں کو داخلے کی اجازت ہوا کرتی جو سفر حضر، کسی حالت میں اپنی ماؤں کو کسی صورت تنہا چھوڑنے کے روادار نہیں ہوتے اور اگر انہیں زبردستی اپنی ماؤں سے الگ کیا جاتا تو اردو کے ہر سفر کو انگریزی کے SUFFER میں اور ہر تفریح طبع کو تفریح تباہ، میں شرطیہ بدل دیا کرتے۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ زیادہ تر سنیما گھروں میں زنانہ کلاس کا حدود اربعہ، مردانہ کلاس کے اوپر بالکنی کے نصف حصہ کا احاطہ کیے ہوتا اور یوں زنانے کو گھروں کے علاوہ سنیما گھروں میں بھی مردوں کے سروں پر سوار رہنے کی سہولت حاصل رہتی نتیجتاً دوران شو، زنانہ کلاس سے اکثر پان کی پیک مونگ پھلی کے چھلکوں و دیگر خورد ونوش شئے باقیات الصالحات کی بارش مردانہ کلاس پر مسلسل ہوا کرتی۔ البتہ اس رنگین بارش کے سنگین چھینٹوں کا پتہ

سنیابینوں کو عموماً شو کے ختم ہونے پر بلکہ کبھی کبھی گھر پہونچنے پر چلتا۔ ایسے میں زنانہ گل کاریوں، کے شکار سنیابین حضرات صرف پیچ و تاب کھاکر رہ جاتے کیونکہ تب تک رنگ ریزنیاں ان کے پیرہن رنگ کر اپنے اپنے رنگ محلوں کو واپس لوٹ چکی ہوتیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے اس دور میں ہمارے ایک دور کے ماموں جو سنیا بینی کے کہنہ مرض میں بری طرح مبتلا تھے اور ہر دوسرے تیسرے روز بڑے ہی خشوع و خضوع کیساتھ آخری شو ضرور دیکھا کرتے جب بھی کسی سنیاہال کا رخ کرتے بلا تخصیص موسم چھتری ضرور ساتھ لے جاتے جو انہیں نہ صرف سنیاہال کے اندر ہونے والی زنانہ گل کاریوں کی اوکالی، بارش سے محفوظ رکھتی بلکہ رات دیر گئے گھر واپس لوٹتے ہوئے آوارہ کتوں کی زد سے بھی بچاتی۔!!

صاحبو! زنانہ کلاس میں بیٹھ کر ہماری سنیا بینی، کا جو سفر شروع ہوا وہ اس وقت تک زنانہ کلاس میں جاری رہا جب تک کہ زنانہ کلاس کے دیگر زنانے کو یہ احساس نہیں ہوگیا کہ زنانہ کلاس ہمارے توسط سے آہستہ آہستہ مردانہ کلاس، میں بدلنے لگا ہے۔ اس بات کو لے کر ہمارے خاندان کی بزرگ خواتین اور زنانہ کلاس کی دیگر خواتین میں ایک روز بڑا جھگڑا ہوا، خوب تو تو میں میں ہوئی۔

ایک خاتون نے واویلا مچاتے ہوئے کہا۔ یہ سنیا والے پیسے کھاکے اچھے خاصے پختی عمر کے پوتوں، (بچوں) کو زنانے میں چھوڑ دے ریں، نہ ان کو گوشے کا خیال ہے نہ پردے کا۔!!

واویلے کے جواب میں ہمارے خاندان کی ایک معمر خاتون نے واویلا مچایا۔ ذرا اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ جاکے، بڑی آئیں پردے کی بوبو۔ معصوم بچے کو پختی عمر، کا بول رئیں۔!! جواب میں اسی خاتون نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ یہ بچے کو معصوم بول رئیں منھ پہ اچھے خاصے مچھیاں پھٹ گئیں۔ بلیڈ لگایا تو داڑھی بھی نکل کو آتی سخت۔!! ہمارے خاندان کی ایک اور معمر خاتون نے جوابی حملہ کیا اب منھ نکو کھلواؤ بچے کی مچھوں تک کاں آرئیں اس سے گہرے مچھیاں تو تمہارے منھ پہ ہیں نا، جاکے بلیڈ سے صاف کرو اپنی مچھوں کو۔!!

قصہ مختصر یہ کہ اس روز یہ جھگڑا اس قدر بڑھا کہ تھیڑ ہذا کے منیجر بلکہ مالک تک کو بیچ بچاؤ کیلئے آنا پڑا اور فیصلہ ظاہر ہے فریق مخالف کے حق میں ہوا اور یوں ہمیں زنانہ کلاس سے پروموٹ PROMOTE کرکے مردانہ کلاس کا اہل قرار دیا گیا۔!!

زنانہ کلاس میں بیٹھ کر البتہ جتنی بھی فلمیں ہم نے دیکھیں، یا یوں کہئے جتنی بھی فلمیں ہمیں سلسلہ وار دکھلائی گئیں اتفاق سے ان کا سلسلہ حسب و نسب کسی نہ کسی راستے سے نیک پروین اول سے ضرور جاملتا تھا، یا یوں کہئے وہ تمام کی تمام فلمیں نیک پروین اول کی نیک اور صالح اولادیں ثابت ہوئیں صورت کے اعتبار سے بھی سیرت کے اعتبار سے بھی مثلاً حاتم طائی کی بیٹی عالم آرا، کی نواسی الهلال عرف خدا کا انصاف یعنی کہ غیب کی لاٹھی حور عرب عرف پرستان کی پری، کوہ قاف کی ملکہ عرف عزیب کی جورو سب کی بھابی وغیرہ وغیرہ۔ ان مخصوص موضوعات پر مبنی فلمیں زبردستی دکھلانے کے پس پردہ بزرگوں کا صرف ایک ہی مقصد ہوا کرتا تھا کہ اس طرح تفریح کے بہانے ہمارے قوت ایمانی اور جوش اسلامی کو سلولائیڈ کی حرارت سے اس حد تک گرمایا جائے کہ ہماری رگ حمیت پھڑکنے لگے اور ہم کمسنی ہی میں زندگی کے ہر محاذ پر نعرۂ تکبیر، اللہ ہے نادیدہ دشمنوں کے کشتوں کے پشتے لگاتے ہوئے

سیدھے اپنی منزل مقصود پر لینڈ کریں لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا مذکورہ فلمیں دیکھ کر رگ حمیت کے سوائے تمام رگیں بلکہ پٹھے بھی پھڑک اٹھے۔ یہی نہیں چند ایک تو بھانگڑہ ناچنے لگے اور اسی طرح ناچتے ناچتے ہم وقت سے پہلے جوان ہوگئے اور یوں نہ صرف زنانہ کلاس سے ایک ہی جست میں مردانہ کلاس میں پہنچ گئے بلکہ فلموں کے انتخاب کے سلسلے میں بزرگوں کے دائرۂ اثر سے باہر نکل گئے اور بلا روک ٹوک بالغوں کے لیے بنائی جانے والی بچکانہ فلمیں دیکھ کر اپنی عاقبت خراب کرنے لگے، اور یہ سلسلہ آپ کی دعا سے آج بھی جاری ہے۔!!!

عابد معز
پوسٹ باکس 5253
ریاض، سعودی عرب

یہ نہ تھی ہماری قسمت

وطن سے خطوط آتے ہی رہتے ہیں لیکن اس مرتبہ بیگم کا عجیب و غریب خط آیا۔ ایسا خط انہوں نے پہلے کبھی نہیں لکھا تھا۔ خط کیا تھا، ایک معمہ تھا۔ معمہ حل کرنے کے لیے میں نے خط کو ایک مرتبہ پڑھا۔ دوسری بار غور سے پڑھا۔ پھر پڑھا اور پھر بار بار پڑھتا ہی چلا گیا۔ چند باتیں اور جملے ذہن سے چمٹ کر رہ گئے اور وقفہ وقفہ سے مجھے پریشان کرنے لگے۔ لکھا تھا "آخر مجھ میں کیا کمی تھی..... آپ نے ایسا کیوں کیا..... میں اپنی مرضی سے آپ کو چھوڑ کر نہیں آئی۔ بچوں کی خاطر بہت سوچ سمجھ کر ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ پھر آپ اتنی جلد کیوں کر پریشان ہوگئے۔ اگر تنہائی ستانے لگی تھی تو نوکری چھوڑ کر آجاتے یا ہمیں بلا لیتے..... ہم آپ کے بغیر کہاں خوش ہیں..... ہر آتی جاتی سانس میں، میں آپ کو یاد کرتی ہوں۔ ہر لمحہ آپ کا چہرہ میرے سامنے رہتا ہے اور آپ کی آنکھیں میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں..... یقین نہیں آتا کہ یہ وہی معصوم چہرہ ہے جو ہر دم اپنی وفا کا اقرار کرتا رہتا تھا۔ کیا آپ کو وہ عہد و پیمان بھی یاد نہیں آئے..... پپو آسمان میں اڑتے جہاز کو دیکھ کر کہتا ہے کہ ڈیڈی اس پلین سے گھر آرہے ہیں۔ رانی بیٹیا ہر دم آپ کو یاد کرتے ہوئے تصور میں آپ کو دیکھتی رہتی ہے۔ ڈیڈی اس وقت دفتر میں ہوں گے۔ اب گھر میں کھانا بنا رہے ہوں گے۔ سالن جل گیا ہوگا۔ پریشان ہوں گے کہ کیا کریں اور پھر جھنجھلا کر بھوکے سوگئے ہوں گے۔ اس وقت ہمیں خط لکھ رہے ہوں گے..... آپ کو معصوم بچوں کا بھی خیال نہیں رہا۔ اب میں ان سے کیا کہوں۔ وہ میری پریشانی اور رونے کا سبب دریافت کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیسے بتلاؤں کہ آپ نے ہم پر کیا ظلم ڈھایا ہے۔"

دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے سوچنے لگا کہ آخر میں نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے سبب بیگم کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہے اور بچوں پر ظلم ہوا ہے میں نے ایسا کون سا کام کیا ہے جسے بیگم بچوں کو بتلا نہیں سکتیں۔ سعودی عرب کے ریگ رواں کا تنہا مقابلہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ بیگم اور بچوں کے بغیر بتائی میں اپنی پچھلی دو سالہ زندگی کا ایک ایک دن یاد کرنے لگا۔ کھانا بنانا، برتن و کپڑے دھونا، دفتر جانا، ٹیلی ویژن گھورنا، بے خوابی کی نیند سونا اور ویک اینڈ پر تفریح کے نام پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنا اور فلمیں دیکھنا یا پھر کبھی کبھار شاپنگ کرنا اور احباب کو چھوڑنے اور لینے ایرپورٹ جانا۔ یہی تو مجھ جیسے "غریب الوطن" اور "بعید العیال" لوگوں کی یہاں زندگی ہے۔ اس معمول سے ہٹ کر میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا ہے۔ کہیں تانک جھانک کی ہے اور نہ ہی کوئی دیوار پھاندنے کا سوچا بلکہ یہاں پر اس قسم کے مواقع ہی میسر نہیں آتے۔ یہاں چہروں کے گھر الگ، ان کے تفریحی حصے جدا اور

پبلک مقامات پر بھی ان کی جگہ مختلف ہوتی ہے۔ اسی لیے اکثر بیویاں سوت کے خطرے سے بے نیاز ہو جاتی ہیں اور بہت آسانی سے اپنے شوہروں کو دیوانہ بنا کر دشت صحرا میں مجنوں کی طرح بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتی ہیں۔

بیگم کے خط کے ساتھ چچا جان کا خط بھی تھا۔ خط میں بزرگوار مجھ سے سخت ناراض دکھائی دے رہے تھے۔ اپنی ناراضگی کا انہوں نے سلیقے سے یوں اظہار کیا۔ "میاں تمہاری فرمانبرداری کی مثال ہم فخر سے تمہارے چھوٹوں کو دیتے ہیں۔ یہ تمہاری عادت رہی ہے کہ معمولی سے معمولی بات پر تم ہم سے مشورہ لیتے ہیں۔ مشورہ کا تو صرف نام ہوتا، ہمارے کہے کو تم حکم سمجھتے لیکن اس مرتبہ تم نے اپنے بزرگوں سے مشورہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر تمہیں اپنی بیوی سے شکایت تھی تو مسئلہ کو خاندان والوں کے سامنے رکھتے۔ ہم بڑے بزرگ (معلوم نہیں اب تم ہمیں ایسا سمجھتے بھی ہو یا نہیں) خاندانی انصاف پسندی کی روایت کے مطابق تمہارے ساتھ زیادتی نہ ہونے دیتے۔ تمہاری بیوی میں مجھے تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ فرمانبردار، وفاشعار، بااخلاق اور سلیقہ مند ہے۔ خوبصورت اور خوب سیرت بھی ہے۔ معلوم نہیں کس کے بہکاوے میں آکر تم نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور اپنی بیوی بچوں پر ظلم کے مرتکب ہوئے" سب کچھ ہو جانے کے باوجود چچا جان مجھ سے مایوس نہیں تھے۔ انہوں نے مزید لکھا "مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسا ہوا ہے خدا سے دعا ہے کہ میرا بھروسہ سلامت رہے۔ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو تم اپنی بیوی اور بچوں سے غفلت نہ برتنا۔ ان سے وہی سلوک روا رکھنا جس کے وہ مستحق ہیں اور ہاں انصاف کا دامن کبھی نہ چھوڑنا۔"

میں حیران اور پریشان کہ خدایا ماجرا کیا ہے۔ میرے اور بیگم کے درمیان ایسا کون سا مسئلہ درپیش تھا بلکہ اب بھی موجود جسے حل کرنے کے لیے میں نے بزرگوں سے مشورہ کئے بغیر اور خود غرضی سے کام لیتے ہوئے اپنی بیوی اور بچوں پر ظلم ڈھایا ہے۔ بہت سوچا کہ کیا بات ہو سکتی ہے۔ کیا میں نے اپنی دولت جوے میں ہار دی ہے یا کسی پر لٹا دی۔ کیا میرے بھیجے ہوئے پیسے بچوں کو نہیں مل رہے ہیں اور وہ تنگدستی کا شکار ہیں۔ کیا میں نے ان کی طرف سے انجان ہو گیا ہوں اور انہیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ تھک ہار کر میں نے بیگم کو فون کیا۔

سلام دعا کے بعد "کیسی ہو" پوچھنا غضب ہو گیا۔ بیگم زار و قطار رونے لگیں۔ میری پریشانی بڑھ گئی۔ پیشانی پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے میں نے دریافت کیا "خدارا مجھے بتلاؤ ہوا کیا؟"

بیگم نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا "کچھ نہیں۔ سب خیر ہے۔"

میں پریشانی میں مختلف سوالات کرنے لگا۔ "کیا کسی کا انتقال ہوا ہے؟ کیا کوئی حادثے کا شکار ہوا؟ کیا کسی سے لڑائی ہوئی؟ یا پھر کوئی بیمار ہے" سب سوالوں کے جوابات نفی میں ملے۔ میں نے نام بنام بچوں اور قریبی رشتہ داروں کے تعلق سے پوچھا۔

جواب ملا "سب خیریت سے ہیں۔ بس میری اپنی قسمت..... " ٹھنڈی آہ کے ساتھ بیگم پھر رونے لگیں۔

جھنجھلا کر میں فون پر دھاڑا "آخر مجھے بتلاتے کیوں نہیں کہ ہوا کیا ہے۔ تمہارا خط ملنے کے بعد سے میں سخت پریشان ہوں۔"

جواب ملا "آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ آپ کی خوشی ہی میں میری خوشی ہے"

میں نے اسی سختی سے پوچھا "میری خوشی میں اگر تمہاری خوشی ہے تو پھر یہ رونا دھونا کیسا؟"

"سب کچھ لٹ جانے پر کیا رونا بھی نہ چاہیے۔ اب یہ رونا دھونا تو زندگی بھر کا ہے" محسوس ہوتا تھا کہ بیگم آنسوؤں کو بمشکل ضبط کر پا رہی ہیں۔

صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ میں نے فون پر چیخ کر غصہ سے کہا "تم بتلاتی کیوں نہیں کہ میں نے کیا کیا ہے"

بیگم نے بھرّائی آواز میں جواب دیا "آپ نے جو کیا ٹھیک ہی کیا ہے۔ آپ غصہ کریں اور نہ پریشان ہوں۔ آپ کی خوشی میں ہم سب کی خوشی ہے۔"

"پھر وہی بکواس۔ میری خوشی میں تمہاری خوشی بلکہ ہم سب کی خوشی ہے۔ آخر میری وہ خوشی ہے کیا۔"

"ایسے پوچھ رہے ہیں جیسے آپ جانتے نہیں"۔ بیگم نے جواب دیا "چلئیے میں ہی پوچھ لیتی ہوں۔ کیسی ہے وہ؟ کیا نام ہے؟ کہاں کی رہنے والی ہے؟ عمر کیا ہے؟ رنگ کیسا ہے؟ بال کیسے ہیں؟ آپ ہمیشہ سے میرے چھوٹے قد کے شاکی رہے ہیں۔ وہ لانبی تو ہوگی۔ آپ کا خیال رکھتی ہوگی۔ کیا وہ میرے سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

کچھ لمحوں کے لیے مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ خیال کیا کہ بیگم ہیجانی کیفیت میں کچھ کا کچھ کہہ رہی ہیں لیکن اب مطلع صاف ہونے لگا تھا اطمینان ہوا کہ خطرناک حالات درپیش نہیں ہیں۔ میں نے پرسکون لہجے میں استفسار کیا "کون کیسی ہے"

"خدارا۔ اتنے بھولے بن کر میرے زخموں پر نمک تو نہ چھڑکئے" بیگم نے التجا کی۔

"یقین کرو تمہاری باتیں میرے پلّے نہیں پڑ رہی ہیں۔ تم کس کی بات کر رہی ہو؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"آپ کی دوسری....." اتنا کہہ کر بیگم پھر رونے لگیں۔

میں نے آرام سے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "کاش یہ سچ ہوتا۔ اس شریف آدمی میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ دوسری بیوی کو برداشت کر سکے۔ یوں بھی آپ کے ہوتے ہوئے کسی دوسری کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ہی "بہت" ہیں۔ دوسری کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ مطمئن رہیے۔ میں صرف اور صرف آپ ہی کا ہوں۔"

"دل رکھنے کے لیے آپ باتیں خوب کرتے ہیں۔ انہیں باتوں کے چکر میں، میں آپ کو سمجھ نہ پائی، خیر، جو ہو چکا سو ہو چکا مجھے سوت قبول ہے۔ بس آپ خوش رہیے۔ میری جانب سے اسے شادی کی مبارک باد دیجیے اور کہیے کہ آپ کا خیال رکھے۔ وقت پر کھانا اور دوائیں کھلائے" اتنا کہہ کر بیگم مزید رونے کے لیے فون بچوں کے حوالے کر کے چلی گئیں۔

بات بالکل صاف ہو چلی تھی۔ بیگم کے مطابق ان کی غیر موجودگی اور اپنی تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ بیگم کا رونا دھونا دراصل سوت کا غم ہے۔ چچا جان کو دوسری شادی کرنے سے پہلے ان سے مشورہ نہ کرنے کا دکھ ہے جب کہ میرا غم ان دونوں سے الگ اور عجیب قسم کا درد ہے۔ غم روزگار کا بوجھ اٹھائے تنہا اپنوں سے دور پڑا ہوا ہوں۔ دوری اپنوں سے محبت کی چنگاری کو بھڑکا دیتی ہے اور جذباتی بھی بنا دیتی ہے۔ ایسے حال میں کہاں اور کس سے دل لگے۔ میرا دل اپنے پاس ہے کہاں۔ میں اسے ہزاروں میل دور اپنوں کے پاس ہی رکھ آیا ہوں۔ تو پھر یہ دوسری شادی کی افواہ اٹھی کیسے اور بیگم تک کیوں کر پہنچی۔ کسی نے بیگم کو اپریل فول بنایا ہوگا یا پھر میرے کسی دوست نے شرارت کی ہوگی۔ بیگم کو چاہیے تھا کہ پریشان ہونے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیتیں لیکن بیگم نے اپنا اور میرا تماشہ بنا دیا۔

بیگم کو مزید مضطرب ہونے سے بچانے اور حقیقت جاننے کے لئے میں نے پھر فون لگایا اور صفائی پیش کی۔ "بیگم میں نے دوسری شادی نہیں کی ہے۔ میری ایک ہی شادی ہوئی ہے اور وہ بھی بڑے بزرگوں نے دھوم دھام سے تمہارے ساتھ کی تھی۔ تمہیں بھی یاد ہوگا۔ میرے لیے بس ایک شادی کافی ہے۔ میرا دوسری شادی کا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ اگر کبھی سوچا تو سب سے پہلے تمہیں بتلاؤں گا مجھے لگتا ہے کسی نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے کہ میں نے شادی کر لی ہے....."

بیگم نے میری بات کاٹی "مجھے کسی اور نے نہیں آپ نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ آپ نے سوچا ہوگا کہ میں کیا کر لوں گی۔ دو

چار دن رو دھو کر خاموش ہو جاؤں گی۔" اور پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "سب آپ کے پلان کے مطابق ہی ہو رہا ہے"

میں نے نرمی سے بیگم کو سمجھایا "فرضی سوت کے بارے میں سوچ کر کیوں ہلکان ہو رہی ہو۔ میرا یقین کرو۔ اچھا یوں کرتے ہیں تمہیں کس نے بتلایا کہ میں نے شادی کر لی ہے، میں اسی سے تردید کراؤں گا۔"

جواب ملا "میں کان کی کچی نہیں ہوں۔ لوگ اگر کہتے تو میں کبھی یقین نہ کرتی۔ شادی کی اطلاع خود آپ نے دی ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "میں نے!"

بیگم نے زور دے کر کہا "جی ہاں آپ نے اپنے ہاتھ سے یہ خوشخبری تحریر کی ہے۔"

"یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جو میں کر نہیں سکتا، اسے کیسے لکھ سکتا ہوں۔" میں نے دعوی کیا "اچھا بتلاؤ میں نے کب اور کیا لکھا ہے"

"آپ نے لکھا ہے، میں نیا عقد کیا ہے۔ اسی لیے چھٹی پر نہ آسکوں گا۔ اب آپ مجھے بہلانے کے لیے کہیں گے کہ آپ نے یوں ہی مذاق کیا ہے لیکن میں جانتی ہوں بات سنجیدہ ہے۔" بیگم کی آواز رندھ گئی۔

میں نے ٹیلیفون کا ریسیور اپنے سر پر دے مارنا چاہا لیکن کیا فائدہ۔ دیار غیر میں تیمار داری کے لیے کوئی اپنا بھی تو نہیں ہے اور پھر "یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ" ایک اور عقد ہوتا اور دوسری بیوی خیال رکھنے کے لیے موجود ہوتی۔

میں نے بیگم کو سمجھایا "یہ عقد وہ عقد و نکاح والا نہیں ہے جس میں دلہن کو بیاہ کر لایا جاتا ہے۔ یہاں عقد سے مراد "عقد العمل" یعنی جاب کنٹراکٹ سے ہے۔ میرے جملے کا آسان ترجمہ یوں ہے کہ میں نے نئی نوکری کر لی ہے۔ نئے دفتر میں اتنی جلدی چھٹی نہیں مل سکتی اسی لیے میں وطن نہیں آسکتا۔ تم نے سوچا ہوگا کہ میں نئی دلہن کے ساتھ ہنی مون....."

"سچ آپ نے شادی نہیں کی۔ کھائیے قسم" بیگم خوشی سے چیخ پڑیں

"خدا کی قسم میں نے دوسرا عقد نہیں کیا ہے" پھر دوسری ہی سانس میں تصحیح کر دی "یعنی دوسری شادی نہیں کی ہے۔"

نیا سال مبارک — اسرار جامعی

یہ سال نیا جو آیا ہے وہ سال مبارک ہو سب کو
یہ عیش و طرب اس دنیا کا اقبال مبارک ہو سب کو
اس کو بھی مبارک ہو یہ سب جو حرص و ہوس کا بندہ ہے
اسرار بہت شرمندہ ہے اس دور میں کیسے زندہ ہے

فضل جاوید
1862 ، MIG کالونی BHEL
آر سی پورم، حیدرآباد 502032

شادی کا موسم

ـم طور پر موسم تین ہوتے ہیں ۔ موسم گرم، موسم سرما اور برسات کا موسم ۔ ان تینوں موسموں کے درمیان دو ذیلی موسم اور ہیں ۔ خزاں کا موسم اور بہار کا موسم ۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں نے انہیں ہجر کا موسم اور وصال کا موسم بھی کہا ہے ۔ ہر موسم کا وقت مقرر ہے ۔ گرمیوں کا موسم آغاز امتحان سے گرمائی تعطیلات تک پھیلا ہوتا ہے ۔ جوں ہی اسکول کھل جاتے ہیں گھنیئے بارش کا موسم ۔ اور پھر چھاتے اور برساتیاں لپیٹ کر انہیں محفوظ جگہ پر رکھتے ہی کمبلوں اور لحافوں کا موسم یعنی موسم سرما شروع ہو جاتا ہے ۔

ان کے علاوہ ایک موسم اور ہے جس کے نہ کوئی مہینے مختص ہوتے ہیں نہ گرم و سرد ہستی کا اس پر کوئی اثر ہوتا ہے ۔ بارش بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ۔ وہ سال کے بارہ مہینے رواں دواں رہتا ہے اور یہ ہے شادی کا موسم..... شیروانیاں، سوٹ الماریوں سے نکالے جارہے ہیں ۔ سلوٹوں کو دور کرنے کے لئے پریس ہو رہی ہے ۔ سلیم شاہی جوتوں کی تلاش ہو رہی ہے ۔ کتان اور بنارسی ساڑیوں کو دھوپ دی جارہی ہے ۔ بینڈ ماسٹر نئے فلمی گانوں کی ریہرسل کر رہے ہیں ۔ آرکسٹرا والے نئے فنکاروں کی تلاش میں ہیں ۔ مچھر دانیوں اور مخملی بستر کی دوکانوں پر ہجوم بڑھتا جارہا ہے طلائی و نقرئی زیوارت کی دکانوں پر تل دھرنے کی جگہ نہ ہو اور سپلائنگ کمپنی والوں کی دوکانیں خالی خالی دکھائی دینے لگیں تو سمجھیے کہ شادیوں کا موسم آگیا ۔ یہ بڑا دل فریب موسم ہے خاص طور پر کنواروں کے لئے.....

تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ موسم امڈ آتا ہے ۔ پتھر گٹی اور لاڈ بازار پر گہرے بادل چھا جاتے ہیں اور پھر بارش ہونے لگتی ہے درہم کی، ریال کی، دینار کی اور ڈالر کی ۔ جب دنیا بھر کی کرنسی ہمارے شہر پر برس رہی ہو تو اس موسم کے شباب کا کیا کہنا..... شادی کے موسم کے گرما گرم مہینوں میں اخباروں میں خبر نما اشتہار اکثر پڑھنے کو ملتے ہیں..... "دلہن نے شادی سے صاف انکار کر دیا" جلی حرفوں میں چھپی اس سرخی کو پڑھ کر آپ پوری خبر پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ نیچے لکھا ہوگا "جب دلہن کو علم ہوا کہ دلہا نے شہر کی مشہور و معروف دوکان "قزاق اینڈ سنس" سے شادی کی شیروانی نہیں خریدی تو اس نے شادی سے صاف انکار کر دیا ۔ راتوں رات دوکان کھلوا کر شیروانی خریدی گئی اور اس کی رسید دلہن کو بتائی گئی تب جاکر دلہن نے ہاں کی" اس طرح کسی جگہ دولہے میاں کے مخزوں کی خبر چھپے گی کہ اگر سہاگ رات کا جوڑا "رقیب برادرس" کی دوکان سے نہیں لیا گیا تو یہ شادی نہیں ہوگی ۔ اس طرح خریداروں کی گہما گہمی دیکھنے کی چیز ہوتی ہے ۔

شادی تو عزیز و اقارب کے یہاں ہوگی لیکن شادی کا موسم ہمارے گھر میں داخل ہونے لگتا ہے ۔ بیگم کو نئی ساڑی اور بچوں کو

نئے ڈریس درکار ہوتے ہیں کیوں کہ موجودہ اسٹاک پچھلی شادیوں میں استعمال ہو چکا ہے۔ اگر پرانی ساڑی پہنی تو رشتہ داروں کو ہماری معاشی زبوں حالی پر ہنسنے کا موقعہ مل جائے گا۔ یہی حال بچوں کا اور ہمارا ہے۔ شادی کا لطف کوئی اور اٹھائے اور قرضوں کا بوجھ ہمارے ناتواں کندھوں پر۔ سال میں ایک دو شادیاں ہوں تو روپیٹ کر صبر کرلیا جائے لیکن یہ موسم تو پہاڑوں کے موسم کی طرح ہے۔ اچانک بادل امڈ آئے برسات ہوئی اور پھر پلک جھپکتے ہی آسمان صاف دھوپ چمکنے لگی اور پھر فوراً گھٹا چھائی اور بارش ہونے لگی۔ سماج میں رہنا ہے تو ان شادیوں کو ہنستے مسکراتے سہنا پڑتا ہے۔ آج زید کے لئے تحفہ خریدنا ہے تو کل بکر کے لئے۔ اس موسم میں کبھی کبھی دن میں تین تین تحفے بھی خریدنا پڑتے ہیں..... زندگی آج کل بہت مصروف ہو گئی ہے۔ لوگوں کے پاس تحفے خریدنے کا وقت نہیں۔ اس لئے لفافوں کا چلن ان دنوں عام ہے۔

شادی کے موسم میں سب سے بڑا اور اہم مسئلہ شادی خانہ بک کروانے کا ہے۔ اگر آپ کوئی معیاری شادی خانہ حاصل کرنے میں ناکام رہے تو آپ کی صاحبزادی کی شادی کھٹائی میں پڑ سکتی ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں انہیں موقعہ کی اس نزاکت کا بخوبی علم ہے ایک دن ہمیں کار میں بٹھا کر شہر کے شادی خانوں کے چکر لگانے شروع کردیئے۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ ہم نے حیرت سے پوچھا کیا بیٹی کی شادی طے ہو چکی؟" وہ بولے "نہیں یار۔ شادی طے ہو گئی اور تمہیں نہیں معلوم ہو گا پہلے کوئی اچھا شادی خانہ تو حاصل کرلوں۔ پھر قریب ہو کر رازدارانہ لہجے میں بولے "میاں اگر کوئی معیاری شادی خانہ مل جائے تو پھر دیکھو رشتوں کی قطار لگ جائے گی۔" ہماری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔ پوچھا۔ یار اگر تمہیں اچھا شادی خانہ مل بھی گیا تو اس کی خبر ان لوگوں تک کیسے پہنچے گی جن کے یہاں رشتہ کرنا ہے" "ارے میاں، بدھو کے بدھو رہے۔ ادارہ پیامات میں جب بیٹی کے رشتے کا رجسٹریشن کرواؤں گا تو اس میں اس کی واضح طور پر صراحت ہوگی کہ فلاں تاریخ کو فلاں اعلیٰ اور معیاری شادی خانہ حاصل کیا جاچکا ہے لڑکے والوں کو اس سے اندازہ ہو جائے گا بلکہ ان پر دھونس بیٹھے گی کہ ہم کس حد تک معیاری شادی کرسکتے ہیں....." ہمارے دوست کی اس دور اندیشی پر ہم واہ واہ کئے بغیر نہ رہ سکے

ویڈیو گرافر بھی اس موسم کی پیداوار ہیں۔ آج کل غریب غرباء کی شادیوں میں بھی ویڈیو فلم بنانے کا شوق عام ہے۔ گھر کے اندر ہونے والے تمام رسومات کو بھی معہ پردہ نشین خواتین آپ ٹی وی اسکرین پر آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ ویڈیو گرافر موقعہ شناس ہوتے ہیں۔ اچھی صورتوں پر کہ دیر تک فوکس کئے رہتے ہیں۔ رشتوں کی تلاش میں ایسے کیسٹ بڑے کارآمد ثابت ہو رہے ہیں۔

شادی کا موسم بن بلائے مہمانوں کے لئے بہار کا موسم ہوتا ہے۔ ولیمہ کی دعوت ان کا خاص نشانہ ہوتی ہے۔ اگر آپ لڑکے والے ہیں تو وہ لڑکی والوں کی طرف سے آئیں گے اور اگر لڑکی والے ہوں تو دلہا کے دوست بن کر آئیں گے۔ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا بہت مشکل ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں انہیں ایسی دعوتیں کھانے کا بڑا شوق ہے۔ گھر میں یوں تو ہر طرح کی نعمت موجود رہتی ہے کیوں کہ کافی متمول گھرانے سے ان کا تعلق ہے لیکن انہیں گھر کے کھانے سے زیادہ اس قسم کا کھانا ہی زیادہ پسند ہے۔ وجیہ شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت جامہ زیب بھی ہیں۔ کوئی بھی انہیں بن بلایا مہمان نہیں سمجھتا۔ ساتھ میں ان کے دو تین دوست بھی ہمیشہ موجود رہتے۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو میزبان کا خاص آدمی ظاہر کرنے کے لئے وقت سے کافی پہلے وہ شادی خانے کے اس حصہ میں پہنچ جاتے تھے، جہاں پکوان کا انتظام ہوا کرتا ہے۔ اپنے قیمتی مشوروں سے باورچیوں کو نوازتے ہوئے لوگ انہیں دیکھتے اور یہی سمجھتے کہ یہ بھی میزبان ہی ہیں۔ اس طرح کسی کو ان پر شبہ نہ ہوتا۔ ہم نے انہیں بارہا سمجھایا کہ ایسی اوچھی حرکت انہیں زیب نہیں دیتی لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور رہتے۔ ایک دن حسب معمول وہ اپنا ایک بہترین سوٹ زیب تن کئے اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ ایک شادی خانہ پر پہنچ گئے۔ کار پارک کی۔ ہال میں زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ ایک دوست نے حوصلہ بڑھایا کہ چلو بیٹھ جاتے ہیں۔ سب کھانے کے

لئے گئے ہوں گے۔ دولہے کے مسند پر کچھ بچے چمک دمک کی شیروانیاں اور تاج سر پر پہنے اچھل کود کر رہے تھے جیسا کہ عموماً قریبی عزیزوں کے بچے کرتے ہیں۔ ہال میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ دستر خوان کے شیر دھاوا بول چکے ہیں۔ جب کافی دیر ہو چکی اور شکم سیر ہو کر لوگ باہر نہیں آئے تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ ایک بزرگ بڑی دیر سے ان کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ قریب آئے اور دریافت کیا "اگر آپ لوگوں نے کھانا نہیں کھایا تو اندر چلیے۔ ذلیسے میں نے آپ کو پہچانا نہیں" ..... ہمارے دوست بڑی بے نیازی سے بولے۔ ہم نوشہ کے قریبی عزیز ہیں..... وہی بزرگ ذرا مسکرائے اور بولے..... جناب شاید آپ کسی غلط شادی خانے میں آگئے۔ آج کا نوشہ تو وہ لڑکا ہے۔ انہوں نے ان کھیلتے ہوئے لڑکوں میں سے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا جو سر پر تاج پہنے مسند پر بیٹھا تھا۔ آج میرے پوتے کی تسمیہ خوانی ہے۔ "..... اس سانحہ کے بعد ہمارے دوست نے توبہ کرلی اور اب وہ اپنے قریبی دوستوں کی شادی میں باضابطہ بلانے پر بھی شریک نہیں ہوتے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ رقعہ میں اگر صرف شرکت کی گذارش ہو اور تناول طعام کا ذکر نہ ہو تو ایسی شادیوں میں شریک ہونے والوں کی تعداد خاص الخاص رشتہ داروں تک محدود ہوتی ہے البتہ دعوت ولیمہ میں اس قسم کا کوئی وسوسہ نہیں ہوتا۔

ایک شادی میں شریک ہونے کا ہمیں اتفاق ہوا۔ سارا شادی خانہ روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ دولہے کے لئے مہکتے پھولوں سے اسٹیج سجایا گیا تھا۔ کھلی جگہ پر قناتیں تنی ہوئی تھیں۔ انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا اندر داخل ہو رہا تھا۔ دولہے میاں سجی ہوئی کار سے اترے۔ کیمروں کی روشنی کی چکاچوند سے ان کا استقبال ہوا۔ اس کے بعد دو پہلوان نما آدمیوں نے ایک قوی الجثہ بکرا اٹھا کر دولہے کے سر پر سے وارا۔ نکاح کے بعد چاروں اطراف سے مصری اور چھواروں کی یلغار ہوئی۔ اس کے بعد مجمع اس وسیع و عریض میدان کی طرف کوچ کرنے لگا جہاں ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دور سے مینو دیکھ کر ہی ہمارا پیٹ بھر چکا تھا۔ میزوں پر سجے ہوئے قابوں کو شمار کرنا دشوار تھا کچے گوشت کی بریانی، پکے گوشت کی بریانی، چکن بریانی، فرائڈ چکن، مرغ مسلم، جنجر چکن، نان، لقمی کباب، مچھلی کے کباب، بگھارے بینگن، مرچوں کا سالن، کئی قسم کی چٹنیاں۔ فیرنی، خوبانی کا میٹھا، بادام کا حلوہ، گاجر کا حلوہ اور نہ جانے کیا کیا تھا جن کے نام کم از کم ہمیں تو نہیں معلوم تھے۔ لوگ پلیٹوں اور ڈشوں سے نبرد آزما تھے اور ہم انہیں مرغ و ماہی سے دست و گریباں دیکھ رہے تھے۔ ہمارے شکم ناتواں میں اتنی وسعت نہیں تھی کہ ان تمام قابوں سے ایک ایک نوالہ ہی چکھ لیتے۔ تقریباً ڈھائی ہزار انسانی پیٹ شکم سیر ہو چکے تھے۔ پھر بھی کئی دیگ جوں کے توں بھرے رہ گئے تھے۔ کوئی کھانے والا باقی نہ بچا تھا۔ فقیر اور بھکاری بھی شاید پہلے ہی اپنی جھولیاں بھر کر جا چکے تھے۔

اچانک ہماری نظروں کے سامنے ان والدین کے مرجھائے ہوئے خزاں رسیدہ چہرے ابھر آئے جو اپنی محنت کی کمائی سے تھوڑے جوڑے کی رقم نہ جوڑ سکے۔ جہیز جمع نہ کر سکے اور جن کی جوان لڑکیاں اپنی غریبی کا لبادہ اوڑھے حسرتوں کو دل میں دبائے نہ جانے کب سے بابل کی گلیوں سے پیا کے دیس تک کا سفر صرف خوابوں میں طے کرتی آرہی ہیں۔ کاش ان کے پاس اللہ دین کا جادوئی چراغ ہوتا اور ان کے سونے آنگن میں بھی شادی کا موسم اتر آتا.....!!

نظر برنی

نیا سال

نیا سال ہوگا نئی بات ہوگی
نئی صبح ہوگی نئی رات ہوگی

نیا سر، نئی لے، نیا ساز ہوگا
زمانے کو "ٹھگنے" کا انداز ہوگا
کرپشن کا کیا پھر سے آغاز ہوگا؟
نئے کل کی کیا یہ ہی سوغات ہوگی؟
نیا سال ہوگا نئی بات ہوگی

نئی منزلوں کے نشاں ڈھونڈنے کو
"کرنسی" بھری بوریاں ڈھونڈنے کو
نکل تو پڑے کارواں ڈھونڈنے کو
نئے "ڈاکوؤں" سے ملاقات ہوگی
نیا سال ہوگا نئی بات ہوگی

ذرا دیر کو اپنے غم بھول جائیں
گھریلو مسائل سے آنکھیں چرائیں
چلو چل کے ہوٹل کی محفل سجائیں
یقیناً خوشی چند لمحات ہوگی
نیا سال ہوگا نئی بات ہوگی

نیا سال ہے اور مہنگائیاں ہیں
"گھوٹالوں" کی دنیا میں شہنائیاں ہیں
غریبوں کے حصے میں تنہائیاں ہیں
بہت جلد "ٹیکسوں" کی برسات ہوگی
نیا سال ہوگا نئی بات ہوگی

خوشامد سے افسر پٹاؤ تو بہتر
اسے آپ رشوت چٹاؤ تو بہتر
اور اوپر سے مکھن لگاؤ تو بہتر
نئے ڈھب سے اس کی مدارات ہوگی
نیا سال ہوگا نئی بات ہوگی

گئے سال کو آپ کیوں رو رہے ہیں؟
مقدر میں کانٹوں کو کیوں بو رہے ہیں؟
دلوں کی سیاہی کو کیوں دھو رہے ہیں؟
نیا سال ہے تو نئی گھات ہوگی
نیا سال ہوگا نئی بات ہوگی

کرو بڑھ کے ٹاٹا تم اٹھانوے کو
کہ جیسے کیا تم نے ستانوے کو
گلے سے لگا لیجئے ننانوے کو
اسی طور تسکین جذبات ہوگی
نیا سال ہوگا نئی بات ہوگی

منظور الامین
3 B ، فیرویو ، بنجارہ ہلز ،
حیدرآباد

کاکلِ پیچاں

آج کل ملک میں اور بیرونِ ملک لفظ بل Bill مقبول ہوگیا ہے بیرونِ ملک تو عالمی تھانے دار بل کلنٹن نے کردار (ملاحظہ ہو چشتی داستان مونیکا لیونسکی) اور موت کے کاروبار (بغداد میں بل کے مزائیل اور بمبار) کے ذریعے جو شہرت حاصل کی ہے وہ دنیا کی آج کی تاریخ کا ایک الم ناک باب ہے، ادھر ہمارے ملک میں وناچل بل، آنچل بل، چھتیس گڑھ بل، ارکان پارلیمنٹ کی تنخواہوں سے متعلق ترمیمی بل اور پیٹنٹس Patents بل پارلیمنٹ میں پیش ہورہے ہیں۔

ایک اور بل جس کا ذکر کیا جاسکتا ہے وہ ہے چوہوں کا بل، اپنے اپنے بلوں سے چوہے نکل کر کیا قیامت ڈھاسکتے ہیں اس کا نظارہ تو اہلِ ملک نے دیکھ لیا جب سورت شہر کے چوہوں نے کچھ برس پہلے شہر میں پلیگ پھیلادی اور سورت کی صورت بگاڑدی تھی۔

دو ایک قسم کے بل اور بھی ہیں جن کا ذکر شاعر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

ادھر ہوٹل کا بل زائد ادھر شاپنگ کا بل بیوی
ابھی ہے کورٹ شپ دہری حجامت ہوتی جاتی ہے!

پارلیمنٹ کا حالیہ اجلاس ختم ہوا لیکن پارلیمان کے معزز ممبروں نے سال نو ۱۹۹۹ء میں بجٹ سیشن کی عاجلانہ سے اتفاق کرلیا، مندرجہ بالا بلوں میں سے کچھ بل اب غالباً آنے والے سیشن ہی میں پیش کئے جائینگے۔

ہمارے ملک میں ویسے تو تین موسم ہوا کرتے ہیں، گرمی، سردی اور برسات لیکن ایک اور اہم موسم بھی ہوتا ہے ہم بجٹ کا موسم کہہ سکتے ہیں یہ موسم ہر سال جنوری فروری کے مہینوں میں آتا ہے، گھروں میں بیویاں بھی اپنے گھریلو بجٹ میں ملک کے بجٹ کے مطابق تبدیلیاں لانے کی کوشش کرتی ہیں اور اپنے اپنے شوہروں سے تعاون کی خواستگار ہوتی ہیں، لیکن صاحب بجٹ ہے بڑی ٹیڑھی چیز، جو ہر کسی کے بس میں نہیں۔

مشہور ماہر طبیعات آئین اسٹائین کو نظریہ۔ اضافیت کا خالق کہا جاتا ہے یہ امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں ریاضیات کے پروفیسر بھی تھا ظاہر ہے یہ اعداد و شمار کا ماہر ہوگا لیکن ایسا تھا نہیں، کہتے ہیں اس کی بیوی اسے بازار سے چیزیں لانے کے لئے رقم دیا کرتی تھی، اکثر اسے ایک ڈالر دیا جاتا تھا، وہ بازار سے چیزیں تو خرید لیا کرتا تھا شاپنگ لسٹ کے مطابق، مگر اس ایک ڈالر کے خرچ کا حساب رکھنے اور بیوی کو حساب دینے میں اسے بڑی مشکل پیش آتی تھی، کس شئے پر اس نے کتنے سینٹس Cents خرچ کئے؟ باقی رقم کتنی بچی؟ نہیں بچی تو کیوں نہیں بچی اس نے اگر

خرچ نہیں کیا تو پھر چیزیں کس طرح آئیں اور شاپنگ کیسے ہوئی الغرض وہ ان دنیوی Mundane معاملوں میں پھنس کر رہ جاتا تھا؛ور گویا اپنے آپ ہی سے تصور میں بیوی کو مخاطب کرکے کہتا تھا ۔۔" ایسے الجھاؤ ترے کاکل پیچاں میں نہیں! "

چونکہ اوپر پیٹنٹس Patents کی بات ہوئی ہے تو ایک ضمنی سی بات یہ کہ ایک زمانے میں آئین اسٹائین سوئٹزرلینڈ کے برن نامی شہر میں انسپکٹر آف پیٹنٹس کے عہدے پر فائز تھا۔

ہاں تو ذکر پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے بلوں کا ، اقتصادیات کا، بجٹ کا اور مالیات کا ہو رہا ہے۔ اقتصادیات اور مالیات کے عالمی شہرت کے مالک اور ماہر پروفیسر امرتیہ سین ان دنوں ملک کے امریکہ سے ہندوستان آئے ہیں۔ پروفیسر سین کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ بڑی سین Sane یا عقل مند شخصیت ہیں۔ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار ان کی کسی بات پر ان کے ایک دوست نے ان سے کہا " یہ بات کہہ کر کیا تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو ؟ "سین صاحب کا جواب تھا " یار میں قدرت کے کاموں میں دخل نہیں دیا کرتا "۔

گھریلو معاشی بحران سے قطع نظر عالمی اقتصادی بحران جولائی ۹۷ء میں تھائی لینڈ میں شروع ہوا تھا جو مشرقی ایشیا کے ملکوں میں آگ کی طرح پھیل گیا اور پھر ان ملکوں سے ہوتا ہوا اس نے روس اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کو بھی اپنی باہوں میں جکڑلیا ان کے علاوہ دیگر اور ملک بھی اس بحران کا شکار ہوئے ، کئی ملکوں کی سماجی اور اقتصادی زندگی اس سے متاثر ہوئی ، نتیجے کے طور پر ماں باپ کی یہ استطاعت نہ رہی کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیج سکیں ، اس لیے اچانک dropouts یا اسکول نہ جاسکنے والے بچوں کی شرح بڑھ گئی ، لوگوں کی صحت پر اسکا برا اثر پڑا لاکھوں لوگ غربت کا شکار ہوئے اور لوگوں کی فی کس ترقی یا فروغ ۳-۲ فی صد سے گھٹ کر اعشاریہ ۴ فی صد ہوگئی ، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ میں سال رواں ۱۹۹۸ء میں ۲۵ملین لوگ غربت کا شکار ہوگئے۔

حال کی گرانی سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا ملک بھی اس بحران سے متاثر ہوا ہے ، ملک کے بجٹ کے ساتھ ساتھ ان دنوں ہمارے گھر میں بھی بجٹ کا مسئلہ زیر غور ہے۔بحث کافی زور شور سے جاری ہے ہم نے رمضان کو ایک وجہ بتاکر تحریک التوا پیش کردی لیکن بیوی کا کہنا ہے کہ پھر آنے والی عید کے اخراجات کا کیا ہوگا ؟ بہرحال بیوی کو جو ہماری وزیر مالیات و اقتصادیات و ماحولیات ہیں اور جو گھر کے بجٹ کی کیمسٹری سے بخوبی واقف ہیں ہم نے اپنے کانفیڈنس Confidence میں لے لیا ہے وہ اس پر راضی ہوگئی ہیں کہ جب تک عالمی معاشی بحران ختم نہیں ہو جاتا وہ سونے کے کاروبار میں کٹوتی کر دینگی ، سونے کے لفظ سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ سونے یا نیند میں کٹوتی کر دینگی سچ تو یہ ہے کہ بیوی تو جب موقع مل جائے استراحت کرتی ہی رہتی ہیں اور کرتی ہی رہینگی ، دراصل وہ اس پر راضی ہوگئی ہیں کہ وہ سونا یا gold (یعنی وہ دھات جسے ستار عیوب اور قاضی الحاجات کہا گیا ہے) کی خرید پر خود ہی پابندی لگادینگی اور ایک آدھ مہینہ جوہری کی دکان کا رخ نہ کرینگی کہتے ہیں قطرہ قطرہ دریا ہوتا ہے اس طرح اگر مشرقی ایشیا کے ملکوں کے شہری اپنی اپنی معاشیات کو استوار کرنے کے لئے فرداً فرداً اس طرح کا قدم اٹھائیں جس طرح کا قدم ہماری ذمہ دار بیوی اٹھانے کے لئے تیار ہوگئی ہیں تو امید ہی نہیں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بحران جلد دور ہوجائیگا۔

اقتصادی اور معاشی مشکلوں کے شکار معصوم انسانوں کو ہمارا وہی مشورہ ہے جو شاعر کا ہے

مشکلیں اور بڑھا کرتی ہیں گھبرانے سے
وقت رکتا نہیں گھڑیال کے رک جانے سے

سلیم مقصود

موتی سمجھ کے

ایک دن عجیب اتفاق ہوا ہمارے گھر کے نل میں پانی آنے لگا ہم بہت حیران ہوگئے ۔ محکمہ آب رسانی کی اس بے اعتدالی پر ہمیں بہت حیرت ہوئی ۔ آج تک صرف بل پابندی سے آیا کرتا تھا کیا مجال کسی دن نل میں پانی بھی آجائے مگر اچانک اس بھاگیہ وان دن پانی بھی آگیا صبح محلے والوں نے پوچھا کہ "آج پانی بھرتے نظر نہیں آئے ۔ " ہم نے فخر سے کہا کہ "آج گھر کے نل میں پانی آگیا تھا اس لئے گھر سے باہر نکلنے کی نوبت نہیں آئی ۔ " لوگ حیران ہوئے بلکہ محلے کے بعض ہمدرد حضرات نے ہماری نبض ٹٹولی ۔ اور کچھ لوگوں نے تو برملا پوچھ ہی لیا کہ " آپ کی مزاج تو ٹھیک ہے نا " ہم نے جھنجلاکر پوچھا " ہمارے مزاج اور نل میں پانی کے آنے سے کیا تعلق ہے ؟ ۔ " " بہت دنوں سے پانی میسر نہ ہونے سے Depression ہوکر صدمہ بھی تو ہوسکتا ہے ! " ہم نے کہا ۔ " بخدا ہمارے گھر پانی آیا ہے ۔ ہم جھوٹ نہیں کہہ رہے ہیں ۔ " محکمہ آبرسانی ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانیوں کی ایذا رسانی کے لئے انگریزوں نے قائم کیا تھا ۔ تاکہ وقت ضرورت سارے ہندوستانیوں کا حقہ پانی بیک وقت بہ یک " جنبش ٹوٹی " بند کیا جاسکے اور بجلی کے محکمہ کے متعلق ایسا خیال آتا ہے کہ اس کا بانی نادرشاہ رہا ہوگا ۔ نادرشاہ نے تو صرف دلی اجاڑی تھی ۔ مگر یہ محکمہ اپنے نٹ ورک سے سارے ہندوستان میں گھر گھر اندھیرا کرکے اکثر ویرانی پھیلا دیتا ہے ۔ ہمارے گھر کے بچے اکثر امتحانات میں ناکام ہوجاتے ہیں بے چاروں کا صبح کا وقت پانی کی تگ و دو میں گذر جاتا ہے ۔ اور شام میں بجلی کا کرنٹ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اس میں مطالعہ تو درکنار ایک دوسرے کی شکل تک نہیں پہچانی جاتی ۔ اس سے فائدہ اٹھاکر دوچار چوروں نے چوری کرڈالی وہ لوگوں میں مدھم روشنی سے فائدہ اٹھاکر ایسے گھل مل گئے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کچھ اجنبی بھی ہمارے گھر گھس آئے ہیں ۔ بجلی کی کھلائی ہوئی روشنی میں سارے چہرے ایک جیسے لگتے ہیں ۔ بجلی کی کٹوتی اور بجلی کی نیم روشنی سے بچا کچھا وقت تیوہاروں کے موقع پر بجنے والے بے سر لاوڈاسپیکر کی نذر ہوجاتا ہے ۔ اگر لاوڈاسپیکر کے موجد کو یہ پتہ ہوتا کہ ہندوستان میں اس کی ایجاد کا یہ حشر ہوگا تو وہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے لاوڈاسپیکر کے ساتھ ساتھ انسان میں صبر و تحمل پیدا کرنے والی دوا بھی ایجاد کرتا بہرحال ذکر نل کا کرنے چلے تھے درمیان میں بجلی کا تذکرہ بھی آگیا ۔ ان دونوں محکموں کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ دونوں محکمے ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں بلکہ مذکورہ سکے کا ایک

ہی رخ ہوتا ہے اس لئے یہ محکمے "چت بھی میری" کے اور "پٹ بھی میری" کے اصول پر کاربند رہتے ہیں ۔ ہمارے محلے میں جس دن پانی آتا ہے محلے والوں کے چہرے کھلے کھلے بلکہ دھلے دھلے رہتے ہیں ۔ لوگ ڈیوڈرنٹ Deodorent کا چلتا پھرتا اشتہار نظر آتے ہیں ۔ صاف ستھرے اور معطر ۔

ہم نے تاریخ میں پانی پت کی لڑائی پڑھی تھی ۔ دیکھی نہیں تھی ۔ مگر محلے کے نل پر آج کل ہر روز یہ لڑائی دیکھنے کو مل جاتی ہے ۔ محکمہ آب رسانی کے طفیل میں اس طرح ہم بھی تاریخ کا حصہ بنتے جارہے ہیں محکمہ برقی کی وجہ سے ہمیں گپھا میں رہنے والے آدمی Cave man کا اعزاز دوبارہ حاصل ہوگیا ہے کیونکہ شام ہوتے ہی بقول فیض "شام آئی تو روے عالم پر تیری زلفوں کی آبشار گری" کے مصداق بجلی کی کٹوتی کے سبب سارے محلے پر محبوب کی زلفوں اور شاعر کے خیالوں کی سیاہی چھا جاتی ہے ۔مذکورہ محکموں کے انسانیت پر اتنے احسانات ہیں کہ ان احسانات کا بدلہ موجودہ نسلیں اور ان کے بعد آنے والی نسلوں کو ان کے بل چکا چکا کر ادا کرنا ہوگا۔ ان محکموں کی کارکردگی اور اخلاق کا تذکرہ تو بس وہی شخص کرسکتا ہے جس نے کبھی ان کے بل وصول کئے ہوں گے یا کبھی شومئی قسمت سے ان کے دفتر گیا ہوگا ۔ ہمارے محلے میں ان محکموں کے دو سابق ملازمین رہتے ہیں ۔ ان میں سے ایک لنگڑا ہے اور دوسرا اندھا ۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی معذوری کسی بیماری کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ "مکافات عمل" کی وجہ سے ہے ۔ہمارے محلے کے ایک صاحب کا لڑکا تاریخ میں بہت کمزور ہے اس لئے انہوں نے اسے گھر کی ایک غیر اہم ذمہ داری سونپ دی ہے ۔ اس کا کام ہے کہ وہ محکمہ آب رسانی اور محکمہ ، برقی کے بل بھرتا رہے ۔ایک دن اس لڑکے نے اپنے والد سے کہا کہ "اباجان ! میں نے جب سے محکمہ آب رسانی اور محکمہ ، برقی کے بل بھرنے شروع کئے ہیں مجھے دنیا میں ہونے والی جنگوں کے اسباب کا پتہ چلنے لگا ہے ۔ باپ نے انتباہ دیتے ہوئے کہا " بیٹا ! ابھی گھر میں ٹیلیفون نہیں آیا ورنہ تمھیں خود بہ خود پتہ چل جاتا کہ دنیا میں زلزلے کیوں آتے ہیں زمین کیوں کھسک جاتی ہے ۔

محکمۂ آب رسانی محکمہ برقی و محکمہ ٹیلی فون یہ تینوں توام بہنیں ہیں ۔ ہم نے ایک دن ہمت کرکے محکمہ آب رسانی میں پانی نہ آنے کی شکایت کردی ایک خرانٹ قسم کے کلرک نے پوچھا ۔ "بل ادا کیا تھا ؟ ہم نے جواب دیا "بندہ پرور ! نیا بل رعیت کو ابھی تک نہیں ملا ۔ "کہنے لگا" بل باندھیئے پانی ضرور آئے گا ۔ بغیر بل کے کیسے توقع کرتے ہو کہ پانی آئے گا ۔ بغیر چارے کے کسی گائے نے کبھی دودھ بھی دیا ہے ۔ " ہم نے بل حاصل کرکے دوسرے ہی دن ادا کردیا اور سیدھا گھر پہنچ کر بل Bill نل کے نیچے رکھ دیا تاکہ وہ بھی دیکھ لے نل سے دو بار غراہٹ کی آواز آئی اس کے بعد دو قطرے نل سے کاغذ پر ٹپک پڑے جیسے "موتی سمجھ کے پانی کے مارے نے چن لئے ۔پانی کے چند اور قطرے گرنا ہی چاہتے تھے کہ "حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے" کی تصویر بلیس و حسرت بن کر نل سے باہر نہ نکل سکے ۔غرض ہم نے بل پر پڑے ہوئے پانی کے قطروں کو "عرق انفعال" کی طرح چن کر محفوظ کرلیا ۔ اور سیدھے محکمہ ، آب رسانی کے دفتر پہنچے ۔ اسی خرانٹ کلرک نے پوچھا "پانی آیا تھا " ہم نے کہا " جی ہاں ! پانی آیا تھا ۔ "

" ہم اسے حفاظت سے اپنے ساتھ لائے ہیں"۔ کلرک فوراً میز کے نیچے دبک گیا کہ کہیں ہم پانی اس پر انڈیل نہ دیں۔

ہم نے کہا! "باہر تشریف لائیے۔ ہمارے آنسوؤں کی طرح محکمہ آب رسانی کا پانی بھی بل میں خشک ہو چکا ہے
چشم عبرت کھولئے اور خود دیکھ لیجئے۔" کلرک نے میز سے نکل کر بل Bill پر ایک نظر ڈالی اور بل کو
سونگھنے لگا ہم نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" کہنے لگا یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ واقعی اس پر آب
رسانی کے نل سے ٹپکنے والے پانی کے قطرے ہیں یا نہیں۔"
ہم نے کہاں "آپ سونگھ کر کس طرح پہچان پائیں گے؟" کہنے لگا۔
"پانی سے بدبو آئے تو آب رسانی کا ورنہ ـــ"

وہ دن وہ لوگ

پورن سنگھ ہنر

مولانا چراغ حسن کی عمر کا معتدبہ حصہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں بسر ہوا وہ کلکتہ میں عصر جدید، نئی دنیا، جمہور اور استقلال کی ادارت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ ان کی شہرت مزاحیہ نگاری پر ہی موقوف نہ تھی۔ ادبی موضوعات پر بھی عبور تھا۔ مگر ان کی کامیاب ظرافت نے دوسرے طبعی جوہروں کو نمایاں نہ ہونے دیا۔ وہ کلکتہ کے فسادات سے متاثر ہو کر لاہور آگئے تھے سامان وغیرہ پاس کچھ نہ تھا اور غالباً جیب بھی خالی تھی چوک وزیر خاں بالمقابل مسجد وزیر خاں ایک نان بائی کی دوکان پر کھانا کھانے بیٹھے۔ اتفاق سے وہاں روزنامہ "زمیندار" کا پرچہ پڑھتے رہے جب کھانا کھا چکے تو نان بائی سے ازراہ مذاق کھانے کی بڑی تعریف کی۔ مزاح نگار تھے ہی اس انداز تکلم سے نان بائی ان کا گرویدہ ہوگیا۔ پیسے دینے لگے تو نان بائی نے لئے نہیں بلکہ چائے کا ایک کپ اور پلادیا۔ حسرت نے کہا کہ میں کلکتہ سے آرہا ہوں فسادات کی وجہ سے بے سروسامان چلا آیا۔ نان بائی نے کہا میری بیٹھک ہے جب تک چاہے رہیئے۔ "زمیندار" میں مولانا ظفر علی خاں کی ایک نظم چھپی تھی۔ حسرت نے اسی وقت برجستہ نظم کہی جو اسی ردیف اور قافیے میں تھی اور بذریعہ ڈاک دفتر زمیندار کو پوسٹ کر دی اور پتہ نان بائی کا لکھ دیا۔ اگلے دن مولانا ظفر علی خاں نے حسرت کی غزل پہلے صفحے پر نمایاں طور پر شائع کی اور ساتھ ہی ایک تعریفی نوٹ بھی لکھا۔ ایک خط بھی جس میں مولانا نے استدعا کی کہ آپ مجھ سے دفتر میں کسی وقت ملیئے حسرت کو لکھا۔ دوسرے روز چراغ حسن حسرت مولانا ظفر علی خاں سے ملنے گئے اور اپنا تعارف کروایا تو انھوں نے حسرت کو اسی وقت اپنی ملازمت میں لے لیا۔ ان کی پوری قدر و منزلت کی اور رہائش کے لیے دفتر میں جگہ دے دی۔ پھر کیا تھا مطائبات کے عنوان سے مزاحیہ کالم نگاری ان ہی کا حصہ تھی۔ پھر حسرت کا دوسرے لوگوں سے بھی تعارف ہوا وہ بڑے حلیم اور بردبار تھے کئی برسوں سے اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہے۔ کبھی مسودہ اکٹھا نہ کیا عروض پر بھی عبور حاصل تھا۔ اشعار بھی خوب کہتے تھے۔ مگر زمانہ آج بھی انھیں مزاح نگار سے یاد کرتا ہے۔ ان کے دم قدم سے لاہوری مجلسیں زندہ تھیں ڈاکٹر اقبال کے پاس بھی اکثر جایا کرتے تھے مہر صاحب اور سالک صاحب سے بھی خوب خوب مراسم تھے ـــ

ایوان اردو ـــ دسمبر ۹۶ء

ظفر کمالی
رانی پور گاؤں،
بر ہریا۔ سیوان (بہار ۸۴۱۲۳۲)

غزل *

عجب تاثیر ہے اس کی یہ رشوت کا نوالا ہے
نگاہیں جس طرف اٹھیں اسی کا بول بالا ہے

گلے میں جس کے ہونا چاہیے تھا طوق لعنت کا
وہی اسٹیج پر بیٹھا پہن پھولوں کی مالا ہے

نمائندے ہمارے ہیں جو ایوانوں میں ان کے ہی
علی گڑھ کا کسی نے جڑ دیا ہونٹوں پہ تالا ہے

یہ خستہ حال سڑکیں کس طرح ان کو نظر آئیں
وزیر محترم کی آنکھ میں بچپن سے جالا ہے

کریں گے دور مہنگائی غریبی کو مٹائیں گے
ارے ناداں الکشن کا پرانا یہ مسالا ہے

تجوری ہم سمجھتے ہیں اسے مال غنیمت کی
بہنوئی گر منسٹر ہے تو پی۔اے اس کا سالا ہے

جہاں تھا نور کا چشمہ وہاں ظلمت کا دریا ہے
عجب اندھیر ہے اندھیر نگری میں اجالا ہے

سکھایا ہے رواداری ہر اک مذہب تو آئے دن
اسی کے نام پر کیوں ہر طرف برچھی ہے بھالا ہے

دھماکا ایٹمی بھارت نے کر ڈالا تو حیرت کیوں
یہاں پر ایٹمی رفتار سے ہوتا گھٹالا ہے

چوٹی میں جو منتقل ہیں ان ہی غزلوں پہ آئے دن
رسالوں میں ہیں تنقیدیں جریدے میں مقالا ہے

ادھر عشرت ادھر عسرت ادھر رحمت ادھر زحمت
ادھر ہے روز دیوالی ادھر نکلا دوالا ہے

جو کوڑے دان گھر کے سامنے [illegible] ہے کیا کہیے
یہی لگتا ہے اس کو دیکھ کر پربت ہمالا ہے

رہیں نامحرموں کے بیچ بے گھونگھٹ وہ بے پردہ
نظر آیا جہاں محرم وہیں گھونگھٹ نکالا ہے

صف نعلین کے تھے مستحق سردار بن بیٹھے
ظفرؔ جمہوریت کا باوا آدم ہی نرالا ہے

ٹی۔ این۔ راز
ہریانہ

چھیڑ غالب سے

ایسے بھی کچھ نظارے گلی میں ہو گئے
وہ چھت سے دیکھتے رہے اور ہم پٹا کئے

آنے پہ ہوش صبح کو پوچھا یہ رند نے
نالے میں ساری رات یہ ہم کیا کیا کئے

یہ عشق کے خطوط نے دکھلایا رنگ خاص
محبوب جتنے تھے انہیں لے بھاگے ڈاکئے

کرسی پہ یوں ہی ہم تو نہیں آکے ڈٹ گئے
کتنے ہی پر کئے دیش پہ ہم نے فدا کئے

جرأت کو ان کی میری شرافت کو دیکھئے
"بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے"

مذہب کا زہر گھول کے جام خلوص میں
کتنے ہی رشتے آپسی ہم نے جدا کئے

سرکار اپنی لاشوں کے ہی پیچھے پڑ گئی
کیا رازؔ کوئی مسیحا گری اب کیا کئے

ڈاکٹر حبیب ضیاء
حیدرآباد

انداز اپنا اپنا

کچھ کاج کرکے دوست احباب ، رشتہ داروں کو بلانے کا رواج زمانہ دراز سے چلا آرہا ہے ۔ تقریب کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو ، لوگ اپنے بجٹ ناپ تول کر دیکھ لیتے ہیں ۔ پھر بہت ہی محتاط طریقے سے مدعوئین کی فہرست تیار کرتے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ یہ صرف احتیاط نہیں ہوتی ۔ اس کے پیچھے ان کے ذہن میں سڑنے والے جراثیم خوب کام کرتے ہیں بعض گھرانوں میں رجب کے کونڈوں کی دعوت میں ہر گھر سے مردانے کی دعوت دی جاتی ہے ۔خواتین اور بچے سراسر نظرانداز کئے جاتے ہیں ایک گھر میں ہم نے ایک عجیب سی دعوت دیکھی۔سنا کہ لڑکی کا رسم تھا اس میں جو بلاوا آیا وہ صرف مردانے کے لئے تھا ۔میزبان صاحبہ نے ساتھ ہی اپنی دو کنواری بہنوں کو مدعو کرلیا اور صراحت کردی کہ آئندہ سال وہ اپنے اپنے سسرال چلی جائیں گی اس لئے انھیں بلالیا ۔

ان کے فسادی ذہن کو چین نہیں آیا ۔ اپنی بھانجیوں کو یہ کہکر دعوت دی کہ وہ باہر سے آئے ہیں ۔ اس طرح صرف مردانے کی دعوت غلط ثابت ہوئی ۔ کھوجی لوگوں نے اس کے پیچھے کام کرنے والے میزبان کے ذہن کو پڑھ ہی لیا ۔صرف بے زبان ، شریف بھاوجوں کو ستانا ، ان کی دل آزاری کرنا ہی ان کا مقصد بلکہ مقصد حیات تھا ۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اب یہی فارمولہ ان کی سسرال میں ان پر آزمایا جارہا ہے ۔

دعوت دینا اور قبول کرنا بہت بڑا آرٹ ہے دینے اور قبول کرنے کا ہر ایک کا اپنا ایک منفرد انداز ہوتا ہے ۔ ذرا سی چوک ہو جائے تو ہر دو کے لئے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں ۔ ایک صاحبہ نے اپنے قریبی رشتہ داروں میں سے پچاس افراد کے لئے دعوت کا اہتمام کیا ۔فہرست بناتے وقت انھیں بڑی الجھن کا سامنا کرنا پڑا ۔ ایک قریبی رشتہ دار کے بارہ بچے تھے ۔باپ کو ملا کر چودہ ؛ کافی سوچ بچار کے بعد انھوں نے اس کا حل یوں نکالا ، فون پر کہدیا ہمارے پاس ایک چھوٹی سی تقریب ہے آپ اپنے کسی دو بچوں کو لائیں ۔ بارہ بچے پیدا کرکے زندگی بھر کے لئے پچھتاوے میں تو پڑہی گئے تھے ۔ اب ہر اس لمحہ سے چوکنے رہتے تھے جس میں پچھتاوے کا ذرہ برابر بھی شائبہ محسوس کرتے ۔ کسی دو بچوں کی دعوت نے ان کے ضمیر کو جھنجوڑ ڈالا ۔ کچھ دیر کے لئے دماغ ماؤف سا ہوگیا پھر ان کے ذہن نے اپنا کام کردکھایا ۔ گویا میزبان کو چیلنج کیا ۔گانے کے مقابلے کی طرح انھوں نے دعوت سے دس دن قبل

گھر میں کھانے کے مقابلے کا اہتمام کیا۔ سارے بچوں کو بٹھاکر کھانے کی رفتار اور مقدار کو نوٹ کرنا شروع دلچسپ بات یہ ہوئی کہ بڑے بچے اس بازی میں ہار گئے دس اور بارہ سال کے دو بچوں کا انتخاب کیا، دستر خ کو لوٹنے کے سارے گر انھیں اچھی طرح سمجھاکر اپنے ساتھ لے گئے۔ ان بچوں نے باپ کی لاج رکھ لی۔ کھانے اتنا شاندار مظاہرہ کیا کہ محدود دعوت میں واقعی کھانا کم پڑگیا۔ ان دو ماہروں نے باقی دس بہن بھائیوں کی پوری کرتے ہوئے میزبان کو ایک طرح سے سبق بھی سکھادیا۔

سلام کرنے اور ایک دوسرے کو "Wish" کرنے کے بھی ہر گھرانے کے انداز اپنے اپنے الگ ہو ہیں بڑوں کا احترام مختلف طریقوں سے جتایا جاتا ہے۔ کہیں پیر چھوکر اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے بھی انداز ہیں پورا ہاتھ پاؤں کو لگنا، پاؤں پر لگنے سے پہلے ہی ہٹالینا، بزرگ کے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاکر ہاتھ کھینچ اور آخری صورت ان کے پیٹ تک ہاتھ بڑھاکر اپنے پیٹ کی جانب کھینچ لینا۔

ایک دفعہ ایسی ہی کسی محفل میں پہلی مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ لڑکیاں ہال میں بیٹھی ہر خاتون کے پا جاتیں، اور جھک کر پیروں کی طرف ہاتھ بڑھاتیں۔ ہمارے قریب آکر ایک لڑکی جھکی ہم نے فوراً پاؤں ہٹ کرلیئے۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے یہی عمل کیا۔ ہم نے سوچا شاید اس کی کوئی قیمتی چیز نیچے گر گئی ہے اور ڈھونڈ رہی ہے۔ تیسری بار ہماری عقل نے کام کیا۔ وہ تو بیچاری ہمارے پاؤں چھوکر ہمیں عزت دینا چاہتی تھی

فیشن کی مار کھائے ہوئے گھرانوں میں ایک دوسرے کے گالوں کو چھیڑا جاتا ہے۔ بڑے چھوٹوں کو اور برا والی خوتین ایک دوسرے کے گالوں کو چومتی ہیں۔ یہ نظارے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ لپ اسٹک کے نک جانے کے ڈر سے جو بوسہ لیا جاتا ہے اسے ادھر پتی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بوسہ دصول کرنے والی خاتون برق رفتاری سے پیچھے سرک جاتی ہیں کیونکہ لینے والی کے منہ میں زردہ اور قوام کا پان بھ ہوتا ہے وہ ہوائی بوسہ لے کر دوسری جانب متوجہ ہوتی ہیں اس طرح کے ہوائی بوسے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں)

سلام کے بارے میں تو کہا گیا ہے کہ سلام کرنے والے کا مرتبہ نسبتاً بلند ہوتا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جا۔ کہ بعض لڑکیاں بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے مرتبہ اور وقار کو کم کررہی ہیں۔

ایسی ہی ایک لڑکی کا ذکر ہے جسے ہم اس کے بچپن سے دیکھ رہے ہیں۔ قریب آکر بہت ہی ادب سے "آداب عرض ہے" کہتی اور جب تک ہمارا ہاتھ اپنے سر پر نہ رکھوالیتی جھکی ہی رہتی۔ جوں جوں وہ عمر کی منزلیں طے کرتی گئی۔ اس کے سلام کرنے کا انداز بھی بدلتا گیا۔ ہاتھ اٹھاکر دور ہی سے سلام کرنے لگی پھر ـــــ ہاتھ نہیں اٹھنے لگا بے نیازی سے صرف اسلام علیکم۔

ہم خوشی خوشی اس کے ہر قسم کے سلام لیتے رہے۔ مگر اب ـــــ اب یہ کہ زبان ہلنی بند ہوگئی ہے صرف سر کی ذرا سی جنبش سے ہمیں یقین کرلینا پڑتا ہے کہ ہو نہ ہو، سلام ہی ہے۔ چند سالوں میں یہ ہوگا کہ سر ساکت اور جامد ہوجائے گا۔ صرف آنکھوں کو ذرا سی جنبش دی جائے گی اور پھر اسکے بعد ـــــ نہ سر جھکے گا نہ آنکھوں جنبش ہوگی۔ نظر پڑتے ہی وہ منہ پھیر لے گی۔ بدلتی تہذیب کے اس سلام کو ہم دور ہی سے سلام کرتے ہیں۔

ہندوستانی تیج، شادی بیاہ اور دوسرے مواقع پر اہتمام سے منائے جانے والے رسوم میں مشترکہ تہذیب کی

جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں ۔ بعض لوگ تو ان رسوم میں اتنے ڈوبے ہوتے ہیں کہ تیر کر نکلنا چاہیں تب بھی نکل نہیں سکتے ۔ کچھ دور آکر پھر ڈبکیاں لگانے لگتے ہیں ۔

ایک صاحب شادی بیاہ کے مختلف رسوم کے سخت مخالف ہیں ۔ ان کا یہ انداز ہمیں بہت اچھا لگا ۔ انتہا یہ کہ وہ ایسی شادی کی تقاریب کا بائیکاٹ بھی کرتے ہیں ۔ اس دوسری معقول حرکت سے بھی ہمیں بڑی مسرت ہوئی ۔ انتہا کے بعد آخری حربہ جو وہ استعمال کرتے ہیں وہ یہ کہ اپنے بیوی بچوں پر بھی سخت نگرانی اور پابندی لگا رکھی ہے ۔ قول اور فعل کے اس قدر پابند ہیں کہ بیوی کو دھمکی دے چکے ہیں کہ اگر وہ ایسی شادیوں میں جائیں گی جس میں دلہا یا دلہن کو گھر ہی میں سہی، مایوں بٹھایا جائے گا تو بچوں کو عاق اور بیوی کو طلاق دے دیں گے ۔ عاق کیا ہوتا ہے اسے ہم پھر سمجھائیں گے ۔ بہر حال ان کی تیسری ادا ہمیں اور بھی معقول لگی ۔ کہ چلو خاندان میں ایک تو سپوت ایسا ہے جو بے جا رسومات کے خلاف آواز اٹھا رہا ہے ۔

ان کا بائیکاٹ اور احتجاج ماضی کی بات ہوگئی ۔ ایک دن فون کی گھنٹی بجی ۔ ہیلو ! میں وارث بول رہا ہوں اس ماہ کی ۲۶ / تاریخ کو آشا کی شادی ہے ۔ ۲۲ / تاریخ سے روزانہ آپ سب کو آنا ہے ۔ ہم نے کہا اس مہنگائی میں چار دن کے مانجے ؟ انھوں نے بات کاٹ کر جواب دیا ۔ جی نہیں ! مانجے نہیں Gettogether ۔ اس اصطلاح پر ہم چونک پڑے ۔ ہم نے پھر سوال کیا ۔ دوسرے دن ۔ ؟ ۔ دوسرے دن ! دماغ پر مصنوعی زور ڈال کر انھوں نے کہنا شروع کیا ۔ اسے کیا کہتے ہیں ۔ ہاں ۔ ساچق ۔ میں تو نہیں چاہتا تھا مگر آشا کی ماں کی آرزو ہے ۔ ساچق کیا ۔ بس Gettogether سمجھیئے سب مل کر کھانا کھائیں گے ۔ گپ شپ رہے گی ۔ ضرور آیئے ۔ بالکل سادگی ہی سے کھانے کا اہتمام رہے گا ۔ ڈیڑھ سو دولہا والے آجائیں گے ۔ "بس" ہم نے پوچھا ۔ اور تیسرے دن ۔ ؟ وہ ۔ یتسرے دن بھی Gettogether ہے ، لڑکے کے گھر پر ۔ ہم نے بات کاٹتے ہوئے کہا ۔ مہندی کی رسم کہو نا ! انھوں نے بوکھلاتے ہوئے صراحت کی ۔ نہیں نہیں ۔ مہندی نہیں ۔ میں تو یہ بھی نہیں چاہتا تھا ۔ لڑکا اکلوتا ہے اس کی بہنوں کی آرزو ہے کہ سب جمع ہوں ۔ کچھ خاص اہتمام نہیں صرف اکیس کشتیاں ہم سجا کر لے جائیں گے ۔ Gettogether میں زیادہ نہیں صرف تین سو لوگ یہاں سے چلیں گے ۔

ہم نے احتجاجاً مکمل بائیکاٹ کیا ۔ البتہ چند معتبر جاسوسوں کو لگائے رکھا کہ پل پل کی خبر ہمیں دیتے رہیں ۔ پتہ چلا کہ Gettogther کے نام پر مانجے ، ساچق ، مہندی کی رسومات چار دن تک چلتی رہیں نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے اپنی ضعیف نانی ساس سے ڈھول بجوا کر ان کا گانا بھی سنا ۔ لڑکے لڑکیوں نے مل کر ناچ گانا کیا ۔ شادی کے دن کے ہنگامے تو غضب کے تھے ۔ شان بان کے ساتھ دولہا ، پھولوں سے لدی گاڑی سے اترا ، جو انھوں نے اپنے اخراجات سے سجا کر بھیجی تھی ۔ شادی خانے میں وہ طوفان بدتمیزی مچا کہ لوگ لاؤڈ سپیکر پر گانے کے شور سے کانوں پر ہاتھ رکھے گھروں کو جانے لگے ۔

رات کے ایک بجے پٹاخے شروع ہوئے اس کی دہشت ایسی کہ پولیس آگئی اور باجے والوں کا بینڈ بجادیا ہمیں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ـــــ بہر حال اس انوکھے "گٹ ٹوگیدر" کو مہمان اور میزبان کبھی بھلا نہ پائیں گے ۔ !

قیسی قمر نگری
کرنول اے ۔ پی

غزلیں

لیڈر ہیں کتنے معتبر واللہ اعلم بالصواب
ہیں راہزان یا راہبر واللہ اعلم بالصواب
وکلاء ہمارے سیکھتے ہیں کونسے اسکول میں
یہ جھوٹ کہنے کا ہنر واللہ اعلم بالصواب
روئے خلوص دل پہ کیا پردہ غرض کا پڑگیا
کیوں ہیں دعائیں بے اثر واللہ اعلم بالصواب
سب ہیں کلب میں جابجا مصروف رقص و میکشی
می کہاں ڈیڈی کدھر واللہ اعلم بالصواب
حیران ہے عقل بشر کب تک پھریں گے دربدر
یہ صاحب علم و ہنر واللہ اعلم بالصواب
مجھ پر دولتی جھاڑتے ہیں ودث میرا چھین کر
کیوں وارثین نسل خر واللہ اعلم بالصواب
قیسی کو کیا ہوگی خبر اس ملک کی مہنگائی پر
رشوت بڑھے گی کس قدر واللہ اعلم بالصواب

مندر یا اقتدار ؟ یہ اندر کی بات ہے
ہے ان کو کس سے پیار یہ اندر کی بات ہے
بش شرٹ میں سفید ہے بنیان گیروی
ہم جانتے ہیں یار یہ اندر کی بات ہے
باہر سے دیکھنے میں تو بنگلہ ہے شاندار
اندر ہے کار زار یہ اندر کی بات ہے
داڑھی میں میرے قائد اعلیٰ خصال کی
تنکے ہیں بے شمار یہ اندر کی بات ہے
دیواں کے سارے شعر ہیں طبعاً نیکو شعار
شاعر ہے کج شعار یہ اندر کی بات ہے
واقف ہے قوم آپ کے شوق شکار سے
کس نوع کا شکار یہ اندر کی بات ہے
قیسی میں پستہ قد ہوں پہ دنیائے شعر میں
قد ہے قطب مینار یہ اندر کی بات ہے

مرزا کھونچ
نیا ٹولہ بیتیا بہار

غزلیں

خدا یا کھونچ کے دل کی دعا یہ پھل جائے
کہ جو رقیب ہیں ان کی بیاض جل جائے
چلے ہو آنکھ لڑانے بغیر ہلمٹ کے
یہ واقعہ نہ ہو جغرافیہ بدل جائے
خوشی سے ایک چونی فقیر کو دوں گا
مگر یہ شرط ہے کھوٹا روپیہ چل جائے
خدا کے واسطے میکہ کا راستہ دیکھو
مری اداس طبیعت ذرا بہل جائے
بہت ہی شوخ تھا مرزا پڑوس کا مرغا
پکاتے وقت یہ کوشش رہے کہ گل جائے

کیسا ہے بزدلی کا مزہ ہم سے پوچھئے
بیگم کی برہمی کا مزہ ہم سے پوچھئے
گھر عالیشان بن گیا بس ایک سال میں
چندے کی چاندنی کا مزہ ہم سے پوچھئے
تنخواہ کے علاوہ کمائی ہے رعب کی
سرکاری نوکری کا مزہ ہم سے پوچھئے
فربہ ہوئے ہیں قوم کے آنسو کو پونچھ کر
بے داغ رہبری کا مزہ ہم سے پوچھئے
قرضے پہ قرضہ لیکے پریشان کردیا
مرزا کی دوستی کا مزہ ہم سے پوچھئے

محمد اسد اللہ
معرفت ایس اے خان، 3/B ظفر نگر،
عقب پولیس لائن ٹیکلی، ناگپور

مبارک کہہ نہیں سکتا

نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ دستور کے مطابق مجھے آپ کی خدمت میں مبارکبادی پیش کرنی چاہیئے۔ مگر معاف کیجئے جن تجربات سے ہو کر میں یہاں پہنچا ہوں اس پر آپ بھلا ہی مجھے مبارکباد کا مستحق کیوں نہ سمجھیں، نیا سال شروع ہونے کے باوجود میں آپ کو مبارکباد نہیں دے سکتا۔ تفصیل اس اجمال کی ذرا بعد میں آئے گی۔ پہلے میں آپ کو یہ بتادوں کہ اہل مغرب اس موقع پر خاص طور پر دو کام ضرور کرتے ہیں ایک مبارکباد اور دوسرے نئے سال کے لئے عزائم۔

مشرق میں ان چیزوں کا اہتمام کبھی نہیں رہا، پیروی مغرب کی بات جدا ہے۔ ہندوستان میں نیا سال سال بھر میں کئی بار شروع ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں انگریزی سال، اسلامی سال، پارسی نیو ایر س ڈے، بکرم ورش، کے علاوہ تعلیمی سال، کاروباری سال وغیرہ کے ذریعے سال کو بارہ مہینوں میں کئی مرتبہ شروع کرنے کی کوشش کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے جو روز روزمرے اسے کون روئے۔ مبارکباد دینے کے کئی مواقع ہیں مگر شاید یہاں کے سیاسی، جغرافیائی اور معاشی حالات اس قدر فضول خرچی کی اجازت نہیں دیتے۔

بعض حقائق وقت کے ساتھ بدل بھی جاتے ہیں، کسی نے کہا تھا مشرق مشرق ہے مغرب مغرب ہے، اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی جغرافیائی حدود کو اچھی طرح چیک کرلیں۔ ورنہ کسی دن جائزہ لینے پر پتہ چلا کہ نہ مشرق میں ہیں نہ مغرب میں یعنی کہیں کے نہیں رہے۔

نئے سال کی آمد پر ہم نے ارادہ کیا کہ چند عزائم کے ذریعے زندگی کو نئے سرے سے سنوارا جائے۔ مغرب والوں کی اتباع ہی سہی۔ یاد آیا کہ سال گذشتہ جو عزائم کئے تھے وہ کون سے پورے ہوئے جو اب نئے عزائم کریں۔ بر سبیل تذکرہ یہ بھی عرض کردیں کہ گذشتہ برس مسٹر اے ٹو زیڈ نے طئے کیا تھا کہ ہمیں اپنے گھر کھانے پر بلائیں گے۔ شاندار دعوت ہوگی وغیرہ، سو یہ وعدہ انھوں نے اپنے والد مرحوم کے چالیسویں کی تقریب میں پورا کیا۔ انھوں نے ہمیں بھی کئی مشوروں سے نوازا تھا۔ مثلاً یہ کہا تھا۔

میاں، پان کھانا بند کرو، ورنہ جو دانت تم ہم پر نکال نکال کر ہنستے ہو کسی دن ڈھونڈنے پر بھی نہ ملیں گے اور اسی طرح سگریٹ پھونکنے کے بجائے پھینک دو ورنہ کسی دن تم خود دھوئیں کا مرغولہ بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاؤ گے اور روزانہ علی الصبح اٹھا کرو شاید کسی دن تمہارے ساتھ تمہارا سویا ہوا مقدر بھی جاگ اٹھے۔

پہلے تو ہم ان کی ان بزرگانہ نصیحتوں اور بچکانہ انداز پر ہنسے پھر کوئی قابل قدر و قابل عمل منصوبہ پیش نظر نہ ہونے کی صورت

میں دو تین مہینوں تک ان ہی عزائم کو لپیٹے او پر اوور کوٹ کی طرح سجائے پھرتے رہے۔ مئی جون میں جب گرمی بڑھنے لگی تو شرافت کے جامے سے باہر آگئے ہمیں اس پر افسوس بھی نہیں ہے کیونکہ اگر یہ تمام عزائم گذشتہ برس کے دوران پورے ہوجاتے تو اس سال ہم کیا کرتے؟ نیا سال کیسے مناتے؟ اور ہم یہ سب نہ کرتے تو وقت ہمارے پرانے اسکوٹر کی طرح ٹھہر جاتا۔ ہمارا اسکوٹر رکنے اور چلنے کے لئے کسی بہانہ کا محتاج نہیں ہے مگر وقت کے ساتھ چلنے کے لئے انسان کو عہد و پیماں کی ضرورت ہے۔ ہر چند یہ مشرقی روایت نہیں کہ ہمارے ہاں توڑنے کے لئے اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ ملکی قوانین، اخلاقی ضوابط معاہدے، رشتے اور کچھ نہ ملے تو ایک دوسرے کا سر۔ ہم نومبر دسمبر ہی سے تاک میں تھے کہ کوئی Unbreakable قسم کا عزم اپنالیں مسٹرائے ٹونزیڈ سے پوچھا تو کہنے لگے "ایسا عزم تو بس ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ تم یہ ٹھان لو کہ اس سال کوئی نیا عزم نہیں کروگے"۔

"دھت تیری کی، یہ کیا بات ہوئی"۔

سال ختم ہونے میں بس ایک دن باقی تھا۔ ہم زیر لب بڑبڑائے "عزائم کو اوور کوٹ نہیں بننے دیں گے اپنا عزم خود تلاش کریں گے۔ جیسے یہ کہ ہم بااخلاق بنیں گے۔ مگر کیسے؟ بااخلاق اور پولائٹ بننے کی پہلی سیڑھی ہے بات چیت کا سلیقہ!"

نیک کام میں دیر کیوں، بس جو ملے اسے دو مبارکباد نئے سال کی، بن گئے مسٹر پولائٹ۔ یہی تو ہیں اپنی کیٹس نئی سوسائٹی کے۔ اس عزم کو عملی جامہ پہنانے کے نتیجے میں حسب ذیل واقعات پیش آئے۔

۳۱/دسمبر کی رات بارہ بجے ہوں گے ادھر نئے سال نے ٹھٹھرتے ٹھٹھرتے رات کی کالی چادر سے سر نکالا گھڑیال نے ۱۲ بجا کر اور لوگوں نے پٹاخے چھوڑ کر خواب غفلت کے مزے لینے والوں کو اس عظیم واقعہ کی خبر دی اور ادھر ہم نے فون اٹھایا۔ مسٹرائے ٹونزیڈ سے رابطہ قائم کیا بہت دیر بعد نیند میں ڈوبی ہوئی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہیلو" ہم نے کہا۔ ارے بھئی نیا سال مبارک ہو۔ کیا سو رہے ہو

ادھر سے جواب میں شیر کی سی دہاڑ سنائی دی۔ "ابے او تے مستنڈے تجھے کیا یہی وقت ملا تھا مبارکباد دینے کے لئے"۔

"ظاہر ہے۔ ابھی ابھی تو نیا سال تازہ تازہ شروع ہوا ہے"

"تو کیا صبح تک رک نہیں سکتا تھا کیا صبح تک یہ سال بھاگا جارہا تھا۔ ابے تو کون ہے تیرا نام اور نمبر تو بتا"۔

"اوہو سردار جی رانگ نمبر ویری ساری"

"دھت تیری کی، نیا سال بھی شروع ہوا تو رانگ نمبر سے۔ اب آگے کیا ہووے گا"

"سب اچھا ہی ہوگا سردار جی۔ نیا سال شروع ہوچکا ہے مبار۔۔۔۔" "اوتے نیا سال شروع ہوا تو کیا میں ناچوں؟" یہ کہہ کر فون رکھ دیا گیا۔

اس کے بعد کسی اور سے فون پر بات کرنے کی تاب نہیں تھی۔ جب صبح ہوئی تو دودھ کا پیکٹ لینے کے لئے نکڑ کی دکان پر پہنچا قطار میں کھڑے ایک گاہک نے بتایا لالہ جی کے گھر بچی ہوئی ہے"۔

ہم نے آگے بڑھ کہا "لالہ جی مبارک ہو"

یہ سن کر لالہ جی گرم دودھ کی طرح ابل کر چھلک پڑے۔

"چھڑکے۔۔ لو چھڑک لو، تم بھی ہمارے زخموں پر نمک چھڑک لو"۔

پتا چلا کہ لالہ جی کے گھر لڑکی ہوئی ہے اسی لئے اس قدر جلے بھنے ہیں۔

دودھ کا پیکٹ لے کر لوٹ رہا تھا تو مجو پہلوان پر نظر پڑی ۔ یاد آیا کہ کل کسی نے بتایا تھا ان کے گھر لڑکا ہوا ہے ۔ سوچا اب تو انھیں مبارکباد دینے میں کوئی ہرج نہیں ہم نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

پہلوان صاحب لڑکا مبارک ہو"۔

پہلوان صاحب نے پہلے ہمیں آنکھیں نکال کر اوپر سے نیچے تک دیکھا اور گویا خون کا گھونٹ پی کر کہا۔

"مسٹر صاحب میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اسے وہ پٹخنی دیتا کہ وہ پانی تک نہ مانگتا"۔

آخر ہوا کیا؟"

ہونا کیا ہے ، پچھلے پانچ سالوں سے میں کارپوریشن کے الکشن میں کھڑے ہونے کے لئے ڈنڈ پیل رہا ہوں ادھر مجھے چوتھا لڑکا پیدا ہوا اور ادھر آج کے اخبار میں خبر چھپی ہے کہ سرکار سوچ رہی ہے تین سے زیادہ اولیاد (اولاد) والے کو الکشن میں کھڑے نہیں ہونے دیں گے اور آپ بولتے ہو مبارک ہو"

ہم نے پہلوان صاحب سے معافی مانگی اور آگے بڑھے ۔ اب جو شامت آئی تو سامنے سے چلے آرہے مولوی اشرف علی صاحب سے بھی کہا۔

مولانا نیا سال مبارک۔ ۔

مولانا ناک سکوڑ کر بولے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ " ۔ آپ تو پکے انگریز کی اولاد معلوم ہوتے ہیں ۔ بھائی میرے ، یہ ہمارا سال ہے ہی نہیں تم پر جوش انداز میں مبارکباد دیئے چلے جارہے ہو ۔ یہ غیروں کے طریقے ہیں انھیں چھوڑو ۔ مجھے تو ایسا معلوم دے رہا ہے کہ یہ آپ ہی تھے کہ جب انگریز ہندوستان چھوڑ کر جارہے تھے تو انھیں تسلی دے کر کہہ رہے تھے "حضور! آپ دل چھوٹا نہ کریں ہم تو فقط آپ کو ہی رہے ہیں آپ کی تہذیب اور طور طریقوں کو ہم اپنا سمجھ کر ان کی پوری حفاظت کریں گے ۔ اور آج بھی آپ لوگوں کے دم سے انگریزوں کو ہندوستان اپنا گھر معلوم ہوتا ہے ۔

گھر لوٹتے ہوئے میں نے دیکھا میرا دوست مبارک علی سائیکل پر سوار کہیں جارہا تھا ۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ اسے پکاروں ، مبارک! ذرا ٹھیرو "مگر میں رک گیا کیا پتہ کسی قرضدار سے جان بچا کر وہ جلدی جلدی کہیں جارہا ہو یا اس کی جان کسی ایسی مصیبت میں پھنسی ہو کہ آج اسے اپنا نام بھی سننا گوارا نہ ہو ۔

گھر پہنچ کر میں نے بچہ کے ذریعہ دودھ کا پیکٹ کچن میں بھجوادیا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے کا انتظار کرنے لگا ۔ دس منٹ کے بعد بیگم چائے لے کر حاضر ہوئیں۔

"نیا سال مبارک ہو"

"آپ کو بھی مبارک ہو اور جو خراب دودھ آپ لائے ہیں اس کی یہ پھٹی ہوئی چائے بھی مبارک ہو" ۔ یہ کہہ کر وہ چائے کا کپ پوری قوت سے ٹیبل پر پٹخ کر گذرے ہوئے سال کی طرح واپس چلی گئی ۔

مجھے اب نئے سال کے لئے ایک نیا عزم مل گیا ہے وہ یہ کہ اب کسی کو مبارکباد نہیں دوں گا ۔ مگر ہمارے سماج کی ان توبہ شکن حالات میں وہ وعدہ وعدہ ہی کیا! وہ عزم عزم ہی کیا جو توڑا نہ جائے ۔ میں جانتا ہوں میری اس جرات سے آپ کو تکلیف ضرور ہوگی اسی لئے ڈرتے ہوئے میرا دل کانپ رہا ہے پھر بھی جاتے جاتے کہہ ہی ڈالوں

"سال مبارک ہو!"

اقبال شانہ

غزلیں

چچا غالب سے گر رشتہ ترا طے ہوگیا ہوتا
تو " چاچی غالباً ہوتی بھتیجہ میں ترا ہوتا

مری موجودگی سے ہے یہ رونق اور ہنگامے
اگر پیدا نہ میں ہوتا تو پھر دنیا کا کیا ہوتا

یہ اچھا ہے کہ ایک در زن سے اپنی آشنائی ہے
وگر نہ قیس کی طرح میرا دامن پھٹا ہوتا

کسی بھی جولیٹ نے لفٹ نہ دی راہ الفت میں
وگر نہ آج مسٹر رومیو میں بن گیا ہوتا

خدا نہ خواستہ شادی ہماری گر نہیں ہوتی
تو بیگم اپنے چھوٹے چھوٹے ان بچوں کا کیا ہوتا

کسی حبشن سے بھی اے کاش اپنی عاشقی ہوتی
شمالی آفریقہ سے ہمارا رابطہ ہوتا

اگر سنجیدگی سے شاعری کرتا میاں شانہ
زمانہ آج تیری شاعری پر ہنس رہا ہوتا

عاشقی میں قلب صاحب تڑ پڑ ا کر رہ گئے
اور جگر صاحب بچارے پھڑ پھڑا کر رہ گئے

سامنے ان کو جو دیکھا ہڑ بڑا کر رہ گئے
ہوش صاحب تو ہمارے اڑ اڑا کر رہ گئے

اتنی بے دردی سے مارا اس نے چانٹا گال پر
دانت تقریباً ہمارے جھڑ جھڑا کر رہ گئے

کثرت سگریٹ نوشی سے ہوا سینہ خراب
پھیپھڑے موصوف من کے سڑ سڑا کر رہ گئے

اہلیہ نے رات بھر کھولانہ دروازہ مگر
ہم کو اڑ اپنے ہی گھر کا کھڑ کھڑا کر رہ گئے

چھاگیا ان کے بدن میں نوجوانی کا نشہ
بن پیئے ہی پاؤں ان کے لڑکھڑا کر رہ گئے

جو گرجتے ہیں سنا ہے وہ برستے ہی نہیں
سال بھر کھیتوں پہ بادل گڑ گڑا کر رہ گئے

سامنا کیا خاک کرتے دوستو شانہ غریب
سن کے بس آواز بیگم گڑ بڑا کر رہ گئے

دل میں کچھ عاشقی کے جراثیم ہیں
سر میں دیوانگی کے جراثیم ہیں

بندروں کو ذرا دیکھئے غور سے
ان میں سب آدمی کے جراثیم ہیں

رینگتے پھر رہے ہیں بدن میں میرے
یہ تری عاشقی کے جراثیم ہیں

کوئی وعدہ وفا نہ کیا آپ نے
آپ میں لیڈری کے جراثیم ہیں

زہر سے بھی جو کمبخت مرتے نہیں
وہ تمہاری گلی کے جراثیم ہیں

سن کے شانہ غزل لوگ کہنے لگے
آپ میں شاعری کے جراثیم ہیں

شیخ رحمن اکولوی
دیپک چوک، ہارون سیٹھ کی چال کے پاس
اکولہ444001

"درشن دور درشن کے"

زمانۂ قدیم میں ایران کے بادشاہ جمشید کے پاس ایک جام تھا، جس میں وہ ساری دنیا کا حال احوال دیکھ لیتا۔ اس دور میں ٹیلی ویژن ماڈرن سائنس کا وہ جام ہے جس کا بٹن دباتے ہی ہم دنیا جہاں کے حالات گھر میں چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے لیٹے لیٹے دیکھ لیتے ہیں۔ (کچھ لوگ تو سوتے میں اپنے من پسند پروگرام دیکھ لیتے ہیں اور خوش ہو لیتے ہیں)۔ ٹیلی ویژن کو ہم جادوئی جن مان لیں تو "اینٹینا" اس کی چوٹی ہے جس میں اس کی جان بسی ہے۔ ٹیلی ویژن ریڈیو کے آگے کی ایجاد ہے۔ ریڈیو سے جو آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچتی تھیں ٹیلی ویژن کے ذریعے چلتی پھرتی اور بولتی تصویروں کے ذریعے ہم تک پہنچنے لگیں دوسرے لفظوں میں جو ریڈیائی منظر اور پس منظر ہمارے لئے دور کے درشن تھے ٹیلی ویژن نے انکے ساکشات درشن ہمیں کرادیئے۔

ٹی وی کے فائدے: ٹی وی ہو تو مڈل کلاس سوسائٹی میں مڈل کلاس طبقے کے لوگوں کا سوشل اسٹے ٹس (social status) بڑھ جاتا ہے۔ (جبکہ ہائی کلاس سوسائٹی میں بینک بیلنس، عربی گھوڑے، اعلیٰ نسل کے کتے پرانی شرابیں، امپورٹیڈ کاریں، اور زیادہ عورتوں سے جنسی تعلقات، آدمی کا سوشل اسٹے ٹس بڑھائے ہوئے ہیں۔ اشرف المخلوقات پر کیا برا وقت آن پڑا ہے۔ جانور اس کے سماجی رتبے کا تعین کرنے لگے) ہم نے اپنے سوشل اسٹے ٹس کا خیال کرتے ہوئے گھر کی چھت پر اینٹینا لگوایا یعنی انگلی کٹاکر بلکہ ناخن کٹاکر شہیدوں میں اپنا نام لکھوایا۔ اینٹینا لگا ہو تو کون سوچ سکتا ہے کہ ٹی وی سیٹ نہیں ہوگا؟ کوئی پوچھ بیٹھے تو کہہ دیتے ہیں کہ ابھی ابھی کاریگر درستی کیلئے لے گیا ہے۔ کچھ فالٹ (fault) آگیا تھا۔

ٹی وی خبریں لو بلڈ پریشر کے مریض کا بلڈ پریشر بڑھا کر نارمل کرنے میں مجرب نسخے کا کام کرتی ہیں جبکہ کلاسکل گائن کے پروگرام ہائی بلڈ پریشر کے مریض کا بلڈ پریشر لو کرنے میں معاون و مددگار واقع ہوسکتے ہیں سماچار سے تبدیلئ موسم کی پیشگی اطلاع مل جاتی ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ موسم خشک رہیگا تو بارش کے ساتھ ساتھ اولے بھی پڑتے ہیں۔

ٹی وی پروگراموں سے جنرل نالج بہت بڑھ جاتی ہے۔ صابن، شیمپو، واشنگ پاؤڈر، ٹوتھ برش اور پیسٹ کے بارے میں تو ہماری نالج قابل رشک حد تک بڑھ گئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک صابن دوسرے صابن سے، دوسرا صابن تیسرے صابن سے اور تیسرا صابن چوتھے صابن سے کسی نہ کسی وجہ سے بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پچھلے دو ہفتوں سے فیصلہ نہیں کر پارہے ہیں کہ کون سا صابن، شیمپو، واشنگ پاؤڈر، ٹوتھ برش اور پیسٹ خریدیں۔ (سچ ہے کہ ہر چیز کی زیادتی نقصان دہ ہے چاہے جنرل نالج ہی کیوں نہ ہو)

اسی جنرل نالج کے بوتے پر ہی ہم نے ویسٹ انڈیز کو ایک علاحدہ ملک جانا ورنہ اب تک ہم اسے انڈیا ہی کا کوئی صوبہ سمجھتے آئے تھے ۔ ٹی وی کے اشتہاری فلموں سے ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں صابن ، ہیر آئیل ، شیمپو ، ٹوتھ برش اور پیسٹ ، واشنگ پاؤڈر ، کریم ، فنائل اور مچھر مکھی کا کروچ مار دوائیں بڑی مقدار میں بنتی ہیں (جبکہ دوسرے ممالک ایٹم بم ، روبوٹ ، خلائی راکٹ اور خلائی سیر کا پروگرام بنانے میں لگے ہوئے ہیں) صحیح تو ہے کہ پہلے گھر کی اور خود کی صفائی ہو جائے تو دوسرے معاملات دیکھے جائیں ۔ ٹی وی ہی کی بدولت ہمیں معلوم ہوا کہ کوئی " تیسری دنیا " بھی ہے ۔ اس سے عشاق حضرات کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوا ہے اب انھیں عشق میں دو کی بجائے تینوں جہاں ہارنے ہونگے ۔

ٹی وی کی اشتہاری فلمیں ہمیں بہت سی چیزوں کی خریداری سے محفوظ رکھتی ہیں مثلاً اے ون بروک بانڈ چائے کے بارے میں جب کہا جاتا ہے کہ " کڑک دل والوں کیلئے " تو ہم اسے نہیں خریدتے کہ بفضل تعالیٰ ہم تو ایک نرم دل انسان ہیں ۔ ملاکی تازہ چائے سے متعلق یہ مہمل الفاظ ہمیں اس کی خریداری سے باز رکھتے ہیں کہ " ملاکی تازگی آسمان سے اونچی " ۔ ذرا سوچئے جو لوگ اپنے پروڈکٹ (product) کی پبلسٹی کیلئے ڈھنگ کی اشتہاری فلم نہیں بنواسکے وہ کوئی اچھا پروڈکٹ (product) کیا خاک بنائیں گے ؟

بیشتر شوہر حضرات نے اپنے ہاؤس کو لاجنگ اور بورڈنگ ہاؤس بنا رکھا تھا ۔ ٹی وی پروگراموں کی وجہ سے گھروں میں ٹکنے لگے ہیں ۔ بیویاں خوش ہیں کہ اب انکے درشن دور کے درشن نہیں رہے ۔ (بیشتر شوہر حضرات کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ وہ بیوی کی روز روز کی تھک تھک سے بچنے کی خاطر ٹی وی پروگرام دیکھتے ہیں اس سے بیشتر باہر رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ۔

نقصانات : ٹی وی پروگراموں کا سب سے ضرر رساں پہلو یہ ہے کہ انسانی اخلاق و کردار پر ان کے انتہائی مہلک اثرات مرتب ہوئے ہیں ۔ مثلاً جتنے " صابن کی اشتہاری فلم کے یہ الفاظ دیکھیئے کہ " پہلا پیار لائے جیون میں بہار " اب کوئی بچہ / بچی اپنے والدین سے پوچھ بیٹھے کہ " یہ پہلا پیار کیا ہوتا ہے " " اور پہلا پیار ہوتا ہے تو دوسرا تیسرا چوتھا پیار بھی ہوتا ہوگا " یا یہ کہ پیار کا صابن سے کیا تعلق ہے " تو وہ اسے کیا جواب دینگے " پامولیو صابن کی اشتہاری فلم میں نفیسہ جوزف کا اپنی جلد کیطرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنا کہ " چھوؤ گے " ترغیب نہیں تو اور کیا ہے ؟

ٹی وی دیکھنا بینائی کو متاثر کرتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ تھوڑے ہی دنوں میں بلیک اینڈ وہائیٹ ٹی وی والوں کو بلیک اینڈ وہائیٹ چیزیں کبھی کبھار کلرڈ دکھائی دینے لگتی ہیں تو کلرڈ ٹی وی والوں کو کلرڈ چیزیں بلیک اینڈ وہائیٹ ۔

ہمارے ادھیڑ عمر زندہ دل شناسا چچا شبابی کی نزدیک کی نظر کمزور ہے ۔ کہتے ہیں " اچھا ہی ہے آس پاس رہنے والی تمہاری چاچی کا پوپلا منہ نظر نہیں آتا مگر ذرا فاصلہ کی آنی جاتی رونقیں صاف نظر آتی ہیں " ۔

جدید ترین سائنسی تحقیق کے مطابق ٹی وی دیکھنے سے حافظہ کمزور ہو جاتا ہے ۔ (یوں بھی زندگی کی کتنی باتیں ایسی ہیں جنھیں انسان یاد رکھنا چاہتا ہے) ٹی وی میں بچوں کی دلچسپی دن بدن بڑھتی جارہی ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ حافظہ کی کمزوری تعلیم کے معاملے میں انھیں قطعی ناکارہ کردے ۔ اور بھارت کو ڈاکٹر ، انجینیر ، سائنسداں دیگر ممالک سے درآمد کرنے پڑیں ۔ ٹی وی پر دلچسپ کرکٹ میچ ہو ، خوبصورتی کا مقابلہ ہو ، فیشن شو ہو ، فلم فیئر ایوارڈ فنکشن ہو یا سوپر ہٹ فلم یا سیریل روزمرہ کی زندگی الٹ پلٹ کر رہ جاتی ہے ۔ بیشتر لوگ تو ٹی وی پروگراموں کو ذہن میں رکھ کر روزمرہ کے پروگرام انجام دینے لگے ہیں یقین کیجئے کہ من پسند ٹی وی پروگرام کے وقت عوام الناس اسقدر غیر سماجی ہو جاتے ہیں کہ شادی بیاہ اور جنازے میں شرکت کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں وہ دن دور نہیں جب کسی شادی کا پروگرام اس طرح انجام پائیگا ۔

مادی کا مہورت: پروگرام "کیا کہتے ہیں آپکے ستارے" کے بعد

ن: سیریل کرشنا کے بعد کہ شری کرشنا کا آشیرواد بھی شامل حال ہوجائے

: دوپہر سماچار سے پہلے تک (کیا پتہ کوئی ایسا سماچار سننے کو مل جائے کہ بھوک اور پیاس ہی مرجائے)

میز کی نمائش: سپر "ٹی وی شاپنگ" شو کے بعد (تاکہ کسی نئی چیز کی فرمائش کی جاسکے)

ت: ذی ہورر شو سے پہلے۔

ن کی رخصتی: رات میں دیر سے فلم "ساس بھی کبھی بہو تھی" کے بعد

بیشتر حضرات کو ٹی وی اور بی وی میں مماثلت نظر آتی ہے۔ وہ ان دونوں کو ہم پلہ خیال کرتے ہیں۔ ہم نے معاملہ اس کے س پایا۔ ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے آپ ٹی وی کو اپنے اشاروں پر چلا سکتے ہیں۔ (بیوی کا کوئی ریموٹ ول نہیں ہوتا بلکہ وہی شوہر کا ریموٹ کنٹرول ہوتی ہے اور اسے اپنے اشاروں پر نچاتی ہے)۔ بیوی ایک بار شروع ہوجائے تو پھر کنٹرول نہیں کیا جاسکتا۔ ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول ایک مخصوص فاصلے اور زاویئے سے ہی ٹی وی کو کنٹرول کرسکتا ہے۔ جبکہ بیوی ں سے پرے بھی شوہر پر کنٹرول رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کیا مجال وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرسکے۔ ہر ٹی وی چینل کے دائرہ ایک حد ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی چینل کھیلوں کے لئے تو کوئی انگریزی فلموں کے لئے مخصوص ہے۔ بیوی کے کوئی حدود اربعہ نہیں۔ جہاں کے سبھی معاملات اس کی زد میں آتے ہیں۔ تاریخ اٹھاکر دیکھئے بڑی بڑی حکومتیں پلٹ دی ہیں اس صنف نازک نے۔ زیادہ ال سے ٹی وی اسکرین پر لکیریں ابھرنے لگتی ہیں۔ بی وی کو جھیلتے جھیلتے شوہر کی پیشانی پر پریشانی کی لکیریں مستقل طور پر ابھر آتی اور وہ صورت ہی سے شوہر دکھائی دینے لگتا ہے۔ آخری اسٹیج میں ٹی وی کی تصویر دھندلانے لگتی ہے تو ادھر شوہر کی نظر دھندلا جاتی ہے اس سماعت جواب دے جاتی ہے۔ ٹی وی پر آپ من پسند پروگرام دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن بیوی کی موجودگی میں آپ کو وہی دیکھنا اور تا ہے جو وہ آپ کو دکھانا اور سنانا چاہتی ہے۔ آپ کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ دوسری صورت میں گھر میں آئے دن مہابھارت ہتی ہے۔ (محلے والوں کو ٹی وی سیریل "مہابھارت" دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی)

ٹی وی پر باحمولا کینڈی کی اشتہاری فلم دیکھ کر کہ "جو بھی کھائے دوست بن جائے" ہمارے ایک دوست نے سوچا کہ اسے لیے وہ جان بوجھ کر دیر سے دفتر پہنچے۔ چپراسی نے انھیں بتایا کہ صاحب انھیں بار بار پوچھ رہے ہیں اور ... ت لال پیلے ہو رہے انھوں نے اس کی بات ان سنی کردی اور سیدھے صاحب کی آفس میں جا گھسے وہ انھیں دیکھتے ہی پھٹ پڑے ... آپ! ربانی کی۔ وقت کا کچھ خیال ہے آپ کو؟ اگر نوکری آپ کے بس کی بات نہیں ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے آپ کو تو کوئی بہت بڑا افسر ہونا چاہئے تھا۔ کلرکی آپ کے شایان شان نہیں ہے"۔ انھوں نے ان کی بات کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اور بھرپور مسکراتے ہوئے باحمولا کینڈی پیش کی "باحمولا کینڈی سر" پھر تو وہ ایسے بگڑے کہ کچھ نہ پوچھئے۔ قصہ مختصر ہمارے دوست ند" کردیئے گئے۔ سسپنڈ آرڈر میں لکھا تھا "صاحب نے کافی دیر سے آفس پہنچنے پر آپ کو ڈانٹا تو آپ نے باسولا کینڈی پیش م کا مذاق اڑانے کی کوشش کی ان کی توہین کی اور ان کی ڈانٹ کو بدہضمی سے پیدا شدہ چڑچڑے پن پر محمول کیا، اس لئے آپ کو دو سسپنڈ کیا جاتا ہے"۔

قارئین کرام! ہمارا یہ مضمون آپ کو کیسا لگا؟ دیئے گئے پتہ پر ضرور معلوم کیجئے اور اب اجازت دیجئے۔ انشاء اللہ جلد ہی دوسری ...۔ اس بریک کے بعد۔

پاگل عادل آبادی
عادل آباد ۔ اے پی

لیڈر کی وصیت بچوں کے نام

!

نیتاؤں کی ڈگر پہ بچو دکھاؤ چل کے
یہ ویلتھ ہے تمہارا کھا جاؤ اس کو تل کے

O

دو چار . . ے فوراً کھادی کے تم سلانا
پدیاترا کا ناٹک ہر روز تم رچانا
دو چار رٹ کے بھاشن دنیا اچھل اچھل کے

O

بدمعاش چور اچکے ڈاکو پٹائے رکھنا
پولس سے لائن اپنی ہردم ملائے رکھنا
مرڈر بھی کرنا بچو لیکن سنبھل سنبھل کے

O

خود کو منسٹروں کا چمچہ بنائے ر
بچھڑے کو اور ماں کو مسکہ لگائے ،
جیتوگے تم الیکشن اس آئیڈیے پہ چل

O

جھگڑے فساد دنگے فائرنگ کراتے
مذہب کا نام لے کر سب کو لڑاتے
گاندھی کا منہ چڑانا گاندھی بھون میں پل

O

بنکوں کو دینا دھوکا بم استعمال
الٹی چھری سے مرغے ہردم حلال
چورن بھی یوز کرنا مرغے نگل نگل

O

میری دعا ہے بچو لیڈر بڑے ہو تم
میری وصیتوں پہ فوراً عمل کرو تم
رکھدو گے ایکدن تم بھارت کو ہی نگل کے

محمد روشن علی کرنل
کریم نگر ۔ اے پی

غزل

اب سمجھ میں آگیا کیونکر ملا اتنا جہیز
" چار بیوی ، نوکری نیں ، عمر لبی بھوت ہے "
یوں تو لایا ہوں دبئی سے کام کی چیزیں کئی
وہ تو ماہر ہوگئیں جو ڈو کرانے کھیل میں

اونٹ کا قد ، رنگ کالا ، منہ پہ داغاں دیک
کہدیا پاسٹ اپنا ، ہاتھ بایاں دیکھ
ان کی باچھیں کھل گیئں میک اپ کا ساماں د
کانپتا ہے دل میرا اب ان کے شاناں دیک

آپ تو لے جارہے تھے جام کھانے باغ میں
اڑگیا کرنل وہاں سیندھی کے جھاڑاں دیکھ کر

ڈاکٹر سید عباس متقی

حیدرآباد

ڈاکٹر بابا

خدا لعنت کرے علم دشمنوں پر جنھوں نے ہماری اسنادات کو جعلی قرار دے کر ہمیں کہیں کا رہنے نہ دیا۔ اب پڑھے لکھے لوگ بھی ہمیں "جعلی سند" کے نام سے پکارتے ہیں اور ہم اس پر خدائے قہار کو پکارتے ہیں۔ اللہ اللہ کتنی امنگوں اور آرزوں سے ہم نے خامہ فرسائی کا مظاہرہ کرکے "ڈی ۔لٹ" کی ڈگری حاصل کی تھی، کیا خبر تھی کہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو آزادی کے بعد آزادی کا ہوا ہے ۔ ہر اچھی چیز عموماً غیر شریفوں کے ہاتھوں لٹ جایا کرتی ہے، خواہ وہ عصمت ہو یا عزت و شرافت جب ہماری شرافت کے گال جھوٹ کے طماچوں سے سرخ ہوگئے تو سرخرو ہونے کے لئے ہم نے اکبرالہ آبادی کے مشورے کو یاد کیا جو انھوں نے مزاحاً و طنزاً ہندوستان کے ان نوجوانوں کو دیا تھا جنھیں علم و لیاقت کے گناہ پر صلاحیت و جواہر کے جرم پر نکبت رسید کیا گیا تھا، اس مشورے کو ہم نے گویا حرز جاں بنالیا۔

باہنر بن کر جو چمکوں قوم کی گالی سنوں بے ہنر بن کر جو بیٹھوں طعنۂ حالی سنوں

متقی اکبر الہ آبادی نے دی اچھی صلاح پیر زادہ بن کے بیٹھوں اور قوالی سنوں

ہم مزاح اور طنز کے معاملہ میں بھی نہایت سنجیدہ ہیں ۔ نہایت خلوص دل سے دادا (حضرت) کی بوسیدہ قبر کو چونا ڈلواکر، "مور چھل" سنبھالا اور سجادہ نشینی اختیار کرلی ۔ اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ دادا حضرت کی روح پر مفتوح پر کیا گزری ہوگی ۔ لیکن ہماری سرخروئی کے اسباب تو مہیا ہوگئے ۔ ہمیں تو معلوم ہی نہ تھا کہ فیض کسے کہتے ہیں شکر ہے! ہندوستان آج بھی روحانیت کے ہاتھوں گرفتار ہے ۔ یہاں کے لوگ اس درجہ بھولے بھالے ہیں کہ ہر ہاتھ کی صفائی کو چمتکار اور ہر فریب کو کرامت سمجھتے ہیں۔ حال ہی کی بات ہے کہ کڑوے بابا کی کرامت سلو مودی نے کھول دی لیکن "ہنوز بابا بابا است" لوگ مودی کو جھوٹا سمجھتے ہیں بابا کو نہیں۔

دادا حضرت کی قبر کیا پختہ ہوئی، لوگوں کے عقیدے پختہ ہوگئے ۔ پہلے پہل دادا حضرت کی مزار پر چند فقیر سونے لگے اور ڈھنڈورا بجاکر اطراف و اکناف کے لوگوں کو "رجوع الی القبر" کیا کچھ روپئے کیا وصول ہوئے کہ کم بختوں نے اصول ہی بنالیا ۔ ہر جمعرات کو جمگھٹا ہوتا ۔ گلیجے کی پڑیاں فروخت ہونے لگیں ۔ برقعے اڈا آنے لگے۔

خواتین کی ضعیف الاعتقادی تو مشہور ہے ہی ۔ جب مزار چل پڑا تو کمیشن پر جھگڑے ہونے لگے ۔ ہمیں یہ منظور ہی نہ تھا کہ پیڑ ہم لگائیں اور پھل کوی اور کھائے ۔ غرض ہم نے فقراء اولین کو برخواست کردیا۔ اڈے کو بھانپ کر دانشمند فقیروں نے   ، ہمیں راضی کیا اور مطلوبہ کمیشن پر کاروبار کرنے لگے ۔عود لوبان ۔ ڈھبٹی ۔ بوندی ۔ نقل ۔ چادر ۔ غلاف ۔ ناڑے ۔ عرضیاں ۔ قفل ۔ دادا کی قبر پر جواب مزار شریف تھا ایک ہجوم و ہنگامہ کھڑا ہوگیا کبھی کبھی وہ خواب میں آکر کہتے اگر تو یہ ہنگامہ نہ رکوائے گا میں دعا کروں گا کہ تری قبر پر اس سے زیادہ ہنگامہ آرائی ہو ۔ ہم نے کہا "دادا نیکی اور پوچھ پوچھ آپ اس کی مطلق فکر نہ کریں ۔ آپ کے پوتوں پڑ پوتوں کا بھلا ہوگا ۔" معاشی بحران سے نجات اب مزاروں کے وسیلے ہی سے ممکن ہے ۔ جتنا بڑا مزار اتنا بڑا بینک بیلنس ۔

دادا حضرت سے جو لوگ واقف تھے وہ یا تو ملک عدم چلے گئے تھے یا سامان بھیج کر خود تیار بیٹھے تھے ۔ ان کے شوق فرمانے کے چرچے آپ ہی آپ خاموش ہوگئے ۔ یہ بات کون جانتا تھا کہ وہ ہر عید کے موقع پر خلوص دل سے نماز پڑھا کرتے تھے ۔ کسے خبر تھی کہ وہ مطبخ کے وار وتہ تھے اور ہندوستان کو دارالحرب جان کر اپنا روپیہ معروف رکھا تھا ۔ ہم لاکھ علوم دینیہ سے بے بہرہ و نکتہ ہائے تصوف سے نابلد تھے لیکن جوق در جوق مرید فرمانے لگے ۔ اور سال گزرا تو مریدوں کے بے حد اصرار پر رنگین صافہ باندھا اور قبر پر چراغاں کردیا ۔ جوں جوں قوالی میں فارسی کلام پڑھا جانے لگا وہ لوگ جو اردو سے بھی ناواقف تھے جھوم جھوم کر نذرانے دینے لگے ۔ چنانچہ ایک مرید صادق اور صاحب مال " اما تو چیزے دیگری " پر وجد کرنے لگے پھر رقص کرتے ہوئے قوال کو اصلاح دی ۔ "ماموں تو چیزے دیگری" ـــــ "ماموں تو چیزے دیگری" ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف نے   "اماں" کا پیار نہ پایا تھا "ماموں" سے پرورش پائی تھی اسی لیے مصرعہ میں ترمیم کے خواہاں تھے سننے والے جلا ہوں تو کیا ہمیں پڑی ہے کہ فارسی کی "اما" اور اردو کی "اماں" میں فرق سمجھائیں ۔ چنانچہ قوال بھی وجد میں آکر "ماموں تو چیز سے دیگر" شروع ہوگیا ۔ نوٹوں کی وہ بارش ہوئی کہ ہم اس بارش میں یہ بھول گئے کہ ہماری اسنادات جعلی قرار دی گئی ہیں اور ہم اپنی یونیورسٹی کے ایک ناخلف ، نابکار و ناہنجار فرزند ہیں ۔ واقعی جب ھن برستا ہے تو سفلے اشراف اور کمینے اکابر گردانے جاتے ہیں ۔

ع "دیکھو ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"

آبرو جسے کہتے ہیں آج دولت کے ساتھ بطور "گفٹ" ملتی ہے چنانچہ کتنے ایسے ہیں کہ اگر دولت مند نہ ہوتے تو کوئی انہیں پوچھتا تک نہیں جب سے ہم پیری مریدی کرنے لگے " چھوچھا " کی عادت بھی پڑگئی جب ہجوم بڑھ گیا تو ہم نے "اسسٹنٹ" مقرر کرلیئے جو   ۔لیمو کاٹ کاٹ کر شیطانوں کا ناس کرنے لگے ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ محلہ میں لیمو کا کاروبار چل نکلا۔ پچھواڑے میں لیمو کی منڈی قائم ہوگئی ۔ جہاں بڑے ہوتے میں وہاں چھوٹے کیوں آنے لگے ۔ شیاطین مقرر کیا ہوئے چرچا مزید بڑھ گیا چرچا کیا بڑھا کہ ہم نے اپنے گیسو بڑھالئے ،

ں طویل گیسو کے بغیر عامل دکھائی نہیں دیتا۔ بیگم کو شغل ہاتھ آیا ہماری چوٹیاں گوندھنے لگیں۔ اچھا ہوا کہ یہ دورِ خطابی نہیں ورنہ چوٹیاں ہاتھ میں آجاتیں سر پر استرا پھر جاتا بلکہ تادم آخر پھرتا ہی رہتا۔ اجلی پوشاکوں میں سیاہ دل اور لوبان کی لپٹوں میں سیاہ کاری پروان چڑھنے لگی۔ فریب دیکر آسیب ہٹاتے۔ گنڈوں سے کمپیوٹر کا م لیتے پانچوں گھی میں تھیں۔ نام ہوا تو سیاست دان بھی مائل ہوئے۔ سیاست اور توہم پرستی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے ہم نے جو پیشن گوی کا افسانوی سلسلہ شروع کیا کوٹھی نیتاؤں کی آماج گاہ بن گئی ہر شخص کے منشا کے مطابق پیشن گوی کرنے لگے۔ وہ پیشن گوی ہی کیا جو منشا سے ہم آہنگ نہ ہو۔ کوی یہ دریافت نہیں کرتا کہ ملک و لت کا کیا ہوگا سب یہی پوچھتے۔ شاہ صاحب! میرا کیا ہوگا میری کرسی کا کیا ہوگا اور ہم کچھ ایسی سیاسی جواب دیتے جو ہر اعتبار سے نامکمل و مہمل ہوتا۔ مقصد کے اندھے لفظوں کے ہیر پھیر کو کہاں سمجھتے ہیں یہ وہ سمجھتے ہیں جو اپنے لئے بہتر سمجھتے ہیں لیڈروں سے دوستی میں اگر کالا دھن سفید نہ ہو تو ایسی دوستی پر لعنت ہے۔ جائیدادوں کی خرید و فروخت ان حضرات کے تعاون کے بغیر ممکن کہاں۔ ایک آدھ بار جو دادا کی درگاہ پر ایمانی ہاتھوں پر جو سہلہ باندھا سر بلندی کے اسباب مہیا ہوگئے۔ دستار اور کشادہ دستی میں کتنی ہم آہنگی ہوتی ہے۔

لوگ جب "گھوڑے کی قبر" پر عقیدۃً "سہرا" باندھتے ہیں اور عرضیاں لٹکاتے ہیں۔ یہ تو ایک جیتے جاگتے انسان کا مزار تھا۔ ہمارے دادا کوئی بادشاہ تو تھے نہیں کہ ان کے اعمال زبان زد خاص و عام ہوں اس گمنامی کا فائدہ اٹھاکر ہم نے موصوف کے نام سے پہلے ایک اکیڈمی اور پھر ایک درس گاہ قائم کی اور چندوں کے لئے دنیا کی سیر کرنے لگے۔ آم کے آم گھٹلیوں کے دام والا معاملہ تھا۔ جس ملک میں جاتے رٹی ہوی تقریروں سے بازار گرم کر لیتے۔ گو دوسری مرتبہ بازار میں ایسی گرمی نہ ہوئی لیکن عقلمند پہلی عزت ہی کو غنیمت جانتے ہیں۔ اب تو ہم ان دروغ گو شیاطین اور فتنہ آثار لوگوں کو دعا دینے لگے جنھوں نے جھوٹ بول کر ہماری اسنادات کو جعلی قرار دیا تھا اور ہمیں جعل سازی کی راہ دکھائی تھی۔ میرا من نے صحیح کہا تھا "آدمی کا شیطان آدمی ہے" اگر ہماری اسنادات جعلی قرار نہ دی جاتیں تو خود۔ ملازم ہوتے اب بیسیوں کو ملازم رکھتے ہیں اور ان بے چاروں پر رعب جما کر اپنی رعونت کو چار چاند لگاتے ہیں۔ اپنی بے اصولی کا بھی ایک اصول بنایا ہے کروڑوں وصول کرتے ہیں لاکھوں خرچ کرتے ہیں دنیا لاکھ ہمارے خود ساختہ "کفاف" کو برا بھلا کہے۔ ہمیں اس سے لینا دینا کیا حیا چھوڑ دی ہے جو چاہیں گے کریں گے۔ لوگ عبادت گاہوں کو ڈھاکر ڈھٹائی سے گھومتے ہیں۔ غت ربود کرکے صدارتیں کرتے ہیں ہمیں کیا پڑی ہے کہ لوگوں کو الو بناکر خود الو کی طرح دبکے بیٹھے رہیں۔ ہمارے پاس کیا ہے۔ رب العالمین اللہ کا ثاث پر سونے کی گفتگو کرتے ہیں سونے پہ سوتے ہیں پیٹ پر پتھر والی حکایت بیان کرتے ہیں مرغ و ماہی اڑاتے ہیں۔ ایثار کا درس دیتے ہیں اپنا گھر بھرتے ہیں محبت کا سبق رٹتے ہیں دل میں نام کو وفا نہیں بلکہ ہمیں محبت سے نفرت ہے لوگ کیا جانیں کہ یہ نفرت بھی محبت کی دین ہے۔ کسی سے محبت نہ ہوتی تو محبت سے یوں نفرت نہ ہوتی عقیدت مندوں کی بھیڑ لگا رکھی ہے! کیا یہ خود ایک کرامت نہیں۔ لوگ ہماری بد اخلاقی کو ہمارا کمال اور ہماری بے اعتنائی کو ہماری بے نیازی خیال کرتے ہیں۔ ساری قوم نے الٹا درس لیا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ احمقوں سے نفع نہ اٹھانا خود ایک عظیم حمق کے مترادف ہے۔

تین صوبوں میں حکومتیں گنوا کر چکانی پڑی۔ اب پیاز کی دیکھا دیکھی آلو اور ٹماٹر نے بھی اپنے بھاو بڑھادئے اور ان کی گرانی نے جلتی پر آگ کا کام کیا اور حکومت کے لئے عوام کو جواب دینا مشکل ہوگیا اس پر ناکامی کا ٹھپہ لگ گیا اور پچھلی تمام حکومتوں کی ناکامیاں بھی اس کی جھولی میں ڈال دی گئیں۔ پیاز کے بھاو بڑھنے پر بعض لوگ تو بوکھلا گئے اور انھوں نے اپنی بوکھلاہٹ اور ناراضگی کا طنزیہ مبالغہ سے اظہار شروع کردیا۔ کسی کو خواب میں پیاز ہی پیاز نظر آرہی ہے تو کوئی ایک پیاز کی گٹھی ہاتھ میں لئے بھاگتا پھر رہا ہے کہ اسے کہاں چھپائے۔ کسی خاتون نے پیاز کے زیور پہننے شروع کردیئے تو کسی نے سونے کے بجائے پیاز خریدلی۔ کوئی پیاز (وہ بھی ایک دو کیلو) بنک کے لاکر میں رکھانے کے چکر میں ہے تو کوئی جہیز میں پیاز مانگ رہا ہے غرض عجیب و غریب اور دلچسپ بوکھلاہٹیں پڑھنے کو ملیں۔

مہنگائی اور متوسط طبقہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ طبقہ ہمیشہ مہنگائی کا مارا ہوا یا ادھ مرا ہوتا ہے۔ مہنگائی دراصل قوت خرید اور بازار کے بھاؤ کا توازن ہے۔ غریب کی قوت خرید ہوتی ہی نہیں اور امیر کی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہوتی ہے اس لئے دونوں مہنگائی سے غیر متاثر اور بے نیاز ہیں۔ ہمیں وہ قصہ یاد آرہا ہے جب راستے سے گزرتے ہوئے ایک بچے نے اپنے غریب باپ سے اونٹ خریدنے کی فرمائش کی جو ایک ٹکے میں ہراج ہو رہا تھا تو باپ نے کہا بیٹا بہت مہنگا ہے۔ چند دن بعد جب وہ امیر ہوگئے تھے تو بچے نے پھر باپ سے اونٹ خریدنے کی فرمائش کی جو سو ٹکے میں بک رہا تھا۔ باپ نے کہا بیٹا خرید لے بہت سستا ہے آج سے تیس چالیس سال پہلے تک پرانے شہر کی چھوٹی چھوٹی ہوٹلوں (چائے خانوں) پر بورڈ آویزاں ہوتے "روٹی کے ساتھ دال فری" یہ دال پتلی ہوتی تھی یا گاڑھی ہمیں پتہ نہیں لیکن دال تو بہر حال ہوتی ہوگی۔ یہ دال کی ارزانی کا ثبوت تھا۔ گوشت اتنا ارزاں تھا کہ سب ہی گوشت خور تھے دال کھانے والے کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا اور "دال خور" کہہ کر چڑایا جاتا۔ حتیٰ کہ کسی کی بزدلی اور بہادری کا تعلق بھی اسی سے تھا اور یقیناً دال خور بزدل ہوا کرتا تھا "دال خور" کی پھبتی ایک مخصوص طبقہ پر چسپاں تھی جو لین دین کا کاروبار کرتا تھا۔ دال کو حقارت سے دیکھنے کے باوجود اس کی افادیت سے انکار ناممکن تھا۔ چنانچہ ایک مقولہ تھا "دال بچے پال" اور واقعی لوگ دال کے سہارے دس دس بچوں کو آسانی سے پال لیتے تھے۔ دال روٹی انکساری کی انتہا تھی جب بھی کوئی کسی کو کھانے پر مدعو کرتا تو ازراہ انکساری کہتا "جو بھی دال روٹی حاضر ہے" ایک بار ایک شخص نے حضرت شیخ سعدی کو دال روٹی کھلائی تو جب تک وہ کھاتے رہے یہی کہتے رہے کمبخت نے جو کہا وہی کھلایا۔

رفتہ رفتہ گوشت نے اپنا بھاو بڑھاکر عام آدمی کی دسترس سے باہر ہونا شروع کیا تو لوگوں نے "بڑے" کو چھوٹے کی صف میں لاکھڑا کیا اور پھر دالوں پر بھی نظر کرم ہونے لگی اس نظر کرم نے دالوں کے بھاو بڑھادئے اور وہ بھی خریدار کی دسترس سے دور ہوتی نظر آرہی ہیں اب دال کھانا بھی قدرے مشکل ہورہا ہے۔ اور یوں بھی دیکھا جائے تو دالیں بھی غذائیت میں گوشت سے کم نہیں ہوتیں۔ ماش کی دال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گوشت کی رشتہ دار ہے۔ چنے کے بارے میں مشہور ہے "جو کھائے چنا وہ رہے بنا"۔ یقین نہ ہو، تو گھوڑے کو دیکھ لو۔ مسور کی دال یوں تو بدنام ہے کہ اس کے کھانے سے کینسر جیسا مہلک مرض لاحق ہوتا ہے لیکن اس کی اہمیت کچھ اتنی

زیادہ ہے کہ کسی آلتو فالتو کو اسکے کھانے کی اجازت نہیں، اس پر ایک پھبتی بھی بنی ہے "یہ منہ اور مسور کی دال"۔
جب بھی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں تو لوگ مقدار کم کر کے حساب برابر کر لیتے ہیں جیسے گوشت۔ یوں تو گوشت روز ہی بکتا ہے لیکن اتوار یعنی چھٹی کے دن دکان پر بڑا ہجوم رہتا ہے۔ چھان بین سے پتہ چلا کہ لوگ ہفتہ بھر تھوڑا تھوڑا گوشت کھا کر ترسنے کے بجائے ایک ہفتہ کا گوشت ایک ہی دن میں جی بھر کر کھا لیتے ہیں کیوں کہ اس دن ان کا لنچ گھر پر ہی ہوتا ہے۔ بہر حال لوگ جوں توں کر کے مہنگائی سے نباہ کر ہی لیتے ہیں۔
جہاں سستے زمانے میں روٹی کے ساتھ دال "فری" ملتی تھی وہیں مہنگائی کے زمانے میں بعض تعیشات کی چیزوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی چیزیں مفت ملنے لگی ہیں جیسے فرج۔ ٹی۔ وی کے ساتھ الکٹرک آئرن۔ ٹوسٹر ٹو ان ون وغیرہ وغیرہ حتیٰ کہ واشنگ پوڈر کے ساتھ ایک ٹائلٹ سوپ مفت مل رہا ہے۔ ایسے اشتہار دیکھ کر ہمیں روٹی کے ساتھ دال "فری" والے دن یاد آجاتے ہیں۔ غرض ہر دور میں خریدار کی قوت خرید کو مہمیز لگانے کے لئے ایسے ہتھکنڈے آزمائے جاتے رہے ہیں۔
مہنگائی نے لوگوں کو خود غرض بنا دیا ہے اکثر صدر خاندان یا وہ نوجوان جو کچھ چھوٹی موٹی کمائی کر لیتے ہیں اپنی پسند کی چیزیں بازار میں ہی کھا لیتے ہیں کہ ان خوردنی اشیاء کا خرچ اپنے اہل و عیال کے لئے برداشت کرنا ان کی سکت سے زیادہ ہے آج کل بیکریاں بھی ہوٹل کا منظر پیش کر رہی ہیں لوگ بیکری میں ہی کھڑے کھڑے اپنی پسند کی چیز کری پفس۔ کیک پیسٹری۔ بسکٹ وغیرہ کھا لیتے ہیں اسی طرح میوے کے ٹھیلوں پر لوگ ایک سیب۔ دو موز دو سنترے خرید کر کھا لیتے ہیں اور منہ پونچھتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔
یہ لیل و نہار کو دیکھ کر ہمارے ذہن میں ایک خیال ابھرتا ہے کہ اگر مہنگائی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو کیا وہ وقت بھی آئے گا جب لوگ دال کھانا بھی اکیلے اکیلے ہوٹل میں کھا لیں گے اور گھر والے ٹھنڈا پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کریں گے۔ مگر کیا اس وقت صاف اور ٹھنڈا پانی بھی ملے گا۔ پانی جیسی قدرتی اور بہ افراط پائی جانے والی شئے کو عنقا کرنے کے لئے ہمارے ارباب اقتدار نے ابھی سے اقدامات شروع کر دیئے ہیں۔

حیدر بیابانی

بوڑھے کی جوانی

ڈاکٹر نے بوڑھے سے جب کہا کہ دادا جی
آپ جو کہ بوڑھے ہیں ضعف سے پریشاں ہیں
آپ کو میں اب ایسی سوئی اک لگاؤں گا
ایک پل ذرا ٹھہریں نوجواں بناؤں گا
گڑ بڑا گیا بوڑھا گڑگڑا کے بول اٹھا
یوں نہ کیجئے صاحب ورنہ بھاگ جاؤں گا
میں اگر ضعیفی میں نوجوان بن بیٹھا
مل رہی ہے جو پنشن اس کو بھی گنواؤں گا

محمود شریف محمود
حیدرآباد

غرور حسن

اپنے گھونگٹ کو اٹھاکر ، "دیکھو ادھر" اس نے کہا
پھر مجھے پھیکا لگے "حسن قمر" اس سے

اس کا چہرہ دیکھ کر جب محو حیرت میں ہوا
ہائے اللہ ، مت لگا مجھ کو نظر اس نے

میرے عاشق آئے گا اب کچھ محبت کا مزہ
شوخ نظروں سے کلیجہ کاٹ کر اس نے

میں جو بولا ، تیرے ہاتھوں پر نہیں رنگ حنا
چاہیئے ان کو ترا خون جگر اس نے

نرم و نازک انگلیوں پر زندگی بھر ناچنا
ہے اگر مجھ کو بنانا ہمسفر اس نے

بول قاضی سے پڑھا کر اس کو جب اپنا لیا
اب مزہ آئے گا دیکھو عمر بھر اس نے

شاعری میں کس قدر تو رات دن ہے کھو چکا
مجھ سے کتنا ہوگیا ہے بے خبر اس نے

تیری یہ محمود غزلیں میری سوکن ہوگئیں
ایک دن پھینکوں گی ان کو پھاڑ کر اس نے کہا

فرید سحر
نرساپور، ضلع میدک (اے پی)

غزل

شادی کر کے نبھانا بڑی بات ہے
روز آنسو بہانا بڑی بات ہے

ان کی الفت میں ہم بھی گرفتار ہیں
ان کو سر پر بٹھانا بڑی بات ہے

سبکو الو بناتے ہیں نیتا مگر
ان کو الو بنانا بڑی بات ہے

دعوتیں ہو رہی ہیں امیروں کی اب
بے کسوں کو کھلانا بڑی بات ہے

سن کے میری غزل سب یہ کہنے لگے
ایسی غزلیں سنانا بڑی بات ہے

چٹکلوں سے ہنسانا تو مشکل نہیں
شعر کہکر ہنسانا بڑی بات ہے

ترچھی نظروں سے ہمکو تو لگتا ہے ڈر
ان کا گھونگھٹ اٹھانا بڑی بات ہے

راہِ ایماں پہ چلتے ہوئے دوستو
چار پیسے کمانا بڑی بات ہے

شاعری اتنی آساں نہیں ہے سحر

بابو آر۔ کے
اچل پور سٹی

اکیسویں صدی..... اور ہم

ہمارے دوست خاں صاحب بھی عجیب آدمی ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے۔ اکیسویں صدی کا بھوت اپنے سر پہ سوار رکھتے ہیں۔ دن رات اکیسویں صدی کا ذکر کئے جاتے ہیں۔ اکیسویں صدی سے خود بھی ڈرتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوف دلاتے ہیں۔ اس صدی کے شب و روز کو وہ قیامت سے ذرا بھی کم تصور نہیں کرتے۔ نت نئے حالات و واقعات کو اس صدی سے منسوب کر دینا تو جیسے ان کی عادت بن گئی ہے۔ انھیں یقین ہے کہ اس صدی میں شادی کے بعد رخصتی، بجائے لڑکیوں کے لڑکوں کی ہوگی اور ہنی مون منانے کے لیے مریخ و زہرہ بھی استعمال میں آسکتے ہیں۔ عالم اسلام کے متعلق ان کی پیشن گوئی ہے کہ اس صدی میں مسلمان، رویت ہلال کے بعد مہینوں کے تعین پہ دست و گریباں ہوں گے، یعنی ایک گروہ جس مہینہ کو شوال کہے گا اسی مہینے کو دوسرا گروہ ذیلقعدہ تو تیسرا گروہ ذی الحج سے تعبیر کرے گا۔ الغرض اکیسویں صدی کو انہوں نے ہوّا بنا کر چھوڑا ہے۔

ایک شام حسب معمول، یہی خان صاحب، ہمارے گھر آئے اور آتے ہی اکیسویں صدی کا جاپ شروع کرتے ہوئے بولے۔

" اماں جناب کچھ خبر بھی ہے؟" ہم حیران ہو کر انہیں گھورنے لگے؟ وہ بولے۔ اکیسویں صدی کی آمد آمد ہے۔ ہم نے کہا آنے دیجیے یہاں کون ڈرتا ہے؟ کہنے لگے۔ آپ بھلے ہی نہ ڈریں، ہم تو اس کے نام سے ہی خوف کھاتے ہیں۔ اس صدی میں انسانی قدروں کی پامالی، سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی اور زمانے کی نیرنگیاں کیا کیا گل کھلائیں گی یہ سب سوچ کر ہم تو دانتوں تلے انگلیاں دباتے ہیں۔ ہم نے کہا، دیکھیے خاں صاحب، دانت بھی آپ کے اور انگلیاں بھی آپ کی..... جو دل میں آئے کیجیے۔ انگلیوں کو دبائیے چبائیے یا کھا جائیے ہم کون ہوتے ہیں آپ کو روکنے والے۔ ہمارے اس روکھے جواب کا نوٹس لئے بغیر وہ بولے..... " اماں جناب، سب سے پہلے تو اس صدی میں خونی رشتوں کی طوطا چشمی دیکھنے اور بھگتنے کے لیے ہمیں تیار رہنا ہوگا۔ یہ بات بھی آپ نوٹ کر لیں کہ اس صدی میں خواتین حاکم تو مرد محکوم ہوں گے، عورتیں بازاروں میں کاروبار کریں گی اور مرد گھروں کو گرہستنوں کی طرح زینت بخشیں گے۔ اس صدی میں گھر کے بڑے بوڑھوں سے رعب داب جمانے کی صفت بھی چھن جائے گی۔ اس وقت یہ نہیں چلے گا کہ ہم نے جب چاہا بچوں کو ڈانٹ دیا اور جب چاہا گھر میں آئے اور گھر سے گئے۔ یہاں تک کہ رات میں کھانسنے کھنکارنے اور تھوکنے کی آزادی بھی بزرگوں سے چھین لی جائے گی..... اور پھر گلوگیر لہجہ میں وہ بولے، اتنا ہی نہیں بلکہ بزرگوں کو ناکارہ پرزے کی طرح گھر کے کسی گوشے میں پھینک دیا جائے گا۔ بزرگوں کی اس قدر خاکہ بندی کا احوال سن کر ہماری آنکھیں بھر آئیں۔ ہم نے دو ٹوک لہجہ میں کہا۔ خدا غارت کرے اس کو جو اکیسویں

صدی میں قدم بھی رکھے ارے، ہم تو ۲۰۰۱ء کی پہلی ساعت میں ہی اپنا گلا گھونٹ لیں گے لیکن اکیسویں صدی میں داخلہ نہیں لیں گے

الغرض اکیسویں صدی پہ تبادلہ خیال کرنے کے بعد خانصاحب اپنے گھر چلے گئے اور ادھر ہم..... بستر پہ لیٹے لیٹے اکیسویں صدی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کی ادھیڑ بن میں لگ گئے۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں یہ ہوا کہ۔ جو خانصاحب ابھی ابھی مونچھوں سے عاری چہرے کے ساتھ ہمارے پاس سے اٹھ کر گئے تھے وہی خانصاحب لحیم شحیم مونچھوں کے ساتھ وارد ہوئے۔ انہیں اس طرح مونچھ بردار دیکھ کر ہم حیران ہو کر بولے، ارے بھئی خان صاحب۔ یہ مصیبت آپ نے کب سے پال لی۔ ابھی ابھی تو آپ کا چہرہ مونچھوں سے عاری تھا پھر یہ مونچھیں کیسے آپ کے چہرے پر طاری ہو گئیں؟ خاں صاحب مونچھوں پہ ہاتھ پھیر کر بولے اماں جناب یہ مونچھیں اپنی تھوڑی ہیں۔ یہ سن کر ہم نے کہا کیوں مذاق کرتے ہو خاں صاحب، آپ کے چہرے پہ مونچھیں تو آپ ہی کی ہوں گی نا؟ وہ بات کاٹ کر بولے، نہیں بھائی نہیں، یہ مونچھیں تو اپنے میر صاحب کی ہیں۔ ہم پہ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے..... تو پھر میر صاحب کا چہرہ کہاں ہے؟ وہ انہیں کے پاس ہے لیکن ان کی مونچھیں (مونچھوں پہ تاؤ دیکر) ہمارے پاس ہیں۔ ہم نے کسی قدر چڑ کر کہا۔ خیر بتلایئے کہ میر صاحب کی مونچھیں آپ کے چہرے پہ کیا کر رہی ہیں؟ وہ بولے لو اور سنو، آدمی کے چہرے پہ مونچھیں کوئی ہزار دو ہزار کاموں کی انجام دہی کے لئے تھوڑی ہوتی ہیں۔ اماں جناب، مونچھوں کا کام تو مردانگی کا اظہار کرنا ہوتا ہے سو، وہی کام یہ کر رہی ہیں۔ ہم نے کہا "مردانگی کا اظہار تو وہ میر صاحب کے چہرے پہ رہ کر بھی کر سکتی تھیں۔"۔ "اماں جناب۔ یہی تو مشکل ہے کہ یہ کام وہ وہاں کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اپنے میر صاحب کا سراپا مردانہ کم اور زنانہ زیادہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ شریف النفس اور تھوڑے بزدل قسم کے آدمی بھی واقع ہوئے ہیں۔ اور اس پہ افتاد یہ کہ مونچھوں کی مردانہ صفات نہ رکھنے کے باوجود آپ مونچھیں رکھنے کا ارمان بھی رکھتے ہیں۔ اب آپ ہی کہیے کہ میر صاحب جیسا ڈرپوک طبیعت کا شخص اگر اپنے نحیف و لاغر جسم پہ مونچھوں کا اضافہ کر لے تو وہ مونچھوں کے زعم میں آکر خواہ مخواہ ہی مار کھاتا نہیں پھرے گا" بس یہی سب سوچ کر انہوں نے ہماری مردانگی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے یعنی ہمارے اوپری ہونٹ اور ناک کے بیچ کی راہداری کو انہوں نے لیز (Lease) پر حاصل کر لیا اور اس طرح ایک معاہدہ کے تحت انہوں نے اپنی مونچھیں ہمارے چہرے کے حوالے کر دیں۔" ہم نے ان سے معاہدہ مونچھ کی تفصیل جاننی چاہی..... تو وہ بولے معاہدہ کی رو، سے اپنی مونچھوں کی پرداخت اور تراش خراش کے معقول اخراجات وہ ہمیں دیتے رہتے ہیں اور جواب میں ہم لڑائی جھگڑوں یا تو تو میں میں کے مواقع پہ ان کے ساتھ رہتے ہیں تاکہ ایسے نوجداری حالات میں وہ ہمارے رعب دار چہرے پہ لگی ان کی مونچھوں پہ تاؤ دے سکیں۔ یہ سن کر ہم نے کہا، خدا جانے اکیسویں صدی میں اور کیسے کیسے معاہدوں کے مشاہدات سے ہمیں گذرنا ہوگا..... اچھا یہ بتلایئے اس وقت آنا کیسے ہوا" وہ بولے بس یونہی داڑھی کے سلسلے میں چلا آیا۔ ہم نے حیرت و استعجاب میں ڈوب کر کہا۔ اب مونچھوں کے بعد یہ داڑھی کا کیا ماجرا ہے" کہنے لگے یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم آپ کے صاف و پاک کردار کے ہمیشہ ہی سے قائل رہے ہیں اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ داڑھی جیسی سنت عظیم کے مطلوبہ تقاضوں..... سے ہماری شخصیت میل نہیں کھاتی..... اس لیے اس سلسلہ میں ہم آپ سے معاہدہ کرنے آئے ہیں جس کی رو سے ہم آپ کی تھوڑی (ٹھوڑی) لیز پہ لے کر اپنی داڑھی اس پر چھوڑنا چاہتے ہیں..... اور اس طرح معاہدے کی تکمیل کے بعد جہاں خاں صاحب اپنے چہرے پر میر صاحب کی مونچھیں لیے پھرتے ہیں وہیں ہم اپنے چہرے پہ خان صاحب کی داڑھی سجائے رہتے ہیں۔ جس طرح میر صاحب اپنی مونچھوں کے وقار کے لیے خان صاحب کی مردانگی کی خبر وقفے وقفے سے لیتے ہیں اسی طرح خان صاحب بھی اپنی ریش مبارک کی پاکدامنی کے سبب ہمارے.... چال چلن کو ہفتہ پندرہ دن میں دیکھنے پرکھنے کے لیے چلے آتے ہیں۔ ایک رات خان صاحب کی اسی داڑھی کیساتھ، ہم اپنے گھر میں تھر تھر کانپتے داخل ہوئے ہی تھے کہ اس دوران بیگم نے جھٹ سے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا اور ہمیں گھر کے

ایک گوشہ میں لے گئیں اور سرگوشی میں دانت پیس کر بولیں۔ارے میں کہتی ہوں یہ اکیسویں صدی ہے اکیسویں صدی، اس صدی میں تمہاری بیسویں صدی کی من مانی نہیں چلنے والی۔آج پھر آپ رات میں گیارہ بجے لوٹے ہیں۔میں کہتی ہوں بیٹا خفا نہیں ہوگا تو کیا خوش ہوگا؟ کیا آپ پرسوں کی ڈانٹ اور کل کی مار بھول گئے۔ارے کچھ تو باپ کے رتبہ کا لحاظ کرو اپنی داڑھی اور جوان بیٹے کی مونچھوں کا کچھ تو پاس رکھو۔کیوں آئے آئے دن بیٹے کی ڈانٹ پھٹکار سنتے ہو اور مار کھاتے ہو..... ارے جاؤ جاؤ..... اب ہمارا پارہ بھی اوپر چڑھ گیا۔کیسے نصیحت کرتی ہو، خود تو بڑھاپے میں بہو سے چوٹیا کھنچواتی ہو اور ہمیں پارسائی جتاتی ہو۔ابھی تو کھلے بلتے ہی تو بہو نے تمہارے پورے ایک مٹھی بال نوچ لیے تھے یا نہیں؟ بولو بولو ارے پہلے تم خود اپنے طور طریقے بدلو پھر ہمیں نصیحت کرو۔

ہماری اس تو تو میں میں پر بیٹا بہو اپنے کمرے سے نکل کر ہمارے پاس آئے۔بہو ہمیں گھور کر دیکھتے ہوئے ماتھا پیٹ کر بولیں ہائے اللہ، کم از کم اکیسویں صدی میں تو ایسے دقیانوسی بزرگوں سے پالا نہیں پڑنا تھا۔پھر وہ ہمارے بیٹے اور اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر بولیں، سنو جی، میں تو کہتی ہوں آپ بھی اکیسویں صدی سے فائدہ اٹھائیے لو کچھ سوچ وچار کرو مت اور بدل ڈالو۔وہ دیکھو کل ہی آسنسول سے میرے چچیرے بھائی کا خط آیا ہے اسے تو اپنے ممی پاپا بدلے پورا ایک مہینہ ہوگیا..... اور پھر آج کل ویسے بھی ماں باپ بدل دینے کی ہوڑ سی لگی ہے۔اخبارات میں بھی معمر لوگ اس قسم کے اشتہار دے رہے ہیں۔اس لیے جتنی جلد ہوسکے یہ کام کر ڈالو۔بدل ڈالو۔یہ سنتے ہی ہم نے اپنے بیٹے بہو کے حضور گڑگڑاتے ہوئے التجا کی۔" نہیں بیٹے نہیں خدا کے واسطے ہمیں نہ بدلو دیکھو بیٹے تم لوگ ہمیں ایک آخری موقعہ دو۔اس دوران اگر ہم نے اپنے آپ کو نہیں بدلا تو پھر تم لوگ شوق سے ہمارا بدل تلاش کر لیجئے گا۔یہ گفتگو سن کر بیگم آنکھوں میں آنسو بھر کر گریہ کرتے ہوئے بولیں "یا میرے اللہ! یہ دن بھی ہمیں دیکھنے تھے"، ہم نے بیگم کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" ارے ایسی ہی حرکتوں سے تو ہمارے تمہارے بدلنے کی بات ہو رہی ہے اور تم ہو کہ پھر وہی بیسویں صدی کے ٹسوے بہائے جا رہی ہو، ارے یہ اکیسویں صدی ہے اس کے تقاضے پورے کرو، بہو سے چوٹیا کھنچوا کر مسکرانا سیکھو، یہ دیکھو بیٹے سے پٹ کر ہم کیسے قہقہے لگاتے ہیں ..... ہاہاہا...." ہمارے قہقہے لگانے کا یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب دروازے کی اوٹ سے ہمارے جوان پوتے نے ہمیں اشارے سے بلایا ..... اور سرگوشی میں بولا۔دادا جی دادا جی پورا ایک مہینہ ہونے کو آیا اور میں نے گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالا..... ممی پاپا سے کہیے نا..... مجھے تھوڑی دیر کے لئے بازار جانے دیں۔ہماری کھسر پھسر سنتے ہی بہو دھم سے ہمارے درمیان آکھڑی ہوئی۔کیا کہا، تجھے بازار جانے دیں..... ذرا پھر سے تو بول، اجی سنتے ہو یہ دیکھو تمہارا جوان بیٹا کیا کہتا ہے۔پھر بہو دانت پیس کر بیٹے کو چٹکی بھرتے ہوئے بولیں، ارے میں کہتی ہوں کیا تو نے شرم و حیا واقعی بیچ دی؟ جوان جوان لڑکا اور بازار جانے کی بات کرتا ہے۔ذرا تو اونچ نیچ کا خیال کر۔کل کو اگر سربازار کسی منچلی لڑکی نے تیرا ہاتھ ہی تھام لیا یا تجھے دیکھ کر سیٹی ہی بجا لی..... تو ہم کیا کریں گے؟ ہمارے خاندان کی عزت و آبرو مٹی میں مل گئی یا نہیں؟ خبردار جو آج کے بعد، گھر سے باہر قدم نکالنے کی بات بھی کی تو..... ابھی تو کھلے بلتے ہی شیخ صاحب کے جوان بیٹے کے ساتھ جو واقعہ ہوا کیا تجھے یاد نہیں؟ ساری دنیا شیخ صاحب پہ تھو تھو کر رہی ہے۔ارے میں کہتی ہوں زمانے کے منہ کو کس نے لگام دی ہے۔مانا کہ شیخ صاحب کا جوان بیٹا سڑک سے نظریں نیچے کئے جارہا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن لڑکیوں کی بدمعاشی نے تو اس کا بیڑا غرق کر دیا نا؟ بھرے بازار میں ایک جوان، لڑکی نے مسکرا کر اسے دھکا دے دیا۔اس دن سے آج تک وہ بے چارہ اپنی عزت پہ آئے حرف اور عصمت پہ لگے داغ کے لئے گھر میں بیٹھا آنسو بہائے جاتا ہے۔میں کہتی ہوں کیا تو بھی بازار جا کر اپنی عصمت اور خاندانی عظمت کو داؤ پہ لگائے گا۔

اس پوزیشن میں، ہم اپنے بھتیجا پوتے کے بازار جانے پر خاندان کی ناک کٹنے کے متعلق غور ہی کر رہے تھے کہ اس دوران، ہماری

جوان پوتی سیٹی بجاتی اچھلتی کودتی ایک طوفان کی طرح گھر میں نمودار ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی بہو نے آگے بڑھ کر گلے سے لگالیا اور دریافت کیا، کہو بیٹی سفر کیسا رہا؟ رشتے کے لئے لڑکا پسند آیا؟ می یہ آپ نے مجھے کہاں بھیج دیا تھا۔ وہ لوگ تو انتہائی غیر مہذب نکلے۔ میرے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے انہوں نے اپنے لڑکے کو صرف ایک ہفتہ کی مہلت دی۔ ویسے تو ہم دونوں ایک ساتھ ہفتہ بھر گھومے پھرے لیکن می، آپ ہی سوچیے ایک ہفتہ میں کیا کسی لڑکے کا چال چلن پر کھا جاسکتا ہے؟ ارے بیٹی آج کے زمانے میں اپنے جوان بیٹے کو کسی جوان لڑکی کے حوالے بھی کوئی کرتا ہے؟ وہ تو شکر ادا کرو کہ وہ لوگ روشن خیال نکلے اور پورے ایک ہفتہ کے لئے انہوں نے اپنے خاندان کی عزت و آبرو تمہارے حوالے کردی..... ہم اپنی پوتی اور بہو کی گفتگو انتہائی انہماک کے ساتھ سن رہے تھے کہ ٹھیک اسی وقت ہمارا چھوٹا پوتا درمیان میں آگیا اور سلسلہ منقطع کرتے ہوئے بولا۔ داداجی، داداجی، پڑوس کی آنٹی کے سونو کے پاس پانچ پانچ چھ چھ بم ہیں وہ مزے سے دھماکے کرتے پھرتا ہے اور میرے پاس ایک ہی بم ہے۔ پھر وہ ضد کرتے ہوئے بولا۔ مجھے پیسے دیجئے نا، میں بھی بم لاؤں گا ہم نے جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکالا اور اسے دینا چاہا..... یہ کیا داداجی، اس میں تو پٹاخوں کا بم بھی نہیں آتا؟ تو سچ مچ کا بم کیسے آئے گا؟ یہ سنتے ہی ہماری جان نکل گئی، تو کیا تمہیں سچ مچ کا بم چاہیے..... اور نہیں تو کیا؟ یہ دیکھو میرے پاس صرف ایک ہی تو بم ہے۔ یہ کہکر اس نے اپنے پیٹ پر بندھے بیلٹ کی جانب اشارہ کیا۔ میں آج پیسے لینے کے موڈ میں ہوں داداجی اگر آپ پیسے نہیں دیں گے تو میں آپ سے لپٹ جاؤں گا اور اس انسانی بم سے خود کو آپ کو اور سارے گھر کو اڑا کر رکھدوں گا۔ میں آپ کو آخری وارننگ دیتا ہوں داداجی، جلدی سے پیسے دے دیجئے ورنہ بہت برا ہوگا۔ ہم نے منے کو سمجھایا۔ ضد نہ کرو بیٹا مان جاؤ دیکھو ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یہ سن کر وہ باغیانہ تیوروں کے ساتھ بانہیں پھیلائے ہوئے بولا تو پھر اب میں آپ سے لپٹتا ہوں کہ آپ کے اپنے اور سارے گھر والوں کے چیتھڑے اور گھر کے پرخچے اڑاتا ہوں .... اور یہ کہکر وہ ہم سے لپٹنے کے لئے ہماری جانب لپکا۔ انسانی بم کے خوف سے ہم گھر میں ادھر ادھر بھاگنے لگے اور منا تھا کہ ہمارے پیچھے دوڑے جارہا تھا۔ اور بالآخر منا ہم سے لپٹ ہی گیا۔ ... اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا اور سارا گھر ہوا میں اچھل کر بکھر گیا۔ ہماری چیخوں اور کراہوں نے گھر کے اندر ہنگامہ کھڑا کردیا۔ گھر کے تمام افراد ہمارے اردگرد جمع ہوکر ہمیں جگانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے آنکھیں کھولیں ... تو پتہ چلا کہ ہم سوتے سوتے پلنگ سے گر کر فرش پہ پڑے ہیں۔ اس وقت گھر کا ہر فرد کیا ہوا کیا ہوا؟ کہکر صورت حال جاننے کے لئے بے چین تھا۔ افراد خانہ کی کیا ہوا کیا ہوا کی تکرار پر، ہم نے درد سے کراہتے ہوئے کہا..... ہمیں ہوا نہیں بلکہ "ہوئی" ہے۔ سب نے یک زبان ہوکر دریافت کیا..... کیا ہوئی ہے؟ ہم نے کہا..... ہمیں اکیسویں صدی ہوئی ہے.....

انیس صدیقی
حیدرآباد

ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
لیکن یہ ہماری قسمت ہے کہ لوگ سچائی کو سچ مانتے ہی نہیں ۔ واقعی کسی دانشور نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ سچائی کو تسلیم کرنا بیحد مشکل ہوتا ہے ۔

اب دیکھئے ناحال ہی کی بات ہے کہ ہم کرکٹ میں پہلی گیند پر آوٹ ہوگئے وہ بھی ایک ایسی گیند پر جسے کھیلنے کی کوشش کرنا بھی ہم نے مناسب نہ سمجھا سب نے اسے ہماری نا اہلی کہا کہ سیدھے فل ٹاس کو چھوڑکر بولڈ ہوگئے ۔ ہم نے لاکھ کہا کہ صاحب وہ گگلی تھی اور ٹپہ کھاکر باہر نکل جاتی ۔ لیکن عین اسی وقت ہوا کا تھونکا آیا اور گیند نے پہلا ٹپہ وکٹ پر ہی کھایا لیکن صاحب نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے لوگ مانے ہی نہیں اور کہتے رہے کہ ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا ۔

پتہ نہیں اس کہاوت کی ابتداء کب ، کیسے اور کہاں ہوئی ۔ جہاں تک کب کا سوال ہے ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ناچ اور اس کہاوت کا جنم ایک ساتھ :! ۔ اس کے قدیم ہونے کا ثبوت یہ ہیکہ ہم نے اسے اپنے بزرگوں سے سنا اور انہوں نے ان کے بزرگوں سے ۔ اب رہا سوال کیسے ہوا تو ہم صرف قیاس ہی کرسکتے ہیں کیونکہ یہ اس زمانے میں ہوا ہوگا جب بریک ڈانس ابھی وجود میں نہیں آیا تھا اور واقعی ناچ ایک فن رہا ہوگا کہ اس میں مہارت ہو تو اچھا ورنہ بے ہنگم اب رہا کہاں ایجاد ہوی تو اس بارے میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ناچ کی ابتداء واقعی کسی ہموار آنگن میں ہوئی ہوگی کیونکہ اگر اس کی ابتداء آج کل کی حیدرآباد کی سڑکوں پر ہوئی ہوتی تو ناچنے والے کا عذر فورا تسلیم کرلیا جاتا کہ آنگن ٹیڑھا ہے۔ بہرحال یہ موضوع ایسا ہے کہ اس میں تحقیق کی کافی گنجائش ہے ۔

خیر صاحب اس کا تاریخی پس منظر کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کے مقبول عام ہونے میں کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ۔ کیونکہ اس عذر کا آج کل بھی مسلسل استعمال ہوتا ہے ۔ آپ اس حالیہ واقعے کو ہی لے لیجئے ۔ ہندوستان کو دو کرکٹ ٹیمیں بھیجنی تھیں ۔ ایک کامن ویلتھ گیمس کیلئے کوالالمپور کو اور دوسری ٹورینٹو کو ۔ اول الذکر ایک بین الاقوامی سطح پر مسلمہ ٹورنمنٹ نہیں تھا ۔ خود انگلستان نے کوئی ٹیم نہیں بھیجی ۔ اور دوسرا بین الاقوامی سطح پر

مسلمہ ٹورنمنٹ تھا جس میں مقابلہ روایتی حریف پاکستان سے ہونا تھا۔ آپ یہ پوچھیں گے کہ یہ کونسا بڑا مسئلہ تھا؟ ایسا تو نہیں کہ ہندوستان کی تقریباً سو کروڑ کی آبادی میں اتنے ہونہار کھلاڑی تو ضرور ہیں کہ دو ٹیمیں بن سکیں آخر سری لنکا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے لیئے تو ٹیموں کے انتخاب میں کوئی دشواری نہیں ہوئی بلکہ انہیں ایک بہت اچھا موقعہ ملا کہ دوسرے ہونہار اور ابھرتے کھلاڑیوں کو آزمایا جائے اور موقعہ دیا جائے تاکہ انہیں آئندہ ہونے والے مقابلوں کیلئے تیار کیا جائے۔ لیکن آپ یہ بات بھول رہے ہیں کہ دیگر ممالک میں ٹیم کے انتخاب کا کوئی سیاسی پہلو نہیں ہوتا۔ اور انہوں نے اس غیر مسلمہ ٹورنمنٹ کو اتنی ہی اہمیت دی جتنی اسے دینی چاہیئے تھی۔ لیکن ہمارے وطن عزیز میں یہ ناممکن تھا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ٹیم کے ٹکڑے کردیئے گئے جو کہ مسلسل جیتتی جارہی تھی۔ اور دونوں ٹیمیں چوں چوں کا مربہ بن گئیں۔ یوں سمجھیئے کہ ایک موٹر کار کے دو پہیئے نکال کر دو سائیکل کے پہیئے فٹ کردیئے گئے اور توقع کی گئی کہ اس کی کارکردگی متاثر نہ ہو نتیجہ حسب توقع نکلا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

لیکن صاحب جو اس ہزیمت کے ذمہ دار تھے وہ بھلا کیونکر اپنی غلطی تسلیم کرتے۔ جہاں قومی وقار کے نام پر غلطی کی گئی تھی وہاں اس کو شخصی وقار کا مسئلہ بنالیا گیا۔ پھر وہی ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا والی بات ہوئی اور کہا گیا کہ اقدام تو صحیح تھا لیکن چونکہ کوالالمپور میں کھلاڑیوں کو زیادہ پیسہ نہیں ملنا تھا بلکہ صرف زیادہ سے زیادہ ایک گولڈ مڈل ملتا اسلیئے کھلاڑیوں نے دل لگاکر نہیں کھیلا اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہ الزام اس ٹیم پر لگایا گیا جس میں نہ صرف ارجن اوارڈ یافتہ کھلاڑی شامل تھے بلکہ ہندوستان کا وہ مایہ ناز کھلاڑی بھی شامل تھا جسے ملک کے اسپورٹ کا سب سے بڑا اعزاز عطا کیا گیا ہے اور الزام ان لوگوں نے لگایا جن کا شمار کرکٹ کی دنیا میں قد آور شخصیت تو کجا ایک بونا بھی نہیں کہا جاسکتا اور وہ یہ تک نہیں جانتے کہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہوتا ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ ایسا صرف کھیل کے میدان میں ہوتا ہے حال ہی میں جناب صدرِ مملکت نے حکومت کی پیش کردہ دفعہ ۳۵۶ کے نفاذ کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا تو عذر پیش کیا گیا کہ تجویز تو بالکل حق بہ جانب تھی لیکن جناب صدر صاحب کو اس کے مضمرات سے ٹھیک طرح واقف نہیں کرایا گیا۔ وہی آنگن ٹیڑھا والی بات دہرائی گئی۔ اب یہ کون ان سے پوچھے کہ ٹھیک طرح سے واقف کیوں نہیں کرایا گیا؟

ان مثالوں سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ ایسا صرف کھیلوں اور سیاست میں ہوتا ہے۔ ہماری عام زندگی میں بھی اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں ایک دفعہ ہماری سکوٹر خراب ہوگئی باقی سب تو ٹھیک تھا صرف سٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ اس بات کا تجربہ ہوگا کہ اگر آپ کی گاڑی راستے میں رک جائے تو چار بلکہ شش جہت سے ماہرین آپ کی مدد آپ کو بھی کو آجاتے ہیں اور مشورے دینے لگتے ہیں کہ یوں کیجیے اور ایسا کیجیے ہم ان ماہرین فن سے بہت گھبراتے ہیں اور ان سے استدعا کرتے ہیں کہ گاڑی دھکیلنے میں ہماری مدد کرکے کسی کارخانے تک پہونچادیں چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا لیکن قسمت نے یہاں بھی ہمارا ساتھ نہ دیا۔ بجائے پلگ یا کاربوریٹر صاف کرنے کے اس نے پلک جھپکتے میں پورا چیمبر کھول دیا کیونکہ اس کو شبہ تھا کہ ٹائمنگ آوٹ ہوگئی ہے۔ ہمارے گڑگڑانے پر جب اسے ہماری بے بسی پر رحم آیا تو پھر سے فٹ کرنا شروع کیا اور وہ بھی غلط۔ ہم نے بعد عجز و نیاز اس سے رحم کی

ر خواست کی کہ اگر اسے ٹھیک کرنا نہ آتا ہو تو کم از کم اتنی مہربانی کرے کہ کھولے ہوئے کل پرزے ہماری ھولی میں ڈال دے۔ وہ بہت ناراض ہو کر کہنے لگا کہ ہم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اسے کام نہیں آتا وہ تو موٹر سائیکل ماہر ہے۔ وہ تو ازراہ ہمدردی اس نے ہماری موٹر کو ہاتھ لگایا قصور اس کا یا ہمارا نہیں بلکہ آنگن ہی ٹیڑھا تھا۔

ہمارا دوسرا تجربہ ایک نیم حکیم سے ہوا۔ بیماری کی سب سے بری عادت یہ ہوتی ہے کہ وہ وقت دیکھتی ہے نہ قام بلکہ بلائے ناگہانی کی طرح بغیر اطلاع کے وارد ہوجاتی ہے۔ اور بیماریوں میں بھی سب سے زیادہ تکلیف دہ نت کا درد ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کوئی اور تکلیف ہو تو اس کا سیدھا سادہ علاج ہو سکتا ہے۔ بس اتنا کریں کہ ایک ر چھوٹا جوتا پہن لیں۔ وہ اتنی تکلیف دیگا کہ آپ باقی تکلیفیں بھول جائینگے۔ لیکن دانت کے درد کا مزاج ہی کچھ ر ہوتا ہے۔ اور آپ کو کسی ڈنٹسٹ کے ہاں جانا ہی پڑتا ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن مشکل اس وقت تی ہے جب تکلیف تو اپنے دانت میں ہوتی ہے اور ڈنٹسٹ کو یہ پہچاننا ہوتا ہے کہ کس دانت میں تکلیف ہو رہی ے۔ آپ کا منہ تو کھلا ہوتا ہے اور آپ اس موقف میں نہیں ہوتے کہ کچھ کہہ سکیں چنانچہ یہی ہوا۔ تکلیف ارے نچلے دانت میں تھی لیکن انہوں نے اوپری دانت ادھیڑنا شروع کیا۔ ہم کچھ کہہ تو نہیں سکتے تھے۔ جب یف ناقابل برداشت ہوئی تو لاشعوری طور پر سر جو ہلایا تو اچھا دانت اکھڑ آیا۔ جب ہم کچھ کہنے کے موقف میں ئے تو الٹی ڈانٹ سننی پڑی۔ انہوں نے کہا "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ اگر میں نے غلط دانت نکالنا شروع کیا تھا آپ مجھے ہاتھ یا پیر چلا کر روک سکتے تھے۔ آپ نے سر ہلایا تو میں نے سمجھا کہ آپ میری مدد کر رہے ہیں۔" ہائے ے قسمت آنگن یہاں بھی ٹیڑھا نکلا

اس ٹیڑھے آنگن کو ہم ایک عرصے سے بھگت رہے ہیں لیکن اس سے چھٹکارا پانے کا خیال ہمیں کبھی نہیں ۔ اب آپ اسے ہماری بے توجہی کہہ لیجئے یا صبر کی زیادتی۔ اس سرزمین میں جسے ناچ کی جنم بھومی کہا جاتا ہے ۔ جس میں ناچ کو عبادت کا مقام حاصل ہے اس ٹیڑھے آنگن کو درست کرنے پر ہم نے کبھی توجہ نہیں دی۔ اس کا مداوا سوچا تو دوسرے علاجوں کی طرح مغرب ہی نے۔ مغرب ہی نے بہت غور و خوض کے بعد بریک س کی بنا ڈالی۔ واقعی صاحب بقول حضرت صفیؔ اورنگ آبادی "بنایا عیب کو بھی یار لوگوں نے ہنر دے۔" یہ چ کی ایسی قسم ہے جس میں کوئی ٹیڑھے آنگن کا گلہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ ٹیڑھا آنگن اس کے لئے ایک حد تک وری ہے۔ عام ناچ میں لوگ ٹیڑھے آنگن سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ پاؤں میں موچ نہ آجائے یا پھسل کر ٹ نہ آجائے۔ لیکن اس بریک ڈانس میں ایسا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ کیونکہ ٹانگیں تو ہوا میں اوپر ہوتی ۔ زمین چھوتا ہے تو صرف سر۔ یہ سر تو صدیوں سے سنگ در پر جھکتا چلا آیا ہے اگر یہ عاشق کا ہو تو معشوق ، در پر ٹکتا ہے۔ اگر عابد کا ہو تو عبادت گاہ میں زمیں بوس ہوتا ہے اور اگر حاجت مند کا ہو تو حاجت روا کے پر۔ بلکہ یہ تو اتنا جھکا ہے کہ

"پست و بلند کوچۂ قاتل کی تھی زمیں
بسمل نے لوٹ لوٹ کے ہموار کردیا"

جانتے ہیں کہ آپ ضرور کہیں گے کہ فرمائش تو مزاحیہ مضمون کی تھی آپ نے یہ کیا لکھ مارا۔ تو صاحب ہم ض کریں گے کہ کیا کریں آنگن ہی ٹیڑھا ہے۔ ہاں اپنی غلطی کو تسلیم کرنا ہماری سرشت ہی میں نہیں ہے۔

مجید عارف نظام آبادی
9-17-159/20 ، ہاشمی کالونی
نظام آباد503001

ایک بیرنگ خط شاعر کے نام....!

محترم مرزا تخیل بیگ صاحب آنسو!

سلام و احترام!

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ کو یہ جان کر یقیناً آنسو نکل آئیں گے کہ علامہ بے خود (مرحوم اب حقیقت میں مرحوم ہوگئے ہیں) وہ رات دیر گئے مشاعرہ لوٹ کر گھر لوٹ رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے انہیں لوٹ لیا۔ ان کی جیب سے تازہ کلام برآمد کرنے کے بعد غالباً ان کے کلام کو معیاری نہ پاکر ڈاکوؤں نے انہیں بری طرح مار اپیٹا۔ وہ برسر موقعہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

علامہ بے خود مرحوم نے اردو ادب پر جو احسانات کئے ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ کئی ایک انجمنوں کے وہ صدر رہ چکے تھے وہ بیک وقت کئی زبانوں پر عبور بھی رکھتے تھے۔ فارسی صرف لکھتے تھے بول نہیں سکتے تھے۔ انگریزی و تلگو میں گفتگو اس لیے نہیں کرتے تھے کہ سننے والے کو خواہ مخواہ ڈکشنری دیکھنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔ بقول مرحوم ان کے تحریر کردہ مضامین یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔ وہ اپنا نام اس لیے نہیں دیتے تھے کہ مخالفین خواہ مخواہ حسد کی آگ میں جل نہ جائیں۔

مرحوم نے اردو کی خدمت کے لیے ساری زندگی وقف کردی تھی۔ کئی ایک انجمنوں سے والہانہ وابستگی کی وجہ سے جو کچھ بھی انہوں نے اردو کے نام پر چندہ جمع کیا تھا۔ اپنا رہائش کے لیے عالیشان بنگلہ تعمیر کروایا تھا اور اسے "اردو منزل" کے نام سے موسوم کرکے انہوں نے اردو کو جیسے زندہ جاوید کردیا۔

مرحوم فرضی ناموں سے ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں اپنے متعلق تعریفی خطوط شائع کرواتے تھے۔ مختلف تنظیموں کو چندہ دے دے کر مشاعرہ کی صدارت و نظامت پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا فن تو انہیں خوب آتا تھا۔ مرحوم کے حیرت انگیز کارناموں میں یہ بھی شامل ہے کہ مختلف اخبارات میں ملک کے ان نامور شعرا کے ساتھ تصویریں شائع کروائی تھیں جن کا انتقال مرحوم کے پیدا ہونے سے قبل ہی ہوا تھا۔

اردو کے لیے انہیں جیل بھی جانے کا اعزاز حاصل ہے ہوا کچھ یوں کہ ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں دھڑلے سے جو غزل مرحوم نے سنائی تھی دراصل وہ کسی پولیس آفیسر شاعر کی تھی۔ آن کی آن میں کئی ایک الزامات کے تحت انہیں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد مرحوم چار عدد ورزشی "کلام" رکھنے والے شاگردوں کو ساتھ لیے پھرنے لگے تھے جو ان کی شاعری اور شہرت میں تاحیات چار

چاند لگاتے رہے۔

بھائی چارگی امن و شانتی کے لیے مرحوم کا نام تاقیامت لیا جائے گا۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ "میں شانتی چاہتا ہوں..... اور اس ملک میں امن و شانتی کے لیے ہی پیدا ہوا ہوں..... "بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ "شانتی" دراصل ان کے گھر میں کام کرنے والی خوبصورت نوکرانی کا نام تھا.....

اس حقیقت سے انکار نہیں مرحوم کو کئی ایک "اصناف" پر دسترس حاصل تھی جن میں "صنف نازک" بھی شامل ہے۔ شاعرات کی اصلاح وہ فی سبیل اللہ کیا کرتے تھے۔ ساری زندگی وہ مجرد ہی رہے فرماتے تھے کہ "شاعری" ہی ان کی "رفیق زندگی" ہے اس طرح سے پسماندگان میں دو عدد شعری مجموعے چند آزاد نظمیں اور کئی ایک مرثیے شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ "متفرق اشعار" بھی ہیں جو کہ بدنامی کے ڈر سے منظر عام پر نہیں لائے گئے۔

زندہ لوگوں پر بھی "مرثیہ" لکھ کر مرحوم نے خوب نام کمایا ہے شاعری سے زیادہ ان کی آواز میں درد تھا ترنم میں جب وہ اپنا کلام سناتے تھے تو ایک عجیب قسم کا سماں بندھ جاتا تھا اور سامعین شعرا سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگتے تھے۔

"اللہ بخشے بڑی خوبیاں تھی مرنے والے میں"

بہر کیف! مرحوم کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں جلسہ تعزیت و مشاعرہ کا انعقاد "انجمن غرقیان اردو" کی جانب سے عمل میں لایا جا رہا ہے۔ کرایہ آمد ارسال ہے کرایہ روانگی، آپ کے کلام کو شک و شبہ سے بالاتر پاکر یا آپ کی جانب سے مستند دلیل پیش کرنے کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ آپ سے گزارش ہے مع اہل و عیال اس مشاعرہ میں شرکت فرمائیں چونکہ آج کل مشاعروں میں سامعین کی تعداد کم اور شعرا کی بہتات ہوگی سبب مشاعرہ کی کامیابی کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ مشاعرہ کے بعد "ڈنر" کی کامیابی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ چنو بھائی باورچی، جنہوں نے اس مشاعرہ کے انعقاد میں فراخدلی سے دست تعاون دراز کیا ہے۔ مشاعرہ کی صدارت کریں گے۔ مشاعرہ کی نگرانی ان کا پہلا اتفاق ہے مگر پکوان کے معاملے میں یہ تیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔

اگر آپ کی بیگم کی آواز اچھی ہو تو انہیں بھی مشاعرہ پڑھنے کا اور آپ کو خوار ہونے کا موقعہ عنایت کیا جائے گا۔ آپ کی شرکت سے مرحوم کی بے چین روح کو یقیناً قرار آئے گا۔

آپ کی شرکت و سمع خراشی کا متمنی

کاغذ قلم آبادی

معتمد "انجمن غرقیان اردو"

مشاعرہ نگر۔ اردو آباد

ڈاکٹر سید حامد حسین
۵ ۔ سلور لائن اپارٹمنٹس، اے سیکٹر
(بی ڈی اے) "کوہ فضا" بھوپال، ۴۶۳۰۰۱

کبڑے کی موت اور بغداد کا حجام
(الف لیلہ کی کہانی کی مزاحیہ ریڈیائی تشکیل)

(ایک عورت اور مرد کے ہنسنے کی آواز)

درزی: آج تو بڑا مزا آیا

درزی کی بیوی: مہینے بھر گھر میں بند رہنے کی کسر نکل گئی (ہنستی ہے) اور وہ لنگڑا لڑکا (ہنسی) کیسا پانی میں غوطے لگا رہا تھا (ہنسی) تم نے بھی اسے کتنی زور سے دھکا دیا تھا

درزی: اس بچی نے بھی تو میری ٹانگوں میں لاٹھی پھنسا کر گرایا تھا۔ مزا نہیں چکھاتا

بیوی: تم بھی تو کیسا منھ بنا کر گرے تھے (ہنسی) بالکل سڑی ہوئی گوبھی جیسا

درزی: دیکھو مذاق نہ کرو۔

بیوی: اپنے پر آیا تو چڑھ گئے۔

درزی: دیکھو وہ کبڑا جا رہا ہے۔ اسے گھر لے چلتے ہیں۔ چھیڑ خانی کریں گے.... کیوں خواجہ کدھر چلے۔

کبڑا: ارے استاد! آپ! گردن تو چھوڑو (ہنستا ہے) ۔ مسخری مت کرو۔ چھوڑو بھی۔ یہ بھی کوئی مذاق کا وقت ہے۔

درزی: مذاق کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے (ہنسی) ۔ اچھا یہ بتاؤ آج کل تمہارا گانا وانا کیسا چل رہا ہے۔

کبڑا: سب چھوڑ رکھا ہے۔ کہیں موقع ہی نہیں ملتا۔ وزیر صاحب کو مہینے بھر روز کچا پکا سب سنایا، دربار کے لیے سفارش ہی نہیں کرتے۔

درزی: آج ہمیں بھی سناؤ کوئی چیز اچھی سی چیز۔ گھر بھی آگیا۔ چلو اندر۔

کبڑا: آج نہیں استاد۔ پھر کبھی۔ پیٹ میں چوہے دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔

بیوی: اس کی فکر نہ کرو۔ ابھی بازار سے لئے ہیں یہ قلچے اور تلی ہوئی مچھلی۔ سب ساتھ کھائیں گے۔

کبڑا: آج گلا ٹھیک نہیں۔ پھر کبھی۔

درزی: ابے سر کی سمجھ آئی نہیں اور گویوں کے نخرے آگئے (مارنے کی آواز)

کبڑا: دیکھو استاد۔ مارنے کا مذاق نہیں۔
درزی: چل بیٹھ ادھر۔ جب تک کھانا نکلتا ہے۔ کچھ سنا۔
کبڑا: سچ سچ استاد۔ آج گلا بہت پھنس رہا ہے (کھنکھارتا ہے)۔ بالکل گایا نہیں جائے گا۔
درزی: نخرے بند۔ گائے گا نہیں تو پاؤں میں رسی باندھ کر کھڑکی سے الٹا لٹکا دوں گا۔ نکل جائے گا۔ جو کچھ پھنسا ہے تیرے گلے میں
کبڑا: ٹھیک ہے استاد۔ (گاتا ہے) آ..... آ..... آ..... (درزی دھپ لگاتا ہے)۔ ڈھول بجانے کی نہیں استاد۔
درزی: سر اٹک رہا تھا۔ نکالا کہ نہیں۔
بیوی: آجاؤ۔ نکلا آیا کھانا۔
درزی: ادھر بیٹھو خواجہ
بیوی: یہ لو مچھلی کا بڑھیا قتلہ۔
درزی: خواجہ پورا قتلہ ایک بار میں کھانا ہے۔ ایسے۔
کبڑا: اتنا بڑا قتلہ۔ مجھ سے نہیں ہوگا۔ پھر کانٹے۔ دیکھو کتنے بڑے بڑے۔
درزی: کیسے نہیں ہوگا۔ رکھو منہ میں۔ قتلہ منہ میں جانے کے بعد پھر منہ نہیں کھلے گا۔
کبڑا: (جیسے منہ پر ہاتھ ہو) چھوڑو۔ چھوڑو
درزی: منہ پر سے ہاتھ نہیں ہٹاؤں گا۔ نگلو پورا قتلہ نگلو (درزی اور بیوی ہنستے ہیں)
کبڑا: (جیسے گلے میں پھنس رہا ہو)۔ غو، غو۔
درزی: ارے کیوں مکاری کرتا ہے۔ لیٹ مت، میں چھوڑوں گا نہیں۔
بیوی: دیکھو تو سہی۔ ہاتھ پیر کیسے ڈھیلے پڑ گئے۔ منہ چھوڑو۔ سانس گھٹ جائے گی۔
درزی: پانی، دو جلدی سے۔ ارے پانی بھی منہ سے باہر نکل آیا۔ کیا ہو گیا اسے...
بیوی: کہیں یہ.....
درزی: خواجہ، خواجہ، خواجہ اٹھ، پانی پی لے۔
بیوی: ارے اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھی اوپر چڑھ گئیں۔ آنکھیں بند کر دو اس کی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔
درزی: یہ..... یہ تو سچ مچ مر گیا۔ کیا کریں۔
بیوی: اسے گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں۔ رات کا وقت ہے۔ اسے کہیں لے چلو۔
درزی: ٹھیک ہے حکیم کے یہاں چلتے ہیں۔

(وقفہ)

درزی: دیکھو یہ یہودی حکیم کا گھر ہے۔ وہ اوپر رہتا ہے۔ تم جاکر دروازہ کھٹکھٹاؤ۔

(دروازے پر دستک)

لونڈی: (دروازہ کھلنے کی آواز) کون ہے
بیوی: دیکھو ہم ایک مریض کو لے کر آئے ہیں۔ حالت بہت خراب ہے۔ حکیم صاحب سے کہنا فوراً دیکھ لیں۔ (دروازہ بند ہونے

کی آواز) ۔ (شوہر سے) اوپر لے آؤ ۔

درزی: اب کیا کریں ۔

بیوی: کپڑے کو ہمیں دروازے کے سہارے ٹکادو اور سرک لو .... ۔

(دوبارہ دروازہ کھلنے کی آواز)

حکیم: کیا بات ہے ۔ بھائی (سیڑھیوں پر سے لڑھکنے کی آواز) چراغ لاؤ ..... جلدی سے ..... یہ کیا ہوا ۔

لونڈی: کیا ہوا مالک؟

حکیم: مریض سیڑھیوں سے نیچے پھسل گیا .... ارے خدا .... یہ تو مرگیا ۔ اب کیا ہوگا ۔

لونڈی: غضب ہو گیا مالک (سیڑھیوں پر سے دوڑتی ہوئی آتی ہے) اب کیا کریں ۔

حکیم: سہارا دے ۔ اسے اوپر اٹھا کر لے چلیں ۔ (بوجھ کی وجہ سے ہانپنے کی آواز)

لونڈی: اوپر تو لے آئے لیکن اس لاش کا کریں گے کیا؟

حکیم: اسے پڑوسی کے گھر میں اتار دیتے ہیں ۔

لونڈی: وہی شاہی باورچی جو آدھی آدھی رات تک غائب رہتا ہے ۔

حکیم: ہاں ۔ شاہی باورچی خانے سے لالا کر اس نے کیا کیا مال رکھ چھوڑا ہے ۔ آٹا ۔ میدہ ۔ گھی ۔ مکھن ۔ گوشت

لونڈی: ہاں وہ ہر وقت کتے بلیاں اس کی کوٹھری میں اودھم مچاتے رہتے ہیں ۔

حکیم: اس مردے کو بھی وہیں پھینک دیتے ہیں ۔ کتے ۔ بلیاں چیر پھاڑ کر برابر کر دیں گے ۔ اندر سے رسی اٹھا لاؤ ابھی اتارے دیتے ہیں ۔ (اوپر ، ادھر کر کے لاش اتارنے کی آواز ۔ دروازہ کھلنے کی آواز)

باورچی: کون ہے؟ ۔ ان کتے بلیوں نے بھی کیا ناک میں دم کر رکھا ہے ۔ لیکن یہ تو آدمی سا لگتا ہے ۔ کون ہے بے تو ۔ اب سمجھ میں آیا روز مال کہاں جاتا تھا ۔ کہاں بچ کر جائے گا تو میرے ہاتھ سے ..... لے (لاٹھی مارنے کی آواز ۔ لاش دھم سے گرتی ہے) دیکھوں تو یہ کون ہے بدمعاش .... ارے کبڑے تو ..... لیکن .... لیکن اسے کیا ہو گیا ۔ ارے یہ تو مر گیا .... برے پھنسے .... لاش کو کہیں ٹھکانے لگانا پڑے گا ۔ بازار کے نکڑ پر دیوار کے سہارے کھڑا کر آتے ہیں ۔ کسی کو کیا پتا چلے گا کہاں مرا ہے ..... (وقفہ)

شرابی: (نشے میں چور ، چلاتا ، گاتا ہوا) ہا ، ہا ، ہا ہاہا (ہچکی) ہو ، ہو ، ہو ، ہو (ہچکی) .... (بے سرے ڈھنگ سے) مدت ہوئی ہے یار کو .... کون سے یار کو ..... اجی اپنے یار کو .. . کیا ہوا .. .. ہاں ، یار کو مہماں کئے ہوئے ..... (لہک کر) مدت ہوئی ہے یار کو مہماں .... ہاں جی .... یار کو مہماں کئے ہوئے .... اور آگے ..... آگے ..... (بہت دور سے 'جلتے رہو' کی آواز) ... . چل چل چمیلی کے باغ میں (ہچکی) ۔ بات تیرے کی ۔ یہ نہیں ہے (گاتا ہے) جی ڈھونڈتا پھر دہی ..... یہ نہیں ہے جدل ... کیسے نہیں (ہچکی) ..... یہی ہے .... بیٹھے رہیں تصور جاناں میں ..... نہیں جما .... (ہچکی) کیسے نہیں جما ..... بھائی عیسیٰ کہیں (ہچکی) اور نہیں ملتے ..... ارے یہ دیوار ہماری طرف کیوں آرہی ہے ... ارے رک ۔ رک ..... (دھم سے آواز) ۔ گرا دیا رے بھائی عیسیٰ کو ۔ (گاتا ہے) بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم ... غیر ہمیں اٹھائے کیوں .. ابے او غیر کے بچے تو کیوں آیا ... دیوار بنا کھڑا ہے اور ہنستا ہے ۔ بیٹا (ہچکی) .... ابھی بتاتا ہوں ۔ .. وہ تو لے گیا تمہ پگڑی اس کی .... چراغ گل

اور پگڑی غائب..... آج کہاں جائے گا بیٹا..... لے..... لے..... نکال میری پگڑی.....

حولدار: جاگتے..... ارے اتر اس کے سینے سے۔ کیوں مارتا..... الگ ہٹ........ کیا مار ہی ڈالے گا اسے۔

شرابی: حولدار صاحب..... یہ پگڑی چور ہے..... میری پگڑی لے گیا۔

حولدار: چل ہٹ بے شرابی۔ پگڑی تو تیرے سر پر رکھی ہے..... اور اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا..... ابے چل اب تو بھی اٹھ..... مکار کیسے دم سادھے پڑا ہے..... اٹھ.....

شرابی: لات مت مارو حولدار صاحب۔ مر جائے گا۔

حولدار: ابے چپ۔ لگتا ہے تیری طرح اس نے بھی چڑھا رکھا ہے۔ دونوں کو بند کرتا ہوں حوالات میں، ارے..... ارے یہ کیا..... یہ تو سچ مچ مر گیا۔ او، او تو کہاں کھسکتا ہے۔ تو نے اس کی جان لی ہے۔ بتا یہ کون ہے

شرابی: حولدار صاحب مجھے نہیں معلوم۔ چاہے جس کی قسم لے لو۔

حولدار: کیا دشمنی تھی اس سے۔

شرابی: بخدا میں اسے نہیں جانتا۔

حولدار: ٹھیک ہے ایک جھٹکے میں تو اتنی اتری ہے۔ اب تھانے چل۔ باقی نشہ بھی اتارتا ہوں۔

شرابی: حولدار صاحب میں بالکل بے قصور ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ جو تاوان کہیں گے بھر دوں گا۔ تھانے نہ لے جائیے۔ بدنام ہو جاؤں گا۔ حولدار صاحب۔ خدا کے واسطے۔

حولدار: ابے چل۔ چھٹا ہوا لگتا ہے۔ اب تو حاکم ہی کرے گا تیرا فیصلہ۔

(منظر بدلتا ہے)

چوبدار: باادب۔ باملاحظہ۔ حضور بادشاہ سلامت تشریف لاتے ہیں..... مقدمہ پیش ہو

کوتوال: جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو۔ حضور کے عدل و انصاف کا فیض ہے کہ ملک میں جرم اور بے ایمانی نابود ہو چکی ہے اور آج عالم پناہ کے سامنے جو مقدمہ پیش کیا جا رہا ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ جہاں دوسرے مقامات پر جرم کے بعد مجرم کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک جرم ہوا ہے اور تین تین لوگ اس کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ اصل مجرم وہ ہیں۔

بادشاہ: معاملے کی تفصیل پیش ہو

کوتوال: حضور عالی۔ ایک کبڑے گویے کی لاش اس حالت میں برآمد کی گئی کہ ایک شرابی اسے مار رہا تھا۔ شرابی کو قتل کی سزا میں پھانسی دی جانے والی تھی کہ ایک باورچی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ لاش اس نے بازار کے نکڑ پر رکھی تھی اور کبڑے کی موت کا سبب اس کی لاٹھی کا وار تھا۔ باورچی کو پھانسی دی جانی تھی کہ حکیم نے آگے بڑھ کر قبول کیا کہ کبڑا اس کی سیڑھیوں سے گر کر مرا تھا۔ حکیم کو گرفتار ہی کیا گیا تھا کہ درزی نے اس کو بے قصور بتایا اور یہ قبول کیا کہ اصل میں کبڑا اس کے مچھلی کھلانے سے مرا تھا۔ اس لئے جہاں پناہ سے درخواست ہے کہ وہی اس عجیب و غریب مقدمہ کا فیصلہ فرمائیں۔

بادشاہ: درزی تو بتا کیا تو اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔

درزی: جہاں پناہ۔ نمک خوار کو جو کہنا تھا وہ عرض کر چکا ہے۔ لیکن اگر حضور کی اجازت ہو تو میں وہ قصہ حضور کے گوش گذار کرنے کی خواہش رکھتا ہوں جو میں نے کبڑے کی موت سے پہلے شاطر حجام کے بارے میں سنا تھا۔

بادشاہ: اجازت ہے۔

درزی: حضور کل میرے ایک دوست کے بیٹے کی شادی تھی۔ جب ہم لوگ کھانے پر بیٹھنے لگے تو میرا دوست اپنے ساتھ ایک نوجوان کو لے کر آیا جو نہایت خوبرو اور شکیل تھا اور قیمتی کپڑے بڑے سلیقے سے پہنے ہوئے تھا۔ لیکن سب کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت سب ہوئی جب کھانے پر بیٹھا نہ تھا کہ اس کی نظر مہمانوں میں سے ایک شخص پر پڑی اور وہ اٹھ کر باہر [illegible] میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور میزبان بھی گھبرا کر اٹھا اور نوجوان کے پیچھے لپکا.....

میزبان: کیوں، کیا ہوا، کہاں چلے، رکو تو سہی

نوجوان: (دانت پیستے ہوئے) یہ منحوس یہاں بھی پہنچ گیا۔ میں [illegible] ایک پل نہیں ٹھہر سکتا۔

میزبان: یہاں تو سب اپنے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ تمہیں کون [illegible] منحوس شخص نظر آگیا جو اس قدر پریشان ہو گئے۔

نوجوان: وہ بڈھا ملعون، حجام جو دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ اسی نے ہی میری یہ حالت کی ہے۔ اسی کی وجہ سے میں نے اپنا وطن چھوڑا اور یہ موذی یہاں بھی موجود ہے۔

میزبان: ادھر آجاؤ۔ دوسرے کمرے میں بیٹھیں گے۔ اس خوشی کے موقع پر بدمزگی اچھی نہیں لگتی۔ آرام سے بیٹھ کر یہاں کھانا کھاؤ لیکن میں تمہاری دکھ بھری کہانی ضرور سنوں گا۔ (وقفہ)

نوجوان: اس عزت و اکرام اور اتنے لذیذ کھانے کے لیے بہت بہت شکریہ۔ جہاں تک میری زندگی کی کہانی ہے اسے سن کر کسی کو خوشی نہ ہوگی۔ اس سیاہ رو حجام نے جس طرح میری زندگی کو عذاب بنایا ہے ویسا آپ میں سے کسی کے ساتھ نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ میرا باپ بغداد کا ایک مالدار سوداگر تھا۔ اس کے مرنے پر مجھے بڑی دولت ملی۔ لیکن میری عادتیں عام نوجوانوں جیسی نہیں تھیں۔

میزبان: جیسے۔

نوجوان: جیسے مجھے عورتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ ان سے میں گھبراتا تھا۔

میزبان: پھر کیا ہوا

نوجوان: ایک دن میں بازار سے گزر رہا تھا۔ دیکھا عورتوں کا ایک غول ہنستا، چہلیں کرتا، میری طرف آرہا ہے۔ میں گھبرا کر قریب کی ایک گلی میں گھس گیا۔ اس انتظار میں کہ وہ غول نکل جائے میں گلی میں پڑے ایک تخت پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں.....

میزبان: اتنے میں کیا ہوا؟

نوجوان: کچھ کھٹکا ہوا۔ میں نے اوپر نظر ڈالی۔ ایک کھڑکی کا پٹ کھلا تھا۔ اس میں سے ایک لڑکی کا حسین ہاتھ دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر میں دوسرا پٹ بھی کھلا اور اس کے پیچھے ایک حسین چہرہ دکھائی دیا۔ اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ اس نے جس الھڑپن سے مجھ پر نظر ڈالی لگتا تھا اس کے بعد میں اسی گلی میں پتھر کا بت بن جاؤں گا۔

میزبان: پھر؟

نوجوان: ایک دم ہٹو بچو کا شور ہوا۔ کھڑکی تڑ سے بند ہو گئی۔ گاڑی میں سے قاضی صاحب اترے اور گھر میں چلے گئے۔ وہ شہر قاضی کا گھر تھا۔

میزبان: یعنی وہ قاضی کی لڑکی تھی۔

نوجوان: ہاں میں گھر لوٹا، عجیب بے کلی تھی۔ کسی پل چین نہ تھا۔ آنکھوں کے سامنے بس ایک تصویر تھی۔ ایک حسین سی صورت ہلکے تمتماتے گال۔ آنکھوں میں چمک اور اشتیاق۔ پہلے معلوم بھی نہ تھا کہ آنکھوں میں بھی مسکراہٹ کا جادو ہوتا ہے۔

میزبان: پہلے جو عورت سے گھبراتا تھا اس کے ساتھ تو یہ جادو ہی ہوا۔

نوجوان: ہاں۔ پہلے کھانا پینا بند ہوا۔ پھر باہر نکلنا، چلنا پھرنا، پھر اٹھنا بیٹھنا۔ بستر سے لگ گیا۔ خاندان والے، رشتہ دار، نوکر چاکر سب تدبیریں کر کر کے ہار گئے۔ کوئی تبدیلی نہیں، کوئی افاقہ نہیں۔

میزبان: پھر؟

نوجوان: ہمارے یہاں ایک بوڑھی انا آتی تھی۔ بوڑھی خرانٹ۔ کائیاں گھنی۔ خیریت پوچھنے آئی۔ سرہانے کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گئی۔ بولی، بیٹا، تیرا دکھ پہچان گئی۔ دکھ دینے والی کا نام بتادے۔ پتا میں خود ڈھونڈھ لوں گی۔ تیسرے دن سامنے لاکر کھڑا نہ کیا تو نام بدل دینا۔

میزبان: تو لائی اسے؟

نوجوان: جتنا جانتا تھا بتادیا۔ سنتے ہی بڑھیا سن ہو گئی۔ بولی بیٹا بڑی ٹیڑھی جگہ دل لگایا ہے۔ پھر بھی کوشش کرتی ہوں۔

میزبان: کیا جواب لائی؟

نوجوان: تیسرے دن آئی۔ کہنے لگی قاضی قصائی ہے۔ لڑکی کو قیدی بناکر رکھا ہے، ٹھیک اپنے کرے کے اوپر۔ پرندہ پر مار سکتا ہے نہ ہوا پلو چھیڑ سکتی ہے۔ پھر بھی میں لڑکی کے پاس پہنچ ہی گئی۔ اس کا دماغ تو باپ سے بھی دو آسمان اوپر ہے۔ ناک کی جگہ تو بس بل ہی بل ہیں۔ کہا کوئی تیرے فراق میں جان دیتا ہے۔ بولی جنازے کی نماز کے لیے ابا سے بات کرو۔

میزبان: خوب۔

نوجوان: یہ سن کر میری حالت اور بگڑ گئی کچھ روز بعد بڑھیا پھر آئی۔ بولی۔ پہلے قاضی کی بیوی سے راہ و رسم بڑھائی۔ اب روز جاتی ہوں لڑکی کے سامنے بھی آنسو بہاآتی ہوں۔ لگتا ہے پگھل رہی ہے۔ جمعے کے دن قاضی نماز پڑھانے جاتا ہے۔ واپسی میں دو گھنٹے لگتے ہیں۔ تجھے اسی وقت بلایا ہے

میزبان: تو گئے؟

نوجوان: جمعہ اگلے دن ہی تھا۔ ہفتے بستر پر گزر گئے تھے۔ حال سے بے حال تھا۔ صورت ایسی کہ اچھا بھلا آدمی دیکھ کر منھ پھیر لے۔ سوچا حجامت بنوائیں۔ حمام جائیں۔ اپنا بہترین جوڑا پہنیں اور پھر اپنی جان تمنا کے پاس جائیں۔

میزبان: چلو جان میں جان تو آئی

نوجوان: صبح ہی نوکر کو بھیجا کہ حجام کو بلالائے۔ وہ گیا تو اسی کم بخت مردود حجام کو بلالایا۔

میزبان: اس نے کیا کیا؟

نوجوان: یہ پوچھو، کیا نہ کیا، آتے ہی بولا......

حجام: میاں لگتا ہے آپ کا مزاج ناساز ہے۔ دیکھو تو سہی کیسا منھ نکل آیا ہے۔ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ آپ جیسا نوجوان اور اس حالت میں۔

نوجوان: ہاں کچھ عرصے سے بیمار تھا

حجام: آپ اطمینان رکھیں۔ بہت جلد صحت یاب ہوں گے۔ یہ بتائیے کہ حجامت کروں یا سنگی لگا کر فاسد خون نکالوں۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ جو شخص جمعے کو حجامت کرواتا ہے، خدا اسے ستر آفتوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جمعے کے دن سنگی لگوانے سے آنکھوں کی بینائی تیز ہوتی ہے اور کئی خطرناک بیماریوں سے نجات ملتی ہے۔

نوجوان: یہ بکواس بند کرو اور حجامت کرو۔ مجھے اور بھی کئی کام ہیں..... اور اب اس گٹھری میں سے کیا نکال رہے ہو۔

حجام: حضور یہ ایک آلہ ہے۔ ہاتھ میں لے کر دیکھئے۔ کمال کی چیز ہے۔ ایک ایک ستارے کا حال بتاتا ہے۔ یہ دیکھئے یہاں جب اس لکیر پر سایہ پڑتا ہے تو مشتری ستارے کے مقام کا پتا چلتا ہے۔ اور اس گھنڈی کو گھما دیں تو اس سے چاند کی جگہ کا پتا چلتا ہے۔ دیکھئے میں اس وقت کا حال ابھی دیکھ کر بتاتا ہوں۔ مریخ ستارہ جسے منگل بھی کہتے ہیں۔ عطارد یعنی بدھ سے مل رہا ہے۔ واہ واہ۔ یہ تو حجامت کے لئے بڑی اچھی گھڑی ہے۔ اور ہاں اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ آپ کی کسی من چاہے شخص سے ملاقات ہوگی۔ لیکن اس میں آپ کے لئے کچھ پریشانی بھی ہے۔

نوجوان: خدا کے لئے میرا دماغ نہ چاٹو اور حجامت بناؤ۔

حجام: آپ ناحق خفا ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ پتا چل جائے کہ کیا ہونے والا ہے تو آپ فضول کے کاموں میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔

نوجوان: مجھے تمہارے جیوتش دیوتش میں کوئی عقیدہ نہیں۔ میں نے تمہیں حجامت کے لیے بلایا ہے یہ فضولیات سننے کے لیے نہیں

حجام: حضور آپ شکر کیجئے کہ آپ کے سامنے کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں کھڑا ہے جو صرف استرا چلانا جانتا ہو۔ حضور کو جب یہ معلوم ہوگا کہ خادم کے پاس جیوتش ہی نہیں، کیمیا، سحر حلال، شاعری، منطق، حساب، قانون وغیرہ وغیرہ کتنے علوم ہیں تو دنگ رہ جائیں گے۔ جو مشورہ حضور کو میں دے سکتا ہوں وہ اچھے سے اچھے باخبر لوگ نہیں دے سکتے۔

نوجوان: لگتا ہے تو آج میری جان لے کر چھوڑے گا۔ شرفو۔ دیکھو اسے اجرت دو اور چلتا کرو۔ ہمیں حجامت نہیں بنوانا۔

حجام: سرکار میں بلا خدمت کے اجرت تو ہرگز نہ لوں گا۔ اگر آپ کے یہاں سے اجرت نہ ملے تو بھی میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا میں نے آپ کے والد صاحب کی خدمت کی ہے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے انہوں نے ایک بار مجھے طلب کیا اور کہنے لگے سنگی لگا کر خون نکالو۔ میں نے اپنا آلہ نکال کر سورج کی بلندی دیکھی پھر ستاروں کا مقام اور انہیں بتایا کہ یہ وقت خون نکلنے کے لئے نیک نہیں ہے اور انہوں نے فوراً میری بات مان لی۔ میں نے اسی وقت ان کی شان میں ایک قصیدہ وہیں کھڑے کھڑے سنا دیا۔ انہوں نے نوکروں کو حکم دیا کہ اسی وقت مجھے خلعت اور ایک سو تین دینار دیئے جائیں۔ تو جناب جب مناسب گھڑی میں خون نکال کر جانے لگا تو میں نے عرض کیا حضور یہ ایک سو تین دینار کس حساب سے۔ تو انہوں نے کہا۔ ایک دینار میرے جیوتش کے حساب کا، ایک تیری دلچسپ باتوں کا ایک خون نکلنے کا اور ایک سو دینار تیرے قصیدے کے لئے۔

نوجوان: خدا میرے باپ پر رحم کرے کہ وہ تجھ جیسے شخص کو جانتا تھا۔ میری حجامت کر اور چلتا بن۔ میرے پاس تیری یہ طول طویل باتیں سننے کا قطعی وقت نہیں۔

حجام: سرکار گھبراتے کیوں ہیں۔ میں یہ صابن لگائے دیتا ہوں۔ یہ لگتا ہے کہ آپ مجھ سے کچھ چڑ گئے ہیں۔ لیکن میں اس کا برا نہیں مانتا۔ اپنے گاہکوں اور کرم فرماؤں کا کیا برا ماننا۔

نوجوان: یا خدا کس بیچڑے سے پالا پڑا ہے۔ (کپڑا پھٹنے کی آواز)

حجام: یہ کیا کیا آپ نے۔ گریبان چاک کرنا سمجھ دار لوگوں کا شیوہ نہیں۔

نوجوان: لیکن تو نے سمجھ رہنے کہاں دی ہے۔ مجھے پاگل کر دیا۔ ابھی تو اپنا گریبان پھاڑا ہے۔ اب تیرے کپڑے پھاڑ کر تیرے سر پر خاک ڈالوں گا۔

حجام: خدا کے واسطے خاموش رہیئے۔ نوکر چاکر سنیں گے تو کیا خیال کریں گے۔ خادم سے تو کچھ چھپا نہیں، وہ تو آپ کا ہی ہے (سانس بھر کر) اس سینے میں پتا نہیں کتنے راز دفن ہیں۔ مجال ہے کہ کبھی ایک لفظ زبان پر آیا ہو اور حقیقت یہ ہے کہ اگر چار باتیں زبان سے نکل جائیں تو چودہ لوگوں کی عزت سر بازار نیلام ہو جائے۔

نوجوان: ابے چپ رہتا ہے یا نہیں۔

حجام: سرکار آپ کی ہی تو خدمت میں لگا ہوا ہوں۔ دیکھیں یہ استرا تیز کر رہا ہوں۔

نوجوان: یہ تو دس منٹ سے دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ لگتا ہے کہ بجائے استرے کے تیری زبان پر دھار چڑھ رہی ہے۔

حجام: سرکار آپ کے مزاج میں بہت جلد بازی ہے۔ آپ نے سنا تو ہو گا۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ حضور صبر کی عادت ڈالیں۔ صبر ی خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔ بلکہ یوں کہیئے عبادت ہے۔ جو خدا کی آزمائش پر پورا اترتا ہے۔ اس سے بڑا عابد کون ہ گا۔ اس کے لئے تو دونوں جہانوں میں کامیابی ہے۔

نوجوان: (چیختے ہوئے) بس بس خاموش۔ چار بال مونڈ کے پھر بکواس شروع کر دی۔ دیکھ میرے دوستوں نے میری صحت یابی کی خوشی میں ایک جلسہ رکھا ہے اور مجھے وہاں جانا ہے۔ اب جلدی حجامت پوری کر دے۔

حجام: سرکار آپ کے کہنے سے مجھے بھی یاد آیا کہ میں نے بھی آج اپنے کچھ دوستوں کو کھانے پر بلالیا ہے۔ اور دماغ کو دیکھئے۔ بالکل اتر گیا۔ حضور کے پاس آنے کی جلدی میں بھٹیارن سے بھی کہنا بھول گیا اب کیا ہو گا۔ آج تو بڑی بے عزتی ہوگی۔

نوجوان: اب یہ ذکر چھوڑ۔ میں نے بتایا میں دوسری جگہ مدعو ہوں۔ گھر میں جو تیار ہوا ہے وہ سب تیرا ہے۔ اپنے ساتھ لے جانا۔ اب ذرا جلدی ہاتھ چلا۔

حجام: خدا آپ کا بھلا کرے۔ لیکن یہ تو بتادیں کہ آج کیا کیا تیار ہو رہا ہے۔

نوجوان: (تالی بجا کر) جاؤ باورچی سے کہو باورچی خانے میں جو بھی تیار ہے وہ سب کا سب یہاں لے آئے۔

حجام: اور کچھ شراب وراب آپ کے یہاں نہیں ہے۔ سوچئے اب مہمان آئیں گے تو کیا بغیر پیئے واپس جائیں گے۔

نوجوان: دیکھو دیکھو۔ وہ انگور والی شراب کے دو خم بھی رکھ دینا۔

حجام: خدا سرکار کو اجر دے۔ لیکن کچھ عطر اور خوشبوؤں کا انتظام ہو جاتا تو اچھا تھا۔

نوجوان: سنو خوشبوئیں بھی لے آؤ۔ اور او حجام دیکھ تو جو جو کہتا جا رہا ہے، میں ہر فرمائش پوری کر رہا ہوں۔ اب تو حجامت پوری کر کہ میں حمام جا سکوں۔

حجام: بس ذرا سا صبر کر لیں۔ میں یہ سارا سامان گھر چھوڑ کے آتا ہوں۔ مہمانوں سے کہہ آؤں کہ کھائیں۔ پئیں اور مزہ کریں۔ پھر

میں آپ کے ساتھ آپ کے دوستوں کے جلسے میں چلوں گا۔ بڑا لطف رہے گا۔

نوجوان: خدارا میرا پیچھا چھوڑ۔ اپنے دوستوں کے ساتھ موج کر۔ مجھے میرے حال پر رہنے دے۔ اس لیے کہ جہاں مجھے جانا ہے وہاں میرے علاوہ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔

حجام: (ہنستے ہوئے) ارے وہ تو میں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ آپ نے کسی عورت سے ملاقات کی ٹھانی ہے۔ میں اب بھی کہہ رہا ہوں مجھے ساتھ رکھیں۔ آپ ہی کا فائدہ ہے۔

نوجوان: دور ہو تو خبیث، چالاک بڈھے۔ جتنا موقع مل رہا ہے، اپنے پیچھے گڑا تا ہی جا رہا ہے۔ اچھا اب تو جا۔ جب تو آجائے گا تو تجھے ساتھ لے کر جاؤں گا۔

حجام: اچھا تو سرکار مجھے ٹرخا رہے ہیں۔ میں ہٹوں اور آپ اکیلے نکل جائیں۔ دیکھئیے بتائے دیتا ہوں۔ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ میرا انتظار کرنے میں ہی بھلا ہے۔

نوجوان: ٹھیک ہے میں یہیں ہوں۔ تو جلدی سے لوٹ کر آنا۔

میزبان: اس کے بعد کیا ہوا؟

نوجوان: اس کی مکاری تو دیکھئیے۔ کھانے پینے کا سارا سامان تو حمال سے گھر پہنچا دیا اور خود قریب کی گلی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وقت کافی نکل چکا تھا۔ جمعے کی نماز ختم ہونے کا وقت بھی آگیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور قاضی کی گلی میں جا پہنچا

میزبان: پھر؟

نوجوان: بڑھیا وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مجھے فوراً اوپر لے گئی۔ میں پہنچا نہ تھا کہ گلی میں شور ہوا۔ معلوم ہوا قاضی لوٹ آیا ہے میں نے کھڑکی میں سے نیچے جھانک کر دیکھا تو.....

میزبان: کیا تھا وہاں۔

نوجوان: یہ منحوس حجام تخت پر بیٹھا کھڑکی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ادھر قاضی ہاتھ دھو کر کھانے پر بیٹھا لونڈی نے قاب سامنے لاکر رکھی۔ اس میں کھی تھی۔ قاضی نے گرم گرم شوربے کی وہی قاب لونڈی کے منہ پر دے ماری۔ وہ بے تاب ہو کر چلائی تو غلام اس کی مدد کو لپکا۔ قاضی کسی وجہ سے بھرا بیٹھا تھا۔ جوتا اٹھایا اور غلام کو پیٹنا شروع کر دیا۔ غلام نے چیخ پکار مچائی.....

میزبان: تو پھر کیا ہوا؟

نوجوان: حجام نے سمجھا قاضی مجھے پیٹ رہا ہے اس نے شور مچایا۔ بچاؤ بچاؤ میرے مالک کو قاضی مارے ڈالتا ہے۔ چلتے ہوئے لوگ رک گئے۔ حجام دوڑا تو گھر جا کر خبر کر دی۔ سارے نوکر چاکر غلام اور رشتہ دار قاضی کے دروازے پر جمع ہوگئے۔ شور سن کر قاضی نے دروازہ کھولا۔

قاضی: کیا بات ہے۔ یہاں بھیڑ کیوں لگائی ہے۔

بھیڑ: پکڑ لو اسے ظالم، کمینہ، کتا، بنتا ہے تو قاضی اور انصاف کا ر کھوالا اور لوگوں کو اپنے گھر میں بند کر کے مارتا ہے۔

نوکر: ہمارے مالک کو باہر نکالو۔

قاضی: تمہارا کوئی مالک والک یہاں نہیں ہے۔ وہ یہاں کیسے آیا۔

حجام: میری بیٹی نے اسے بلایا تھا۔ تو نے اسے اپنے غلاموں سے پکڑوا کر پٹوایا۔

قاضی: ایسا ہے تو نکال کر دکھا دو اپنا مالک۔ یہ کھلا پڑا ہے میرا دروازہ

نوجوان: حجام لپک کر گھر میں گھس گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ایک خالی صندوق دکھائی دیا۔ اسمیں داخل ہو کر ڈھکن لگالیا۔ جلدی جلدی میں عبا کا ایک کونا صندوق کے باہر رہ گیا۔ حجام نے جیسے ہی عبا کی جھلک دیکھی، اس نے لپک کر صندوق کو اٹھایا اور سر پر رکھ کر بھاگ نکلا۔

میزبان: پھر کیسے بچے۔

نوجوان: جیسے ہی حجام سڑک پر آیا۔ میں نے صندوق کھولا اور باہر چھلانگ لگادی۔ زمین پر اوندھے منھ گرا۔ صندوق بھی میری ٹانگ پر آرہا اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔

میزبان: چچ چچ۔

نوجوان: اب اپنی ٹانگ گھسیٹتا جدھر بھاگتا، حجام شکاری کتے کی طرح آموجود ہوتا۔ اب سڑک پر گھومتے چھوکرے بھی میرے پیچھے لگ گئے۔ بالآخر ایک جلاہے کی دکان میں گھس گیا اور دو دن تک اسی دکان میں چھپا پڑا رہا۔ تیسرے دن جلاہے کی مدد سے وکیل کو بلایا۔ اپنی جائیداد کے حصے بخرے کرکے رشتہ داروں کو سونپا۔ باقی جائیداد کا ایک مختار مقرر کیا۔ کچھ جائیداد بیچ دی اور پیسے لے کر بغداد چھوڑ یہاں آیا۔ آرام سے گزر ہورہی تھی کہ وہ خبیث یہاں بھی آموجود ہوا۔

درزی: تو جہاں پناہ یہ کہہ کر وہ نوجوان تو اپنی لنگڑی ٹانگ گھسیٹتا وہاں سے چل دیا۔ لیکن ہم میں سے جن لوگوں نے نوجوان کی کہانی سنی تھی۔ وہ حجام کی طرف پلٹ پڑے۔ باتوں کی بھنک اس کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ لیکن وہ خاموش بیٹھا مسکراتا رہا۔ جب لوگوں نے اسے گھیر لیا تو بولا۔

حجام: صاحبو، آپ نے خود اس کے منھ سے سن لیا کہ میں نے اسے قاضی کے جنگل سے بچایا۔ سوچیئے تو سہی، اتنا بڑا صندوق میں اپنے سر پر اٹھاکر بھاگ کھڑا ہوا کیوں؟ میں نے اسے نہ بچایا ہوتا تو قاضی کے لوگ اس کی تکا بوٹی نہ کر ڈالتے۔ اب آپ نے جو باتیں سنیں انہیں کیا احسان فراموشی نہیں کہہ سکتے۔

میزبان: لگتا ہے وہ تمہاری بک بک کرنے کی عادت سے چڑھ گیا ہے۔

حجام: میں اور بک بک۔ اس کے تو آپ لوگ خود گواہ ہیں کہ میں اتنی دیر سے خاموش بیٹھا ہوں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ لوگ میرے کم بولنے پر پھبتی کہتے ہیں۔ باپ ہنسی میں لوگوں کو میرا نام خواجہ خاموش بتایا کرتا تھا۔ ایک بار مجھ پر جو گزری وہ سنیئے۔ ایک دن جب گھر لوٹ رہا تھا۔ دیکھا دریا کے کنارے ایک کشتی لگی ہے اور لوگ اس میں چڑھ رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچے تو پولیس کھڑی تھی۔ سب مسافروں کو پکڑ کر انہوں نے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال دیں۔ میرے بھی۔ پتا چلا وہ دس نامی ڈاکو تھے۔ قافلوں کو لوٹا کرتے تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دسوں کی گردنیں اڑادی جائیں۔ میں یہ سب سنتا رہا اور مجھ سے کچھ نہ بولا گیا۔ مقتل میں جلاد نے گن کر دس لوگوں کے سر اڑادیئے۔ لیکن مجھ سے کچھ بولا نہ گیا۔ حاکم نے پوچھا ایک کو کیوں چھوڑ دیا۔ جلاد نے بتایا کہ میں تو گیارھواں ہوں۔ حاکم نے مجھ سے پوچھا میں ان میں کیوں شامل ہوا اور جب گرفتار ہوا تو کیوں نہ بولا۔ میں نے کہا: مجھے زیادہ بولنے کی عادت نہیں۔ حاکم بہت خوش ہوا۔ سو اشرفیاں مجھے انعام میں دیں اور چھوڑ دیا۔

میزبان: لطیفہ تو بڑا اچھا ہے (سب ہنستے ہیں)

حجام: آپ یقین نہ کرنا چاہیں تو نہ کریں ۔ لیکن اگر آپ میرے چھ بھائیوں میں سے ایک سے بھی مل لیں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ بولنا کسے کہتے ہیں ۔

میزبان: تو تمہارے چھ بھائی ہیں ۔

حجام: ہاں ۔ اپنی حرکتوں سے وہ ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت میں پھنستے رہتے ہیں اور آخر مجھے ہی ان کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے ۔ ان کے قصے سنئے تو آپ کو خود پتا چل جائے گا....

درزی: جہاں پناہ! حجام پہلے بھائی کا قصہ سنا رہا تھا کہ دیوار سے ٹکے ٹکے مجھے نیند آگئی ۔ وہ چھ بھائیوں کے قصے سنا چکا تو کسی نے کندھا ہلا کر مجھے بھی جگایا ۔ گھر پہنچا تو دن کے تین پہر نکل چکے تھے ۔ بیوی بپھری بیٹھی تھی ۔ خود سیر و تفریح کرتے ہو اور مجھے چولھے کے دھوئیں سے آنکھیں پھوڑنے چھوڑ جاتے ہو ۔ اس کے کہنے پر گھر سے نکلا ۔ دریا کے کنارے شام تک وقت گذارا ۔ راستے میں قلچے اور مچھلی خریدلئے ۔ کبڑا مل گیا اسے گھر لاکر کچھ گانا سنا ۔ پھر کھانے پر بیٹھ گئے ۔ اس کے گلے میں مچھلی پھنس گئی اور وہ مر گیا ۔ خدا کی قسم حضور ، ہماری نیت اسے مارنے کی نہیں تھی ۔ ہم پر رحم کریں ۔ ہمیں معاف کردیں ۔ جہاں پناہ ۔

باہر سے شور کی آواز: نہیں نہیں مجھے معاف کردو ۔ مجھے چھوڑ دو (فولاد خاں حجام کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

بادشاہ: فولاد خاں ، یہ تم کسے گھسیٹے لا رہے ہو ۔

سپاہی: حضور یہ حجام ہے ۔ اس کو مونچھیں ترشنے کے لئے بلایا تھا ۔

بادشاہ: تو پھر تمہاری صرف ایک ہی مونچھ کیوں ترشی ہوئی ہے ۔

سپاہی: جھگڑا تو یہی ہے جہاں پناہ ۔ اس نے دو گھنٹے میں مونچھ بنائی اور چھ بھائیوں کے قصے سنائے اور اب کہتا ہے کہ دوسری مونچھ تب بناؤں گا جب دس ڈاکوؤں کے قصے سنو گے ۔

درزی: جہاں پناہ یہی ہے وہ حجام ۔ آپ اس کو نہ چھوڑیں ۔

حجام: حضور والا ۔ میں اپنے قصور کی معافی چاہتا ہوں ۔ آپ کی بخشش کے تو چین اور ہندوستان تک میں چرچے ہیں ۔ آپ سب کو معاف کر دیتے ہیں ۔ اسی دربار میں ملاحظہ فرمالیں ۔ باقی سب تعظیماً کھڑے ہیں اور یہ کبڑا مزے سے لیٹا ہوا ہے ۔

بادشاہ: بے وقوف حجام ۔ کبڑا زندہ نہیں وہ اس کی لاش ہے ۔

حجام: (زور سے ہنستا ہے) یہ لاش ہے ۔ یہ لاش ہے ۔ (ہنسی)

بادشاہ: گستاخ ۔ چپ ۔

حجام: میں سچ کہتا ہوں ، حضور کو کسی نے گمراہ کیا ہے ۔ کبڑا تو زندہ ہے ۔ اس کے گلے کی چھوٹی رگ ابھی بھی پھڑک رہی ہے ۔ بھائی فولاد خاں ، میرے اوزاروں کا جھولا تو لوٹا دیجئے ۔ جو آپ نے ضبط کرلیا ہے ۔

سپاہی: یہ لو ، سنبھالو ۔

حجام: حضور لوگوں کو بات کا بتنگڑ بنانے میں بڑا مزہ آتا ہے ۔ زندہ آدمی کو مردہ بنادیا ۔ خدا کے فضل سے یہ کبڑا ابھی اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا ۔ ذرا روغن بلساں سے اس کی گردن کی نسوں کی مالش کردوں ۔ بھائی فولاد ، ذرا جھولے میں سے چمٹی تو دیجئے ۔

ڈریئے نہیں آپ کی مونچھیں نہیں اکھاڑوں گا۔ (لوگوں کی دبی دبی ہنسی)

ماہ: دربار مذاق کی جگہ نہیں۔

؛: گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، جہاں پناہ۔ فولاد بھائی۔ یہ منہ کھول دیا ہے کبڑے کا۔ تھوڑا اسے پکڑ لیں۔ ہاں ایسے۔ دیکھیں یہ بند نہ ہو۔ میں چمٹی اندر ڈال رہا ہوں۔ اوں، اوں اوہ یہ آیا پکڑ میں.... یہ رہا۔ دیکھیے حضور والا، یہ کانٹا، مچھلی کا کانٹا پھنسا تھا اس کے حلق میں (چھینک کی آواز) ماشاء اللہ۔ کبڑے میاں اب اٹھ آئیے۔ بڑی لمبی تانی تھی تم نے۔ ہو تو بھئی استاد۔ تان بھری تھی کہاں اور ٹوٹی دربار میں۔ دیکھ لو بادشاہ سلامت کا دربار۔ ایسے موقعے بار بار کب ملتے ہیں۔

شاہ: ہم مانتے ہیں کہ حجام اپنے فن میں ماہر ہے۔ کسی طرح زبان کو قابو میں رکھنا سیکھ لے تو اللہ کی مخلوق کا بڑا بھلا ہو سکتا ہے۔

دخان لیکن حضور بڈھے طوطے نہیں پڑھتے۔ (سب ہنستے ہیں)

دلشاد رضوی
۲۹/۸۳۰-۲-۱۴، مہدی پٹنم،
حیدرآباد-۲۸

آدمی اُلّو کیسے بنتا ہے

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ آدمی آدمی ہوتا ہے جبکہ اُلو فی الواقعی اُلو ہوتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اُلو میں یہ جرات کہاں کہ وہ آدمی بن کر دکھائے لیکن انسان چونکہ بہت ہی باصلاحیت ہستی کا نام ہے اس لئے اسے یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اگر چاہے تو بآسانی اُلو بن کر دکھاوے جس طرح لیڈر بننے کے لئے نہ کوئی تعلیمی قابلیت کی ضرورت درپیش ہوتی ہے اور نا ہی جسمانی تنومندی کی، ٹھیک اسی طرح اُلو بننے کے لئے بھی کسی ڈگری کا حصول قطعاً لازم نہیں ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی آدمی اُلو بننا چاہے اور بن بھی جائے تو نہ تو اسے پر نکلیں گے اور نا ہی وہ کسی چونچ کا مالک بنے گا۔ نہ اسکی آواز اُلو کی سی ہوسکے گی اور نا ہی کسی میں اتنی ہمت ہوگی کہ وہ اسے اُلو سمجھ کر زو کے حوالے کردے۔ پھر بھی اگر وہ چاہے تو اپنا شمار اُلوؤں میں کروا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے ہمجنسوں کو بھی اُلوؤں میں تبدیل کروا سکتا ہے ترکیب بہت آسان ہے ذرا غور سے سنئے ترکیب نمبر ا: پہلے پہل عوام کی خدمت کا بیڑہ یوں اٹھا ئے کہ قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر کسی بڑے لیڈر کی گھسی پٹی تقریر کو دہراتے جائیں ایسا کرتے وقت منہ کے زاویوں کو بدلتے رہیئے۔ ہاتھوں کو معنی خیز انداز میں جنبش دیجئے اور آواز کو بلند و پست کرتے رہیئے۔ اس عمل کو اس وقت تک جاری رکھئے تا آنکہ آپ تقریر کرنے میں عام لیڈروں کی طرح ماہر نہ ہو جائیں۔ پھر اپنے محلہ کے چند پر جوش نوجوانوں کو جمع کیجئے اب انکے روبرو معنی بے معنی دھنواں دھار تقاریر کا سلسلہ جاری رکھئے۔ پھر بلدیہ کے دفاتر کے چکر کاٹئے اور اپنے آپ کو یوں ظاہر کیجئے جیسے اگر آپ کا وجود نہ ہوتا تو محلہ میں غلاظت ہی غلاظت ہوتی۔ نہ صرف انہیں اپنے محلہ کی صفائی کی طرف مائل کیجئے بلکہ اس کارِ خیر میں خود بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیجئے کیونکہ اسی میں آپ کے مستقبل کی بھلائی کا راز پوشیدہ ہے ابتداء میں تھوڑی بہت تکلیف تو ضرور ہوگی لیکن رفتہ رفتہ آپ پر لیڈر شپ کا نشہ چڑھنے لگے گا۔ تب بڑے بڑے لیڈروں سے دوستی کیجئے۔ پھر ایک دن ایسا آئیگا کہ آپ خود بھی ایک بڑے نیتا بن کر چھا جائینگے۔ تب وزارت کے لئے سر توڑ کوشش کیجئے۔ یاد رکھئے کہ اس عظیم المرتبت عہدہ کے لئے اگر آپ چوتھی جماعت بھی پاس ہوں تو سمجھئے بہت کافی ہے عمر اگر ساٹھ برس بھی ہوگئی ہو

تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہیکہ اگر آپ عمر رسیدہ و تجربہ کار ہوں تو اپنے گاڑھے تجربات کی بناء پر ایسے ایسے پختہ کام سرانجام دے پائیں گے جنہیں دیکھکر بڑے بڑے نیتا بھی آپ کے سامنے اپنے آپ کو اُلو سمجھنے پر مجبور ہوجائینگے۔

ترکیب نمبر ۲ :۔ شہر میں اگر کوئی فلم سستی شہرت لئے چل نکلی ہو تو آپ کو اسکے پروڈیوسر کے سر کی قسم آپ اسے ہرگز نہ دیکھئے۔

لیکن اخبارات و پوسٹروں کے ذریعے اپنے بیانات میں اس کی اتنی برائیاں گنوانا شروع کردیجئے کہ لوگ بیچ بیچ اسے انتہائی خراب فلم سمجھنے لگیں۔ ساتھیوں میں اٹھتے بیٹھتے اسی فلم کی بات کیجئے اپنے بیانات میں اس فلم کی موافقت اور مخالفت میں جتنے لوگ پیش پیش ہوں ان کے ناموں کا بہ بانگ دہل خوب چرچا کیجئے یہ سب اتنے بڑے پیمانے پر کیجئے کہ اس فلم کی شہرت میں چار چاند لگ جائیں تب آپ دور سے ان تھیٹروں کا نظارہ کیجئے جہاں یہ بکواس فلم چل رہی ہو تب آپکو بے پر و بے چونچ کے اُلوؤں کا اژدھام دکھائی دے گا۔کیسی رہی ترکیب نمبر دو؟

ترکیب نمبر ۳ :۔ قدرت کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ آدمی کو بڑھاپا آتا آتا نہیں ہے لیکن جب ایک بار آجاتا ہے تو جاتا جاتا نہیں ہے چاہے آدمی لاکھ جتن کرلے۔ اب آپ ایک کام کیجئے بات ذرا راز کی ہے غور سے سنئے کسی معقول حکیم سے چکنی چپڑی باتیں کرکے باضمہ کے معجون کا نسخہ حاصل کرلیجئے تاکہ عوام الناس کو آپ کے قیمتی معجون سے خدانہ کرے کوئی گزند نہ پہنچ پائے۔ اب تھوڑے سے سرمایہ سے اخباروں میں یوں اشتہار دیجئے " جوانی لوٹائیے پہلی خوراک اثر دکھاتی ہے آزمائش شرط ہے ہماری " معجون جوانی لوٹاور " استعمال کیجئے۔ جب آپ کا معجون ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگے گا تب آپ کا بینک بیلنس یقیناً بڑھتا چلا جائیگا کیونکہ اُلوؤں کی تعداد میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔ تب انکم ٹیکس والوں کو اُلو بنانے کی ترکیبیں زبانی رٹ لیجئے آپ کا بیڑہ پار ہو جائیگا۔

ترکیب نمبر ۴ :۔ کسی شام کو اپنے چار چھ ساتھیوں کو ساتھ لے لیجئے آرام سے یکجا ہوکر پہلے گرما گرم چائے پیجئے اور دوران چائے نوشی اچھی طرح لائحہ عمل طے کرلیجئے پھر سیدھے کسی ٹینک بنڈ کا رخ کیجئے اور عین ٹینک بنڈ کے بیچوں بیچ ایسی جگہ کھڑے ہو جائیے کہ جہاں نیچے پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہو تب سب کے ساتھ مل کر پانی میں ٹکٹکی باندھ کر گھورنا شروع کردیجئے ایک راہرو آئیگا اور آپ سے دریافت کریگا کہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں آپ فوراً سنجیدہ ہو جائیے اور اپنا عمل جاری رکھئے۔ پھر اس کا تجسس بڑھے گا آپ اسے بالکل خاطر میں مت لائیے تب آپ دیکھیں گے کہ اس کا تجسس اور بڑھے گا ایسی صورت میں اپنے ایک ساتھی سے کہلوائیے کہ پانی میں ایک نوجوان لڑکی ڈبکیاں لگاتی نظر آرہی ہے۔ تب وہ آپ کے گروپ میں شامل ہوجائیگا اور پھر آپ دیکھیں گے کہ لوگ دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے سولہ ہوتے ہوتے جمع ہونے شروع ہوجائینگے تمام کی نظر پانی پر ٹھیر جائیگی جہاں پانی کے سوا کچھ نہیں نظر آئیگا۔ جب آپ کے لئے گنتی کرنا مشکل ہو جائے کہ کتنے معصوم وہاں حیران و پریشان بے مقصد کھڑے ہیں۔

تب آپ ایک ایک کرکے اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے رفو چکر ہو جائیے پھر دور سے جھانک کر دیکھئے وہاں آپ کو ایک میلہ سا دکھائی دے گا یقین کیجئے کہ وہ تمام کے تمام آپ کے تیار کردہ اُلو ہی ہوں گے الغرض اُلو میں آدمی کو تبدیل کرنے کی اور بھی آزمودہ ترکیبیں ہیں جن پر عمل کرکے آپ اچھے اچھوں کو اُلو بنا سکتے ہیں۔ صرف عمل شرط ہے۔!

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
4-134/11,
ارونا کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد 500008

آزادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح

سنہ ۱۹۴۷ء کو قومی و سیاسی زندگی ہی میں نہیں، ہماری معاشرتی اور ادبی زندگی میں بھی انفرادی اور امتیازی مرتبت حاصل
بس یہی کہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ۔ سیاسی طور پر ہندوستان ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء تک برطانوی سامراج کے زیر نگیں تھا۔
اگست سے آزادی کی دولت سے بہرہ ور ہوا۔ یہ تبدیلی اپنے طویل پس منظر کے باوجود یکلخت تھی لیکن معاشرت اور ادب کی بات او
ایسا نہیں ہوا کہ معاشرت اور معاشرتی اقدار ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء تک کچھ اور تھیں اور ۱۵ / اگست سے بدل گئی ہوں۔ یہی حال شعر و ا
کا بھی ہے۔ یوں کہاں ممکن تھا کہ شاعر اور ادیب جو لکھ رہے تھے انہوں نے ۱۴ / اگست کو اپنا قلم رکھ دیا اور ۱۵ / اگست سے نئے
اور ادیب منظر عام پر آئے۔ ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ معاشرت اور شعر و ادب تو اپنا ایک تسلسل رکھتے ہیں۔ ان کے "آج" کا گز
ہوئے کل اور آنے والے کل دونوں سے رشتہ جڑا ہوتا ہے۔ یہ اپنے ماضی سے متاثر اور مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں، سلسلہ ر
شب کی طرح جو کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا جہاں تک تعلق ہے، ہمارے ہاں ایسے شاعروں کی تعداد خاصی ہے
چند کہ آزادی سے قبل ہی اپنی شناخت بنا چکے تھے لیکن ابھی ان کا قلم جادو جگا رہا تھا۔ ہاں ان میں سے بیشتر کے موضوعات بدل
اسالیب میں تبدیلی آگئی اور لب و لہجے کچھ اور ہو چکے، یہ ضروری بھی تھا!۔

پہلے یہ چیز تھوڑی بہت تھی لیکن عصر حاضر میں طنز و مزاح کو بہ ہر وجوہ زیادہ معاشرتی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ شاعر قبل
صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے مزاحیہ شعر کہا کرتے تھے یا جو اپنے آپ کو مزاحیہ شاعر کہتے تھے ان کا طنز و مزاح بالعموم عامیانہ اور نچلے
کا ہوتا تھا۔ ایسے شاعر زیادہ سے زیادہ صرف ہنساتے تھے۔ معاشرتی شعور کو بیدار کرنے کی سمت ان کی توجہ نہیں گئی تھی۔ قدر و
سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا ان کے پیش نظر یا تو شخصیات تھیں یا ہنگامی موضوعات۔ مسائل سے کسی کو واسطہ نہیں تھا لہذا ر
ہی چوکھا ہوتا تھا، اس کو "اودھ پنچ" اور اکبر الہ آبادی کی دین کہیئے کہ طنز و مزاح کی طرف ممتاز اور قد آور شاعر بھی متوجہ ہونے لگے.
زندگی کو اپنی نظری سے نہیں اپنے نظریہ سے بھی دیکھنے، سوچنے، سمجھنے اور برتنے کی صلاحیت رکھتے تھے، یوں وہ کچھ اور ممتاز کچھ
آور ہوگئے۔ یہ شاعر اپنے اطراف و اکناف سے باخبر تھے انھیں قدروں کے ٹوٹنے بکھرنے کا احساس اور قہقہوں کا ادراک تھا۔ انہوا
سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی موضوعات اور مسائل پر غور و فکر سے کام لیا، بصیرت کا مظاہرہ کیا اور اپنے باشعور ہونے کا ثبوت دیا
کے ساتھ انہوں نے شعری و ادبی تقاضوں کو بھی پورا کیا، رموز فن سے بے توجہ نہیں ہوئے، ہماری شعری روایات کے محرم ر۔

مستقبل کے بارے میں ان کی سوچ نے ان کی شاعری کو جلادی، ان کے فن کو نکھار دیا۔
ملک آزاد ہوا لیکن آزادی نئے نئے مسائل بھی لائی، نئی نئی الجھنیں، نئے نئے پیچ و خم! عوام نے جو خواب دیکھے تھے وہ چکنا چور ہوگئے۔ فیض نے، یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر، کہہ کر بات واضح کی تو شاہد صدیقی نے عوام کے جذبات کی ترجمانی یوں کی کہ رات کے گزرتے ہی اور ایک رات آئی۔ آپ تو یہ کہتے تھے دن نکلنے والا ہے۔ اور شاعروں نے بھی اپنے اپنے انداز سے کہا۔ نئے تناظر نئے حالات درپیش تھے ہمارے شاعروں نے ان سب کو نگاہ میں رکھا۔ کسی نے کم کسی نے زیادہ، یہ بات اور ہے۔ وہ نیز سیاسی موضوعات سے قطع نظر زندگی کے اور رخوں پر ہمارے شاعروں کے طنز و مزاح کے فن پارے اپنی وقعت رکھتے ہیں۔
۱۹۴۷ء کے لگ بھگ اردو ادب کے طنز و مزاح کے افق پر جو شاعر چھائے ہوئے تھے ان میں مجید لاہوری، راجہ مہدی علی خان، ظریف لکھنوی، جوش ملیح آبادی، سید محمد جعفری، شوکت تھانوی، شاد عارفی اور ماچس لکھنوی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ۱۹۴۷ء میں ملک ہی کا نہیں شاعروں اور ادیبوں کا بھی بٹوارہ ہوگیا۔ مجید لاہوری اور سید محمد جعفری وغیرہ پاکستان کے حصہ میں آئے۔ جوش نے بہت بعد میں اور شوکت تھانوی نے تقسیم ہند کے کچھ بعد ہی پاکستان کا رخ کیا۔
جوش کو آپ شاعر انقلاب کہیں یا شاعر شباب۔۔ ان کی انقلابی شاعری ہو کہ شبابی شاعری، جہاں وہاں مزاح کی لطیف آمیزش ضرور ہے اور طنز کی کاٹ جن منظومات میں ہے بنہایت غیر معمولی۔ خاص طور پر سیاسی اور مذہبی مسائل اور کرداروں پر جوش نے طنز کے تیر خوب خوب چلائے ہیں۔ "فتنۂ خانقاہ" "مولوی" اور ایسی کئی منظومات۔
شوکت تھانوی نے بسیار نویسی کے باوجود ادبی معیار کو برقرار رکھا ہے۔ شوکت تھانوی نے زیادہ تر گھریلو اور روزمرہ زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا وہ ہنسانے زیادہ ہیں سیدھی سادی زبان لیکن رواں دواں۔ زبان و بیان اور فن کی نزاکتوں کو بھی انہوں نے ملحوظ رکھا ہے۔
راجہ مہدی علی خان کی شاعری ہماری عام معاشرتی زندگی کا احاطہ کرتی ہے ان کے ہاں مزاح غالب ہے لیکن بعض منظومات مثلاً "ایک جہلم پر" میں طنز کی ضرب کاری ہے۔ سامنے کی حقیقتوں کو طنز و مزاح کے کیپسول میں پیش کرنے کا سلیقہ انھیں آتا ہے۔ عام فہم انداز بیان کا ان کی مقبولیت میں بڑا حصہ ہے۔ "چور اور خدا" "جی اپنے آپ" "ملاقاتی" اور "دستک نیم شب" ان کی اچھی منظومات ہیں۔ وہ نیز پیروڈی نگاری کے سلسلے میں غالب اور فیض کا اور تضمین نگاری کے خصوص میں میر کا کلام ان کی زد میں زیادہ رہا ہے۔ "دستک نیم شب" کے یہ اشعار دیکھئے۔ فیض کی مقبول عام نظم کی پیروڈی ہے۔

تجھ کو میری ہی قسم ختم کر اب تو یہ سوانگ
رات کو کھیل نہ غصے کی یہ پیاری پنگ پانگ
اونچی دیوار سے کودا تو سرک جائے گی مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اور بھی فکریں ہیں بیوی کی محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں بیوی کی راحت کے سوا

کیسے کرسکتا ہوں دن رات میں مجنوں کا رول
کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

شاد عارفی کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے ان کے ہاں طنز و مزاح بھی جاذب توجہ ہے لیکن تنقیدی رجحان ایسا غالب رہتا ہے شگفتگی پیدا نہیں ہوتی ۔ شاعری میں ضرورت سے زیادہ اصلاح پسندی اور تنقید غالب آجائے تو منظوم وعظ ہو جاتا ہے ۔ طنز و مزاح کیفیت پیدا ہو بھی جائے لیکن شاعر اپنے قارئین / سامعین کی توجہ سمیٹ نہیں سکتا ۔

فرقت کاکوروی نے کیا نظم اور کیا نثر ، دونوں پر توجہ دی اور دونوں میں لطافت اور شوخی سے کام لیا ۔ زندگی کے سرد و گرم انہوں نے کچھ ایسے سہا کہ وہ اپنی ذات پر بھی ہنسنا جانتے ہیں ۔ انہوں نے ہر چند کہ عام معاشرتی مسائل پر قلم اٹھایا لیکن ترقی پسند تحریک کی نعرہ بازی اور سطحیت پر ان کی نظمیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔ پیروڈی نگاری میں بھی فرقت کو کمال حاصل تھا ۔ عبدالمجید بھٹی کی نظم "سیدھا سوال" کی پیروڈی "ٹیڑھا سوال" اور میرا جی کی نظم "محرومی" کی پیروڈی "مظلومی" اردو کی اچھی پیروڈیوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں ۔ فرقت نے آگے چل کر جب مشاعروں پر زیادہ توجہ دی اور "تجارتی" مقاصد کو ملحوظ رکھا تو ان کے ہاں گہرائی کم ہوتی گئی جو عموماً مشاعرہ باز شاعروں کا مقدر ہوتا ہے ۔

ماچس لکھنوی کا شمار اس دور کے نامور طنز و مزاح نگاروں میں کیا جانا چاہیئے ۔ ماچس کے ہاں زہرناکی نہیں شگفتگی اور شوخی ۔ ایک تیزی اور چنچل پن ہے وہ موضوعات کو ڈھونڈتے نہیں ، بلکہ موضوعات انھیں ڈھونڈ نکالتے ہیں ارد گرد کے چھوٹے موٹے معاملات سیاست ، معاشرت مذہبی رہنماؤں کی ظاہر داری اور کردار کے کھوکھلے پن کو انہوں نے اس بھرپور انداز سے پیش کیا ہے کہ ہر شعر لگتا ہے ۔ "چاند کار یڈیو اسٹیشن" "مہنگائی" اور "خاندانی منصوبہ بندی" ان کی غیر معمولی عمدہ منظومات ہیں ۔ پیروڈی نگاری میں بھی کو کمال حاصل ہے ۔ اقبال کی نظم "شکوہ" کی پیروڈی "شکوہ شکر" کے بعنوان لکھی اور شکر کی قلت کا بیان کرتے ہوئے ہماری معاشی زندگی کا گویا کچا چٹھا پیش کر دیا ہے ۔ یوں عصری حسیت سے ماچس کی شاعری رچی بسی ہے اور فکری عنصر کی کار فرمائی کے باعث اس کے وزن وقار میں اضافہ ہو گیا ہے انہوں نے نام نہاد مذہبی لوگوں کا مضحکہ دلچسپ پیرایہ میں اڑایا ہے ۔ مولوی صاحب کا حال دیکھئے ۔

اف یہ چالاکیاں ، اف یہ مکاریاں
لومڑی کیا ہوئی ، مولوی ہو گئی

اور شیخ صاحب کی یوں خبر لی ہے ۔

شیخ آئے جو محشر میں تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

اور اسی غزل کے یہ دو خوشگوار اشعار ہیں

اللہ رے ستم وصل کا جس سال تھا وعدہ
وہ ہوگئے دنیا سے اسی سال ندارد

تحقیق کیا ان کا جو شجرہ تو یہ پایا
کچھ یونہی سی ننہیال ہے ددھیال ندارد

سکار لکھنوی کی شاعری بھی ہمارے گھر آنگن کی زندگی اور روزمرہ کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے ۔ انہوں نے نہ تو قومی مسائل پر توجہ دی اور نہ گمبھیر موضوعات کو اختیار کیا ، ان کا طرز ادا بھی ایسا نہیں ۔ وہ عام انسانی زندگی کی بات کرتے ہیں اور یوں کہ عام فہم ہیں ۔ جہاں سکار نے جس موضوع کو اختیار کیا ہے وہ ہے بھی کچھ ایسا ہی ۔ الفاظ کی نشست و برخاست اور پیرایہ اظہار نے رنگ پیدا کر دیا ۔ بڑی دلکش ہو گئی ہے ان کی یہ نظم ۔ عنوان ہے "نور نظر پیدا نہ ہو" سماجی بدحالی ، معاشی بحران جذباتی رشتوں کی کم سے کم ہوتی وقعت اور گویا اپنی ذات سے اٹھتا ہوا ایقان ۔ دو بند میں ۔

کچھ خبر بھی ہے تجھے او بے خبر پیدا نہ ہو مبتلائے رنج و غم ہے گھر کا گھر پیدا نہ ہو
بطن مادر میں تو آیا ہے مگر پیدا نہ ہو آفتوں سے تجھ کو بچنا ہے اگر پیدا نہ ہو
نو مہینے بعد کیا تو عمر بھر پیدا نہ ہو
اس زمانے میں مرے نور نظر پیدا نہ ہو

گھر میں شاعر کے اگر پیدا ہوا پچھتائے گا جھنجھنا بھی اک اگر مانگے گا ٹھینگا پائے گا
گھڑکیوں پر گھڑکیاں ماں باپ کی بس پائے گا شعر کہنے کا سلیقہ ہاں مگر آجائے گا
شعر و غم کے اس نگر میں شیر نر پیدا نہ ہو
اس زمانے میں مرے نور نظر پیدا نہ ہو

ظریف لکھنوی نے اپنی شاعری کے حدود کو صرف ہنسنے ہنسانے تک محدود رکھا۔ جہاں وہاں کبھی معاشرت اور سیاست پر انھوں نے اظہار خیال کیا لیکن بالعموم شعر و ادب کے موضوعات ہی پر گفتگو کی اور مزاح سے آگے نہ بڑھے۔ ان کی نظم "مشاعرہ" کے دو بند ہیں۔

ہے بہت تکلیف دہ شاعر کی وہ جنس عجیب جو سناتے کے لئے بے چین رہتا ہو غریب
اس کو اچھا کر نہیں سکتا کوئی کامل طبیب شاعری کی جس کو بدہضمی ہو بیٹھے کے قریب
چاہتا ہے سب سنادوں جو کہوں اک سال میں
مبتلا ہے شاعری کے سخت تر اسہال میں

پیسے والوں کی سمجھ میں آگئی ہے اب یہ بات صرف بے جا ناچ گانے کا ہے بالکل واہیات
جب کہیں جلسہ خوشی کا ہو کہیں پر ہو برات منعقد بزم سخن ہوتی ہے تا کٹ جائے رات
پہلے ارباب نشاط آتے تھے گانے کے لئے
اب تو شاعر جاتے ہیں غزلیں سنانے کے لئے

سہل لکھنوی نے زندگی کے بعض اہم گوشوں کی کیسے چلتے چلاتے انداز میں نقاب کشائی کردی ہے۔ مزاح کو سخن کا پردہ کرنے کا بھی فائدہ ہے عام فہم زبان نے دلکشی پیدا کردی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ہیں۔

زندگی تھی کہ پیاز کی گٹھی عمر چھلکے اتارتے گزری
غیر مطلب نکال چلتے بنے میری ، عرض گزارتے گزری
بڑھ کے دو لفظ کہنا مشکل تھا دور سے ہی کھنکارتے گزری
"اچھی صورت بھی کیا بری شئے ہے" نظر ان کی اتارتے گزری

طنز و مزاح نگار بالعموم فن زبان و بیان اور انداز اسلوب پر کم توجہ دیتے ہیں۔ ہمارے آس پاس ہی اس کی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ یوں وقتی طور پر مشاعروں میں داد مل جائے، کوئی تالی بجادے لیکن مزاح میں نہ تو وقعت پیدا ہوتی ہے اور نہ اس مقبولیت کی عمر دراز ہوتی ہے۔ ایسا بھی ہے کہ جن اصحاب نے زبان و بیان پر توجہ دی مزاح کو لفظی بازی گری منصور کیا [illegible] لفظی بازی گری کا نام نہیں، مزاحیہ ادب صرف تفریحی ادب نہیں۔ مزاح نگار کا کام محض ہنسنا ہنسانا نہیں، یہ تو سرکس کے مسخرے اور مسخروں کا کام

کے بھانڈ بھی کر لیتے ہیں ۔ اگر سارے آداب و اقدار کو ملحوظ رکھا جائے تو طنزیہ و مزاحیہ ادب ، سنجیدہ ادب سے زیادہ معاشرے اور معاشرت کی خدمت کر سکتا ہے طنز و مزاح نگاروں کا کام عوام کی فکر کو بیدار کرنااور صالح اور صحت مند معاشرے کے لئے فضاء کو ساز گار بنانا ہے ۔ انفرادی طور پر بعض فنکاروں نے ایسا کیا بھی ہے ۔ طنز و مزاح نگاروں کو زبان و بیان کے آداب کو فراموش نہ کرنا چاہئیے ۔ فنی باریکیوں پر ان کی نگاہ ہونی چاہئیے ۔ ان کو اپنے ورثہ سے آگاہ اور عصری صداقتوں کا امین ہونا چاہئیے ۔ اپنے معاشرے کے مسائل سے آگاہی نہیں ان سے جذباتی وابستگی رکھنے کی ضرورت ہے ۔ ان کے موضوعات اور تخیل میں ندرت درکار ہوتی ہے ۔ ہنگامی اور موقتی مسائل پر توجہ دینی چاہئیے لیکن ان کو کشادہ کینویس میں دیکھنے کی ضرورت ہے ۔ طنز و مزاح نگاروں کے اسلوب و لہجہ میں کھنک ہونا از بس ہے اور مجموعی طور پر وہ تیکھا پن جو مزاح کو تہہ دار ، طرحدار ، دلآویز اور پر اثر بنادیتا ہے ۔ ایسا ہو تو طنز و مزاح صرف طنز و مزاح نہیں ہوتا حیات کی تصویر ، تفسیر ، تنقید بلکہ تعمیر بن جاتا ہے ۔ رضا نقوی واہی ، دلاور فگار ، ساغر خیامی ، ہلال سیوہاری اور ناظر خیامی وغیرہ نے طنز و مزاح کے ان تقاضوں سے اپنے فن کو عبارت کیا ہے ۔

رضا نقوی واہی کو فن اور زبان پر کچھ ایسا غیر معمولی قابو ہے کہ ان کا ہر مصرعہ بولتا ہے ۔ ایک آمد ہی آمد کی کیفیت ۔ واہی کا شعری اسلوب مزاحیہ شاعری ہی میں نہیں مجموعی طور پر ہماری شاعری کے اعلیٰ شستہ اسالیب میں شامل ہے انہوں نے اور موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن دنیائے شعر و ادب کے موضوعات گویا ان کے اپنے موضوعات ہیں ۔ ان کے لہجہ میں تیکھا اور ایک دھیما پن ہوتا ہے اور مزاح ایسا کہ فضاء مہک مہک اٹھتی ہے ۔ نغمہ بار ، دلنواز اور دلدار ہو جاتی ہے وہ نہ مزاح کے لئے شاعری کو قربان کرتے ہیں اور نہ شاعری کے لئے مزاح کو ۔ ان کے ہاں دونوں کا اعتبار ملتا ہے ۔ ہاں کہیں کہیں ان کے ہاں طول کلام ضرور ہے ۔ دیگر عنوانات کے علاوہ شاعری ، شاعروں ، شعرستان ، ناقدین ، محققین اور ریسرچ اسکالروں پر انہوں نے کچھ اپنے ہی انداز سے تحریر کیا ہے ۔ پہلے محقق کے باب میں یہ چند اشعار ۔

ہیں بہ زعم خود محقق آپ ہندوستان کے
آپ نے نقطے گنے ہیں میر کے دیوان کے
کاتتے ہیں سوت کو تحقیق کے اتنا مہین
آپ کے آگے جلاہے مات ہیں ایران کے
زیر تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے
کس قدر چوہے پلے تھے گھر میں مومن خان کے
پانچ بج کر پانچ پر یا پانچ بج کر سات پر
داغ نے توڑا تھا دم ، زانو پہ منی جان کے
رند نے اک بتِ وفا کے عشق میں کھائے تھے جو
وہ چھری کے زخم تھے یا گھاؤ تھے کرپان کے
دھن ہے یہ ثابت کریں دلی تھا ملٹن کا وطن
اور سودا کے چچا ہمسر تھے انگلستان کے

اور نظم "بے چارہ شاعر" سے یہ چند اشعار

کہا شاعر نے اپنے دوستوں سے یاروگھر والی
مری غزلوں کے حق میں ہے کلیم الدین اور حالی
بنا رہتاہے میرا گھر سدا میدان پانی پت
اداکرتی ہے وہ کردار احمد شاہ ابدالی
مری خوش فکریاں رہتی ہیں زد میں چاند ماری کی
زباں اس کی لیلیتہ ہے ، دہن بندوق کی نالی
نہ جانے شاعری سے اس کو بغض للہی کیوں ہے
سمجھتی ہے مجھے قوال ، میرے فن کو قوالی
محلے بھر سے شکوہ میری نااہلی کا کرتی ہے
دلوں کو موہ لیتی ہے بہاکر اشک گھڑیالی
کچھ اس انداز سے منہہ گول کرکے بین کرتی ہے
کہ اردو میں کرے تقریر جیسے کوئی بنگالی

دلاور فگار نے بہت بعد میں ترک وطن کیا ہو لیکن ان کی شخصیت کی ساخت پرداخت یہیں ہوئی، ان کا فن نکھرا ستھرا یہیں۔ اردو طنز و مزاح کی تقدیر بدلنے میں وآپی کی طرح ان کا بھی حصہ ہے۔ ان کا انداز ہی نرالا ہے ان کی فکر رسا، نگاہ گہری اور زاویہ تجزیاتی ہے معاشرتی اور ادبی مسائل پر انہوں نے جس خوبی اور ہوشمندی کے ساتھ نظر ڈالی ہے اس کی مثال کم ہی طنز و مزاح نگاروں کے پاس ملے گی۔ نکتے پیدا کرکے وہ کسی بھی بات میں رنگ کو چوکھا کر دیتے ہیں (نثر میں یہی بات یوسف ناظم کے یہاں ملتی ہے) دلاور فگار کے اسلوب میں طرفگی بھی ہے اور تہہ داری بھی۔ "عشق کا پرچہ" "بدایوں کی لاری" "گدھے کا قتل" "انٹرویو" "آٹھواں سہرا" اور "نائٹ غالب" ان کی، قیع منظومات ہیں۔ انہوں نے "شکوہ" کی پیروڈی بھی دلچسپ انداز میں لکھی ہے ان دنوں تھوڑی بہت جو مہمل شاعری ہو رہی ہے اس کو بھی انہوں نے نشانہ بنایا ہے۔ نظم کا عنوان ہے "اے خاصۂ خاصان ادب" یہ ایک بند

اب شعر ہے ہر جملہ بے معنی و موزوں　　لیلیٰ کی کہانی ہے نہ افسانہ مجنوں
تشریح کرے اس کی کوئی یوں تو کوئی یوں　　مطلب مگر اس کا نہ سمجھ پائے فلاطوں
مطلب ہی نکل آئے تو پھر شعر ہی کیا ہے
اے خاصہ خاصان ادب وقت دعا ہے

دلاور فگار کے دو، ایک قطعات بھی ملاحظہ فرمالیں۔

شاعروں کا اک عظیم الشان جلسہ تھا فگار　　حاضرین بزم تھے اس بزم میں گنتی کے تین
اک جناب صدر ، اک سکریٹری ، اک سامعین　　اور ان تینوں کی تفصیلات بھی سن لیجئے

گرانی ، مفلسی ، بے روزگاری ، قحط ، بیماری
یہ فتنے کیا ہماری موت کا کاشن نہیں دیتے
مگر یہ خوش بیاں لیڈر یہ ناکارہ سیاستداں
فقط بھاشن دیتے جاتے ہیں اور راشن نہیں دیتے

فن تاآنکہ زندگی کے مسائل کا احاطہ نہیں کرتا اس میں برگزیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ عظیم فنکار کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کو اس کے وسیع کینوس میں دیکھے۔ وہ کینوس جو رنگ، نسل، مذہب، جنس، علاقہ اور اعتقاد سے ماورا ہو۔ عظیم فنکار کی منزل انسانیت ہوتی ہے۔ ساغر خیامی ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے قومی ہی نہیں بین قومی صورت حال پر بھی نظر رکھی۔ انسان دوستی اچھے فنکاروں کا مذہب اور ایمان رہا ہے۔ "اگر جنگ ہوگئی" جیسی منظومات ان کی انسان دوستی کی آئینہ دار ہیں، طنز و مزاح کی چاشنی تو اپنی جگہ ہے ہی۔ دو بند دیکھیے :

ابر ہوگا نہ سمندر نہ زراعت ہوگی دھرتی ہوگی نہ ہوا اور نہ حرارت ہوگی
بم جو برسیں گے خلاؤں سے قیامت ہوگی عالمی جنگ سے دنیا کی یہ حالت ہوگی
قیس دکھلائی نہ دیں گے کہیں چھونے کے لئے
ہاتھ آئیں گے نہ لیلائیں نمونے کے لئے

گیس بن جائے گا ہر پھول چمن زاروں میں بھر نیا جائے گا انسان کو غباروں میں
بیٹھ کے دوستو رفتار کے طیاروں میں بھاگ جائیں گے بڑے لوگ تو سیاروں میں
بھوت رہ جائیں گے مردوں میں سمانے کے لئے
مولوی ہوں گے نہ یسین سنانے کے لئے

جاڑے کے بارے میں ان کی نظم "جاڑا" از ابتدا تا انتہا غیر معمولی ہے۔ ابتدائی دو بند ملاحظہ ہوں۔

ایسی سردی نہ پڑی ایسے نہ جاڑے دیکھے دو بجے دن کو اذاں دیتے تھے مرغے سارے
وہ گھنا ٹوپ نظر آتے تھے دن کو تارے سرد لہروں سے جمے جاتے تھے مئے کے پیالے
ایک شاعر نے کہا چیخ کے ساغر بھائی
عمر میں پہلے پہل مجھ سے چائے کھائی

آگ چھونے سے بھی ہاتھوں میں نمی لگتی تھی سات کپڑوں میں بھی کپڑوں کی کمی لگتی تھی
وقت کے پاؤں کی رفتار تھمی لگتی تھی راستے میں کوئی بارات جمی لگتی تھی
جم گیا پشت پہ گھوڑے کی بچارا دولہا
کھود کے کھرپی سے سالے نے اتار دولہا

اسمٰعیل ظریف، برق آشیانوی، امام رائچوری، اعجاز وارثی، ناظم انصاری، محبوب راہی یہ اور ایسے کئی شاعروں نے صرف برائے مزاح شاعری نہیں کی بلکہ ادب اور زندگی کی عالی قدروں کو اپنے اپنے زاویہ اور ظرف کے مطابق ملحوظ رکھا، فنی باریکیوں پر توجہ دی، پھکڑ بازی سے گریز کیا اور شستگی اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کے ہاں لطافت بھی ہے اور رچاؤ بھی۔۔۔ اس سلسلہ میں، میں طالب خوندمیری کا نام لوں گا۔ طالب خوندمیری نے طنز و مزاح میں اپنی پہچان بنالی ہے۔ ان کے ہاں معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز، تلخ و ترش اور خوب و خراب کی عکاسی لائق دید ہے۔ انہوں نے تاحال جو لکھا ہے اس میں وزن و وقار ہے لیکن آئندہ ان سے اور امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ "آرکیٹیکٹ غالب" "اور غالب کے بارے میں" کسی کی منظومات و نیز "تین سہیلیاں" "قسمت محبوب ہے پی" اور "سیاسی موڈ" میں ان کا فن بلندیوں کی طرف مائل ہے۔ مواد، زبان و بیان اور پیرایۂ اظہار ہر زاویہ سے۔۔۔ بڑی بات یہ ہے کہ

انہوں نے کہیں ادبی اقدار کا سودا نہیں کیا۔ ان کے مصرعوں میں بھی ان کا امتیاز ہے۔ "ایک شاعر کا سیلف پورٹریٹ" کا یہ بند ملاحظہ ہو

بہت بیزار ہوں میں اپنے گھر سے　　وہاں رہتا ہوں کم بیگم کے ڈر سے
یہ فیض شاعری یہ وقت آیا　　کہ خود اپنے ہی بچوں کی نظر سے
میں وزن شعر کی صورت گرا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

طالب خوندمیری کا مقصود صرف مزاح نہیں، وہ قاری کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے اور غور و فکر کے لئے آمادہ کرتے ہیں "شہر حیدرآباد کی نذر" یہ قطعہ ملاحظہ ہو

دور سے یہ گھر بھی دلکش تھا مگر　　پاس سے دیکھا تو کیا دھوکا ہوا
" ایں عمارت تا قیامت پائیدار "　　گرتی دیواروں پہ تھا لکھا ہوا

اور یہ قطعہ بھی سن لیں، لہجہ کی کاٹ توجہ چاہتی ہے۔

تیس برسوں سے سے زیادہ ہوگئے　　رخ نہیں پلٹا مگر حالات کا
ہم کو آزادی ملی تھی رات میں　　سلسلہ باقی ہے اب تک رات کا

اور یہ اسمٰعیل ظریف ہیں۔ زبان بھی سادہ و سلیس اور لہجہ بھی دلآویز۔ مسائل وہی جن سے ہم سب واقف ہیں۔ دو اشعار ہیں۔

آنگن میں پڑوسی کا نیا مرغ کھڑا ہے　　افسوس کہ اب گھر میں چھری ہے نہ چھرا ہے
مولانا سے ایسی تو توقع نہیں لیکن　　چندے کے حسابات میں کیوں فرق پڑا ہے

سلیم مقصود نے بھی کچھ ایسے ہی موضوع کو اختیار کیا ہے۔ دوسرے شعر میں بلدیہ کی کارکردگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ اشعار

لوگ کہتے ہیں کہ حضرت شیخ صاحب مرگئے　　بخش دے یا رب ! بچارے جتنے گھپلے کرگئے
شہر میں کچھ آدمی ایسے بھی غیرت دار تھے　　بلدیہ کے " مین ہولوں " میں گرے اور مرگئے

برق آشیانوی نے نظم اور نثر دونوں کو اختیار کیا اور موضوعات وہی جو عام فنکاروں کے رہے۔ ہمارے بدلتے ہوئے تعلیمی نظام کے اس رخ پر بہت کم کی نظر گئی ہے۔ برق نے کہا۔

سیکس ایجوکیشن شریک درس ہونا چاہیے　　لیکن اس میں احتیاط اس بات کی فرمایئے
جس قدر تعلیم ہو اسکول ہی پہ دیجئیے　　ہوم ورک اس کا مگر بچوں سے مت کروایئے

پاگل عادل آبادی نے زیادہ تر تفریحی شاعری کی ہے لیکن ان کے بعض اشعار عصری حسیت سے بھرپور ہیں۔ بڑی سادگی لیکن پرکاری کے ساتھ وہ مسائل کی سمت توجہ دلاتے ہیں۔ آپ مسکرادیں لیکن متعلقہ شخصیات..... نہ جانے ان پر کیا گذرتی ہو۔ غزل کے یہ اشعار

معتمد نے گھر خریدا ، صدر نے لی پھٹ پھٹی　　ہوگیا چندہ غبن آدھا ادھر ، آدھا ادھر
لیڈروں کا بس چلے تو بول کر گاندھی کی جے　　بانٹ لیں گاندھی بھون آدھا ادھر آدھا ادھر

اور یہاں بھی ہماری پریشانی کا تذکرہ کرتے ہوئے کھدر پوش لیڈروں کی کرامت پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ راہی قریشی کا شعر

ہے۔

ہماری شیروانی ہے یہاں وجہ پریشانی جسے کھدر میسر تھا اسے سب کچھ ملا آخر

ہماری معاشرتی زندگی جن آلام و مصائب، انتشار و اختلال اور الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہے اقبال شانہ اس کی بھرپور عکاسی کرنے میں بڑے کامیاب ہیں۔ یہ غزل کے لحاظ و اختصار کا بھی حسن ہے اور خود شاعری کی فن پر قدرت کا شعر ملاحظہ ہو۔

گرانی، ناتوانی تنگ دستی اور فاقہ ہماری زندگی افکار کا دار الخلافہ ہے

فنکار کی نظری نہیں اس کا زاویہ نظر بھی بدلا ہوا ہوتا ہے۔ عام انسان مسائل پر ان پہلوؤں سے غور نہیں کرتا لیکن فنکار جس زاویہ سے منظر کو دیکھتا ہے وہ کیفیت ہی اور ہوتی ہے۔ جوہر سیوانی کا یہ شعر

بخت بندر میں تھا کل والوانسان ہونا آج "ننگی" کا مقدر ہے بی اماں ہونا

اور عبدالکریم ماہر نے معاشرتی زندگی کے جس پہلو کو اجاگر کیا ہے وہ بارہا ہماری نگاہوں سے گزر چکا ہے بلکہ عجب نہیں ہم میں سے کئی اس قطعہ کے ہیرو ہوں۔ ملاحظہ ہوں۔

قدِ رعنا کی زیبائش نئی ہے مکاں بوسیدہ آرائش نئی ہے
چمک سی آگئی ہے جھریوں پر پرانا شوز ہے پالش نئی ہے

سیاستدانوں نے جہاں گاندھی جی اور نہروں کے ناموں کا استحصال کیا ہے دنیائے شعر و ادب میں بھی ہمارا رویہ کچھ ایسا ہی ہے۔ اقبال کے تعلق سے ہماری عقیدت پر کیسی چوٹ ہے، طنز ہے کتنا کاری۔ خواہ مخواہ کہتے ہیں۔

درس خودی کو ان کے سبھوں نے بھلا دیا اقبال صرف قومی ترانے میں رہ گئے

اور یہ بھی دنیائے شعر و ادب کی بات ہے۔ ان دنوں یونیورسٹیوں میں ریسرچ کا جو حال احوال ہے اس کی کیفیت بھی سن لیجیے ہم میں بہت سے ان کی تصدیق کریں گے۔ مجیب الرحمن بزمی کہتے ہیں۔

میر پہ تھیسس لکھکر اس نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی میر کا شعر سمجھنے سے ذہن ہے جس کا عاری جی

ایک اور معاشرتی مسئلہ ایک اور تلخ حقیقت قیسی قمر نگری کا شعر ہے

تحفتاً اک کار اور بنگلہ خسر نے دیدیا تب کہیں دلہا کو دلہن کا کفر اچھا لگا

یہ وہ شاعر ہیں جنہوں نے یا تو پورے طور پر اپنے آپ کو طنز و مزاح کے لئے وقف کر دیا یا جن کی شاعری کا معتد بہ حصہ طنز و مزاح کا حاصل ہے لیکن ہمارے ہاں ایسے اصحاب بھی ہیں جنہوں نے یا تو سنجیدہ شاعری کی یا طنزیہ و مزاحیہ نثر یا تحقیق اور تنقید وغیرہ پر توجہ دی ہاں کبھی کبھی منہ کی ذائقہ بدلنے کے لیے طنزیہ و مزاحیہ شاعری سے کام لیا۔ ایسے اہل قلم میں پروفیسر گیان چند جین، نرسندر لوتھر، دلیپ سنگھ، یعقوب عمر، مناظر عاشق ہرگانوی، اسلم عماری، عزیز قیسی، مضطر مجاز اور مجید بیدار وغیرہ ہیں۔ میں یہاں صرف پروفیسر گیان چند جین کے ایک دو غزلہ سے اشعار درج کرتا ہوں۔

نقل کرکے طلبا فرسٹ ڈویژن لائے ہم اسے اپنی ریاضت کا ثمر کہتے ہیں
میری آنکھوں میں سدا دھول ہی جھونکی اس نے اہل ارشاد جسے نور نظر کہتے ہیں
بانئے رے شوق پی ایچ ڈی کے ہمارے نگراں ڈھونڈ کر لائیے چہ سیر شکر کہتے ہیں
شرح بھی ساتھ میں چھپوایا کریں بندہ نواز آپ الجبرے کے اشعار اگر کہتے ہیں

دکنی شاعری کو نہ جانے کیوں عام طور پر من حیث المجموع طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے زمرے میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ دکنی میں بھی طنزیہ ومزاحیہ شاعری ہوتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر دکنی شاعر طنزیہ ومزاحیہ شاعر ہو۔ خود ہمارے سلیمان خطیب کی شاعری اس خانے میں نہیں آتی۔ انہوں نے طنز ومزاح سے خوب خوب کام لیا ہے لیکن دکنی میں خالص سنجیدہ اشعار سے بھی ان کی آبرو بلند ہے۔ دوسری بات یہ کہ دکنی اپنی ایک انفرادی اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات خاطر نشین رہے کہ دکنی بگڑی ہوئی اردو کا نام نہیں ہے جیسا کہ فی زمانہ بیشتر شاعر بگڑی ہوئی اردو میں شاعری کرتے ہوئے بہ زعم خود دکنی شاعر کہے جاتے ہیں۔ اس زاویہ سے دیکھا جائے تو اس عہد میں دکنی میں شاعری کرنے والے صرف چند شاعر ملیں گے جنہوں نے واقعی طنز ومزاح سے کام لیا۔ میں یہاں بس تین چار شاعروں کا ذکر کروں گا۔ سب سے پہلے علی صائب میاں۔

علی صائب میاں کا دکنی شاعری میں خاصا اونچا مقام ہے لیکن انہوں نے خود کو مسائلی شاعری سے دور ہی رکھا ان کے ہاں طنز بھی کم ہے، مزاح کا عنصر غالب۔ نئی شاعری پر علی صائب میاں کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

گمی ترئی ، املی کے بوماں لگ گئے انجیر کو
اک گھیری بند دیئے ہیں بھینس کی زنجیر کو
شاعراں اب بول رئیں نوے رقم کی شاعری
ایک مصرعہ تیر کو تو ایک مصرعہ میر کو

سرور ڈنڈا نے دکنی میں شاعری کی اور خوب کی۔ نظم اور غزل دونوں میں انہوں نے اپنا رنگ پیدا کیا ڈانڈا کی اپنے عہد کی سیاست اور معاشرت پر گہری نظر تھی اور انہوں نے دو ٹوک انداز میں اظہار خیال بھی کیا ہے۔ وہ نہایت گہرائی کے ساتھ اور سیاق و سباق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسئلہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ لہجہ بھی کچھ ایسا کہ پڑھیے اور سر دھنیے۔ ڈنڈا کی ایسی منظومات میں "شاہ پور واڑی" "ادے ناماد لیثم"، "جھنا کی عرضی"، "ڈنڈا کتھا"، "اردو کی پگڑی پھو"، "ڈھولک کا گیت" اور "شانتی بنکھا" اپنی مثال آپ ہیں۔ "ادے ناماد لیثم" کے یہ بند۔ ملاحظہ ہوں۔

سراں میرے گاداں پو غربت کا موسم
نہ فاقوں سے فرصت نہ دم پچ ہے دم
یاں دھوتی بھی گت نئیں واں ان کو ہے ریشم
ادے ناماد لیثم ، ادے ناماد لیثم

جاں جینے پو ٹیکساں ، جاں مرنے پر ٹیکساں
جاں جنور سے بدتر ہیں بے چارے انساں
جاں ملنا بھی مشکل ہے بیڑی کے دو دم
ادے نا ماد لیثم ، ادے ناماد لیثم !

اردو کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمالیں

بڑے منت مراداں سے ترقی مینجر رئی تھی
مراحق مار نے بارا تو ام۔ ال۔ اے کا سالا ہے

سلیمان خطیب کا شمار بھی انہی شاعروں میں ہوتا ہے جن سے اس دور میں دکنی شاعری کی آبرو قائم تھی۔ سلیمان خطیب نے معاشرتی مسائل پر زیادہ توجہ دی اور اصلاحی مقصد کو ہمہ وقت پیش نظر رکھا روزانہ زندگی کے معاملات، شادی بیاہ، جوڑا جہیز، لباس، فیشن کلرک، پڑوسی، ٹیڈی کلچر، جدید فیشن، انتخابات، بیوی...... غرض ایسے ہی موضوعات ان کے ہاں بہار دکھاتے ہیں اور پھر اپنی منظومات کے دیہی اور گھریلو پس منظر کی وجہ سے ان کی ہاں ایک اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات وغیرہ سے انہوں نے خوب خوب کام لیا ہے۔ سلیمان خطیب کی نظموں میں "پہلی تاریخ"، "ساس بہو"، "چھورا چھوری"، "راستے"، "چچے"، "پڑوسن"، "مزاج کا پلنگ"، "جدید مصور" اور نقاد وغیرہ اپنے طنز ومزاح کے باعث خاصی معروف ہیں۔ نظم نقاد کا پہلا بند ہے۔

لے کو بیٹھیں سب کتاباں بنڈیاں بھر کو چو طرف
بھئی کو دیکھو پیٹ چیرو تو تیں نکلتا اک حرف
چار مضمونان چراکو ، چار حرفاں جوڑ کو
ایک نوّا گھر بنائیں سو گھراں کو توڑ کر
اب فرق کر نچ تئیں اپنے میں اور سقراط
اک میٹرک کیا نکالیں آٹھ نو اقساط

و نیز "تنگ پتلون" کا یہ بند بھی سن لیں

اک صاحب نماز میں یارو تنگ پتلون چڑھا کو آئے تھے
انوں کنڑ کو تھے بس اقامت میں لوگاں سجدے میں سرجھکائے تھے

گلی نلگنڈوی نے بھی دکنی میں رنگ پیدا کیا لیکن بڑی حد تک تفریحی۔ مسائل کے چکر میں وہ کم ہی پڑے۔ ہاں کہیں کہیں معاشرتی بحران کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ یہ دو اشعار

کڑکی میں بھی چھوڑے نئیں بھئی آخر مجھے جھاڑے ناں
اپ اپ سے میں خوش تھا زندہ مجھ گاڑے ناں
عید گزر گئی ، بات گزر گئی ، یاراں ، میرے کیا بولوں
تھا سو ایک بش شرٹ پرانا ، گلے مل کو پھاڑے ناں

حمایت اللہ نے عصری اردو آمیز دکنی شاعری کی ہے ان کے ہاں مسائل اور موضوعات وہی ہیں جو بالعموم اور شاعروں کے یہاں ملتے ہیں حمایت اللہ کی بعض نظمیں بے حد معروف ہیں۔ میں یہاں ان کی غزلوں سے دو اشعار درج کرتا ہوں جن میں ہلکا سا تغزل جھلکتا ہے۔

ہزاروں دلوں کو انگل کو چلے گئے ___ میرا بیگلا دل کھندل کو چلے گئے
دیدہ تو کریں پن کی آئیں کی نیں آئیں کی
جھاڑیوں کو غم کے میرے ڈھائیں کی نئی ڈھائیں کی

آزادی کے بعد دکنی کے اور شاعر ہیں اشرف خوند میری ، بگڑ رائچوری ، سراج نرملی ، ڈھکن رائچوری اور ایسے کئی نام مل جاتے ہیں جن کے ہاں کم یا زیادہ طنز و مزاح ملتا ہے۔

یہ موضوع ایک ضخیم کتاب یا طویل ترین مقالے کا متقاضی تھا۔ میں نے اختصار ، غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے۔ مثالوں سے بھی ممکنہ حد تک گریز کیا ہے۔ ابھی ایسے کئی شاعر ہیں جن کے ناموں اور اقتباسات کی شمولیت ضروری تھی لیکن ظاہر ہے میرا مقصد فہرست سازی نہیں اس لئے نام درج کرنے سے گریز کرتے ہوئے یہی عرض کروں گا کہ آزادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح کا رنگ گہرا ، بھرپور اور تیز رہا اور آئندہ کے لئے امکانات مزید روشن ہیں۔ میں اردو میں طنز و مزاح کے مستقبل سے نہایت پر امید ہوں

شفیقہ فرحت
24 ، تاپتی اپارٹمنٹ، روشن پورہ
بھوپال، 462002

ہر چند کہیں کہ ہے مگر نہیں ہے "مسیح انجم"

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو بجلی کی طرح چمک کر آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتیں راہ چلتوں کی توجہ کا مرکز نہیں بنتیں۔ نہ انہیں پہننے اوڑھنے کا سلیقہ آئے نہ باتیں بنانے کا فن، نہ بال جھٹکنے کا اسٹائل نہ سگریٹ کے کش لینے کی ادا، بس کچھ ایسے ہی تھے مسیح انجم۔ سکڑے سکڑے، جھکے جھکے، دھندلے دھندلے، مگر اس دھندلے پن اور بے نوری کے اندر خلوص اور وفا کا اجالا۔ انسانیت کی روشنی، علمیت کا نور سب ہی کچھ پھوٹا پڑتا تھا۔ لیکن دیئے کے لو کی سی مدھم روشنی بھی بڑی مشکل سے آپ تک پہنچتی تھی۔ یا یوں کہئے کہ اس تک پہنچنے کے لیے آپ کو بڑی ریاضت کرنی پڑتی تھی۔

تقریباً تیس سال پہلے انہیں پہلی بار دیکھ کر بھی یہی تاثر پیدا ہوا۔ اور پچھلے سال آخری بار دیکھنے ملنے پر بھی یہی تاثر قائم رہا۔ پہلی بار انہیں تیس سال قبل مجتبیٰ حسین کا سایہ بنے زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ کانفرنس میں دیکھا۔

ایک مختصر سے کم عمر صاحبزادے جیسے مسیح انجم۔ جب تک وہ اسٹیج پر نہیں آئے تب تک سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ لکھتے بھی ہیں اور جب مضمون سنا تو یقین ہوا کہ یہ نہ صرف لکھ لیتے ہیں بلکہ سننے پڑھنے والوں کو مسکرانے ہنسنے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ مضمون تو قدرے سیدھا سیدھا سا تھا۔ لیکن اس سادگی میں بھی کہیں کہیں مزاج کی لپک اور طنز کی کاٹ تھی۔

اس سادگی کے پیکر اور خلوص کے مجسمے سے دوسری بار ملاقات بھوپال کانفرنس میں ہوئی۔ اس کانفرنس کے متعلق کیا عرض کروں۔ جنہوں نے بھگتا دکھ جھیلے، ہم تو ان کی ہمت، حوصلے اور صبر کی داد دیتے ہیں۔ ان مظلومین میں مسیح انجم بھی تھے۔ یہاں ان کی سادہ طبیعت کے بہت سے پہلو نمایاں ہوئے سب نے حسب مقدور کسی نہ کسی قسم کا "حلفیہ بیان" دیا۔ مگر ان کی زبان سے ایک حرف ناروا نہ نکلا۔ آدھی ادھوری شکایت بھی لبوں تک نہ آئی۔

پھر تو چندی گڑھ، لکھنو، بمبئی، ہر جگہ ساتھ رہا۔ ایک ہی برادری کے جو ہوئے! اس کے علاوہ حیدرآباد کے زندہ دل، ہر سال سر جوڑ کے بیٹھتے اور قہقہے لگاتے اور سامعین و حاضرین و ناظرین کے دلوں میں شگوفے کھلاتے۔ سو کتنی بار مسیح انجم سے ملاقات ہوئی اس کا ہی کھاتہ تو رکھنا ممکن نہیں۔ البتہ ایسے چند مواقع یاد کئے جا سکتے ہیں جب مسیح انجم نے شرکت نہیں کی یا ہم نہیں پہنچ پائے۔

جب مسیح انجم ہوتے ان کی موجودگی کی خبر نہ لگتی۔ لیکن جب اور جہاں نہ ہوتے وہاں ان کے نہ ہونے کا شدت سے احساس ہوتا۔ سٹیج سونا سونا لگتا اور بہت سے لوگ ادھورے ادھورے لگتے۔ کیوں کہ وہ مضمون پڑھنے کے علاوہ بہت سی ذمہ داریاں سنبھالا کرتے

تھے۔ وہ منتظمین کے ہاتھ پاؤں تھے۔ اس خاموشی اور اعتماد سے کام کرتے کہ کبھی ہڑبونگ نہ مچتی اور کہیں کوئی کمی نہ رہتی۔
جتنے سنجیدہ وہ نظر آتے اتنی ہی سنجیدگی سے مضمون سناتے۔ مگر سنجیدگی کی چادر تو وہ اوڑھے رہتے اور قہقہوں مسکراہٹوں کے جال میں سننے والے لاشعوری طور پر کھنچتے چلے جاتے۔ یہی مزاح کی کامیابی کی دلیل ہے۔ یہ نہیں کہ آپ ہی لکھیں۔ آپ سنائیں اور آپ ہی ہنسیں۔

مسیح انجم کے فن میں پختگی آہستہ آہستہ پیدا ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ہی ان کی شہرت پھیلتی گئی۔ ملک کی سرحدوں کو پھلانگ کر غیر ممالک تک شہرت اور مقبولیت کے ساتھ ان کی تصانیف کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ "سائیڈ سے چلیے"، "در پردہ"، "چنانچہ"، چوتھی اور آخری"، "طرفہ تماشہ" جو انہوں نے ۳ ستمبر ۹۷ء خود بہ نفس نفیس پیش کی اور اس میں تاریخ کے ساتھ وقت بھی لکھ دیا۔ "۸ بجے شب" شاید انہیں کسی چینل سے خبر مل گئی تھی کہ زندگی کی "آخر شب" بس دہلیز پہ کھڑی ہے۔

یہ کتاب انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے جلسے میں عنایت کی گئی تھی۔ جلسے میں جیلانی بانو نے تقریر کی اور مسیح انجم نے میرا خاکہ پڑھا۔ حیدرآباد میرے لئے وطن ثانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ میری بہن اور بہنوئی عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ۱۹۹۵ء میں بہنوئی کا انتقال ہوا۔ سال ڈیڑھ سال بعد بہن اور ان کے بچوں نے حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر مستقل طور پر امریکہ میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ مکان وغیرہ فروخت کیا گیا۔ مجھے بھی ان کاموں میں کہ جن کا مجھے کوئی تجربہ نہیں مدد کے لیے تقریباً ڈیڑھ دو مہینے حیدرآباد رہنا پڑا۔ اس کے بعد حیدرآباد سے میرا خاندانی رشتہ منقطع ہونے والا تھا اور وہ ہو گیا۔ البتہ ادبی اور جذباتی رشتے ہمیشہ باقی رہیں گے۔ ویسے جیلانی بانو نے سختی سے منع کیا ہے کہ میں یہ خیال دل میں اور ایسی بات زبان پر بھی نہ لاؤں اور انہیں اپنی سگی بہن کی جگہ سمجھوں اور ان کے گھر کو اپنا گھر۔ واقعی وہ اور انور بھائی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں اور مجھے بھی بے حد عزیز ہیں۔

بہر حال جلسہ ہر اعتبار سے بہت کامیاب رہا اور مسیح انجم کا تحریر کردہ خاکہ بھی۔ وہ خاکہ میں نے ان سے لینے کی کوشش کی تو انہوں نے کہا۔ نظر ثانی کے بعد دیں گے۔ لیکن افسوس نظر ثانی کی نوبت ہی نہ آئی کہ اتنی مہلت ہی نہ ملی۔ پہلے ان کی آنکھوں کا آپریشن ہوا اس کے نتیجے میں صحت نے ان سے مذاق کرنا شروع کیا۔ پھر زندگی طنزیہ وار کر گئی اور موت نے ایک آسان کیچ کی طرح انہیں دبوچ لیا۔
اس بار میں نے انہیں کئی برس بعد دیکھا تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے کچھ بال سفید ہو گئے تھے کہ وہ تو ہونے ہی تھے۔ سیاہ کو سفید کرنا ہر شعبے کے ماہرین کا محبوب مشغلہ ہے۔ پھر عمر کیسے پیچھے رہ جاتی۔ ویسے اس کے علاوہ کوئی خاص تبدیلی ان میں محسوس نہیں ہوئی۔ نہ گذرتے ہوئے وقت کی کوئی بہت گہری چھاپ دکھائی دی۔ سنجیدہ وہ پہلے ہی تھے۔ ایسی سنجیدگی کی چادر میں عمر کہیں چھپی تھی۔ جب انہوں نے بتایا کہ دو سال پہلے ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں تو قدرے حیرت ہوئی۔ کسی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا تو مسیح انجم کی فطرت ہی نہ تھی۔ پھر ملازمت نے انہیں کیسے چھوڑ دیا۔ مجھے لگتا ہے آخری طور پر وہ اپنی ڈیوٹی پر ضرور جایا کرتے ہوں گے پابندی سے نہ سہی گاہے گاہے۔

مزاح نگاروں کی یہ بڑی نایاب قسم ہے جس میں مزاح سامنے ہوتا ہے اور مزاح نگار پیچھے۔ پردہ میں ہٹا ہٹا کر اسے دریافت کرنا پڑتا ہے، سامنے لانا پڑتا ہے اور ابھی مسیح انجم پوری طرح سامنے آئے بھی نہ تھے کہ پھر پردے کے پیچھے غائب ہو گئے۔
لیکن ادب کے اوراق پر وہ ہمیشہ موجود رہیں گے۔ پوری تابندگیوں کے ساتھ۔

پروفیسر آفاق احمد
گل کدہ، 8، عید گاہ ہلز
بھوپال 462001

رشید احمد صدیقی اور تخلص بھوپالی
دو شہر، دو تہذیبیں، دو مزاح نگار

بھوپال اور علی گڑھ محض دو شہر نہیں ہیں بلکہ دو تہذیبی مراکز ہیں۔ بہت سی باتوں میں بالکل ایک دوسرے جیسے اور کچھ باتوں میں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ۔ ان دونوں شہروں میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان دونوں کی تہذیب، اردو تہذیب ہے۔

اردو مزاح کی کوئی بھی تاریخ اس وقت تک وقیع اور معتبر قرار نہیں دی جا سکتی جب تک ملا رموزی اور رشید احمد صدیقی کے کارناموں سے اسے اجلانہ کیا گیا ہو۔ بعد میں بھوپال کے ایک نام کا اور اضافہ ہوتا ہے وہ عبد الاحد خان تخلص بھوپالی کا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ رشید احمد صدیقی اور عبد الاحد خاں تخلص بھوپالی کے سوچنے کے انداز میں حیرت ناک حد تک یکسانیت تھی۔ دونوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے جو اسلوب اختیار کیا، وہ طنز و مزاح کا تھا۔ دونوں ان صالح قدروں کو عزیز رکھتے تھے جو قدیم تہذیب کی اعلیٰ روایات کی پاسدار تھیں۔ دونوں اردو زبان کے عاشق تھے۔

رشید احمد صدیقی کا خیال تھا کہ

> "اردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود کسی فتور کی علامت ہے۔ اردو کا نام علی گڑھ بھی ہے۔"

تخلص بھوپالی، بھوپال کو "سرزمین خان" کے نام سے پکارتے تھے اور اسے شہر اردو کہتے تھے۔

رشید صاحب غالب کے اس حد تک شیدائی تھے کہ ان کے مضامین، انشائیوں اور خاکوں میں غالب ضرور کہیں نہ کہیں سے در آتے ہیں۔ تخلص بھوپالی اس معاملے میں اس حد تک آگے تھے کہ وہ شاعری کرنے کو بھی "غالبی" کا نام دیتے تھے

لیکن خیالات کی اس یکسانیت اور موضوعات کے اس اشتراک کے باوجود رشید صاحب اور تخلص بھوپالی کا رنگ تحریر ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ جہاں رشید صاحب کے مزاح میں ایک عالمانہ شان، ایک نکھرا ستھرا لطیف انداز اور خندہ زیر لب کی کیفیت نظر آتی ہے وہاں تخلص بھوپالی کے یہاں خالص عوامی زبان، اس میں بھوپالی روزمرہ اور جس طرح بولتا اسے اسی طرح لکھ دینے کا ذھیٹ انداز ملتا ہے۔

جس طرح رشید احمد صدیقی کو "تب و تاب" "رنگ و آہنگ اور صورت و معنی" کی دولت علی گڑھ نے ودیعت کی تھی بالکل اسی

طرح تخلص بھوپالی کو یہ سب بھوپال کی اس بروکٹ بھوپالی تہذیب سے ملا تھا جس میں پٹھانی بے باکی شامل تھی۔

رشید صاحب کی پوری زندگی یونی ورسٹی کے علمی ماحول میں گزری۔ ان کا دائرہ کار اور حلقہ احباب دونوں ہی علمی و ادبی تھے۔ جونپور کا ماحول بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ جب کہ تخلص صاحب کی زندگی عوام کے درمیان اس طرح گزری کہ ٹیلرنگ سے لے کر فوج کی ملازمت تک اور پھر موٹر کے کل پرزوں کی دکان سے تجارت استخواں تک کتنے ہی پیشوں سے وہ وابستہ رہے۔ ماحول جاگیردارانہ اور سلسلہ نسب اس فوجی خاندان سے جو سردار دوست محمد خان بانی بھوپال کے ساتھ وارد بھوپال ہوا تھا۔

تخلص صاحب کو "تجارت استخواں" اتنی راس آئی کہ بیویاں، بچے، باغ، بنگلہ سب کچھ میسر تھا اور ان کی زندگی میں "ب" کا عمل دخل اتنا بڑھا کہ "باکار" ہونے کے ساتھ ساتھ رئیسوں والے روگ بلڈ پریشر کا مستقل شکار رہے لیکن جان دی اس سے بھی زیادہ رئیسوں والی بیماری میں۔ ہارٹ فیل! نہ کسی کو خدمت کے لیے پکارا، نہ کسی کی راحت میں خلل انداز ہوئے، خاموشی کے ساتھ ایسے سوئے کہ پھر اٹھے ہی نہیں۔

رشید صاحب ادبی دنیا میں علمی ادارے کے کھلے دروازے اور تابناک روشنی سے آئے تھے لیکن تخلص صاحب جو ایک غیر شاعرانہ نام اور شاعرنہ ہوتے ہوئے بھی "تخلص" تخلص رکھتے تھے اور چال ڈھال، وضع قطع سے ادیب کم فوجی زیادہ معلوم ہوتے تھے، وہ عوام کے درمیان عمر کا ایک بڑا حصہ گزارنے کے بعد ادبی دنیا میں وارد ہوئے۔

تخلص بھوپالی کی ادبی دریافت کا سہرا اپنے سرباندھنے کے لیے یوں تو ادبی دنیا کے بہت سے کولمبس دعوے دار ہیں لیکن ان میں نادم سیتاپوری کا کیس سب سے مضبوط ہے۔ بقول تخلص صاحب انہوں نے (نادم سیتاپوری نے) ہی مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر کے مصداق تخلص صاحب کا اپنے نام ایک ذاتی خط دیکھ کر پیچ گردی پر آمادہ کیا اور بعد میں تو یہ صورت حال ہوئی کہ ایک دفعہ دریافت ہونا شرط تھا کہ جب تک وہ جیئے مسلسل دریافت ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں مقامی طور پر جوہر قریشی، مرتضیٰ شاد، محمود الحسینی نے ابتدائی مضامین لکھے۔ "دبی دبی سی قیامت" کے عنوان سے دسمبر ۱۹۶۱ء میں، میں نے بھی تخلص صاحب پر قلم اٹھایا۔ لیکن حق بات تو یہ ہے کہ تخلص صاحب اپنی دریافت آپ تھے۔

تخلص بھوپالی کا کل سرمایہ ہے تین سال کے "بھوپال پنچ"..... بھوپال پنچ! جو تخلص صاحب کا اپنا ذاتی ہفت روزہ تھا جس میں صرف تخلص صاحب کو اپنے قلم کے جوہر دکھانے کی اجازت تھی..... اس کے علاوہ چھ کتابیں لکھیں۔ ان کی تحریری زندگی کا عہد شباب محض سات برسوں تک قائم رہا۔ ۱۹۵۹ء میں وہ طنز و مزاح کے میدان میں وارد ہوئے اور اگست ۱۹۶۶ء تک بغیر تاج کے بادشاہ بنے رہے۔ پھر ان کی مسلسل بیماریوں نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ یکسوئی کے ساتھ ادب کی خدمت کرتے۔ لیکن اتنی کم مدت میں ادب میں، طنزیہ و مزاحیہ ادب میں، اپنے لیے ایک مخصوص مقام بنالیا۔ تخلص صاحب کا کارنامہ ہے۔

رشید احمد صدیقی اور تخلص بھوپالی کے مشترکہ موضوعات میں پرانی اقدار کی پاسداری کے علاوہ دونوں کے اپنے اپنے شہر، شہروں کی صفات کی مدح سرائی اور زبان زد ہیں!

رشید صاحب "آشفتہ بیانی میری" میں کریکٹ کا ذکر کرتے ہیں اور سرسری طور پر ہاکی کا۔ تخلص صاحب بھوپال کے قومی کھیل ہاکی کو بار بار اپنا موضوع بناتے ہیں اور سرسری طور پر کبھی کریکٹ کا بھی ذکر کرنے لگتے ہیں۔ بھوپال کی زوال پذیر ہاکی پر نوحہ خوانی کرتے ہیں اور جو اس زوال کے ذمہ دار ہیں ان کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

علی گڑھ کے مشاعروں کی طرح بھوپال کے مشاعروں کی بھی اپنی تاریخ ہے۔ رشید صاحب اور تخلص صاحب دونوں کے یہاں ان کا ذکر ملتا ہے۔

علی گڑھ میں خطاب دینے کی روایت پر رشید صاحب روشنی ڈالتے ہیں۔ بھوپال میں، بالکل یہی کیفیت عرفیت کی ہے کہ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جنہیں ان کے اصلی نام سے نہیں بلکہ عرفیت سے جانا جاتا ہے..... عرفیت جو اصل نام کے آگے لگادی جاتی ہے۔ اسے لوگ

" بھوپالی دم چھلا " بھی کہتے ہیں ۔ یہ عرفیت عام طور پر ہم نام لوگوں کے معاملے میں ان کی شناخت کا وسیلہ بنتی ہے ۔ لیکن یہ عرفیت یوں ہی کسی کے نام کے آگے نہیں جڑ جاتی بلکہ اس کا سبب " صاحب عرفیت " پر گذرا کوئی نہ کوئی اہم واقعہ ضرور ہوتا ہے ۔ مثلاً ایک صاحب ہیں ، کسی مظاہرہ میں شریک تھے ۔ پولیس نے مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا ۔ بھگدڑ مچی ۔ وہ صاحب ایک درخت پہ چڑھ گئے ۔ اب درخت TREE ـ ٹری) ۔ ان کے نام کا دم چھلا بن گیا ۔

رشید صاحب نے " ہم نفسان رفتہ " اور " گنج ہائے گراں مایہ " میں شخصی مضامین اور خاکے لکھے ہیں ۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے تریر کیا ہے کہ رشید صاحب کی تحریروں میں ایک عالمانہ شان ، نکھرا ستھرا لطیف انداز اور خندۂ زیر لب کی کیفیت نظر آتی ہے ۔ اور وہ ہ از گل افشانیٔ گفتار جو بقول رشید صاحب " علی گڈھ کے ہی پیمانہ و صہبا " سے انہیں ملا ہے ۔ رشید صاحب ایک شائستہ اسلوب میں اپنے ملوں کی ساخت اور اشعار کے زبان زد الفاظ اور بندشوں کے اشاروں سے واقعہ کی پیش کش میں مزاح کا رنگ پیدا کرتے ہیں ۔ تخلص دپالی نے بھی خاکہ نگاری کا حق ادا کیا ہے اور ان کے خاکوں کا مجموعہ " پوسٹ مارٹم رپورٹ " بالکل اسی انداز کا ہے جس طرح " زی ٹی ی " پروگرام " آپ کی عدالت " ہے ۔ رشید صاحب نے جن شخصیتوں کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے ان میں سربرآوردہ ہستیاں شامل ہ اور ان مضامین کے عنوانات بھی ادبی چاشنی لیے ہوئے ہیں ۔ مثلاً پنڈت جواہر لال نہرو کے خاکے کا عنوان ہے " کہاں ہے آج تو اے تاب نیم شبی " یا فاروق دیوانہ کے لیے " میر مرحوم عجب تھا کوئی " وغیرہ ۔ عام انسانوں میں صرف ایک چہرا نظر آتا ہے اور وہ ہے کندن کا یا ر " آشفتہ بیانی میری " میں سراج بیرے ، غلام حسین بسکٹ والے ، کھمانی پان والے یا پوسٹ مین کا مختصر ذکر ۔

لیکن تخلص بھوپالی نے اپنے خاکوں میں بالکل جداگانہ انداز اپنایا ہے ان کی " پوسٹ مارٹم رپورٹ " دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے عمل جراحی کا حق یا تو ڈاکٹروں اور جراحوں کو ہے یا انسان اور انسان کے درمیان جھگڑا کرانے والوں کو ، مگر حیرانی ہوتی ہے کہ جن ہستیوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ تخلص صاحب نے لکھی ہے اس میں ان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی روانی تک ان کی نظریں ں خوبی سے کیوں کر پہنچ گئیں ۔ پوسٹ مارٹم میں مختلف سیاسی ، سماجی اور ادبی شخصیتوں کے علاوہ ان لوگوں کو بھی شامل کیا گیا ہے نپنے پیشے یا زندگی میں اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں ۔ دو چار کو چھوڑ کر وہ سارے لوگ جن کی پوسٹ مارٹم رپورٹ شائع کی گئی ہے مقامی یت کے ہیں ۔ بھوپال کے باہر ان میں سے بیشتر کو کوئی نہیں جانتا مگر یہ یقیناً حیرت کی بات ہے کہ ان شخصیتوں کے قالب میں ان کی تیں بھی موجود ہیں جن سے ہم صورت آشنا نہیں لیکن جو اس ملک میں ہر جگہ موجود ہیں ۔ وہ سیاسی لیڈر ، وہ صحافی ، وہ شاعر ، وہ ادیب ، تاجر ، سرکاری عہدے داران ، جن کا اس رپورٹ میں تذکرہ ہے کہنے کو مقامی ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ تخلص صاحب نے ان دکھتی ں پر نشتر رکھا ہے جن کے لیے کسی مخصوص جسم یا مخصوص شخصیت کی کوئی قید نہیں ۔

رشید صاحب اور تخلص صاحب دونوں نے ایک ہی عنوان سے یعنی " اپنی یاد میں " اپنی مختصر آٹو بائیو گرافی تحریر کی ہے ۔ ایک ضوع پر ایک ہی عنوان سے لکھے یہ دونوں مضامین بلکہ سرگذشت دونوں مزاح نگاروں کے نمائندہ اسلوب کو سمجھنے کے لیے جتنے ن ثابت ہو سکتے ہیں اتنی کوئی دوسری تحریر نہیں ۔ رشید صاحب " خوشی خاطر " کوئی مضمون نہیں لکھتے تخلص صاحب بھی دوسروں سرار کے بغیر قلم نہیں اٹھاتے ۔ رشید صاحب جب تحریر کے لیے قلم اٹھاتے ہیں تو وہ باتیں جو حاشیہ خیال میں بھی نہ آئی تھیں وہ ذہن بھی پھوہار ، کبھی آبشار کے مانند گرنے لگتی ہیں " ادھر تخلص صاحب جب کچھ لکھتے ہیں تو " قلم کی تیزی اور تندی اس قدر خطرناک ت اختیار کر لیتی ہے کہ مخلص دوستوں کو " سرکاری مہمان بننے کا اندیشہ " ہونے لگتا ہے ۔ تخلص صاحب کا پردوں میں چھپا کر بات من کیوں کر اپنائیں کہ اس احتیاط سے ان کے بروکٹ بھوپالی پٹھان کی آن بان شان جو خطرے میں آجاتی ہے !

رشید صاحب بھی عظمت رفتہ کو یاد کرتے ہیں اور دکھی ہو جاتے ہیں تخلص بھوپالی نے بھی ماضی کی عظمت اور کارناموں کو میاں کے روپ میں پیش کیا ہے ۔ غفور میاں جو خالص بھوپالی پٹھان ہیں ۔ بے پر کی اڑانے میں انہیں ملکہ حاصل ہے ۔ خود کو طبقہ ، کا آخری وارث سمجھتے ہیں پھٹے حال ہیں مگر امارت کی باتیں کرتے ہیں اور جن کی علمیت مشکوک ہے مگر جو اپنے سے زیادہ عالم و ور عاقل کسی کو نہیں مانتے ۔ صرف باتیں ہی جن کا سرمایہ ہیں اور پر عظمت ماضی کی یادیں ۔ اگر اس معاملہ میں ان کا مقابلہ سرشار ہے کیا [illegible]

مخلص صاحب کو ماضی کے ساتھ حال اور مستقبل کی بھی فکر ہے۔ اس کے لیے انہوں نے پاندان والی خالہ کا کردار تخلیق کیا ہے
ر سعید صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے۔

"خالہ اور غفور میاں کا رشتہ یہ ہے کہ دونوں ہی بھوپال کی خاک سے اٹھے۔ دونوں نے بھوپال
تال کا پانی پیا ہے۔ دونوں ہی ایک جیسے جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ دونوں بھوپال کی عوامی زبان
بولتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ خالہ حقیقت پسند ہیں اور حالات حاضرہ پر اپنی زبان میں بڑی تیکھی
تنقید کرتی ہیں۔ غفور میاں خوابوں میں گم ہیں اور حالات زمانہ سے بیزار"

رشید صاحب، مخلص صاحب کی مزاح نگاری کو پسند کرتے تھے۔ مخلص صاحب، رشید صاحب کے ایک عقیدت مند کی حیثیت ،خود پر نازاں تھے۔ مجھے یہ بات آج بھی خوب یاد ہے کہ جب ۱۹۴۱ء میں مسلم یونی ورسٹی کے کسی سیمینار کے سلسلے میں علی گڑھ گیا تھا مخلص صاحب نے رشید صاحب کے لیے مجھے ایک خط دیا تھا میں ایک سویرے رشید صاحب کے گل کدہ میں پہنچا اور وہ خط ان کی مت میں پیش کیا۔ دوران گفتگو رشید صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں مخلص صاحب سے کہدوں کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں۔ وہ بہت ،پیشہ ور مصنفوں سے اچھے ہیں۔

بعد میں دونوں بزرگوں میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ رشید صاحب، مخلص صاحب کی تحریروں کو پسند کرتے تھے اور خود ص صاحب بھی انہیں چاہے جانے کی حد تک پسند آئے۔
ید صاحب نے کہیں مخلص صاحب کے بارے میں تحریر کیا ہے

"آپ کی تحریروں میں شرافت، جرات اور توازن ملتا ہے۔ آپ کی ادبی ہی نہیں صحافتی اور سیاسی
خدمات بھی شریفوں میں شکر گزاری اور فخر کے ساتھ یاد رکھی جائیں گی۔
پاندان والی خالہ کی تصنیف سے آپ نے اپنے لیے نسبتاً بہت پہلے اردو کے مقبول اور
ممتاز لکھنے والوں میں جگہ بنالی ہے۔"

آج نہ رشید صاحب ہمارے درمیان ہیں اور نہ مخلص بھوپالی ہی ہمارے بیچ موجود ہیں۔ لیکن ان دونوں کی تحریروں میں ایک ں زمانہ کا علی گڑھ اور ایک خاص زمانے کا بھوپال اپنے پورے تہذیبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ زندہ ہے۔

رشید صاحب تو اردو طنز و مزاح کی تاریخ کا ایسا روشن باب ہیں جن کے ذکر سے کسی بھی ادبی مورخ کی جبیں جگمگانے لگتی ہے ، مخلص صاحب کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور ان کی بے جگری بھی مشکل سے فراموش کی جاسکے گی۔ غفور میاں اور پاندان والی خالہ حوم بھوپال" کے یادگار کردار ہیں۔ یہ شکلیں اب دیکھنے کو نہیں ملتیں، یہ باتیں اب سننے کو نہیں ملتیں۔ ممکن ہے نئی نسل کو ان کی ن سی باتیں مضحکہ خیز لگیں لیکن "سرزمین خان" کے ان کرداروں کی شکل میں ایک خاص زمانے کا بھوپال، اس کی تہذیب، اس کی ن، اس کا سوچنے کا انداز زندہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کرداروں کے خالق کی حیثیت سے مخلص صاحب بھی زندہ رہیں گے کہ اب ی اردو کی مملکت طنز و مزاح میں رشید صاحب تو بہت بڑی اور بہت دور کی بات ہیں، مخلص صاحب جیسے "آشفتہ بیان" بھی اب گنتی ی رہ گئے ہیں جو اپنے شہروں کی اس خوش ادائی کے قتیل تھے جنہوں نے ان کی ادبی زندگی کو آب و رنگ عطا کیا تھا۔ جو دو شہری نہیں مذہبی مرکز تھے ا

مون نگار حضرات سے التماس ہے کہ وہ اپنے مضامین صاف خوش خط اور صفحہ کی ایک ہی جانب لکھ بھیجیں۔

ڈاکٹر منور فاطمہ افضل
16-9-530 ، پرانا ملک پیٹ
حیدرآباد

اف یہ مہنگائی

یقین مانیں اگر ہمیں زرہ برابر بھی احساس ہوتا کہ پیاز کے بعد نمک کی باری ہے تو ہم ان قیمتی آنسوؤں کو جمع کر لیتے جو پہلے ۔نتے ہوئے نکلتے تھے ۔ اب پیاز خریدتے ہوئے نکلتے ہیں ان کے لئے ہمیں بازار سے نمک لانے کی ضرورت نہ رہتی ۔

مشہور مقولہ ہے کہ " آٹے میں نمک کے برابر " یعنی نمک کم مقدار میں استعمال ہوتا ہے لیکن کیا آپ بغیر نمک کے ہنڈیا رھا سکتے ہیں جب کہ مہنگائی کے ان حالات میں پیاز تو ڈنر ٹیبل پر ایک شوپیس بن کر رہ گئی ہے ۔

ہمیں اپنی نانی جان کا کہا بہت یاد آتا ہے ۔ وہ کبھی نصیحت کرتی تھیں کبھی ٹوکا کرتیں اور کبھی ڈانٹا کرتی تھیں کہ " پیاز تو صرف یک ذلی گوشت میں استعمال کی جاتی ہے اور اگر دو پیازہ بنانا ہو تو دو ڈلیاں ڈال لو دو پیازہ بن گیا ۔ یہ کیا کہ آدھا کلو پیاز استعمال کرتی ہو ر ایسی سالن کھا کر مرد مسجد جائیں تو کیا ان کے منہ سے بو نہیں آئے گی " ۔ ہم اپنی جان سے پیاری نانی جان کو سمجھاتے تھے کہ نانی جان س زمانے میں گوشت سستا مل جایا کرتا تھا اب اگر ہم پاؤ کلو گوشت میں آدھ کلو پیاز استعمال نہ کریں تو ہمارا بجٹ اپ سٹ ہو جائے گا ۔

" یہ موا بجٹ کیا ہوا کرتا ہے ؟ یہ بلا ہمارے زمانے میں نہیں ہوا کرتی تھی ۔ ہمارے بچپن میں تو چار روپے میں بکرا ، دو آنے میں ۔ سیر گوشت اور ایک آنے کی ترکاری مل جاتی تھی ۔ چاول ایسا باریک اور لمبا لمبا روپے میں دو سیر اور شربتی اور بنسی گیہوں روپے یں چار سیر ملتے تھے ۔ بہت سکون اور اطمینان سے بھرپور زندگی گزاری جاتی ۔ ہر کوئی خوش حال تھا ۔ ملک کو آزادی کیا ملی چوروں اور یروں کو آزادی مل گئی ہے "

" اوہ نانی جان ! چھوڑو بھی یہ داستان ! " ۔

" ہاں اب تم لوگ تو اسے داستان ہی کہو گے " ۔

نانی جان کی ٹھنڈی سانس ہمیں اس دہشت زدہ مہنگائی کے ماحول میں فرحت بخشنے لگی ۔

ہمیں وہ کہانی یاد آ رہی ہے جس میں بادشاہ اپنے بچوں سے سوال کرتا ہے کہ " وہ بادشاہ کو کتنا چاہتے ہیں " تو سب سے چھوٹی زادی کہتی ہے " میں تو آپ کو نمک کے برابر چاہتی ہوں " ۔ بادشاہ خفا ہو کر شہزادی کو محل سے نکال دیتا ہے ۔ شہزادی ادھر ادھر بھٹکتی ی ہے کہ ایک مقام پر کسی شہزادے سے ملاقات ہوتی ہے اور اس کی بے سہارا زندگی میں بہار آ جاتی ہے ۔ ایک دفعہ بادشاہ کا گزر اسی ستے سے ہوا تو وہ بادشاہ کو بڑے اصرار سے رکوا کر اس کی ضیافت کا اہتمام کرتی ہے لیکن خود سامنے نہیں آتی ۔ دسترخوان پر تمام قیمتی

چیزیں رکھی جاتی ہیں ۔ بادشاہ جب تمام قیمتی چیزوں کو دیکھتا ہے تو اسے نمک کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ دسترخوان پر سب کچھ ہے مگر نمک نہیں۔ شہزادی چلمن سے کہتی ہے کہ "حضور نمک کی حقیقت کیا ہے اس کی بدولت تو شہزادیاں محلوں سے نکال دی جاتی ہیں" ۔

دو چار دن قبل کی بات ہے کہ ہم مہنگائی سے پریشان ہو کر کاغذ ہاتھ میں لیئے شوہر صاحب کے سر پر کھڑے ہوئے اور انھیں بجٹ ترتیب دینے کو کہا ۔ وہ بے چارے تھکے ہارے لوٹے تھے چڑ کر کہنے لگے کہ "میں کوئی وزیر خزانہ ہوں جو بجٹ مرتب کروں ۔ ساری تنخواہ تو حوالے کر دیتا ہوں تم جو چاہو کرو ۔ نہ میں لالو پرساد یادو ہوں نہ تم جیہ للیتا ۔ اسی لئے تنخواہ کو پہلی تاریخ تک کھینچو"۔ شوہر کی بے رخی پر آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے ۔ وہ جلدی سے اٹھے اور رومال سے آنکھیں صاف کیں اور اسے عقیدت سے تھام کر کچن کا رخ کیا ۔ ہم نے حیرت سے ان کا تعاقب کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس رومال کو نمک کے ڈبے پر احتیاط سے رکھ رہے ہیں ۔ ہمیں آتا دیکھ کر کہنے لگے "بیگم اگر نمک ختم ہوجائے تو اس رومال کو سالن میں ذرا سا غوطہ دے لینا تاکہ نمکینی اتر سکے ۔ یوں پیسوں کی بھی بچت ہوگی ۔ کیونکہ آج ہی اخباروں میں یہ خبر چھپی ہے کہ شمالی ہندوستان میں نمک کی قیمت ۔/60 روپے فی کلو ہوگئی ہے" ۔ ہم جو آنسو پوچھے جانے پر خوش ہوئے تھے منہ بسورتے بجٹ ترتیب دینے کی کوشش میں معروف ہوگئے ۔

جب دو دن تک بھی ہمارا بجٹ Set نہیں ہوا تو ہم نے اپنی عزیز سہیلی کے گھر کا رخ کیا جو کفایت شعاری اور سلیقہ مندی میں بہت مشہور تھی ۔ جیسے ہی ہم اس کے شاندار طریقہ سے سجے دیوان خانے میں پہنچے اور اے سی (A.C.) کی فرحت بخش ہوا میں سانس لے کر صوفے پر ابھی براجمان ہوئے تھے کہ اچھل پڑے کیونکہ آبنوس کے درمیانی میز پر لکڑی کی بہت ہی نفیس کشتی میں بہت ہی خوبصورت آٹھ دس پیاز کی ڈلیاں رکھی ہوئی تھیں ۔ ایسی خوبصورت اور صاف ستھری پیاز کو اتنے عرصہ بعد دیکھ کر دل خوش ہوگیا اور ہم پر سہیلی کی امارت کا رعب اور بڑھ گیا ۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ تم نے اتنی اچھی پیاز کہاں سے خریدی ہے اور اسے دیوان خانے کی زینت کیوں بنائی ہو ۔ میری بات پر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی کیونکہ یہ خوبصورت پیاز تو دراصل موم کی بنی ہوئی تھی ۔ کیا زمانہ ہے پیاز بھی امارت کا امتیازی نشان بن گئی ہے ۔

اسی ماہ ہمارے گھر بڑے لڑکے کی تسمیہ خوانی کی تقریب ہونی تھی ۔ ہم نے صاحب کو دفتر جاتے وقت یاد دہانی کروائی کہ واپسی پر باورچی سے ضرور ملتے آئیں اور سامان کی فہرست ضرور لائیں ۔ ان کا بڑا اصرار تھا کہ دعوت کو دو چار ماہ کے لئے ملتوی کر دیا جائے ۔ لیکن ہم نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ یہ کوئی لیڈروں کے دورے نہیں کہ حالات سازگار نہ ہوں تو منسوخ یا ملتوی کر دیئے جائیں ۔ واپسی پر انھوں نے دو فہرستیں ہمیں تھمادیں ۔ ایک پر لکھا تھا کہ "فی کس ۔/45 روپے ۔ ائٹم بغیر پیاز و نمک و آلو" ۔ دوسری پر لکھا تھا فی کس ۔/75 روپے ۔ آئٹم معہ پیاز و نمک و آلو" ۔ تقریب تو ہم نے فی کس ۔/45 روپے والی کی لیکن دسترخوان تمام نادر و نایاب اشیاء سے سجا تھا یہ کیسے ممکن ہوا یہ ہمارا گرہستی کا راز ہے ۔

ہماری دوست کی نند کا ولیمہ تھا ۔ خیر سے شادی ایک دن پہلے ہو چکی تھی لیکن آج کل ہم بھی زمانے کی چال چل رہے ہیں ۔ خواہ مخواہ دو دن کیوں شرکت کریں ۔ پٹرول اور میک اپ کا خرچ تو بچ جائے گا ۔ ولیمہ میں شرکت سے دلہن کی رونمائی بھی ہوجائے گی اور ڈنر بھی اڑا سکیں گے اور پھر کپڑوں کی کمی کا احساس بھی نہ رہے گا ۔ اب ہم عورتیں یہ تو نہیں کر سکتیں کہ ایک ہی جوڑا دو دن استعمال کرلیں! بے چارے مرد کم سے کم مہنگائی کے اس دور میں کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں ۔ ایک ہی جوڑا دو دن استعمال کریں یا دوسرے دن صرف شرٹ بدل لیں گے ۔ ہمارے صاحب کی ایک راز کی بات بتاؤں وہ ایک پینٹ کے ساتھ چار چار شرٹس سلواتے ہیں ۔ پینٹ تو

ہفتہ بھر استعمال ہوتا ہے بس شامت آتی ہے تو صرف شرٹس کی اب ہم خواتین تو ایسا کرنے سے رہیں کہ ایک سوٹ پر چار چار ڈوپٹے بدلتے رہیں ۔ہاں بہمہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ایک ڈوپٹے پر چار چار سوٹس استعمال ہوں ۔یہی تجویز جب ہم نے صاحب خانہ کے سامنے رکھی تو وہ چراغ پا ہوگئے کہنے لگے "ہاں تمہیں تو جب بھی سوجھتا ہے ہرا ہرا ہی سوجھتا ہے" ۔

ویسے دعوت ولیمہ بڑی شاندار تھی ۔جب میزبان کی طرف سے کھانے کے لئے چلنے کا اشارہ ملا تو ہم نے اپنی تمام سوچوں کو پس پشت ڈال کر میز کی طرف پیش قدمی کی ۔جب کھانے کی میز پر نظر پڑی تو دل خوشی سے کھل گیا ۔اب آپ کہیں گے کہ ہم اتنے ندیدے ہیں کہ کھانے کی چیزیں دیکھ کر منہ میں پانی بھر آئے ۔مینیو پر سجی اشیاء کی تفصیل سن کر آپ کے منہ سے رال نہ بہنے لگے تو ہمارا نام بدل دیں ۔دم کے آلو کے ساتھ دہی اور آلو کی پھلکیاں ،آلو گوشت کا گاڑھا شوربہ ،ترکاری پلاؤ جن کے اوپر بڑے بڑے آلو سجے ہوئے ۔سلاد میں باریک لچھے دار پیاز کٹی ہوئی ۔دہی کی چٹنی جس میں وافر مقدار میں پیاز کٹی ہوئی ۔میٹھے میں آلو کی کھیر ۔

ہم تو میزبان کے ذوق کی تعریف کئے بغیر نہ رہے ۔کیا موقع سے لوگوں کو نادر و نایاب اشیاء کھلا کر دعائیں اور تعریفیں سمیٹیں ۔

یوں تو "ہم" جو اکیسویں صدی میں قدم رکھ رہے ہیں اور ہائی ٹیک سٹی کے باشندے ہیں ۔ہماری بنیادی ضرورت اب بھی روٹی ، کپڑا اور مکان ہی ہے ۔سائنس لاکھ ترقی کرلے پیٹ روٹی کی جگہ کمپیوٹر پر تکیہ نہیں کرسکے گا اور نہ ہی جنم بھومی میں لگائے گئے درختوں کے سائے تلے ہم مکان کی ضرورت پوری کرسکتے ہیں نہ ترقی کے نام پر اس بڑھتی ہوئی فضائی آلودگی سے اپنے جسم کپڑے کی ضرورت سے نجات حاصل کرسکتے ہیں ۔اب تو حالات اتنے بگڑ گئے ہیں کہ ہم کسی بھی طرح کے سدھار کا خواب بھی دیکھتے ہیں تو ان خوابوں کی بھی فضا آلودہ ہی ہوتی ہے ۔اور گھٹن کے احساس کے ساتھ آنکھ کھل جاتی ہے ۔

پروفیسر لئیق صلاح

شگوفہ کی شگفتگی

(تیس سال کی تکمیل پر ایک سرسری جائزہ)

اردو رسالوں یا روز ناموں کی بغیر کسی تعطل کے تسلسل کے ساتھ اجرائی، ادب میں، اس کی ساکھ کی ضمانت ہوتی ہے ہمارے ادب میں ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ جریدے یا اخبارات معیار کے باوجود طویل عمر نہ پاسکے اس لحاظ سے آج کے دور میں، جب کہ اس زبان پر مایوسی اور اداسی چھائی ہوئی ہے، کوئی رسالہ اپنی "۳۰" ویں سالگرہ منانے کے موقف میں ہو تو یقیناً یہ ایک قابلِ فخر اور قابلِ قدر کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ "شگوفہ" اب اپنی عمر کے تین دہوں سے گزر چکا ہے۔

"شگوفہ" ایک رسالہ ہی نہیں ایک ادارہ ہے۔ اس نے نوآموز لکھنے والوں کو روشناس بھی کیا اور صاحب تصنیف بھی بنایا اور اس طرح "مدیر" کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہوگیا کہ قلمی معاونین کے مضامین کو مرتب کرکے کتابی شکل میں چھاپے۔ مدیر کے ساتھ وہ پبلیشر بن گئے۔

انھیں اشتہار دینا پڑا کہ فلاں ممتاز و منفرد مزاح نگار کا مجموعہ منظر عام پر آرہا ہے اور ہر مجموعہ شائع ہوا تو کتاب کی رونمائی کا فرض بھی نبھانا پڑا بات اور آگے بڑھی مصنفین نے چاہا کہ کتابیں ان ہی کے توسط سے فروخت ہوں۔ چنانچہ ایک "سیل کاونٹر" کا اہتمام بھی لازمی ہوگیا۔ بالآخر اس بات کو تسلیم کرنا پڑا کہ "طنز و مزاح" کو ایک تحریک کے روپ میں پیش کرنے میں "شگوفہ" ایک اہم رول ادا کررہا ہے۔

یہ ایک ایسا رسالہ ہے جس نے طنز و مزاح کی بھرپور ترجمانی کی ہے سرورق سے ہی اندازہ لگاسکتے ہیں کہ یہ اپنی نوعیت کا منفرد پرچہ ہے جب فہرست پر نظر دوڑائی جاتی ہے تو از ابتدا تا انتہا مزاح سراپا مجسم نظر آتا ہے۔

مثلاً مختلف موضوعات کی سرخیاں ملاحظہ کیجئے۔

مالِ مفت (انشائیے)۔ دخل درنا معقولات (افسانے، فیچر و ڈرامے)، ایسی کی تیسی (تنقید) حق تو یہ ہے (ترجمہ) چورن (منظومات) اُڑیں گے پرزے (خاکے) مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

بال کی کھال (تبصرہ) ادسے کے خط (مراسلے) اور فہرست کے لیے ان کی اصطلاح ہے، "اس تھیلی کے چٹے بٹے"

قاضی جی دبلے (رپورتاژ) مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ) شگوفے (لطیفے) جلوہ، روبرو (انٹرویو) نہیں آتی تو یاد ان کی (یادِ رفتگاں) آدھا تیتر آدھا بٹیر (ملی جلی اصناف) مشمولات میں بصری مزاح کے نمونے کارٹون ہیں۔ یہ مرقعے سماجی سیاسی اور تہذیبی مسائل کی منہ بولتی تصویریں ہیں جنھیں موضوع کی مناسبت سے، عالم خیال سے، صفحہ، قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے۔ وقتاً فوقتاً ہم عصر رسائل و اخبارات کے منتخب کارٹون بھی شائع کیے جاتے ہیں۔

قارئین نے مراسلوں میں جس انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ، جس صنف کو دوسرے درجے کا ادب کہا جاتا تھا۔ اب وہ پہلے درجے کے ادب سے مسابقت میں پیچھے نہیں رہی نومبر ۱۹۹۱ء میں اکولہ کے ڈاکٹر محبوب راہی نے "شگوفہ" کو "اودھ پنچ" "بھوپال پنچ" "سرپنچ" اور "نمک داں کا ایک اچھا جانشین قرار دیا ہے جس نے اپنے اسلاف کی پونجی کو نہ صرف سینے سے لگایا ہے، بلکہ اس میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ برصغیر کا یہ ایک نمائندہ رسالہ ہونے کے سبب، اس کے قدرداں پاکستان میں بھی موجود ہیں۔

نامور ادیب و شاعر سید ضمیر جعفری نے لکھا ہے کہ "شگوفے" سے ہمیں ہندوستان میں، فکاہی ادب کے نئے رجحانات سے آگاہی ہوتی رہتی ہے۔ ضمیر جعفری کے علاوہ پروفیسر محمدؐ حسن، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر گیان چند جین اور مالک رام نے بھی شگوفہ کی مدح و ستائش کی ہے، پروفیسر محمدؐ حسن رقمطراز ہیں

"شگوفہ" باقاعدگی سے مل رہا ہے، ممنون ہوں۔ اتنی مدت سے مل رہا ہے اور پڑھ رہا ہوں گویا روز مرہ زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ محمد خاں کی سرگذشت سفرنامے کا سلسلہ چھاپ کر، آپ نے "شگوفہ" کی دلچسپیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ مزاح نگار نہیں کہ کوئی مزاحیہ لکھ بھیجوں سوائے داد و ستائش کے، آپ کے اس کرم خاص کا کیا بدل ہو۔ جی چاہتا ہے کہ "شگوفہ" اور بھی دل چسپ اور دل نواز ہوجائے۔"

پروفیسر نثار احمد فاروقی تعریف و توصیف میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں لیکن "شگوفہ" کے تعلق سے وہ اپنا محتاط رویہ برقرار نہ رکھ سکے وہ نہایت فراخ دلی سے لکھتے ہیں۔

"شگوفہ" پچھلے مہینے بھی ملا تھا۔ اور اس بار بھی آیا ہے۔ دل کی کلی کھل گئی۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ حسب ضرورت شائع ہوتا ہوگا۔ بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ طنز و مزاح میں دوسرا کوئی رسالہ پورے برصغیر میں اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔ آپ نے لکھنے والوں کی ایک پوری جماعت پیدا کر دی ہے۔ مضامین سب نہایت دلچسپ ہیں۔ ابتذال اور سوقیانہ پن سے کوسوں دور، اور شگفتگی سے معمور۔ طنز و مزاح میں مہذب رہنا اور دامنِ ادب کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا کوئی معمولی بات نہیں۔ مبارکباد

(مئی ۱۹۹۱ء)"

"شگوفہ" کے عام شماروں کے علاوہ سالناموں، خاص نمبروں اور سوونیئر Souvenier, کی اشاعت بھی وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہے۔ ان خاص نمبروں، کو بھی ستائشی کلمات سے نوازنے والوں میں ممتاز محقق اور منفرد نقاد سب ہی شامل ہیں مجھے اس بات کا علم ہے کہ "اقبال نمبر" کی اجرائی بعجلت ممکنہ ہوئی تھی۔ باوجود وقت کی کمی کے علامہ اقبال "کو خراج عقیدت شایان شان انداز میں ادا کیا گیا۔ اس نمبر کے مہمان مدیر مضطر مجاز تھے اس خصوصی نمبر کے عنوانات کی سرخیوں پر بھی اقبال کا اثر نمایاں ہے مثلاً "بڑا بے ادب" (اداریہ) "

تیرے بحر تخیل "(نقد و نظر) لڑا دے مولے کو ــــ (پیروڈی) کرے کوئی اس بندہ گستاخ کا منہ بند "(مزاحیہ مضامین)، تمام عنوانات اقبال ہی کے کلام سے اخذ کیے گئے ہیں۔ پروفیسر گیان چند جین نے اپنے مراسلے مورخہ مئی ۸۶ء میں پسندیدگی کی مہر اس طرح ثبت کی کہ اپنے مضمون کو منہا کرکے باقی انشائیوں کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے حصہ نظم کو ترجیح دی ہے۔

لکھتے ہیں :۔

"شگوفہ" کا "اقبال نمبر" پرسوں شام ملا۔ کل ہی میں نے از ابتدا تا انتہا مکمل پڑھ ڈالا۔ مضامین کی کیا تعریف کروں۔ میرے مضمون کو چھوڑ کر ایک سے ایک بہتر ہے۔ کسی مخصوص مضمون کا نام نہیں لیتا تاکہ دوسروں سے بے انصافی نہ ہو۔ نظم کا حصہ نثر سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ پاکستانی اہل قلم کے مضامین اور نظمیں بطور خاص جاذب نظر ہیں۔ بہت سے رسالوں کے جغادری "اقبال نمبر" نکلے۔ لیکن شگوفے کے نمبر کی بات ہی دوسری ہے۔ دلچسپی میں کوئی اقبال نمبر اس کے پاس نہیں پہنچتا۔ خیال آتا ہے کہ بین الاقوامی سمینار میں آخری اجلاس طنز و مزاح کے لیے مخصوص کر دیا جاتا جس میں "شگوفہ" کے مضامین اور نظمیں پڑھی جاتیں "

اردو ادب کے بزرگ مصنف جناب مالک رام نے مدیر شگوفہ کے موسومہ مکتوب مورخہ جنوری ۱۹۸۲ء میں، رسالے کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ نہایت اہم ہیں۔ انھوں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ضعیف العمری میں آدمی کس طرح، اپنے آپ کو دنیا سے بے تعلق محسوس کرتا ہے۔ زندگی کی جولانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ "آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی" والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ نوجوان طبقہ انھیں عضوئے معطل سمجھنے لگتا ہے۔ ایسے میں کوئی بھی اس کی دل جوئی کرنے والا نہیں ہوتا۔ تب کہیں سے اگر اس کے لیے کچھ ہنسنے ہنسانے کا سامان مہیا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہی ثابت ہوگا۔ ان کے تاثرات ملاحظہ کیجئے۔

"بے طلب دین ــــ پرچہ بہت دلچسپ اور نشاط انگیز ہے ہم بوڑھوں کے لیے ایسی چیزیں ٹانک کا حکم رکھتی ہیں۔ جب رگوں میں خون سرد ہو جائے اور دنیا میں دلچسپی کم ہو جائے تو جو چیز بھی مسرت خیز ہو ممد حیات ہوتی ہے۔"

"شگوفہ" کے ایک اور پرستار نے "کنہیا لال کپور نمبر" کی اشاعت کے اعلان پر محظوظ ہو کر جن خیالات کا اظہار کیا۔ اس سے اس امر سے بھی آگہی ہوئی کہ "کپور نمبر" کی اجرائی میں پہل "شگوفہ" کی طرف سے ہوئی ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے جون ۱۹۸۰ء کے مکتوب میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے :۔

"کنہیا لال کپور نمبر کی اطلاع خوش کن ہے۔ ابھی دوسرے رسائل والوں نے پہل نہیں کی ہے وہ رسائل بھی نہیں جن کے یہاں کپور مستقل لکھتے رہے۔"

مناظر عاشق کے خط سے دنیا والوں کی ناقدری کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح خود غرض افراد بڑے سے بڑے فن کار کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔

"کنہیا لال کپور نمبر" جب اشاعتی مراحل سے گذر کر منظر عام پر آیا تب جناب رام پال نے جالندھر سے اپنے احساسات کی یوں ترجمانی کی۔

"شگوفہ کا "کنہیا لال کپور نمبر" باصرہ نواز ہوا ــــ مدت کے بعد مجھے ہندوستان میں ایک بہت دلکش صوری، معنوی دونوں لحاظ سے ایک اردو رسالہ دیکھنے میں آیا ــــ اگر کسی اردو کے طالب علم کو، کنہیا لال کپور پر تحقیق کرنا ہے تو یقینی طور پر اس سے زیادہ دور تک فاصلہ طے کرنے کی ضرورت نہیں مبارک (مئی ۱۹۹۱ء)

جب مخلص بھوپالی نمبر نکالا گیا تو اسے ماہنامہ "شگوفہ" کا ایک نادر تحفہ قرار دیا گیا۔ بعض ایسے اہل قلم کے خاص نمبر بھی اس کے سبب معرض وجود میں آئے جن کو دنیا فراموش کر چکی تھی۔ مجاہد لکھنوی کے مکتوب مورخہ مئی ۹۱ء سے اس بات سے آگہی ہوتی ہے کہ ماچس لکھنوی کو کس طرح نظر انداز کیا گیا۔ لکھتے ہیں۔ "یہ تحریر محض تشکر نامے کے طور پر ارسال کر رہا ہوں آپ نے ماچس کی روح کو شاد کام کیا ورنہ کسی کو آج تک ان کے بارے میں لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔

"شگوفہ" نے مرحومین کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ زندہ شخصیتوں کے اعتراف خدمات کا بھی حق ادا کیا ہے۔ عموماً معاصرین کے تعلق سے اس طرح کی وسیع النظری و فراخ دلی کا مظاہرہ کم ہی نظر آتا ہے۔ اس کی بہترین مثال "مجتبیٰ حسین نمبر" ہے۔ مجتبیٰ حسین نمبر کے، مشمولہ مضامین کو مصنف کی تصانیف کے ناموں سے مزین کیا گیا ہے۔ فہرست کا اہتمام اس طرح کیا گیا ہے۔ قصہ مختصر (زندگی کے حالات) قطع کلام (تنقید) تکلف برطرف (خاکے) سو ہے یہ بھی آدمی (مباحثہ و منظومات) الغرض (انتخاب) بالآخر (اداریہ) بہر حال (بیگم و صاحبزادی کے تاثرات)

اس خاص شمارے کے تعلق سے اظہار خیال فرمانے والے قارئین میں نقد و ادب کی دیدہ ور شخصیتیں وجاہت علی سندیلوی اور بلراج ورما وغیرہ ہیں۔ بلراج ورما نے اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"ایسے اچھے نمبر نکالنا آپ کی عادت بن گئی ہے ــــ طنز و مزاح کو ادب کا درجہ دلوانے میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ فکر، لوتھر، مجتبیٰ حسین اور کھنہ صاحب جو شگوفہ کے خاص سرپرستوں میں سے ہیں۔ اردو کے اصلی دوست ہیں۔"

غنی اعجاز نے اکولہ سے "شگوفہ" کو ایک منفرد رسالہ قرار دیا ہے

لکھتے ہیں :۔

"حیدرآباد سے "شگوفہ" جیسا اچھوتا رسالہ نکال کر آپ نے ہندوستان گیر پیمانہ پر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ کیونکہ اتنے عظیم الشان ملک میں ایک بھی رسالہ ایسا نہ تھا جو پژمردہ دلوں میں مسکراہٹوں کے فوارے جاری کرے۔ اس کے لیے یقیناً آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

اکولہ ہی سے محبوب راہی نے اسے مزاحیہ رسالوں بھوپال پنچ، اودھ پنچ وغیرہ کے تسلسل کی ایک کڑی قرار دیا ہے۔ اور جو تاثر انھوں نے اس رسالے کے مطالعے سے قبول کیا، اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"شگوفہ" ــــ از اول تا آخر چاٹ کر ابھی فارغ ہوا ہوں تمام وجود میں ایک شگفتگی سی رچ بس گئی ہے۔

"شگوفہ" کے دسترخوان کو آپ جس روحانی غذا سے سجاتے ہیں وہ بے حد لذیذ، انتہائی چٹخارے دار اور نہایت زود ہضم ہوتی ہے۔ پھر بھی اگر کچھ ضعف معدہ، طبع کے شکار لوگ "مال مسروقہ" یا "مال مفت" کا کچھ حصہ ثقالت کی وجہ سے ہضم نہ کر سکیں تو ان کے لیے چورن کا بھی اہتمام کیا ہے ــــ شگوفہ کے تعلق سے تو صرف اس

قدر کہنا کافی ہوگا کہ شگوفہ بھوپال پنچ، اودھ پنچ، سرپنچ اور نمک دان وغیرہ کے ورثہ کو ایک سعادت مند اور ہوشیار اولاد کی طرح نہ صرف یہ کہ سینہ سے لگائے ہوئے ہے بلکہ اس میں روز بروز بیش بہا اضافے کرکے بزرگان سلف کی ارواح کے لئے ایصال ثواب کے اسباب مہیا کر رہا ہے۔ آج بے شک ہند و پاک میں طنز و مزاح کی نمائندگی کا فرض بلاشرکت غیرے شگوفہ "ادا کررہا ہے۔" (مارچ ۱۹۷۸ء)

کنور مہندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک مکتوب مرسلہ جنوری ۷۹ء میں اس کے پھلنے پھولنے کی دعامانگی تھی لکھتے ہیں

"شگوفہ" نہایت کامیاب رسالہ ہے، خدا اور کامیاب کرے۔ زندہ دلان حیدرآباد زندہ باد"

ایک اور مزاح نگار فکر تونسوی نے مدیر کی مساعی کو سراہتے ہوئے افسر شاہی پر بھرپور طنز کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

" آندھرا میں گولیاں چل رہی تھیں اور تم دیوانوں کی طرح سالنامہ برآمد کرنے میں مشغول رہے۔ دیوانگی دونوں طرف رہے، داد تمھیں ملی، گولیوں کو نہیں ـــ کیا تم نے اپنا یہ سالنامہ پولیس ہیڈ کواٹر بھیجا تاکہ وہ اسے پڑھ کر عبرت حاصل کریں۔ "(فبروری ۱۹۸۳ء)

ہندوستان سے باہر بھی اس کے مداحین موجود ہیں۔ ہندوستانیوں کے علاوہ دیگر ممالک کے افراد، اسے ایک موقر جریدہ سمجھتے ہیں۔ فیروز حیدر نے دمام سے مرسلہ خط میں اس کا اظہار کیا ہے۔

"شگوفہ پڑھ کر میرے پاکستانی احباب بہت محظوظ ہوئے۔ خصوصاً دکنی شاعری کا بہت چرچا رہا۔ اگر کسی طرح "شگوفہ" کو مستقلاً بھیجنے کا انتظام ہوجائے تو اچھا ہے۔ "(۱۹۷۸ء)

ڈسمبر ۸۷ء میں میسور میں کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے "شب مزاح" کا اہتمام کیا گیا تھا۔ رؤف خوشتر نے اپنے گرامی نامے مورخہ جنوری ۸۸ء میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "اس کی کامیابی کا سہرا "شگوفہ" کے سر ہے۔ کیونکہ ان ہی لوگوں کی کوششوں سے کل ہند سطح پر مزاح کا ماحول بن گیا ہے۔"

"شگوفہ" میں مطبوعہ مکاتیب کے علاوہ اس کے اداریوں سے بھی ان تین دہائیوں کی اشاعتوں کے تعلق سے کئی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے، کہ یہ تیس سالہ دور خصوصاً اردو زبان کی نمائندگی کرنے والے رسالے کے لیے کس قدر آزمائشی رہا۔ کن صبر آزما لمحات سے گزرنا پڑا۔ اس کے باوجود مدیر یا اس کے معاونین کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔

اس تیس سالہ دور کی سرگذشت مدیر ہی کی زبانی ملاحظہ کیجئے "ستمبر ۱۹۸۴ء "میں حیدرآباد میں فرقہ وارانہ فسادات نے، لوگوں کی پرسکون زندگی کو جس طرح درہم برہم کیا تھا۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال "شگوفہ" ستمبر ۸۴ء کے اداریہ میں موجود ہے۔ اور ساتھ ہی اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس پرآشوب دور میں بھی "شگوفہ" کی اجرائی میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ لکھتے ہیں۔

"اردو رسالوں کی زبوں حالی، اور غیر یقینی زندگی کے پیش نظر ہم نے "شگوفے" کے اداریہ کے لیے یہ مستقل عنوان (پھر ملیں گے ـــ) اختیار کیا تھا۔ لیکن حیدرآباد کے حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کرلیا ہے کہ ہر شریف آدمی بوقت وداع یہی مصرعہ دہراتا ہے۔ مئی۔ جون، جولائی اگست اور پھر ستمبر کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرا جس میں فسادات اور کرفیو سے چھٹکارا ملا ہو۔ جس تبرگاہ پر ہم پچھلے ۲۵ سال سے نصف شب گزرنے کے بعد

بلاخوف و خطر محفلیں سجائے ہنستے کھیلتے کاموں میں مشغول رہا کرتے تھے۔ آج وہی عمارت جارحانہ فرقہ پرستی کی چشم دید گواہ اور ویرانی، اداسی کا پیکر بنی ہوئی ہے ۔۔۔ اور تا دم تحریر شہر میں رات کا کرفیو برقرار ہے ایسے حالات میں ستمبر کا شمارہ اسی مہینے میں شائع ہونا ناممکن امر تھا۔" (ستمبر ۱۹۸۴ء)

جنوری ۸۶ء کے اداریہ میں نئے لکھنے والوں کو محنت شاقہ کی ترغیب دلائی گئی ہے کیونکہ رسالے کی اجرائی کے علاوہ اس کے معیار کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اخبار یا رسالے کم تر درجہ کے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں تو یقیناً باذوق قاری سے ایک نہ ایک دن انھیں محروم ہونا پڑے گا۔ مدیر شگوفہ نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً ان کی سرزنش بھی کی۔ ملاحظہ کیجئے جنوری ۸۶ء کا "اداریہ"۔ "ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ نئے لکھنے والوں کو "شگوفہ" کے صفحات پر زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ نئے لکھنے والے توجہ، محنت، خلوص اور لگن کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے۔ مطالعہ کی کمی، شہرت کی خواہش، اور معمولی سی شہرت حاصل ہونے پر، خود کو صف اول کا تخلیق کار سمجھ لینے کا رجحان، فن میں ٹھہراو پیدا کرتا ہے۔ خاص طور سے مزاحیہ شاعری میں جمود سا پیدا ہوگیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مزاحیہ شعراء، موضوعات میں تنوع اور فن میں پختگی پیدا کریں۔ اور اس تاثر کو ختم کریں کہ مزاحیہ شاعری روبہ زوال ہے۔"

شگوفہ کا اکتوبر ۸۸ء کا اداریہ الفونوں سے مختلف ہے۔ اس میں "رسالے" کے حالات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے کہ اس کی اشاعت کے اس ان بیس سالہ عہد میں کس طرح نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ اس میں فراز زیادہ ہیں یا نشیب اس کا اندازہ "اداریہ" ہی سے ہوگا۔

"شگوفہ کے بیس سال کے فائیل گواہ ہیں کہ اس رسالہ نے اردو میقاتی جرائد کی دنیا میں ایک نئی تاریخ بنائی ہے۔ شگوفہ کی روایت ہے (ہوسکتا ہے آپ اسے روایت شکنی کہیں) یہ رسالہ نامساعد حالات کے باوجود نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ ڈیڑھ ماہی (نومبر ۶۸ء تا مئی ۷۳ء) کا دور ہو یا جون ۸۳ء کے بعد بطور ماہنامہ اشاعت کا مرحلہ۔ کرفیو کے حالات ہوں یا ریاستی اشتہارات کی مسدودی۔ تمام طرح کے موانعات کے باوجود "شگوفہ" روایتی پاسداری اور آن بان کے ساتھ منظر عام پر آتا رہا۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ پابندیٔ اشاعت سے "شگوفہ" کا معیار کبھی متاثر نہیں ہوا جس کا نقادان ادب وقتاً فوقتاً اعتراف کرتے رہے ہیں اور طنز و مزاح کے فروغ کے سلسلہ میں "اودھ پنچ" کے کارناموں کے ساتھ "شگوفہ" کا نام لیا جانے لگا ہے۔ "شگوفہ" کی وجہ سے بے شمار نئے لکھنے والے طنز و مزاح نگار روشناس ہوئے۔ جن میں سے بعضوں نے اپنی تحریروں سے چونکا دیا۔ پرانے لکھنے والوں نے "شگوفہ" کی تحریک پر اپنے تخلیقی عمل کو تیز کیا اس طرح بحیثیت مجموعی طنز و مزاح کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ ہوسکا۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ "شگوفہ" نے طنز و مزاح اور طنز و مزاح نگاروں کے باوقار مقام کے تعین کے لئے فضا بنائی، راہ ہموار کی۔ اور تمام تر مشکلات کے باوجود رسالہ کے کردار میں تبدیلی کو گوارا نہیں کیا گیا۔ بیس ۲۰ سال کے اس عرصے میں کئی مواقع ایسے آئے کہ خوشیوں کی دولت بانٹنے والا یہ ادارہ مایوسیوں کے اندھیروں میں گھر گیا۔ لیکن "شگوفہ" کے صفحات پر ان اندھیروں کا سایہ پڑنے نہیں دیا گیا۔

کتابت، طباعت، مضامین کی وصولی، اور اشاعت کے مراحل کی دقتوں اور مہنگائی کا کبھی رونا نہیں رویا گیا۔ کہ یہ انداز کاروانِ مزاح کے بڑھتے قدموں کو متزلزل کردے گا۔ مزاح نگاروں نے اس کارواں کے بڑھتے قدموں کا ہمیشہ ساتھ دیا۔ قارئین کرام نے داد و تحسین سے نوازا، صحافتی اور ادبی حلقوں نے ستائش کے دو بول سے ہمت بڑھائی۔ ہمیں امید ہے کہ مستقبل میں بھی ہمیں اسی طرح کا تعاون حاصل ہوگا۔"

یہ تو تھی "شگوفہ" کی بیس سالہ زندگی، پچھلے دس سال میں اسے اور بھی سرد و گرم حالات سے گزرنا پڑا ہوگا۔ ایک نسل کے ہاتھوں سے یہ گذر چکا ہے اب نئی نسل کو چاہئے کہ اسے "خوش آمدید" کہے اور اس رسالہ کو ۲۱ ویں صدی تک پہنچانے کے لیے ہم رکاب رہے۔

"شگوفہ" کے ایک قاری نے اکٹوبر ۸۰ء کے ایک مکتوب میں جو تمنا کی تھی، خدا کرے، وہ پوری ہو۔ لکھتے ہیں:

"اس دور میں جب کہ عوام تفکرات میں ملوث ہیں ہم "شگوفہ" کا مطالعہ کرتے ہیں تو کچھ دیر کے لیے تفکرات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں ۔۔۔ انشااللہ! وہ دن دور نہیں جب کہ عوام بغیر "شگوفہ" کے زندگی میں کمی محسوس کریں گے۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

تیس سال کی تکمیل پر شگوفہ کا سالنامہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ اس شمارے میں طنز و مزاح کے مختلف اہم موضوعات پر تین تنقیدی مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے آزادی کے بعد اردو میں مزاحیہ شاعری کے ارتقا کا مبسوط جائزہ لیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر لیق صلاح نے شگوفہ کے کام پر توجہ مرکوز کی ہے۔ شگوفہ ہندوستان میں طنز و مزاح کے ارتقا کی داستان کی اہم لڑی بن چکا ہے۔ پچھلی تین دہائیوں میں یہ منفرد رسالہ طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ کا موجب بنا رہا۔ شگوفہ کے قلم کاروں کی فہرست میں ہمیشہ نئے نام شریک ہوتے رہے ہیں۔ جن میں بعض نے موضوعات کی ندرت اور انداز تحریر کی شگفتگی کے ذریعہ ادب کے قاری کو چونکایا بھی ہے۔ زیر نظر خصوصی شمارے میں مشہور و ممتاز طنز و مزاح نگاروں کے ساتھ بعض ایسے نو آموز مزاح نگاروں کی تخلیقات بھی شامل ہیں، جنھوں نے اپنے دور کے مسائل کو نئے انداز سے برتا ہے۔ ان تحریروں کے مطالعہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کا طنز و مزاح نگار اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر نہیں ہے۔ طنز و مزاح کو وہ محض ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ نہیں سمجھتا اور طنز و مزاح کی اعلیٰ روایات کا وہ پاسبان ہے۔ اس پس منظر میں شگوفہ اپنی زندگی کے چوتھے دہے میں بڑے اعتماد، عزم اور حوصلے کے ساتھ نئی منزلوں کی جانب گامزن ہے۔

*****

مدیر شگوفہ کی صاحبزادی کی شادی

حیدرآباد۔ مدیر شگوفہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کی دوسری لڑکی سہا کمال کی شادی جناب محمد عزیز الرحمن مرحوم (سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ زراعت) کے فرزند محمد اشفاق الرحمن ایم بی اے کے ساتھ جمعرات ۲۱ جنوری کو نفیس منزل پر انجام پائی۔ محفل عقد میں جناب صلاح الدین اویسی، ایم پی، نواب شاہ عالم خان صاحب صدر نشین انوار العلوم کالجس، جناب نریندر لوتھر آئی اے ایس، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر کونسل برائے فروغ اردو، جناب زاہد علی خان مدیر روزنامہ سیاست، جناب سید وقار الدین، رہنمائے دکن جناب خان لطیف خان مدیر منصف، جناب شجاعت حسین جوائنٹ کمشنر سلیس ٹیکس، جناب محمد علی رفعت آئی اے ایس، پروفیسر سلیمان صدیقی رجسٹرار مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، جناب سید عبدالولی قادری آرکیٹکٹ، ڈاکٹر وی کے باوا آئی اے ایس، جناب لائق علی خان آئی جی پولیس، محترمہ جیلانی بانو، محترمہ رفیعہ منظور الامین، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر لیق صلاح، پروفیسر اشرف رفیع، ڈاکٹر شمیم ثریا پرنسپل بی بی رضا کالج گلبرگہ، کے علاوہ جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے صدور شعبہ جات اردو، انوار العلوم و ممتاز کالج کے پرنسپل صاحبان، اساتذہ، صحافیوں اور معزز شہریوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ جناب الیاس محی الدین انجنیئر (سعودی عرب) جناب سید عبدالقادر، ڈاکٹر سید ابراہیم احمد اور سید حامد علی (داماد) نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد ۳۲ شمارہ ۳ حیدرآباد

مارچ ۱۹۹۹ء

قیمت فی پرچہ ۱۲ روپے زر سالانہ ۱۴۰ روپے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱۔ بچلرز کوارٹرز ، معظم جاہی مارکٹ ۔ حیدرآباد ۔ ۱ فون (آفس) 4745716
4576064 (رہائش)

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

ہولی

ظفر کمالی (سیوان)

کیا ہے دوستوں نے یوں مرا سمان ہولی میں
کرایا گھول کر گوبر مجھے اشنان ہولی میں

لڑانے کے لئے نکلے تھے وہ رومان ہولی میں
بچارے کا پولس نے کردیا چالان ہولی میں

محبت کا کوئی کرتا ہے یوں اپمان ہولی میں
کھڑا ہے گیٹ پر کیوں کابلی دربان ہولی میں

کلیجہ پھٹ گیا شاعر کا نکلی جان ہولی میں
کوئی ظالم چرا کر لے گیا دیوان ہولی میں

جدھر دیکھو ادھر میلا حسینوں کا دکھائی دے
بچاکر کس طرح رکھتے کوئی ایمان ہولی میں

وہ مجھ پر مار دے ہنس کر اگر رنگوں کی پچکاری
کروں میں اس پہ اپنی جان بھی قربان ہولی میں

دلوں کی آگ ہو یا پیاس نظروں کی بجھیں دونوں
فقط ہے فائدہ کچھ بھی نہیں نقصان ہولی میں

امیدوں کے سہارے ہی گلے ملنے کو آتے ہیں
نبھاؤ رسم دنیا کی کرو احسان ہولی میں

کدھر جاتی ہے یہ بدمست ٹولی نوجوانوں کی
بنے گا کون سا گھر جنگ کا میدان ہولی میں

نہ بچ پاؤ گے بیٹھو گے اگرچہ بند کمرے میں
کھلا جو رہ گیا غفلت سے روشن دان ہولی میں

پتے کی بات کہتا ہوں گرہ میں باندھ لو پیارے
اسی میں ہوشیاری ہے بنو نادان ہولی میں

پلانا اور پینا بھنگ کا شربت ضروری ہے
یہی نشہ ہر اک مشکل کرے آسان ہولی میں

اسے چھت پر جو دیکھا تو بجادی اک ذرا سیٹی
وصولا جارہا ہے مجھ سے کیوں تاوان ہولی میں

خدا کی شان ہے یہ بھی کہ ہے عالم ضعیفی کا
اٹھا دل میں جوانی کا مگر طوفان ہولی میں

مرے گالوں پہ ہونٹوں سے گلال اس نے لگایا
بڑی مدت پہ نکلے ہیں مرے ارمان ہولی میں

جسے مرغوب ہولی کھیلنا ہو شوق سے کھیلے
ہمیں تو پیٹ بھر کر چاہیے پکوان ہولی میں

گرانی کا اثر ہے یا بخالت کے کرشمے ہیں
کھلا کر لوگ ٹرخانے لگے اب پان ہولی میں

ظفر دبکا پڑا رہتا ہے رانی پور میں دن بھر
نہیں جاتا کبھی بھولے سے وہ سیوان ہولی میں

مجتبیٰ حسین
(دلی)

ہند پاک دوستی ہماری بے بسی

وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی جب سے بس میں بیٹھ کر لاہور گئے اور وہاں سے واپس آئے ہیں تب سے ہم پر ایک عجیب سی بے بسی طاری ہے لوگ ہم پر یہ الزام دھرتے ہیں کہ کسی مسئلہ پر جب کوئی اتفاق کرنے لگتا ہے تو ہم اس میں سے اختلاف کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے ہیں اب یہی دیکھئے کہ پچھلے کئی برسوں سے ہم ہندوستان اور پاکستان کے بیچ تعلقات کی کشیدگی کے عادی ہوگئے تھے ہم نے سوچ لیا تھا کہ جب دونوں ملکوں کے تعلقات ہمارے جیتے جی بہتر ہو ہی نہیں سکتے تو ہم کیوں خواہ مخواہ اس معاملہ میں پر امید رہیں۔

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں ہم ٹھہرے ایک معمولی آدمی۔ مگر معمولی آدمی کے ہاں ایک غیر معمولی خوبی یہ ہوتی ہے کہ جب کسی معاملہ میں جبر کا کوئی پہلو دکھائی دیتا ہے تو وہ اس کا مقابلہ صبر سے کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی ہند و پاک تعلقات کے پس منظر میں اپنے پاکستانی احباب اور چاہنے والوں سے کہہ دیا تھا کہ بھیا تم جہاں بھی رہو خوش رہو ہمارے لئے تمہارے دل میں محبت، پریم وغیرہ کے جذبات ہیں بھی تو انھیں اپنے پاس ہی رکھو اور ہم پر ان کا اظہار نہ کرو مگر اب وزیراعظم نے بیٹھے بٹھائے لاہور تک بس میں سفر کرکے ہمارے پاکستانی احباب کے دلوں میں امید کی کرن روشن کردی ہے۔ ان کی بس یاترا کے بعد دو تین پاکستانی احباب کے فون آچکے ہیں کہ میاں اب تو آؤ۔ بس سروس شروع ہوچکی ہے اب کیا دشواری ہے۔ یہ لوگ یوں سمجھ رہے ہیں جیسے بس سروس شروع ہوگئی ہے تو ہم یونہی منہ اٹھائے بس میں سوار ہوجائیں گے۔ انھیں معلوم ہونا چاہئیے کہ بس میں ایک کنڈکٹر بھی ہوتا ہے اس سے ہمیں بڑا ڈر لگتا ہے کیونکہ ٹکٹ کے پیسے مانگتا ہے، پھر یہ بس ہم تھوڑا ہی چلاتے ہیں۔ ڈرائیور چلاتا ہے پھر ویزا اور سامان سفر کے مسئلے الگ ہیں۔ بس کے دھکوں کی شکایت ہم اس لئے نہیں کریں گے کہ ان دھکوں کے پرانے عادی ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ہندوستانی احباب سے ہی اپنے تعلقات کو برقرار رکھنے کے قابل نہیں ہیں تو ایسے میں غیر ملکی احباب سے تعلقات کو استوار کرنے کی زائد ذمہ داری کیسے اٹھاسکتے ہیں۔ جب سے ہند و پاک تعلقات کو پھر سے استوار کرنے کی بات چلی ہے تب سے ہم یوں بھی کسی نہ کسی وجہ سے مصروف ہوگئے ہیں۔

وزیر اعظم واجپائی کے لاہور جانے سے آٹھ دن پہلے کی بات ہے۔ ممتاز کانگریسی رہنما و سابق اسپیکر لوک سبھا بلرام جھاکڑ جی کا فون آیا کہ میاں ایک فوری مسئلہ درپیش ہے۔ اس میں تمہاری مدد چاہیئے ہم نے کہا حکم کیجئے بولے "پرسوں میں ہندوستانی ارکان پارلیمنٹ کے ایک وفد کے قائد کی حیثیت سے پاکستان جارہا ہوں۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر میں ویسی ہی ایک شیروانی سلوانا چاہتا ہوں جیسی میں آج سے پچپن برس پہلے لاہور میں اپنے زمانہ طالب علمی میں پہنا کرتا تھا۔ میں لاہور جاؤنگا تو ایف۔ سی کالج بھی جاؤنگا اور میں وہاں شیروانی کے بغیر جانا نہیں چاہتا۔ اس وقت میں جلدی میں ہوں وزیر داخلہ اڈوانی جی سے ملنے جارہا ہوں۔ ایک گھنٹہ میں واپس آجاؤنگا اتنی دیر میں تم کوئی ایسا درزی ڈھونڈھ نکالو جو نہ صرف اچھی شیروانی سیتا ہو بلکہ جلد بھی سیتا ہو۔ یہ کہہ کر وہ تو اڈوانی جی سے ملنے کے لئے چلے گئے اور ہم سوچنے لگے کہ ڈاکٹر بلرام جھاکڑ نے اس سلسلہ میں ہمیں کیوں یاد کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ پینتالیس برسوں سے ہمارا بھی شیروانی سے کوئی تعلق نہیں رہا اب تو عید بقرعید اور دوسروں کی شادی بیاہ کی تقریبوں میں بھی شیروانی نہیں پہنتے۔ ڈاکٹر بلرام جھاکڑ ہمارے پرانے کرم فرما ہیں اردو تہذیب کے نہ صرف پروردہ ہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان بھی کامیاب کر رکھا ہے اقبال فیض حفیظ جالندھری وغیرہ کے شعر ان کی نوک زبان پر رہتے ہیں اس حوالہ سے ہمارے دل میں ان کی بڑی عزت تو ہے ہی۔ وہ بھی ہمیں کچھ کم عزیز نہیں رکھتے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ شیروانی کا خیال آتے ہی ہمیں یاد کیا۔ اب یہ ایک اتفاق ہے کہ پچھلے پچیس برسوں سے ہمارے دوست شیام لال گپتا ہے جو دلی میں ملبوسات کی تیاری کیلئے بڑی شہرت رکھتے بلکہ "ماہر شیروانیات" بھی سمجھے جاتے ہیں۔ دلی میں ہر سال "پھول والوں کی سیر" کی جو تقریب ہوتی ہے اسے آراستہ کرنے میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ان سے ہمارے پچیس برس پرانے تعلقات اب ہند۔ پاک تعلقات کو بہتر بنانے میں کام آئیں گے۔ ہم نے فوراً ان کے بیٹے کو فون کرکے ضروری ہدایات دیں کہ جھاکڑ جی کی شیروانی کچھ ایسی ہو کہ پھر کبھی ہند و پاک تعلقات کے بخیے ادھیڑے نہ جاسکیں۔

دوسرے دن ہم ڈاکٹر بلرام جھاکڑ سے ملنے کیلئے گئے تو ان کی شیروانی کا پہلا خاکہ تیار ہوچکا تھا اور اس پہلے خاکہ کی نوکیں اور پلکیں ٹھیک کی جارہی تھیں۔ جو لوگ ڈاکٹر جھاکڑ کے قد اور ان کے تن و توش سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی ایک شیروانی میں ہم جیسوں کی کم از کم تین شیروانیاں تو آسانی سے سل جاتی ہیں۔ ڈاکٹر جھاکڑ بے حد حساس اور جذباتی آدمی ہیں شیروانی پہنتے ہوئے ان کی آنکھوں میں اچانک آنسو آگئے بولے "آج ماضی کی کتنی باتیں یاد آرہی ہیں کتنے ہی دوست یاد آرہے ہیں" ہمیں یوں لگا جیسے یہ شیروانی "جادوئی شیراونی" ہے جسے پہنتے ہی آدمی کو اس کا ماضی یاد آنے لگتا ہے ڈاکٹر بلرام جھاکڑ اور ارکان پارلیمنٹ کا یہ وفد روزنامہ "جنگ" کی دعوت پر پاکستان جارہا تھا اس رعایت سے بولے "یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہم "جنگ" کے حوالہ سے "امن" کی بات چیت کرنے پاکستان جارہے ہیں۔" پھر ذوق کا ایک شعر انھیں اچانک یاد آیا تو بولے

کل جہاں سے کہ اٹھالائے تھے احباب مجھے

لے چلا آج وہیں پھر دل بیتاب مجھے۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک وہ لاہور کے ایف سی کالج میں زیر تعلیم رہے ان کا آبائی قصبہ ہندوستان میں واقع ہے تعلیم کے بعد ۱۹۵۵ء میں وہ صرف ایک بار کرکٹ میچ دیکھنے لاہور آئے تھے اس کے بعد وہ پھر کبھی لاہور نہ جاسکے ۔ لہذا جذبات کا ایک طوفان تھا جو ان کے دل میں امڈ آیا تھا ۔ بیچ بیچ میں رومال سے اپنی آنکھوں کو بھی پونچھتے جاتے تھے ۔ بہرحال ڈاکٹر جہانگر نے پاکستان کا کامیاب دورہ کیا ۔ واپس آئے تو بہت خوش تھے ۔ ہنس کر بولے "وہاں میں اکیلا آدمی تھا جو شیراونی میں ملبوس تھا " کئی پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی ۔ مقبول بھٹی بھی ملے جو ایف ۔ سی کالج میں میرے ہم جماعت تھے بعد میں پاکستان کی وزارت خاجہ کے سکریٹری بھی بنے لاہور اب بالکل بدل گیا ہے ۔ کئی تبدیلیاں ہوچکی ہیں ۔ انار کلی کا وہ نقشہ نہیں رہا جو ہمارے زمانہ میں ہوا کرتا تھا ۔ ایف سی کالج میں آٹھ سو طالب علم تعلیم پاتے تھے اب پانچ ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں پاکستان کے عوام ہندوستان سے دوستی چاہتے ہیں اس معاملہ میں نواز شریف کی نیت بھی اچھی ہے میں سمجھتا ہوں برصغیر میں صرف دو فیصد عوام ایسے ہونگے جو ہند پاک تعلقات کو بہتر بنانا نہیں چاہتے ہیں جب کہ بقیہ عوام دوستی مفاہمت اور یگانگت کے حق میں ہیں میں جب لاہور گیا تو وہاں بسنت کا تہوار دھوم دھام سے منایا جارہا تھا لاہور کا پورا آسمان رنگ برنگے پتنگوں سے بھرا ہوا تھا جب کہ ہمارے ہاں اب بسنت کا تہوار اتنی دھوم دھوم سے نہیں منایا جتا ۔ " ڈاکٹر جہانگر اپنے دورہ پاکستان سے نہ صرف خوش تھے بلکہ پرامید بھی تھے ۔

ان کے دورہ پاکستان کے چار پانچ دنوں بعد وزیراعظم واجپائی جب لاہور گئے تو شیروانی وغیرہ کے معاملہ میں تو انھوں نے ہم سے کوئی مدد نہیں مانگی (خیر ہمیں شکایت بھی نہیں ہے) البتہ ان کے ساتھ ہمارے جو صحافی دوست لاہور گئے تھے انھوں نے ہم سے کئی اردو شعروں کے معنی پوچھے ۔ یوں لگا جیسے ہند ۔ پاک تعلقات کو بہتر بنانے کی ساری ذمہ داری اردو شاعری پر ہی عائد ہوگئی ہے ۔ فیض ، اقبال ، احمد فراز اور خود اٹل بہاری واجپائی کے شعروں کے جگہ جگہ حوالے دئے گئے لیکن سب سے زیادہ شہرت مخدومی سردار جعفری کی نظم کو ملی جس میں انھوں نے کہا ہے ۔

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش

ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لیکر

پھر اس کے بعد یہ پوچھیں کہ دشمن کون ہے

جس دن وزیراعظم واجپائی کے دورہ لاہور کا آنکھوں دیکھا حال ٹیلی ویژن سے نشر کیا جارہا تھا تو ہم یہ حال پریس کلب میں اپنے احباب کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے ہمارے ساتھ ایک بزنس مین دوست بھی موجود تھے ۔ جب سردار جعفری کی نظم کا یہ بند سنایا گیا تو ہمارے ان دوست نے کہا ۔

" یار ! یہ گلشن لاہور کی ہواؤں اور صبح بنارس کی روشنی کے تبادلے سے کچھ بھی نہیں ہوگا جب تک آگرے کا پیٹھا ، متھرا کے پیڑے ، علی گڑھ کے تالے ، بنارس کا سلک ، حیدرآباد کے موتی (بشمول ہمارے) وغیرہ یہاں سے وہاں نہیں جائیں گے ۔ اور جب تک لاہور کی لسی ، سیالکوٹ سے کھیلوں کا سامان ، پشاور سے خشک میوہ ، یہاں نہیں آئے گا تب تک دونوں ملکوں کے تعلقات ٹھیک نہیں ہونگے ۔ " اور ہم اپنے دوست کو کوئی

جواب نہیں دے سکے کیونکہ ہماری ذہنی ساخت اور تربیت کچھ ایسی ہے کہ صبح بنارس، شام اودھ اور شب مالوہ کوتی اب تک بنیادی اہمیت دیتے آئے ہیں۔ بہر حال ہند۔ پاک تعلقات کی بہتری کے آثار نے ہمیں خواہ مخواہ ہی مصروف کردیا ہے۔ دیکھئے یہ معروفیت کب تک برقرار رہتی ہے۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

☆☆☆☆

قطعات

پاگل عادل آبادی

ان پہلے بارہ بچوں کا گورا ہے رنگ مگر
اس تیرہویں کا تھوڑا سا کالا ہے کیوں کلر
ٹائپسٹ بیوی بولی کرو ہوش کی دوا
یہ کاربن کی آخری کاپی ہے مائی ڈیر

☆☆☆☆

وعدہ کسی کے ساتھ تو شاپنگ کسی کے ساتھ
ارجنٹ کسی کے ساتھ تو ویڈنگ کسی کے ساتھ
ان لڈروں کا حال حسینوں سے کم نہیں
بولنگ کسی کے ساتھ تو بیاٹنگ کسی کے ساتھ

☆☆☆☆

چل گئی کی چیخ پر سمجھے کہ لاٹھی چل گئ
یا کہیں پھر شہر میں پولس کی گولی چل گئ
گھیر کر لوگوں نے پوچھا کیا تو پاگل نے کہا
بعد مدت کے میری کھوٹی چونی چل گئ

☆☆☆☆

ہو کر کرکٹ کھلاڑی نکلے برقعے اوڑھ کر
پیچھے سے آواز آئی ہلو ہلو بھائی اظہر
ہم ہیں برقعے میں بہن پہچانا تم نے کس طرح
تیسرا برقعہ بولا یہ میں ہوں سچن ٹنڈولکر

☆☆☆☆

ارجنٹ کام کو نکلے دوہی دو بیلوں کی بنڈی میں
کھوٹی چونی بمبئ میں تو ڈھونڈ رہے ہیں دلی میں
کیسے کھاٹر ہیں یہ لیڈر سر میں سمجھ ہے کچھ نہیں
بارش ہے ٹی وی میں چھتر کھول رہے ہیں گلی میں

☆☆☆☆

پکڑ ہے بندوق الٹی ہاتھ میں کیوں بے گدھے
سچ بتا کس نے یہاں ڈاکو بنایا ہے مجھے
بولا ڈاکو کیا بتاؤں گینگ کے سردار نے
کرلیا بھرتی منسٹر کی سفارش پر مجھے

یوسف ناظم
۱۹ الہلال ۱۳ باندرہ ریکلمیشن
ممبئی ۴۰۰۰۵۰

قصہ خون کا

آج کل لوگوں کا خون خراب ہے اور اگر کسی وجہ سے خون خراب نہیں ہے تو خانہ ضرور خراب ہے دنیا میں خون خرابے کی ایک وجہ یہ بھی ہے ۔ آدمی کے خون کا امتحان ، اسکولوں میں ششماہی اور سالانہ امتحان کی طرح لازمی ہوگیا ہے ۔ پہلے یہ امتحان صرف خون کا گروپ معلوم کرنے کیلئے کروایا جاتا تھا اور جب خون کے بنک کھل گئے تو خونی تجارت شروع ہوگئی اور آدمی آدمی میں خونی رشتے عام ہوگئے ایک آدمی میں اس کی جاں بخشی کیلئے جب کسی ہم گروپ آدمی کا خون دوڑایا جاتا ہے تو اسے بتایا بھی نہیں جاتا کہ یہ خون تھا کس کا یہ خون اس کتاب کی طرح ہوتا ہے جو کسی سے مستعار لی جاتی ہے لیکن واپس نہیں کی جاتی ۔ اچھا خون اب نایاب ہوتا جارہا ہے اور معائب سخن کی طرح انسان کے خون میں بھی بکثرت نقائص شامل ہوگئے ہیں (خون کم رہ گیا ہے نقائص زیادہ ہوگئے ہیں) کچھ لوگوں کا خون تو میٹھا بھی ہوگیا ہے اتنا میٹھا کہ وہ لوگ بجائے خود ایک شکر فیکٹری ہوگئے ہیں۔ شکر سازی کا ایسا کارخانہ جو مسلسل نقصان میں چل رہا ہے معلوم نہیں کب بند ہوجائے خون کے دوسرے عوارض بھی کچھ کم نہیں ہیں ۔ ایسے خون کے ساتھ لوگ اکیسویں صدی میں کیسے داخل ہوسکیں گے ۔ یہ انھوں نے نہیں سوچا ہے ۔ اکیسویں صدی ، قدرے بہتر صدی ہوگی کیوں کہ خرابیوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے اکیسویں صدی میں داخلے کہ دروازے تو بیسیوں ہوں گے (اب یہ بیسیوں کی ترکیب بھی اکیسویں میں بدلی جانی چاہیئے) لیکن ان میں پچھلا دروازہ کوئی نہیں ہوگا اس لئے وہ لوگ جو اپنی زندگی یعنی عملی زندگی میں " پچھلے دروازے " کے فوائد سے فائدہ اٹھانے کے عادی رہے ہیں اکیسویں صدی میں داخل ہوتے وقت (اگر اس کا موقع ملا تو) درزاے میں " جرح " کی غرض سے روک لئے جائیں گے ۔ یہ جرح سخت بھی ہوگی اور طویل بھی ۔ بہت ممکن ہے کہ وہ جرح کے دوران ٹوٹ جائیں اور بیسیویں صدی میں لوٹ جانے کی خواہش کریں لیکن بیسویں صدی تو بند ہوچکی ہوگی ویسے کہا جارہا ہے کہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی شرائط بہت سخت ہوں گی لوگوں کو پورے کپڑے پہنے ہوں گے اور وہ مورچہ نکالیں یا دھرنا دیں اس وقت بھی انھیں کپڑے پہنے ہی رہنا ہوگا ۔ یہ نہیں کہ کپڑے اتار کر دھرنا دیں (ہاں اپنے گھر کی چار دیواری میں وہ جو چاہیں کریں) مورچوں دھرنوں کے دوران توڑ پھوڑ بھی غیر قانونی عمل ہوگا ۔ اور قانون صرف برائے نمائش نہیں ہوگا ۔ قانون کے محافظ ، چشم پوشی یا کور چشمی سے کام نہیں لے سکیں گے بلکہ قانون کی پابندی اتنی سخت

ہوگی کہ لوگوں کو چھٹی کا دودھ (اگر انھوں نے چکھا تھا) یاد آجائے گا۔ بیسویں صدی کے آخری دہے میں غ
پارلیمانی الفاظ بہت استعمال کئے گئے اور پارلیمان ہی میں استعمال کئے گئے اکیسویں صدی میں یہ الفاظ بہ
سرے سے منع ہوں گے اور ان الفاظ کو کسی دوسرے جامے میں بھی پیش کیا گیا تو اس کی سزا ناقابل بیان ہوگی.
اس سزا کا انگریزی نام کیپٹل پنشمنٹ ہے اور اردو میں اسے سزائے موت کہا جاتا ہے جو لوگ غیر پارلیمانی الف
استعمال کرنے کے عادی ہوچکے ہیں انھیں ابھی سے اپنی زبان اور انداز بیان درست کرلینا چاہیے وقت کم
گیا ہے۔اگر انھوں نے اکیسویں صدی کے کسی دروازے پر مامور اور ایستادہ دربان کے ساتھ بدکلامی کی تو یہ ا
کی آخری گفتگو ہوگی اکیسویں صدی کے دربان کسی سیاسی دباو کے بوجھ تلے دبنے والے لوگ نہیں ہوں گے۔
صحیح قسم کے مارشل ہوں گے اور صرف کام سے کام رکھیں گے ان کا کام ہوگا کام تمام کرنا لیکن ٹھہریئے ان باتوا
کیلئے ابھی دو سال کی مدت اور باقی ہے اس وقت ہم صرف "خون" کی باتیں کریں گے۔

ڈاکٹروں نے طے کر رکھا ہے کہ اب وہ اپنے ہر مریض کا خواہ وہ صرف زکام ہی کا مریض کیوں نہ ہو صرف
اس وقت علاج کریں گے جب اس کے خون کی رپورٹ ان کے ملاحظے میں پیش کی جائے ان کے اس متفقہ فیصلے
کا نتیجہ ہے کہ خون کے معائینے کی دوکانیں جگہ جگہ کھل گئی ہیں خون کے نقالیں کے جانچنے والے ماہرین بھی ڈاکٹر
ہوتے ہیں لیکن ان کا قبیلہ الگ ہوتا ہے اور یہ لوگ پیتھالوجسٹ کہلاتے ہیں ان کے پاس حاضری کی شرط یہ ہوتی
ہے کہ صبح سویرے کھائیے پیئے بغیر ہی خون کی جانچ کروالی جائے ۔ خود لہو شناس ڈاکٹر دیر سے سوکر اٹھتا ہے ا
دیر تک ناشتہ کرتا رہتا ہے انتظار کرنے والے مریضوں کا آدھا خون تو انتظار کرنے میں سوکھ جاتا ہے خون کا امتحان
طرح کا ہوتا ہے ایک سرسری جس میں ایک قطرہ خون مریض کی کسی انگلی میں سوئی چبھا کر حاصل کیا جاتا ہے
انگلی ہاتھ کی ہونی چاہیئے) یہ قطرہ خون شیشے کے دو ٹکڑوں پر منتقل کردیا جاتا ہے اور اس رگ سے ایک پچکاری
سرینج میں خون حاصل کیا جاتا ہے اس کی مقدار خاصی ہوتی ہے لیکن پیتھالوجسٹ کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی ا۔
ایک چھوٹی سی شیشی میں منتقل کرکے شیشی پر مریض کی نیم پلیٹ چسپاں کردی جاتی ہے مریض کو ناشتے
اجازت مل جاتی ہے بلکہ کئی جگہوں پر تو ناشتہ بھی مل جاتا ہے ۔ (اس کی قیمت لہو شناسی کے بل میں شامل ہوتی ۔
) تھوڑی دیر بعد مریض کو دوبارہ طلب کیا جاتا ہے یہ دیکھنے کیلئے کہ ناشتے کا اس کے خون پر کیا اثر ہوا پھر وہی عمل
دہرایا جاتا ہے اور تین گھنٹے بعد رپورٹ مریض کے حوالے کردی جاتی ہے (اب پاسپورٹ کیلئے کھنچوائے ہو۔
فوٹو بھی اسی طرح دئے جاتے ہیں) ناشتے کے بعد کا خون نسبتاً گرم ہوتا ہے اور آدمی صرف.بحث و تکرار ہی کیا
نہیں نبرد آزمائی کیلئے بھی آمادہ نظر آتا ہے رپورٹ میں خون کی ماہیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور پتہ چلتا ہے
خون میں سرخ ذرات یا تو کم ہوگئے ہیں یا زیادہ ہوگئے ہیں خون میں دبیز ہوجانے کی بھی خاصیت ہوتی ہے جس ۔
اس کی روانی میں فرق آجاتا ہے یوں سمجھئے اس کی روانی میں لکنت پیدا ہوجاتی ہے یہاں ایک اہم نکتے کی طرف
آپکی توجہ مبذول کروانی ضروری ہے پیتھالوجسٹ کی دوکان پر شیشیوں میں سے ایک آدھ شیشی دوکان کے ا
کارکن کے کام آتی ہے جو کسی کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے وہ اسی خون سے ایک خط لکھ کر محبوب کے نام بھیجتا۔
اور وہ محبوب جس نے اس کے سارے پچھلے خط ردی کی ٹوکری میں ڈال دئے تھے اب ہتھیار ڈال دیتا ہے۔
خونی تحریر گو کہ جعلی خون سے لکھی ہوتی ہے اس کے دل پر اتنا اثر کرتی ہے کہ وہ خط نویس کے ساتھ ر
ازدواج قائم کرنے میں دیر نہیں کرتا محب پر اس راز کا انکشاف برسوں بعد ہوتا ہے (پروین شاکر نے کہا تھا

لڑکیاں بہت دیر میں کھلتی ہیں لیکن یہاں تو کسی غیر کے خون نے ایک پوری فلم بناڈالی)

خون کا منفی پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب کسی مریض کے خون کی رپورٹ میں " مثبت " لکھا ہوتا ہے طبی اصطلاحات میں سب سے خطرناک اصطلاح یہی " پازیٹیو " کی اصطلاح ہے اس مثبت کا ذکر کرتے ہوئے قلم کانپنے لگتا ہے اور خون کا دباؤ یکلخت خطرے کی علامت کو چھونے لگتا ہے اس اثبات میں اغلاط بہت ہوتے ہیں اور ایک ایک قطرے کا حساب دینا پڑتا ہے ۔

بعض صورتوں میں خون کی مقدار اتنی کم ہوجاتی ہے کہ پہلو میں دل کا صرف شور سنائی دیتا ہے لیکن دل میں ایک قطرہ خون بھی نہیں ہوتا خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ اگر کوئی رقیب اس شخص کا قتل کردے تو " خون بہا " کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ مقتول میں خون تھا کہاں

خون کا امتحان بیماری کے موقع پر تو خیر ٹھیک ہے کیونکہ آدمی خواہ اس کے حالات زندگی اور ملک کے حالات حاضرہ کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو زندہ رہنا چاہتا ہے لیکن خون کا امتحان ایشین گیمس یا اولمپک کے میدان میں اچھا نہیں معلوم ہوتا ۱۰۰ میٹر کی دوڑ میں حصہ لینے والا فرد فرید ہو یا جمناسٹک کا کوئی کمال دکھانے والا ماہر فن بازی گاہی لباس اور (اسپورٹ وئیر) پہنے میدان میں حاضر رہتا ہے کہ اچانک اسے " امتحان " کیلئے طلب کرلیا جاتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اس نے تو طاقت کا انجکشن لگوایا ہے اسے میدان سے کھڑے کھڑے نکل جانا پڑتا ہے اور سارے حاضرین کو آدم کے خلد سے نکالے جانے کے واقعے کی یاد آتی ہے ۔

خون ہر جگہ بولتا ہے اور بعض موقعوں پر تو بے وجہ بولتا ہے ہماری شکایت یہ ہے کہ اب آستینوں پر لہو نظر آئیگا اور اس کی پکار کسی کے کانوں تک جاتی بھی نہیں ہے جن لوگوں نے لذت کام و دہن کیلئے خون چکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ ذائقے میں سب سے اچھا خون خونِ ناحق ہوتا ہے جس پر سب کا حق ہوتا ہے ۔۔۔

اعلان ملکیت بابتہ ماہنامہ " شگوفہ "
(تحت دفعہ ۴ قانون اشاعت)

۱۔ مقام اشاعت : حیدرآباد ۲۔ وقفہ اشاعت : ماہانہ

۳۔ نام اڈیٹر / پرنٹر / پبلشر : سید مصطفیٰ کمال ۴۔ قومیت : ہندوستانی

۵۔ سکونت : مکان نمبر 768_6_17 دبیر پورہ ، حیدرآباد ۔ 23 (اے پی) ۶۔ ملکیت : قیصر کمال 768_6_17 دبیر پورہ ، حیدرآباد ۔ 23

میں سید مصطفیٰ کمال اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ مندرجہ بالا معلومات علم و اطلاع کے مطابق صحیح و درست ہیں

یکم مارچ ۱۹۹۹ء دستخط

غزل

نسیم سحر (جدہ)

کاٹیں تو شب ہجراں ہم یار کی باتوں میں
رکھا ہی مگر کیا ہے بے کار کی باتوں میں

اک پھول ہو تم لیکن آجاتے ہو کیوں جاناں
کم بخت عدو جیسے اک خار کی باتوں میں

آفس میں تو ہوتے ہیں پر کام نہیں کرتے
ہم کاٹتے ہیں چھ دن اتوار کی باتوں میں

میری بھی نظر ان کی ہمسائی کی جانب ہے
کھوئے ہوئے ہیں وہ بھی اغیار کی باتوں میں

برباد مرے دن ہیں برباد مری راتیں
سرکار کی باتوں میں ، دلدار کی باتوں میں

افسوس یہ ہے جن کا کردار بھیانک ہے
آگے وہی رہتے ہیں کردار کی باتوں میں

مہمان مرے گھر میں آئے ہیں پشاور سے
کٹ جائیں گے اب کچھ دن نسوار کی باتوں میں

جس روز بھی پڑھ لیں ہم تفصیل سے کچھ خبریں
الجھے ہوئے رہتے ہیں اخبار کی باتوں میں

اب یاد نہیں کب تک رہ کر وہ پس چلمن
الجھائے رہے ہم کو دیدار کی باتوں میں

اس نرس کو دیکھا تو بے ساختہ جی چاہا
اے کاش وہ آجائے بیمار کی باتوں میں

لگتا ہے نسیم اب تو ڈوبے گی مری کشتی
پتوار کی بحثوں میں ، منجدھار کی باتوں میں

دلدار کی باتوں سے دل ٹوٹ چکا میرا
کیا چین ملے مجھ کو غم خوار کی باتوں میں

غزل

باذغ بہاری ۔ کلکتہ

روتے ہوئے دلوں کو اچانک ہنسا دیا
مجھ کو خدا نے وہ ہنر قہقہہ دیا

جنت کی سیر کرنے لگے شیخ محترم
بیڑی میں بھر کے میں نے جو گانجہ پلا دیا

اس دور انحطاط میں اصلاح کے لئے
رب نے مجھے سلاخ ظرافت تھما دیا

صنف مزاح و طنز کا گلقند چھوڑ کر
" میں نے غم حیات کو ٹھینگا دکھا دیا "

پوچھا جو اس نے ، عشق کیا ہے جناب نے
ٹوپی ہٹا کے میں نے سر اپنا دکھا دیا

میں جھک گیا ہوں شاخ ثمردار کی طرح
لاک اپ نے کس طرح مجھے جینا سکھا دیا

باذغ نے قہقہہ دیا صنف مزاح کو
غالب نے شاعری کو اگر ریختہ دیا

سگِ لیلیٰ (پہلی قسط)

پرویز یداللہ مہدی
(ممبئی)

آپ کو کتے نے کاٹا کاٹیئے کتے کو آپ

سانپ کے کاٹے اور کتے کے کاٹے میں فرق یہ ہوتا ہے کہ سانپ کا کاٹا پانی نہیں مانگتا اور کتے کے کاٹے کو پانی نہیں دیا جاتا اور پانی پیئے بغیر مرنے کا مطلب ہے قیامت کے "غلغلے" تک سوکھے گلگے " کی طرح قبر کے اندھیروں میں پڑے رہنا اسی لیے سانپ کو دیکھ کر ہماری نانی مرتی ہے تو کتے کو دیکھ کر پوری ننیہال۔ کتوں کے سلسلے میں ہمارے خوف کا عالم یہ ہے کہ ہم کبھی H.M.V کے پرانے رکارڈوں (وہ جو کالے توے نما ہوتے ہیں) اور کیسٹس کو ہاتھ نہیں لگاتے مبادا ان پر تصویر کی صورت بیٹھا ہوا کتا ہمیں بھنبوڑ ڈالے اگرچہ تصویر والے کتے کی حیثیت چچا غالب کے نقش فریادی سے بھی گئی گزری ہوا کرتی ہے لیکن خوف کا کیا علاج؟ کوئی علاج نہیں ہے، جب کتے کی تصویر کے معاملے میں ہماری احتیاط کا یہ عالم ہے تو پھر سوچیے جیتے جاگتے اور اصل کتے کو دیکھ کر ہمارا کیا کچھ نہ "خطا" ہو جاتا ہوگا۔!

اب آپ سے کیا چھپائیں، محض کتے کے خوف کی وجہ سے ہمیں چاندنی راتوں سے وحشت ہوتی ہے کیونکہ بزرگوں سے سنا ہے چاندنی راتوں میں یا تو ناکام عاشق دھاڑیں مار کر اپنے کپڑے پھاڑ کر روتے ہیں یا پھر سگ گزیدہ افراد۔ عاشق کے رونے کی حد تک تو خیر ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ کتے کے کاٹے کا رونا اس واسطے بھی واجبی معلوم ہوتا ہے کہ اس بیداد کی نہ تو داد ہے نہ فریاد نہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر کتے کو سزا دلوائی جاسکتی ہے نہ دعویٰ دائر کیا جاسکتا ہے نہ انصاف کی دہائی دی جاسکتی ہے بلکہ اگر کچھ انصاف ہے بھی تو ایسا عجیب و غریب کہتے ہیں ایک مجسٹریٹ صاحب بہادر کے کتے نے کسی راہ گیر کو کاٹ لیا، جب سگ گزیدہ فریاد لے کر مجسٹریٹ بہادر کے حضور میں پہنچا تو موصوف نے پہلے تو بڑے غور سے اس کی فریاد سنی کہ سارے شہر میں ان کے انصاف کا شہرہ تھا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی اس صفائی اور ہشیاری سے الگ کر دیا کرتے تھے کہ خود تو دودھوں نہاتے، فریادی کے لیے پانی چھوڑ دیا کرتے تھے خودکشی کے لیے خیر سگ گزیدہ کی فریاد سننے کے بعد مجسٹریٹ بہادر نے حکم صادر فرمایا کہ کتے کو مشکیں باندھ کر ان کے روبرو پیش کیا جائے، جب کتا بیٹھک میں پہنچا دیا گیا تو مجسٹریٹ بہادر نے سگ گزیدہ سے مخاطب ہو کر بڑے ہی شاعرانہ انداز میں یہ شعر پڑھا۔

دودھ کو پانی کریں گے اور نہ پانی کو بھاپ
آپ کو کتے نے کاٹا، کاٹئے کتے کو آپ

ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ انوکھا انصاف، اگر آدمی کتے کو کاٹ سکتا تو کتے کی وفاداری اور انسان کی بے وفائی کے اتنے قصے دنیا میں مشہور نہ ہوتے ــــ!!

جہاں تک ہمارا تعلق ہے کسی سے شناسائی بڑھانے سے پہلے اپنے تمام تر اثر و رسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ معلوم کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ صاحب موصوف کہیں کتوں سے عشق تو نہیں فرماتے۔ صاحب موصوف اگر اس "کتا پرنکشا" میں پورے اترتے اور ہر قسم کی کتا چھاپ علتوں سے پاک نظر آتے، تب ہی بات آگے بڑھتی شناسائی دوستی میں ڈھلتی ورنہ بصورت دیگر شناسائی کے سلسلے کو پہلے ہی مرحلے میں بریک، لگ جاتا۔ اس سلسلے میں ایک مرتبہ پٹتے پٹتے رہ گئے، سفر کے دوران ایک پہلوان سے جو کشتیوں کے فری اسٹائیل مقابلے میں ملکی و غیر ملکی پہلوانوں کو پچھاڑ کے رستم دوراں کا خطاب جیت کے وطن مالوف کو خوشی خوشی لوٹ رہے تھے، باتوں باتوں میں خاصی شناسائی ہوگئی بلکہ یہ شناسائی اس حد تک بے تکلفی، میں بدل گئی تھی کہ جب مقام مطلوبہ پر پہنچ کر جدا ہونے کا وقت آیا تو ہم نے ان کی طرف دست دوستی دراز کرنے سے پہلے عادت سے مجبور ہوکر یہ خطرناک سوال پوچھ ہی لیا

"پہلوان جی، آپ کے بال بچے تو یقیناً ہوں گے ہی، ہمیں صرف یہ بتائیے کہ آپ کے کتنے کتے، ہیں۔ ؟"
سوال کیا تھا اچھا خاصا بم کا گولہ تھا، جو گالی کی طرح لگا اور پہلوان کو سر سے پیر تک آگ بگولہ کر گیا، اس سے پہلے کہ وہ ہمیں گردن سے پکڑکر اس بری طرح پچھاڑتے کہ ہم سچ مچ کسی کتے کی طرح دم دبائے کھسیائے ہوئے پلیٹ فارم پر لوٹتے نظر آتے، بھیڑ کا ایک ریلا آیا اور ہمیں پہلوان کی دسترس سے بچالے گیا۔!

ہمارے وہ احباب جن کی معلومات کتوں کے تعلق سے ہم سے زیادہ وسیع ہیں، طرح طرح کی دلیلوں سے ہمارا یہ خوف دور کرنے کی بارہا کوششیں کر چکے ہیں، بڑے بڑے فلاسفروں کے اقوال دہرا چکے ہیں کہ وفاداری کے باب میں کتے کا مقابلہ کوئی دوسرا جانور نہیں کرسکتا حتی کہ آدمی بھی نہیں، اور جواب میں ہم ہر بار یہ کہہ کر اس قول کو رد کرتے آئے ہیں کہ ہماری نظر میں اس وفاداری کی کوئی اہمیت نہیں جو صرف اپنے مالک کے لیے ہو۔ ویسے اگر وفاداری ہی سب کچھ ہوتی تو پہلی محبوبہ کی بے وفائی کے بعد عاشق حضرات دوسری محبوبہ کی تلاش میں جوتیاں نہیں چٹخاتے۔ لہٰذا ہمیں وفاداری کی پٹی پڑھانا فضول ہے ہمارے اس کرارے جواب پر ہمارے سگ پرست احباب ہمیں سگ بیزار کے خطاب سے نواز کر چپ ہوجاتے اور ہم جواباً اس بات کا اس لیے برا نہیں مناتے کہ سگ آزاری، کی علت میں مبتلا ہونے سے سگ بیزاری کی تہمت اٹھائے پھرنا زیادہ بہتر ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمیں کتے سے زیادہ ہول ان انجکشنوں سے آتا ہے جو سگ مہاراج سے اپنی مزاج پرسی کروانے

کے بعد آدمی کو لگوانے پڑتے ہیں ، وہ بھی ایک دو نہیں پورے چودہ ، اسی لیے ہم کتے کی دوستی اس کی وفاداری ، اس کی نمک حلالی کو دور سے چودہ سلام کرتے ہیں ۔ سگ گزیدہ کو جو انجکشن لگائے جاتے ہیں ان میں اسقدر تندرست و توانا بلکہ "کنگ سائز" سوئی استعمال کی جاتی ہے کہ آدمی تو آدمی خود اگر کتے کے لگائی جائے تو کاٹنا تو دور بھونکنا بھی بھول جائے ۔

کتوں کے بارے میں ہماری معلومات ایک دم محدود بلکہ ناقص ہیں اس سلسلے میں ہم خود کو طفل مکتب ، سے بھی گیا گزرا گردانتے ہیں ۔ کتوں کی اقسام اور نسل کے بارے میں تھوڑا بہت جو جانتے ہیں وہ بھی محض سنی سنائی کی حد تک البتہ جس کتے کی بابت ہم نے ضرورت سے زیادہ سن رکھا ہے وہ وہی ہے جو عرف عام میں لیلیٰ کا کتا کہلاتا ہے اور شہرت کے معاملے میں میاں مجنوں سے کم نہیں بلکہ ہم سر و ہم پلہ ہے ، تاہم سگ لیلیٰ کے تعلق سے ہم نے کبھی تحقیق کا کوئی نیا یا پرانا باب کھول کر یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس عالمی شہرت یافتہ کتے کا واقعی کوئی وجود ، تھا یا یہ بھی یار لوگوں کی محض قیاس آرائی ہے البتہ سگ لیلیٰ کہ وجود پر ہمیں یقین اس لیے بھی آتا ہے کہ لیلیٰ اگر مجنوں کے علاوہ کسی کتے کے عشق میں مبتلا نہ ہوتی تو آج کی بیشتر ماڈرن متمول حسینائیں کتوں کی پرورش و پرداخت میں خصوصی دلچسپی لے کر اس روایت کو برقرار نہ رکھتیں ، چنانچہ آج کی ہر الٹرا ماڈرن دوشیزہ اس وقت تک خود کو مکمل نہیں سمجھتی جب تک کہ پرس نما بستہ اس کے شانے سے لٹکتا اور ہاتھ میں جھولتا کتے کا پٹہ نہ ہو ۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ عشاق حضرات کے حق میں یہ ماڈرن حسینائیں جتنی بے وفا ہوتی ہیں کتوں کے حق میں اتنی ہی وفادار (یہ اپنا اپنا نصیب ہے) بہر حال اگلے وقتوں کی لیلیٰ سے لے کر دور حاضر کی لیلیٰ و شہلا تک سبھی دوشیزائیں اس کتا چھاپ ، علت میں مبتلا ہیں اور ہونا بھی چاہیئے ، یہ بات ہم اس لیے بھی پورے دعوی کیساتھ کہہ رہے ہیں کہ ہماری محبوبہ بھی انہی کافر ادا حسیناؤں میں سے ایک ہے اور جب ہم اپنے دام محبت میں گرفتار کر کے دو بول پڑھوا کے یقیناً بابل کے گھر سے پی کے گھر لے آئے ہوتے اگر ایک عدد خونخوار کتا عرف سگ محبوب ، ظالم سماج کی طرح ہمارے بیچ حائل نہ ہوگیا ہوتا ۔ داستان ذرا طویل ہے لہذا دل جمعی کیساتھ سنئے ۔

اپنی اکلوتی محبوبہ سے ہماری پہلی پہلی ملاقات ٹرین کے سفر کے دوران ہوئی ہم بمبئی سے حیدرآباد لوٹ رہے تھے اور وہ گلبرگہ شریف سے ٹرین میں سوار ہوئی تھی اور یہ سفر اسے اپنے چھوٹے بھائی کے گلبرگہ کے ایک انجنیئرنگ کالج میں داخلے کی علت کے سلسلہ میں کرنا پڑا تھا ، وہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کی عادی تھی لیکن فرسٹ کلاس میں ریزرویشن نہ ملنے کی وجہ سے بحالت مجبوری سکینڈ کلاس میں سفر کرنا پڑ رہا تھا جس کا اظہار وہ پہلے تو اپنی حرکتوں پھر باتوں ، پھر نخروں پھر اداؤں سے کر کے اپنے سوشیل اسٹیٹس (Social Status) اور کلاس پر اچھی خاصی روشنی ڈال کر دیگر اہالیان ڈبہ کو مرعوب و متاثر کر چکی تب کہیں جاکر موضوع بدلا یعنی اپنی گلبرگہ شریف آمد و رفت کا مقصد بیان فرمایا جواب میں ہم بھلا چپ رہتے محترمہ کو "دھونسیانے" کی غرض سے عرض کیا کہ گرمائی تعطیلات کی وجہ سے ہم بھی مجبوراً سکینڈ کلاس میں سفر کر رہے ہیں ورنہ ہم تو صرف اے ۔ سی سلیپر کلاس میں سفر کرنے کے عادی ہیں ہمارے اس ترکی بہ ترکی جواب نے اثر دکھایا محترمہ دیگر

اہالیان ڈبہ کی بہ نسبت ہم سے کسی قدر بے تکلف ہوگئیں جس کا فائدہ اٹھاکر ہم نے باتوں باتوں میں ان کے در دولت پر شرف باریابی کی اجازت تو حاصل کرلی لیکن حسن کی چوکھٹ پر ڈنڈ پیلنے سے پہلے یہ اندیشہ دل سے دور کرنا ضروری تھا کہ محترمہ بھی دیگر ماڈرن حسیناؤں کی طرح عاشقوں کے علاوہ کتوں سے بھی محبت تو نہیں فرماتیں ۔ معاملہ نازک تھا ، براہ راست سوال یقیناً ہماری بہادری اور جواں مردی کا بھانڈہ پھوڑ سکتا تھا اس لیے گھما پھرا کر ابہام کے سہارے کتے کے امکانات پر پڑا پردا اٹھانے کی کوشش کی "آپ کے ہاں وہ " تو یقیناً ہوگا ۔ ؟

"وہ ۔۔۔ ! وہ کون ۔۔۔ ! " محترمہ نے حیرت سے دیدے گھماکر سوال کے جواب میں سوال داغا ۔

"وہ یعنی کہ وہی جو گھر کی دیکھ بھال کرتا ہے ۔ ! " ہم نے لفظوں کو چبا چبا کر الگ انداز سے وہی سوال دہرایا "

" گھر کی دیکھ بھال ۔ ؟ وہ اچھا اچھا آپ کا اشارہ نوکر کی طرف ہے ارے صاحب ہمارے ہاں تو نوکروں کی پوری کی پوری فوج ہے ، کچن کا مورچہ سنبھالنے والی بٹالین الگ ، باہر کا کام کاج دیکھنے والا دستہ علیحدہ ۔ " محترمہ نے بڑے فخر سے نوکروں کی فوج ظفر موج پر تفصیلی روشنی ڈالی ہم نے اپنی بات بلکہ اپنے مافی الضمیر کو مزید وضاحت کیساتھ محترمہ تک پہنچانے کے لیے عرض کیا ۔

" گھر کی دیکھ بھال سے میری مراد صرف نوکروں چاکروں سے نہیں بلکہ میرا اشارہ اس کی طرف ہے جو رات میں بھی جاگ کر گھر کی نگرانی کرتا ہے ۔ ! "

"رات میں جاگ کر گھر کی نگرانی کرتا ہے ۔ " محترمہ نے حیرت سے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر جیسے ہی بات کی تہہ ہاتھ لگی فخریہ لہجے میں بولیں ۔ ، رات میں جاگ کر گھر کی نگرانی تو واچ مین ' Watch man میرا مطلب ہے چوکیدار کرتا ہے ، اور چوکیدار ہمارے ہاں دو ، دو ہیں ایک دن کی ڈیوٹی والا ، دوسرا رات کی ڈیوٹی والا ۔ !

ہم نے گڑبڑا کر کہا ۔ ، لیکن میں جس کی بات کر رہا ہوں وہ نہ نوکر ہے نہ چوکیدار ، بلکہ وہ تو وہ ہے ، جو گرجتا ہے تو برستا نہیں ، برستا ہے تو گرجتا نہیں ،

محترمہ نے متحیر لہجے میں کہا " گرجتا ہے تو برستا نہیں برستا ہے تو گرجتا نہیں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے ، آپ ایسا کیجے ، گھر کا پتہ آپ نے پوچھ لیا ہے خود ہی آکر دیکھ لیجئے اسے " اتنا کہہ کر محترمہ نے بات ہی ختم کردی اور ہمارا اندیشہ بھاڑ سا منہ پھاڑے بھونکتا اور غراتا رہا ۔

(جاری)

گھر کی مرغی دال برابر

سید علی شبنم کاروادی

ابا جان کی قدر نہ جانی
ان کی شفقت نا پہچانی
ان سے روٹھے کی من مانی
اپنی ضد کی چادر تانی
چلی ہے اپنی چال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

ماموں جان ہیں وردی والے
سخت بہت بے دردی والے
گرمی میں ہیں سردی والے
کانپیں غنڈہ گردی والے
شیر ہے گھر میں کھال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

غیروں کا ہر کام ہے اچھا
ان کا جھوٹ لگے ہے سچا
اپنا پکا بھی ہے کچا
اپنا بالغ بھی ہے بچہ
سچ ہے پھر یہ مثل برابر
گھر کی مرغی دال برابر

چاچا جان ہیں ایسے افسر
ان سے کانپے سارا دفتر
ڈرے نہ کوئی ان سے گھر پر
ان کے آگے بولیں فرفر
گھر میں ہے بھونچال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

گھر کی بڑی ہر چیز بھی چھوٹی
گھر کی اصلی چیز بھی کھوٹی
گھر کی سچائی بھی جھوٹی
گھر کی نازک چیز بھی موٹی
گھر کا پیسہ ہے ڈال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

اپنا گھوڑا نال برابر
صدی ہے گویا سال برابر
یہ تالاب ہے تھال برابر
کتنا سچ ہے ہر حال برابر
شبنم کا ہے خیال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

ابا جان پڑھے لکھے ہیں
معلومات میں وہ یکے ہیں
سیکھنے والے سیکھ چکے ہیں
ہم اب تک بے فیض رہے ہیں
آپ کا ہے یہ خیال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

کچھ بھی نہیں حرمت ٹیچر کی
بے ادبی ہر بار مگر کی
گستاخی ہی شام و سحر کی
قدر نہ کی کچھ علم و ہنر کی
چادر ہے یہ رومال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

دادا جی کی ہنسی اڑائی
دادی ماں کی جان جلائی
نانا کی عینک بھی چرائی
نانی کی لاٹھی بھی چھپائی
کیا انہیں بے حال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

ماں نے ہر پکوان پکائے
پکا پکا کر ہمیں کھلائے
ہم نے ماں کے گن نہیں گائے
لذت میں بس نقص بتائے
بال کی کھینچی کھال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

اپنوں کو ہی کمتر سمجھا
اپنے پھول کو پتھر سمجھا
غیروں کو ہی بڑھ کر سمجھا
بیگانوں کو بہتر سمجھا
موتی رسی بال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

اپنے وطن کی شے نہ خریدی
لی جاپان کی جلدی جلدی
میڈ ان انگلینڈ فورا لے لی
میڈ ان جرمن جھٹ سے پکڑ لی
باہر کا ہر مال برابر
گھر کی مرغی دال برابر

ڈاکٹر آدم شیخ
(ڈائرکٹر ، انجمن اسلام اردو
ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی)

انٹلکچوئیل Intellectual

لاکھ سر مارنے پر بھی میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کرسکا کہ انگریزی لفظ Intellectual کے لئے اردو میں مناسب ترین مترادف لفظ کیا ہے ۔ ماہرین لسانیات اور زباندانوں سے پوچھا تو کسی نے دانشور ، بتایا اور کسی نے خردمند ، کوئی عبقری ، کے حق میں تھا ، کوئی دیدہ ور ، کو ترجیح دیتا تھا اور کوئی دانشور کو مناسب سمجھتا تھا ۔ ایک بار تو ہم ، یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوگئے کہ چونکہ اردو لغت میں Intellectual کے لئے کوئی لفظ یا دانش ور موجود نہیں ہے اس لئے کہیں ایسا تو نہیں کہ اردو دنیا میں کوئی دیدہ ور یا دانشور موجود ہی نہیں اردو زبان وادب کے چند کرم فرما تو یہ فرماتے ہیں کہ کسی لفظ کی تشکیل ، اس شے کے وجود کی محتاج ہوتی ہے جس کے لئے لفظ مذکور گھڑا گیا ہو ۔ اردو میں انٹلکچوئیل کے مترادف لفظ کا نہ پایا جانا کیا اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ اردو والوں میں یہ مخلوق عجیب پائی ہی نہیں جاتی ۔ اردو کے ان کو رچشم قالغوں کو یہ کیسے باور کرایا جائے کہ ان کی انہی معاندانہ سرگرمیوں کے پیش نظر محبان اردو نے اس زبان کے معیار کو اس جگہ پہنچایا ہے جہاں اس مظلوم زبان کا ہر شاعر ، نثار ، تنقید نگار ، ، پروفیسر ، کتب فروش اور کاتب ، حتیٰ کہ اردو اخبار و رسائل کی ردی بیچنے والا بھی خدا کے فضل وکرم سے اپنی ذات میں ایک انٹلکچوئیل بن گیا ہے ۔ بعض نکتہ چیں اس پر یہ واویلا مچاتے ہیں کہ اردو میں تعلیم و تدریس اور تخلیق وتنقید کا معیار بہت ہی گھٹیا ہے ، شاید وہ نہیں جانتے کہ اردو والوں نے قنوطیت اور مایوسی کو قانی بدایونی کے ساتھ دفن کردیا ہے اور اب ان کے حوصلے اتنے بلند اور معیار اتنا اونچا ہے کہ اردو کے غبی سے غبی طالب علم کو بی ۔ اے یا ایم ۔ اے کے امتحان میں اگر فرسٹ کلاس نہیں ملتا تو اسے قرب قیامت کی نشانی سمجھتا ہے اور جس نے کبھی سلیقے کی دو سطریں بھی نہیں لکھی ہوں ، پی ۔ ایچ ۔ ڈی کا مقالہ لکھ کر فلسفے کا ڈاکٹر بن جاتا ہے ۔ آج ہمارا ہر دیوانہ صاحب دیوان اور ہر فرزانہ ، تنقید نگار ہے ۔

پچھلے دنوں ایک اخباری نامہ نگار نے یہ احمقانہ سوال اٹھایا کہ ایک فرد یہ فیصلہ کس طرح کرے کہ وہ انٹلکچوئیل ہے اور کیا ایسے ہو سکتا ہے کہ ایک انٹلکچوئیل خود ہی یہ اعلان کرتا پھرے کہ وہ ایک انٹلکچوئیل ہے ۔ مذکورہ رپورٹر کے اس احمقانہ سوال کا عالمانہ جواب یہ ہے کہ اس دنیا سے اہل نظر اور عقلمند لوگ اس طرح غائب ہوگئے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ لہذا علم ودانائی کی کساد بازاری کے اس عہد میں انٹلکچوئیل

حضرات اپنی فہم و فراست کا اعلان کرتے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ اور پھر یہ کہ جب ایک کج رفتار راست بازی کا، ایک گناہ گار اپنی نیک چلنی کا، ایک سیاستداں اپنی دیانت داری کا اور ایک خزاں چشیدہ عورت اپنی بہار جوانی کا اعلان کر سکتی ہے تو پھر ایک انٹلکچوئیل ہی پر یہ پابندی کیوں عائد ہو کہ وہ اپنی عقل و دانش اعلان نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ کسی انٹلکچوئیل کے سر پر سینگ تو ہوتے نہیں کہ اپنی دانشوری ثابت کرنے کے لئے ہر جگہ اور ہر کسی کو مارتا پھرے البتہ اس مرحلے پر یہ احتیاط ضروری ہے کہ ہم کس گدھے انٹلکچوئیل نہ کہیں حالانکہ اس کے سر پر بھی انٹلکچوئیل حضرات کی طرح سینگ نہیں ہوتے۔

اب رہا یہ سوال کہ کوئی شخص اپنے بارے میں یہ فیصلہ کس طرح کرے کہ آیا وہ انٹلکچوئیل ہے یا نہیں تو صاحبو، سینیکا SENECA نامی ایک مفکر نے اس ضمن میں بڑی ہی دل لگتی بات کہی ہے کہ دنیا میں کوئی دانشور ایسا نہیں جو پاگل نہ ہو"۔ ایک اور ادیب ہیگو Hugo نے کہا ہے "ذہانت یہ ہے کہ آدمی بہت سی باتوں سے ناواقف رہے۔" اسی طرح مارک ٹوائن Mark Twain کا خیال ہے کہ "سنکی ہو اور دانش مند کہلاؤ"۔ گویا ان زعما کے خیالات کی روشنی میں انٹلکچوئیل کہلانے کا مستحق وہی شخص ہے جو سنکی پاگل اور ناواقف ہو اور اسی کو کسوٹی مان لیا جائے تو کم از کم اردو زبان و ادب کے لئے یہ بات قابل فخر ہوگی اس کے دامن سے انٹلکچوئیل حضرات جراثیم کی تعداد میں جونک کی طرح لپٹے ہوئے ہیں۔ مذکورہ اوصاف علاوہ اگر کسی بندہ خدا میں درج ذیل اضافی خوبیاں ہوں تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ منصور کی طرح الاعلان اپنے انٹلکچوئیل ہونے کا دعوی کرے۔

(۱) جو ذاتی خرچ پر اپنے اعزاز میں جلسے کروا سکتا ہو

(۲) جو اپنی بے مثال تحریروں کو خود ہی چھپوا کر انھیں خود ہی پڑھنے کی ہمت رکھتا ہو۔

(۳) جو اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے خود کو، متعدد کمیٹیوں کا صدر بنا سکتا ہو

(۴) جو مختلف اقسام کی خواتین کا نزدیک سے مطالعہ کر کے ان کی مشکلات اور مسائل میں دور تک ساتھ دے سکتا ہو۔

(۵) جو اردو کے جہاں دیدہ و نادیدہ فنکاروں کے لئے شراب و کباب اور حسن و شباب کا معقول انتظام کر سکتا ہو

پنولین بونا پارٹ سے نہ جانے کس حکیم نے یہ کہہ دیا تھا کہ ملک گیری کی ریشہ دوانیوں اور حسیناؤں کی ناز برداری کے ساتھ ساتھ عقل و دانش کے پھٹے میں بھی ٹانگ اڑایا کرو۔ ممدوح نے نہ جانے کس ترنگ میں عجیب و غریب انکشاف کیا کہ، "دانشوروں میں قابل ذکر اور لازمی عیب یہ ہوتا ہے کہ ان میں ضمیر نامی کوئی چیز نہیں ہوتی" یعنی جس شخص میں ضمیر نامی چیز کی ذرا بھی پھانس ہو، وہ دانش ور نہیں ہو سکتا۔ راقم الحروف کو بونا اس لئے قد آور نظر آنے لگا کہ اس نے زندگی میں کم از کم ایک بات تو سلیقے کی کی۔ پنولین کے اس حکیمانہ قول کے پس منظر میں جب میں نے اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑائی تو مجھے زندگی کے واٹر لو میں ایسے کئی بونے نظر آئے جو پنولین بننے کی کوشش کر رہے تھے، یاں یوں کہئے خود کو انٹلکچوئیل ثابت کرنے کے لئے ضمیر کی نفی کر رہے تھے۔ اب ان سادہ دل انسانوں کو کون سمجھائے کہ قدرت کسی مخلوق کو خواہ وہ عام آدمی ہو یا انٹلکچوئیل ضرورت کے تحت ہی پیدا فرماتی ہے۔ ذرا غور فرمائیے، دنیا میں اگر انٹلکچوئیل حضرات نہ ہوں تو ان امرا و رؤسا

کیا حال ہو جنھیں خوشامدیوں اور حاشیہ برداروں کی اتنی ہی ضرورت رہتی ہے جتنی کہ مغلیہ بادشاہوں کو درباری مسخروں کی تھی ۔

دنیا کے بڑے بڑے انٹلکچوئیل بلا کے عاشق مزاج اور کمال کے نظرباز رہے ہیں، ان کی عظمت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ منکوحہ بیوی کے علاوہ ان کے ادبی و غیر ادبی تعلقات دس پانچ حسیناؤں سے ضرور رہتے ہیں، حسن و شباب کی قربت کے بغیر ان کی فہم و فراست میں کاٹ پیدا ہی نہیں ہوتی ۔ اس منطق پر بعض علماء کو اعتراض ہو تو ہو، لیکن میری نظروں سے ایک بھی جید مولوی ایسا نہیں گزرا جو صرف ایک بیوی پر اکتفا کئے ہوئے ہو البتہ ایک مولوی اور ایک انٹلکچوئیل کے طریقہ۔ کار میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جو کام ایک مولوی شریعت کی چہار دیواری میں کرتا ہے، وہی کام ایک انٹلکچوئیل، جامے سے باہر ہوکر انجام دیتا ہے ۔ آدم کو جنت سے نکلوانے کے بعد عورت نے سب سے بڑا کام یہی کیا کہ اپنے وجود کی دھیمی دھیمی آنچ سے مردوں کے دل گرما گرا کر ان سے ذہانت و حماقت کے بے شمار کارنامے انجام دلوائے اور ہر دو صورت میں مرد خود کو انٹلکچوئیل ہی سمجھتا رہا ۔ کثرت تعلقات کے اسی بنیادی وصف کی بناء پر خاکسار جوش ملیح آبادی کو اس صدی کا ممتاز ترین دانشور گردانتا ہے ۔ حالانکہ خود جوش اپنے آپ کو اس صدی کا حافظ اور خیام منوانے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

گذشتہ چند سالوں سے بارش کی کمی نے ملک میں خشک سالی کی جو وحشت ناک فضا پیدا کردی ہے اس کا سب سے زیادہ اثر اردو کے پروفیسروں پر پڑا ہے اور بعض سینیر پروفیسر (پہلے گریڈ کی وجہ سے) بھی ذہنی خشکی کا شکار ہوکر خود کو انٹلکچوئیل سمجھنے لگے ہیں ۔ ان حضرات کو انٹلکچوئیل تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں اس لئے کہ ایک دانشمند میں خود سری، حسن پرستی اور علم بیزاری کی جن خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان پروفیسروں میں وافر مقدار میں موجود ہیں ۔ لگتا ہے ان پروفیسر حضرات نے بیچر Beechar کے اس خیال کو اپنا لیا ہے "جس نے کہا تھا کہ "ایک انٹلکچوئیل کو چراغ خانہ بننے کے بجائے روشنی کا مینار بن جانا چاہئے جس کی رہنمائی میں بھٹکے ہوئے ملاح اور مسافر اپنی منزل ڈھونڈ لیتے ہیں ۔" روشنی کا وہ مینار جو دوسروں کی رہنمائی تو کر سکتا ہے لیکن خود اپنی جگہ سے جنبش، نہیں کر سکتا اوروں کو روشنی دے سکتا ہے لیکن خود بصارت سے محروم ہے، جو ڈوبتے ہوؤں کی زندگی تو بچا سکتا ہے لیکن خود بے جان ہے ۔ اب اگر اردو زبان و ادب کے یہ خادم اور روشنی کے یہ مینار، بصارت حرکت اور ذہانت سے محروم ہیں تو ان کا گلہ کیوں ۔ ان حقائق کی روشنی میں جب ہم نے اردو کے پروفیسروں کی جانب دیکھا تو ہمارا سر فرط عقیدت سے جھک گیا ۔۔۔

پیروڈی کے چند اشعار

روشن لال روشن بنارسی

یہ دوسری بات ہے کہ ہکلا کرے کوئی
"مشکل ہے تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی"

کھانا بھی ہے بے دام تو سونے کی جگہ بھی
"گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے"

پانچ سو کی نوکری ۔ بھاڑے کا گھر مہنگا نگر
"ہم نے یہ مانا رہیں دلی میں پر کھائیں گے کیا"

ہوگئی ہے غیر کی "اردو پرستی" کار گر
"عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں"

روٹی تھی پیٹ میں نہ لنگوٹی تھی جسم پر
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

ایک عالم میں جو احمق کوئی ہم سا نہ ہوا
"پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا"

میرا لڑکا تیری لڑکی سے بہت مقبول ہے
لوفروں کا دوست "وہ آوارگی کا آشنا"!

دور تعلیم کا اس طرح ہے گزرا روشن
"ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ پڑھا کرتے تھے"!

غزل

جب بھی ڈانس پہ جائیے صاحب
شعر گاکر سنائیے صاحب

ہاضمہ ہی بگڑ کے رہ جائے
اتنی رشوت نہ کھائیے صاحب

نیکیاں کم نہیں بزرگوں کی
آپ روپیہ کمائیے صاحب

آپ ہی کو یہ دانت کاٹیں گے
مت انہیں منہ لگائیے صاحب

کچھ تو کہنا تھا آپ سے لیکن
جائیے خیر جائیے صاحب

عشق ہے دل لگی نہیں روشن
سوچ کر دل لگائیے صاحب

فضلِ حسنین
اے ۔ ۷ پترکار کالونی
اشوک نگر الہ آباد ۔ ۲۱۱۰۰۱

محفلِ خواب

میدان ادب میں داخلہ پانے کے لئے قلمکاروں کو کن کن صعوبتوں سے گزرنا پڑتا ہے، یہ تو انہی کا دل جانتا ہے۔ لیکن دشوار ترین منزل تب آئی جب ادبی محفلوں میں شرکت کے لئے ہمیں باقاعدہ دعوت نامے موصول ہونے لگے۔ کچھ دنوں تک تو اس ایڈونیچر سے ہم یقیناً محظوظ ہوئے آخر ش وہ نوبت بھی آگئی جب ہمیں ادبی محفلوں میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہونے لگا اور بہت جلد ہمیں احساس ہوگیا کہ ان محفلوں میں دانشوری کا مظاہرہ نہایت اذیت ناک ہوتا ہے (سامعین کے لئے) اور ہم سمینار کے مقررین کی جائز و ناجائز قابلیت سے کہیں زیادہ سامعین کی قوت برداشت کی داد دینا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

ایک عرصہ سے اس طرح کے سمینار یا سمپوزیم میں شرکت کرتے ہوئے ہم نے پایا کہ ماہرین ادب اگر کبھی بے خیالی میں کسی موضوع پر متفق نظر آئے بھی تو عموماً لایعنی باتوں پر مثلاً غالب قمار بازی و مے نوشی کے اتنے رسیا تھے کہ ان مشاغل کے طفیل اکثر ذلیل و خوار ہوتے اور مے نوشی کے لئے قرض تک لینے میں عار نہ محسوس کرتے تھے یہاں تک کہ قرض نہ ادا کر پانے کی صورت میں ایک بار تو عدالت میں فی البدیہہ شعر کہہ کر انھیں اپنی گلو خلاصی کرانا پڑی۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اسی طرح فانیؔ بدایونی کے بارے میں ہم نے دانشوروں کو اسی غم میں ماتم کرتے ہوئے پایا کہ مرحوم نے نہایت تنگ دستی و محرومی کی زندگی گزاری حالانکہ تصویروں میں ہمیں فانیؔ جس طرح کی شیروانی زیب تن کئے نظر آئے ہیں ہم اگر اتنا قیمتی کپڑا کسی طرح خرید بھی لیں تو اتنے اچھے ٹیلر سے اسے سلوانے کی ہمت شاید ہی کر سکیں۔

غرض یہ کہ آج تک کسی سمینار میں کوئی مثبت یا نئی بات سننے کا اتفاق اس ناچیز کو نہ ہوسکا اس وقت اپنے ایک حریف نما دوست کا واقعہ یاد آرہا ہے جو شاعری میں مبتلا رہنے کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً نثر نگاروں کی صف

میں بھی آن کھڑے ہونے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔
ہوا یوں کہ ایک مقامی درس گاہ میں علامہ اقبال پر ایک سمینار برپا ہو رہا تھا لیکن باہر سے آنے والے خصوصی مقرر نے عین موقعہ پر معذرت کا تار بھیج دیا کیونکہ اسی تاریخ کو کوئی سرکاری تقریب فاضل مقرر کے ہاتھ لگ گئی تھی جو ہر اعتبار سے زیادہ سود مند تھی۔ چنانچہ ہم نے ازراہ مذاق اپنے مذکورہ دوست سے کہا کہ اس سے اچھا موقعہ پھر کب ملے گا کیوں نہ آج آپ ہی میدان یعنی سمینار مار لیں۔ "اس پر موصوف نے عاجزانہ لہجے میں فرمایا۔ "اقبال پر ادھر کچھ دیکھ نہیں سکا"
"اقبال نے ادھر کچھ کہا بھی نہیں" ہمارے منھ سے بے اختیار نکل گیا اور اتنا سا اشارہ کام کر گیا موصوف نے اپنی سابقہ معلومات کے بل بوتے پر ہی سمینار میں ایسی دھوم مچا دی کہ نوخیز سامعین عش عش کر اٹھے البتہ تجربہ کار قسم کے سامعین موصوف کے اسٹیج پر نمودار ہوتے ہی مراقبے میں چلے گئے۔
ممکن ہے آپ کو ان محفلوں سے مستفید ہونے کا شرف ہنوز حاصل نہ ہو سکا ہو اس لئے ان صبر آزما محفلوں کی اذیت ناکی پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے آپ کو ایک بار آگاہ کر دینا ہم اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔
ادبی سمیناروں کے انعقاد کے لئے سب سے بڑا مسئلہ موضوع کے انتخاب کا ہوتا ہے کیونکہ ماہرین سمینار کا عقیدہ ہے کہ موضوع جس قدر خشک ہوگا، سمینار کی کامیابی کے امکانات اتنے ہی روشن ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ سمینار کا موضوع طے کرتے وقت دانشوران ادب اپنی تمام تر لیاقت صرف کر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ پتہ نہیں اصل سمینار میں انھیں اپنے جوہر دکھانے کا موقعہ ملتا بھی ہے یا نہیں۔
خدا خدا کر کے جب یہ منزل سر ہو جاتی ہے تو ایسے مقررین کی تلاش شروع ہوتی ہے جو خشک سے خشک تر تقریر کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ چونکہ خالصتاً خشک قسم کی تقریر کرنا اتنا آسان بھی نہیں اس لئے ان مخصوص مقررین کے دستیاب نہ ہو پانے کے باعث اکثر سمینار ملتوی ہوتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اس معاملے میں اگر ذرا بھی چوک ہوئی اور کسی نئے مقرر نے مغالطے میں ذرا بھی دلچسپ قسم کی تقریر کر دی تو سمجھئے کہ بس سمینار گیا اور ناظمین کی نااہلی کا بھانڈا پھوٹا۔ لہٰذا اس کام کے لئے عموماً اعلیٰ درس گاہوں کے مدرسین کو ہی زحمت دی جاتی ہے جو ایک ہی کورس بیس تیس سال تک مسلسل پڑھاتے رہنے کے باعث کسی موضوع پر ایک ہی تقریر دہراتے رہنے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے۔ لگے ہاتھ ان بزرگوں سے کچھ اور کام لے لئے جاتے ہیں یا پھر یہ بزرگ خود ہی اپنا کوئی اور حساب لگا کر "ایک پنتھ دو کاج" کے محاورے کو عملی شکل عطا کرتے ہیں۔
جس طرح مشاعروں میں شعراء کو مدعو کرتے وقت گروہ بندی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، اسی طرح اس کام میں بھی اب اس پہلو پر خصوصی توجہ دی جانے لگی ہے کہ ان محفلوں کا تعلق بھی بہرحال ادب سے ہے۔
ان محفلوں کے مقررین کے لئے دوسری بات جس کا لحاظ اشد ضروری ہے، یہ ہوتی ہے کہ ان میں ایک دوسرے کی نفی کرنے کا فن بام عروج پر ہونا چاہئے ورنہ اگر ان کا پیش رو کسی مخالفت کے بغیر صاف بچ کر نکل گیا تو پھر سمینار یا سمپوزیم کا مقصد ہی کیا رہ جائیگا۔
ان مقررین کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ وہ وقت مقررہ سے کچھ زیادہ دیر تک بولیں ورنہ پھر اس گھنٹی کا کیا مصرف رہ جائے گا جو عاجز آکر صدائے احتجاج بلند کر اٹھتی ہے گویا کہہ رہی ہو "حضرت! آپ حتی الوسع بور کر چکے ہیں۔ اگر آپ اب بھی خاموش نہ ہوئے تو محفل ان بچے کھچے سامعین سے بھی محروم ہو جائے گی۔ لیکن

مقررین کے لئے مشکل یہ ہوتی ہے کہ گھنٹی کے احتجاج سے قبل اگر وہ خاموش ہوگئے تو کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ موصوف ابھی اس فن میں کچے ہیں اس کوشش میں تو اکثر ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کسی مقرر کا مقالہ یا حفظ کی ہوئی تقریر اگر متعین مدت سے کچھ قبل ختم ہوگئی تو موصوف گھنٹی بجنے کے انتظار میں اسے دہرانے لگتے ہیں۔ چونکہ ان محفلوں کے سامعین ان تقریروں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دینے کے اصول پر سختی سے عمل پیرا ہوتے ہیں اس لئے مقررین کی یہ حرکت عموماً گرفت میں نہیں آتی البتہ ایسے مقررین اکثر پکڑ لئے جاتے ہیں جو اپنی اصل تقریر سے فارغ ہوجانے کے بعد گھنٹی بجنے کے انتظار میں موضوع سے ہٹ کر بولنے لگتے ہیں کیونکہ سامعین میں کچھ تو ایسے کچے ہوتے ہیں جو وقتاً فوقتاً ان تقریروں پر دھیان دے ہی دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں گھنٹی بجنے سے قبل سامعین ہی بجنے لگتے ہیں کیونکہ ان میں اکثریت ایسے مظلومین کی ہوتی ہے جو دل ہی دل میں مقررین سے فرمایا کرتے رہتے ہیں۔

سوداؔ خدا کے واسطے کر قصہ مختصر

اپنی تو آنکھ لگ گئی تیرے فسانے میں

کبھی کبھی ایک نہایت دلچسپ منظر ابتداء میں ہی دیکھنے کو مل جاتا ہے جب کوئی نومشق سمینار یہ کسی اور موقع کے لئے لکھوائی گئی تقریر نشر کرنے لگتا ہے چونکہ نئے مقرر کے ابتدائی کلمات پر سامعین اس امید پر کچھ توجہ دے ہی دیتے ہیں کہ شاید موصوف کی تقریر میں کوئی نئی بات ہو لیکن یہ جان لینے کے بعد کہ حضرت ایک کہنہ مشق " سمینار باز " ہیں سامعین حسب روایت بے اعتنائی فرماتے ہوئے سمینار کے اختتام کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں حالانکہ ان محفلوں کا اختتام تو اور بھی مایوس کن ہوتا ہے کیونکہ ان نشستوں میں چائے وغیرہ کا اہتمام بھی عموماً نہیں کیا جاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پورے وقت تک اس کامیابی کے ساتھ بے لطفی برقرار رکھنے کے بعد آخر میں سامعین کچھ راحت محسوس کرلیں اور سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے۔ اگر کسی سمینار سے اس قسم کی بدعنوانی کی خبر مل گئی تو اسے نہایت کمزور قسم کے سمینار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہم آپ سے سچ بتائیں کہ جب کبھی اچھی نیند کا لطف لینا ہوتا ہے تو ہم کسی ادبی سمینار میں چلے جاتے ہیں اور نشست گاہ کے کسی کونے میں دیوار یا ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک دو تقریروں کے بعد ہی ہم تھوڑا کیا وہاں موجود ہر چیز بیچ کر ایسا سونے لگتے ہیں کہ پھر دری یا کرسی اٹھانے والا ہی ہمیں جگاتا ہے۔ اس بدسلوکی کے دور میں بے خبری کی نیند اگر چند لمحے کے لئے ہی میسر آجائے تو غنیمت جانئے۔ لہذا اگر خدا نخواستہ آپ بھی بے خوابی کے شکار ہوں تو کسی ادبی سمینار کا رخ کیجئے !!

* قلمی معاونین صاف اور خوش خط صفحہ کے ایک جانب لکھیں۔
* ہر تخلیق پر اپنا پوسٹل پتہ ضرور لکھیں۔

ہری شنکر پرسائی
ہندی ترجمہ
ف ۔ م ۔ سلیم رپورٹر ہندی ملاپ
حیدرآباد

عید کارڈ اور راشن کارڈ

میری میز پر دو کارڈ پڑے ہیں ۔ آج کی ہی ڈاک سے آیا ہوا عید کی مبارکبادی کا کارڈ، اور دوسرا دکان سے لوٹا ہوا راشن کارڈ ۔ عید کارڈ میں کسی چاہنے والے نے مبارکباد پیش کی ہے کہ خوشی حاصل کروں ۔ ابھی میری بھلائی کے طلبگار اس دنیا میں باقی ہیں، جو خوشی دیئے بغیر چین کی سانس نہیں لیں گے ۔ عید پر انہیں کم سے کم ہماری یاد تو آتی ہے کہ اس آدمی کو خوشی ملنا ابھی باقی ہے ۔ وہ کارڈ بھیج دیتے ہیں کہ ہم تو خوش ہیں اگر تم بھی خوش ہو جاؤ تو ہمیں فی الحال کوئی اعتراض نہیں ۔

یہ عید کارڈ میری خوشی کی تمنا کا اظہار کرتا ہے ۔ مگر راشن کارڈ یہ بتاتا ہے کہ اس ماہ سے گیہوں دس کلو سے گھٹا کر پانچ کلو کر دیے گیے ہیں راشن کارڈ نے عید کارڈ کو کاٹ کر رکھ دیا ہے ۔ اور ایسا طمانچہ مارا ہے کہ خوبصورت عید کارڈ کے نازک رخسار لہو لہان ہو گیے ۔ شروع ہی سے راشن کارڈ اس عید کارڈ کو غرا کر دیکھ رہا تھا ۔ جیسے ہی میں عید کارڈ پڑھ کر خوش ہوا، راشن کارڈ نے عید کارڈ کی گردن دبائی اور کہنے لگا "کیوں بے! عید کارڈ کے بچے، تو اس آدمی کو خوشی دینا چاہتا ہے ؟ جا اس کے گیہوں گھٹا کر آدھے کر دیے گیے ۔ اب وہ باقی گیہوں کالے بازار سے خریدے یا بھوکا رہے ۔

بیچارا عید کارڈ رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا ہے ۔ میں کیا کروں؟

مظلوموں کی حفاظت کرنے کا ٹھیکہ مجھے تھوڑے ہی ملا ہے ! جنھیں ملا ہے، ان کے سامنے ہاتھ جوڑ ۔ میرے راشن کارڈ کو تیرا جھوٹ برداشت نہیں ہوا ۔ ان حالات میں میری خوشی کی جھوٹی تمنا لے کر تو کیوں آیا ۔ عید کارڈ بین الاقوامی امن کمیٹی کے امن معاہدوں کی طرح خوبصورت، مگر بے اثر ہے ۔ راشن کارڈ کھردرا اور بدصورت ہے، مگر اس میں اناج ہے ۔ میرے لیے یہی سچ ہے ۔ عید کارڈ کی اس رنگین چکناہٹ میں صرف جھوٹی اور رسمی مبارک باد ہے ۔ عید کارڈ بھی سچا ہوتا، اگر اس کے ساتھ ایک راشن کارڈ بھی بھیجا گیا ہوتا اور لکھا ہوتا "ہم چاہتے ہیں کہ تم خوش حال رہو تمہاری خوشی کے لیے ہم ایک مرے ہوئے آدمی کے نام سے ایک جعلی راشن کارڈ بنا کر بھیج رہے ہیں ۔" جب تک ایسی دھاندلیاں چلتی رہیں گی، سستا اناج لیتے رہنا اور خوش رہنا ۔ پکڑے

جانے پر ہمارا نام نہ بتانا۔ مصیبت کے وقت مہربانوں کا نام بھول جانا چاہیئے۔

میرے پاس ایسے عید کارڈ نہیں آتے جس کے ساتھ راشن کارڈ ہو۔ جو آتے ہیں وہ بیکار کے ہوتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ لوگ سمجھدار ہوتے جارہے ہیں۔ حال ہی میں ایک شعری محفل کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ کنوینرز راشن کارڈ کی اہمیت سمجھتے ہیں۔ انہوں نے شعری محفل کے اشتہار میں نوٹ لکھا تھا کہ شعری محفل کے بعد کھیر بھی کھلائی جائے گی۔ ایک بھائی نے پوچھا "کھیر" یعنی چاول کی کھیر؟ "میں نے کہا "ہیں" "تو کھیر کئی چیزوں کی بنائی جاتی ہے۔ لیکن صرف "کھیر" سے چاول کی کھیر ہی سمجھی جاتی ہے۔ شعری محفل کے کنوینر نے سوچا ہوگا یہاں کے شائقین مشاعرہ کو چاول کے دیدار نصیب نہیں ہوتے۔ کم از کم کھیر کے لالچ میں محفل کی زینت بننے آپہونچیں گے۔ سنا ہے وہاں کھیر کھانے والوں کی بہت بھیڑ تھی۔

ان عید کارڈوں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا ـــ جھوٹے ہوتے ہیں ـــ پچھلی ڈاک سے جو عید کارڈ مجھے ملا، میرے ایک دوست کا تھا جو ایک پریس کے پبلشر ہیں اور میری ایک کتاب کے بہت سے روپے ہڑپ کر چکے ہیں۔ لیکن عید کارڈ ـــ ہر عید پر ضرور آتا ہے لکھا ہوا ہوتا ہے ـــ

"تم خوشی اور مسرت حاصل کرو" ـــ میں ہر بار غور سے دیکھتا ہوں کہ کیا اس کارڈ کے چہرے پر کوئی شرم بھی ہے؟ نہیں ہوتی۔ کڑی بے شرمی ہوتی ہے۔ بلکہ شکایت ہی ہوتی ہے کہ تم نے تھوڑے تو روپے لے ہی لیے تھے۔ میں کہتا ہوں "بے شرم کارڈ صاحب، میں اگر خوش ہوجاؤں تو تمہارے بھیجنے والے کی خوشی، کم ہوجائے گی۔ جاؤ، پوچھ کر آؤ کہ کیا سچ مچ خوش ہوجاؤں"

کارڈ گھبرا جاتا ہے کہتا ہے "جناب ان سے کیا پوچھنا ہے، کیا میں انہیں جانتا نہیں ہوں، اس مبارک باد کو بالکل، سیریسلی SERIOUSLY مت لیجئے۔"

ایک عید کارڈ ایک دوا فروش کا ہے۔ ماڈرن کیمسٹس، پروپرائٹر مسرس ٹنگے لال۔ ٹنگے لال اینڈ سنس! کارڈ انگریزی میں ہے مجھے معلوم ہے کہ ٹنگے لال اور ٹنگے لال کے آنجہانی والد خانص ان پڑھ تھے۔ ٹنگے لال اور ٹنگے لال بھی انگریزی نہیں جانتے۔ سنس کے بارے میں نہیں جانتا۔ مگر یہ دونوں بھائی ستیہ نارائن کی کتھا کا دعوت نامہ بھی انگریزی میں دیتے ہیں۔ 1947 میں جب انگریز بھاگنے لگے تو انہیں یہ فکر لاحق تھی کہ ہماری جگہ کون لے گا۔ تب ٹنگے لال جی اور ٹنگے لال جی نے ان سے کہا۔ "ان داتا ہم ہیں نا"۔

انگریز پر سکون ہوئے۔ بولے "اب ہم جاسکتے ہیں ہمیں، قابل وارث مل گئے ہیں۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں ہماری انگریزی محفوظ رہے گی۔ امید ہے کہ آپ لوگوں کے بیٹے کرکٹ بھی کھیلیں گے۔

دکان داروں کے گریٹنگ کارڈ تو بل کی یاد دہانی کا ایک حیلہ ہوتے ہیں۔ "جناب آپ کے خوش ہونے کا تو کوئی "چانس" نہیں ہے، مگر ہمارا بل روک کر آپ ہماری خوشیاں کیوں کم کر رہے ہیں؟"

دوستوں سے تو میں کہتا ہوں کہ وہ مجھے عید کارڈ نہ بھیجیں۔ مبارک باد اس ملک میں کارگر نہیں ہو رہی ہے۔ یہاں "گورکشا (گائے کی حفاظت) کا جلوس تو سات لاکھ کا ہوتا ہے۔ مگر انسانوں کی حفاظت کا جلوس ایک لاکھ کا بھی نہیں ہوتا۔

دنیا بھر میں مبارک باد صرف ایک روایت سی بن کر رہ گئی ہے۔ "پوپ" کی مبارک باد سے ایک بم کم نہیں

گرتا۔ دوستوں کی دعا سے ہی کوئی خوش و خرم اور دولت مند نہیں بنتا۔ کامیابی کے محل کا باب الداخلہ مقفل ہے ۔اس میں پچھلے دروازے سے ہی گھسا جاسکتا ہے ۔ جنہیں گھسنا آتا ہے، وہ ناک پر رومال رکھ کر گھس جاتے ہیں ۔ پاس ہی عطر کی خوشبو سے بھر پور رومالوں کے ٹھیلے کھڑے ہیں ۔ " رومال خرید و ناک پر رکھو ، اور پچھلے دروازے سے گھس جاؤ۔

دوستی کا اصل امتحان خوشی میں ہوتا ہے جو دوست کی خوش نصیبی کو برداشت کرے وہی سچا دوست ہوتا ہے ۔ مصیبت میں بنی ہوئی گہری اور سچی دوستی کو خوش نصیبی کے لمحات میں جھوٹی ہوتے ہم نے دیکھا ہے ۔ ایک شاعر کی چار غزلیں شائع ہوئیں ۔ چار دوست ٹوٹ گئے ۔ آٹھ شائع ہونے پر پورے آٹھ دوست دور ہو گئے ۔ ایک شاعر کو دو مشاعروں میں بے حد داد ملی جس کی وجہ سے ان کے ایک شاعر دوست روٹھ گئے ۔ تیسرے مشاعرے میں جب "ہوٹنگ" ہوئی تو دوستی پھر برقرار ہوئی۔

گریٹنگ کارڈوں پر اب بھروسا نہیں رہا ۔ ۵۰ سالوں سے اس ملک کو گریٹنگ کارڈوں کے بھروسے چلایا جارہا ہے ۔ انبار لگ گیے ہیں ۔ ہر تہوار پر دیش واسیوں کو گریٹنگ کارڈ دیے جاتے ہیں ۔ ۱۵ اگسٹ اور ۲۶ جنوری کو پارلیمنٹ کے اجلاس میں بہترین ، سنہرے رنگ کے اور میٹھے الفاظ کے گریٹنگ کارڈ ۔۔۔ دیش واسیو ، بس اس سال تم سکھی اور دولت مند بن جاو ۔ گریٹنگ کارڈوں کے ڈھیر لگے ہیں ۔ مگر راشن کارڈ چھوٹا ہوتا جارہا ہے ۔ حکومت عوام کو ٹھگ رہی ہے ۔ ایک سرکاری ملازم کہہ رہا تھا " کل ہمارا مہنگائی بھتہ بڑھانے کا اعلان ہوا اور آج بازار میں بھاو بڑھ گیے ۔ سرکار پھر ٹھگ گئی ۔ سرکار کو ٹھگنا بالکل آسان ہے ۔ نابالغ ہے ۔ یہ سرکار ۔۔۔ بیچاری سرکار کی طرف سے کوئی قیمت چکانے والا نہیں ہے ۔ کوئی بھی ٹھگ لیتا ہے ۔ مجھے ڈر ہے اگر ایسا ہی چلا تو کسی دن سرکار کو ڈاکو پکڑلے جائیں گے ۔ اور وارثوں کو فون پر کہیں گے کہ جنگل میں فلاں جگہ اتنی رقم رکھ جاؤ ، تب تمہاری سرکار کو چھوڑ دیں گے ۔

جب کیا ہوگا ؟ وارثوں کا کیا بھروسہ ؟ میں نے سنا ہے ۔ ایک سیٹھ کو ڈاکو پکڑلے گیے ۔ بیٹوں کو چٹھی لکھی تھی " ایک لاکھ روپیہ دیں گے تو تمہارے باپ کو چھوڑ دیں گے ۔ "انہوں جواب دیا کہ " ہمارا تو کوئی باپ ہی نہیں تھا اگر سرکار کے وارثوں نے ایسا جواب دے دیا ، تو کیا ہوگا ؟ مجھے فکر ہے پھر یہ عید کارڈ کون بھیجے گا۔

مرزا کھونچ
نیا ٹولہ، بیتیا
۸۴۵۴۳۸ بہار

کمیٹی بنائیے! فائدہ اٹھائیے،

کہا جاتا ہے کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ یعنی بھاڑ پھوڑنے کے لئے بہت سارے چنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ بہت سارے چنے مل کر بھی ایک ادنیٰ بھاڑ بھوڑ سکے ہوں۔ پھر بھی جب یہ کہاوت ہے تو اسے مان لینے میں کیا جاتا ہے۔ ٹھیک ایک چنے کی طرح ایک اکیلا انسان سماج میں اپنی سوچ کو عملی شکل نہیں دے سکتا۔ اس کے لئے اسے کچھ ہم خیال لوگوں کو اکٹھا کرنا ہوتا ہے۔ لوگوں کے اسی اکٹھے ہونے کا نام کمیٹی ہے۔ بھلے کچھ ہو یا نہ ہو کمیٹی بن جاتی ہے۔ کمیٹی کس کی ایجاد ہے یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ مگر جس نے بھی اس کام کو کیا ہے وہ بہت بڑا مفکر اور مدبر رہا ہو گا یوں تو کمیٹیوں کا فائدہ ہر زاوئے سے لوگ اٹھا رہے ہیں لیکن کمیٹی کی وبائی صورت حال کم نہیں ہے بہت پہلے چچا اکبر فرما گئے ہیں

کمیٹی میں چندہ دیا کیجئے
ترقی کی سبجے کیا کیجئے

واقعی چچا نے بڑے پتے کی بات کہی ہے میری نظروں میں ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کمیٹی ترقی کا پہلا زینہ ہے اور چندہ کمیٹی کا تیل پانی ہے۔ جب بھی کوئی پودا لگایا جاتا ہے اسے کھاد پانی کی ضرورت ہوتی ہے تبھی پودا جلد بڑھتا اور پھولتا پھلتا ہے۔ بنا کھاد پانی کے بھی کچھ پودے بڑھ جاتے ہیں لیکن وہ برسات میں پیدا ہونے والے خس و خاشاک کی طرح جلد ہی سوکھ جاتے ہیں۔ اس طرح ترقی کے لئے کمیٹی بنایئے اور کمیٹی کو پھلنے پھولنے کے لئے چندہ دیجئے یعنی کمیٹی ترقی کی ضامن ہوتی ہے جہاں کمیٹی نہیں ہے وہاں بھی خوب ترقی ہوتی ہے مگر اس ترقی میں مزہ نہیں آتا۔ آپ کی ترقی دیکھ کر کچھ لوگ خوش نہ ہوں کچھ لوگ جلے نہیں تو پھر آپ کی ترقی کا فائدہ کیا ہے۔ سماج کی اصلاح کرنی ہو، جہیز کو مٹانا ہو یا جہیز کو بچانا ہو، ادب کو سجانا سنوارنا ہو، مذہبیات کی گاڑی کو سماج کی سڑکوں پر دوڑانا ہو، غریب بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا ہو، امن قائم کرنا ہو اور اپنے مطالبات کے لئے تگ و دو کرنا ہو تو کسی سے بھی اکیلے یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کے لئے کمیٹی بنانی ہی پڑے گی۔ تبھی جا کر معاملہ آگے بڑھے گا۔ کیونکہ کمیٹیاں سماجی ترقی، مذہبی ترقی، ادبی ترقی، معاشی ترقی کی ضمانت دیتی ہیں۔ کمیٹی قوم

کی اصلاح کے لئے ہاتھ دھوکر پیچھے پڑجاتی ہے ۔ کچھ کمیٹیاں ہاتھ اور پیر دونوں دھولیتی ہیں ۔
وہ تمام ترقیاں جو ایک آدمی سے اکیلے ممکن نہیں اسے کمیٹی کے ذریعہ منزل مقصود پر پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ بھلے ہی وہ کمیٹی راستے میں دم توڑ دے ۔ یہ قسمت کی بات ہے اور قسمت پر کسی کا زور نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب ایک کمیٹی دم توڑتی ہے یا کچھ کمزور پڑتی ہے تو اس کی جگہ فوراً ایک مضبوط کمیٹی تشکیل دے دی جاتی ہے ۔ کمیٹیاں بنتی ہیں بگڑتی ہیں ۔ ہر عروج کو زوال ہونا ہے وہ حسن ہو یا کمیٹی ہو زوال دونوں کی تقدیر ہے ۔ بلکہ حسین ہونے کے لئے زوال قدرے ہونا ضروری ہے ۔ جس کمیٹی کا جلد زوال ہوجائے سمجھ لیجئے وہ بہت حسین تھی جس کمیٹی میں زیادہ سے زیادہ چندہ اکٹھا ہوجائے اور ایک بڑا پروگرام کرنے کا اعلان ہوجائے سمجھ لیجئے کمیٹی اپنے عروج پہ ہے اب اس پر جلد زوال آنے والا ہے ۔ اس کمیٹی کے زوال پذیر ہوتے ہی ایک نئی کمیٹی نئے سج دھج کے ساتھ قائم ہوگئی اور پہلی کمیٹی سے بھی بڑے پروگرام کرانے کا اعلان کرے گی ۔ کمیٹی کے ٹوٹنے اور بننے کا سلسلہ اس لئے بھی برقرار رہتا ہے کہ اس کے ارکان کبھی چندہ اور کبھی خیالوں کے ربط کو یکجا نہیں کر پاتے ہیں ۔ صدر کا خیال سکریٹری کے خیال سے ٹکرایا نہیں کہ یہ دونوں حضرات آپس میں گتھم گتھا ہوئے اور کسی بھی ٹکر کا نتیجہ کہیں ٹوٹ ہوتا ہے تو کہیں پھوٹ ۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ارکان اگر ایک ہی خاندان کے دو ہوئے اور خاندان میں کسی بات کو لیکر اختلاف پیدا ہوگیا تو اسکا بھی اثر کمیٹی پر پڑتا ہے ۔ وہ دونوں ، کمیٹی پر اپنا اثر قائم کرنے کے لئے دوسرے ارکان اور عہدے دار کو اپنے زیر اثر لاکر کمیٹی سے ایک دوسرے کو نکالنے کے حربے استعمال کرنے لگتے ہیں ۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس سے ایک کمیٹی میں دو گروپ پیدا ہوجائیگا ۔ مساوی کمیٹی بنے گی ۔ کمیٹی ٹوٹنے کے اور بھی وجوہات ہیں جنھیں منظرعام پر لانے میں کمیٹی کی صحت پر برا اثر پڑنے کا ڈر ہے اس لئے بس یہی سمجھ لیجئے کہ ٹوٹنا اس کی قسمت ہے ۔ اگر نئی کمیٹی نہیں بنیگی تو نیا خون سرد مہری کا شکار ہوجائیگا اور یہ کسی بھی قوم کے حق میں ایک خطرناک اشارہ ہے ۔

معاشرہ کے اصلاح کے لئے اصلاحی کمیٹی وجود میں آتی ہے ۔ سماج کو جہیز گھن کی طرح کھارہا ہے اس لئے اس موذی کا صفایا ضروری ہے ۔ اور ظاہر سی بات ہے کہ یہ ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہے ۔ اس کے لئے ایک زبردست کمیٹی کی ضرورت ہے ۔ اور کمیٹی یہ طے کرتی ہے کہ اس موذی مرض کے لئے کون سی دوا استعمال کی جائے تاکہ یہ تہذیبی امانت محفوظ بھی رہے اور اس کا استعمال بھی نہ ہو ۔ اسے لینے پر پابندی نہ ہو مگر دینے کے معاملہ میں احتیاط برتی جائے اللہ رسول کا واسطہ دیکر پمفلٹ کتابچے نکالے جائیں اور اس کے برے اثرات کو منظرعام پر لایا جائے ۔ سماج کے غریب بچے اکثر نہیں پڑھ پاتے ہیں انہیں پڑھانا ضروری ہے ۔ یہ بھی اکیلے نہیں ہوکا اس کے لئے ایک کمیٹی ضروری ہے ۔ کمیٹی بچوں کو پڑھانے کے لئے ایک جگہ ڈھونڈتی ہے ۔ ایک استاد ڈھونڈتی ہے جو مدرسہ بہ حسن و خوبی چلاسکے ۔ لڑکوں کو گھروں سے بلا بلا کر لائے اور انہیں پڑھائے ، انہیں خدمت کرنے کے جذبہ سے سرشار کرے تاکہ بچے دن بھر استاد کی خدمت میں لگے رہیں ۔ کمیٹی کے ارکان کے یہاں سے استاد کے لئے کھانا مانگ کر لائیں اور ان کے گھروں کا چھوٹا موٹا کام انجام دیں ۔ استاد اپنی تنخواہ کا پیسہ خود ہی گھر گھر سے وصول کریں وہ لوگوں کی جھڑکیاں سنکر بھی آؤٹ ڈورنہ ہوں ۔ دیکھا کمیٹی کی افادیت ، غریب بچوں نے تعلیم بھی حاصل کرلی اور صدر سکریٹری کو مفت میں خدمت گار بھی مل گئے ۔

ایک بات اور واضح کرتا چلوں کہ حکومت کی طرف سے بھی وہ کمیٹیاں جو رجسٹرڈ ہوتی ہیں اور جنکے کچھ منشور ہوتے ہیں ،انھیں معاشی مدد ملتی ہے تاکہ ان کے فلاحی کاموں میں رکاوٹ پیدا نہ ہو یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی کمیٹی کے ارکان کی جھونپڑیاں بہت جلد کوٹھیاں بن جاتی ہیں پیدل چلنے والے موٹر سائکل پر دندناتے پھرتے ہیں ۔ چاہے زندوں کا تحفظ نہ ہو مگر مردوں کی حفاظت کے لئے قبرستان کمیٹی کا ہونا لازمی ہے ۔ یہ مردے قوم کی امانت ہیں ۔ اگر انہیں محفوظ نہیں رکھا گیا تو مردوں کا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن زندوں کی بے حسی پر دوسری قوم کے لوگ ہنسی اڑائیں گے ۔ اس لئے کمیٹی والے قوم سے چندہ لیکر قبرستان کے چاروں طرف چہار دیواری بنانے کے نام پر چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنوادیتے ہیں اور خود کو اس کا دائمی حقدار قرار دیتے ہیں ۔ وہ قبرستان کو ایسا سجادیتے ہیں کہ وہ جائے عبرت کے علاوہ سب کچھ بن جاتا ہے ۔ مردہ تو مردہ زندوں کا بھی دل لگنے لگتا ہے لوگ فاتحہ بھی پڑھتے ہیں اور قبرستان کمیٹی کا قصیدہ بھی گانے لگتے ہیں ورنہ یہ دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تر لوگ مردے کو دفناتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور فاتحہ پڑھنے کے لئے مرحوم کے پس ماندگان کو چھوڑ دیتے ہیں ۔ ایک کمیٹی بنتی ہے لاوارث مردوں کی ہولت کے لئے تاکہ لاوارث مردوں کو پیسے کی کمی نہیں کھٹکے ۔ چونکہ مسجد اللہ کا گھر ہے اور ہم سب اللہ کے بندے ہیں ۔ اس لئے مسجد کے نام پر جتنی چاہئے کمیٹی بنائیے اور چندہ وصولئے ! روکنے نہیں جائیگا کون روک کر گناہ کا ٹوکرا سر پر لادے کا اللہ کے گھر کے نام پر اللہ کے بندے ہی تو کمیٹی بنارہے ہیں رہا سوال پنجگانہ ادا کرنے کا تو اس کے لئے پیش امام اور موذن تو رکھے ہی جاتے ہیں ۔ سب کام کمیٹی والے کرینگے تو محلے کے بڑے بوڑھے کیا کرینگے ۔ انہیں کم سے کم پنجگانہ ادا کرنا چاہیئے وہ چائے کی دکان پر بیٹھ جاتے ہیں اور دوسروں کی بہو بیٹیوں پر تنقید کرتے ہیں کمیٹی والوں کو اتنا حق نہیں ہے کہ وہ انہیں پنجگانہ پڑھنے کے لئے کہیں ۔ کیونکہ ان بزرگوں میں بہت سارے کمیٹی والوں کے والد ، چچا اور ماموں ہوتے ہیں ۔ پھر کمیٹی والے نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں یہ ان کا انفرادی معاملہ ہے ۔ اللہ ان سے سمجھے کا اللہ کے گھر کی محافظت انہیں جنت میں پہنچانے کے لئے کافی ہے مسجد اللہ کا گھر ہے اور کمیٹی والے اللہ کے بندے ہیں اور چندہ دیا گیا ہے اللہ کے نام پہ اس سے یہ بات ثابت ہے کہ وصولے گئے چندے پر جتنا مسجد کا ہے اتنا ہی کمیٹی والوں کا بھی حق ہے ۔ اس میں ہنگامہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ مذہب کی اشاعت کے لئے یہ کمیٹی والے سال میں ایک بار سالانہ اجلاس بلاتے ہیں دور دور کے واعظین اور مقررین کی آمد ہوتی ہے ۔ رات رات بھر تقریروں کا سلسلہ چلتا ہے ۔ دعوت خوانی ہوتی ہے ۔ یہ کمیٹی والے روزہ رکھیں یا نہیں رکھیں مگر رمضان کے مہینے میں مسجد میں لاوڈ اسپیکر کا انتظام ضرور کراتے ہیں تاکہ روزے داروں کو افطار اور سحری میں آسانی ہو ۔

ہمارے یہاں امداد باہمی کا رواج بہت پہلے سے ہے اس لئے جب بھی کوئی قدرتی آفت آتی ہے فوراً امدادی کمیٹیاں حرکت میں آجاتی ہیں ۔ یہ کمیٹیاں آفت میں راحت کا کام کرتی ہیں ۔ سالوں یہ کمیٹیاں آفت ناگہانی کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہیں میرے خیال سے آفت بھی انہی کمیٹوں کی دعا سے آتی ہے جب تک اللہ کے نیک بندے رہنگے ایسی کمیٹیاں زندہ رہنگی جس دن ایسی کمیٹیاں ختم ہوجائینگی سمجھ لیجئے قیامت نزدیک ہے ۔ ادب کو فروغ دینے میں ان کمیٹیوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے چونکہ ادیب بڑے تنک مزاج ہوتے ہیں اس لئے یہ کمیٹی بھی بڑی نازک ہوتی ہے اور جلد ہی ٹوٹ جاتی ہے ۔ لیکن قربان جائیے ان حوصلوں پر جو ٹوٹے ہوئے کندھوں سے ادب کی گاڑی کو کھینچ کر ترقی کی راہ پر ڈال دیتے ہیں کمیٹی مشاعرہ کراتی ہے شب افسانہ مناتی ہے یوم وفات

اور یوم پیدائش مناتی ہے یعنی وہ سارے کام کرتی ہے جس سے مقامی ادب فروغ پائے کمیٹی ادبی محفل میں کسی وزیر یا رئیس شہر کو بلاکر ادب اور سیاست یا ادب اور معیشت میں ربط پیدا کرتی ہے۔ ادیبوں کو ان سے اعزاز بخشواتی ہے کتنا دلفریب وہ منظر ہوتا ہے جب ایک ادیب کو ایک بے ادب اعزاز بخش رہا ہوتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ کمیٹی کے سکریٹری جب مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو انہیں محسن ادب کا خطاب دے ڈالتے ہیں۔ اب آپ ہی بتلائیے۔ مشاعرہ نہ ہو، شب افسانہ نہ منے تو کیا ادب فروغ پاسکے گا۔ یوم مناکر بزرگوں کی روحوں کو تسکین نہیں پہنچائی جائے تو کیا ان کی روحیں ہمارے ادیبوں کو بد دعا نہیں دینگی۔ آپ آزاد ہیں الزام لگانا آپ کا حق ہے۔ لگاڈالئے کمیٹی والوں پر الزام کہ وہ ادبی نہیں سیاسی جلسہ تھا۔ کمیٹی والوں نے سیاسی روٹیاں سینکی ہیں، مگر ایک بات میں صاف لفظوں میں کہتا چلوں کہ اگر یہ کمیٹی نہیں رہے تو لوگ بے حسی اور بے یقینی کی زندگی گزارنے لگیں گے۔ جس شہر میں جتنی زیادہ کمیٹیاں ہوں وہ شہر معاشی، مذہبی ادبی اور اصلاحی نکتہ نگاہ سے اتنا ہی فربہ اور زور دار مانا جاتا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے شہر میں کمیٹیوں کی کمی نہیں ہے جس محلہ میں جائیے کوئی نہ کوئی کمیٹی آپ کا استقبال کرتی نظر آئیگی۔ کمیٹی والے چندہ لے لے کر قوم کے اندر قومی، ملی اور ادبی ہمدردیوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ صرف عوام ہی کمیٹی بناتی ہے۔ سرکار بھی کمیٹی بناتی ہے اور اس کمیٹی کے مشورے پر حکومت چلاتی ہے اس کمیٹی کو صلاح کار کمیٹی کہتے ہیں کہیں ہنگامہ ہوجائے تو امن کمیٹیاں بناکر یکجہتی کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اس ملک میں جہاں بیکاری کے مسائل عفریت کی طرح منھ کھولے کھڑے ہیں وہاں کمیٹیوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ آخر وہ کیا کرینگے جنکے پاس کوئی کام نہیں ہے خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے اور جب دماغ میں شیطان گھر کر جائے تو سوچئے کیا ہوگا؟ میں تو کہتا ہوں کہ جنکے پاس بھی فرصت کے اوقات زیادہ ہوں وہ فوراً دوڑ کر کمیٹی بناڈالیں۔ ایک سرکاری یا غیر سرکاری عہدے دار کو اپنی کمائی سے فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ اوروں کے مسائل کی طرف نظر ڈالے اسے تو بس کمائی کرنی ہے اگر وہ زیادہ سے زیادہ کمائی نہیں کرے گا تو کمیٹی میں زیادہ سے زیادہ چندہ کیسے دیگا لیکن سوال یہ ہے کہ چندہ وصولنے والا بھی تو کوئی ہونا چاہئے بیکاروں کے پاس فرصت ہی فرصت بیکاروں کے پاس بھی پیٹ ہے نوکری پیشہ تو تنخواہ سے کام چلالیتے ہیں مگر یہ بیکار حضرات عزت کی روٹی پانے کے لئے کہاں جائیں۔ عزت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے انہیں کمیٹی بنانا ہی پڑے گی ورنہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے وہ غلط قدم بھی اٹھا سکتے ہیں کمیٹیوں کی وجہ سے وہ کئی برائیوں سے صاف پاک رہتے ہیں بس چندہ وصولتے ہیں اور قوم کی بگڑی سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں کامیابی ملے نہ ملے یہ قسمت کی بات ہے لیکن وہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ جہیز ہٹاؤ کمیٹی کے لاکھ چاہنے کے باوجود اگر جہیز نے زور پکڑ لیا تو اس کمیٹی والوں کا کیا قصور۔ غریب کے لڑکے اگر نہیں پڑھنا چاہیں تو کمیٹی والے کیا کرسکتے ہیں لوگ مشاعرہ میں کلام نہیں ترنم سننے آئیں تو بھلا کمیٹی والے اچھے اور بڑے شاعروں کو بلاکر کیونکر اپنی ناک کٹوائیں واعظ کی تقریریں سنکر بھی لوگ مسجد کی طرف رخ نہ کریں تو کمیٹی والے ہاتھ پکڑ کر تو مسجد میں نہیں لائینگے۔

تو جناب، آپ نے دیکھ لیا کہ کمیٹی سے کیا کیا فائدے ہیں اب بھی وقت ہے آپ بھی اٹھئے اور جھٹ پٹ ایک کمیٹی بناکر معمار قوم بننے کی کوشش میں جٹ جائیے۔ یعنی کمیٹی بنائیے فائدہ اٹھائیے ــــ

منظور عثمانی (سابق پرنسپل)
۷/۱۱۷۔ ہیملٹن روڈ کشمیری گیٹ۔ دہلی۔ ۶

"دست خود دہان خود"

اہل دانش کی اس سے کیا مراد ہے ہم ان جھمیلوں میں پڑے بغیر یوں محسوس کرتے ہیں گویا یہ ضرب المثل بوفے سسٹم جسے عرف عام میں کھڑا کھانا کہتے ہیں کیلئے ہی وجود میں آئی کیونکہ اس طریقہ، طعام میں ہر شخص کو اپنی مدد آپ کرنی ہوتی ہے۔ میزبان تو مہمان کو در محشر (محفلِ طعام) پر چھوڑ یا دوسرے لفظوں میں رستہ دکھاکر دوسرے کاموں میں مصروف یہ کہہ کر ہو جاتا ہے۔

کار جہاں دراز ہے تو مرا انتظار کر

لیکن اگر بیچارہ مہمان اس کے قول پر یقین کرکے انتظار کے چکر میں پڑجائے تو اس نفسا نفسی اور چھینا جھپٹی کے بیچ عالمی دوڑ میں بھارت کی طرح سب سے پھسڈی رہ کر خالی ہاتھ لوٹنا پڑے ذوق نے کیا خوب کہا ہے۔

اے ذوق تکلف میں ہے، تکلیف سراسر

آرام سے ہیں وہ جو تکلف نہیں کرتے

اگرچہ طوطئ ہندا استاد ذوق کے زمانے میں اس طرح کی خرافات نہیں تھیں لیکن اس شعر کی آفاقیت دیکھئے کہ زمان و مکان کی قیود کو پھلانگتا ہوا اس سسٹم پر ایسے چسپاں ہوگیا جیسے کسی ٹیڈی گرل کے بدن پر جینز۔ اس طرح کی دعوتوں میں تکلف کے چکر میں پڑنے والے تو مار کھاتے ہیں البتہ تہذیب و تکلف کو بالائے طاق رکھ کر اس زریں اصول کو اپنانے والے سرخ رو ضرور ہوتے ہیں کہ جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ سے مینا اسی کا ہے اور جو شرافت کے مارے کم ہمت لوگ ایسا نہیں کرپاتے وہ بیچارے پلیٹ میں ایک آدھ درائٹی اور وہ بھی جسے کسی نے منہ نہ لگایا ہو رکھے ایک کنارے کھڑے حسرت بھری نظروں سے طوفاں (طوفان بدتمیزی) کا نظارہ کرتے نظر آتے ہیں ان محرومین کی خالی پلیٹ فریاد رسی کرتی ہوئی یہ کہتی لگتی ہے

کہ تو ہی ناداں چند تنکوں پر قناعت کر گیا۔

دیکھا جائے تو اس سسٹم میں شہ زوروں کی ہی دال گل پاتی ہے۔ جو حوصلہ مند لوگ دوسروں کو پیچھے

دھکیلنے کا ہنر جانتے ہیں انھیں ہی ایسی ضیافتوں میں جانے کا حق پہنچتا ہے چنانچہ جب کھانا کھلتا ہے یہ حضرات بھی خوب کھل کھیلتے ہیں۔ ہاتھ میں پلیٹ لئے انواع و اقسام کے کھانوں پر بسم اللہ کہکر ایسے ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے قرون اولیٰ میں شہادت کے متلاشی سچے مومن اپنے غنیم پر۔ پلک جھپکتے یہ ضیافتی مجاہد کشتوں کے پشتے لگادیتے ہیں۔ ہمارے ایک واقف کار کو ایسی دعوتیں بے حد پسند ہیں۔ انہیں سب لوگ شکم سیر خاں کہتے ہیں۔ اتنا بتادیں کہ یہ لقب انہوں نے لحاظ ملاحظے یا کسی کی سفارش سے نہیں بلکہ خالص اپنی دست درازی اور زور شکم کے بل بوتے پر حاصل کیا ہے۔ کچھ جان کار انھیں "امام بونہ" بھی کہتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ان کی چابکدستی اور چلت پھرت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔

کبھی اس طرف لپکے ہیں تو کبھی اس طرف۔ کھانا ہے کہ پلیٹ سے ابلا پڑتا ہے۔ ہر اچھے کھانے پر ایسے حریصانہ نظریں ڈالتے ہیں جیسے عیاش جاگیردار پرائی بہو بیٹیوں پر۔ مرغ سے انہیں شکم واسطے کا بیر ہے۔ ان کی لبالب پلیٹ کو دیکھ کر مرغ کی ایک ٹانگ والی کہاوت سراسر باطل نظر آتی ہے مختصر یہ کہ ہمارے "حضرت امام بونہ" کی طرح ہر بسیار خور کو یہ طریقہ طعام بہت خوشگوار گذرے ہے

یہ سسٹم "خود کھودو خود پیو" کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اپنی مدد آپ پر اس کی بنیاد ہے چنانچہ کچھ دعوتی تیز گام مجاہد تو واقعی ڈونگوں سے اچھی اچھی بلکہ خوب سے خوب تر بوٹیاں کفگیر سے کھود کھود کر نکال لاتے ہیں۔ جوئندہ یابندہ۔ جو غوطہ خور جتنی گہرائی میں جانیکی استطاعت رکھتا اتنا نایاب موتی (یہاں بوٹی کہ لیجئے) اس کے ہاتھ (منہ) پڑتا ہے

کھڑے اور نشستی کھانے میں کھڑے اور بیٹھے کا فرق ہے ہی لیکن بنیادی اور نمایاں فرق یہ ہے کہ اس میں بہ یک وقت چاروں ہاتھ پیر مصروف رہتے ہیں۔ بیٹھے کھانے میں تو داہنا ہاتھ اور ٹانگوں کے انتہائی سرور پر لگے پیڈ ("جو دھرنا" دینے کیلئے بھی لازم ہیں) ہی سے کام چل جاتا ہے لیکن اس طریقہ کار میں نہ ہاتھ بیکار رہ سکتے ہیں اور نہ پیر۔ ہر چار میں ایک بھی معطل ہوجائے تو رادھا ناچ ہی نہیں سکتی یہی سبب ہے کہ اس کھڑے کھیل فرخ آبادی میں بڑے سے بڑا نکھٹو بھی اپنے پیروں پر کھڑا نظر آتا ہے۔

بے سروسامانی کی کیفیت سے دوچار اس طرز خوردونوش کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں ایک تو یہی پرانے طرز کی طرح ساتھ بیٹھو ساتھ اٹھو کا لفڑا یہاں قطعی نہیں ہوتا۔ بس آؤ جیسے سوریا کی طرح فٹافٹ رن بناؤ، ہاتھ دکھاؤ چوکے چھکے مارو اور جاؤ یا حنیف محمد یا بائیکاٹ کی طرح جتنی دیر چاہو کریز پر رکو کوئی آپ کو آؤٹ کرنیوالا نہیں۔ ہاں اس میں چوکنا بہت رہنا پڑتا ہے کیونکہ معاملہ فری فار آل ہوتا ہے اسلئے دائیں بائیں آگے پیچھے کا خیال ہردم رکھنا پڑتا ذرا آنکھ چوکی دامن عصمت پیرہن داغ داغ۔ بے بات آپ کو اس میدان حشر میں کوئی سالن سے سان گیا اور آپ ہیں کہ ناچار اپنے سالن چشیدہ لباس کو کنواری کے پیٹ کی طرح بر سر محفل لئے پھررہے ہیں ایسے میں مجھے بھی ایک "پشم پینا" ہونیکی شدید تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ اکثر انجانے میں کوئی صاحب آپ کو داغدار کر بھاگتے ہیں اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کبھی بھیڑ بھاڑ میں کوئی غفلت شعار آپ کو زسرتا پا قورمے سے شرابور کر گیا ادھر آپ ہیں کہ مثل رانا سانگا سالن کے داغ سجائے سر بزم یار کا وے کاٹتے پھررہے ہیں۔ یہاں اچھی خاصی پینترے بازی کا ماہرانہ مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے مراحل سے بے داغ گذر آنا مردمیدان

بس کی ہی بات ہو سو ہو بھلا کہیں گھمسان کی جنگ میں گھاؤ نہ کھانا کیسے ممکن ہے ؟ یہاں بے داغی محرومی کی دلیل ہے یا یہ کہ بھائی بس ساحل سے ہی طوفان کا نظارہ کر کے لوٹ آئے ہیں۔

مذکورہ "روغن پہلو" کے علاوہ بوفیت کا "روشن پہلو" یہ ہے کہ میزبان بہت سے شائستہ جھمیلوں سے بچ جاتا ہے اور بڑی سی بڑی بد سلیقگی بھی نبھ جاتی ہے۔ نہ تواضع کا جھمیلا نہ نشست و برخاست کا چکر بس دس پانچ لمبی لمبی میزیں بچھائیں اس پر قابیں سجائیں اور بس۔ مہمانوں کو میزوں کی طرف ہنکادیا اب وہ جانیں اور انکا کام۔ نہ گلہ نہ شکوہ نہ مطالبہ نہ توقع دست خود دہان خود اب یہ کیسٹ پر منحصر ہے کھائیں۔ سونگھیں یا ٹھوریں، ٹونگیں۔ بھنبھوڑیں یا ہڑپیں کوئی آپ سے پوچھنے والا نہیں کہ آپ کے منہ میں دانت ہیں کہ نہیں اور ہیں تو کتنے یا آپ پیٹ کے ٹاپے میں کتنے مرغ۔ ایسے میں جس کا دل جتنا شکم آشنا ہوتا ہے اتنا ہی شکم سیر نظر آتا ہے۔

اس میں مساوات کا چلن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ محمود و ایاز ہم صف ہوجاتے ہیں۔ بندہ اور بندہ نواز دونوں اپنے کام سے کام رکھتے ہوئے اپنے کام سے کام رکھتے اور اپنے اپنے گھاٹ پانی پیتے دکھائی پڑتے ہیں۔ تقدیم و تاخیر یا بعد و قرب کا مسئلہ کوئی نہیں اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ من تو کا فرق یکسر مفقود

آج کل کیونکہ شو بازی کا زمانہ ہے اس لئے مختلف ورائٹیز ہونا بھی ضروری۔ اس پر ویج اور نان ویج کا التزام الگ نتیجہ کے طور پر اتنی اقسام ہو جاتی ہیں کہ کسی کیساتھ انصاف نہیں ہو پاتا شوق طعام کا تقاضہ یہ کہ کوئی بھی اچھوتی نہ رہ جائے ادھر بیچاری تنہا ایک پلیٹ بیکس اپنے اندر کس کس کو سمائے۔ اکثر لوگ "غذائی سیکولرزم" کا ثبوت دیتے ہوئے ویج اور نان ویج کھانوں کو اپنی پلیٹوں میں نیتاؤں کی تجوریوں کی طرح لبالب بھر لیتے ہیں۔ عجیب سماں ہوتا ہے قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا دال میں لپٹی ہوئی بوٹی دیکھکر ایسا لگتا ہے گویا شیخ و برہمن گلے مل رہے ہوں

سنے ہاتھوں، اپنی ذاتی پسند، ناپسند کا اظہار بھی کرتے چلیں۔ صاحبان! آپ سے سچ کہیں ہمیں یہ سسٹم ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ کھڑے ڈنر کے تصور سے ہی ہماری بھوک آدھی رہ جاتی ہے۔ جیب و داماں کی فکر ہمیں کھانے سے ذرا بھی محظوظ نہیں ہونے دیتی ہردم یہ تصور پریشان کئے رہتا ہے کہ کہیں کوئی ناہنجار ہمیں داغ نہ لگا جائے۔ یوں لگتا ہے مانو پل صراط پر چل رہے ہوں۔ انجام کار ایک آدھ کھانا لیکر پلیٹ کو غریب کی آبرو کی طرح تھامے کسی گوشے میں کھڑے یاران تیز گام کی سرعت کا نظارہ باحسرت و یاس کیا کرتے ہیں۔ حال دل کہیں بھی تو کس سے اس حال خودروی میں کسے یاد آئے کون؟ یا کون کس کا آشنا چنانچہ ایسی دعوت سے جب ہم خالی پیٹ لوٹتے ہیں تو اس احساس کیساتھ کہ بانجھ عورت کی طرح ہمارے پیٹ کبھی کچھ پڑنے والا نہیں۔

ویسے حامیان بوفے کیلئے ہمارا "خود غرضانہ" مشورہ ہے کہ نیپکینز کیساتھ لنگر لنگوٹے کا بھی بندوبست ہونا چاہئے تاکہ اسے کس کر کس کے کس کے کھایا جائے پھر تو ہم جیسے محروماں کی بھی بن آئے گی اور ہم بھی دلجمعی اور یکسوئی کیساتھ مستفید ہو پائیں گے ـــ

سید حسین احمد زاہدی
۱/۴۰، جان نگر روڈ، کلکتہ ۱۷

چچا غالبؔ پیاز بازار میں

دہلی میں غدر ۱۸۵۷ء سے دو سال قبل ۔ صبح کا وقت کوچہ قاسم جان کی حویلی سے مرزا غالب برآمد ہوتے ہیں ایک ہاتھ میں بازار لانے کی تھیلی ہے جبکہ دوسرا ہاتھ چوغہ کی جیب میں ہے جس میں پانچ پانچ روپے کے دو سکے پڑے ہیں ۔ دلی وہی ہے جو غدر سے پہلے تھی لیکن چیزوں کے دام بے تحاشہ بڑھے ہوئے ہیں ۔ غالب اس سے ناواقف ہیں ۔ ان کا تمام دن چوسر کھیلنے شاعری کرنے اور حسینوں کے خطوط کے جوابات لکھنے میں گزر جاتا ہے اور رات بادہ نوشی میں ۔ بیگم نے رات انھیں بڑا سخت سست کہا اور پیاز نہیں ہونے کی وجہ سے کھانا نہ پکانے کی دھمکی دی جس کی وجہ سے آج غالبؔ سبزیاں خریدنے نکلے ہیں ۔ سامنے ہی ہوا دار معہ کہاروں کے کھڑا ہے کہار غالبؔ کے ہوادار میں بیٹھنے کے منتظر ہیں لیکن وہ پیدل چلنے کو ہی ترجیح دیتے ہیں راستے میں جان پہچان کے لوگ مل رہے ہیں سب سے سلام دعا ہو رہی ہے وہ چہل قدمی کے انداز میں چلتے ہوئے آخر سبزی بازار پہنچ جاتے ہیں ۔ بازار میں خریداروں کا ہجوم ہے خاص کر پیاز پر لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں غالبؔ کھڑے ہو کر کچھ سوچنے لگتے ہیں اچانک سامنے ایک فقیر ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔

فقیر (غالبؔ کی غزل کے شعر کو گاتے ہوئے) : ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا   اور درویش کی صدا کیا ہے

غالب (جیب میں ہاتھ ڈال کر) : واہ میاں بڑے غالب نواز لگتے ہو ۔ لیکن یہ اچھا نہیں لگتا کہ غالبؔ جیسے قادر الکلام شاعر کی غزلیں بھیک مانگنے کے لئے گائی جائیں

فقیر : بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ   تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

غالبؔ (جیب سے ہاتھ باہر نکالتے ہیں جس میں پانچ کا ایک سکہ دبا ہے) : لیجئے بابا (فقیر ان سے سکہ لیکر ہزاروں دعائیں دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے)

غالبؔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) : واہ میاں غالب آدھے سرمائے تو تم نے یہیں لٹا دیئے اب سبزیاں کیسے خریدوگے خیر دیکھا جائیگا   رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ایک اجنبی (حیرت زدہ لہجے میں) : مرزا نوشہ ہیں، آج راستہ بھول کر آپ کیسے ادھر چلے آئے لال قلعہ

کے دیوان خاص کی صحبت سے نجات مل گئی کیا اس گندے بازار میں میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں کیا۔
غالب (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) : انقلاب زمانہ ہے صاحب وقت انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ! اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے۔

اجنبی : نہیں حضرت پوری دلی آپ کی ہے جہاں دل چاہے قدم رنجہ فرمایئے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ظل سبحانی بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں بازار کا معائنہ کرنے آئے ہیں۔ چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی ہیں۔ شکایت بادشاہ سلامت تک پہنچی ہوگی۔ آپ اس غرض سے آئے ہیں۔ بادشاہ سے تو آپ کی گاڑھی چھنتی ہے۔

غالبؔ : کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں، مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اجنبی : میں نہیں مانتا کہ وہ آپ کو غلام سمجھتے ہوں گے۔ ان کی نگاہ میں تو آپ کی بڑی قدر ہوگی۔ آخر آپ بادشاہ کے استاد ہیں۔

غالبؔ : یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل ان کو، نہ دے مجھ کو زباں اور

ایک دکاندار (غالب کو مخاطب کرکے) : آیئے حضرت، ادھر تشریف لایئے کیا پیش کروں آلو، پیاز، ٹماٹر ـــــ

غالبؔ (گنگناتے ہوئے) : جو ہے تجھے سر سودائے انتظار، تو آ
کہ ہیں دکان متاع نظر در و دیوار

میاں دکاندار، خدا تمہارا بھلا کرے، پیاز کی خرید مطلوب ہے ہاں بھئی، اس ذرا سی پیاز کی کیا قیمت آنکتے ہو۔

دکاندار : حضور، سب لیں گے، اچھی خاصی رقم ہو جائے گی۔ پچاس روپئے کیلو پڑیں گے نہ ایک دھیلا زیادہ نہ ایک دھیلا کم۔

غالب (اپنی سماعت پر یقین نہ کرتے ہوئے) : ہاں محترم کیا فرمایا آپ نے، مکرر ارشاد فرمانے کی زحمت کریں۔

دکاندار (غالب کو وقت برباد کرنے والا خریدار سمجھ کر) : اماں، کیوں صبح صبح دکانداری خراب کرنے چلے آتے ہو، مجھے تو تم یکدم بہرے جان پڑتے ہو۔

غالب : بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

دکاندار (جھنجھلاکر) : کانٹے سے کانٹا ملاکر پچاس روپئے ہوں گے ایک کیلو کے۔

غالب (انتہائی حیرانگی سے) : پچا ـــ س ـــ رو ـــ پئے ـــ (اچانک غالب کو چکر آجاتا ہے وہ تیورا کر زمین پر گرا ہی چاہتے ہیں کہ قریب کھڑا ایک خریدار جلدی سے انھیں تھام کر زمین پر بٹھادیتا ہے)

خریدار (ہمدردانہ انداز میں) : لگتا ہے اچانک جناب کی طبیعت ناساز ہوگئی ورنہ کچھ دیر پہلے تو ٹھیک ٹھاک تھے۔

غالب (زیر لب) : بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

خریدار: کیا میں آپ کو آپ کے دولت کدے تک چھوڑ دوں؟ آپ غالباً دلی کے ہی جان پڑتے ہو۔
غالب (خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے): تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز
دکاندار (درشت لہجے میں): اماں سامنے سے ہٹو، چلتے پھرتے نظر آؤ۔ میری دکانداری کیوں خراب کرنے میں لگے ہو۔

غالب (دکاندار کی جلی کٹی سن کر): کوئی میرے دل سے پوچھے، تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

(غالب خاموشی سے اس جگہ سے اٹھکر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دوسرے دکاندار کے پاس پہنچتے ہیں اور پیاز کی قیمت دریافت کرتے ہیں۔ دوکاندار وہی قیمت بتاتا ہے۔ غالب خاموش ہوکر سوچنے لگتے ہیں کہ ان کی جیب میں تو فقط پانچ روپۓ ہیں جس میں صرف ایک سو گرام پیاز ہی آئے گی۔ دکاندار سے ایک سو گرام پیاز تولنے کے لئے کہتا ہوں تو وہ دل میں کیا سوچے گا غالب دل میں بڑی شرمندگی محسوس کرتے ہیں)
دکاندار (تیز لہجے میں): منھ میں گھنگنیاں ڈال رکھیں ہیں کیا؟ کچھ تو منہ سے پھوٹو کیا گونگے ہو یا بات کرنی نہیں آتی۔

غالب: ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

دکاندار (غالب کو نظر انداز کر دیتا ہے اور خریداروں کو مختلف اشاروں سے متوجہ کرتے ہوئے): پنجاب کے پیاز ہیں، فرہاد نے اگائے ہیں۔ شیریں نے ہاتھ لگائے ہیں۔ جنت کا میوہ ہے جنت کا

غالب: بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا۔

(غالب وہاں سے آگے بڑھ کر دوسری طرف چلے جاتے ہیں۔ ہر طرف پیاز کی گرم بازاری ہے محسوس ہو رہا ہے کہ دکانداروں نے ہر طرف اندھیر مچا رکھی ہے۔ اچھے پیاز کو بھول کر اب غالب سڑے پیاز کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ اس تلاش میں وہ کبھی بازار کے ادھر اور کبھی ادھر جاتے ہیں کبھی اس دکان کے کبھی اس دکان کے پاس کچھ دیر کے لئے رکتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں)

غالب (گنگناتے ہوئے): وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

دوکاندار غالب کی حرکت دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ انھیں کچھ لینا دینا نہیں ہے بس دل لگی کر رہے ہیں۔ اب ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ آخر ایک دکان کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن دکاندار ان کا کوئی نوٹس نہیں لیتا اور نہ وہ شرم سے دکاندار سے کچھ کہنے کی اپنے اندر ہمت پاتے ہیں)

غالب (مایوسانہ لہجے میں): ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

ایک دکاندار (غالب سے راز دارانہ انداز میں مخاطب ہوکر) : محترم، میرے پاس بادشاہ پسند پیاز ہیں۔ دیکھتے ہی دل نہ خوش ہوجائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ کہئے تو ساری وزن کردوں۔ تھوڑے سستے ہی میں دیدوں گا۔

غالب (دھڑکتے دل کے ساتھ) : کتنا۔۔۔ سستا؟

دکاندار : بس یہ سمجھ لیجئے کہ بے قیمت ہی مل رہی ہے

غالب : کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقت سخن　　جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر؟

دکاندار (کان میں سرگوشی کرتے ہوئے) : حضت! اسی روپئے دے دیجئے گا ایک کیلو کے۔ آگرہ میں تو سو روپے میں بھی ایسا پیاز ڈھونڈھنے پر بھی نہیں ملے گا۔

غالب (روہانسی آواز میں) : حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

(سامنے سے غالبؔ کے ایک شناسا آتے ہیں۔ غالب کو دیکھ کر رک جاتے ہیں۔ غالب ان سے اپنا دکھڑا روتے ہیں۔ دوست کو بازار کی حالت، اجناس کی گرانی اور حکومت کی بے عملی کا خوب پتہ تھا لہذا وہ دکانداروں کی حمایت کرتے ہیں)

غالبؔ : یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح　　کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

دوست (سمجھاتے ہوئے) بھئی، یہ سمجھو ابھی بھی پیاز دلی میں سستی رہی ہے دوسرے شہروں میں تو حالت اور خراب ہے میرا مشورہ مانو تو تمام پیسے کے پیاز خرید لو ورنہ ایک دن یہ بھی نہیں ملیں گے۔

غالب (مایوسی سے) : کوئی امید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

دوست : ہاں بھئی تو کیا کہتے ہو۔ میری بات تو سمجھ میں آگئی۔

غالب : بات پر واں زبان کٹتی ہے　　وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

دوست : اگر تمہیں پیاز خریدنے میں شرم محسوس ہورہی ہے تو لاؤ پیاز کے دام نکالو میں خرید لاتا ہوں۔

غالب : درم و دام اپنے پاس کہاں　　چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

دوست (حیرت سے) : کیا کہا درم و دام نہیں۔ ناقابل یقین بات ہے۔ بادشاہ وقت کے استاد ہو۔ نواب لوہارو کے دوست ہو بھلا تمہیں پیسے کی کیا کمی۔ خدا کا شکر ادا کرو جس نے ہر چیز سے نواز رکھا ہے۔

غالب : زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ　　ہم بھی کیا یاد کریں گے خدا رکھتے تھے!

دوست : اچھا بھائی تو اس وقت تک انتظار کرو جب پیاز کی قیمت گر جائے اور وہ سستی ہو جائے۔

غالب : (آہ سرد بھر کر) آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دوست (ناصح مشفق کے انداز میں) : محترم، زندگی جینے کے لئے کھانا پینا ضروری ہے۔ قیمتیں جتنی زیادہ ہوں

کھانا بند نہیں کیا جاسکتا۔

غالب : ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

دوست : جب کچھ خریدنا ہی نہیں ہے تو آؤ چلیں یہاں سے

غالب (کمزور لہجے میں) : ہاں بھئی چلو، یہ بڑی پریشان کن جگہ ہے۔

جو تیری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

دوست (قدم بہ قدم چلتے ہوئے) آپ تو کافی دنوں تک دلی سے باہر رہے اب دلی چھوڑ کر کہیں جانے کا ارادہ تو نہیں ہوگا

غالب (تھکے تھکے انداز میں) ہے اب اس معمورے میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

(آہستہ آہستہ دونوں دور چلے جاتے ہیں)

مجید عارف نظام آبادی
۱۹-۱۷-۵۹
ہاشمی کالونی نظام آباد
۵۰۳۰۰۱

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!

نئے سال کی مبارکباد دینے سے قبل ہم آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ گزرے ہوئے سال ۱۹۹۸ء کو الوداع کہنے کے لئے ایک سکنڈ کا انتظار کرنا پڑا۔ چونکہ نئے سال ۱۹۹۹ء کی ایک سکینڈ تاخیر سے آمد ہوئی ہے۔ یہ بات ہم ہندوستانی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ نئے سال نے ایک سکنڈ کی تاخیر کی ہے تو یہ غیر ملکی ماہرین اتنا کیوں واویلا مچارہے ہیں ؟؟ کوا چلا ہنس کی چال کے مطابق ہمارے تمام قومی اخبارات نے اس "تاخیر" کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ جبکہ کسی بھی معاملہ میں "تاخیر" کرنا ہمارا قومی فرض ہے ؟؟

دراصل یہ فرق بین الاقوامی وقت کے معیارات اور زمین کی گردش پر مبنی روایتی فلکیاتی وقت میں فرق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ امریکی مینول آبزرویٹری کے ماہر اسٹیون ڈک کے مطابق کرہ ارض کی گردش میں انتہائی معمولی سی کمی ہورہی ہے جس کی وجہ سے نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لئے ایک سکنڈ کا انتظار کرنا پڑا۔ ویسے بھی انتظار کرنے کے معاملہ میں ہم ہندوستانیوں کا کوئی ثانی نہیں۔ نیا سال بھلے ہی ایک سکینڈ کی تاخیر سے شروع ہو یا ایک سال کی تاخیر سے اس سے ہمیں کیا لینا دینا ۔۔؟ ہمیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ نیا سال "تاخیر" کے ذریعہ نہیں بلکہ "تقلید" کے ذریعہ غیر محسوس طریقے سے ہماری ہمت افزائی کررہا ہے، چونکہ ہمارے ملک میں "تاخیر" ہی وہ واحد چیز ہے جس کا چلن عام ہے۔ گھر سے لے کر دفتر تک ہر کوئی اس بیماری سے متاثر ہے ایک عورت بھی اپنے شوہر سے یہی کہتی ہے کہ "میں ایک گھنٹہ سے کہہ رہی ہوں کہ ابھی دس منٹ میں تیار ہو جاؤنگی ۔۔ لیکن آپ میری بات سمجھتے ہی نہیں ہیں ۔۔؟"

اسی طرح ہم نے دفتر کو بلاناغہ تاخیر سے پہنچنے والے ایک سرکاری ملازم سے پوچھا کہ ۔۔ بھئی تم کیوں لیٹ جاتے ہو ۔۔ تو وہ فرمانے لگے ۔۔ دفتر میں خراٹے لینا تھوڑا مشکل ہے اس لیئے دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر "لیٹ" جاتا ہوں ۔۔"

مرزا تخیل بیگ آنسو کا کہنا ہے کہ ہمارے یہاں وقت پر کسی نے کام کیا ہے تو وہ صرف اور صرف گھڑی کی سوئیاں ہیں۔ ورنہ تاخیر کا سامنا کئے بغیر ہندوستان میں جینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

وزیر اعظم سے لے کر، دور کنی انجمنوں کے خود ساختہ عہدیدار تک سب تاخیر سے جلسہ گاہ پہنچتے ہیں کہ

اپنی اہمیت کا احساس دلائیں اور جو جلسہ جتنی تاخیر سے شروع ہوگا وہ اتنا ہی کامیاب تصور کیا جاتا ہے۔ تاخیر کے معاملہ میں اب تو قاضی اور نوشہ میں بھی مقابلہ آرائی ہونے لگی ہے۔

رہی سرکاری محکموں کی بات تو پولیس تاخیر سے پہنچنے میں اپنی مثال آپ ہے وہ اس وقت تک جائے واردات پر نہیں پہنچتی جب تک کہ قاتل چشم دید گواہوں کا بھی صفایا نہ کردے مرکزی حکومت کے زیر نگرانی محکمے تاخیر کے متعلق کچھ زیادہ ہی فراخدلی دکھاتے ہیں بعض اوقات ایک پوسٹ کارڈ بھی صرف 70 کیلو میٹر کا فاصلہ چھ تا سات سال میں طے کرتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی شکل جوں کی توں رہتی ہے۔۔ کم از کم لفافہ یا ان لینڈ لیٹر کی شکل تو اختیار کرنی چاہیئے ؟ امید کہ پوسٹل ڈپارٹمنٹ کے ارباب مجاز اس جانب توجہ دینگے۔۔؟

ٹرین کی تاخیر کے متعلق۔۔ ہر کوئی گواہی دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ ہندوستانی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ محکمہ ریلوے نے اب کافی ترقی کرلی ہے۔ پہلے وہ گھنٹوں لیٹ ہوتی تھی اب وہ کئی کئی دن لیٹ ہونے لگی ہے۔ بعض اوقات اس میں سفر کرنے والے انگریزی کا وہ LATE ہوجاتے ہیں جو نام سے پہلے لکھا جاتا ہے۔

چلتے چلتے یہ دلچسپ حقیقت بھی بتاتے چلیں کہ ایک کمپیوٹر انجنیئر کو وقت پر کام کرنے کی عادت تھی۔ ہماری حکومت نے اسے ایک اہم پروجکٹ کی ذمہ داری سونپی جسے اس نے بڑی جستجو محنت، ولگن کے ساتھ بہت کم وقت میں کر دکھایا۔۔ اس کے اس کارنامہ پر اس الزام کے ساتھ فوری گرفتار کرلیا گیا کہ یہ ہندوستانی نہیں امریکی ہے۔۔"

"کوئی بتلائے کے ہم بتلائیں کیا۔۔؟"

اگر نیا سال ایک سکینڈ کی تاخیر سے شروع ہوا ہے تو ہوسکتا ہے ہندوستان کا اس پر کسی حد تک اثر ہوا ہو۔۔؟ یا ہمارے سیاسی لیڈروں نے اس کی مٹھی گرم کی ہوگی کہ کم از کم ایک سال کی تاخیر سے آئے۔۔ تاکہ اس بہانے الیکشن کو ٹال کر اپنی کرسی محفوظ کرسکیں۔ بدلہ میں نئے سال نے شاید ان کی بات نہیں مانی ہوگی یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح مٹھی گرم کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اس طرح نہ کیا گیا ہو۔۔ جس کی وجہ سے نئے سال نے صرف ایک منٹ کی تاخیر۔۔ کرکے۔۔ جتنا دام اتنا کام۔۔ پر عمل کیا ہوگا؟؟ اب آپ ہی بتلایئے نئے سال کو کیا معلوم کہ لیڈر کے وعدے بھی کبھی ایفا ہوئے ہیں۔۔؟؟ کچھ بھی ہو نئے سال کی آمد سے خواتین پر تو کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔۔ گزشتہ سال وہ جتنے برس کی تھیں اس سال بھی وہ اتنے ہی برس کی رہیں گی۔۔

بہرحال ! تاخیر سے ہی سہی نئے سال کی آمد تو ہوئی ہے۔۔ ورنہ آج کے مصروف ترین دور میں انسان پانچویں دن آنے کا وعدہ کرنے لگا ہے جبکہ یہ دنیا چار دن کی ہے۔ آخر میں ہم اس صدی کے آخری سال کی آمد پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ دیر سے ہی سہی آپ بھی ہماری جانب سے بھی مبارکباد قبول فرمائیں۔ دیر اس لیئے ہوئی کہ "تاخیر" کی اس ہندوستانی روایت کو ہم بھی توڑنا نہیں چاہتے۔۔

جہاں قدر چغتائی
۱۲۔ لیلیٰ برج روڈ
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

جائیں تو جائیں کہاں

ہم جب بھی اس ملک میں پیدا ہوئے ہوں ہم کو یہ پتہ تو بہت جلد چل گیا تھا کہ ہم ایک بہت بڑے ملک میں پیدا ہوئے، جہاں سب کچھ تھا آزادی کے سوا۔ ہم کیا جانتے غلامی کیا ہے اور آزادی کس کو کہتے ہیں ہم کو تو صرف غلامی سے واسطہ پڑا تھا۔ اس وقت کے آقا ہمارے والدین تھے جنہوں نے دس سال تک ہمارے سر پر راج کیا اور کسی دن بھی کالے بال سر پر قائم نہیں رہنے دیئے۔ ہم آج جب سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ بچپن اور لڑکپن کا وہ استرا ہی قدرت نے ہمارے سر پر چلایا ہے۔ ہم مجبور تھے گنجے پن پر صبر کرنے کے لئے۔ صبر مجبوری کا دوسرا نام ہے شاید۔ سر منڈوا کر بھی خوش رہنا سکھا دیتے تھے۔ ہمارے آقاؤں نے دوسرا ظلم یہ کیا کہ گنجے سر پر ٹوپی لگانا ضروری کر دیا اور وہ بھی اس حد تک کہ بغیر سر پر ٹوپی اگائے گھر سے باہر تک نہیں جاسکتے تھے۔ کیا یہ بات ستم بالائے ستم نہیں کہی جائیگی۔ ہم سوچتے ہیں تو آج یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ لوگ آخر ایسا ہمارے ساتھ کیوں کرتے تھے سیدھی سی بات تھی کہ ان کو سر پر کالے بال بھلے نہ لگتے ہونگے، پھر ٹوپی کیوں؟ ان کو منڈا ہوا سر بھی ہمارا ناگوار لگتا ہوگا۔ اس خیال سے ان کی گنجی اولاد کو کوئی سر پر دھپ نہ مارے ٹوپی سر پر رکھنا لازم کر دیا گیا۔ واہ صاحب واہ ہم ہی گنجے نہ تھے سارا ملک ہی گنج با سودا تھا۔ ہم سرداروں کی بات نہیں کرتے جو پگڑی لگائے پیدا ہوئے سے لگتے ہیں۔ ہر سردار کا سر والدین کے ایک ہی ستم کا نشانہ بنا ہے۔ وہ یہ کہ پگڑی سر پر لگاؤ مگر وہ بال کاٹ کر ہمارے سردار بھائی کو گنجا تو نہیں کرتے۔ یہ ایک بات ہم نے صرف اسلئے کہی کہ ہماری پیدائشی غلامی واضح ہوجائے۔ ہم کو پورا یقین ہے کہ اگر ہندوستانی بچے والدین کی غلامی کا شکار نہ ہوئے ہوتے تو ہندوستان میں مہاتما گاندھی ہرگز غلامی میں پیدا نہ ہوتے۔ ہمارے بچپن میں ہمارے گھر میں ایک رحمت خالہ تھیں۔ بڑے ہوئے تو پتہ چلا کہ یہ ہماری اصلی خالہ نہیں بلکہ وہ ایک ایسی بچی تھیں جن کو ہمارے والدین نے دو سیر گیہوں کے بدلے میں خریدا تھا امریکہ کو مجرم قرار دیا جاتا ہے کہ افریقہ سے غلام خریدے تھے مگر ہم لوگ سودیشی پر شروع ہی سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ آج بھی ہماری نئی سرکار "دیشی" سرکار دیشیت پر کاربند ہے۔

آج تو آبادی بہت زیادہ ہے یعنی موتھ زیادہ ہیں اناج کے دام کم، مگر اس وقت اناج زیادہ تھا کھانے والے کم تھے جب ہی تو رحمت خالہ ہماری خالہ بنی تھیں ہم یہ دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زیادہ آبادی کا غلہ یا اناج کی کمی سے کوئی واسطہ نہیں ہے تو غلط نہ ہوگا۔ خیر ہم چھوڑتے ہیں ذکر بال استرا اور ٹوپی ۔آبادی اور اناج کے رشتے کو، اور آتے ہیں ایک ایسی بات کی جانب جس کا دور کا واسطہ بھی روٹی، کپڑا، مکان یا بھوک پیاس والے سیاسی مسئلہ سے نہ جوڑا جاسکے ۔ہم چونکہ ایک گاؤں جیسے علاقہ میں پیدا ہوئے تھے تو ہماری ہر بات کا تعلق ایسے مسئلے سے ہوا ہے جس کی طرف آج تک کسی سیاسی لیڈر کی نظر تک نہیں گئی۔ ورنہ کسی بھی سیاسی پارٹی حکومت کی باگ ڈور حاصل کرنے کے لیئے نہ مسجد ڈھانا پڑتی نہ مندر بنانا پڑتا۔ ہر شخص کو خواہ کسی مذہب و دین سے تعلق رکھتا ہو کھانا کھانے کے بعد روزانہ اس مشکل سے گذرنا ہوتا ہے ۔ اگر کھانے کے بعد وہ مشکل کسی طرح حل نہ ہوسکے تو آدمی جان سے بھی جاسکتا ہے ۔ چنانچہ ہم کو کیسی کیسی دشواریوں سے گاؤں میں گذرنا پڑا ہے ، ہم جانتے ہیں ۔ خاص طور پر برسات میں جبکہ ہمارے گاؤں کے گھر میں اس بات کے حل کا کوئی انتظام ہی نہیں تھا۔ بس یوں سمجھ لیجیے ہم اپنے بچپن میں گاندھی جی بن چکے تھے ، اپنا کام خود کرتے تھے ۔ اس کے بعد سے آج تک جبکہ ہم ایک نئی صدی میں داخل ہونے والے ہیں ، مزائل بنا چکے ہیں ، کمپیوٹر کو اپنا غلام بنا چکے ہیں ہمارے بنائے سٹیلائٹ ہمارے سروں پر چکر لگا رہے ہیں ، وہ مسئلہ وہیں کا وہیں ہے ۔ ہم کو اس سے واسطہ نہیں کہ گاؤ آمد و خر رفت ۔ ہم تو بس ایک انسانی اہم سوال کا حل ڈھونڈھ رہے ہیں ۔ پھر جب راجدھانی میں علم حاصل کرنے آئے تو بھی اسی مشکل سے دوچار ہوئے پھر جب ہماری علم کی دولت میں اتنا اضافہ ہوا کہ ہم کو علم کی خاطر سفر کرنا پڑا تو کچھ مناظر چلتی ٹرین سے ایسے نظر سے گذرے کہ دل ہل ہل گیا ۔آگرہ ہمارے امتحان کا سینٹر تھا ، گاڑی بہت سویرے راجہ کی منڈی پہنچتی تھی گوالیار سے آگرہ جاتے ہوئے ہم آگرہ کینٹ سے ہی ٹرین کے دروازے پر جاکر کھڑے ہوجاتے تھے ۔ تاکہ راجہ کی منڈی پر جلد اتر کر آگرہ کالج کے امتحان سینٹر پہنچ جائیں ، ہم نے دیکھا کہ سینکڑوں مرد اور عورتیں بوڑھے اور بچے آگرہ کینٹ سے راجہ کی منڈی ریلوے اسٹیشن تک کے بڑے میدان میں مشکل سوال کو حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں ۔ یہ کوئی ایسا منظر نہیں جو صرف میں نے دیکھا ہو ، ریل گاڑی میں سفر کرنے والے مسافر بڑے سے بڑے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر دیکھ سکتے ہیں جن کی ریل گاڑی بہت سویرے پہنچتی ہو ۔ ہماری مالی حالت ہم کو جہاں جہاں لے گئی ہم نے منظر بہت زیادہ مختلف نہیں پایا۔ اپنے اس تجربے کی بنیاد پر ہم کالے کوئے کے فارمولے کے مطابق جو کہتا ہے ایک کوا کالا تو دوسرا بھی کالا تو سمجھا جانے لگا سارے کوے کالے ۔ بس تو ہر ریلوے اسٹیشن پر ایک سا منظر ہونا چاہیئے ۔ بچپن ، لڑکپن اور جوانی میں یہ ہندوستانی مسئلہ ہمارے ذہن میں برابر برگد کے پیڑ کی طرح جڑیں پکڑتا رہا ۔ ہم نے بڑے سے بڑے لیڈر کی بات پر زندگی میں ایک پل بھی دھیان نہیں دیا۔ جو لیڈر بھی آیا اس نے منتر پڑھے اور غریبی ختم کرنے کا کم سے کم مدت میں دعویٰ کیا مگر ہر وہ بیچارہ اپنی مقرر کردہ مدت سے پہلے ہی غریبی ختم کرنے کا ارمان دل میں لیئے راج نیتی کی دنیا چھوڑ گیا ۔ یہی حال ہے بیروزگاری کے دور کرنے اور سر پر چھت مہیا کرنے کا ۔ پچاس سال بعد بھی یہ مسئلہ جہاں کا تہاں ہے ۔ ہم جانتے ہیں یہ کام مشکل ہیں ان کا حل بہت زیادہ مشکل ہے لہذا اپنی توجہ ، ساری کی ساری ایک فطری ضرورت اور اس کے حل پر مبذول کرلی اور اس

سلسلے میں ریلسرچ کے کام میں لگ گئے۔ روٹی نہیں دیتے نہ دو مگر اسے ہمارے دیوتاؤں سے بڑے قد کے نیتاؤ اپنے بنگلے بھوکے عوام کے لیئے صرف اتنی سی جگہ تو فراہم کردو جہاں جاکر وہ فقیر قسم کے لوگ مانگے کی روٹی کھانے کے بعد اسے کسی دیوار کے پیچھے پیٹ سے نکال تو سکیں۔ جو اتنا سا کام بھی نہ کرسکے اس کو چاہیئے کہ وہ راج نیتک یونیورسٹی سے چرائی ہوئی ڈگری بھی واپس کردے۔ اب جب ہم کو ہمارے دوستوں نے اس مسئلہ کا دیوانہ پایا تو وہ ہماری مدد کے لیئے تیار ہوگئے۔ لیڈر ایسے ہی تو بنتے ہیں شاید۔ ہمارے لئے روپیہ جمع ہونا شروع ہوگیا۔ ایک ایک اینٹ جمع کرکے اگر مندر بن سکتا ہے تو ہم بھی مالدار ہونے لگے آپ کو چاہے یقین نہ آئے مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ اس مقصد سے اسکاٹ لینڈ، انگلینڈ اور فرانس تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ وہاں کا ذکر ہم آگے کرینگے ہم نے کیا دیکھا کیا پایا لیکن ہمارے کام کا تقاضہ تھا کہ سب سے پہلے اپنے ملک کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کریں۔ دوستوں کی کمیٹی کے فنانس سکریٹری نے ہم کو ایک بڑی رقم کا چیک دیا۔ اور ہم کو پابند کیا کہ جزیرہ نما ہند کے ساحلی علاقوں کا نہایت دیانتداری اور غیر جماعتی نقطہء نظر سے جائزہ لیں اور کمیٹی کے صدر کو رپورٹ پیش کریں۔ ہمارا پہلا پڑاؤ ممبئی کے ساحل پر پڑا۔ ماہم کے ساحل پر ہم منہ اندھیرے پہونچے۔ بڑا ساحل ہے، ایک طرف ساحل پر عظیم الشان سیون سٹار اسپتال بادلوں سے بات کرتا دکھائی دیا۔ لیکن جب ساحل پر موجوں کو اپنا سر پیٹتے دیکھا تو دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ آگرہ کینٹ سے راجہ کی منڈی والا منظر اتنا چھوٹا لگا جتنا چھوٹا، بڑا ہمالہ جغرافیہ کے نقشے میں لگتا ہے۔ مہاراشٹر کے ساحلوں میں ایک بات اچھی لگی اور وہ یہ کہ کسی ساحل پر جاکر کھڑے ہوجاؤ لگتا ہے وہی ساحل ہے جہاں پہلے کھڑے تھے۔ فلم کمپنیوں کی وجہہ سے ہم کو ممبئی کا موسم بہت اچھا لگا۔ صبح کا منظر ساحل پر دیکھو شام کو جوان ہیروئنوں کے درشن کرو۔ صبح کی تکلیف شام کو دور۔ کافی دن مہاراشٹر میں رہے وہیں ٹیبلوں پر بیٹھ کر ہندوستان بھر کے ساحلوں کی رپورٹ تیار کرنے میں اتنا ہی وقت لگا دیا جتنا تقریباً اس کام کو پورا کرنے میں لگ سکتا تھا۔ ایمان داری کے ساتھ کالے کوے والا فارمولہ استعمال کرکے رپورٹ مرتب کردی جس میں کسی جماعت کی طرفداری کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا۔ ہم نے یہ دیکھ کر رپورٹ مکمل کی کہ جب جہاں فلمستان ہو وہاں کا ساحل ایسا نکلے تو پھر ہندوستان کا کوئی بھی ساحلی علاقہ اس ممبئی کے علاقے سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ ہماری دیانتدار اور غیر جماعتی رپورٹ کمیٹی میں بہت پسند کی گئی اور ہم دیانتداری کے انعام کے حق دار قرار دیئے گئے۔ اس طرح ہم اپنے احباب کے لیئے ایک قابل فخر لیڈر اور دوست بن گئے۔ اس عرصہ میں ہمارے ہمدردوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ احباب کے مینڈیٹ کے مطابق ہم کو یوروپ کے سفر پر پہونچانے کے لیئے آمادہ کیا جانے لگا۔ جس نے دہلی اور کلکتہ نہ دیکھا ہو وہ انگلینڈ کی سیر کرے۔ یہ خیال کسی کو کیسا لگ سکتا ہے صرف وہی شخص اندازہ لگا سکتا ہے جس کو ایسا چانس ملے۔ خوشی کا یہ عالم کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ آپ نے دیکھا ہمارا مشن کتنا چھوٹا مگر بہت اہم، جس نے ہم کو یوروپ کی سیر کے لائق کردیا۔ کسی نے سچ کہا ہے لیڈر بن کے دیکھو۔

ہم نے اپنی لمبی عمر میں سمندر نہیں دیکھا تھا۔ بھوپال کے مشہور تال سے کوئی سوگنا بڑا ہوگا، ہمارے خیال سے۔ اونچی سے اونچی عمارتیں، بس یوں جانا سینکڑوں قطب منار کھڑے ہیں ممبئی میں۔ جب کبھی دلی جانا ہو تو دیکھیں گے ہم نے ممبئی کے بارے میں غلط بات تو نہیں کہہ دی ٹیکسی والا ہم کو ہندوستان سے باہر، فارن

Foreign کا مسافر جان کر جگہ جگہ لیئے پھرا۔ پوش سے پوش علاقہ میں اور وہاں کی سڑکوں پر جھگی میں رہنے والی آبادی کی سویرے پیدا ہونے والی پہلی انسانی ضرورت ادھر ادھر آزادی سے بکھری ہوئی۔ ہم اپنے ان دوستوں سے کہنا چاہتے ہیں جو پہلی بار ممبئی جائیں تو ایک بات کا ضرور خیال رکھیں اور وہ یہ کہ وہاں کے ساحلوں پر بہت سویرے سویرے ہوا کھانے ہرگز نہ جائیں ورنہ ممبئی بری لگنے لگے گی جو ہم پسند نہیں کرینگے۔

ہم کو کافی وقت لگ گیا اپنی رپورٹ تیار کرنے میں۔ ہم ہر جگہ گئے خود ہی اسپاٹ کا معائنہ کیا۔ درمیان میں مختلف دشواریاں بھی سامنے آئیں مگر ایک ہونے والے لیڈر کی طرح ہر مشکل کا سامنا بھی کرتے رہے۔ ہمارے دل میں ہمارے ہم وطن بھائیوں کی فطری ضرورت کانٹا بن کر چبھنے لگی۔ ہم نے دیکھا کہ ہماری بہت بڑی سیاسی جماعت نے الیکشن میں ناکامی کے بعد اپنے کاموں کا جائزہ لیا اور اس کی وجہ معلوم کرنے کے لیئے غور و خوض کیا۔ چنانچہ ہم کو بھی سوچنا پڑا کہ آخر آزادی کے پچاس سال بعد بھی ہمارے ملک میں کوئی نیتا ایسا نہیں پیدا ہوا جو اس انسانی فطری ضرورت کی طرف طائرانہ نظر بھی ڈالتا۔ جو لیڈر بھی آیا روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے لگا کر ووٹ بٹورتا رہا مگر ملک میں بھوکے، ننگے اور فٹ پاتھی بڑھتے ہی رہے۔

اے میری قوم کو اکیسویں صدی میں لیجانے والے نیتاؤ! کیا تم اس قوم کو بھی کاغذ کی اکیسویں صدی میں لے جاؤگے۔ اس غریب قوم کو تم لوگ پچاس سال میں اس کی حاجت روائی کے لیئے دو قدم رکھنے کی جگہ نہ دے سکے اکیسویں صدی میں کس طرح لے جاؤگے؟ لیکن ہم کو اس بات کا پورا یقین ہے تم سب لیڈران قوم بائیسویں صدی پار کر جاؤ گے۔

لوگ یوروپ جاتے ہیں کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیئے مگر مجھ کو افسوسناک مقصد کی خاطر سرد ملکوں کا سفر کرنا پڑا۔ مجھے میرے احباب نے یہ معلومات فراہم کرنے کے لیئے پہنچایا کہ میں یوروپ جاکر یہ دیکھوں کہ وہاں پیشاب گھروں کی کیا "پوزیشن" ہے۔ وہاں کے لوگ تو ہماری طرح بازاروں میں گھبرائے گھبرائے اور پریشان پریشان کسی مناسب جگہ کی تلاش میں مارے مارے تو نہیں پھرتے، خواتین پر کیا گذرتی ہوگی؟ ہمارے یوروپ کے سفرنامے کا حال پڑھ کر اگر ہماری قوم کے لیڈران کی آنکھیں کھل جائیں تو ہم سمجھیں گے کہ ہمارے سفر خرچ کے دام وصول ہوگئے۔ ورنہ میں میدان سیاست میں کودنے پر مجبور ہو جاؤنگا اور "پیشاب گھر" کا نعرہ قوم کو دے کر الیکشن جیت کر دکھاونگا (نوٹ ہم انگریزوں سے اس بات سے خوش نہیں کہ ریل گاڑی بنائی خوشی کی بات یہ ہے کہ ریل کے ڈبے میں سنڈاس بنایا)

ہم نے محسوس کیا کہ اگر کسی کے دل میں قوم کا درد ہو تو، قوم اس کو اپنا لیڈر بنا کر اپنے سر پر بٹھاتی ہے۔ ہم بھی قوم کی خاطر نکلے تو ہماری قیمت بھی بڑھنے لگی۔ ہمارے یوروپ کے ٹور کا پروگرام بنا کر ہمارے احباب نے دیا۔ اس میں ہمارا فرانس جانا درج تھا مگر ہم نے ان سے کہا کہ ہم پہلے انگلینڈ جائینگے کیونکہ انگریز ہمارے پرانے آقا بھی ہیں اور ان سے تھوڑی بہت واقفیت بھی ہے۔ ہم کو انگریز صرف ایک وجہ سے پسند ہیں، انھوں نے ہندوستان میں ریل گاڑی چلائی اور ملک میں پٹریوں کا جال ڈالا۔ لوگ آج بھی ان کو یاد کرتے ہیں مگر ہم ان کا سب سے بڑا کارنامہ ریل کے ڈبوں میں پانی اور سنڈاس بنانے کو سمجھتے ہیں۔ غیر ملکی لوگوں کو ہماری فطری ضرورت کا جو احساس تھا کیا آج تک کسی کو ہوا؟ بڑے بڑے لیڈر ملک میں ہوگئے۔ بہت جلد وہ دن بھی آگیا

جب ہم لندن کے ہوائی اڈے پر اترے ، جو لیڈر بننے والا ہوتا ہے اس کی قسمت بھی اچھی ہونے لگتی ہے۔ ہوائی اڈے پر ہمارے ایک لڑکپن کے دوست مل گئے جو کسی دوسری جگہ سے وہاں اترے تھے۔ بس کیا تھا گنجے کو ناخن مل گئے۔ انھوں نے پوچھا کیا ہند سرکار کی طرف سے کسی کام پر لندن اترے ہو۔ ہمارا جواب سن کر وہ حیرت میں پڑ گئے ، ہماری بات کو مذاق جانا۔ مگر ہمارا کام تو دراصل وہاں کے پیشاب گھروں کی سیر کر کے رپورٹ تیار کر کے اپنے ملک کو واپس لیجانا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دوست ہی مصیبت کے وقت کام آتا ہے۔ ہمارے یہ دوست کوئی تیس سال پہلے لندن جاکر جم گئے تھے ڈاکٹر تھے خاصے بڑے آدمی ہوگئے تھے۔ انھوں نے وقت نکال کر ہماری مدد شروع کردی۔ کار میں بیٹھے وہ ہم کو لندن کے پیشاب گھروں کے بارے میں تفصیل بتاتے جاتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں ایک ایسا نظام پیشاب گھروں کا وضع کیا گیا ہے کہ کسی بھی مرد عورت کو جہاں پیشاب کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہیں پیشاب گھر ہوگا۔ ہم نے کہا بھائی پھر تو یہ لندن کا جادو ہوا۔ جہاں پیشاب آنا لگے وہیں پیشاب گھر۔ شاید اسی وجہ سے ہمارے ہم وطن بھاگ بھاگ کر یہاں لاکھوں میں آ بسے ہیں۔ اپنے دوست کی بات میں کتنی صداقت ہے جاننے کے لیئے ایک جگہ ہم نے تھوڑی دور چلنے کے بعد کہا مجھے ضرورت درپیش ہے۔ انھوں نے کار روکی فٹ پاتھ پر کوئی بیس قدم چلے ہونگے کہ ایک زینہ نظر آیا جس کی سیڑھیاں خود بخود چل رہی تھیں۔ ایک منٹ بعد ہم ایک ہال میں داخل ہوئے یہ چینی کے ٹائل اور سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ ایک طرف لکھا تھا لیڈیز مگر عورت کی تصویر نہیں بنی تھی۔ یہ چالیس فٹ لمبا تیس فٹ لمبا صاف شفاف کمرہ تھا۔ مستقل گرم پانی بہہ رہا تھا فنائل کی گولیوں کو ناچ دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر نل سے گرم پانی نکلتا ہوا۔ پیشاب گھر میں تولیہ تلاش کیا۔ ہمارے دوست نے ایک نل کی طرف اشارہ کیا ہم نے اس کو کھولا تو گرم بھاپ نکل رہی تھی ہاتھ سکھائے اور کار میں آ بیٹھے اور سیر پر نکل گئے۔ دوسری مرتبہ جو ہم چلتے زینے سے سڑک کے نیچے پہونچے تو دل دھک سے ہوگیا۔ پیشاب گھر میں ایک کوری ڈور میں ایک سنگ مرمر کی ماں بچے کو دودھ پلا رہی تھی جس کو ہم حیدرآباد کے سالارجنگ میوزیم میں دیکھ چکے تھے مگر یہ مرمر کا مجسمہ نہ تھا سچ مچ ایک جوان لڑکی تھی۔ انگریز عورتیں لاکھ شہر میں ننگی پھریں لیکن ماں اپنے بچے کو سرعام دودھ نہیں پلاتی۔ چنانچہ اس پیشاب گھر میں ایک کاریڈور ایسا تھا جو اس کام میں لایا جاتا تھا ہم انگریز قوم کو بے شرم قوم سمجھتے ہیں لیکن ہماری یہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی کیا قوم ہے جس نے اپنی قوم کی لڑکیوں کی شرم و حیا کا خیال رکھتے ہوئے پیشاب گھروں میں بچے کو دودھ پلانے کا بندوبست کر رکھا ہے۔ ہمارے دوست تھوڑی دور جاکر ایک بہت اچھے آفس کے سامنے رکے وہ آفس اتنا خوبصورت تھا جیسا ہم نے کبھی فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسپشن روم کو دیکھا تھا یہاں ایک آفیسر بیٹھا تھا تین چار ٹیلی فون اس کی میز پر تھے ایک دو چپراسی بھی موجود تھے۔ میرے دوست نے اس آفیسر سے کہا تھا کہ ہمارے یہ دوست ہندوستان سے صرف پیشاب گھروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیئے انگلینڈ آئے ہیں۔ اس نے ایک گھنٹے تک ساری باتیں ہم کو بتائیں اور علاقہ کے سارے پیشاب گھروں کا چارٹ بھی دکھایا اسی طرح جیسا ہمارے ریلوے ٹائم ٹیبل کے چارٹ میں ریلوے لائنوں کو دکھایا جاتا ہے، اس سے انگلینڈ میں پیشاب گھر سسٹم معلوم ہوگیا۔ پیشاب گھر سے باہر آنے پر ہمارے دوست نے کہا جانتے ہو یہ ایک مخصوص علاقہ کا یورینل انچارج ہے اور اس کی تنخواہ ایک ڈاکٹر کی تنخواہ کے برابر ہے میں نے کہا اگر ایسی

کوئی جگہ خالی ہو تو ہمیں رکھوادو کیونکہ اگر ہندوستان گئے تو ہمیں یہاں کا یہ سسٹم باقی زندگی چین سے نہیں رہنے دے گا اور آگرہ کینٹ سے راجہ کی منڈی والا منظر باقی زندگی بھوت بن کر ہمیں ستاتا رہے گا۔

اپنے دوست کو چھوڑ کر اسکاٹ لینڈ گئے ۔ وہاں کوئی دوست نہیں تھا جو ہماری رہبری کرے۔ لیکن وہاں بھی جہاں جہاں گئے تو لندن کا ساجادو نگر لگا۔ اسکاٹ لینڈ سے پیرس پہونچے انڈر گراونڈ ٹرین سے اتر کر پیرس کی سیر کو نکلے ۔ بہت خوبصورت شہر ہے ۔ وہاں فٹ پاتھ کے قریب ایک پیشاب گھر ملا جہاں ہم گئے ۔ وہاں پیشاب گھر میں ایک فرینک کا سکہ ڈال کر نکلے تو ہم پر سینٹ کا اسپرے ہو رہا تھا قصہ مختصر یہ کہ ہم خالی ہاتھ گئے تھے خالی ہاتھ لوٹ آئے ۔ لیکن یوروپ سے واپسی پر ایک سبق سیکھ آئے اور وہ یہ کہ لوگ کس طرح جہاں میں جیتے ہیں۔

ایک مہاراجہ گوالیار پیرس گئے تھے وہ وہاں سے سڑکوں کے لیئے بجلی کے لیمپ پوسٹ لے کر آئے۔ جو آج بھی مہاراجہ کے اسٹیچو کے پاس لشکر میں مہاراج باڑے پر جگمگا رہے ہیں۔ بھوپال کے نواب حمید اللہ خاں بھی یوروپ سے سڑک کے لیمپ پوسٹ کا ڈزائن لائے تھے جو حمیدیہ روڈ پر لگے تھے ۔ ایک پرائم منسٹر نے یوروپ کی سڑکوں پر جہاں سال کے دس مہینے کہرہ چھایا رہتا ہے سوڈیم کے پیلے بلب جلتے دیکھے تو ہندوستان کی سڑکوں پر لاکر لٹکا دیئے ۔ جس ملک میں روشنی سے بچنے کے لیئے موٹے موٹے پردے دروازے اور کھڑکیوں میں لٹکانا پڑتے ہیں۔ مگر ان حرکتوں سے ہندوستان پیرس بن سکا نہ انگلینڈ۔ اگر کچھ لانا ہے تو یوروپ سے اندازِ زندگی اٹھا کر لاؤ ۔۔۔

غزل

محبوب مانجھوی

مرغ و مٹن و نان اڑانے کے لئے آ
کرچن سے مری بھوک مٹانے کے لئے آ

رمانٹوں کا ڈھیر لگانے کے لئے آ
لو کا مجھے بیل بنانے کے لئے آ

ماں باپ ، بہن بھائی ، عزیز اور اقارب
ن سب سے مرا پنڈ چھڑانے کے لئے آ

شاپنگ کے لیے ساتھ ترے جاؤں گا خوش خوش
وکر کا مجھے رول دلانے کے لئے آ

نواہ و رشوت کی بھی دے دونگا کمائی
ساری کمائی کو اڑانے کے لئے آ

ں میں ترے واسطے بن جاؤں گا بھیگی
مجھ پہ سدا رعب جمانے کے لئے آ

اے مری محبوب ، مری جان تمنا
مجھ کو ٹھکانے سے لگانے کے لئے آ

غزل

ڈاکٹر ہادی منزہ

اب تو ہم سے یہ دلندر نہیں دیکھے جاتے
جن میں ایماں تھا وہ لیڈر نہیں دیکھے جاتے
رتھ نکلتی ہے فضاؤں میں لہو بھرنے کو
ملکی حالات یہ ابتر نہیں دیکھے جاتے
کام رشوت کے بنا کون یہاں کرتا ہے
ملک میں ایسے تو دفتر نہیں دیکھے جاتے
گھاس بھی کھانے لگے ملک کے اکثر لیڈر
پر جگالی کے وہ منظر نہیں دیکھے جاتے
مار بھی کھائیں شکایت نہ کریں بیگم کی
ہم سے مظلوم یہ شوہر نہیں دیکھے جاتے

بابو آر کے
آزاد الکٹریکلس چاول
منڈی اچل پور سٹی
444806

عرض کیا میں نے

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

اردو شاعری میں معشوق کی گلی کے ساتھ ہمارے شعراء نے عجیب عجیب طرح کے سلوک روا رکھے تھے خصوصاً غالبؔ صاحب نے تو کوچہ، جاناں کو عجوبہ، روزگار بناکر چھوڑا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا ۔۔۔ کہ کوچہ، جاناں میں ہنگامہ مچانے اور داداگری کرنے میں غالب کا کوئی ثانی نہیں تھا ۔ آئے دن وہ اپنے معشوق کی گلی میں غنڈہ گردی کیا کرتے تھے ۔ یہاں تک کہ چکا جام کرنا اور راستہ روکو آندولن چھیڑنا ان کے معمولات میں شامل تھا ۔ مذکورہ شعر میں ہی دیکھئے کہ کوچہ، جاناں کا تصرف ان کے نزدیک کس نوعیت کا تھا ۔ اس کا فیصلہ آپ خود کیجئے کہ کوچہ، جاناں میں بجائے آمد و رفت کے ان کا بے تکلف بیٹھ جانا کیا انھیں ایک غیر ذمہ دار شہری ثابت نہیں کرتا ؟ اور پھر کوچہ، دلبر میں بیچ سڑک پہ بیٹھ کر ہٹ دھرمی سے یہ کہنا " ۔۔۔ کہ ہم اپنے معشوق کی گلی میں رہ گذر عام پہ بیٹھے ہیں ۔ کسی کے دولت کدہ پہ تھوڑے ہی بیٹھے ہیں اس لئے کسی ایرے غیرے کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہمیں اٹھ جانے کی تنبیہ کرے ۔ " اب آپ ہی کہیئے یہ غالبؔ صاحب کی کھلی دھاندلی اور صاف داداگری ہوئی یا نہیں ؟ خیر یہ تو ہوئی غالبؔ صاحب کے زمانے کی بات ۔۔۔ لیکن اگر یہی حرکت غالبؔ سے آج کے موجودہ بھیڑ بھرے ماحول میں سرزد ہوئی ہوتی ۔۔۔ تو ٹریفک جام کرنے کی پاداش میں وہ یقیناً دھر لیئے جاتے اور ٹریفک سپاہی ان کی سرزنش کرتے ہوئے کہتا ، کہ اے میاں اٹھو ، شرم نہیں آتی بیچ سڑک پہ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہو ، کیا سڑک بھی بیٹھنے کی جگہ ہے ؟ سارا ٹریفک جام کرکے رکھ دیا جاؤ بھائی جاؤ کسی مندر مسجد میں جاکر بیٹھو یا کسی کے گھر کی چوکھٹ پہ لیٹو چلو راستہ چھوڑو ۔ بہرکیف یہ مقام مسرت ہے اور اردو شعری ادب پہ احسان عظیم ہے کہ غالبؔ کے زمانے میں ٹریفک کا مسئلہ نہیں تھا ورنہ اتنا خوبصورت شعر تخلیق ہونے سے رہ جاتا ۔۔۔ اور یہ شعر بھی دیکھئے

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

ماضی کو رفیق اور حال کو رقیب جاننا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اسی نظریہ کے شکار مذکورہ شعر میں غالبؔ بھی ہوئے ہیں۔ یعنی عمر کے آخری دور میں جب ۔۔۔ وہ حال کی دلدل میں پھنس کر رہ گئے تھے تب ماضی کی مخملی یادوں کو کریدنا عالم شباب کے رنگین لمحات کو ترسنا اور فرصت کے رات دن کے لئے تڑپنا ان کا معمول ہوگیا تھا۔ یہ عمر کے آخری پڑاؤ پہ وقت پیری ادھر ان کے قویٰ مضمحل ہونے لگے تھے اور ادھر امور خانہ داری کا حملہ اور بیوی کا غلبہ شدید سے شدید تر ہونے لگا تھا۔ ان حالات میں خانگی ذمہ داریوں کی یلغار دال روٹی کی چیخ پکار اور بے لاڈ وہ لاڈ کی ہاہا کار نے ان کا ناطقہ بند کر کے رکھ دیا تھا۔ یعنی جب حال کے تقاضے جلاد کی تلوار بن کر ان کے سر پہ لٹکنے لگے تب انھیں اپنا مکتب عشق میں تصور جاناں کا مصلیٰ بچھا کر زانوئے عشق تہہ کر کے پہروں بیٹھے رہنا یاد آنے لگا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالبؔ تصور جاناں میں بجائے لیٹنے، اٹھنے یا چلنے پھرنے پر صرف بیٹھ جانے کو ہی ترجیح کیوں دیتے تھے؟ شاید ریاضت عشق میں معشوق کے گیان دھیان کا یہ کوئی مسنون طریقہ ان دنوں رائج رہا ہوگا ورنہ تصور جاناں میں استراحت فرمانے یا چلنے پھرنے سے غالبؔ کو بھلا کون روک سکتا تھا ۔۔۔ اسی طرح اب یہ شعر بھی ملاحظہ کیجئے۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند کہ سر اڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

اردو شعری ادب میں نوشہ غالبؔ سے زیادہ اذیت پسندی کا دلدادہ کم از کم ہماری نظروں سے تو کوئی دوسرا نہیں گذرا۔ مرنے اور جان دینے کا تو کوئی موقعہ وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنے معشوق کے حسن و جمال پہ ہی جان نہیں چھڑکتے تھے بلکہ اس کی آواز سننے کے لئے بھی وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہنے کی پوزیشن میں ہوا کرتے تھے۔ اب اسی شعر کے خونی پس منظر میں ان کی اذیت پسندی اور بے دھڑک جان دینے کے جذبۂ شہادت کو ملاحظہ فرمایئے کہ ۔۔۔ ادھر جلاد تلوار ہاتھ میں لیکر انھیں سزا دینے کے درپے ہے اور ادھر غالبؔ اس جاں سوز موقعہ پر بھی بجائے اپنی گردن کی خیر منانے کے اپنے معشوق کی آواز سننے کی گردان کرتے نظر آتے ہیں۔ غیرت ناہید کی تان سننے کے شوق میں ان کا سر دھڑ کی بازی لگا کر یہ کہنا کہ ۔۔۔ اے کاش اس موقعہ پر میرا معشوق اگر اپنی سریلی آواز کی شیرینی میرے کانوں میں گھول دیتا تو مجھے اپنے سر کے قلم ہونے کا ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔ اب اگر آپ یہ کہیں کہ ان جاں بلب لمحات میں وہ اپنے معشوق کی دلکش آواز میں کوئی وداعی گیت یا رزمیہ نظم سننے کے آرزومند ہیں تو ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے بلکہ وہ تو صرف اپنے معشوق کی آواز کے پرستار ہیں بھر چاہے ان کا معشوق اپنی شیریں آواز میں انھیں گالیاں دے، کوسے یا طعنہ زنی کرے یا جلاد سے وہ یہی کیوں نہ کہے ۔۔۔ کہ دیکھ اے جلاد، اس ظالم نامراد کو چھوڑ نا مت زبردست ہاتھ چلانا وار پہ وار کئے جانا وغیرہ وغیرہ ۔۔۔ اسی طرح یہ شعر بھی دیکھئے۔

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس شعر کے مصرعہ اولی کے کروفر سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ غالبؔ صاحب کے دولت کدہ پہ آنے والے مہمان کوئی V.I.P یا ہزہائینس قسم کے انسان تھے اور آنے سے قبل ان کا کوئی ٹور شیڈول اخبارات میں شائع ہوا تھا یا ریڈیو پہ نشر اور ٹی وی پہ ٹیلی کاسٹ ہوا تھا ۔ خیر جو بھی ہو مہمان کی آمد کی سن گن ملتے ہی غالبؔ صاحب کے میزبانی کے جملہ امور سے چشم پوشی کرنے اور بوریا بوریا کہنے سے کہیں آپ یہ بھی قیاس نہ کرلیں کہ وہ آنے والے مہمان محض بوریئے کے حصول کیلئے ہی تشریف لارہے تھے یا بوریا ان کی اولین پسند اور ان کی زندگی کا مقصد تھا ۔۔۔ یا پھر غالبؔ صاحب کوئی بے سرو سامانی کی زندگی جی رہے تھے اور اتنے گئے گذرے تھے کہ ان کے گھر میں بچھانے کے لئے بوریا تک دستیاب نہیں تھا ۔۔۔ بلکہ بوریئے کے لئے غالب کے واویلا مچانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ آنے والے مہمان کی حیثیت ان کی نظروں میں پسندیدہ اور ہر دلعزیز نہیں تھی اور شاید ان کے تئیں غالبؔ کے دل میں کسی قدر نفرت پائی جاتی تھی ۔ اسی لئے ایسے مہمان کی آمد کی خبر سن کر انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا ۔۔۔ کہ گھر کے گدے غالیچے چادریں اور شطرنجیاں اٹھاکر رکھ دیں اور مذکورہ مہمان کے شایان شان بوریئے کی خدمات حاصل کرنی چاہیں ۔ شاید ان کا منشا یہ رہا ہو کہ مہمان بوریئے پر ہی اٹھے بیٹھے اور سوئے جاگے تاکہ بوریئے کی تکلیف دہ نشست سے اکتاکر وہ فوراً ہی رخت سفر باندھ لے کیونکہ ویسے بھی بوریئے اور کانٹوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا بس انیس بیس والا معاملہ ہوتا ہے ۔ الغرض مذکورہ شعر میں غالبؔ کا بوریا بوریا کرنا ان کی بے سرو سامانی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مہمان کے تئیں ان کی انتقامی کاروائی کا پیش خیمہ ہے

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد ۳۲ شمارہ ۴ حیدرآباد

اپریل ۱۹۹۹ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز : ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

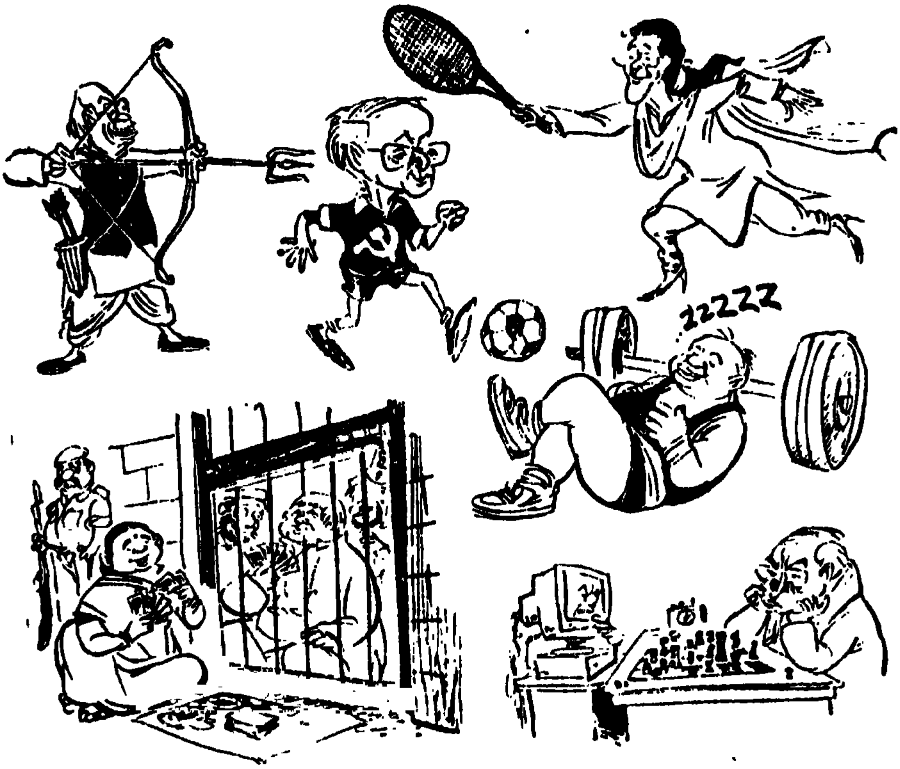
قیمت فی پرچہ ۱۲ روپے زر سالانہ ۱۴۰ روپے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

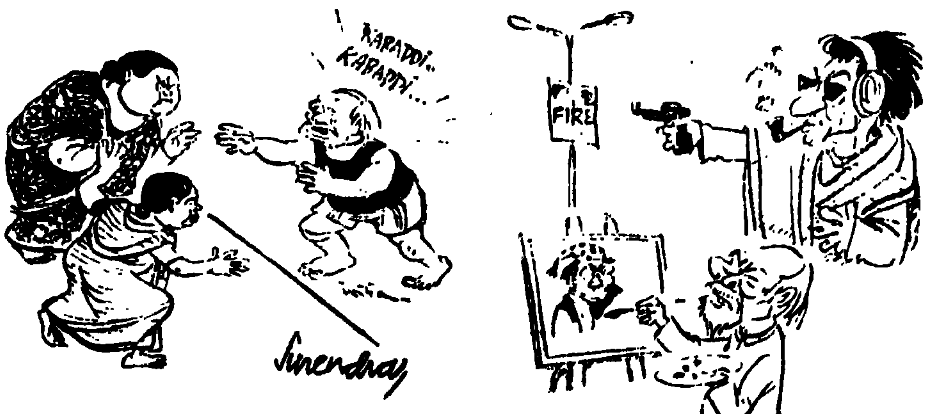
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱۔ بچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد۔ ۱ فون (آفس) 4745716
(رہائش) 4576063

اس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

دفتر شگوفہ کا تبدیل شدہ فون نمبر 4745716


zzzzz


KABADDI..
KABADDI...
FIRE
Surendra

مجتبیٰ حسین (دہلی)

بنجارہ ہلز کی چٹانیں

نریندر لوتھر کو حیدرآباد سے عشق ہے (یوں بھی ایک عمر کے بعد آدمی شہروں سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے) پچھلے ہفتہ دہلی آئے تو ہمیں فون کیا۔ ہم نے حیدرآباد کا حال پوچھا تو حسب معمول اسے اچھا بتانے لگے۔ ہم نے کہا "حیدرآباد سے آپ کا عشق اب اس منزل میں ہے جہاں آپ بھولے سے بھی اس شہر کے موسم کی برائی تک کرنا نہیں چاہتے۔ سنا ہے ان دنوں وہاں گرمی بہت ہے بولے "شہر ہوگا تو اس کے موسم بھی ہونگے۔ بھلا گرمی بھی کوئی شکایت کرنے کی چیز ہے" ہم نے کہا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ عشق جب آتش نمرود میں کود پڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو آپ حیدرآباد کی گرمی کی شکایت کیوں کریں گے" بولے "باتیں نہ بناؤ۔ پہلے یہ بتاؤ کل تمہاری کیا مصروفیت ہے؟" ہم نے کہا "معاصرانہ چشمک کے سوائے اردو کے ایک ادیب کی اور کیا مصروفیت ہو سکتی ہے۔ کسی کی غیبت کریں گے کسی کی ٹانگ کھینچیں گے۔ کسی کی ٹوپی اچھالیں گے (بشرطیکہ اس نے پہن رکھی ہو تو) بولے "کل گیارہ بجے نائب صدر جمہوریہ ہند جناب کرشن کانت اپنی قیام گاہ پر میری وہ دستاویزی فلم دیکھنے والے ہیں جو میں نے حیدرآباد کی چٹانوں کے بارے میں پچھلے دنوں بنائی ہے۔ تم بھی آجانا"

نریندر لوتھر کی اس دستاویزی فلم کا ذکر ہم نے نہ صرف پڑھا تھا بلکہ سنا بھی تھا۔ دیکھا اس لیے نہیں تھا کہ جس دن یہ فلم دوردرشن پر دکھائی گئی تھی اس دن ہم غالباً اور طرح کی چٹانیں دیکھنے میں مصروف تھے۔ دیکھا جائے تو چٹان اور عشق کا بھی بڑا پرانا سمبندھ ہے۔ اگر یہ سمبندھ نہ ہوتا تو میاں فرہاد اپنے ساتھ تیشہ، پھاوڑا اور کدال وغیرہ لے کر اپنی شیریں کی خاطر پہاڑ کو کاٹنے کیوں جاتے۔ نائب صدر جمہوریہ کے ساتھ بیٹھ کر چٹانوں کے بارے میں فلم ہی نہ دیکھ لیتے۔ بہرحال سچے معاملات عشق تو سچے عاشق ہی جانیں۔

اگر چہ علامہ اقبال نے ہم جیسے مومنوں کو بہت پہلے ایک مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

ہمیں کیا معلوم تھا کہ علامہ اقبال کے اس شعر میں جن چٹانوں کا ذکر ہے وہ بنجارہ ہلز اور جوبلی ہلز کی چٹانیں ہیں۔ لہٰذا جب ہم میں شاہین بننے کی صلاحیت موجود تھی تو اس وقت ہمیں ان چٹانوں کو دیکھ کر ڈر ہوتا تھا کہ ان میں جا کر کیسے رہیں لیکن اب جب کہ ہم میں ان چٹانوں میں رہنے کی خواہش بیدار ہونے لگی تو پتہ چل رہا ہے کہ ان چٹانوں پر این آر آئیز (NRI.s) اور پیسے والوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور چٹانوں کا ایک گز رقبہ بھی چار پانچ ہزار روپے سے کم میں دستیاب نہیں ہے۔ اب احساس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال سچ مچ دانائے راز تھے۔ ہم جیسے عاقبت نااندیشوں نے ان کے کلام کی قدر نہ کی۔ ان کے کلام کی صرف داد دی اس پر عمل نہ کیا ورنہ آج کوئی چٹان ہمارے قدموں میں بھی ہوتی یہ اور بات ہے کہ وہ ہمارے قدموں سے اپنا سر پھوڑ رہی ہوتی۔

نریندر لوتھر نے ان چٹانوں کے بارے میں سچ مچ ایک خوبصورت دلنشین اور دلگداز فلم بنائی ہے۔ بہت سے حیدرآبادیوں کو

یہ پتہ بھی نہ ہوگا کہ جن چٹانوں کے بیچ وہ رہتے ہیں ان کا شمار اس سطح زمین کے سب سے قدیم ارضی نمونوں میں ہوتا ہے یہ چٹانیں 2500 ملین برسوں سے موجود ہیں (حساب ہمیں نہیں آتا۔ سنا ہے کہ ایک ملین کے دس لاکھ روپے ہوتے ہیں۔ ڈھائی ہزار ملین کے کتنے کروڑ اور کتنے ارب برس ہونگے۔ ذرا ہمیں بتایئے تو) پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ چٹانیں سطح مرتفع دکن پر بیس ہزار مربع کیلو میٹر کے رقبہ پر چیدہ چیدہ حالت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ میسور کے پاس بھی جہاں فلم "شعلے" کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ چٹانیں موجود ہیں کروڑوں برسوں سے خاموش چٹانیں سطح مرتفع دکن میں یونہی چپ چاپ کھڑی ہیں۔ کسی نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کہ اے چٹانو کیوں کھڑی ہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو۔ جب تک فلم "شعلے" نہیں بنی تھی جب تک کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ قدرت نے ان چٹانوں کی تخلیق کیوں کی ہے (یوسفی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ خدا نے کتوں کو اس لیے پیدا کیا تھا کہ ایک دن پطرس بخاری ان پر ایک مضمون لکھیں۔ اس طرح ہمارا خیال ہے کہ قدرت نے سطح مرتفع دکن کی چٹانوں کو اس لیے پیدا کیا تھا کہ ایک دن ان کے پس منظر میں فلم "شعلے" بنائی جائے) گبر سنگھ نے جب سلیم جاوید کا لکھا ہوا یہ مکالمہ ادا کیا "اب تیرا کیا ہوگا کالیا؟" تو اس وقت وہ اصل میں کالیاں سے مخاطب نہیں تھا بلکہ اس کا روئے سخن ان چٹانوں کی طرف تھا کہ "اب تمہارا کیا ہوگا اے چٹانو؟" چنانچہ اب آئے دن ہندوستانی فلموں کے نازک اندام ہیرو بسا اوقات جنوبی ہند کی صحت مند اور چٹان صفت ہیروئنوں کے ساتھ ان چٹانوں کے بیچ ناچتے، گاتے اور ویلنوں سے جھگڑے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس صورت حال سے گھبرا کر اب نریندر لوتھر کو خود ان چٹانوں کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنانی پڑی ماشاء اللہ اس دستاویزی فلم میں ان چٹانوں نے غضب کی اداکاری کی ہے۔ چٹانیں بول نہیں سکتیں تو کیا ہوا نریندر لوتھر کا اسکرپٹ تو پیچھے سے بول رہا ہے۔ یوں بھی ساٹھ ستر برس پہلے تک ہمارے ہاں خاموش فلمیں ہی بنا کرتی تھیں۔ اب بھی جو بولنے والی فلمیں بنتی ہیں تو ہمیں ان کے بننے پر بھی اعتراض ہے کیوں کہ آپ دو چار ہندوستانی فلمیں ذرا دل لگا کر دیکھ لیں تو آپ کو یہ جاننے میں محنت صرف نہیں کرنی پڑتی کہ ہیرو کیا کہنا چاہتا ہے۔ ویلن کے کیا ارادے ہیں، ہیروئن کے باپ کی کیا مجبوری ہے۔ آپ غور سے دیکھیں تو ان فلموں میں پروڈیوسر کے مکالمے بھی سنائی دیتے ہیں حالانکہ وہ خود پردہ سیمیں پر نمودار نہیں ہوتا۔ نریندر لوتھر نے اس فلم کے ذریعہ ان خاموش چٹانوں کو جو قوت گویائی عطا کی ہے اس سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ چٹانیں نہ صرف بول رہی ہیں بلکہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں بول رہی ہیں۔ فلم میں چٹانوں کا ایک منظر ایسا بھی ہے جس میں ایک بڑی چٹان کھڑی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پتھریوں بکھرے ہوئے جیسے بڑے انہماک کے ساتھ اس رہنما چٹان کی تقریر سن رہے ہوں۔ ایک چٹان میں ایک ماں اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ ایک اور چٹانی منظر میں پورا ایک خاندان پکنک منا رہا ہے (برابر میں کوکا کولا کی خالی بوتلیں پڑی ہوئی ہیں) ایک چٹان میں ایک بارعیش آدمی کی شبیہ نظر آرہی ہے (یہ اور بات ہے کہ تیز ہوا کے باوجود داڑھی کے بال ہلنے سے معذور ہیں) ہم نے یہاں تک دیکھا کہ ایک چھوٹی چٹان، ایک بڑی چٹان کی جیب کاٹ رہی ہے۔

افسوس کہ نریندر لوتھر نے اس فلم کے بنانے میں ذرا دیر کردی ورنہ اس فلم میں شمولیت کے لیے ہم اس چٹان کی نشان دہی بھی کر دیتے جو ابھی چند برس تک حسین ساگر کے ایک کنارے پر واقع تھی۔ یہ ہماری محبوب چٹان تھی جس پر ابھی تیس پینتیس برس پہلے تک، ہم شام کے دھندلکے میں بیٹھا کرتے تھے (اکیلے نہیں) اس چٹان سے ہماری کتنی ہی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ پانچ چھ برس پہلے ایک دن یونہی وہاں سے گزرے تو دیکھا کہ کوئی اس چٹان کو کاٹ کر لے گیا ہے۔ یوں لگا جیسے کوئی ہمارا دل کاٹ کر لے گیا ہو۔ اب کس سے فریاد کریں کہاں ہے وہ زنجیر عدل جسے ہم کھینچنے جائیں۔ کس سے داد رسی چاہیں۔ نریندر لوتھر کی اس فلم کا پہلے سے پتہ ہوتا تو ان سے کہہ کر اس فلم میں اس چٹان کو بھی محفوظ کر لیتے۔ غرض اب نہ وہ چٹان باقی رہی اور نہ ہی وہ ہستیاں جن کے ساتھ ہم یہاں بیٹھا

کرتے تھے ۔ سب فنا ۔ آخر فنا ۔ چٹانیں تو اس قدر جلدی فنا نہیں ہوا کرتی تھیں لیکن اب وہ بھی ہونے لگیں ۔ اس فلم میں وہ محیر العقول چٹانیں بھی دکھائی گئی ہیں جن میں ایک چھوٹے سے پتھر پر اس کی جسامت سے ہزار گنا بڑی چٹان یوں ٹکی ہوئی ہے جیسے سرکس کے شو میں سالم ہاتھی ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ جاتا ہے ۔ ہاتھی تو خیر بیٹھنے کی اداکاری کرتا ہے لیکن چٹان تو نہیں کرسکتی ۔ ایسی چٹانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ سے ڈر لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب سر پر آن گرے ۔ پہلے تو خیر بہت گھبراتے تھے لیکن اب نہیں گھبراتے کیوں کہ جب سے مرکز میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی مخلوط سرکار بنی ہے تب سے ہمیں ایسی چٹانیں کوئی عجوبہ نہیں دکھائی دیتیں کیوں کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی اتنی بڑی سرکاری بھی تو پانچ پانچ چھ چھ ارکان پر مبنی پارٹیوں پر ٹکی ہوئی ہے ۔ ایک سال سے تو ٹکی ہوئی ہے آگے کا حال ہم نہیں جانتے ۔

نریندر لوتھر کی فلم رابندر ناتھ ٹیگور کی اس مشہور نظم سے شروع ہوتی ہے جسے انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے دورہ حیدرآباد کے موقع پر ان چٹانوں کو دیکھ کر کہی تھی ۔ ہم سوچتے رہے کہ اگر ٹیگور آج ان چٹانوں کو کاٹ کر بنائی گئیں موجودہ بستیوں کو دیکھتے تو کیا ایسی خوبصورت نظم کہہ سکتے تھے ۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے ۔ رابندر ناتھ ٹیگور ۱۹۳۲ء میں ہی یہ نظم کہہ سکتے تھے نہ اس سے پہلے کہہ سکتے تھے اور نہ ہی بعد میں کہہ سکتے تھے ۔ ان چٹانوں نے کروڑوں برس تک ایک پر سکون زندگی پائی ۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ ایک دن پیسے والے ان کے سکون کو چکنا چور کردیں گے ۔ ۱۹۲۷ء میں نواب مہدی نواز جنگ نے بنجارہ ہلز میں ۵۰۰ ایکڑ کی اراضی کوڑیوں کے مول خریدی تھی اگر انہیں معلوم ہوتا کہ ساٹھ ستر برس بعد اس علاقہ کا یہ حال ہوجائے گا تو ہرگز نہ خریدتے ۔ سنا ہے کہ ان چٹانوں کے تحفظ اور انہیں برقرار رکھنے کی خاطر ایک انجمن بھی بنائی گئی ہے ۔ لیکن ہمارے ہاں انجمنوں سے مشکل یہ ہوتی ہے کہ یہ بھی ٹوٹنے کے معاملہ میں چٹانوں کی طرح کمزور ہوتی ہیں ۔ انجمن کے ارکان میں اتفاق رائے موجود نہ ہو تو بعض ارکان انجمن کو ہی کاٹ کر لے جاتے ہیں ۔ خدا کرے یہ انجمن بنجارہ ہلز کی چٹانوں سے کہیں زیادہ مضبوط ثابت ہو ۔ یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ہماری محبوب چٹان تو ملیامیٹ ہوگئی کم از کم دوسروں کی چٹانیں تو محفوظ رہیں ۔

صرف میرا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

غرض آدھے گھنٹہ کی اس فلم کو نائب صدر جمہوریہ مسٹر کرشن کانت نے بھی نہایت ذوق و شوق سے دیکھا بلکہ دو چار چٹانوں کو تو پہچانا بھی ۔ کیوں نہ پہچانیں گے ۔ آخر وہ بھی تو ایک عرصہ تک ان چٹانوں کے دامن میں رہ چکے ہیں ۔

مشینی دور میں دکھڑا ہمیں کس کو سنانا ہے
مبارک شاعری تم کو ، ہمیں پیسہ کمانا ہے
بہت آسان ریگستان میں سبزہ اگانا ہے
بہت مشکل سروں پر کھیتیوں کا لہلہانا ہے
ہمارے رہنما کے پاس قارونی خزانہ ہے
مگر دن رات بے چارے کو فکر آب و دانہ ہے
کہاں لیلیٰ ، کہاں مجنوں ، کہاں آنسو ، کہاں آہیں
وہ فرصت کا زمانہ تھا یہ جھٹ پٹ کا زمانہ ہے
جسامت کا نہایت فرق پڑتا ہے لباسوں پر
تمہارے ناپ کا کرتا ہمارا شامیانہ ہے
زمانے بھر کو دھوکہ دے رہا ہے اپنے حلیے سے
کہ اس جہل مرکب کا سراپا عالمانہ ہے
جو کل سرکس کے جوکر کے بدن پر ہم نے دیکھا تھا
وہی فیشن ہمیں اپنے بدن پر آزمانا ہے
سیاست میں کرپشن ہے ، کرپشن میں سیاست ہے
کرپشن زندگانی کا ہماری تانا بانا ہے
حکومت مرد کرتے ہیں ، کبھی عورت بھی کرتی ہے
سنا ہے آجکل دور حکومت درمیانہ ہے
للیتا ، ٹھاکرے ، ممتا کے آگے روز و شب ان کو
مسلسل گڑگڑانا ہے ، اگر کرسی بچانا ہے
انہیں سر پر بٹھا کر ہم نے خود ہی مونگ دلوائے
جسے کہتے ہیں مہنگائی خدائی تازیانہ ہے
بہت آساں عوام الناس کو الو بنا دینا
بہت مشکل مگر نیتاؤں کو الو بنانا ہے

غزل

اقبال ہاشمی

شکاری جانتا ہے کس جگہ پر جال پھیلائے
وہیں چڑیاں پہنچتی ہیں جہاں کا آب و دانہ ہے
ہمارے سر سے چھپر ہٹ گیا اپنی حماقت سے
یہ اپنا سر اٹھاکر بیٹھنے کا شاخسانہ ہے
بھلا کس گھر میں آنگن ہیں ، کہاں دیوان خانے ہیں
ہر اک ہوٹل ہمارے واسطے دیوان خانہ ہے
تمہیں بھی چاہیے کہ بھولنے کا وصف اپناؤ
ہمارا وصف تم سے قرض لے کر بھول جانا ہے
ہمیں کھانے کی عادت ہے سدا کھاتے ہی رہتے ہیں
ہمیں معلوم ہی کیا ہے ، کیسے ، کب ، کیا کھلانا ہے
ستانا اپنے معدے کو کہیں مہنگا نہ پڑجائے
سنبھل کر ، سوچ کر ، تہذیب سے لقمہ اٹھانا ہے
ہمیں پیٹا ہے ابا نے ، انھیں پیٹا ہے دادا نے
تشدد کی حمایت میں ، گھرانے کا گھرانہ ہے
ہزاروں بار بکرا بن چکے ہم بدحواسی میں
حواس و ہوش میں رہ کر اسے بکرا بنانا ہے
الف اور واؤ گرتے ہیں کبھی ہم خود بھی گرتے ہیں
ہماری شاعری کا وصف ہی گرنا ، گرانا ہے
اسی میں شعر گلتے ہیں ، اسی میں شعر ڈھلتے ہیں
ہر اک شاعر بزعم خود سخن کا کارخانہ ہے
اسے اقرار سمجھیں یا اسے انکار سمجھیں ہم
عجب انداز میں موصوف کا گردن ہلانا ہے
سبق سکھلا دیا بیخ کھود کر ہم کو جیالوں نے
زمانہ اس کی سنتا ہے بدن جس کا توانا ہے
ابھی چائے کی پیالی ہاشمی حاضر کریں گے ہم
اگر چائے کی پیالی میں تمہیں طوفان اٹھانا ہے

سنگ ملی (دوسری قسط)

پرویز یداللہ مہدی
(ممبئی)

ملنا ھمارا ایک وائلڈ لائف ایکسپرٹ سے

محبوبہ۔ دلنواز سے پہلی ملاقات کے دوران ہمارے دل میں جس اندیشے نے سر ابھار کر غرانا شروع کیا تھا اس کی غراہٹ کو کم کرنے کے لیے ہم نے اسے بہت پچکارا بہت تھپکیاں دیں لیکن اس کی غراہٹ کم نہ ہوئی چنانچہ مجبور ہوکر اپنے اس شناسا سے رجوع کیا جن کے حلقہ۔ احباب میں ہر مکتب فکر ہر مکتب خیال سے تعلق رکھنے والے اصحاب تھوک کے بھاؤ مل جاتے ہیں، ادب سیاست، طب، نجوم ہر میدان کا مہرہ ان کی بساط پر ہمہ وقت دستیاب، ہم نے موصوف سے حرف مدعا بیان کیا کہ ہمیں ایک ایسے شخص کی تلاش ہے جس کا تعلق وائلڈ لائف Wild Life سے ہو۔ جواب میں موصوف نے حسب عادت سر سہلاتے ہوئے مراقبہ کیا اور پھر جب مراقبہ سے واپس لوٹے تو ایک عدد وائلڈ لائف ایکسپرٹ، کا کچا چٹھا ان کے ساتھ تھا بولے ۔۔

" آج شام میں تمہارے مطلوبہ اسامی سے ملاقات پکی سمجھو ۔۔ پسٹن جی پالن جی دارو والا وائلڈ لائف " پر اتھارٹی ہے بلکہ اپنی لائف اور وائف دونوں کو وائلڈ لائف کی بھینٹ چڑھا چکا ہے، پچھلے تیس سال سے محکمہ انسداد بر بے رحمئ جانوراں، میں سکینڈ گریڈ کلرک کے عہدے پر گوند لگاکے چپکا ہوا ہے ۔ " !!

ہم نے جواباً حیرت سے کہا۔ " تیس سال سے ایک ہی عہدے پر، یار جانوروں پر رحم کی تلقین و تاکید کرنے والا محکمہ خود اپنے ایک کارکن کے ساتھ مسلسل بے رحمی کا سلوک روا رکھے ہوئے ہے، یہ تو سراسر اندھیر ہے !! "

وائلڈ لائف ایکسپرٹ پسٹن جی پالن جی دارو والا کے بارے میں مزید یہ پتہ چلا کہ موصوف اگر دن بھر محکمہ۔ انسداد بر بے رحمئ جانوراں کے دفتر کے ایک نیم تاریک گوشے میں فائیلوں کے انبار پر سر رکھے جانوروں کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھتے ہوئے پائے جاتے ہیں تو شام ہوتے ہی شہر کے ایک قدیم دارو کے اڈے میں ان خوابوں کے شرمندہ۔ تعبیر نہ ہونے کا غم غلط کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دارو کا اڈا ہی وہ مقام ہے جہاں صرف بوتل ہی نہیں، پسٹن جی بھی پوری طرح کھلا کرتے تھے یعنی دن بھر جو دفتر میں اونگھا کرتے تھے، شام ہوتے ہی دارو کے اڈے پر پہنچ کر ان کے منھ سے پھول جھڑا کرتے تھے ۔ ہم

نے بھی ان سے ملاقات کے لیے اسی جگہ کو موزوں و مناسب جانا اور اسی شام دارو کے اڈے پر بہ نفسِ نفیس پہنچ گئے۔!

وائلڈ لائف ایکسپرٹ پسٹن جی پالن جی دارو والا حسب معمول ایک ٹیبل پر بیٹھے چہک رہے تھے اگرچہ موصوف اس وقت ٹیبل پر تن تنہا تھے، پھر بھی خاصے چہک رہے تھے باتیں کر رہے تھے اکیلے میں وہ آخر کس سے باتیں کر رہے تھے تو عرض ہے کہ وہ اس وقت بوتل سے محو گفتگو تھے اور بوتل کے بارے میں مشہور ہے کہ خود نہیں ناچتی، منھ سے لگانے والے کو طبیعت سے نچاتی ہے اور اس قدر نچاتی ہے کہ جلد یا بہ دیر ناچنے والے کا کلیجہ جل کر راکھ اور ناچنے والا بذات خود ہمیشہ کے لیے تہہ خاک پہنچ جاتا ہے۔ ہمارے ممدوح کی عمر ویسے کچھ زیادہ نہیں تھی۔ ہوں گے یہی کوئی ساٹھ کے پیٹے میں لیکن ان کی قوی روایات کے مطابق ہر زاویے ہر طرف سے جھک کر سراپا عجز و انکسار میں ڈھل چکے تھے۔ تعارف کے بعد ہم نے سب سے پہلے ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے محکمۂ انسداد بربے رحمیٔ جانوراں کی ان کے تئیں کھلی بے رحمی پر اظہار افسوس کیا تو جواب میں موصوف نے یہ کہہ کر الٹا ہمیں دم دلاسہ دیا۔ "افسوس کائے کا باوا۔ ڈیپارٹمنٹ اپنا پروموشن کبھی نئیں روکا الٹا اپن نے پروموشن روکا کائے کو بولے گا تو اپنے کوئی پروموشن نئیں منگتا ارے باوا تیس برس سے جس جگہ جس ٹیبل کرسی کے اوپر اپن بیٹھا اس سے پیار ہونے کو منگتا چ نا باوا۔ اور پروموشن کا مطلب یہ ہوتا کہ اپن اپنا پرانا جگہ پرانا ٹیبل کرسی کو چھوڑ کر نوی جگہ نوے ٹیبل کرسی کے اوپر بیٹھنا منگتا، اور یہ اپن کو منظور نئیں، اس واسطے بول کے اپن نے خود ہر ہمیش پروموشن کینسل کرایا۔ کیا۔!!"

"بالکل سمجھ گیا۔" ہم نے فوراً گردن ہلا کر اقرار کیا پھر اصل موضوع کی طرف موصوف کو لانے کی کوشش کی۔ "میں نے سنا ہے، وائلڈ لائف پر آپ اتھارٹی ہیں، بالخصوص کتوں پر آپ کی نظر بڑی گہری ہے۔!"

بوتل سے راست ایک گھونٹ حلق کے نیچے اتار کر بولے۔ "گہری دہری کیا باوا۔ ابھی تو سالی نظر چ کمزور ہو گئیلی ہے، نئیں تو جوانی میں سالی اتی ایکسپرٹ تھی اپنی نظر کہ ایک نظر میں اپن بتا دیتا تھا کہ فلانا کتا فلانی فلانی نسل کا اصلی مال ہے کہ ڈوغلی نسل کا کنتری مال۔ کیا سمجھا۔!!"

اس سے پہلے کہ موصوف کی ذہنی رو اوٹ پٹانگ باتوں کی جانب بھٹکتی ہم نے انہیں ٹوک دیا۔ "مسٹر دارو والا، دراصل میرے ایک دوست کتوں پر ریسرچ کر رہے ہیں اور میں ان کے لئے ازراہ دوستی مواد اکٹھا کر رہا ہوں، اگر آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد فرمائیں تو بڑا احسان ہوگا۔" ہم نے اصلی بات چھپانے کے لیے ریسرچ کا ہوّا کھڑا کیا۔

مسٹر دارو والا نے ایک اور گھونٹ حلق کے نیچے اتار کر فرمایا۔ "اس میں احسان کس بات کا باوا۔ یہ تو ہمارا ڈیوٹی ہے، ہمارا علم کسی کے کام آیا تو سالا ہمارا بھی نام ہوئیں گا نا باوا۔ اور پھر علم بھی سالا کوئی چلم ہے جو جاستی آدمی لوگ دم ماریں گا تو بجھ جائیں گا۔ ارے علم تو سالا ہٹ فلم ہے جتا آدمی لوگ دیکھیں گا اتا پاپولر ہوئیں گا باوا۔ کیا۔!!"

"بالکل صحیح فرمایا آپ نے" ہم نے فوراً ہاں میں ہاں ملا کر موصوف کو ٹوک دیا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مسٹر

دارو والا کو اصل موضوع سے زیادہ تمہید کی بھول بھلیاں میں بھٹکنے بھٹکانے کا شوق تھا ہم نے ایکبار پھر انہیں موضوع گفتگو کی طرف واپس گھسیٹنے کی کوشش کی۔ "ادھر ادھر کی باتیں بہت ہو چکیں مسٹر دارو والا اب ذرا کتوں کے بارے میں کچھ گفتگو ہو جائے۔"

پھٹاک سے بولے۔۔ "یہ کیا بات کرتا تم، جب سے کیا ہم اپن کے بارے میں بات کرتا تھا باوا۔ ارے کتا لوگ کے بارے میں تو بولتا تھا۔" اتنا کہہ کر موصوف نے بوتل اٹھاکر اپنے منھ سے لگالی اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں چھٹتی ہے کب یہ کافر منھ سے لگی ہوئی۔!!

وائلڈ لائف ایکسپرٹ پسٹن جی پاکن جی دارو والا بوتل ہونٹوں سے لگائے گھونٹ گھونٹ کرکے نشہ کے مزے نہیں لوٹ رہے تھے بلکہ قطرہ قطرہ، ہمارے صبر کو ربر کی طرح کھینچ کر اس کی پائیداری اور برداشت کو آزما رہے تھے۔ بڑی دیر تک وہ نشے کے اور ہم زہر کے گھونٹ پیتے رہے پھر اس سے پہلے کہ ہم ان کی توجہ، اصل موضوع یعنی کتوں کی طرف مبذول کرواتے ان پر اچانک رونے کا دورہ پڑ گیا اس طرح، چھت کی طرف منھ اٹھائے رو رہے تھے جس طرح آدھی رات کو آسمان کی طرف منھ اٹھاکر کتے روتے ہیں روتے روتے بولے۔ "اپن تو سمجھا تھا کہ اپن اس کو بھول گیا ہے، لیکن تم آکے اس کی یاد دلا دیا باوا۔" ہم نے متحیر لہجے میں پوچھا۔ "کس کی یاد۔۔!"

"جولی ڈارلنگ کی یاد باوا۔۔"

"جولی ڈارلنگ۔۔ کون جولی ڈارلنگ! آپ کی محبوبہ۔! "ہم نے سوالیہ لہجے میں پوچھا

"محبوبہ نہیں باوا، کتیا۔ ہماری نرگس ڈارلنگ کی Beloved Doggy باوا۔۔" موصوف نے ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر کہا۔

"اچھا اچھا۔ جولی ڈارلنگ آپ کی نرگس ڈارلنگ کی کتیا کا نام ہے۔!

"ہے نہیں تھا باوا۔ بہت حرامی کتیا ہوتی اکھی بستی کے کتا لوگ سے عشق لڑاتی ہوئی باوا۔!" موصوف نے اس کے عشق لڑانے کی بات اس طرح رال ٹپکاکر کی جیسے اس کے عاشقوں کی فہرست میں موصوف کا نام بھی شامل رہا ہو۔ ہم نے بھی گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔ "تو گویا آپ کی نرگس ڈارلنگ کی جولی ڈارلنگ کو آپریٹو، Co-operative کے اصولوں پر چل کر اجتماعی عشق لڑایا کرتی تھی۔!

موصوف پھٹاک سے بولے۔ "کریکٹ بالکل کھری بات، نرگس ڈارلنگ اس کو بہت سمجھاتی عزت کا واسطہ دیتی پن سالی کے اوپر جوانی کا نشہ ایسا چڑھا ہوتا کہ ہر روز ایک نئے پارٹنر کے ساتھ گھومتی ہوتی بالکل دھندے والی عورت کا مافک ہرجائی بن گئی ہوتی باوا، نرگس ڈارلنگ اس کے یہ کرتوت دیکھ کے بہت روتی ہوتی، اور میرے کو اس کا یہ رونا دھونا دیکھ کے ایک دن ایک دم غصہ آگیا باوا بازار کو جاکے زہر لے کے آیا اور سالی کو گوشت میں ملا کے کھلادیا۔!"

"کس کو۔؟ نرگس ڈارلنگ کو۔؟ "ہم نے بڑبڑا کر پوچھا۔

جھنجلا کر جواب میں بولے۔ "نرگس ڈارلنگ کو کائے کو کھلائے گا باوا۔؟ وہ حرامی جولی ڈارلنگ کو کھلا کے اس کی اسٹوری ہی خلاص کر دیا وہ جو تم لوگ کہاوت میں بولتا نا، نہ رہے بانس نہ بجے سالی بانسری۔!!

نے فوراً ان کے اس اقدام کی ستائش میں کہا۔ بہت اچھا کیا یہ آپ نے، بڑا نیک کام کیا خدا آپ کو اس کا ضرور دے گا"

ا۔ کیا۔ کیا دیں گا بولا باوا ۔۔ "انہوں نے حیرت سے پوچھا ہم نے وضاحت کی۔ "اجر یعنی کہ پھل، خدا نیک کام کا پھل ضرور دے گا ۔!

الی پھل نئیں باوا، سیتا پھل ۔ "دینے کو بولو باوا ۔ "موصوف نے پھل کے حوالے پر اپنے پسندیدہ پھل ر چھیڑ دیا چنانچہ مزید فرمایا ۔۔ "ہم کو سیتا پھل بہت پسند ہے باوا، پہلے جنگل جھاڑی کی کمی نئیں تھی اس طے سیتا پھل بہت کھانے کو ملتے تھے، ابھی جب سے جنگل جھاڑی کاٹ کے بلڈر لوگ فیکٹری کھڑا کیا ہے، سے پلیوشن Pollution بڑھ گیا اور سیتا پھل خلاص ہوگیا ہے باوا ابھی کم از کم دس برس ہوگیا پھل کھانا تو دور دیکھنے کو تک نئیں ملا باوا ۔۔!!! "موصوف پھر بہکنے لگے تھے ہم نے پھر انہیں واپس کتوں کی ف کھینچنے کی کوشش کی ۔ "تو آپ نے نرگس ڈارلنگ کی جولی ڈارلنگ کو زہر دے کر اس کا کام تمام یا ۔۔!"

چپاک سے بولے ۔ "نئیں تو کیا سالی کو موج مزا کرتا دیکھ کے نرگس ڈارلنگ کو پانی میں نمک کا مافک گھلتا نا، مگر باوا، میں جس ٹیم کی بات تم کو بتاتا، وہ ٹیم میں جولی ڈارلنگ کا مافک ہر جائی کتیا بہت کم ہوتا، ابھی تو ر دیکھو پاپ ہی پاپ دکھتا ہے، ہر کتا حرامی ہے، پہلے زمانے میں جو کتا بھونکنے والے ہوتا، وہ کبھی کاٹتا ں تھا باوا اور جو کتا سالا بھوکتا نئیں تھا وہ کاٹنے میں ایکسپرٹ ہوتا تھا، لیکن ابھی کا کتا سالا معلوم نئیں پڑتا کتے بھوکتے کبھی کاٹیں گا اور کاٹتے کاٹتے کبھی بھوکنا چالو کریں گا۔ ابھی وہ ہمارے ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر کے کو دیکھو جیسا نام ہے سالے کا ویسا ہی کام بھی ہے باوا ۔۔ تم کو معلوم کیا نام ہے اس کا ۔۔؟"

یا نام ہے ۔؟ "ہم نے پوچھا۔

سیزر ۔۔! اور کاٹتا بھی سالا سیزر مطلب قینچی کے مافک ہے اور کاٹنے کے پہلے سالا کوئی سگنل بھی نئیں دیتا الا ہے تو کتا پن پیچھے سے بلی کے مافک بنا آواز، چپ چاپ آ کے ادمی لوگ کی ٹنگڑی پکڑ لیتا باوا ۔! موصوف زبانی کی خونخواری کی کہانی سن کر ہی ہمیں جھرجھری سی آگئی ہم نے پوچھا ۔ خدا نخواستہ اس نے کبھی آپ بھی ٹانگ پر اپنے قینچی جیسے دانتوں کا کوئی نشان چھوڑا ۔؟"

ب میں موصوف نے فخریہ لہجے میں فرمایا۔ "دو تین ٹیم اس نے کوشش تو بہت کیا باوا پن اپنی سیزر چھاپ لی نئیں چھوڑ سکا کائے کو بولے گا تو اپن جب بھی ڈائرکٹر صاحب کے بنگلے کے اوپر گیا ٹنگڑی کے اوپر واٹر ف کا مافک سیزر پروف، بوٹ پہن کے گیا۔

ر پروف بوٹ مطلب ۔؟ "ہم نے حیرت سے وضاحت طلب لہجے میں پوچھا تو بولے ۔ سیزر پروف بوٹ ب برساتی لانگ بوٹ ۔"

او خوب چکمہ دیا آپ نے اسے آپ بھی کم نہیں ہیں اگر وہ سیزر ہے تو آپ اس کے باپ یعنی جولیس سیزر ہیں مارے ان تعریفی کلمات نے مسٹر دارو والا کے منحنی وجود میں ستائش کی ایسی ہوا بھر دی کہ وہ پھول کر غبارہ ہوگئے

(پہلی قسط)

سید طالب حسین زیدی
۱۱-۵-۴۱۶- ظفر باغ
لال ٹیکری - حیدر آباد - ۴

جانا ہمارا پاکستان، معیت و مساعدت میں جگندر کی ۔۔ ۱

چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گوئیم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گوئیم

(ہم آفتاب کے شیدائی ہیں، جو کچھ کہیں گے وہ اسی کی طرح روشن اور منور ہوگا نہ رات ہیں، نہ رات کے پجاری کہ خوابوں کی دنیا کی سیر کرائیں)

کراچی سے ہم نے ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب کو خط لکھا تھا جس میں ان کا پیام محترم مشفق خواجہ صاحب (خامہ بگوش) تک پہنچادینے کی اطلاع کے ساتھ ساتھ اور باتوں کے علاوہ یہ بھی مذکور تھا کہ اپنے سفر کی روداد، انشاء اللہ واپسی کے بعد بالمشافہ "بقلم خود" بیان کریں گے۔ سو، قارئین کرام! واپس آنے کے بعد اس روداد کو قلم بند کرنے کا بہتیرا ارادہ باندھتے رہے، مگر وہ چونکہ ذرا "بحر طویل" کی متقاضی ہے اس لئے ہم مہر نجان مرنج "شگوفہ" کے صفحات کی "تنگ دامنی" کے پیش نظر اس ارادے کو بریک لگاتے رہے۔

محبی منظور الامین صاحب (سابق ڈائرکٹر جنرل دوردرشن) سے ڈاکٹر کمال کی صاحبزادی کی تقریب شادی میں ملاقات ہوئی آپ نے پوچھا! تمہارے سفر پاکستان کی کہانی پڑھنے کے لئے آخر کب تک انتظار کرنا ہوگا۔؟ آپ کا یہ پوچھنا ہمارے سمند شوق کی دار فنگیوں کو ایک تازیانہ ہوا۔

اسی شب قلم سنبھالا اور داستان سرائی کو ذرا مختصر کرنے ان واقعات کو قلم زد کرنے کے لئے جو ہماری دانست میں زیادہ اہم نہ تھے جونہی ان کی طرف قلم بڑھایا وہ مچل گئے، ایڑیاں رگڑنے لگے۔ ہمیں ترس آگیا اور اپنے آپ کو اس شقاوت سے روک کر بولے! مت غم کھاؤ چلو، تمہیں بھی لئے لیتے ہیں۔ اب تم جانو شگوفہ جانے ہمیں تو بہر طور اپنا عہد نباہنا ہے۔

سپردم بتو مایہ خویش را ۔۔ تو دانی حساب کم و بیش را

جو کچھ وہاں نظر آیا، محسوس کیا سنا گیا، اور پیش آیا اسے جوں کا توں آپ کے ذوق سلیم کی ضیافت کے لئے حاضر ہے۔ اب آپ کو اگر مزا نہ آوے تو اپنے ذوق سلیم کو نہیں بلکہ ہمارے بے ڈھنگے "بازار قصہ خوانیاں

کی بے کیفیوں کو دوش دے لیجئے۔

پاکستان کے لئے سب سے پہلے ویزا کے حصول کا مسئلہ پیش آیا جو ناممکنات میں تصور کیا جاتا ہے اور دراصل حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے (اگر ہم صحیح راستہ اختیار کریں) یہ مسئلہ حل ہوا جناب محبوب الرحمان صاحب فاروقی (مدیر ماہنامہ آجکل دہلی) و بیگم فاروقی کی عنایت کریمانہ سے، جناب وحید الحسینی صاحب، نمائندہ۔ خصوصی اخبار "جنگ" کی غیر معمولی دلچسپی، جناب چوہدری عزیز احمد صاحب، ویزا آفیسر سفارت خانہ۔ پاکستان کی مہربانی اور ذرہ نوازی سے اور کرنل محمد خاں صاحب کے ایک خط کی زندہ کرامت سے جو ہمارے نام لکھا گیا تھا ان تمام اصحاب کے ہم تہہ دل سے سپاس گزار ہیں کہ جو کام پہاڑ بنا ہوا تھا وہ ان کی بدولت رائی برابر ثابت ہوا اور ہاتھ کے ہاتھ ہم ویزا حاصل کرکے حیدرآباد واپس ہوکر سفر کی تیاریوں میں جٹ گئے۔ روانگی کی تاریخ قریب آرہی تھی ادھر کراچی سے برادرم مبین زیدی فون پر برابر ربط قائم رکھے ہوئے تھے کہ کسی حال روانگی میں تاخیر نہ ہونے پائے۔ (انہی کے صاحبزادے فاروق کی تقریب شادی میں شرکت پاکستان جانے کا باعث ہوئی) اوسان قابو سے باہر ہوئے جارہے تھے سراسیمگی کے عالم میں گویا، شراب بیخ پر اور کباب شیشے میں ٹھونسنے کے معاملے سے دوچار تھے ... ایک دن چند احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان سے کچھ ضروری اور بہت کچھ غیر ضروری مشورے اور "پرچۂ ترکیب استعمال" حاصل کرنے میں منہمک تھے ایک صاحب بولے، میاں اس زمانے میں جارہے ہو جب سارے کراچی میں "ٹھک ٹھوں" اور "دھنا دھن" ہو رہی ہے۔ کہیں، اٹھائی گیرے کے ہاتھوں اٹھانہ لئے جاؤ کہ رسید بھی نہ ملے۔ دوسرے نے کہا، نکاح کے بعد جب شادی خانے سے گھر لوٹو تو تالے ٹوٹے ہوئے ملیں۔ ایسی ہیبتناک باتیں سن سن کر دل ہول کھارہا تھا کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں سامنے سے "جگندر" "سر جھاڑ منہ پھاڑ بولا یاہوا دُراتا چلا آرہا ہے۔ الٰہی خیر ہو، خلاف معمول آج بے وقت یہ کیسے نازل ہوگیا۔؟ کونسی افتاد پڑگئی۔؟ حالانکہ ہمیشہ یہ اس وقت جارے پاس آتا ہے "جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا، پوچھا، خیر تو ہے۔؟ یہ بے وقت کیسے ٹپک پڑے۔؟ بولا! سننے میں آیا ہے کہ تم پاکستان جارہے ہو۔؟ ہم نے کہا ٹھیک سنا، تمہیں کوئی تکلیف۔؟ ہماری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا، "لہور (لاہور)" بھی جاؤ گے۔؟ ضرور جائیں گے پھر؟ ... پھر ہیں۔؟ غرض کیا بھلے آدمی فکر کیوں کرتے ہو، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔؟ جہاں ہم وہاں تم یہ تو ہمارا تمہارا سدا کا معاملہ و معاہدہ ہے، تمہارے بغیر ہم ادھورے نہ لگیں گے۔؟ ... اس کی تسلی ہوگئی۔ رخصت کرکے ہم پھر سے احباب کے مشورے سمیٹنے میں مشغول ہوگئے ...

اللہ اللہ کرکے آخر وہ دن بھی آگیا جب ہم کراچی میں تھے ایک مرتبہ جب وہاں پہنچ گئے تو شادی وغیرہ کے ہنگاموں سے فارغ ہوتے ہی سب سے پہلے اردو کے ادیب شہیر جناب مشتاق احمد یوسفی صاحب سے ملنے کی شدید خواہش نے سر ابھارا۔ پتہ معلوم کرلینا آسان سمجھے ہوئے تھے مگر وہ جوئے شیر لانے سے کم ثابت نہ ہوا۔ ٹیلیفون ڈائیرکٹری دیکھی، نام ندارد۔ جہاں بھی یونائیٹیڈ بنک کی کوئی شاخ نظر آئی وہاں رک کر دریافت کیا کہ آپ کے سابق پریسیڈنٹ کا فون نمبر اور پتہ کیا ہے۔؟ جواب ملتا، ہمیں نہیں معلوم وہ کہاں رہتے ہیں اور فون نمبر کیا ہے۔؟ یوسفی صاحب کی کتابیں شائع کرنے والے پبلیشروں کو ٹٹولا وہاں سے بھی کورا جواب ملا۔

★ تاج محل نے اپنے پتے پر پہرے بٹھا رکھے ہیں!

دن پر دن گزرتے جارہے تھے اور یوسفی صاحب کراچی میں ہوتے ہوئے بھی ہمارے ہاتھ نہیں لگ

رہے تھے ادھر سے مخدومی و محبی کرنل محمد خاں صاحب کی ،، قسم مسلسل کچوکے لگائے جارہی تھی جوانہوں نے کراچی جانے والوں کو دے رکھی ہے ۔ " کوئی کراچی جائے اور مشتاق احمد یوسفی سے نہ ملے یہ ایسا ہی ہے جیسے آگرہ جاکر تاج محل کی دید سے محروم رہنا " ۔ اب ہم اور ہماری خاطر عاطر سے برادرم مبین زیدی بھی کریں تو کیا کریں ۔ ؟ کنوؤں میں بانسوں کا ڈلوانا ایک باقی رہ گیا تھا مگر سارے " کراچی " شہر میں کہیں کوئی کنواں بھی نظر نہیں آیا ۔ " تاج محل نے اپنے پتے پر پہرے بٹھا رکھے ہیں ۔ (بعد میں اس کی تصدیق بھی یوسفی صاحب نے بقلم خود کردی)

یارب جذبہ ۔ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

جوں جوں ناکامی سے دوچار ہو رہے تھے توں توں شوق ملاقات کو اور آنچ مل رہی تھی ، اس جلتی پر تیل کے مصداق ایک روز شب میں ٹی ۔ وی پر " یونائٹیڈ بنک آف پاکستان " کا ایک پروگرام دکھایا گیا جسے انور مقصود صاحب پیش کررہے تھے ۔ بنک نے اپنے کھاتہ داروں کو رجھانے اور شیشے میں اتارنے کے لئے لاٹری کے ذریعہ " کرولا " موٹروں کے انعام کی ایک اسکیم شروع کر رکھی ہے اور آج اسی سلسلہ میں یہ پروگرام ترتیب دیا گیا تھا ۔ اعلان ہوا ! بنک کے سابق پریسڈنٹ اور اردو کے نامور ادیب جناب مشتاق احمد یوسفی صاحب پروگرام کے مہمان خصوصی تشریف لارہے ہیں ۔ سنتے ہی دل بلیوں اچھل کر حلق تک آنے لگا ۔ اللہ دے ، بندہ لے ، باادب باملاحظہ ہوشیار چشم ماروشن دل ماشاد ۔ ٹکٹکی باندھ کر اسکرین کو دیکھنے لگے ۔ ہلکے ازرقی رنگ کے خوبصورت تراش کے سوٹ میں باوقار انداز سے مسکراتے ہوئے یوسفی صاحب تشریف لائے اور اپنی نشست سنبھال لی ۔ ہم کہ یوسفی صاحب سے ملاقات کے لئے اپنی ساری توانائیاں صرف کررہے تھے اس اتفاق کو بسا غنیمت سمجھ کر پلک جھپکائے بغیر پروگرام دیکھنے لگے ۔ " کبھی کبھی تصویر دل بہلا بھی دیتی ہے ۔ ۔۔۔ "

کرولا موٹروں کے انعام کی اسکیم کے روح رواں (نام غالباً جاوید اقبال ہے) نے اس اسکیم کی افادیت پر سرچ لائیٹ سے روشنی ڈالنے کے بعد یوسفی صاحب سے اظہار خیال کی گزارش کی ۔ آپ نے بلاتمہید فرمایا !

" بنکنگ کے پیشے کی " خوبی " یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو کروڑپتی ، ارب پتی بنتے دیکھتا ہے اور رشک و حسد نہیں کرتا بلکہ ان کی خوش حالی میں اپنے کو شریک سمجھتا ہے سب سے چھوٹا ٹرانزیکشن خود اس کی اپنی تنخواہ ہوتی ہے ۔ "

" یونائٹیڈ بنک آف پاکستان " کے سابق پریسڈنٹ دوسروں کو کتنا بھولا سمجھے ہوئے ہیں ۔ غالب سے معذرت کے ساتھ ۔

کتنے سادہ مگر پر کار ہیں خوبان بنک غالب

یوسفی صاحب سکے کے دوسرے رخ کی " خرابی " بیان کرنے سے بڑی خوبصورتی سے اغماض فرماگئے ، اسے ہم سے سن لیجے ۔ آدمی یہ بھی دیکھتا ہے کہ بنک والوں کی چکنی چپڑی میں آکر کبھی کبھی بہت سے " لکھ پتی راتے اور کروڑی مل " سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے بھی نظر آتے ہیں ۔۔۔ ہونہہ ! " دس لاکھ لینے پر بنک آپ کے رحم و کرم پر ہوگا " ۔۔۔ (زرگزشت) ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو ،

ہتیلی میں جنت دکھانے کا فن لائف انشورنس ایجنٹ کی طرح کوئی بنک والوں سے بھی پوچھے جس طرح لوگ اس سے گھبراتے ہیں اسی طرح اب بنک والوں سے بھی سہم کر دور بھاگتے ہیں۔ خود کرولا موٹروں کی اسکیم کے روح رواں نے اس روز اپنی تقریر میں بتلایا، "جب ہم اپنی اسکیم لے کر دیہاتوں میں گئے تو کھیتوں میں کام کررہے کاشت کار ہم کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ہل اور بیل چھوڑ چھوڑ کر پیچھے مڑے بغیر گھروں کی طرف بھاگ رہے تھے۔"۔۔۔

کیوں۔؟ انہیں معلوم ہے کہ جب نئے کھاتے کھلوانے اور روپیہ لینے کا معاملہ ہوتا ہے تو ان کا رویہ کچھ اور ہوتا ہے اور جب دینے کی باری آتی ہے تب یہ بھی "ٹونک"، جے پور اور راجپوتانے کے دیگر علاقوں کے مارواڑی سیٹھوں کے زرین اصول پر سختی سے کاربند ہو جاتے ہیں۔ "تھارو مال سو مھارو مال، مھارو مال! ھیں۔ ھیں۔ ھیں"۔۔۔

(تمہارا مال، گویا میرا مال اور میرا مال۔؟ (فقط ہنسی)

ہمیں بھی ایک مرتبہ بنک سے کچھ لینے کا واسطہ پڑا، اللہ کی پناہ! فارموں کا ایک پورا دفتر ہمارے سامنے رکھ کر فرمایا گیا، ان پر یہاں یہاں دستخط کرو یہ مرحلہ بڑی دیر بعد جاکر طے ہوا اور ہمارے سر کا ہر بال گرد ہو جانے کے کئی روز بعد مراد بر آئی تھی۔ تھوک بھاؤ میں اتنے دستخط زندگی مستعار میں ہم سے نکاح کے دن قاضی صاحب ہی نے لئے تھے دونوں موقعوں پر دستخط ثبت کرکے ہم اپنی انگلیوں میں آج تک دکھن محسوس کر رہے ہیں اور انہیں "چٹ چٹ" چٹکا کر ان دونوں دنوں کو بے فائیدہ آج بھی کوستے ہیں۔۔۔

انشورنس ایجنٹ جب کسی کو شکار کرتا ہے تو وہ خدائی خوار بھی اس غریب کو دم نہیں لینے دیتا۔ ایک مرتبہ ہم کو بھی سابقہ پیش آیا، اپنی بے پناہ لفاظی سے کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر شیشے میں اتارتے ہوئے بولا! اپنی زندگی کا بیمہ کروالینے کا سب سے بڑا فائیدہ یہ ہے کہ۔۔۔ ہم نے پوری بات سنے بغیر درمیان میں بے صبری سے منڑپ (منڑپ کا مشق Interruption) ہوکر پوچھا! کیا آدمی مرے گا نہیں۔؟۔۔۔ سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹیپ کو ذرا سا ری وائنڈ Rewind کرکے بولا، سب سے بڑا فائیدہ یہ ہے کہ آپ پہلی قسط ادا کرتے ہی اگر فوت ہوجائیں یا کسی ایکسیڈنٹ میں مارے جائیں تو ہماری بیمہ کمپنی آپ کے وارث کو بیمے کی پوری رقم معہ بونس وغیرہ فوراً ادا کر دے گی۔ ہم نے پوچھا، مگر ہماری ذات ستودہ صفات کو اس سے فائیدہ۔؟ کہنے لگا! آپ کا بڑا نام ہوگا اور "پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا"۔۔۔۔ نام ہی تو آدمی کے لئے بڑے فائیدے کی چیز ہے، آپ کی آنے والی نسلیں بھی آپ کو یاد رکھیں گی کہ ہمارے فلاں پیڑھی کے دادا جان، ہمارے عیش کے واسطے اتنا بنک بیلنس چھوڑ گئے، اس سے بڑھ کر آپ اور کون سا فائیدہ حاصل کرنے کی دھن میں ہیں۔؟ کہیئے حضور! ایک لاکھ لکھ لوں۔؟

ٹیلی وژن پروگرام ختم ہوا یوسفی صاحب کے دستخط لینے کے لئے رجسٹر پیش کیا گیا اس پر دستخط کرنے کے لئے جب انہوں نے قلم کو جنبش دی تو "جگندر" نے جو ساری کاروائی پر مسلسل اپنی نگاہیں جمائے ہوئے تھا، آہستہ سے ہمارے کان میں بولا، دیکھ رہے ہو اردو کے قطب مینار کو۔؟ قلم بائیں سے دائیں طرف کو چل رہا ہے۔ ہم بولے دیوانہ ہوا ہے یہ تیرا وہم ہے ایسا ہرگز نہ ہوگا آخر ہم بھی تو دیکھ ہی رہے ہیں بولا! یہی تو رونا ہے تم اگر اس قابل ہوتے تو پھر میری کیا ضرورت تھی۔؟ موقع ملے تو پوچھ کر تشفی کرلینا۔

★ "ڈاکٹر" انور مقصود!

"منڈیرکٹ" موچھوں والے انور مقصود جو پروگرام کی نظامت انجام دے رہے تھے بڑے خاصے کی چیز ہیں پچھلے تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ برسوں سے پی ۔ ٹی ۔ وی پر چھائے ہوئے ہیں ، ڈرامے لکھتے ہیں اور ان میں کبھی کبھی خود بھی اداکاری کے جوہر دکھلاتے ہیں کبھی اہم شخصیتوں کے انٹرویوز لیتے ہیں جب بھی اسکرین پر نمودار ہوتے ہیں اپنے اچھوتے پن ، بے ساختہ اداکاری اور ڈائیلاگ کی ادائی کے بانکپن سے ناظرین کے دلوں کو مسخر کرلیتے ہیں ۔

کئی برس ہوئے ایک مرتبہ "ملکہ ترنم نورجہاں" سے انٹرویو لے رہے تھے وہی "آواز دے کہاں ہے ۔ دنیا مری جواں ہے" والی نورجہاں ، جو پاکستان میں نہایت احترام ، عقیدت اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور سارا پاکستان انہیں "میڈم" سے مخاطب کرتا ہے ۔ نام لئے بغیر اگر صرف میڈم ہی بولا جائے تو تب بھی ہر کوئی اس کا مشارالیہ نورجہاں ہی کو سمجھے گا ۔

انور مقصود کے بارے میں معلوم ہوا کہ گنڈی پیٹ (عثمان ساگر) کا پانی پی کر پروان چڑھے ، اور جلال کی ہوٹل (تفریح دکن) کے نہاری کلچے کھاکر بلوان بنے ہیں اور غالباً نورجہانی نفسیات" پر تھیسس Thesis لکھ کر پی ۔ ایچ ۔ ڈی بھی ہوگئے ہیں اور فی نفسہ وہ بلاہیں جو "شیشے سے پتھر کو توڑ دے " ملکہ ترنم نورجہاں کو ٹی وی پر دیکھ کر فلم انمول گھڑی کی یاد آگئی جس میں ان کے ساتھی ستاروں میں ثریا سریندر بی ۔ اے اور ظہور راجہ بھی شامل تھے

سریندر بی ۔ اے اور ظہور راجہ دونوں پرلوک سدھار گئے ۔ یحیٰ خان بھی اللہ کو پیارے ہوگئے لے دے کے باقی رہے ایک دلیپ کمار سو ، وہ بھی پچھلے دنوں اپنے دل ناصبور کی عاقبت نااندیشانہ حرکتوں سے تنگ آکر ہسپتال میں شریک ہوگئے تھے ....

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو ،
اب یہاں !
کوئی نہیں
کوئی نہیں
کوئی نہیں
آئے گا ۔

(جاری) (نیم قلندر سید طالب حسین زیدی)

غزل

غلام نبی بلبل کاشمیری
(لندن)

یہ زلفوں کا محل گنبد نما معلوم ہوتا ہے
ترے سر پہ کسی کا مقبرا معلوم ہوتا ہے

بدلتا ہے مزاجِ یار، موسم کی طرح فوراً
یہ انگلستان کی آب و ہوا معلوم ہوتا ہے

کبھی سورج نہیں ڈوبا تمہارے حسنِ تاباں کا
یہ سابق دولتِ برطانیہ معلوم ہوتا ہے

ہمیشہ میری قسمت میں ہے افریقہ کی تاریکی
یہ تیرا سایۂ زلفِ دوتا معلوم ہوتا ہے

تری تیغِ نظر نے اس کے دو حصے بنا ڈالے
دلِ عاشق بھی کوئی کوریا معلوم ہوتا ہے

تمہارے حسن کی دنیا سے میرا دل ہوا روشن
عدو جل جل کے جیسے کوئلہ معلوم ہوتا ہے

مری آنکھوں سے دریا بہہ رہے ہیں تیری فرقت میں
اور اس پانی میں بلبل بلبلا معلوم ہوتا ہے

محمود علی خاں ـ حیدرآباد (پاکستان)

قابلِ رحم ہے حالت ترے دیوانے کی
زہر لے آیا تو فرصت نہیں اب کھانے کی
دیدیا گود میں بچہ کہ اسے بہلائیں
خوب ترکیب نکالی مجھے بہلانے کی
مشکلے نیست کہ آساں نہ شود مولانا!!
آپ چاہیں تو لگاتے نہیں نذرانے کی

کہہ رہی ہے مری بیگم یہ بری کا پاؤڈر
روز دھمکی جو دیا کرتی تھی مرجانے کی
تم کسی طور تو للہ سنبھالا کرنا
یوں کرو زہر ہی بن جاؤ شفا خانے کی

منظور الامین
۳ بی فیرویو روڈ ۔ ۷
بنجارہ ہلز حیدرآباد (اے ۔ پی)

قصہ ناول کا

دنیا میں آئے دن دلچسپ واقعات ہوتے رہتے ہیں کئی بار ناقابل یقین ، آپ کے تجربے میں بھی ایسے واقعات آئے ہونگے کیونکہ اسی دنیا ہی میں آپ بھی تو رہتے ہیں اس وقت ہم ایک ایسے ہی واقعے کا ذکر کرنا چاہیں گے جو ہمارے ساتھ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جو راقم السطور کی بیوی کے ساتھ پیش آیا ۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہم لوگ کشمیر میں رہ رہے تھے یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہاں موسم بہت خوشگوار تھا ، وادی پر بادلوں کے سائے تھے اور فضا میں صلصل و سار (پرندوں کے نام) کے دلوں کو لبھانے والے نغمے ، یہ اس دور کی بات ہے جو آج کا دور نہیں تھا ، ہماری رہائش سری نگر میں نگین جھیل کے پاس تھی جہاں ہم لوگ اکثر سیر کے لئے جایا کرتے تھے

آپ میں سے بعض قارئین کو شاید علم ہوگا کہ راقم الحروف کی بیوی ایک افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں ، کشمیر میں ہر جگہ حسن و رعنائی کے جلوے ہیں بقول اقبال رخت بہ کاشمر کشا ــــ اپنا سامان سفر کشمیر کی خوب صورت وادی میں کھول دیجئے اور حسین و دل نشین کوہ و دمن کا نظارا کیجئے ، بیوی کو یہ حسن اس قدر بھایا کہ انھوں نے کشمیر کو پس منظر بناکر ایک ناول لکھنا شروع کردیا ، تین چار ماہ گذر گئے وقت وقتاً ... سے وہ اپنے ناول کی تحریر کی طرف رجوع ہوتی گئیں وقت وقت ہی سے وہ اپنے ناول کی قسطیں ہمیں سنایا کرتیں کچھ عرصے میں ان کا ناول تین چوتھائی تک پہنچ گیا ۔

جس گھر میں ہم رہتے تھے اس پر ایک دل پذیر لان بھی تھا جہاں چھٹی اور اتوار کے دن ہم ہلکی ہلکی دھوپ کا لطف اٹھایا کرتے ادھر ہم اخبار بینی میں مشغول رہتے اور ادھر بیوی اپنے ناول کے پلاٹ کو آگے بڑھانے میں مصروف یہ Cherry Pink and apple blossom white کا موسم تھا ، جب وادی میں چیری کے درخت گہرے گلابی رنگ کے پھولوں سے بھر جاتے ہیں اور سیب کے پیڑوں پر دور دور تک سفید شگوفے کھل اٹھتے ہیں یہ ایک ایسا طلسماتی منظر ہوتا ہے جیسے الفاظ کے ذریعے سمجھایا نہیں جاسکتا بلکہ جو صرف دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے فضا میں ہلکی ہلکی خنکی رہتی ہے اور پیلی پیلی دھوپ بدن کو ذائقہ بہم پہنچاتی ہے ۔

ایک ایسے ہی دن ہم دونوں لان پر بیٹھے اپنے اپنے مشغلوں میں مشغول تھے لان کے ایک کنارے پر گلابوں کے تختے تھے ہلکی ہلکی خوشبو فضا میں بکھری ہوئی تھی دل ایک انجانی خوشی سے معمور ہو گیا تھا،
جی چاہا کہ اس وقت چائے کی پیالی سامنے ہوتی اور ہم گرما گرم چائے کی چسکیاں لے رہے ہوتے تو لطف دو بالا ہو جاتا۔

دیکھا گیا ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں کے محسوسات سے واقف ہوتی ہیں۔اس وقت ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا بیوی نے اپنے ناول کے ڈھیر سارے کاغذات وہیں لان پر چھوڑ دیئے اور سیدھے کچن کا رخ کیا تاکہ میاں کی چائے کی ان کہی چاہ کو پورا کر سکیں ادھر ہم اخبار پڑھنے میں لگ گئے کچھ چٹپٹی خبریں تھیں۔الف نے بے کے غم میں زہر کھا کر خود کشی کر لی، لڑکا اپنے ہی دفتر کی لڑکی کو چھٹی کے دن بھگا لے گیا سرخی تھی دفتر عشق میں تعطیل کہاں ہوتی ہے، ایک اور خبر تھی لڑکی بجلی کی دکان پر لڑکے سے ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔لڑکے نے لڑکی کو وارننگ دی تو نے ہنس ہنس کے بجلی گرائی اگر، کار بن دل کے پنکھے کا جل جائیگا،
اتفاق سے گھر کے لان کے سامنے کا گیٹ کھلا رہ گیا تھا سڑک گیٹ سے لگی ہوئی تھی جہاں آمد و رفت جاری تھی ایک گائے کا ادھر سے گذر ہوا، اس نے دیکھا سنسان لان پر ہری ہری دوب کا شائبہ تھا اور دور ایک دخل در معقولات نہ کرنے والا شخص آرام کرسی پر دراز اخبار بینی میں مصروف تھا گائے نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔
اس کے لئے یہ سنہری بلکہ ہرا ہرا موقع تھا لہذا وہ اندر داخل ہوئی اور خامشی سے لان پر آگئی لیکن سبزے کو دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی ہو گئی کیونکہ ایک دن پہلے ہی ہم نے Lawn Mover لان موئر سے سبزے کو کافی چھیل دیا تھا۔گائے نے جب سبزے پر منہ ڈالا ہو گا تو وہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوا ہو گا کیونکہ لان سبزے کا بس شائبہ ہی تھا۔

اب گائے کے سامنے ان کاغذات کے ڈھیر تھے جن پر بیوی اپنا ناول تحریر فرما رہی تھیں، ان کاغذوں کے باطن میں گائے کو گھاس اور بانس کے ریشے نظر آئے ہونگے جن سے کاغذ بنتا ہے، اس کے لئے یہ دعوت دعوت عام تھی بلکہ دعوت خاص! اس خاکسار نے جس وقت ایک بن بلائے مہمان کو گھر کی 'ضیافت' میں اس طرح حصہ لیتے دیکھا تو ایک لمحے کے لئے بس دیکھتا ہی رہ گیا۔گائے کو کاغذ کی یہ ڈش کوئی خاص پسند نہیں آئی اور اس نے منہ سا بنایا اس وقت گائے کو منہ بناتا دیکھ کر راقم کو خیال آیا کہ ناول کے سارے ہی کاغذات چبا لینے کے بعد غالباً اس نے ناول پسند نہیں کیا۔ناول نگار کے طنزیہ طرز نگارش میں اس نے شاید ببول کے کانٹے پائے سماج پر نکتہ چینی میں اسے ناگ پھنی ملی، باقی جہاں تک کاغذات اور ان کے اجزائے ترکیبی کا تعلق ہے وہ بھوکی گائے کی مرغوب غذا ثابت ہوئی۔گائے کاغذات تناول کر کے گیٹ کی طرف مراجعت کر گئی۔ طالب علمی کا زمانہ یاد آیا جب ہم سو میٹر کی ریس میں حصہ لیا کرتے تھے پس ہم نے ایک جست لگائی اور گائے سے ریس کرنے لپک پڑے، اس اثنا میں بیوی ہاتھوں میں چائے کے کپ لیے نمودار ہوئیں انھوں نے اپنے شوہر کو گائے دوڑ (بروزن گھوڑ دوڑ) میں حصہ لیتے دیکھا تو پیالیاں نیچے رکھ کر وہ بھی گائے کی طرف لپکیں مگر کیا ہو سکتا تھا چڑیا تو کھیت چگ گئی تھی ہم دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر فی میٹر سو گھنٹے کی رفتار سے لوٹے بیوی مضمحل تھیں تو خاکسار نڈھال، بیوی شکستہ تھیں تو خاکسار پامال، گائے ناول کے تمام کاغذات چبا کر یہ نغمہ گاتے ہوئے اپنے گھر کا رخ کر چکی تھی۔

کھانا جو کھالیا ہے تو گھر جانا چاہیئے
اپنے کیے پہ ہم کو نہ شرمانا چاہیئے

اپنے ناول کا حشر ہو جانے پر بیوی کو غصہ بھی تھا اور ملال بھی وہ چائے کی جگہ غصہ پیئے جا رہی تھیں، کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ جب غصے کا ابر اور ملال کا بادل چھٹتا محسوس ہوا تو ہم نے بیوی کی نازک کلائی تھامی انھیں تسلی دی اور پھر انھیں انگریزی ادیب اور تاریخ نویس کارلائل کے ساتھ جو کچھ بیتی تھی وہ کہہ سنائی۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب کارلائل نے اپنی کتاب French Revolution انقلاب فرانس مکمل کرلی تو وہ اپنے دوست جان اسٹوراٹ مل کے پاس گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ کتاب پر ایک غائر اور تنقیدی نظر ڈالے تاکہ تحریر میں اگر کوئی خامی، کوئی لغزش رہ گئی ہو تو دور ہو جائے مل نے وہ کتاب رکھ لی۔ وہ سرما کا بڑا شدید دور تھا، خوب برفباری ہوئی تھی اور غضب کی سردی تھی مل کسی کام سے گھر کے باہر گیا تو اس کی خادمہ نے جوان پڑھ تھی مل کا کمرہ گرم رکھنے کی غرض سے آتشدان میں آگ جلائی کوئلے اور لکڑی کی کمی ہو گئی تھی۔ مل کے کمرے میں رکھے سارے کاغذات آتشدان میں جھونک دیئے یہ کاغذات دراصل کارلائل کی کتاب تھی جنھیں خادمہ نے ردی کاغذات سمجھ کر یوں استعمال کرلیے تھے۔ کتاب جل کر خاک ہوگئی۔

مل کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو اسے زبردست صدمہ ہوا مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا اس نے کارلائل کو اس سانحے سے مطلع کیا جو دنگ رہ گیا بالآخر کارلائل نے اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے (ترجمہ)

"مجھے ایسا لگا جیسے میرے ان دیکھے استاد نے میری لکھی کتاب کو چاک چاک کردیا اور مجھ سے کہا برخوردار تم نے اس کتاب کے لکھنے میں پوری محنت نہیں کی ہے اس میں کئی غلطیاں ہیں جاؤ اور اسے دوبارہ لکھو"۔

بیوی کا غصہ اتر گیا تھا انھوں نے محسوس کرلیا کہ ایسا اللہ کے حکم سے ہوا ہے کچھ دنوں بعد انھوں نے کاغذ اور قلم پھر سے سنبھالا اور ایک شاندار ناول تحریر کیا۔

نلکی زادہ

نلکی زادہ ہوا ہے اک پیدا
منتظر ہم تھے اس خبر کے لئے
مشکل آسان ہوگئی سب کی
راستے کھل گئے بشر کے لئے
دورِ حاضر کی یہ حسیں ایجاد
کارآمد ہے خام زر کے لئے
لوگ جا جا کے اب خریدیں گے
قطرہ، زیست اپنے گھر کے لئے

شبنم کارواری

قطعاتِ "انکل"

غضب ہے ہوئے مہ جبینوں کے انکل
ستم ہے بنے نازنینوں کے انکل
ہمیں لفظ چاچا سے چڑ آگئی ہے
ہوئے جب سے ہم ان حسینوں کے انکل

لفظ چاچا تو ہے لقب اچھا
بس، میں کرنے کا ہے سبب اچھا
کوئی معشوق گر کہے انکل
پھر نہیں لگتا یہ ادب اچھا

انکل یہ لفظ سنگِ ملامت سے کم نہیں
معشوق گر کہے تو قیامت سے کم نہیں
یہ لفظ چھیڑ دیتا ہے احساس عمر کو
انکل کسی کو کہنا شرارت سے کم نہیں

سگار شات
سگار لکھنوی بمبئی

باعمل

رہنا ہے خوش جو تم کو تو ہوجاؤ باعمل
یہ سیدھا سادہ راستہ ہلا رہے ہیں ہم
اکبر ظریف جعفری ماچس کو پڑھ کے روز
ہردم غم حیات کو ٹھکرا رہے ہیں ہم

انور پانی پتی

قطعات

جانا ذرا سنبھال کے وہاں دل کی لوٹ ہے
شوہر کو اس منادی پہ غصہ اٹوٹ ہے
بیگم نے مسکرا کے کہا بار با مگر
اس شہر نو میں آنکھیں لڑانے کی چھوٹ ہے

O

عزت بٹوریئے نہ صداقت بٹوریئے
عالی جناب آپ نہ شہرت بٹوریئے
اس دور پر فتن میں اگر ہے بٹورنا
قائل جناب والا بس دولت بٹوریئے

ڈاکٹر شمیم ثریا
پرنسپل بی بی رضا کالج، گلبرگہ

ہم نے افسانہ لکھا

گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کی جانب بھاگتا ہے اور ہماری جو شامت آئی تو ہم نے افسانہ لکھا۔ نہ صرف لکھا بلکہ ایک مشہور ماہنامہ میں اشاعت کے لئے بھیج بھی دیا۔ شاید اس وقت ہمارے ستارے ٹھیک ٹھیک چل رہے تھے کہ مدیر نے افسانہ کو اشاعت کے لئے منتخب کرلیا۔ جب رسالہ کی کاپی ہمارے نام آئی تو بہ صد اشتیاق ہم نے اسے کھول کر دیکھا۔ واقعی ہمارا افسانہ بڑی شان سے اس میں جلوہ گر تھا۔ ہم نے تسلی کے لئے اس کو پڑھ ڈالا کہ واقعی بھی یہ شائع ہوچکا ہے تو انکشاف ہوا کہ بعض جگہ چند ایک جملے غائب ہیں اور بعض جگہ مکالمے کچھ اس طرح آگے پیچھے ہوگئے ہیں کہ مفہوم کچھ کا کچھ ہوگیا ہے۔ بہرحال ہمارا افسانہ شائع ہوچکا تھا اور ہم بھی اپنے آپ کو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگے تھے کہ اچانک لفافوں میں نامہ دیکھ کر ہم شش و پنج میں پڑگئے کہ آیا یہ ہماری ڈاک ہے یا ہماری بیٹی کی۔ سب سے پہلے اپنی ڈاک میں آیا ہوا ایک بھاری بھرکم لفافہ ہم نے کھولا۔ قریب آٹھ صفحے طویل مراسلہ تھا جس میں ایک قاری نے ہمارے افسانے کے ہر پیراگراف اور ہر سطر کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ تحریر سنوارنے کے کئی مشورے دینے کے بعد اپنے افسانے کی ایک نقل بھی رکھ دی تھی تاکہ اس کی روشنی میں ہم اپنے آئندہ افسانے لکھیں۔ شاید موصوف تنقید نگار تھے۔ سچ پوچھئے تو ان کے مراسلے کو پڑھنے کے بعد ہم اتنے مایوس ہوگئے کہ دوسرا خط کھولتے ہوئے بھی ہمیں ڈر لگنے لگا۔ اس لئے ہم نے ایک خوبصورت ہلکا پھلکا گلابی گلابی رنگت والا لفافہ منتخب کیا۔ کھولتے ہی ہلکی سی خوشبو پھیل گئی جس سے ہمارے مشام جان معطر ہوگئے اور وہ جو اک ناگوار سی کیفیت ہم پر چھائی ہوئی تھی دور ہوگئی۔ تحریر تھی کہ حروف میں ڈھلے ہوئے موتی۔ لکھنے والے نے ہمارے افسانے کی تعریف بلکہ قصیدے میں زمین و آسمان کے قلابے ملادیئے تھے اور ہم جو ابھی ابھی پہلا خط پڑھ کر اپنے آپ کو انتہائی نااہل اور بحر ادب کا ناتجربہ کار شناور سمجھ رہے تھے یکایک ہوا میں اڑنے لگے بلکہ افسانوی ادب میں ہمیں اپنے سوا کوئی اور نظر نہ آنے لگا۔ ایک اور صاحب نے ہم سے ان کے رسالے کے لئے فوری ایک افسانہ بھیجنے کی خواہش کی تھی اس اعتراف کے ساتھ کہ ہمارے افسانے کے

بغیر ان کا پرچہ ادھورا ہے۔ ایک دوسرے صاحب نے لکھا کہ وہ ہمارا قلم چومنا چاہتے ہیں۔ ہم نے انھیں اپنا قلم پارسل کردیا کہ لیجئے جناب! اسے چومئے یا لالی پاپ کی طرح چاٹیئے ہم نے تو اس سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔ ایک اور صاحب نے ہم سے ہماری تصویر مانگی ہے کیونکہ وہ افسانہ نگاروں سے قلمی دوستی کے شوقین ہیں اور بقول ان کے یہ دوستی ایک عدد رنگین تصویر کے بغیر ادھوری ہے۔ سب سے دلچسپ خط تو ایک مولوی صاحب کا تھا کہ جنھوں نے مذہب و شریعت کی روشنی میں افسانے کا جائزہ لینے کے بعد یہ مشورہ دیا کہ ہم اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے ہوں تو عورت کی آزادی کو ہرگز افسانوں کا موضوع نہ بنائیں بلکہ عورت کو مرد کی دوسری، تیسری یا چوتھی بیوی بن کر رہنے کی ترغیب دیں۔ پس نوشت میں یہ درج تھا۔

"میری بیوی کا انتقال ہوچکا ہے۔ دونوں بچوں کی شادیاں ہوگئی ہیں۔ اب بالکل تنہا ہوں۔"

ایک اہم بات ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ ہمیں جتنے خطوط موصول ہوئے تھے زیادہ تر مرد قارئین کے تھے۔ خواتین کا تناسب آٹے میں نمک برابر تھا یعنی دس خطوط میں دو خواتین کے تھے۔ ایک نے لکھا تھا کہ ہمارا افسانہ اس کی زندگی کی ہو بہو تصویر ہے اور دوسری نے لکھا تھا کہ وہ عنقریب اپنا افسانہ ہمیں بھیجیں گی تا کہ ہم اپنے سفارشی خط کے ساتھ اسے ایڈیٹر کو بھیج سکیں۔

خطوط کے علاوہ ہماری معمول کی زندگی پر بھی افسانہ کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ وہ اشخاص جو ہمارے علمی و ادبی مضامین اور تحقیقی مقالے پڑھ کر ہماری قابلیت سے مرعوب اور سنجیدگی سے محتاط رہا کرتے تھے اب بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگے اور افسانے کے تناظر میں ہماری زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو ٹٹولنے کی فکر میں لگ گئے۔ ایک مشہور افسانہ نگار تو بار بار اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کی داستان ہمیں سنانے لگے۔ شہر کی ادبی نشستوں میں ہمیں مدعو کیا جانے لگا بلکہ ہمارے افسانوں کے بغیر ادبی جلسے روکھے پھیکے سمجھے جانے لگے۔ ہم نے بھی وہ تمام افسانے جو کچی عمر اور زمانہ طالب علمی میں لکھ رکھے تھے ایک ایک کر کے سنا دیئے اور خوب داد بٹوری کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایکبار کوئی شخص شہرت حاصل کرے تو اس کی گھٹیا اور غیر معیاری تخلیق بھی ادب میں اضافہ ہی سمجھی جاتی ہے۔

یہ تو ہوئی خطوط اور گھر سے باہر کی بات ہماری افسانہ نگاری سے گھر کے پرسکون ماحول میں بھی اضطراب پیدا ہوگیا۔ ایک فرماں بردار بہو مخلص بیٹی اور شفیق ماں کی جگہ ہمیں ایک "باغی عورت" کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ سسرال والے جو ہماری خدمتوں سے گرویدہ تھے کترائے کترائے رہنے لگے کہ کہیں اپنے کسی افسانے میں ہم ان کی ناانصافیوں کی روداد نہ لکھ ڈالیں۔ بیٹی الگ ہم سے ناراض ہے کہ کہ ہمیں کیا سوجھی جو اچانک خاتون خانہ سے خاتون محفل بن گئے ہیں۔ دوست رشتہ دار طنزیہ کہنے لگے ہیں کہ اگر افسانوں سے فرصت ہو تو ہم انھیں بھی یاد کرلیا کریں۔ غرض۔

ایک افسانے کے پیچھے ہی ہوئی یہ صورت
کہ چھپاتے نہیں بنتی ہمیں اپنی صورت

اب ہم اس گھڑی کو کوس رہے ہیں جب ہمارے ہاتھ۔۔ نہیں نہیں۔۔ ہمارے دماغ میں کھجلی ہوئی تھی کہ ہم بھی افسانہ لکھ سکتے ہیں جس کی وجہ ہماری اچھی خاصی پوزیشن خطرے میں پڑگئی ہے۔ اب آپ ہی مشورہ دیجئے کہ ہم کیا کریں۔

ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم
۱۰۳-۶-۵ محبوب پورہ
پوسٹ آفس ۔ جگتیال۔ ۵۰۵۳۲۷ (اے۔پی)

حلال منافع کمائیے

آج کے پر آشوب دور میں حلال آمدنی کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں ایسے میں حلال منافع کمانا کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مہنگائی در مہنگائی کے دور میں زندگی گزارنے کے لیے آمدنی کا تصور محال ہے۔ آمدنی سے کچھ حصہ بچاکر (جو بیوی سے چھپاکر رکھا جاتا ہے) تجارت میں مشغول کرنا اور پھر حلال منافع کمانا ہر ایک کی بس کی بات نہیں ہے اب بھی ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اگلے زمانے کے لوگ دو چار بیویوں اور دس بارہ بچوں کے ساتھ ایک ہی آمدنی میں گزارا کیسے کرتے تھے؟ اب تو حال یہ ہے کہ ایک عدد بیوی اور دو عدد بچے ہی گھر کے فرد کی کمر توڑ دیتے ہیں۔ یقیناً اس کے پیچھے حکومت کی کوئی نہ کوئی چال پوشیدہ ہے چوں کہ فیملی پلاننگ کا نعرہ کامیاب نہ سہی ناکام بھی نہیں ہے۔ اس لیے حکومت نے سوچا کہ کیوں نہ لوگوں کو مہنگائی کے طوفاں سے آشنا کردیں تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری! اس لیے آج کل شادیاں نہ صرف دیر بلکہ بہت دیر سے ہو رہی ہیں بلکہ اولاد کے معاملے میں انسان نہایت کنجوس ہوتا جارہا ہے ایک دو سے بات آگے بڑھتی ہی نہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر شیریں فرہاد آج بھی زندہ ہوتے اور فرہاد شیریں سے واقعی شادی کا خواہش مند ہوتا تو یقیناً اس کے آگے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے کے بجائے حلال آمدنی کمانے کی شرط رکھی جاتی اور فرہاد اس شرط کو کبھی پورا نہیں کر پاتا کیوں کہ اس آمدنی میں وہ اپنی محبوبہ کے ناز و نخرے کیا اٹھا پاتا۔ آج کے ہائی ٹیک دور میں پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنا آسان ہے مگر حلال آمدنی سے محبوبہ کو راضی بہ رضا رکھنا یا بیوی کو خوش و خرم رکھنا تقریباً محال ہے۔

وہ زمانہ گزر گیا جب لوگ حلال روٹی کھاتے اور حق کے گیت گاتے تھے ان کی دعائیں اس قدر جلد مقبول ہوتی تھیں جیسے آج رشوت قبول کی جاتی ہے آج کے انسان کا رواں رواں ناجائز آمدنی میں ڈوبا ہوا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ کچھ دانشور اپنی بیٹی کا رشتہ اس نوجوان سے طے کرنے میں شرم محسوس کرتے ہیں جو صرف تنخواہ پر گزارا کرتا ہے ان کا خیال ہے تنخواہ تو چائے پانی کے لیے ہوتی ہے۔ کھانے پینے اور اوڑھنے پہننے کے لیے

آمدنی ضروری ہے۔ اس لیے بہت سے نوجوان جو تنخواہ پر گزارا کرتے ہیں اکثر کنوارے ہی نظر آتے ہیں (سیاسی قایدین اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں) یہ نوجوان اپنی آمدنی بڑھانے کی تگ و دو کرتے ہیں یا پھر اپنی عمر بڑھاتے رہتے ہیں۔

شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد جہاں تہذیب و تمدن کی ندیاں بہتی ہیں۔ قومی یکجہتی کے فوارے پھوٹتے ہیں اور رواداری و اخوت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود ہے وہیں کبھی کبھی منہ کا مزا بدلنے کے لیے دنگا فساد بھی ہوجاتا ہے۔ایسا خوبصورت شہر جو آج کل ہائی ٹیک شہر کے نام سے مشہور ہے حتیٰ کہ یہاں کے ڈرینج بھی ہائی ٹیک ہیں تبھی تو وہ اُور فلو ہوکر ایک دوسرے کو اُور ٹیک بھی کرتے ہیں۔ ایسے شہر میں حلال تجارت و حلال منافع کی کئی ایک دوکانیں کھل گئی ہیں۔ کوئی چالیس فیصد سے زائد حلال منافع دینے کا وعدہ کرتا ہے تو کوئی پیسوں کے درخت اگاکر لوگوں کو اکٹھا کرتا ہے کہیں میجک سائنس کا سہارا لیا جاتا ہے تو کوئی فکسڈ ڈپازٹ کی انوکھی اسکیمیں پیش کرکے پیسہ بٹورتا ہے۔ غرض کہ ہر طرف حلال منافع کی گونج سنائی دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے شہر میں حلال منافع کی کوئی مشین ایجاد ہوگئی ہو ادھر بٹن دبایا ادھر حلال منافع حاضر۔

ہم ہندوستانیوں کی خوبی یہ ہے کہ ہم دل و جان سے اپنے مذہب کو چاہتے ہیں اس سے بڑھ کر خوبی یہ ہے کہ ہم خود مذہبی اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہوتے ۔ جب سرمایہ داروں نے "حلال منافع" کا اعلان کیا تو اہل ایمان کا ایمان جوش میں آگیا اور ہر کوئی حلال منافع کا خواہش مند نظر آنے لگا۔ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی خواہش میں کسی نے اپنا گھر بیچ کر سرمایہ کو ان دوکانداروں کے حوالے کردیا۔ کسی نے بیٹی کی شادی کی رقم اس تجارت میں لگادی تاکہ دو بیٹیوں کا جہیز خریدا جاسکے بہت سوں نے انکم ٹیکس سے بچنے کےلیے اپنے سرمائے کو ان سرمایہ داروں کے حوالے کردیا جو سلیقے سے تجارت کرنا بھی نہیں جانتے نتیجہ سب کے سامنے ہے حلال منافع کی آس میں ان لوگوں نے غریبوں کو حلال کردیا اس سلسلے میں ہمیں ایک قصہ یاد آرہا ہے جسے ایک ماہر ادبیات وغیر ادبیات نے ہمیں سنایا ۔آپ بھی سنیے گا اور سر کھجائیے گا۔

ایک شہر میں ایک تاجر رہا کرتا تھا اس کی بڑے بڑے لوگوں سے جان پہچان تھی ۔ لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے کچھ لوگ اپنا پیسہ بطور امانت اس کے پاس رکھا کرتے تھے ایک بھولے شاہ نے اشرفیوں سے بھرا ہوا دیگچہ بطور امانت تاجر کے حوالے کیا کچھ دن گزر گئے۔ تاجر نے بھولے شاہ کو بلایا اور ایک دیگچی جس میں دوچار اشرفیاں تھیں دیتے ہوئے کہا مبارک ہو۔ تمہارے دیگچے نے یہ بچہ پیدا کیا ہے۔ اس پر تمہارا ہی حق ہے بھولے شاہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر سوچا کہ مفت میں دیگچی مل رہی ہے اسے کیوں ٹھکراؤں اور وہ خوشی خوشی چھوٹی سی دیگچی کو گھر لے گئے۔ کچھ دنوں بعد تاجر نے پھر بھولے شاہ کو بلایا اور کہا کہ مبارک ہو آپ کے دیگچے نے ایک اور دیگچی کو جنم دیا ہے۔ بھولے شاہ نے تاجر کا شکریہ ادا کیا اور دوسری دیگچی کو بھی گھر لے آئے ۔ کچھ دنوں تک یہی مراحل طے ہوتے رہے ایک دن بھولے شاہ کو پیسے کی ضرورت آن پڑی انہوں نے تاجر سے کہا براہ کرم مجھے میرا دیگچہ واپس دیجئے مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ تاجر نہایت غمگین بیٹھا ہوا تھا۔ اداس لہجے میں کہا کہ اچھا ہوا تم آگئے میں تمہیں ہی بلانے والا تھا بھولے شاہ نے خیریت پوچھی تو تاجر نے کہا کہ

کل رات کو ہی تمہارے دیگچے کا انتقال ہوگیا ہے اور اس کی آخری رسومات بھی ادا کردی گئیں یہ سنتے ہی بھولے شاہ آگ بگولہ ہوگئے اور تن کر کہا "کہیں دیگچے کا بھی انتقال ہوتا ہے ۔" بہرحال یہ معاملہ قاضی، شہر کے سامنے پیش ہوا ۔ اس نے دونوں طرف کے حالات سنے اور بھولے شاہ سے کہا ۔

"تم جیسے بیوقوفوں کی یہی سزا ہے جب دیگچہ کو بچے پیدا ہوتے رہے تو تم نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ مفت کا مال ہڑپ کرتے رہے ۔ اب دیگچے کا انتقال ہوگیا ہے تو تم اس کی موت کے قائل نہیں ہو ؟ جاؤ بے کار بحث میں وقت ضائع نہ کرو جب دیگچہ بچے پیدا کر سکتا ہے تو وہ مر بھی سکتا ہے ۔ تمہیں اس کی موت کو قبول کرنا چاہیئے ۔" ـــ سچ تو یہ ہے کہ آج شہر میں بہت سے لوگ اپنے دیگچوں کی موت کا غم منا رہے ہیں ـــ!

کوئی اور ہے

نیاز سواتی

مجھے پیار ہے کسی اور سے، مجھے چاہتا کوئی اور ہے
میں ہوں گھورتا کسی اور کو، مجھے گھورتا کوئی اور ہے

جو تھا کام اس کا وہ کر دیا، تو یہ کہہ کے مجھ سے وہ چل دیا
ترا راستہ کوئی اور ہے، مرا راستہ کوئی اور ہے

کیا کام جب کہا، "شکریہ" مجھے اس پہ بابو نے یہ کہا
یہ جو شکریہ ہے یہ پاس رکھ، کہ مرا صلہ کوئی اور ہے

تجھے جس کی ملتا ہے وہ سزا، نہیں اصل میں وہ تری خطا
تری جان لیتا ہے جس لئے، وہ تری خطا کوئی اور ہے

نہیں اب تمیز رہی کوئی، نہ حلال اور نہ حرام میں
میں درخت ہوں کسی اور کا، مجھے کاٹتا کوئی اور ہے

یہ سمجھ کے میرا وہ دوست ہے، میں نے اس کی ٹوپی اتار دی
میں خجل ہوا ہوئی جب خبر، سر رہ کھڑا کوئی اور ہے

اسے میں نے سوہنا جب کہا، تو وہ میرے پیچھے ہی پڑ گیا
نہیں وہ جو اس نے سمجھ لیا، مرا مدعا کوئی اور ہے

انہیں کہہ رہا ہے جو ایک سا، یہ روش نہیں ہے تری بجا
ترا واقعہ کوئی اور ہے، مرا واقعہ کوئی اور ہے

یہ بھی کہ مکا کا کمال ہے، کہ یہ کاروبار کا حال ہے
جو پلاٹ ہے کسی اور کا، اسے بیچتا کوئی اور ہے

مجھے دے رہا ہے جو تو دوا، مجھے اس سے کیسے ملے شفا
کہ مرا مرض کوئی اور ہے، کہ مری دوا کوئی اور ہے

پانی کا نلکا

ہزاروں بار بھی چکر لگاؤ تم ٹیکنی کے
تو پانی پھر بھی نلکے میں باآسانی نہیں آتا
لگایا ہے جو نلکا بلدیہ نے گھر میں پانی کا
ہوا تو اس میں آتی ہے، مگر پانی نہیں آتا

سوکن

میں نے گھر والی کی جب پوری کی فرمائش، نیاز!
بھٹ دعا دی اس نے، جنت آشیانہ ہو ترا
جب کہا میں نے، وہاں مجھ کو ملے گی حور بھی
جل کے وہ بولی کہ پھر دوزخ ٹھکانہ ہو ترا

مجید عارف نظام آبادی
۲۰/ ۱۵۹۔ ۱۷۔ ۹ ہاشمی کالونی نظام آباد

کچھ باتھ روم کے بارے میں!

ہمارے قارئین میں سے جو کبھی نہائے ہیں یقیناً وہ باتھ روم کے بارے میں واقفیت رکھتے ہونگے ۔ یہ الگ بحث ہے کہ جدید طرز تعمیر نے ہمارے صحنوں کو نگل لیا ہے کشادہ صحن ہی نہیں رہے ہیں ۔ اس کی جگہ کشادہ باتھ روم وجود میں آگئے ہیں ۔

پہلے لوگ "آسائش و زیبائش" کے لئے ڈرائنگ روم کی طرف توجہ دیتے تھے اب باتھ روم کو دینے لگے ہیں ۔ دوستو ! یہ حقیقت ہے کہ جس صاحب خانہ کا باتھ روم جتنا زیادہ کشادہ ہوگا اس کی سیاسی ، سماجی ، و ثقافتی حیثیت اتنی ہی بڑھ جاتی ہے ۔ اپنے Social Status کو اونچا کرنے کے لئے ایسے لوگ دیگر کمروں کے بجائے باتھ روم میں رہنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں ۔ بلکہ مرزا تخیل بیگ آنسو کے مطابق ساری زندگی باتھ روم میں ہی گزار دیتے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ انہیں کبھی بھی فون کریں جواب یہی آئیگا کہ "صاحب باتھ روم میں ہیں ـــ "

آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ کچھ لوگ تو اٹھتے بیٹھتے باتھ روم میں گرنے کی دعائیں مانگا کرتے ہیں کیونکہ اگر یہ باتھ روم میں پھسل کر گر جائیں تو اخبارات کے ذریعہ ان کی شہرت میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور ان کی سیاسی حیثیت مسلمہ قرار دی جاتی ہے اس طرح باتھ روم کا ایک راستہ بھی ہے جو اقتدار تک جاتا ہے ۔

رہا عام آدمی تو اس کی حیثیت کیا؟ باتھ روم میں گنگناتے ہوئے نہانے کی سہولت آج بھی اسے میسر ہے ۔ رہی ڈانس کی بات تو یہ مسرت دل میں ہی رہ جاتی ہے چونکہ باتھ روم اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرتا ہے ۔ مختصر باتھ روم کی وجہ سے تو غریبوں کو کھل کر صابن لگانے کی بھی توفیق نصیب نہیں ہوتی ہے ۔ شاید ایسے ہی موقع پر کسی نے خوب کہا ہے کہ ننگا نہائے کیا نچوڑے کیا ـــ ؟؟

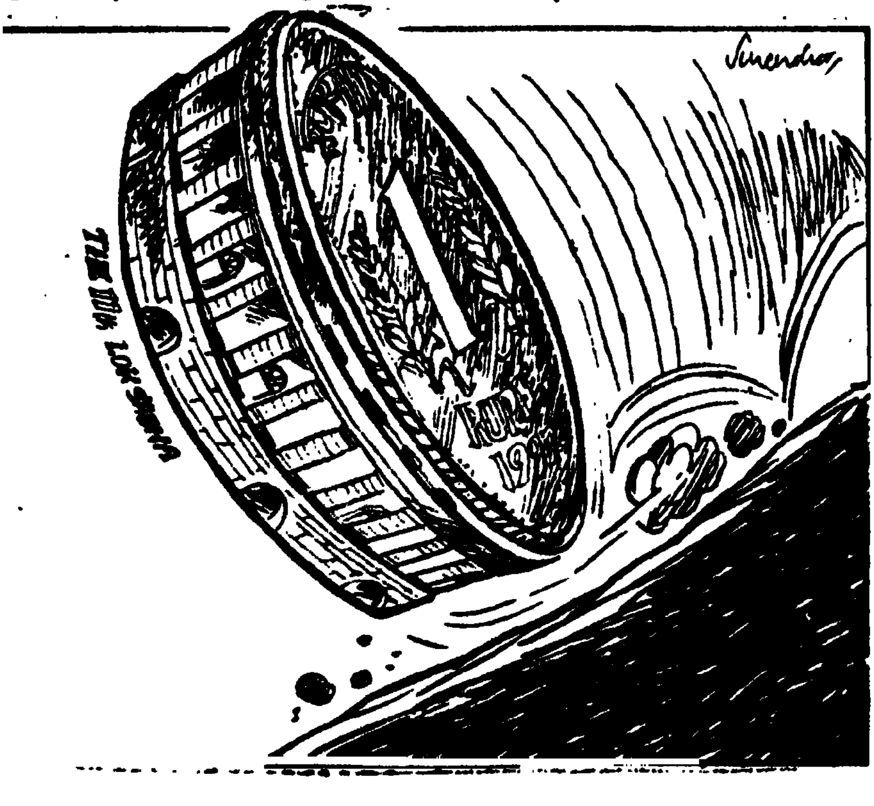
باتھ روم ایک ایسی جگہ ہے جہاں انسان دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر راحت و سکون کے لمحات تلاش کرتا ہے اور باتھ روم سے ترقی کر کے ہی ایک سنگر فلم اسٹوڈیو کے ریکارڈنگ روم تک جاتا ہے ۔ کچھ سنگرز آج بھی نہاتے

اس لیئے ہیں کہ چلو اس بہانے " ریاض " ہو جائیگا۔

باتھ روم کا تعلق چونکہ نہانے سے ہے اس لیئے کچھ لوگ اس کے بغیر ہی زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے لئے نہانا انتہائی مشکل ترین امر ہوتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہانے کے بہانے تلاش کرتے ہیں اور کچھ اس طرح نہاتے ہیں کہ باوجود انتھک محنت کے ان کی رنگت گوری نہیں ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو لوٹے بھر پانی میں نہانے کا ہنر جانتے ہیں اور کچھ لوگ تو پانی کا بنیادی مقصد نہانا اور صرف نہانا سمجھتے ہیں۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجیئے کہ آپ کا شمار کن افراد میں ہوتا ہے وہ جو ہفتہ میں ایک بار نہاتے ہیں یا وہ جو ہر مہینے کی پہلی کو باتھ روم کا رخ کرتے ہیں یا پھر عیدین کے موقعوں پر جنہیں نہانے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ اب کیا کیا جائے ۔۔۔ ؟؟ بعض تو بارش میں بھیگنے کو نہانے کا نعم البدل سمجھتے ہیں ۔۔۔ کہیں آپ بھی ؟؟

اس سلسلہ میں جب ہم نے کچھ لوگوں کو توجہ دلائی تو فرمانے لگے کہ ہماری حکومت پینے کے لئے معقول پانی سپلائی کرنے سے قاصر ہے ۔۔۔ نہانے کے لئے کہاں سے لائیں ۔۔۔ ؟؟ اس معقول دلیل کو سن کر ہم بھی شرم سے پانی پانی ہوگئے ۔۔۔ اب وہ دن بھی دور نہیں جب بینے کے پانی کو لوگ معقول مقدار میں پانچ سال کے لئے کسی WATER BANK میں جمع کروا دینگے تاکہ ڈبل ہو جائے۔ حکومت کو چاہیئے کہ آئندہ WATER BANK کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر معقول منصوبہ بندی کرے۔ انسان کی اس بنیادی ضرورت کو نظرانداز کرنے والی حکومتیں چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کے قابل بھی نہیں رہتیں آپ کا کیا خیال ہے ؟؟؟



یہ میزباں کیسے کیسے!

ہاشم سید محمد بن قاسم، ریاض

باذوق قارئین کی تواضع کے لیے ایک پُرلذّت، چٹپٹی تحریری ڈش

ایک صاحب اپنے دوست کے ہاں گئے تو میزبان نے ان کے سامنے چھولے وغیرہ رکھے۔ اس تواضع کے دوران وہ اپنے مہمان کو بار بار مجبور کرتے، "یار کچھ اور چھولے لو، تم تو کچھ کھا ہی نہیں رہے"، وغیرہ۔ مہمان ان کے اس اصرار کو کچھ دیر برداشت کرتا رہا، اور چند لقمے زہر مار کرنے کے بعد بولا، "بھئی میں تو تمھارے تیار کیے ہوئے یہ چھولے چنے کھارہا ہوں، مگر تم بھی میرا ساتھ دو، اور کچھ کھاؤ"۔ اس پر وہ میزبان دوست بے ساختگی سے گویا ہوئے، "یار یہ چھولے تو تم ہی کو مبارک ہوں، ورنہ یہ بھی کوئی انسانوں کے کھانے کی چیز ہے"۔ ان کے دل کی بات زبان سے ادا ہوچکی تھی اور کمان سے نکلا ہوا یہ تیر اب واپس نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ اس مکالمہ کے بعد کیا دلدوز واقعات پیش آئے ہوں گے، اس کا اندازہ لگانا تو آپ کے لیے بھی چنداں دشوار نہ ہوگا، اور یہ تو طے ہے کہ وہ مہمان ایسے چھولے چنے کھانے کے بعد اپنے میزبان کے گھر سے بلبلاتے اور ہنہناتے ہوئے کسی تیز رفتار گھوڑے کی طرح فراٹے بھرتے ہوئے ہی نکلا ہوگا۔

دنیا کے ہر کونے، اور ہر ثقافت اور معاشرت میں گھر آئے مہمان کی عزّت اور خاطر تواضع کرنے کے بارے میں غلو آمیز رسم و رواج پائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "آمدن بارادت و رفتن باجازت"۔ برصغیر میں یہ وہم بھی عام ہے کہ اگر گھر کے صحن کی منڈیر پر کوّے بھیّا آکر کائیں کائیں کریں تو اس روز کوئی من پسند شخص ضرور مہمان بنے گا۔ اگرچہ یہ بحث کی جاسکتی ہے کہ موجودہ مہنگائی کے دور میں روایتی مہمان نوازی صاحب ثروت لوگوں کے ہی بس کی بات رہ گئی ہے۔ یا یہ کہ واقعی کچھ مہمان، بلائے جان بھی ثابت ہوتے ہیں، جو اپنے میزبانوں کے روز و شب کے جائز آرام و راحت کے بارے میں قطعی لاپرواہ رہنا پسند کرتے ہیں، اور کہیں آنے جانے پر اپنے بچّوں کو میزبان کے ہاں تمام اٹھا پٹخ، توڑ پھوڑ، اور اودھم مچانے کی وہ "خاموش تکنیکی اجازت" دے دیتے ہیں جس کا ان بچّوں کو اپنے گھر میں موقع نہیں دیا جاتا، اور اس محرومیت کی تلافی کا صرف یہ ہی موقع ملتا ہے۔ آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ، دراصل، مہمان نوازی بھی ایک سماجی فن ہے، جس میں، اپنی نیک نیتی کے باوجود، ہر شخص یا خاندان ید طولیٰ نہیں رکھتا۔ اگرچہ کچھ بے تکلف دوستوں میں اس قسم کی بھی مکالمہ بازی ہوتی ہے کہ "یار تم کھانا کھا کر آئے ہو یا جا کر کھاؤ گے؟"، مگر، کسی گھر آئے ہوئے مہمان کا مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کر استقبال کرنا، حال احوال پوچھنا، ہر ممکن تواضع کرنا، اور رخصتی کے وقت اسے دروازہ تک جاکر خداحافظ کہنا ہمارے معاشرے کی وہ کلاسیکی

اور سنہری روایات ہیں جن پر عمل کرنے والے خوش اخلاق کے اعلیٰ درجات کے حامل کیے جاتے ہیں۔ پاکستان کے مرحوم صدر ضیاء الحق اس معاملہ میں ازحد انکسار روا رکھتے۔ وہ پاکستان کے اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود اپنے مہمانوں کا تمام تر مشرقی روایات کے ساتھ استقبال بھی کرتے، اور ان کی ازحد دل جوئی اور خاطر تواضع کرنے کے بعد انھیں چھوڑنے دروازے تک بھی جاتے۔ ان سے ملنے جلنے والے اس حسن اخلاق پر نہ صرف متعجب ہوتے بلکہ وہ اپنی عزت نفس کے اس درجہ خیال رکھنے پر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

آپ نے "نیبو نچوڑ" کا قصہ تو سن رکھا ہوگا۔ ایک شخص کا دستور تھا کہ وہ سرائے میں آنے جانے والے مسافروں کے دسترخوان پر نظر رکھتا۔ کھانا لگتے ہی وہ اپنے ہمراہ ایک عدد نیبو لے جاکر اس مسافر سے کہتا کہ "حضرت، یہ نیبو آپ کے طعام کا زبردست جوڑ ہے، اسے نچوڑ کر اپنے کھانے کا لطف دوبالا کیجیے۔ اور مسافر بے چارہ مروّت میں نیبو لے کر اس شخص کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دے دیتا۔ اس طرح یہ نیبو نچوڑ صاحب، مان نہ مان میں تیرا مہمان، اپنی پیٹ پوجا کر کے دسترخوان، اور اپنا منہ صاف کرتے، مونچھوں پر تاؤ دیتے چلے آتے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اس قسم کے نیبو نچوڑ نہیں ہم تو پیاری پشتو زبان کی اس مثل کے قائل ہیں، "پیاز دوی پہ نیاز دوی" (پیاز ہو مگر نیاز کے ساتھ)۔ کہیں آنے جانے میں خاصی احتیاط کیا کرتے ہیں۔ تاہم، اپنے مشاہدے میں آئی ہوئی چند لذیذ حکایات، آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں کا خوان آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

سعودی عرب حاتم طائی جیسے سخی اور مہمان نواز شخص کا مسکن رہا ہے، جس نے ایک روز ضرورت پڑجانے پر ایک مہمان کے سبب اپنے عزیز ترین گھوڑے کو بھی ذبح کردیا تھا۔ آج بھی سعودی عرب کو ہر برس لاکھوں عازمین حج و عمرہ کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ پھر بھی یہاں مقیم کچھ خاندانوں میں کسی بن بلائے مہمان کا اچانک آجانا کسی مصیبت کے پہاڑ کے ٹوٹنے، اور ایک حادثہ سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ ایسے مہمان کو کسی نہ کسی طرح یہ جتلایا جاتا ہے کہ اس کا اچانک آجانا کسی دہشت گردی یا دراندازی سے کم نہیں۔ چنانچہ پھر اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے جو کسی دہشت گرد کے شایانِ شان ہوسکتا ہے۔ ایسے خاندانوں میں انفرادی مہمان نوازی سے ہر ممکن گریز کرنے کے لیے اپنے ہم خیال حلقہ، میزبان کے ساتھ گھروں کے باہر ہی "ون ڈش" پارٹیوں کا اہتمام کرلیا جاتا ہے۔ شاید ایسی دعوتوں کے لیے ہی یہ محاورہ گھڑا گیا تھا کہ، "ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آئے"۔ "فون کرکے آئیے گا"، ایسے بااخلاق افراد کی جانب سے وہ کھٹی میٹھی دھمکی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے آپ ان کے گھر جاتے خود ہی کتراتے ہیں۔ اور جب کبھی مجبوراً آپ انھیں فون بھی کر بیٹھیں، تو ان کی جانب سے کچھ ایسی درد بھری کہانی اور فوری طور پر باہر جانے کا ہنگامی پروگرام سننے میں آتا ہے کہ نہ صرف آپ اپنی حالت زار پر بھی خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، بلکہ آپ کو ان سے مزید ہمدردی ہوجاتی ہے، اور آپ انھیں گزشتہ موقع کی طرح ایک بار پھر جلد از جلد اپنے گھر آنے کی دعوت دے دیتے ہیں۔ ہمارے ایک ایسے جاننے والے بھی ہیں جو بڑے کھلے دل اور میٹھی زبان سے اپنے گھر آنے کا کہتے ہیں۔ "یار آج بعد نماز عشاء آجانا، اور ہاں، کھانا ہمارے ساتھ ہی کھانا۔ دیکھو ہم منتظر رہیں گے۔" ہم جب ایک شانِ بے نیازی سے دعوتِ شیراز اڑانے ان کے گھر جاتے ہیں تو وہ مجلس عارفانہ کے ایک نمائندہ نمونہ میں ڈھل جاتے ہیں۔ کچھ دیر بیٹھنے

اور ان کا منہ دیکھنے کے بعد ہم ایک "مہمانِ بے نیاز" کا مجسمہ بنے ہوئے بدھو بن کر گھر کو لوٹ آتے ہیں۔ اس خیال سے کہ کہیں ان کا نازک دل ٹوٹ نہ جائے، ہم انھیں یہ بھی یاد نہیں دلاتے کہ ہم تو آپ کی دعوت پر ہی براجمان ہوئے ہیں۔ ہاں اس روز گھر آتے ہوئے قریبی ہوٹل سے کھانا لینا نہیں بھولتے۔ شروع میں تو ہم یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتے رہے کہ یہ صاحب ہمارے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک کیوں کرتے ہیں۔ آخر ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ کئی بار ایسے تجربات ہونے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ ہمارے ان بے نیاز میزبان کا تو یہ تکیہ کلام ہے، "یار آج تو تم ہمارے۔۔۔۔" ۔ وہ دراصل اس مقولہ پر عمل پیرا رہتے ہیں کہ "گڑ نہ دے پر گڑ جیسی بات تو کرے" ۔ نہ جانے ان کے اور کتنے دوست اس عملی مذاق کا نشانہ اور خیالی دسترخوان کے مہمان بنتے ہوں گے۔ مزے دار امر تو یہ ہے کہ وہ اور ان کی بیگم اکثر ایسی دعوتیں بالاصرار ٹیلیفون پر ہی دیا کرتے ہیں۔ ایسے دو چار سانحات کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ دراصل ان کی جانب سے یہ سب ٹیلیفون پر طویل گپ بازی کے دوران چٹپٹے موضوعات کے فقدان کا نتیجہ ہوتا ہے، جب کوئی اور بات نہیں سوجھتی، تو ٹیلیفونی مکالمات کی ٹانگ اور پائے اسی کھوکھلی دعوت اور صلائے سمرقندی پر ٹوٹا کرتے ہیں۔

ہمارے ایک اور واقفِ کار ہیں۔ وہ اور ان کے اہلِ خاندان کسی بھی مہمان کے پہنچتے ہی بڑے خلوص کے ساتھ دسترخوان پر ہمہ قسم کے خوان چن دیتے ہیں۔ مگر وائے قسمت، ابھی مہمان حضرات ہاتھ میں خالی پلیٹ لیے ہوئے خوانوں پر دزدیدہ نظریں ڈال رہے ہوتے ہیں کہ میزبان اور ان کے مستقبل کے بے شمار چشم و چراغ اس ہفت خوان کو دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر جاتے ہیں۔ اس دوران اس قسم کے جملے سننے میں آتے ہیں: "واہ بھئی واہ، ممی کی اس کا جواب نہیں یہ دہی پھلکیاں کس قدر غضب کی بنائی ہیں، لیجیے صاحب، آپ تو تکلف کر رہے ہیں، کچھ لے ہی نہیں رہے۔ لگتا ہے کہ آج لنچ کچھ زیادہ کھا کر آئے ہیں، منے میاں ذرا یہ سموسے تو آگے بڑھانا، واہ مزا آگیا، کیا چٹپٹے مصالحہ والے ہیں، یہ تلے چکن، واہ واہ، اور یہ سویوں کا مزعفر تو فردوس بریں سے آیا لگتا ہے۔۔" ہم ان کی میز پر اب تک نظر انداز کیے گئے ٹھنڈے پانی کے گلاس پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ "واہ جی واہ، اس یخ بستہ پانی کا تو جواب نہیں۔ اس شدید گرمی میں یہ آبِ کوثر سے کم نہیں۔" اسی طرح ہمارے ایک اور مہربان ایسے بھی ہیں کہ وہ وقت دے کر گھر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ جب ہم ان کے انتظار میں کھلے آسمان تلے کھڑے تارے گن رہے ہوتے ہیں، وہ اور ان کے بیوی بچے اپنے حلق سے معدہ تک ٹھنسے ہوئے گرما گرم پیزا کے چٹخارے اور ڈکار لیتے، بچے کھچے پیزا کے کارٹن بغل میں دبائے اپنی کار میں سے برآمد ہوتے ہیں، اور غاؤں غوں کرتے، معذرت کرتے، ندامت سے آنکھوں سے کم از کم اس رات کے لیے فوری طور پر شب بخیر کہنے میں دیر نہیں کرتے۔

صفِ اول کے ایک پاکستانی قلم کار جناب قمر علی عباسی نے اپنے ایک پُر مزاح سفرنامہ، "امریکہ مت جئیو" میں چند ایسی دعوتوں کا تذکرہ کیا ہے جو امریکہ میں رہتے ہوئے ان کے اعزاز میں صرف اس لیے دی گئیں کہ گھر کے ڈیپ فریزر میں ہفتوں سے جمع شدہ بچے کھچے کھانوں، یا جلد ہی میعاد ختم ہونے والے پکے پکائے کھانوں کے پیکٹوں وغیرہ کی صفائی مقصود تھی۔ تو ہمارے ایک ایسے دوست یہاں بھی موجود ہیں۔ وہ دعوت دے کر میز پر ایسے کھانے چن دیتے ہیں جو گزشتہ چند ہفتوں سے تھوڑی تھوڑی مقدار میں بچ کر پلاسٹک کے ڈبوں کی زینت بنتے رہے تھے۔ تھالی پیٹ بھرنا تو کجا، کسی ایک کھانے کا بھی سواد نہیں ملتا۔ کتنے

زمانوں میں شاید مغلئی دسترخوان، اپنی مقدار سے صرف نظر، ایسے ہی متنوع ہوا کرتے ہوں گے۔

جب میزبانوں کا تذکرہ ہو رہا ہو تو اسمارٹ فضائی میزبانوں کو کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔ ہوائی سفر کے دوران مسافروں کی دیکھ بھال اور خاطر تواضع کے لیے دنیا بھر کی ہوابازی کی کمپنیاں نک سک سے درست اور تربیت یافتہ عملہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے رکھا کرتی ہیں۔ یہ فضائی میزبان افراد، جن میں اکثر دل ربا خواتین ہوتی ہیں، ہوائی جہاز کے سفر کے دوران کئی ایسے اہم فرائض انجام دیتے ہیں جن پر مسافروں کی توجہ کم ہی رہتی ہے۔ مثلاً مسافروں کو ان کی متعین نشست تک پہنچانا، کسی وجہ سے نشست کی تبدیلی کی ضرورت ہو تو اس کا انتظام کرنا، ہوائی جہاز کی روانگی سے پہلے تمام دروازے چیک کرنا، یہ یقین کرنا کہ تمام مسافروں نے سیٹ بیلٹیں باندھ لی ہیں، اور جہاز کے فضا میں بلند ہوجانے کے بعد مسافروں کو ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے مختصر مگر اشد ضروری تربیت دینا، اور کبھی کبھی مریضوں کو ابتدائی طبی امداد بہم پہنچانا، مختلف اخبارات اور فارم مسافروں میں تقسیم کرنا، اور وقتاً فوقتاً سفر سے متعلق اعلانات کرنا، جہاز اور مسافروں کی حفاظت کی خاطر مسافروں کی کسی مشتبہ حرکت پر نظر رکھنا۔ مگر ان سب فرائض سے ہٹ کر اکثر مسافروں کی نظریں کسی امکانی حسن و جمال کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے، اور کھانے پینے" کی جانب مرکوز رہتی ہیں۔ مگر، وائے افسوس، چونکہ جہاز اس وقت 30 ہزار فیٹ بلندی پر اڑ رہا ہوتا ہے، عام طور پر ان فضائی میزبانوں کے دماغ بھی اسی بلندی کو چھو رہے ہوتے ہیں۔ اگر پرواز دو چار گھنٹوں کی ہے تو وہ اس قدر مصروف رہیں گی کہ آپ کو ان کی شکل صرف "ٹرالی" کے ساتھ ہی نظر آئے گی۔ اگر آپ نے انھیں بلانے کا بٹن دبا دیا تو یا تو انتظارِ یار کی عمر تمام سفر ہی کٹ جائے گا، یا پھر ایسی جھڑکی سننے میں آئے گی جیسی کہ شرارتی بچوں اور شوہروں کو خاتونِ خانہ خود دیا کرتی ہیں یعنی کہ "اگر پھر شرارت کی تو دروازے سے باہر نکال دوں گی۔" اعلیٰ درجہ کے مسافروں کے ساتھ البتہ امتیازانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ مگر کفایتی (اکانومی) کلاس میں خاطر تواضع میں بھی بچت کا خاص خیال رکھنا ان نازک اندام، پر آہن دل، فضائی میزبانوں کی دلآزار مجبوری ہے۔ ان حسین میزبانوں کی یہ خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اکثر مسافر ان کو اپنے گھر میں مستقل مہمان کی حیثیت دینے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسے ہی واقعہ کی بدولت اردن کے شاہ حسین نے ایک عام امریکی خاتون کو ملکہ نور" بنا کر قصرِ شاہی میں جا دیا تھا۔ شاید زمین کی کشش ثقل سے نکل جانے کے بعد فضاؤں میں رومانیت کے شگوفے کچھ زیادہ ہی کھل کر رنگ دکھاتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عجب نہیں کہ جوڑیں بھی صرف آسمان پر جاکر ہی مل سکیں گی۔ کبھی کبھی ایسے فضائی میزبانوں سے بھی سابقہ پڑجاتا ہے جو کہ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بادلوں کے دوش پر اڑتی پھرتی ہیں، اور مہمان مسافر اس فکر میں ڈوب جاتے ہیں کہ انھیں کس نام سے پکارا جائے: خالہ جان، بڑی بہن، یا نانی اماں۔ یہاں تک کہ اسی گومگو میں جہاز منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے، اور گوہرِ مقصود ہاتھ ہی نہیں آتا۔ پھر جہاز کے پہیوں کے زمین کی پستی سے لگتے ہی بلندیوں پر عشق کا یہ وقتی دورہ بھی ہوا ہوجاتا ہے۔

کچھ ایسے میزبان بھی ہوتے ہیں جن کی مہمانیوں کی زد میں آنے کے خوف سے سب ہی لرزاں و ترساں رہتے اور کان پکڑتے ہیں۔ اس لسٹ میں ڈاکٹر اور نرسیں بھی شامل ہیں، مگر شاعر و ادیب حضرات سرِ فہرست سمجھے جاتے ہیں۔ فی لقمہ طویل بحر کی ایک غزل یا ایک انشائیہ، اور چائے کے ایک کپ کے بدلہ میں ایک چوتھائی دیوان سے سمع خراشی تو ایسے حالات میں عام ہے

معیاری سزا "ٹکرز" ہے۔ اگر آپ اس قبیل کی محفل میں پھنس ہی جائیں تو "کلام" کے مقابلہ میں "طعام" کی داد دینے کی غلطی بھولے سے بھی نہ کر بیٹھیں۔ ورنہ نتیجتاً کلام کا دورانیہ اس وقت تک بڑھتا ہی رہے گا، جب تک کہ میزبان کی "دادی تشنگی" دور نہیں ہوجاتی، یا آپ ہی ہمت کرکے، یا نظر بچاکر، ادب کے دائرے سے خارج ہونے کی تہمت کا خطرہ مول لیتے ہوئے بگٹٹ فرار نہ ہوجائیں۔ دوسری جانب، ڈاکٹروں اور نرسوں کی میزبانی کتنی ہی خوش کن و دل پذیر کیوں نہ ہو، ان کی جانب سے بار بار آنے کی "پر اسرار" دعوت مہمان مریض کو آخر کار "بل بلا" کر رکھ دیتی ہے۔

میزبانوں کی ایک اور دل دہلادینے والی قسم "شاہی میزبانوں" کی ہے۔ تھانے داروں کی معیت میں ان مہمان خانوں میں لائے جانے والے افراد عام طور پر ایک طویل عرصہ تک ریاستی میزبانی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ برصغیر میں ایسے چند مشہور مہمان خانے تہاڑ، دلی" اور "شاہی قلعہ، لاہور" ہیں۔ یہاں عام طور سے سو جوتے اور سو پیاز پر مشتمل ایک اختیاری مینو ہوتا ہے۔ اگر یہاں پر پیش کیے جانے والے شاہی خوانوں کی تواضع سے دل نہ بھرے تو مہمانوں کو حضرت عزرائیل کے ساتھ ابدی میزبانوں کی جانب روانہ کردیا جاتا ہے۔ اپنی کتاب "لوحِ ایام" میں پاکستانی دانشور جناب مختار مسعود صاحب نے 1979ء تک قائم رہنے والی ایرانی حکومت کی جانب سے ایسے مہمانوں کے لیے ایک خاص "گھوڑے" کی سواری کا ذکر کیا ہے۔ ایک بڑی اور نہایت ہی تیز دھار تلوار کی شکل کا یہ گھوڑا شاہی مہمان خانے کے ایک کمرے میں نصب تھا۔ مہمان مسافر کو اس پر بیٹھنے پر مجبور کردیا جاتا، یہاں تک وہ اپنے ہی وزن کے زیرِ اثر دو حصوں میں تقسیم ہوکر ملکِ عدم کی ضیافت کے دکنے مزے اڑانے کے لیے رحلت کرجاتا۔ مجرم مہمانوں کی میزبانی کے ضمن میں کالے پانی، اور براعظم آسٹریلیا کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ برطانیہ کے سر یہ سہرا بندھتا ہے کہ انھوں نے میزبانی کی ایک انوکھی مثال قائم کرتے ہوئے اپنے "شاہی مہمانوں" کو نہ صرف طویل بحری سفر مفت ہی کرائے، بلکہ آسٹریلیا جیسی ایک بنجر، صحرائی، اور عمومی طور پر بے آب وگیاہ زمین کو ایک اہم اور طاقت ور ملک میں تبدیل کردیا۔

برصغیر کے ہی حوالہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک "سید" ایک علاقہ غیر میں کسی قبیلہ کے مہمان ہوئے، اور پہاڑی تحفے کھا کھا کر ان کا پیٹ پناہ مانگنے لگا تو وہ جب بھی واپس جانے کی اجازت مانگتے، جواب میں مزید نیاز مندانہ دعوتیں پاتے۔ یہاں تک کہ ان کے ہمہ وقت اصرار سے میزبان تنگ آگئے تو انھیں جواب دیا کہ، "خو، ہمارے علاقہ میں کسی بھی سید کا مزار نہیں، اب تو ہم آپ کا مزار یہیں بنائیں گے۔" دوسری جانب مشرقِ بعید کے کچھ جزیروں میں، مائکرونیشیا اور نیو گنی کے علاقوں میں، ایسے آدم خور قبیلے بھی پائے جاتے تھے جو اپنے مہمانوں کو کھلا پلاکر، موٹا تازہ کرکے انھیں قد آدم دیگوں میں بٹھا کر مزیدار کھانوں میں تبدیل کردینے میں مہارت رکھتے۔ کچھ اسی قبیل کے ایک انوکھے یونانی میزبان کا تذکرہ، صاحب طرز و اسلوب پاکستانی مزاح نگار، جناب مشتاق احمد یوسفی نے اپنی کتاب "چراغ تلے" میں "چارپائی اور کلچر" کے عنوان کے تحت کیا ہے۔ اس میزبان کا نام "پروقراط" تھا۔ موصوف کے پاس دو چارپائیاں تھیں۔ ایک لمبی اور دوسری چھوٹی۔ ٹھگنے مہمان کو وہ لمبی چارپائی پر لٹاتا، اور کھینچ تان کر اس کا جسم چارپائی کے برابر کردیتا۔ اس کے برعکس لمبے آدمی کو وہ چھوٹی چارپائی دیتا، اور جسم کے زائد حصوں کو کاٹ چھانٹ کر ابدی نیند سلادیتا۔

میزبانوں کی ایک اور اچھوتی قسم، جو سعودی عرب میں بھی افراط سے دیکھنے میں آئی، وہ مختلف سماجی تنظیموں کے نام نہاد کرتا دھرتاؤں کی ہے۔ یہ اصحاب کسی عصری اہمیت اور دل چسپی کے موضوع کے نام نہاد عاشق بن کر کسی ایک ایسی اہم یا غیر اہم شخصیت کو مہمان خصوصی بنالیتے ہیں جس سے کوئی ذاتی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ یا پھر کم از کم ایسی تقریبات سے اخبارات میں خبروں میں ... میں مدد ملتی ہے ؛ ہر تنظیم میں ایسے افراد کی تعداد خاطر خواہ سے زیادہ ہی ہوتی ہے۔ ایسی ہی منعقدہ رسمی تقریب کے اختتام پر یہ سب خود ساختہ میزبان، مہمان خصوصی کے ساتھ ساتھ اس طرح دوڑ لگاتے ہیں جیسے کہ جلتے توے پر پاؤں پڑ گیا ہو اور کسی تنہائی خاص ترین میز پر مہمان خصوصی کی سنگت کے لیے آخری لقمہ تک مقابلہ کرتے ہیں، اور بڑھ چڑھ کر کھانوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ دوسری جانب عام مہمان، جن کے چندے اور خریدے ہوئے ٹکٹوں سے یہ محفل سجی ہوتی ہے، ہیروں کی چمکتی ہوئی فینسی لائٹوں کے درمیان، سوکھے منہ، اور سکتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ کھانے اور شہرت کی بھوک کا یہ سبق آموز تماشہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میوزیکل چیئر کا ایک تیز رفتار اور دل چسپ کھیل ہو رہا ہے۔ اس کھیل میں ہارنے والوں کی صورت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ عام طور پر اپنی ہار پر یہ "معدہ شکستہ" افراد اپنی اس تنظیم کی سابقہ کارروائیوں" پر لعنت ملامت کرتے ہیں، اور "کھاؤ پیو موج کرو" کے (مرغ) زریں جیسے "خیال پُر حلال" پر عمل کرتے ہوئے ہاتھ دھو کر ایک مدد نئی "تن۔ظیم" کی بنیاد ڈال لیتے ہیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے کے مصداق اب یہ آزمودہ اور مجرّب فارمولہ استعمال کیا جاتا ہے کہ بہر صورت "اعلیٰ عہدہ داران" اور کھانے کی کرسیوں کی تعداد مساوی سے زائد نہ ہو۔ ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رہتا ہے کہ اس توند پرست تنظیم کے تمام "اعلیٰ معدہ داران" کی مجموعی تعداد اور گروپ تصویر کا سائز بھی کچھ ایسا ہی رہے کہ اخبارات میں چھپنے پر کم از کم خود اپنی شناخت کرنے اور کرانے میں آسانی ہو۔

اچھا، اس وقت تو آپ ہمیں اجازت دیں ؛ یاد آیا کہ مظلوم و بے کس شوہروں پر مشتمل ہماری نو ساختہ تنظیم "بے نوا" نے آج "بیچلرز بریانی" کے نام سے ایک "ون ڈش ڈنر" کا انتظام کیا ہے۔ آپ بھی آئیے نا !

نامور طنز و مزاح نگار

طالب محمود میری

کا دلچسپ شعری مجموعہ

"سخن کے پردے میں"

قیمت 100 روپے

ڈاکٹر میر گوہر علی خاں
خواجہ پہاڑی
میر عالم ٹینک روڈ
حیدرآباد۔ ۵۰۰۲۶۴

سرکار کے سو کروڑ روپئے

میری نئی نئی ملازمت تھی ۔ وہ بھی دور دراز ضلع پر ۔ کالج چھوٹا ۔ سب ساتھی چھوٹے ۔ صرف ایک عدد چپراسی کے ساتھ پتہ نہیں یہاں کتنے دن رہنا پڑے ۔نیا پوسٹ نئی ملازمت نیا چپراسی ۔ نئے دواخانے کی پرانی عمارت ۔ جسے خواہ مخواہ "وٹرنری ڈسپنسری " کا نام دے دیا گیا ۔ اندر جھانکو تو بھائیں بھائیں کرتے ہوئے کمرے ۔ اور بال ۔ دھول سے اٹے ہوئے در و دیوار ۔ میرے ساتھ آئے ہوئے سینئیر ڈاکٹر نے کہا ۔ " جناب ۔ یہ ڈسپنسری نئی نئی کھلی ہے ۔ NATIONAL EXTENSION SERVICE کے ضمن میں ۔ "آہستہ آہستہ ادویات ، آلات اور فرنیچر آجائے گا ۔ جب تک آپ موج منائیں ۔ " ایک ہفتہ بعد تعلقہ کے افسروں سے ملاقات کی خاطر باہر نکلا ۔ قرعۂ فال مڈیکل آفیسر کے نام نکلا ۔ بڑے نرم طبعیت کے آدمی تھے ۔

پھولے پھولے گال ۔ بھاری بھر کم بدن ۔ جب میرے کام کے بارے میں انھوں نے دریافت کیا تو من و عن میں نے وہی کچھ کہہ دیا جو میرے سینئیر ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا ۔ ایک زور دار قہقہہ لگایا ۔ " ارے آپ بغیر ڈھوبٹی کے حجام ہیں " ۔ کچھ اچھا نہیں لگا ۔ اب ان سے ملنے کترانے لگا ۔

چند دنوں بعد ضلع کے وٹرنری آفیسر تشریف لائے ۔ تنقیح کے لئے ۔ قدم رنجہ فرماتے ہی کہا ۔ " " رجسٹرارت دکھاؤ ۔ " میں ہکا بکا ان کو تکنے لگا ۔ کاہے کے رجسٹرات ۔ نہ دوا ہے نہ دارو ۔ علاج کے لئے ایک کتا آتا ہے نہ بلی ۔ انھوں نے میری پریشانی کو بھانپ لیا ۔ " اچھا تو حاضری رجسٹر ہی دکھلادو ۔ میاں نئے نئے کالج سے ابھی ابھی نکلے ہو ۔ " یہ بھی ندارد ۔ کشادہ دل کے مالک تھے ۔ ساتھ آئے ہوئے ڈاکٹر سے کہا ۔ " جناب ۔ کم از کم انھیں حاضری رجسٹر کھولنے کہو ۔ ورنہ تنخواہ کہاں سے ملے گی ۔ " فوراً رجسٹر حاضری کھولدیا گیا ۔ اور ان سارے پچھلے دنوں کی حاضری ڈال دی گئی ۔

مکمل ایک ماہ بعد ضلع کے مستقر کے دواخانہ پر تبادلہ کے اچانک احکامات آئے خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ چلو اب وقت بے کاری میں نہیں کٹے گا ۔ ہم نے کچھ کر دکھانے کی ٹھانی ۔ اب کیا تھا بے حساب گائے بیل ۔ بھینس

کھلگا۔ بکرا بکری۔ مرغا مرغی۔ علاج کے لئے آنے لگے یا لائے جانے لگے۔ دل بہلتا گیا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ دن کب شروع ہوتا ہے اور شام کب ہوتی ہے۔ کسان بھی خوش اور ہم بھی خوش۔ چند دنوں بعد پھر وہی اڑچن پیش آئی۔ تنقیح۔ اب کی بار تو نائب ناظم محکمہ، علاج حیوانات خود دورے پر تشریف لارہے تھے۔ اور ان کے پروگرام میں میرے دواخانہ کی تنقیح بھی شامل تھی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں ـــ اور بعد بھی کئی برسوں تک مملکت محروسہ سرکار عالی حیدرآباد میں صرف ایک ناظم ہوتا تھا اور ایک ہی نائب ناظم بھی۔ " آج کل کی طرح نہیں کہ گلی کوچوں میں مکانات پر تختیاں آویزاں ہیں۔ " مددگار ناظم ـــ نائب ناظم

REGIONAL JOINT DIRECTOR- ـــ علاقائی جڑواں ناظم۔

ہاں! تو نائب ناظم صاحب آئے۔ ساتھ میں ایک منشی جی اور دو چپراسیاں بھی لے آئے۔ یہ چپراسیاں تو ڈاک بنگلہ ہی میں رک گئے۔ البتہ منشی جی کو لیئے " صاحب " میرے دواخانہ تشریف لائے۔ میں نے اپنی کرسی پیش کی۔ انھوں نے اس پیشکش کو قبول فرمایا میں ان کے سامنے کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ شروع میں کچھ ادھر ادھر کی گفتگو ہوئی۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کہا۔ " دواؤں کی الماری دکھاو "۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔

دواؤں کا رجسٹر دکھاؤ "۔ میں نے یہ بھی ان کے سامنے پیش کردیا۔ الماری میں سے ٹنکچر آیوڈین کی ساری بوتلیں نکلوائیں۔ انھیں خود اپنے دست مبارک سے گنا۔ رجسٹر سے اس کی تصدیق کی۔ چھ کی چھ بوتلیں برابر تھیں۔ خوش ہوئے۔ مسکرائے۔

" اچھا۔ چلو آلات کی الماری دیکھتے ہیں۔ "

الماری کے اندر شلف پر پچاس سی۔ سی۔ کی ریکارڈ سرنج ٹوٹی پڑی ہوئی تھی۔ بہت خشمگین ہوئے۔

" اتنی قیمتی سرنج کیسے ٹوٹی۔ اور کس نے توڑا "؟

" میری رخصت کے دوران اونور کے ڈاکٹر وقار نے توڑا ہے "۔

" رجسٹر نکالو "۔

"جی "

" اس رجسٹر میں تو کچھ لکھا نہیں ہے۔ جب کوئی سامان ٹوٹتا ہے۔ تو اس رجسٹر میں لکھ دیا جاتا ہے۔ "

" بھول ہوئی۔ آئندہ سے ایسا ہی عمل ہوگا۔ "

" نہیں۔ ابھی لکھ ڈالو۔ اور صدر دفتر کو بھی اس کی اطلاع دے دو۔ "

الماری کے سب سے اوپری شلف میں بڑا " ایگل " EAGLE برانڈ والا تھرماس رکھا تھا۔ نائب ناظم صاحب نے حکم دیا کہ اسے نکالو۔ وہ نکالا گیا۔

" اسے کھولو۔ " اس کا ڈھکن علحدہ کیا گیا۔ اندر سے جھنجھنانے کی آواز آنے لگی۔

" یہ کیا ہے "؟

" جی اس کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے "۔

"کیسے۔ کب۔ اور کس کے ہاتھوں"؟
جی۔ جب میں ٹیکہ اندازی کے لئے تملذگو موضع گیا تھا۔ مذکوری کے ہاتھ میں یہ تھرماس تھا اور اسی نے اس کو توڑا ہے"۔
"تمہارا چپراسی کیا کررہا تھا"؟
"وہ۔ چاوڑی میں میرا ناشتہ تیار کررہا تھا"۔
"جانتے نہیں۔ سرکاری ملازم سے خانگی کام لینا منع ہے"
"معلوم ہے ـــ" مگر آپ کے لئے شاہی ٹنکپور جو ڈاک بنگلے میں تیار ہورہے ہیں۔ وہ کون تیار کررہا ہے؟
جی میں آیا کہ یہ کہدوں ـــ
"آئندہ سے تمہارا چپراسی ہی تمہارے ساتھ رہے گا۔"
اب فائلوں کی باری آئی۔ میں نے دو موٹے موٹے گٹھے فائلوں کے ان کے سامنے رکھ دیئے۔ انھوں نے جاریہ سال کے فائیل دیکھے۔ انھوں نے یہ فائیل کچھ الٹے پلٹے تو کہیں۔ میری دستخط سرخ روشنائی میں کی ہوئی ملی۔ بہت جھلائے۔ اپنا چہرہ بھی سرخ کرلیا۔
"آپ نے حد کردی ہے آپ کوئی گزیٹڈ آفیسر تو ہیں نہیں۔ اور نہ ہی رستم ہند۔ کہ سرخ روشنائی سے دستخط کریں۔ غصہ سے جیب سے قلم نکالا اور میری دستخط پر چلیپے لگادیئے۔
"خبردار۔ ایسی غلطی پھر کبھی نہ کرنا۔ ورنہ مجھے سخت قدم اٹھانا پڑے گا"۔
"صادر کتنا منظور ہے"؟
"دس روپیہ"
"سب کا سب خرید لیا"
"جی ہاں۔"
"دیسی ادویات کی منظوری کتنی ہے"
"۶۵ روپیہ ۱۲ آنے"
"یہ بھی خرچ ہوگئے"۔
"جی ہاں تازہ تازہ خریداری ہوئی ہے۔ سب سامان اسٹور میں رکھا ہوا ہے"۔
دیسی ادویات، اصل میں ادویات نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ کڑوی کسیلی دوائیوں میں ان کو ملاکر جانوروں کو کھلایا پلایا جاتا تھا۔ اور یہ تھیں۔ میٹھا تیل۔ نمک۔ گڑ۔ مٹی کا تیل بھی اس میں شامل تھا۔ مٹی کا تیل اس لئے کہ اگر دواخانہ میں کرنٹ نہ ہو تو لیمپ جلالیا جائے۔ میں نے یہ فائیل بھی ان کے سامنے کردی۔
"کیا ساری چیزیں اچھی طرح سے اور صحیح طور پر استعمال ہورہی ہیں۔" جب انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا تو ہم نے بھی بڑی ڈھٹائی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ "جناب والا۔ قسم لے لو۔ جو ہم نے ایک قطرہ تیل اپنے اوا پنی بیگم کے لئے استعمال کیا ہو۔"

بوڑھے آدمی تھے بالوں کو گھاٹ گھاٹ پھر کر ۔ ضلع ضلع کے دواخانوں کی تنقیح کر کے سفید کر چکے تھے ۔ بھانپ گئے ۔ پینترا بدلا ۔ "کیا آپ کو حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کا وہ قصہ معلوم ہے جب وہ ایک رات معمول سے زیادہ دفتری کام میں مشغول تھے ۔ اور سامنے سرکاری تیل کا چراغ جل رہا تھا ۔ تب ان سے ملنے ایک صاحب تشریف لاتے ہیں "۔ مجھے سب کچھ معلوم تھا ۔ مگر ڈاکٹر پرشاد کی زبان سے پھر سے سننے کا اشتیاق پیدا ہوا ۔ میں نے جھوٹ کہا

"مجھے کچھ نہیں معلوم "۔

انھوں نے بڑی احتیاط سے رک رک کر پورا قصہ سناڈالا ۔ اور مجھے پھر یوں گھورا ۔ جیسے کہ رہے ہوں ۔

"میاں صاحبزادے ۔ مجھے توقع ہے کہ تم ایسا ہی عمل کروگے ۔ کبھی سرکاری میٹھے تیل میں مصالحہ دار پاپڑ نہ تلوگے ۔ اور چھوٹی سی پٹیپٹی ہی سی ۔ کسی سرکاری مٹی کے تیل سے تمھارے گھر میں نہیں جلے گی "

اب جب میں ستر (۷۰) برس کا ہو چلا ہوں ۔ تو اس بیسویں صدی کے آخری دہے کے آخری حصہ میں بہار پردیش کے سو کروڑ روپیہ کے چارہ گھٹالہ کی خبریں ملک میں اور ساری دنیا میں چوکھا گھوم رہی ہیں ۔ تو وٹرنری سرجن ہونے کے ناطے میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتے ہیں ۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے کہ تنقیح کرنے والے ۔ رتی ۔ رتی ۔ تنکہ ۔ تنکہ ۔ اٹھا اٹھا کر ۔ جھاڑ پھونک کر دیکھتے تھے ۔ مگر آزادی ۔ ہند کے پچاس سال بعد کیسے ڈاکٹر جمع ہو گئے جن کی آنکھیں دھول میں اٹی ہوئی ہیں ۔ اور انھیں اب کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا ۔ کیا اب ڈاکٹر پرشاد جیسا کوئی موجود نہیں ہے ۔ جو ڈراتا دھمکاتا ۔ اور سچ بات حلق سے اگلواتا ۔ اور یوں سرکار کے سو کروڑ روپیہ گندی موری میں بہہ نہیں جاتے ۔!

علیم خان فلکی
پوسٹ باکس نمبر ۲۰۴۲۳
جدہ (سعودی عرب)

ناظر قدوائی والد

ناظر قدوائی صاحب نے تیس برس کے عرصے میں جتنے مشاعرے پڑھے اور پڑھائے ہیں اتنے تو میں نے شعر بھی نہیں پڑھے ہوں گے۔اس کے باوجود مجھے ان کی شخصیت پر مضمون لکھنے کا حکم ملا ہے پتہ نہیں یہ میری قدردانی ہے کہ ناظر قدوائی کی رسوائی جب میں نے یہی سوال ان سے کیا تو انہوں نے انتہائی اعلاظرفی سے میری ہمت بڑھائی۔گویا کہہ رہے ہوں بھائی کوئی سمجھدار ہوگا تو اور رسوا کرے گا آپ ہی غنیمت ہیں۔

یہ کام میرے لیئے اس لئے بھی آسان ہوگیا کہ ناظر قدوائی انتہائی سادہ مزاج عجز و انکساری کے پیکر صاف گو اور غیر معمولی بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں۔نہ ان کے اشعار سمجھنے کیلئے سامنے لغت رکھنی پڑتی ہے نہ ان کی باتوں کی تہہ تک پہنچنے کیلئے فلسفہ پڑھنا پڑتا ہے اور ان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ابھی زندہ ہیں ورنہ کسی مرحوم کی شخصیت پر مضمون لکھنے کے لئے جتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں وہ تحقیق کرنے والے جانتے ہیں یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے میں یہ معروضات پیش کرنے کے قابل ہوا۔

جدہ کی ادبی کہکشاں کو جانے کس شاعر کی بیوی کی بددعا لگی کہ پچھلے تین چار برسوں میں کئی نامور شعرا انجمن چھوڑ گئے جیسے روف خلش، سلیم مقصود، سجاد بابر، ناظم الدین مقبول، ارشد غازی، شجاعت علی راہی وغیرہ اب ناظر قدوائی ہم سے جدا ہورہے ہیں حالانکہ کئی ایک شعرا۔ایسے ہیں جنکو سن کر جی چاہتا ہے کہ یہ ملک بدر کردیئے جائیں۔ہم نے تو ان پر الوداعی نظمیں تک لکھ رکھی ہیں لیکن وہ نہیں جاتے البتہ ان لوگوں کے جانے کی خبر ملتی ہے جن سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا اور نہ ہی میں ان کا میر درد جگر یا دلاور فگار سے موازنہ کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ اکثر مقالہ نگار یہ جسارت بھی کرڈالتے ہیں۔ناظر قدوائی ان ہی میں سے ایک ہیں۔

آج کا یہ جشن اسی ہمدم دیرینہ سے لوگوں کی بے پناہ محبت کا ایک شاندار مظہر ہے اور منفرد بھی۔یہ بھی نصیبوں کی بات ہے ورنہ ہم کسی اور کا نام کیوں لیں ہماری ہی مثال لیجئے ہم نے بھی کئی بار وطن لوٹ جانے کا فیصلہ کیا جتنی کہ تاریخ کا اعلان بھی کردیا لیکن آخر دن تک کہیں سے نہ کسی جشن کا بلاوا آیا نہ تقریب کا

مجبوراً ہم نے جانا ملتوی کردیا اور ان کی ہر دل عزیزی دیکھئے کہ انہوں نے ایک بار وطن واپسی کا تذکرہ کیا اور لوگ الوداعی جشن کے لئے سرگرم ہوگئے گویا خیر مقدم کررہے ہوں میرے نزدیک یہ طریقہ لوٹنے والے کو بڑی مشکل میں ڈال دیتا ہے فرط جذبات کے ساتھ رخصت کرنے والوں کی گرمجوشی دیکھ کر دو بارہ آنے میں وہ شرمندگی محسوس کرتا ہے اور اسی مجبوری کی وجہ سے وہ کسی دوسرے ملک کی طرف نکل پڑتا ہے۔

ناظر قدوائی ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے عمر انسٹھ سال ہے سٹھیانے میں ابھی ایک سال باقی ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے جب بھی ان کو مشاعروں میں دیکھا پچھلے مشاعرے سے کم عمر ہی پایا۔ بڑی چور عمر پائی ہے کہیں سے اتنی عمر والے نہیں لگتے اور اشعار سے تو بالکل نہیں انتہائی خوددار آدمی ہیں جب آئے تھے وزن ۴۸ کلو تھا اب جارہے ہیں اب بھی ۴۸ کلو ہی ہے۔ سعودی عرب کا ایک کلو کا بھی احسان نہیں لیا انہوں نے زندگی میں سمجھداری کا کام یہ کیا کہ شاعری شادی کے بعد شروع کی باپ اور والد ساتھ ساتھ بنے اگرچہ نانا بھی بن چکے ہیں لیکن تخلص وہی برقرار ہے شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بلا کا حافظہ دیا ہے کہ ہزارہا اشعار یاد ہیں لیکن اسی شاعر کا شعر یاد رکھتے ہیں جو ان کا پسندیدہ ہو ہم نے ان کو ہمارا یا طارق غازی صاحب کا کوئی شعر سنانے کو کہا یہ نہیں سنا سکے انہوں نے شوق بہرائچی اور ظریف لکھنوی کو دلچسپی سے پڑھا بھی ہے اور سنا بھی ہے لیکن ریاض حیدرآبادی کے انداز لب ولہجے اور رنگ نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

دوسرا سمجھ داری کا کام یہ کیا کہ جدہ آکر نظامت پر توجہ کی۔ آج سے تیس برس قبل جدہ کی ادبی فضا اگرچہ کہ استاد شعراء سے خالی نہیں تھی لیکن نظامت کا حال دور درشن کے اردو اناؤنسمنٹ جیسا ہی تھا مشاعرے "کا آغاز شروع" ہوتا تھا اور "اختتام ختم" کیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامت انہوں نے شروع نہیں کی بلکہ ان کے سر آگئی۔ ایک مرتبہ کلیم عاجز۔ معین احسن جذبی۔ شمیم جے پوری۔ بیکل اتساہی جیسے استاد شعرا کی آمد پر ایمبسی نے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ نظامت کے لئے صحیح آدمی کی تلاش شروع ہوئی اس وقت کے سفیر ہند عبدالقادر حافظ (مرحوم) کی نظر انتخاب ناظر قدوائی پر پڑی اور ان کے بے حد اصرار پر میدان میں اتر گئے۔ اور اس کے بعد سے آج تک یہ حال ہے کہ مسند نظامت ان کے بغیر بے رونق لگتی ہے اگر کبھی یہ مسند نظامت کے بجائے سامعین یا شعراء کے درمیان بیٹھے نظر آئیں تو سامعین الجھن کا شکار ہونے لگتے ہیں گویا دولہا کی جگہ کسی اور کو مسند نکاح پر بٹھادیا گیا ہو۔ جدہ دوبئی ہندوستان ہر جگہ ان کا بڑا شہرہ ہے۔

ابھی حال ہی میں بارہ بنکی کے ایک مشاعرے میں یہ سامعین میں دبے بیٹھے تھے کہ ملک زادہ منظور کی نظر ان پر پڑگئی انہوں نے فوری ان کا نام نظامت کے لئے پکار لیا۔ ان کی دلچسپ چھیڑ چھاڑ نوک جھونک لطیفے اور تبصرے مشاعرے کی فضا بنائے رکھتے ہیں۔ ان کے فی البدیہہ اشعار سے شعر نہ سمجھنے والے سامعین جنکی اکثریت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے وہ بھی لطف اندوز ہوتے ہیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں شاعروں کے درمیان تاخیر و تقدیم کے مسئلے کی وہی اہمیت ہے جو کٹر وہابیوں اور سنیوں کے مجمع میں امامت کی ہے ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اسی مسئلے پر مشاعرے کے اختتام پر کچھ شاعر حضرات طیش میں آگئے ان سے دو دو ہاتھ کرنے آگے بڑھ گئے مگر سبحان اللہ! ان کی دلنواز مسکراہٹ اور پر جوش مصافحے کے آگے ٹھنڈے پڑگئے اور جس نمبر پر بھی پڑھائے گئے اسی کو اگلے مشاعرے کیلئے غنیمت جان لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ظرافت کا ایسا ہنر بخشا ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو مسند نظامت دنگل بن جاتی پھر پتہ نہیں اس منحنی صحت کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا۔ شاعری میں شمشیر عریاں ہیں تو نظامت میں تیغ محرف۔ لیکن شاخ گل سے لگتے ہیں اور باد نسیم سا بولتے ہیں ناظم مشاعرہ کسی جہاز کے

pilot کی طرح ہوتا ہے جس کی ذرا سی غلطی پلین کو crash کر ڈالتی ہے ۔ چھوٹے چھوٹے جہاز چلانا اور بات ہے بات تو تب ہے جب کوئی 747 چلائے اور ناظر قدوائی کو یہ افتخار حاصل ہے کہ انہوں نے ایک نہیں کئی بار چلائے ہیں اور ہر بار کامیابی کے ساتھ لینڈ کیا ۔ ورنہ شاعروں کی فہرست میں کوئی تنک مزاج ہوتے ہیں تو کوئی صاحب تحث خفا، کوئی خود ساختہ بزرگ ہوتے ہیں تو کوئی واقعتاً ایسے بزرگ ہوتے ہیں جنکی شاعری پر بچپن کا گمان ہوتا ہے ۔ کوئی صاحب صاحب دیوان ہوتے ہیں لیکن شاعر نہیں معلوم ہوتے حتی کہ شاعری سے بھی نہیں ۔ کوئی صاحب دیر سے آکر مزید دیر سے پڑھوانے کا زعم دکھاتے ہیں بہر حال اتنے متنوع مزاج کے شعرا کو ساتھ لے کر چلنا ہی ناظر قدوائی کا کمال تھا ۔ ان تیس برسوں میں جدہ کی ادبی فضاء کئی طرح کے پیچ و خم سے گزری ہر دور میں گروپ بندیاں انجمن سازیاں صف آرائیاں علاقہ واریت برابر موجود رہی ۔ ناظر قدوائی نے اپنے آپ کو کبھی کسی سے وابستہ نہ کیا ۔ ظاہر ہے جس شخص کو نہ صدر بننے کا شوق ہو نہ سکریٹری بننے کی آرزو وہ کسی کے دام سیاست میں کیسے گرفتار ہوتا ۔ ہاں ایک بار صدر بنے اور وہ بھی انڈین ایمبیسی اسکول کی کمیٹی کے آج سے پچیس چھبیس سال قبل جب نام زدگی نہیں انتخابات ہوتے تھے ایک عام شکوہ یہ تھا کہ اسکول پر حیدرآبادی کمیونٹی کا قبضہ ہے انہوں نے انتخابات میں حصہ لیا اور ۱۱۳ کے منجملہ ۱۱۰ ووٹ لاکر یہ ثابت کیا کہ انسان باصلاحیت و باوصف ہو تو لوگ نہ اس کا شہر دیکھتے ہیں نہ علاقہ ۔

ناظر قدوائی نے شہرت کے لئے محنت نہیں کی ۔ مقبولیت کی چاہت نہیں کی پھر بھی دونوں ساتھ چلیں بے نیازی کا یہ عالم کہ کلام تو درکنار بیاض بھی نہیں رکھتے پرچیوں پر گزارا کرتے ہیں اس عادت میں غالباً زمانہ ، عاشقی سے مبتلا ہیں ۔ اگر ساری پرچیاں جمع کردی جائیں تو تین چار دیوان ضرور شائع ہو سکتے ہیں ۔

ناظر قدوائی اگر چہ روایتی مذہب سے بیزار ہیں جس کا اظہار عام گفتگو ہی میں نہیں بلکہ اشعار میں بھی شیخ و ناصح واعظ و محتسب پر تنقید کے ذریعے کرتے ہیں لیکن پکے موحد ہیں

جدہ کی محفلوں سے رونق چھین کر یہ کہیں اور بانٹنے جارہے ہیں جہاں اگرچہ نہ ریالوں کی ریل پیل ہے نہ بنگلوں اور کاروں کا عیش لیکن ان تمام سے بڑی ایک دوسری نعمت حاصل ہے اور وہ ہے آزادی کی نعمت ۔

آخر میں میں ناظر قدوائی والد کا ہی یہ قطعہ ان کی طرف سے آپ تمام کی نذر کرتا ہوں :

دعائیں دیجئے اب تو دعاؤں پر گزر ہوگی
خدا معلوم باقی عمر اب کیسے بسر ہوگی
مرے جانے سے کوئی فرق آئیگا نہ محفل میں
نہ بولے مرغ پھر بھی وقت پر اپنے سحر ہوگی ۔

قلمی معاونین تخلیقات پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیں

ڈاکٹر سید حسین احمد زاہدی
ا۔ ۴۰، جان نگر روڈ، کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۱۷

مزاحیہ کردار

انسان ایک سماجی جانور ہے جو اپنے ہم جنسوں اور جلیسوں کی صحبت میں رہنا پسند کرتا ہے انسان کی بہ نسبت جانور جو عقل و شعور سے عاری ہوتے ہیں اور فطری جبلت کے تحت زندگی گزارتے ہیں تنہائی پسند ہوتے ہیں ۔ انسان انفرادیت پر اجتماعیت کو ترجیح دیتا ہے ۔ اس کے لئے اس نے سماج کی تخلیق کی ۔ سماج نام ہے چند افراد کے مل جل کر رہنے کا ۔ یہ افراد چند مسلمہ اصولوں کو مان کر زندگی گزارتے ہیں جن کا تعلق امن و امان و فلاح و بہبود سے ہوتا ہے ۔ ان اصولوں کی خلاف ورزی سماج کے ضابطے کو توڑنا اور اس سے بغاوت کے مترادف ہے ۔ اس وقت سماج کا نگہبان " قانون " اس بغاوت پر گرفت کرتا ہے اور رہنما اصولوں کی خلاف ورزی پر خاطی کو سزا دیتا ہے ۔ سماج کے اصولوں کو توڑنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے جو ایسا کرتا ہے وہ مجرم سمجھا جاتا ہے اور اسے اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے ۔

سماج میں ہر طرح کے فرد ہوتے ہیں ۔ اکثریت ایسے افراد کی ہوتی ہے جو امن پسند ہوتے ہیں اور تمام اصول و ضوابط کو مان کر چلتے ہیں ۔ چند ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو سماجی اقدار کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے ہٹ جاتے ہیں ۔ ایسے افراد کے خلاف قانون حرکت میں آتا ہے اور انھیں سوسائٹی کی سیدھی لکیر پر چلنے پر مجبور کرتا ہے ۔ سماج میں چند ایسے افراد بھی ملتے ہیں جو اپنی فطری ناہمواری کی وجہ سے سماج سے میل نہیں کھاتے ان کی حرکات عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہیں اور یہ اپنی فطری ناہمواریوں اور بے لوچ پن کی وجہ سے سماج کی لکیر سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ یہ افراد سماج کے لئے نقصان دہ نہیں ہوتے اس لئے قانون ان کی گرفت کے لئے حرکت میں نہیں آتا ۔ ان کی کج روی ہمیں ان پر ہنسنے کا موقعہ فراہم کرتی ہے ۔ ہماری اس ہنسی میں ایک قسم کا تمسخر پوشیدہ ہوتا ہے جن کا نشانہ ایسے افراد ہوتے ہیں تاکہ وہ غلط راہ پر بھٹکنے کے بجائے صراط مستقیم پر واپس آجائیں ۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا :

"بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی چند فطری ناہمواریوں کے باعث سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے بھٹکتے نظر آتے ہیں۔ یہ افراد ایسے کردار ہوتے ہیں جن کی غیر سماجی حرکات سوسائٹی کے قانون کو جنبش میں لانے کے بجائے صرف اس کی ہنسی کو تحریک دیتی ہیں۔ چنانچہ ہنسی نہ صرف افراد کو اکٹھا ہونے کی ترغیب دیتی ہے بلکہ ہر اس فرد کو نشانہ تمسخر بھی بناتی ہے جو سوسائٹی کی اقدار سے انحراف کرتا ہے اور اس لئے اس کا مذاق اڑاتی ہے کہ وہ پھر سے سوسائٹی کی سیدھی لکیر میں شامل ہو جائے۔"[1]

سماج کی لکیر سے ہٹے ہوئے یہ افراد عرف عام میں مزاحیہ کردار کہلاتے ہیں جو اپنی فطری ناہمواریوں کی وجہ سے ہمارے اندر ہنسی کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ مزاحیہ کردار سماج سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ اپنی کج روی اور جھوٹے وقار کی وجہ سے خود کو سماج کے سب سے اعلیٰ فرد تصور کرتے ہیں۔ وہ اپنی خامیوں کو بھی خوبیوں میں شمار کرتے ہیں۔ مزاحیہ کردار کو تیقن ہوتا ہے کہ وہ اپنی حرکات میں حق بجانب ہیں۔ وہ بے لوچ فطرت کے مالک ہوتے ہیں اس لئے ان کے اندر خود کو بدلنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ مطالعے و مشاہدے سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ وہ اپنے رویے میں سخت گیر ہوتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ایسے بے لوچ اور ناقابل اصلاح افراد پر غصے کے بجائے ہنسی کیوں آتی ہے تو اس بات کو ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک بہت اچھی مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے کہ ایک مزاحیہ کردار کس طرح اپنی حرکات سے ہمارے اندر جذبہ ترحم کو جگانے کے بجائے حس مزاح کو بیدار کرتا ہے:

"اگر کوئی شخص حقیقی غم میں مبتلا ہو کر رونا شروع کر دے لیکن اس کے رونے کا انداز مضحکہ خیز ہو تو ہم اس کے غم میں شریک ہونے کے بجائے اس پر ہنسنا شروع کر دیں گے اور یہ اس لئے کہ یہ شخص ہمارے جذبات ترحم کو برانگیختہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"[2]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مزاحیہ کردار اور عام کردار میں کیا فرق ہے۔ کس کو ہم مزاحیہ کردار کہیں گے اور کسے عام کردار۔ عام کردار کو سمجھنے کے لئے ابوالبرکات کربلائی کی یہ بات پیش کی جا سکتی ہے:

"فسانہ زندگی سے عبارت ہے۔ زندگی حرکت و عمل کا نام ہے۔ حرکت و عمل کردار کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی بھی قصہ یا داستان میں ہم اس عہد کی تہذیب و تمدن، بود و باش، معاشرت طرز گفتگو کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اچھی کردار نگاری کے لئے ضروری ہے کہ فنکار اپنے کرداروں سے ویسے ہی حرکت و عمل کرائے جیسے کہ روز انہ کی زندگی میں ہوتے ہیں۔ ہمیشہ اس کو بشری محاسن و معائب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ فنکار بشری کمزوریوں اور اچھائیوں سے اپنے کردار کو مزین نہیں کرتا تو وہ کردار اس دنیا کے بجائے دوسری دنیا کا معلوم ہونے لگتا ہے۔"[3]

عام کردار میں بشری معائب و محاسن کا ہونا ضروری ہے جبکہ مزاحیہ کردار عام انسانی وصف سے جدا ہوتا ہے۔ وہ اپنی فطری ناہمواریوں کی وجہ سے عام کرداروں سے جدا ہوتا ہے۔ اپنی بشری کمزوریوں کو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں پر محمول کرتا ہے۔ وہ لکیر کا فقیر ہوتا ہے اور بلا سوچے سمجھے اپنی متعین راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ وہ حالات کے تقاضے اور ماحول کی مناسبت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا کیونکہ وہ عام انسانی لچک سے مبرا ہوتا ہے۔

اس کے غیر آہنگ افعال بہت نمایاں ہوتے ہیں جو عام مشاہدے میں آکر ہنسی کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری کے خیال میں :

" طربیہ کے کردار نہ صرف سماج سے پوری طرح مربوط نہیں ہوتے بلکہ اپنی خامیوں کو بھی اپنی شخصیت سے گہرا علاقہ قائم نہیں کرنے دیتے۔ اپنی سطحیت اور عدم تطابق کی وجہ سے ہم ان خامیوں کا مطالعہ آسانی سے کرسکتے ہیں " ۴

مزاحیہ کردار اپنی حرکات میں رجعت پسند ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو جس راہ پر ایک بار ڈال دیتا ہے اس پر بلا سوچے سمجھے چلتا رہتا ہے۔ اس کے اندر اپنے آپ کو بدلنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی بے لوچ فطرت کا اسیر اور عام انسانی خصوصیات سے یکسر محروم رہتا ہے۔ اس لئے جب وہ کسی نئے واقعے سے دوچار ہوتا ہے تو اس پر ایک قسم کی بوکھلاہٹ طاری ہوجاتی ہے اور وہ بدحواسی کا شکار ہوکر حماقت پر حماقت کرنے لگتا ہے۔ وہ الجھنوں سے بچنے کی جتنی کوشش کرتا ہے اتنا ہی اس میں مزید پھنستا جاتا ہے۔ اپنی بےلچک فطرت کی وجہ سے خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے سے عاجز رہتا ہے جس کی وجہ سے قدم قدم پر اس کو نت نئی پریشانیاں اپنے دام میں پھانستی رہتی ہیں بقول ڈاکٹر وزیر آغا :

" مزاحیہ کردار ــــ عام انسان کی مانند آزادانہ چل پھر نہیں سکتا بلکہ اپنی فطرت کے دام میں بری طرح جکڑا ہوتا ہے اور جب اسے کوئی انوکھا واقعہ پیش آتا ہے تو بوکھلا جاتا ہے۔ بدحواس ہو جاتا ہے اور خود کو اس قضیے سے رہائی دلانے کے لئے صحیح راستہ اختیار کرنے کے بجائے ایسے طریق پر چلتا ہے کہ مزید قضیوں میں گرفتار ہونے لگتا ہے۔ " ۵

مزاحیہ کردار بہت حد تک مسخرے سے مماثلت رکھتا ہے لیکن دونوں کے درمیان ایک خاص بُعد ہے۔ مزاحیہ کردار معصوم، سادہ دل اور عام انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کی حرکات میں تصنع نہیں ہوتا۔ وہ کسی کو اپنی حرکتوں سے ہنسانے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر مضحکہ خیز حرکات کرتا ہے۔ وہ خود کو باوقار، عقلمند اور باشعور سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس مسخرے کے اندر کوئی وقار نہیں ہوتا۔ نہ وہ معصوم اور سادہ دل ہوتا ہے۔ اس کی حرکتیں شعوری ہوتی ہیں وہ مضحکہ خیز حلیے بناکر اور عجیب و غریب حرکتوں کے ذریعے دوسروں کے لئے تفریح کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس کی حرکات میں تصنع ہوتا ہے۔ وہ اپنی شعوری حرکتوں کے ذریعہ ناہمواریوں کو جنم دیکر ہمیں محظوظ کرتا ہے اور اس کے عوض انعامات کا طلبگار ہوتا ہے۔

مسخرے کے علاوہ انگریزی ادب میں ایک اور کردار " فول " کا ہوتا ہے جو اپنی حرکتوں سے ہنسی کے سامان فراہم کرتا ہے۔ یہ کردار بظاہر احمق لیکن بہ باطن بے حد باشعور ہوتا ہے اور اپنے تیکھے اور نکیلے کٹیلے جملوں کے ذریعہ انسانی زندگی کی عام غلطیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ فلسفیانہ انداز میں ہماری غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ بظاہر وہ خود کو نشانہ تمسخر بناتا ہے لیکن حقیقتاً غیر سماجی حرکتوں اور غلطیوں کو منظر عام پر لاتا ہے۔

The Corrupt World is the final clue to the meaning of the Fool. He is not of tragic scope. He afferiss of man neither as animal nor angelic reason. " 6

وزیر آغا نے فول Fool کو ایک خوش باش فلسفی قرار دیا ہے۔
" فول کا مقام بھی ہماری توجہ کا طالب ہے کہ فول کا درجہ ایک ایسے خوش باش فلسفی کا ہوتا ہے جس کی نظر زندگی کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے اور وہ بالعموم الفاظ کی بازیگری سے کام لیکر زندگی کی ناہمواریوں کو طشت از بام کرنے کی سعی کرتا ہے۔ " ۷

فول یا کلاؤن مزاحیہ کردار سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ بظاہر احمق نظر آتا ہے لیکن بے حد عقلمند ہوتا ہے۔ اس کے ظاہر و باطن میں تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ شعوری طور پر اپنی احمقانہ حرکتوں سے سماج کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ خود پر طنز نہیں کرتا بلکہ دوسروں کی تحریف کرتا ہے۔ شیکسپیر کے یہاں فول کا کردار بہت اعلیٰ ملتا ہے جس کے ذریعہ اس نے روز مرہ کی انسانی ناہمواریوں کو واشگاف کیا ہے۔ فول، فالسٹاف اور ہملیٹ کا شمار ایسے ہی کرداروں میں ہوتا ہے۔

ایک اور کردار طنزیہ کہانیوں میں فارماکوس Pharmakos کا ملتا ہے جب مصنف اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے قربانی کا بکرا بناتا ہے یعنی اس کو اپنا نشانۂ تمسخر بناکر اس کی کھلی اڑاتا ہے اس میں بھی نشانہ ستم کوئی اور ہوتا ہے لیکن مزاحیہ کردار اور فارماکوس میں فرق ہے۔ ایک خود کردہ حماقتوں کا شکار ہوتا ہے تو دوسرا زبردستی نشانہ تمسخر بنتا ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو مزاحیہ کردار کے یہاں ایک ایسی انفرادیت ملتی ہے جو فارماکوس، مسخرے اور فول کے یہاں ناپید ہے۔ مزاحیہ کردار کی ممتاز خصوصیت تصنع کی حد تک بڑھا ہوا وقار اور اپنی عزت کا خیال ہے۔ وہ خود داری کے جھوٹے پندار میں مبتلا ہوتا ہے اس لئے وہ اپنی حرکات کو حق بجانب سمجھتے ہوئے اس پر عمل کرتے رہنے کو اپنی عادت بنالیتا ہے۔ وہ اپنی خامیوں کو اپنی شخصیت کی خوبیوں میں شمار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو اپنی حرکتوں میں کوئی ناہمواری کا احساس نہیں ہوتا اور نہ کسی قسم کا مضحکہ خیز پہلو نظر آتا ہے۔ وہ ایک قسم کی خود فریبی میں مبتلا ہو کر سماج کے دوسرے افراد کو کم عقل اور بے وقوف سمجھتا ہے اور اپنے کو عالم اور عقلمندوں میں شمار کرتا ہے۔ اس کی یہی عادتیں اس کو دوسروں کی نظر میں نشانہ تمسخر بناتی ہیں بقول ڈاکٹر شمع افروز زیدی:

" مزاحیہ کردار ماحول کے تقاضوں سے بے نیاز آگے بڑھتا رہتا ہے۔ ماحول کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کا اسے مطلق خیال نہیں ہوتا۔ وہ جس روش کو روز اول اختیار کرلیتا ہے اس سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ اس باعث زندگی میں اسے اکثر و بیشتر مضحکہ خیز واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ماحول کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنی روش بدل لیتا ـــــ تو شاید نشانہ تمسخر بننے سے بچ جاتا مگر اس کی فطرت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ

عام انسان کی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ "۸

مزاحیہ کردار خود نمائی کے جذبے سے بھی سرشار ہوتا ہے۔ وہ اپنے کو مثالی شخصیت سمجھتا ہے۔ وہ بات بات میں اصول و ضوابط کی باتیں کرتا ہے لیکن عملی طور پر اس کے برعکس ثابت ہوتا ہے یعنی اس کی گفتار و کردار میں حد درجہ تضاد پایا جاتا ہے۔ کردار و گفتار کا یہ تضاد لوگوں کو ہنسنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری نے مزاحیہ کردار کی دو خصوصیات بتائی ہیں:

"مزاحیہ کردار میں دو کردار کا پایا جانا بہت ضروری ہے۔ اول ایک نوع کا بے لوچ پن اور سخت گیری اور دوسرے خود بینی و خود نمائی۔ یہ دونوں خصوصیات اس امر کی علامت ہیں کہ ایسا کردار نہ اپنے آپ میں ربط تلاش کرسکا ہے اور نہ سماج کے دوسرے افراد سے تطابق اور ہم آہنگی قائم کرسکتا ہے۔ وہ ہمیشہ خود فریب میں رہتا ہے اور دوسروں کو فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہی چیز مزاح نگار کو ہنسنے پر اکساتی ہے۔ "۹

مزاحیہ کردار کے اندر ایک قسم کی انانیت پائی جاتی ہے۔ وہ خود کو سماج میں سب سے زیادہ اعلیٰ و ارفع متصور کرتا ہے۔ وہ اس جذبے کے تعلق سے دوسروں کی رہنمائی کا خواہاں رہتا ہے۔ لیکن جب اس کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوتی ہے تو یہ باور کرلیتا ہے کہ لوگ اس کی قدر و قیمت سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کو اہمیت نہیں دیتے۔ اس سے اس کے جھوٹے وقار کو شدید ضرب لگتی ہے اور وہ مغموم ہوجاتا ہے۔

۱ اردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا ۹-۲۷۸ نیو لیتھو پریس، دہلی ۱۹۸۱ء

۲ ایضاً ص۲۷۹ ایضاً "

۳ مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ از ابوالبرکات کربلائی ۴۵ نصرت پبلیشرز لکھنؤ

۴ ادب اور تنقید از ڈاکٹر اسلوب ــــ احمد انصاری ۲۵۴ نیشنل آرٹ پرنٹرس الہ آباد ۱۹۶۸ء

۵ اردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا ص۲۸۲ ۱۹۸۱ء

۶ Shakespeṛs Doctrine of Nature by John - f- , Dannby pp. 110

1982

۷ اردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا ۲۵۴ ۱۹۸۱ء

۸ اردو ناول میں طنز و مزاح از ڈاکٹر شمع افروز زیدی ۲۴۲ ۱۹۷۶ء

۹ ادب اور تنقید از ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری ص۲۳۵ ۱۹۶۸ء

اقبال شانہ
خفل، سعودی عرب

پہلوانی غزل

ہے میرے بازوؤں میں زور کتنا پھر بتاؤں گا
اکیلے میں کبھی تم مجھ سے ملنا پھر بتاؤں گا

لگاکر پیٹھ پر گھونسا میری اترا رہے ہو کیا!
میاں تم سامنے سے وار کرنا پھر بتاؤں گا

میرے منہ پر لگاکر ایک چانٹا مسکراتے ہو
طمانچہ دوسرا تو مار دینا پھر بتاؤں گا

اجازت ہے تمہیں الفت میں میری جان دینے کی
کسی بھی غیر کی چاہت میں مرنا پھر بتاؤں گا

درختوں کے میرے پھل توڑتے ہو بے حیائی سے
ذرا تم پیڑ سے نیچے ٹپکنا پھر بتاؤں گا

میرا گھر چھوڑ کر تم جارہے ہو شوق سے جاؤ
کسی بھی دوسرے کے ساتھ رہنا پھر بتاؤں گا

میں نالائق ہوں، پاجی، بے حیا، احمق، نکما ہوں
اگر ہمت ہے تم میں پھر سے کہنا، پھر بتاؤں گا

نہیں کرتے محبت ہم سے جاناں نہ سہی لیکن
ذرا تم دوسرے سے عشق کرنا پھر بتاؤں گا

سناتے ہو غزل چوری کی اکثر تم ڈھٹائی سے
غزل شانہ کی اپنی کہہ کے پڑھنا پھر بتاؤں گا

ملٹی نیشنل غزل

ہے نظر میں حسن "انگلستان" کا
دل میں لیکن پیار "ہندوستان" کا
"انڈین" بیوی ہے قسمت میں لکھی
یار بھی ہے اک حسیں "لبنان" کا
آنٹی "ہسپانیہ" کی ہے میری
اور انکل ہے میرا "یونان" کا
ایشیا چھت پہ میرے "چین" کا
گھر میں ٹی وی ہے مگر "جاپان" کا
پیر میں "اٹلی" کے جوتے آگئے
مل گیا موزہ بھی "پاکستان" کا
"بیلجیم" کی ہاتھ میں لے کر چھری
کاٹتا ہوں مرغ "ترکستان" کا
"روم" کے فانوس چھت سے ہیں لگے
فرش پر قالین ہے "ایران" کا
آپ کے ڈیڈی کی دولت دیکھ کر
یاد آیا شیخ "عربستان" کا
میں گیا "قبرص" تو لوگوں نے کہا
ہوگیا شانہ تو "قبرستان" کا

شاید

سر سے باندھے کفن وہ بیٹھا ہے
ریل کا انتظار ہے شاید
دن بہ دن بڑھ رہی ہے جو یارو
شاعروں کی قطار ہے شاید
اپنی قسمت میں ایسا لگتا ہے
ان کے ڈیڈی کی مار ہے شاید
آج اس کی گلی میں ہے کرفیو
سخت مشکل میں یار ہے شاید
گھس گئے گھر میں یار کے شانہ
عشق دیوانہ وار ہے شاید

روف رحیم

ہندی غزل

پریم کا نو نرمان کریں گے
کام ہے یہ آسان کریں گے

کمپیوٹر کی بات نہ پوچھو
ودھوا کو ودھوان کریں گے

شاعر کی ہے قسمت الٹی
مرنے پر سمان کریں گے

آپ کی رچنا میں لے سن لی
آئیے اب جل پان کریں گے

نام پہ فرقوں کے یہ نیتا
شہروں کو شمشان کریں گے

خالی ہے پولس کا خزانہ
پیدل کو چالان کریں گے

پہلے دے کر دان میں موٹر
بعد میں کنیا دان کریں گے

کام نہ کر پائے جو شیطاں
کام وہی انسان کریں گے

وہ بھی نردھن کر نہ سکے گا
جو چاہے دھن وان کریں گے

مل جائے سسرال جو چنگا
ہم بھی جگ میں شان کریں گے

جان اگر مل جائے رحیم اک
ارپن اس پر جان کریں گے

20-5-525 شکر گنج حیدرآباد

غزل

کیا ہوئی شادی مری مجھو جھمیلہ ہوگیا
نیم کی وہ شاخ تھیں اور میں کریلا ہوگیا

جھانکتا رہتا تھا چھت کی روزنوں سے ہر گھڑی
ان کے گھر میں گھسنے میں پانی کا ریلا ہوگیا

حسن زن بھی کیا بلا ہے جب ہوا جھگڑا کوئی
سب ہوئے اس کی طرف اور میں اکیلا ہوگیا

آتے ہی رہتے ہیں قربانی کے بکروں کی طرح
ان کا گھر عشاق کے حق میں تبیلہ ہوگیا

گود میں ہے ان کی پاکٹ ڈاگ اس انداز سے
جیسے کہ زیب کمر کنجی کا جھیلہ ہوگیا

میری ان کی گفتگو گھر میں ہوئی کچھ اس طرح
میرے دروازے کے آگے ایک میلہ ہوگیا

اس طرح الٹی ہے بازی شہرتوں کے کھیل میں
میں گرو جس شخص کا تھا اس کا چیلہ ہوگیا

اس شکر نے میری حالت پتلی کردی ہے رحیم
میں بھی پتھر تھا اب مٹی کا ڈھیلا ہوگیا

عرفان حسین کا قتل!

آئینہ دکھانے کی سزا؟

عین اختر



"میں کارٹون بنائے بغیر نہیں رہ سکتا! اس سے مجھے طمانیت اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔" مشہور کارٹونسٹ عرفان حسین نے یہ بات اپنے قتل سے قبل اپنے ایک انٹرویو میں کہی تھی۔ لیکن اتفاق دیکھئے کہ ان کو طمانیت اور مسرت بخشنے والے کارٹون ہی ان کی دردناک موت کا سبب بن گئے۔ کیونکہ یہی کارٹون بہت سے لوگوں کے لئے پیچ وتاب کھانے اور خواری کا کرب جھیلنے کا سبب بنتے تھے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ دوسروں کو خوار کرکے عرفان کو مسرت حاصل ہوتی تھی۔ عرفان کا کہنا تھا: "ایک کارٹونسٹ کو مظلوموں اور عام آدمی کا طرفدار ہونا چاہئے اور قوت واختیار رکھنے والوں کی برائیوں کو اجاگر کرنا چاہئے۔ اسے ایک ناقد ہونا چاہئے لیکن بدطینت نہیں ہونا چاہئے۔" عرفان کو جاننے والے سبھی لوگوں کو اعتراف ہے کہ عرفان بدطینت نہیں تھے۔ اسی لئے سبھی لوگ کہتے ہیں کہ عرفان کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ وہ ایک کم گو اور خوش مزاج انسان تھے۔ لیکن اس خوش مزاج انسان کا جس بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا ہے اس سے عرفان کے تئیں قاتلوں کی سخت نفرت اور شدید انتقام کا اظہار ہوتا ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق عرفان کے جسم پر کل ۲۸ وار کئے گئے تھے۔ جس میں سے ۷ وار انتہائی مہلک تھے اور نازک حصوں پر کئے گئے تھے۔ قاتلوں نے پہلے ان کے ہاتھ اور پیر باندھ دیئے تھے اور قتل کرنے سے پہلے انہیں سخت اذیت دی گئی تھی۔ ۱۳ مارچ کو جس روز ان کی لاش برآمد ہوئی اس سے چار دن پہلے ہی ان کے قتل کئے جانے کا خیال پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جبکہ وہ چھ دن پہلے یعنی ۸ مارچ سے غائب تھے۔ ۸ مارچ کو وہ آفس سے اپنے ایک دوست کے ساتھ پریس کلب گئے تھے، پھر وہاں سے اپنے دوست کو کشمیری گیٹ چھوڑتے ہوئے صاحب آباد میں واقع اپنے گھر کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں انہوں نے اپنی اہلیہ سے فون پر بات کی تھی اور کہا تھا کہ وہ ۱۵ منٹ میں گھر پہنچ رہے ہیں لیکن اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

انگریزی ہفت روزہ "آؤٹ لک" کو اپنے چبھتے ہوئے کارٹونوں سے مقبول بنانے والے ۳۶ سالہ کارٹونسٹ کا قتل بظاہر پولیس کے لئے ایک معمہ بن گیا ہے اور وہ تین پہلوؤں سے اس کی جانچ کر رہی ہے۔ آیا یہ رہزنی کا کیس ہے؟ ذاتی رنجش کا معاملہ ہے یا پیشہ سے جڑا انتقام ہے۔ عرفان کے گھر والے اور ان کے نزدیکی لوگ ذاتی رنجش کے امکان کو بالکل مسترد کرتے ہیں اور رہزنی کا معاملہ خیال کرنا بھی بس ایک کھینچ تان والی بات ہی سمجھی جا رہی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ عرفان حسین خونخوار تنظیم شیوسینا کی دہشت گردی کا شکار ہوئے ہیں۔ اس خیال کو تقویت دینے والے بہت سے عوامل موجود ہیں۔ عرفان کی گمشدگی کے تین روز بعد نیشنل ہیرالڈ کے کارٹونسٹ پریش ناتھ کے گھر پر ایک فون آیا تھا۔ فون کرنے والے نے پریش کی اہلیہ کو بتایا تھا: "عرفان کو تو ہم نے اوپر پہنچا دیا ہے دوسرا نمبر سدھیر تیلنگ کا ہے اور پھر تمہارے شوہر کی باری ہے۔" فون کرنے والے نے خود کو شیوسینک بتایا تھا۔

ناگپور کے ایک کاروباری گھرانے سے تعلق رکھنے والے عرفان حسین نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کی تھیں۔ کارٹوننگ اور آرٹ سے انہیں بچپن سے ہی دلچسپی تھی۔ مشنری اسکول میں سیکنڈری تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ناگپور کے ایک آرٹ کالج سے کارٹوننگ میں امتیازی پوزیشن کے ساتھ گریجویشن کی ڈگری حاصل کی تھی۔ شروع میں وہ مقامی اخباروں کے لئے کارٹون بنایا کرتے تھے۔ ۱۹۸۹ء میں دہلی آکر انہوں نے مشہور نیوز میگزین "کلیا نوادے" میں کام شروع کیا تھا لیکن یہاں زیادہ دنوں نہیں ٹک سکے۔ اس کے بعد "آبزرور" اور "پائنیر" میں کام کیا۔ دو سال پہلے وہ "آؤٹ لک" سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ایک ملاقات میں "آؤٹ لک" سے وابستگی کے بارے میں بتاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا: "میں جب آؤٹ لک سے وابستہ ہوا تھا تو کسی قدر نروس تھا کیونکہ میں نے ایک عظیم کارٹونسٹ کی جگہ پر کی تھی۔ لیکن جلد ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔

افکار ملی

اداریہ

• ڈاکٹر سلطان عمر انچارج پرنسپل انوار العلوم کالج کا گزشتہ مہینے اچانک انتقال ہوگیا۔ انتقال کے دوسرے ہی دن وہ حج کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ دیرینہ رفیق اور ساتھی سلطان عمر اعلیٰ درجہ کے انسان تھے۔ خلوص و محبت کا پیکر، اصولوں اور ڈسپلن کے پابند، اردو کے سچے خدمت گذار، نہایت شفیق استاد، ملت کے درد مند اور ہر ایک کی مدد کے لیے ہر دم آمادہ۔ علم سیاسیات کے استاد کی حیثیت سے بھی بڑا نام کمایا۔ اردو ذریعہ تعلیم کے زبردست حامی تھے وہ ملت کا ایک گراں بہا سرمایہ تھے۔ شگوفہ اور مدیر شگوفہ کو ٹوٹ کر چاہنے والے۔ ایسی محبت کرنے والے دوست کا جدا ہونا ایک ایسا سانحہ ہے جس کا لفظوں میں اظہار ممکن نہیں۔ ان کے انتقال پر کس کس کو پرسہ دوں ان کی اہلیہ، بچوں، احباب و اقربا کو۔ ملت کے غم گساروں کو، اردو کے چاہنے والوں کو، اپنے آپ کو؟ اللہ غریق رحمت کرے۔ اس شخص کی دائمی جدائی کا غم ایک پہاڑ ہے جو سینہ پر سوار ہے۔

• شگوفہ کے کاتب مشہور خوش نویس محمد غالب کا بھی پچھلے دنوں انتقال ہوگیا۔ غالب اپنے فن میں یکتا تھے۔ کیرالا اور آندھرا پردیش کے بعض شہروں میں خطاطی کے استاد کی حیثیت سے بھی کام کرچکے تھے۔ کالج آف فائن آرٹس کے تحصیل یافتہ اچھے آرٹسٹ تھے۔ کاتبوں کی عام روش کے برخلاف وعدہ کے بڑے پابند تھے۔ ایک عرصہ تک شگوفہ کی کتابت کا کام سنبھالے ہوئے تھے۔ غالب ثانی کے نام سے مزاحیہ شعر بھی کہتے تھے۔ شعر کہنے کا ان کا اپنا انداز تھا۔ چند ماہ قبل کولہے کی ہڈی کے ٹوٹنے سے بہت کمزور ہوگئے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ انہیں اپنی رحمتوں سے سرفراز کرے۔ آمین

زندہ دلان حیدر آباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد ۳۲ شمارہ ۵ — حیدر آباد

مئی ۱۹۹۹ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

طباعت:
دائرہ پریس چھتہ بازار

قیمت فی پرچہ ۱۲ روپے — زر سالانہ ۱۴۰ روپے — بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ : ۳۱۔ بچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ۔ حیدر آباد۔ ۱ فون (آفس) 4745716
4576064 (رہائش)

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

مال مفت (انشائیے)

قسط وار مضامین

گوشہ مسیح انجم (پہلی برسی کے موقع پر)

حق تو یہ ہے (ترجمہ)

تعارف

منظوم تاثر

چورن (منظومات)




WELCOME TO ~~QUIT~~ INDIA
AS PRESIDENTS
PMS
MINISTERS


WOULD ANYONE LIKE TO PLAY CRICKET WITH ME?
JUST WATCH OUT FOR THE LAND MINES.

مجتبیٰ حسین

پتھر کے دور سے پتھری کے دور تک

کون کہتا ہے کہ انسان پتھر کے دور سے نکل کر لوہے کے دور، صنعتی دور وغیرہ سے ہوتا ہوا خلائی دور میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ انسان آج بھی پتھر کے دور میں زندہ ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ آج بھی ہم بڑے اہتمام کے ساتھ ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے رہتے ہیں۔ ہمارے رہنماؤں کا دل پتھر کا ہوتا ہے اور ان کی عقل پر تو اور بھی زیادہ پتھر پڑے رہتے ہیں۔ ان حالات میں ہم جیسے لوگ اپنے دل پر پتھر رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اردو شاعر تو خیر یوں بھی بڑی آسانی سے ایک دوسرے کے سر پھوڑنے کے اہل ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے از راہ عنایت اپنے ہی پتھر سے خود اپنا سر پھوڑنے کو ہمیشہ پسندیدہ فعل جانا بلکہ اس خصوص میں معشوق کے سنگ آستاں تک کو زحمت دینا گوارا نہ کیا۔

وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا   تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

کہنے کو انسان چاہے کسی بھی دور میں داخل ہوا ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پتھر کی اہمیت ہر دور میں برقرار رہی ہے بلکہ حضرت شیخ سعدی تو پتھر کی آزادی کے بھی قائل رہے ہیں۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ ایک بار وہ کسی شہر سے گزر رہے تھے تو ایک کتے نے ان پر بھونکنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کتے کو مارنے کے لیے زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر کو اٹھانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ پتھر زمین میں کافی اندر تک دھنسا ہوا ہے۔ اس پر شیخ سعدی نے کہا "بڑا عجیب شہر ہے۔ یہاں لوگ کتے کو تو کھلا چھوڑ دیتے ہیں لیکن پتھر کو باندھ کر رکھتے ہیں۔"

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ہم کسی بھی بات کو گھما پھرا کر بیان کرنے کے عادی ہیں۔ ہم نے اپنے قارئین پر اتنی لمبی تمہید کا پتھراؤ صرف یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے پتّے کی پتھری کا آپریشن ہوا ہے۔ اور اس آپریشن کے بعد ہم پر یہ راز منکشف ہوا کہ انسان پتھر کے دور سے نکل کر کسی اور دور میں نہیں گیا بلکہ پتھری کے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ کہنے کو انسان کئی ادوار سے گزر کر خلائی دور میں داخل ہوا ہے لیکن ہر دور میں وہ کچھ ایسی حرکتیں کرتا رہا ہے جن سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر سے پتھر کے دور میں داخل ہونے کی دلی خواہش رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ جو ایٹمی طاقتیں آئے دن ایٹمی تجربات کرتی رہتی ہیں تو وہ انسان کی اس دلی خواہش کی غماز ہیں۔ خیر ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ پچھلے ہفتہ حیدرآباد کے میڈی سٹی اسپتال میں ہمارے اس پتّے کو جسے ہم زندگی بھر پتا تو مارتے رہے یا جسے پانی پانی کرتے رہے، ہمارے پیٹ سے کاٹ کر نکال باہر کر دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس پتّے کو پتھری کی شکایت لاحق ہو گئی تھی اور جو پچھلے دو ڈھائی برسوں سے ہمیں تنگ کرتا چلا آ رہا تھا۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ہم مثالی صحت رکھتے ہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ [illegible] چالیس ...

میں ہمارا ٹمپریچر کبھی نارمل سے اونچا نہیں ہوا۔دل ہمارا آج تک اس لیے خراب نہیں ہوا کہ ہم نے اسے کبھی اپنے پاس نہیں رکھا۔جہاں کوئی اچھی شکل دیکھی اس کی جھولی میں اسے ڈال دیا۔ہماری ساری خرابیوں کی جڑ ہمارا پاپی پیٹ ہی رہا ہے جس کی خاطر ہم نے کیا کیا پاپڑ نہ بیلے مگر اسے ہم کبھی اپنی ذات سے الگ نہ کرسکے۔یوں بھی دل کے تو کئی خریدار مل جاتے ہیں لیکن پیٹ کا کوئی خریدار نہیں ملتا۔غرض ہم جہاں گئے اپنے اس بدکار پیٹ کو ساتھ لے گئے (دعوتوں میں تو اور بھی زیادہ ساتھ لے گئے) ہمارے دوست افتخار عارف کا شعر ہے۔

شکم کی آگ لئے پھر رہی ہے شہر بہ شہر سگ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

ڈیڑھ دو برس پہلے جب ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے پتّے میں پتھری آگئی ہے تو ہم نے اس کے آپریشن کو حتی الامکان ٹالنا چاہا۔ہم نے سوچا کہ جس پتّے کو ہم زندگی بھر مارتے رہے۔اب اسے کیونکر اپنی ذات سے الگ کریں۔ہماری ذات میں مارنے کے لیے کچھ تو ہونا چاہیے۔اگر یہ نکل جائے تو ہم کسے ماریں گے۔نفس امارہ کو مارنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ مارا نہ گیا۔اب ایک پتارہ گیا ہے سو وہ بھی خوش ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ دوستوں کی مزاج پرسی کرنے کے لیے یوں تو ہم سینکڑوں بار اسپتال گئے ہیں لیکن خود کبھی اسپتال میں شریک نہیں ہوئے۔اگرچہ نوجوانی میں بیسیوں مرتبہ ہم اپنے ہوش گنوا چکے ہیں لیکن اَستھیسیا (Anesthesia) کی مدد سے اپنے ہوش گنوانے کو ہم نے ہمیشہ کسرشان سمجھا پھر پیٹ کے آپریشن سے ہم اس لیے بھی گھبراتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ بعض اوقات غلطی سے آپریشن کے دوران اپنی چھری، چاقو، پستول، قینچی وغیرہ پیٹ میں رکھ کر بھول جاتے ہیں اور بعد میں مانگنے چلے آتے ہیں۔دیکھا جائے تو یہ بھی ڈاکٹروں کی بڑائی ہے ورنہ آج کے زمانے میں کون کسی کے پیٹ میں اپنی کوئی چیز چھوڑتا ہے۔بعض لوگوں کا ہاضمہ اتنا اچھا ہوتا ہے کہ پورے ملک کو تک کھا کر ہضم کرلیتے ہیں لیکن ہم جیسوں سے ایک معمولی قینچی تک ہضم نہیں ہوتی۔ویسے ڈاکٹروں کا بس چلے تو مریض کا پورا پیٹ تجوری سمیت نکال کر لے جائیں۔کیا کریں ڈاکٹر کو بھی تو اپنے پاپی پیٹ کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔غرض ایسی ہی باتوں کی وجہ سے ہم پیٹ کے آپریشن سے گریز کرتے رہے۔یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ہم نے اپنے دل میں کئی باتیں چھپا کر رکھی ہیں لیکن آج تک ہمارے پیٹ میں کوئی بات نہ رہ سکی۔یہی وجہ ہے کہ لوگ ہمیں ہلکے پیٹ کا آدمی سمجھتے ہیں۔پہلے ہی ہمارا پیٹ ہلکا ہے۔اوپر سے اس میں سے پتّا نکال دیا جائے تو اس میں باقی کیا رہ جائے گا۔

اسے ہمارے خوش بختی ہی کہیے کہ ہمارے پیٹ کا آپریشن امراض شکم کے نوجوان سرجن ڈاکٹر ونئے کمار نے کیا جو ہمارے کرم فرما جناب شیو شنکر کے فرزند ہیں۔ہمیں یہ یقین تھا کہ شیو شنکر صاحب سے ہمارے مراسم کی وجہ سے ڈاکٹر ونئے کمار ہمارے پیٹ میں قینچی وغیرہ نہیں بھولیں گے۔جب ہم نے اس بھروسہ کا اظہار ڈاکٹر ونئے کمار سے کیا تو بولے "جناب آپ کے پیٹ کو کھولا ہی نہیں جائے گا تو اس میں قینچی کو رکھ کر بھولنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے میں تو سرجری کی جدید تکنیک (Laparo Scopy) کے ذریعہ آپ کے پتّے کو پتھری سمیت باہر نکال لوں گا۔چنانچہ ڈاکٹر ونئے کمار نے ڈیڑھ گھنٹہ کی سرجری کے ذریعہ کچھ ایسی صفائی سے ہمارے پتّے کو پیٹ سے نکال باہر کیا کہ آپریشن کے چھ گھنٹوں بعد ہی ہم نہ صرف اپنے بستر میں اٹھ بیٹھے بلکہ کچھ دور چلنے کا بھی مظاہرہ کیا۔ڈاکٹر ونئے کمار نہایت مستعد اور چاق و چوبند نوجوان ہیں نہ اپنی بات چیت میں "خدا کا فضل، خدا حافظ، انشاء اللہ، ماشاء اللہ جیسے لفظوں کا بے دریغ

استعمال کرتے رہتے ہیں ۔ گویا علم طب کی مدد سے جہاں عمل جراحی انجام دیتے ہیں وہیں زخموں پر مندرجہ بالا اردو لفظوں کے ذریعہ مرہم کا پھاہا بھی رکھتے جاتے ہیں ۔اسے ڈاکٹر ونئے کمار کی جراحی کا کمال کہئے یا ہماری مثالی صحت کا کرشمہ کہ اسپتال میں اپنے دو روزہ قیام کے دوران میں وہاں کے عملہ سے ہمارے تعلقات خوشگوار نہ رہ سکے ۔ نرسیں ہمیں مریض سمجھ کر ہم پر اپنے التفات کی بارش برسانا چاہتی تھیں اور ہماری خواہش تھی کہ یہی کام وہ ہمیں صحت مند سمجھ کر انجام دیں ۔ سوچنے کے اس بنیادی فرق کی وجہ سے اسپتال کی ایک دایا نے تو ہمیں زبردستی پہیہ دار کرسی پر بٹھا دیا کہ بندہ خدا کچھ دیر کے لیے تو مریض بنے رہو ۔ مریض بننے کی اتنی بھاری فیس اسپتال کو دے رہے ہو تو اس کا فائدہ بھی اٹھاؤ مگر ہم نے مریض بن کے نہ دیا ۔ چنانچہ آپریشن کے دوسرے ہی دن علی الصبح جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم غفلت میں اسپتال کے کپڑوں میں ہی چہل قدمی کرنے کے لیے اپنے کمرہ سے باہر نکل کر چلے گئے ۔ کیا کریں چہل قدمی کی عادت پچیس تیس برس پرانی ہے ۔اس سے کیونکر دستبردار ہو جائیں ۔اس پر نرسوں نے واویلا مچایا کہ یہ مریض اسپتال میں صحت مندوں کی سی حرکتیں کرتا ہے ۔ بعض اوقات تو اپنے بستر سے بھی غائب رہتا ہے ۔ان حالات میں ڈاکٹر ونئے کمار نے ہمیں دو ہی دن میں اسپتال سے چھٹی دینے میں عافیت سمجھی (ہماری نہیں اپنی) اس کی ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری مزاج پرسی کے لیے آنے والے احباب بھی اسپتال کے عملہ کے لیے مسئلہ بنتے چلے جا رہے تھے حالانکہ ہمارے احباب کو ہماری علالت کی اطلاع صرف اڑتے اڑتے ہی ملی تھی کچھ کرم فرما ایسے بھی تھے جنہوں نے میڈی سٹی اسپتال کی بجائے میڈ وین اسپتال سن لیا اور ہماری مزاج پرسی کرنے کے لیے وہاں پہنچ گئے ۔ ہمارے بزرگ دوست جناب محسن علی بتاتے ہیں کہ وہ بھاگے بھاگے میڈ وین اسپتال گئے ۔ ریسپشن پر ہمارا نام بتایا تو انہیں ایک کمرہ میں بھیج دیا گیا ۔ وہاں پچ مچ ایک مجتبیٰ حسین داخل تھے جو اتفاق سے اس وقت بعض ضروری طبی معائنے کروانے کے لیے دواخانے کے کسی شعبہ میں گئے ہوئے تھے ۔ البتہ کمرہ میں ان کی خوش اخلاق بیگم صاحبہ ضرور موجود تھیں ۔ محسن علی صاحب کو بڑے تپاک سے یہ کہہ کر بٹھایا کہ آپ تشریف رکھیں وہ ابھی آجاتے ہیں ۔ محسن علی صاحب نے ہمیں بعد میں بتایا کہ خاتون چونکہ خاصی کم عمر نظر آرہی تھیں اس لیے انہیں ایک لمحہ کے لیے شبہ بھی ہوا کہ شاید وہ غلط جگہ آگئے ہیں ۔ (محسن علی صاحب صحیح جگہ پر پہنچ کر اسے غلط سمجھنے کے لیے یوں بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں) اتنی دیر میں وہ ہمارے بارے میں کئی مشکوک اندازے بھی قائم کرتے رہے ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اصل مجتبیٰ حسین آئے تو ان کی غلط فہمی رفع ہوئی مگر افسوس کہ ان کے میڈ وین سے میڈی سٹی آنے تک ہم گھر واپس ہو چکے تھے ۔اس معاملہ میں ہمارے ایک اور کرم فرما پروفیسر جعفر نظام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ۔ مزاج پرسی کرنے والوں کی بھیڑ تو یقیناً رہی لیکن ہمیں یہ سہولت حاصل رہی کہ ان ہی دنوں میں پروفیسر سراج الدین بھی میڈی سٹی اسپتال کے ایک کمرہ میں شریک تھے ۔ جب مزاج پرسی کرنے والوں کی بھیڑ بڑھ جاتی تو ہمارے ایک دوست بعض احباب سے کہتے "بھئی اتنی دیر میں آپ ذرا پروفیسر سراج الدین صاحب کی مزاج پرسی کر آیئے" جب سراج الدین صاحب کے کمرہ میں لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی تو وہ لوگوں کو ہماری طرف بھگا دیتے تھے ۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون کس کی مزاج پرسی کر رہا ہے ۔اس مسئلہ کا بھی واحد حل یہی تھا کہ ہم جلد از جلد اسپتال سے گھر بھاگ آئیں ۔ سو ان دنوں پتہ !! احباب کے بغیر ہم آرام سے ہیں اور سچ مچ آرام کر رہے ہیں ۔

ڈاکٹر محبوب راہی (اکولہ)

جو کچھ نہ بن سکا اسے ٹیچر بنا دیا

پہلے کو ہم نے چیف منسٹر بنا دیا
جو دوسرا تھا اس کو کمشنر بنا دیا
اور تیسرے کو ڈپٹی کلکٹر بنا دیا
چوتھے کو ہم نے بینک منیجر بنا دیا
جو کچھ نہ بن سکا اسے ٹیچر بنا دیا
بیٹوں کا اپنے ہم نے مقدر بنا دیا

پڑھنے میں کند ذہن تھے لکھنے میں ڈل تھے سب
ہوتے ہیں عام طور سے جو آجکل تھے سب
بے کار بے بساط تھے سب بے عمل تھے سب
ہاں بدمعاشیوں میں مگر بے بدل تھے سب
بدتر تھے سب کے سب انہیں بہتر بنا دیا
بیٹوں کا اپنے ہم نے مقدر بنا دیا

جانا ہے دیش بھاڑ میں گر جائے شوق سے
مرنا اگر ہے قوم کو مرجائے شوق سے
شیرازہ حیات بکھر جائے شوق سے
جو کچھ بھی ہے، گزرتا گزر جائے شوق سے
ہم نے تو خار کو بھی گل تر بنا دیا
بیٹوں کا اپنے ہم نے مقدر بنا دیا

دولت لٹائی ۔ مٹی بھی اپنی خراب کی
کوشش جو کی خدا کی قسم کامیاب کی
پانی کو ہم نے خوبی عطا کی شراب کی
صورت ہر ایک ذرے کو دی آفتاب کی
ہر قطرے کو اتھاہ سمندر بنا دیا
بیٹوں کا اپنے ہم نے مقدر بنا دیا

پہنیں گے پیسہ دھوئیں گے پیسہ نہائیں گے
اوڑھیں گے پیسہ اور وہ پیسہ نہائیں گے
ناچیں گے دھن پہ پیسے کی پیسہ نچائیں گے
لوٹیں گے، دونوں ہاتھوں سے پیسہ لٹائیں گے
سیر ہوس کا ان کو شناور بنا دیا
بیٹوں کا اپنے ہم نے مقدر بنا دیا

اقبال شاذ　　حقل، سعودی عرب

آہستہ آہستہ

چلوگی گر میری جان جگر آہستہ آہستہ
سفر میں ہی رہوگی عمر بھر آہستہ آہستہ

حقیقت یہ ہے ڈیڈی آپ کے ہیں آپ سے بہتر
لگاتے ہیں وہ چانٹے گال پر آہستہ آہستہ

مسلسل گھورتے رہنے کا ٹی وی یہ نتیجہ ہے
ہماری ہوگئی دھندلی نظر آہستہ آہستہ

اگر اک دور بیں اچھی سی لے کر غور سے دیکھیں
نظر آجائے گی ان کی کمر آہستہ آہستہ

اگر میں آپ سے ملتا رہا سنسان راتوں میں
نکل جائے گا شیطان کا ڈر آہستہ آہستہ

کسی بھی جھیل میں ہرگز نہ بھولے سے قدم رکھنا
نگل جائے گی پانی میں مگر آہستہ آہستہ

بخار عشق دونوں کو ہے لیکن فرق اتنا ہے
ادھر تیزی سے چڑھتا ہے ادھر آہستہ آہستہ

لگاتے رہنا کش سگریٹ کے شاذ مسلسل تم
تمہیں بیمار پڑنا ہے اگر آہستہ آہستہ

یوسف ناظم

۱۹، البلال،
باندرہ ریکلیمیشن، ممبئی ۔ ۵۰

کوّے

ان دنوں پریشان کون نہیں ہے لیکن ہم نے سنا ہے کہ اس وقت سب سے زیادہ پریشان اور حیران کوّے ہیں۔ ان کی پریشانی یہ ہے کہ وہ کس کس کو کائیں اور کہاں تک کائیں۔ اب کوئی آدمی ایسا نہیں ہے، جو جھوٹ کے علاوہ کچھ اور بولتا ہو۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جھوٹ اشرف المخلوقات نام کی مخلوق میں پوری طرح سرایت کر گیا ہے اور ان کی رگوں میں خون کی طرح نہ صرف دوڑ رہا ہے بلکہ زبان سے ٹپک رہا ہے (زبان سے ٹپکنے کی وجہ سے ہونا تو اسے سرخ چاہیے تھا لیکن یہ ہے سفید) کوؤں کی آبادی یوں بھی انسانوں کی آبادی سے بہت کم ہے۔ ان کی عمر کا اوسط بھی بس یوں ہی سا ہے۔ جو غذا یہ کھاتے ہیں اسے کھا کر اتنے دن زندہ رہنا بھی کمال ہے۔ اس لیے ان میں معمر کوے ہوتے ہی نہیں ہیں۔ ہم نے ان کی عمر کے بارے میں تحقیق نہیں کی ہے۔ (ضرورت بھی نہیں ہے) لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ جوں ہی ان کے اڑنے کی سکت جواب دے دیتی ہے، یہ بھی اپنے کسی عزیز پر بار بننا پسند نہیں کرتے۔ (اچھی عادت ہے) کوؤں میں ہم نے دیکھا ہے کہ ان میں اتحاد بہت ہوتا ہے اور یہ دل کے نرم ہوتے ہیں (حالاں کہ ان کی شکل و صورت کچھ اور ہی کہتی ہے) ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں آتے ہیں شاید انہیں پی جاتے ہوں گے۔ کہاں بار بار کنکر تلاش کر کے پانی کے برتنوں میں ڈالیں اور قطروں سے پیاس بجھائیں، پیاس تو بجھتی ہی نہیں لیکن وقت کتنا برباد ہوتا ہے۔ یوں بھی آنسوؤں کو دل گرفتگی کا سمبل سمجھنا مناسب نہیں ہے۔ شتر مرغ کے آنسوؤں کی مثال موجود ہے۔ کوؤں کو ہم نے بری طرح غمزدہ ہوتے دیکھا ہے۔ اس کا مظاہرہ کسی کوے کی وفات کے موقع پر ہوتا ہے۔ جب کوئی کوّا طبعی عمر کو پہنچنے پر یا کسی ناگہانی حادثے کا شکار ہو کر وفات پا جاتا ہے تو بیسیوں کوّے (جنہیں بھی اطلاع ملتی ہے) دور دور سے آکر اس کی نعش کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ کوؤں میں یوں بھی شور کرنے کا رواج ہے اور اس تعزیت کے موقع پر تو وہ اپنے جذبات پر قابو رکھ ہی نہیں سکتے۔ ان کے یہاں زیادہ سے زیادہ شور کرنا بھی ان کی اخلاقیات میں داخل ہے اور سچ پوچھئے تو ان کی تعزیتی نشستیں ہوتی بڑی اثر انگیز ہیں نشست صحیح معنوں میں انہیں پرندوں کی ہوتی ہے۔ یہ کھڑے ہوں تو بھی کوئی نہیں کہتا کہ دیوار پہ کوّے کھڑے ہیں۔ سب یہی کہتے ہیں کہ دیکھو کوّا منڈیر پر بیٹھا ہے اور کائیں کائیں کر رہا ہے۔ اب کوئی نہ کوئی مہمان ضرور آئے گا (کمال ہے مہمانوں کی آمد کے ذمہ دار بھی یہ کوے ہی ہوتے ہیں) کوؤں کی تعزیتی

نشست کے سبھی شرکا بآواز بلند شریک ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ مقرر ایک ہے اور باقی سب سامعین چپ دم سادھے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ممکن ہے سن بھی نہ رہے ہوں کہ مقرر کیا کہہ رہا ہے اس کے برعکس کوّے آنجہانی کوّے سے اپنی قربت کا اظہار خود انفرادی اور اجتماعی طور پر شور مچا کر کرتے ہیں۔ سب ایک ساتھ بولتے ہیں اور اتنا شور کرتے ہیں کہ ڈر ہوتا ہے کہ آنجہانی اٹھ کھڑے نہ ہوں۔ سنگدل سے سنگدل آدمی بھی قریب سے گزرتا ہے تو افسردہ ہوجاتا ہے۔ اپنا کام بھول کر ایک منٹ کے لیے خاموش کھڑا ہوجاتا ہے (یہ اس کی عادت ہے)

یہی شور و شرانگیز کوے آدمی کو جھوٹ بولنے پر اس کی سرزنش بھی کرتے ہیں۔ یہ سرزنش ان کے حوصلے اور صلاحیت کے مطابق صرف "منقار زنی" ہوتی ہے۔ کووں کا کاٹا مرتا نہیں ہے اور نہ ہی بیمار پڑتا ہے۔ کوے چاہتے ہیں کہ ان کے کاٹنے کی وجہ سے عبرت حاصل کرلے تو کافی ہے۔ کوے جانتے ہیں کہ سزا کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے (لیکن آدمی نہیں جانتا) کوے اب تھک گئے ہیں، ان کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ ایک کوا جان پر کھیل کر اپنے جوہر دکھائے بھی تو وہ ایک دن میں پندرہ بیس سے زیادہ آدمیوں کی خدمت نہیں کرسکتا۔ یہ بھی بہت ہے۔ اسے اور بھی کام کرنے ہوتے ہیں ان میں نہ تو سرمایہ دار ہوتے ہیں نہ سیاست داں۔ اس لیے اپنی روزی خود کمانی پڑتی ہے۔ اس لیے کوے صبح صبح، سورج کی روشنی پھیلنے سے پہلے ہی مستعدی کے ساتھ اپنی غذا تلاش کرنی شروع کردیتے ہیں۔ قدرت نے سب سے مضبوط معدہ کووں ہی کو دیا ہے، بصارت بھی خوب دی ہے، صبح اٹھتے ہی ان کی بھوک کھل جاتی ہے۔ دراصل ان کی آنکھ اور بھوک ایک ساتھ کھلتی ہے۔ پرندوں میں سب سے پہلے اٹھنے اور غذا تلاش کرنے والے یہی کوے ہیں۔ محکمہ صفائی میں کام کرنے والے مزدور ان سے بہت خوش رہتے ہیں۔ ان کا ایک چوتھائی کام تو یہی کوے ہی کردیتے ہیں۔ کوے کبھی ناغہ نہیں کرتے۔

آدمیوں میں جھوٹ بولنے کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ کوے تو بہت دیر سے منظر عام پر آئے اور ان میں جھوٹ سچ کا فرق جاننے کی صلاحیت کے پیدا ہونے میں اور بھی دیر ہوئی ورنہ آدمی تو ابتدائے عمر سے ہی اس فن میں عبور حاصل کرلیتا ہے۔ کوئی بھی بچہ اپنے والد کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے بغیر جھوٹ نہیں بولتا۔ ماں کی گود سے نکل کر بچہ جوں ہی ماں باپ کے سایۂ عاطفت میں آتا ہے، شفقت پدری اسے جھوٹ بولنے پر اکساتی ہے (بنیادی طور پر یہ مصلحت آمیز جھوٹ ہوتا ہے) بچہ اپنے والد کے ملاقاتیوں کو خواہ وہ قرض خواہ ہوں یا ان کے خیر خواہ، یہ کہہ کر واپس کردیتا ہے کہ ابو گھر پر نہیں ہیں۔ اب کوئی کوّا ایک جھوٹ کے لیے دو کو تو قصوروار ٹھہرا نہیں سکتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس جھوٹ کے سلسلے میں محرک کی سرزنش کرے یا نادان بچے کی (دونوں باعزت بری ہوجاتے ہیں) اور نتیجے میں مصلحت آمیز جھوٹ فروغ پاتا رہتا ہے اور رفتہ رفتہ یہی مصلحت خصلت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ دنیا میں اتفاقات ہوں یا انقلابات اسی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ جھوٹ، بولنے، سننے اور برتنے میں ایک الگ ہی چیز ہوتا ہے۔ یہ قول محال تو نہیں ہوتا لیکن اس کا پہچانا جانا محال ہوتا ہے۔ خود آدمی اس معاملے میں بے بس ہوچکا ہے اور اس نے یہ جاننے کے لیے کہ یہ آدمی سچ بول رہا ہے یا جھوٹ، ایک مشین ایجاد کی ہے۔ یہ تحقیقی مشین ہوتی ہے اور سچ اگلوانے والے شخص کو حتمی طور پر بتادیتی ہے کہ مشین کے سامنے جو شخص کھڑا ہے، وہ سچ نہیں بول رہا ہے۔ کوئی دوسری ترکیب استعمال کی جائے۔

کوے یہ بات جانتے ہیں اور آدمی کی قابلیت سے متاثر ہو کر اس کے جھوٹ کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں، وہ صرف کوے ہیں ۔ اجنّہ تو ہیں نہیں لیکن دل میں سوچتے ضرور ہیں کہ آدمی بذات خود سچ بول نہیں سکتا تو کسی دوسرے کو سچ بولنے کے لیے کیوں زبردستی کرتا ہے اور طرفہ یہ کہ سچ اگلوانے کے مشینوں پر بکثرت روپے ضائع کرتا ہے جب کہ دولت کا صحیح مصرف یہ ہے کہ آدمی اپنے ضرورت مند پڑوسیوں اور ان کے بعد ہم کوؤں کی غذا پر بھی کچھ روپے خرچ کرے ۔ کوؤں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ آدمی فطرتاً خسروانہ مزاج کا مالک ہوتا ہے اور " مصلحت خویش " کے سوا اسے دوسرے مسائل سے الگ رہنے میں سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔

جھوٹ اور سچ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جھوٹ متواتر اور بار بار بولا جائے تو ایک نہ ایک دن وہ سچ بن جاتا ہے یہ نکتہ ہمارے عوام تو نہیں لیکن دانش مند حضرات جانتے ہیں اور اسی لیے ان کی کہی ہوئی بات کو کوئی جھٹلاتا نہیں ہے جب کہ سچ میں نقص یہ ہے کہ مسلسل سچ بولنے سے آدمی کی ساکھ متاثر ہوتی ہے ہم نے کتنے ہی لوگوں کو سچ بولنے سے توبہ کرتے دیکھا ہے اور شاید یہی ایک توبہ ہے جو ٹوٹتی نہیں ہے ۔ یہ بجائے خود جام جم ہے ، جام سفالی نہیں کہ بازار گئے اور دوسرا لے آئے ۔

دنیا میں سچ بولنے والے اور سچ بول کر اس کا مزا چکھنے والے لوگ بھی یقیناً پیدا ہوئے ہیں ۔ لیکن یہ قصّہ پرانا ہو چکا اور ان لوگوں کی تعداد دو یا تین سے زیادہ تھی بھی نہیں ۔ دنیا میں اس وقت جو سچ بولا جا رہا ہے یعنی سچ کے نام سے جو کچھ ہماری سماعت تک پہنچتا ہے وہ صرف ملمع ہے ، سونے کی کان سے بھی جو سونا برآمد ہو رہا ہے وہ ۲۴ قیراطی سونا کہا گیا ہے ۔ اس میں قیراط کا عنصر کم اور خیرات کا زیادہ ہے ، زمین تو اب بھی زرخیز ہے بس ہوا یہ ہے کہ برآمد ہونے والے سونے پر کسی نے کالی مرچ چھڑک دی ہے ۔

یوں تو اشرف المخلوقات پر کسی دوسری مخلوق کو کئی وجوہات کی بنا پر فوقیت نہیں دی جا سکتی لیکن جزوی طور پر کچھ خوبیاں ایسی ہیں جو آدمی سے زیادہ دوسری مخلوقات میں پائی جاتی ہیں ۔ مثلاً یہی روسیاہی ہے ، کوے اس سے مبرا ہیں ، بے زبان جانوروں میں جھوٹ اور سچ کا جھگڑا ہے ہی نہیں ۔ آدمی بھی اگر خاموش رہنے کی عادت کو اپنا لے (جو مشکل ہے) تو کس کوے کی مجال ہے کہ اسے کاٹے ۔ لیکن آدمی خاموش کیسے رہ سکتا ہے وہ خاموش رہ گیا تو دشنام طرازی اور غیبت کے فنون لطیفہ کی سرپرستی کون کرے گا ۔ ؟

منہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

درد دل، زخم جگر، بس ہوگیا
تو نے دیکھا اک نظر بس ہوگیا

لکھ دیا تھا دوار پر "نو انٹری"
آپ آئے میرے گھر، بس ہوگیا

کردیا تھا "گارڈ" نے اس کو "ریجکٹ"
آکے دھرتی پر بشر بس ہوگیا

کون ہے جو کاٹ دے تیرا لکھا
حکم تیرا یار اگر، بس ہوگا

فرسٹ نمبر آکے بھی ہم منفوٰ رہے
ہونے والے کو صفر بس ہوگیا

یوں تو پٹری پر تھی گاڑی عشق کی
ل گیا سگنل سفر، بس ہوگیا

کرلی میری زوجیت منہ پھٹ قبول
اس پہ چاہت کا اثر بس ہوگیا

خدا کی ہم پہ یلدم مہربانی کیوں نہیں ہوتی
ہماری مفلسی جنت مکانی کیوں نہیں ہوتی

پرانی مل، پرانی گھر، پرانی گھر کا ہر سامان
تعجب ہے مگر بیوی پرانی کیوں نہیں ہوتی

کھلا رہتا ہے پھولوں کی طرح مولانا کا چہرہ
گرانی سے انہیں بھی سرگرانی کیوں نہیں ہوتی

جوئے سٹے نے کالے خاں کو بھورے خاں بنا ڈالا
ہماری زندگی اجلی سہانی کیوں نہیں ہوتی

ہمیشہ بھینچ کر دانتوں کو تم کوے اڑاتی ہو
میرے بیٹوں کی ماں اب گلفشانی کیوں نہیں ہوتی

چکن بریانی ہر الو کے پٹھے کو کھلاتی ہو
تمہارے گھر ہماری سہانی کیوں نہیں ہوتی

ترے شاگرد تجھ کو تیل گھی لاکر نہیں دیتے ؟
ترے اشعار میں منہ پھٹ روانی کیوں نہیں ہوتی

یہ سوچا ہے بڑھاپے میں ترا دیدار کرلیں گے
اتر جائے گا جب پانی ندی کو پار کرلیں گے
یہ مفلر سویٹر لیکر ہمارے ساتھ مت چلیے
بڑھی سردی تو ہم تقریر شعلہ بار کرلیں گے
ابھی تو ان سے چھپ چھپ کر ملا کرتے ہیں جنگل میں
پکڑلے گا کوئی چوری تو ہم اقرار کرلیں گے
اسی امید پر ہم چار بیوی کرکے بیٹھے ہیں
کم از کم چھ برس میں ٹیم اک تیار کرلیں گے
رکھو محفوظ زرداروں سے تعلیمی اداروں کو
یہ بے ایمان ہیں، تعلیم کو بیوپار کرلیں گے
کھلی آزادیاں دے دی ہیں جن کے سرپرستوں نے
بڑے ہوکر یہ بچے ساری سیما پار کرلیں گے

سگ لیلیٰ (تیسری قسط) پرویز یداللہ مہدی

ہم آدمی سمجھے، وہ کتّے کی دم نکلے

وائلڈ لائف ایکسپرٹ پسٹن جی پالن جی دارو والا، ہماری لفاظی کے لپیٹے میں آکر تعریف کے جھاڑ کی سب سے اونچی شاخ پر پہنچ کر الو کی طرح بیٹھ گئے تب ہم نے کتوں کے تعلق سے اگلا کام کا سوال داغا "کسی کتّے کو ہموار کرنے کا سب سے آسان طریقہ کیا ہے۔؟"

"کیا بولا۔ کون سا وار کرنے کا طریقہ بولا باوا۔" موصوف نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا

"ہموار کرنا۔ مطلب، رام کرنا، پٹانا۔" ہم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "کسی اجنبی کتّے کو پٹانے کا آسان طریقہ بتائیے، یعنی بنا جان جوکھم میں ڈالے اسے کیسے پٹایا جاسکتا ہے۔؟"

"طریقہ تو اپن تم کو بعد میں بتائیں گا باوا، پہلے تم اس کتّے کے بارے میں یہ بتانے کا کہ وہ کتا کون سی ذات کا کون سی نسل کا، کون سی کاسٹ CASTE کا، کون سے لیول LEVEL کا، ہے؟ مطلب اس کا سوشل اسٹیٹس SOCIAL STATUS کیا ہے۔!"

کتوں کے بارے میں موصوف سے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ہم آئے تھے، لیکن جواب میں موصوف نے الٹا ہم ہی سے سوالات کرکے ہمیں چکر میں ڈال دیا۔ ہم نے ہاتھ جوڑ کر جواباً ان سے عرض کیا۔ "مسٹر دارو والا، ہم سوالی کی صورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، ہم سے سوال کرکے بخدا ہمیں شرمندہ نہ کیجئے، کتوں کی ذات پات بندی، نسل، کاسٹ، اور سوشیل اسٹیٹس کا ہمیں کیا پتہ، ہماری نظر میں ہر کتا، ایک جیسا ہے وہی خونخوار جبڑے، زہر آلود دانتوں اور خونی پنجوں والا"

ہمارا یہ معروضہ سن کر موصوف سر پیٹتے ہوئے بولے۔ "ہمارا یہ مطلب نئیں تھا باوا۔ اپن تو خالی یہ پوچھتا تھا کہ جو کتّے کی تم بات پوچھتا وہ اصل میں کون سا کتا ہے؟ HOUSE HOLD مطلب پالتو ہے کہ فالتو مطلب سڑک چھاپ ریلوے اسٹیشن میں بھکاری کا مافک پلیٹ فارم پر دم ہلاتے پھرنے والا ہے کہ بس کے اڈے پہ، بینچ کے نیچے، اسٹاپ کے چھجے کے اوپر یتیم چھوکرا لوگ کا مافک لیٹنے والا کھجلی بھرا ہے یا پھر کسی الٹرا ماڈرن بیوٹی کوئین کی بوڈی سے بوڈی گارڈ کے مافک چوبیس کلاک چپک کر مزا مارنے والا ہے باوا؟"

عرض کیا۔ "جس کتے کے تعلق سے ہم جاننا چاہتے ہیں، وہ آخری والا ہے، یعنی الٹراماڈرن بیوٹی کوئین کی باڈی سے باڈی گارڈ کی طرح چپکا رہنے والا کتا۔!"

آنکھ مار کر بولے "پھر سیدھا سیدھا محبوبہ کا کتا بولونا باوا۔ اس کو پٹانا بہت مشکل ہے، کائے کو بولے گا تو یہ تمہاری محبوبہ کو اپنی محبوبہ سمجھتا ہے اور اپنی محبوبہ کو کوئی دوسرا سالا اپنی محبوبہ سمجھے یہ اس سے کبھی برداشت نئیں ہوتا، اس کے واسطے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے باوا، سامنے والے کو چیر پھاڑ کے رکھ سکتا!"

یہ سن کر ہم پر لرزہ طاری ہوگیا، ہم نے گھگھیائے ہوئے لہجے میں پوچھا، "اس کے جان لیوا حملے سے بچ کر محبوبہ سے ملنے کی کوئی ترکیب۔؟ مطلب کوئی ایسا راستہ، کوئی ایسا طریقہ جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی بچ جائے۔!"

"بہت مشکل ہے باوا، کائے کو بولے گا تو محبوبہ کا کتا ہماری انڈین فلم کے ولن کے مافک ہوتا ہے، جیسا دکھتا ہے ویسا ہوتا نئیں اور جیسا ہوتا ہے ویسا دکھتا نئیں اصل میں یہ کیسا ہوتا ہے بڑے سے بڑا کتا ایکسپرٹ بھی نئیں بتا سکتا، پھر بھی ایک "ٹپ" اپن تم کو دیتا دھیان سے سننے کا۔!" ہم موصوف کی اس کرم فرمائی بلکہ "ٹپ نوازی" پر پوری طرح ہمہ تن متوجہ ہوگئے، وہ آگے گویا ہوئے۔ "یہ جو محبوبہ کا کتا لوگ ہوتا ہے نا یہ کاٹنے کے پہلے اپنے شکار کو سنگھتا ضرور ہے باوا۔!"

"وہ کیوں۔؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔

بولے۔ "یہ تپاسنے (معلوم کرنے) کے واسطے کہ کئیں اس کی دہشت کے مارے شکار اس "لوک" سے "پرلوک" تو نئیں پہنچ گیا۔ اور اگر پہنچ گیا باوا تو پھر کتا اس کو نئیں کاٹتا کائے کو بولے گا تو کتا لوگ ادی لوگ کا مافک مرے ہوئے کو نئیں کاٹتا۔ اس واسطے بول کے ہشیار عاشق محبوبہ کے کتے کی جب بھی جھپٹ میں آتا دم مار کے سانس کھینچ کے کھڑا ہوجاتا باوا۔ اور جب بھی کتے کو یہ بات کا پکا بھروسہ ہوجاتا کہ شکار میں جان ہے نہ سانس تو وہ خود ادھر سے ریورس گئیر ڈال کے نکل لیتا۔ بس باوا آدی اگر "آزمائش کا یہ ٹیم نکال لیا تو سمجھو بال بال بچ گیا۔!"

ہم نے ہڑبڑا کر پوچھا "فرض کیجیے اگر آزمائش کا یہ سلسلہ دراز ہوجائے اور شکار بے چارہ سانس روکے روکے خدا نخواستہ سانس لیناہی بھول جائے تو۔؟"

موصوف پھٹاک سے بولے۔ "تو کیا ہوگا، شکار پھٹا پھٹ مرجائیں گا باوا۔ لیکن یہ موت ذرا سوچو، اس موت سے اچھی ہونگی جو کتے کے کاٹنے کے پیچھو ہوتی۔ ہوتی کہ نئیں ہوتی باوا۔؟"

کتوں کے موضوع پر مسٹر دارو والا سے ہماری یہ گفتگو کیا تھی ان تلوں سے تیل نکالنے کی حماقت تھی جن میں تیل نہیں ہوتا، موصوف کے طرز گفتگو سے یہ بات پوری طرح صاف ہوگئی تھی کہ جس طرح کتے کی دم ٹیڑھی ہوتی ہے اور بارہ برس تک فولادی نلکی میں رکھنے کے بعد بھی اس کا ٹیڑھا پن دور نہیں ہوتا اسی طرح مسٹر پلسٹن جی پالن جی دارو والا کی طبیعت کی کجی اور ٹیڑھا پن لاعلاج تھا، وہ آدی نہیں سر سے پیر تک کتے کی دم تھے، ہم نے اس بے مقصد قصہ طولانی کو ختم کرنے کی غرض سے حتمی لہجے میں کہا۔

"مسٹر دراو والا کتوں کے تعلق سے میری ٹیڑھی معلومات کو آپ نے اپنی کار آمد باتوں کی نلکی میں رکھ کر

ایک دم سیدھا کر دیا، آپ کا بہت بہت شکریہ، ۔ صاحب جی ۔!"

موصوف نے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے لقمہ دیا ۔ "اس میں شکریہ کائے کا بلوا، گیانی لوگ بول کے گیا علم بتانے سے مل چھپانے سے بڑھتا ہے، آگے بھی تم کو کچھ بھی پوچھنے کا معلوم کرنے کا ہووے تو اپنے پاس "بن داس" آجانے کا ابھی صاحب جی ۔!!" اتنا کہہ کر موصوف نے ایکبار پھر بوتل اٹھاکر منھ سے لگالی اور ہم جیسے کورے وہاں گئے تھے، ویسے ہی کورے وہاں سے لوٹ آئے ۔!!

وائلڈ لائف ایکسپرٹ پسٹن جی پالن جی دلر.دوالا سے بے فیض اور مایوس کن ملاقات کے بعد ہم نے قطعی فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو جائے کسی اور کتا ایکسپرٹ کی تلاش میں جوتیاں گھسنے کے بجائے، خود کو محبوبہ، دلنواز کے کتے کے روبرو یہ کہتے ہوئے پیش کردیں گے ۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف! تاہم اس فیصلہ، پر عمل درآمد کرنے میں بھی ہفتہ بھر لگ گیا اور یہ ہفتہ بھر اسی شش و پنج میں بیت گیا کہ محبوبہ کے گھر جائیں یا نہ جائیں کیونکہ جب بھی اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا ارارادہ کرتے، تصور میں جہاں محبوبہ کی موہنی صورت نمودار ہوتی وہیں ایک عدد خطرناک کتے کی بھونکتی ہوئی شبیہ برق کی طرح لہرا کر ہمارے تصور کی حسین دنیا کو جلاکر سیاہ و خاک کر جاتی کیفیت ہوبہو یہی تھی کتا مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے حسن ۔

آخر ایک دن جی کڑا کر کے ڈرتے مرتے قدم پھونک پھونک کر دھرتے، محبوبہ، دلنواز کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ ہی گئے البتہ احتیاط یہ کی کہ دندناتے ہوئے سیدھے محبوبہ کے درِ دولت پر "لینڈ" LAND کرنے کے بجائے [illegible] پڑوسیوں گلی محلے والوں سے محبوبہ کے گھر کتے کی موجودگی کے بارے میں "چھان بین" کرنے کی ٹھانی ۔ اس سلسلے میں عاقل و بالغ افراد سے "پوچھ کچھ" کرنا اپنی ہنسی اڑوانے کے برابر تھا اس لیے محلے کے بچوں سے رجوع ہوئے لیکن افسوس ان سے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا ۔ مجبور ہوکر ایک ایسے عاقل و بالغ شخص کو تاکا، جو پھٹے حالوں بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے الگ تھلگ بیٹھا خالی خالی آنکھوں سے خلا میں کچھ تاک رہا تھا شخص مذکور ہمیں ہر طرح سے بے ضرر نظر آیا، چنانچہ پہلے تو احتیاطاً ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی ہمیں دیکھتا نہ ہو، جب اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو دبے قدموں سے اس کے پاس پہنچ کر بڑے ہی دھیمے لہجے میں اسے مخاطب کیا ۔ "بھائی صاحب !" جواب میں بھائی صاحب اس طرح چونک کر کھڑے ہوگئے جیسے ہماری آواز کی لہرنے کھمبے میں "برقی رو" دوڑا دی ہو ۔ اس سے پہلے کہ بھائی صاحب اس شاک سے بدک کر بھاگ کھڑے ہوتے ہم براہِ راست مطلب کی بات پر آگئے ۔ "بھائی صاحب اس نکڑ والے نیلے بنگلے میں کتا تو نہیں ہے ۔؟ "

جیسے ہی ہمارا جملہ ختم ہوا بھائی صاحب کی ناک کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے، ہونٹوں کے گوشے اس طرح پھڑ پھڑانے لگے جیسے شکار کو دیکھ کر کسی خونخوار درندے کے ہونٹ پھڑ پھڑاتے ہیں، پھر حلق سے عجیب و غریب ڈراؤنی سی غراہٹ بلند ہوئی اور پھر ایک زبردست دھماکہ سا ہوا "کتا ۔ بھوں بھوں بھوں ؟"

اب جو بھائی صاحب نے بھونکنا شروع کیا تو یوں لگا جیسے ہمارے روبرو کوئی دو پاؤں والا آدم زاد نہیں بلکہ واقعی کوئی خونخوار شکاری کتا کھڑا اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے پنجے جھاڑ رہا ہو ۔ خطرے کی بو تو ہم سونگھ چکے تھے بلکہ خطرے کے دہنِ مبارک، سے اڑتے ہوتے کف کے چھینٹے، اپنے روئے نامبارک پر محسوس بھی

کر رہے تھے ۔ ایسے میں بھلا ہم وہاں ٹھہرتے ، سر پر پاؤں رکھ کر اس طرح دوڑ پڑے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس مشہور محاورے کو عملی طور پر اپنی ذات کے حوالے سے سچ ہوتا ہوا دیکھ بھی لیا ۔ ہم آگے آگے تھے اور بھائی صاحب کسی خونخوار تیز رفتار شکاری کتے کی طرح دیوانہ وار ہمارے پیچھے ــــ آہستہ آہستہ ہمارے بیچ کا فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا اس سے پہلے کہ یہ فاصلہ ختم ہوتا اور وہ ہمیں دبوچ کر بھنبھوڑ ڈالتے کہ اچانک ایک مسیحا پتہ نہیں کہاں سے اڑکر ہمارے اور ہم پر حملہ آور ہونے والے بھائی صاحب کے درمیان آگیا ۔ اتفاق سے مسیحا کے ہاتھ میں ایک قدآور تیل پلایا ہوا ڈنڈا بھی تھا ، اور غالباً اسی ڈنڈے نے مرنے مارنے پر اتارو ، بھائی صاحب کے دوڑتے قدموں میں بریک ڈال دیئے ۔ اس سے پہلے کہ بھائی صاحب پہلے شاک سے سنبھل کے اگلا کوئی بھیانک قدم اٹھاتے ، مسیحا صورت شخص نے زمین پر ڈنڈے کو زور سے دے مارا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈنڈے کی محض دھمک ، محسوس کرکے ہماری جان کے بیری بھائی صاحب کسی سہمے ہوئے کتے کی طرح دم دبائے بغل والی گلی میں غائب ہوگئے ۔

جب ہمارے ہوش ٹھکانے ہوئے تو پتہ چلا کہ جسے ہم مسیحا سمجھ رہے تھے وہ اصل میں بغل والی کرانے کی دکان کے مالک تھے ، اور ہمیں دور سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہوا اور اس وحشی کو ہمارا دیوانہ وار پیچھا کرتا ہوا دیکھ کر ہی ساری سچوئشن ، ان کی سمجھ میں آگئی تھی لہذا وہ ڈنڈا لے کر کود پڑے تھے ، ہماری حالت کے معمول پر آتے ہی دکاندار مہاشے نے پوچھا ۔ " بابو صاحب آپ نے اس مجنوں باوا کو چھیڑا تو نہیں تھا ۔ ؟ "

ہم نے گلے کو چھوکر کہا " قسم لے لیجئے سیٹھ صاحب جو میں نے اسے چھیڑا ہو ۔ ، میں نے تو صرف اس سے اتنا پوچھا تھا کہ وہ جو نیلے بنگلہ نظر آرہا ہے نا اس میں کوئی کتا تو نہیں ہے ؟ "

ہمارے اس انکشاف پر سیٹھ صاحب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ فوراً بولے " تب ہی میں کہوں ، مجنوں باوا نے آپ کو اس قدر کیوں دوڑایا ۔ ! کسی کی دعا تھی جو آپ کے کام آگئی ۔ اگر میں بیچ میں نہ آیا ہوتا تو آپ کا تو کام تمام ہوجاتا ، مجنوں باوا آپ کو کاٹ کھاتا ؟ "

ہم نے ہڑبڑا کر پوچھا " مجھے کیوں کاٹ کھاتا بھئی نہ میں نے اسے پتھر مارا نہ اسے ستایا نہ چھیڑا ۔ ! "

سیٹھ جی جھلاکر بولے " اجی آپ نے تو اس سے بھی بڑا ظلم کیا اس پر ، ۔ اسی کتے کے بارے میں اس سے پوچھ رہے تھے جس کتے کا وہ کاٹا ہوا ہے ۔ "

" مطلب وہ اس نیلے بنگلے والے کتے کا شکار ہے " ہم نے گھگھیاکر پوچھا ، سیٹھ صاحب نے اثبات میں سر ہلاکر اقرار کیا ، اور ان کا اقرار کرنا تھا کہ ہمارے بچے کچے اوسان بھی خطا ہوگئے ۔ !

(جاری)

سید طالب حسین زیدی، حیدر آباد

جانا ہمارا پاکستان، معیت و مساعدت میں جگندر کی۔۲

بغیر دل ہمہ نقش ونگار بے معنیٰ ست
ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدعا اینجاست
مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ، تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

کر دلاموٹروں کی انعامی اسکیم کاؤنی۔وی پروگرام ختم ہونے کے بعد ہماری رات مسلسل ایک ہی خواب دیکھنے میں کٹی اور وہ خواب تھا یوسفی صاحب کی تلاش میں زمین آسمان کا ایک کر دینا کبھی ہاتھ آتے کبھی پھسل جاتے۔

دوسرے دن ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ برادرم مبین کو ان کے ایک دوست مشہور نعت گو شاعر بیابانی صاحب نے فون کیا خیریت خیر سلا کے بعد مبین نے ان سے یوسفی صاحب کا پتہ پوچھا انہوں نے وعدہ کیا کہ اپنے اور یوسفی صاحب کے ایک مشترکہ دوست سے پتہ اور فون نمبر معلوم کر کے جلد مطلع کریں گے اور خدا بھلا کرے بیابانی صاحب کا کہ شام تک انہوں نے ہمارے "گوہر مقصود" کا پتہ اور فون نمبر بتلادیا۔ "ترنت" ہم نے مبین سے کہا آپ ہی بات کر کے ملاقات کے لئے وقت مانگ لیں۔فون کیا گیا اور خوش بختی ملاحظہ ہو خود یوسفی صاحب دوسری طرف فون پر تھے۔مبین نے ہمارے بارے میں تفصیل سے بتلایا اور ملاقات کے لئے اشتیاق ظاہر کیا جواب سے معلوم ہوا "دو روز سے معیت غذا کا شکار ہو کر علیل رہے تھے آج اور کل آرام لیں گے لہٰذا پرسوں شام پانچ بجے وہ نہ صرف ہمارا انتظار کریں گے بلکہ ملاقات از دیاد مسرت بھی ہوگی"۔مقررہ دن ساڑھے چار بجے ہم دونوں گلشن اقبال سے خیابان بدر ڈیفنس سوسائٹی کے لئے روانہ ہوتے اور تینسویں اسٹریٹ میں داخل ہو کر مکان تلاش کرنے لگے۔ایسا کوئی نظر نہیں آیا جس سے پوچھ لیا جاتا بڑی دیر بعد دو بندے (پنجاب اور سندھ میں آدمی کی بجائے بندے بولنے کا رواج ہے) خوش گپیوں میں معروف ایک بنچ پر بیٹھے ہوتے نظر آئے صورت، لباس اور وضع قطع سے سندھی اور گھروں میں کام کرنے والے لگ رہے تھے ان کے قریب گاڑی روک کر پتہ دریافت کیا۔ایک نے پوچھا، کون یوسفی صاحب وہ جو "شیو شائیری" لکھتے ہیں ہم نے جلدی سے کہا ہاں وہی یوسفی صاحب جو شیو شائیری لکھتے ہیں۔اس نے ہاتھ اٹھا کر انگلی سے سامنے والے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

سندھی میں داخل ہو کر "ر" "ڑ" ہو جاتا ہے۔حالانکہ اردو والے اس کی کثافت اور گدلا پن سے بے مزا ہو کر پیچھا چھڑانے کی تگ ودو میں لگے ہوئے ہیں اور جہاں جہاں یہ جما ہوا ہے وہاں سے اکھاڑا جا رہا ہے۔ساڑھیاں اب "ساریاں" ہو گئیں۔نواڑ "نوار" بن گئی۔اقوام متحدہ میں ہمارے ڈیلیگیشن کے سابق صدر "گھوڑے خان صاحب" کی محنت

ہمارے ایک دوست سنڈیکیٹ بنک کے منیجر ٹی۔آر۔راؤ، چائے اور سگریٹ کے دیوانے، سگریٹ گویا ان کی شخصیت کی شناخت بن گیا ہے۔ہونٹوں یا انگلیوں میں سگریٹ کو دبائے بغیر اگر وہ کہیں کہ میں ٹی۔آر۔راؤ ہوں تو کوئی ماننے کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔ان کا کہنا ہے "میری رگوں میں بجائے خون کے چائے دوڑتی ہے اور سانسوں میں سگریٹ کا دھواں۔اسی کے پیشے میں ہونے کے باوجود سگریٹ کو ہونٹوں میں دبائے ہوئے وہ آج بھی چاق وچوبند ہیں۔

یوسفی صاحب سے ہماری گفتگو جاری تھی ہر جملہ فردوس گوش تھا۔بات میں نرمی، شیرینی، حلاوت اور شائستگی کا وہ عالم کہ منہ کھلتے ہی لوگ پھول چننے لگیں۔وہ بول رہے تھے اور سارا ماحول "دامان باغبان وکف گل فروش" بنا ہوا تھا۔یوسفی صاحب کی انہی دلنوازیوں کی تصویر کرنل محمد خان صاحب نے کہ آپ بھی حکمت ودانش کے دریا ہیں اپنے الفاظ میں ایسی پیاری کھینچی ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہے پھر بھی نہ بھرے-----

"یوسفی دیدار سے زیادہ گفتار کے تاج محل ہیں ان کی زبان سے ان کے قلم کی طرح ہر لفظ گل بدن بیگم بن کر نکلتا ہے اور ہمیں انہی گلبدن بیگموں کی دید کا شوق تھا مگر وائے قسمت کہ فون کیا تو پتہ چلا کہ تاج محل تو دورے پر ہے۔ناچار از راہ تلافی ہم نے "خاکم بدہن (خاکم بدہن یوسفی صاحب کی وہ کتاب جس پر انہیں پاکستان کا سب سے بڑا اور باوقار ادبی ایوارڈ ملا تھا) کا نسخہ اپنے ساتھ رکھ لیا کہ یہ بھی تاج محل کا چھوٹا نمونہ ہے"

چور چوری سے گیا ہیرا پھیری سے نہیں۔

چائے نوشی کے دوران ہم نے محسوس کیا سگریٹ کے پرانے رسیا اس کی طرف سے بالکل ہی غافل ہیں دور دور تک اس کے اثر آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے ہم کہ ایسی چائے کے ساتھ "متصلاً" سگریٹ کے کش لینے سے اپنے آپ کو روک نہیں پا رہے تھے آخر بے قابو ہو کر بلکہ تنگ آکر ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی بیٹھے۔اس "یاسمن سپید" کے جرعوں کے درمیان "تمباکوئے آتش زدہ" کی کمی اس کی حلاوت کو کم کئے دے رہی ہے اگر اجازت ہو تو..... بے اختیار مسکرائے اور کسی اندرونی خوشی کی ایک واضح لہر چہرے پر قوس قزح کی مانند پھیل گئی، شتابی سے فرمایا "ضرور ضرور، شوق سے۔ جب کسی کو میں سگریٹ پیتے دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے----"

اجازت پاکر ہم نے سگریٹ کو لائیٹر دکھاتے ہوئے پوچھا، ولیم اینڈرسن کے وقتوں میں سارے یونائیٹیڈ بنک آف پاکستان میں آپ "امام السگریٹ نوشاں" کے منصب جلیلہ پر فائز تھے اور دوسرے آپ ہی کی اتباع میں (جو امام کی نیت سوا تنی) اپنے اپنے سگریٹ سلگایا کرتے تھے پھر "ابھی کے ابھی میں یہ کیا ہو گیا کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا" کیوں اور کیسے ہو گیا؟ سگریٹ پر "حین حرف" بھیجنے کی داستان سناتے ہوئے فرمایا ایک مرتبہ لندن میں معمولی سر کے درد کا نسخہ لکھوانے اور دوا لینے ڈاکٹر کے پاس جانا ہوا "بدذوق" جو والنٹریانہ تمباکو نوشی کے خلاف تبلیغی کام میں بڑی شہرت رکھتا تھا یوسفی صاحب کی چین اسموکری ہائے رستاخیز اندازہ کو دیکھ کر اس کی تبلیغی رگ زور سے پھڑکی اور بجائے سر کے درد کی دوا دینے کے سگریٹ نوشی کے خلاف لکچر دینے لگا اور بولا! مسٹر یوسفی، یہ آپ کے سینے کو جلا چکا ہے دل اور پھیپھڑے کباب ہو گئے ہیں اور اب پوڈر بن کر جھڑتے جا رہے ہیں اگر اب بھی باز نہ آئیں گے تو چند دنوں بعد پچھتانے کا موقع بھی نہ ملے گا۔ثبوت کے لئے ایک بیلون ہاتھ میں پکڑاتا ہوا بولا، اس میں زور سے پھونک ماریئے۔یوسفی صاحب نے حسب ہدایت پھونک ماری، بیلون جب ہوا سے بھر گیا تو اس نے کہا دیکھئے آپ کے سوکھے ہوئے دل اور پھیپھڑوں کی بھوسی پھونک کے ساتھ باہر نکل کر اس بیلون میں نظر آرہی ہے...... ہم نے بغیر کسی حیرت وتشویش کے

پوچھا، جناب! کیا یہ حقیقت ہے؟ — فرمائیے، بالکل، آنکھوں دیکھی، ٹرانسپرنٹ بیلون کے اندر باریک باریک ذرات نظر آرہے تھے — بس اسی دم میں نے عہد کر لیا.... گویا آخری وقت میں مسلمان ہونے کا"

دل ہی تو ہے سیاست افرنگ سے ڈر گیا!

اسی لئے جگندر نے ہمارے کان میں چپ کے سے کہا، عیار انگریز نے اپنی بازیگری سے انہیں ڈرا دیا۔ حالانکہ اس بیلون میں لکڑی کے برادے کی ایک چٹکی اس نے ان کی نظریں بچا کر ڈال دی تھی جسے یہ دیکھ نہ پائے یہ اس انگریز بچے کی سیاست تھی جس نے یوسفی صاحب کو حوصلہ ہارنے پر مجبور کر دیا....

ادھر ہم چائے کے جرعوں کے "متصلاً" پیہم سگریٹ کے کش لے کر ناک اور منہ کے رستے بڑی آسودگی سے دھواں باہر نکال رہے تھے اور ادھر یوسفی صاحب اس عیش کو کنکھیوں سے شدید للچاہٹ اور حسرت سے تک رہے تھے چہرہ کسی اندرونی محرومی کے احساس کی غمازی کر رہا تھا۔ آپ کی اس متاسفانہ کیفیت کو دیکھتے ہوئے ہمارا خیال ہے کہ یوسفی صاحب نے سگریٹ کو "مبین بول، ط" سے نہیں "ت" سے دے رکھے ہیں اور بعید نہیں کہ ہم جیسے پراگندہ طبع کسی میر کی اگر انہیں صحبت حاصل ہو گئی تو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے آپ کو "رجوع" کر لیں گے.... محترم یوسفی صاحب! گھر بیٹھے آئے اس موقع کو غنیمت جانئے اور "موقع" بڑے پاپڑ بیل کر آپ تک پہنچا تھا۔ ورنہ!

دگر دانا نے راز آید کہ نیاید

جگندر نے ٹہوکا دیا اور ہمیں یاد آگیا، پوچھا! آپ نے اس روز رجسٹر پر کس زبان میں دستخط کئے تھے؟ عینک میں سے بھوئوں اور آنکھوں کو اوپر چڑھا کر ہمارے چہرے کی طرف غور سے کچھ اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں، کیا ارادے ہیں؟.... اور پھر زیر لب ارشاد فرمایا! "جی انگریزی میں"....... جگندر نے ہمارے پھر ایک کہنی ماری جیسے کہہ رہا ہو، دیکھا! میں نے کہا نہ تھا......

مبین زیدی اور یوسفی صاحب امریکہ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے ہم نے پوچھا! آپ اکثر امریکہ جاتے آتے ہیں وہ کون سی معروفیت ہے جس کے باعث یہ آمد و رفت ہوتی ہے؟ سامنے دیوار پر آویزاں ایک تصویر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا! یہ میرا لڑکا ہے جو وہاں رہتا ہے ایک سال وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہم سے ملنے کراچی آتے ہیں دوسرے سال ان سے ملنے ہم وہاں چلے جاتے ہیں۔ تصویر میں بیٹے اور بہو کے ساتھ دو ننھے بچے بھی نظر آرہے تھے جو یوسفی صاحب کے پوتا پوتی ہیں۔

اصل سے سود پیارا!

اس نکتے کو بنکنگ کے پیشے کے ماہرین ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں ہم نے یوسفی صاحب کی نازک رگ پر نشتر رکھتے ہوئے کہا، بیٹے اور بہو کا تو نام ہے ورنہ آپ کے وہ دو کھلونے ہیں جن سے کھیلنے کی خواہش سے بے اختیار ہو کر آپ ہر دوسرے سال کھنچے کھنچے وہاں چلے جاتے ہیں۔ ہماری زبان سے اصل راز کے افشا ہو جانے سے یوسفی صاحب کا چہرہ، پیار، شفقت اور محبت کے گہرے احساس سے دھنک رنگ ہو گیا.....

وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا اور ہم یوسفی صاحب کی سحر آگیں گفتگو نہایت شوق اور پورے انہماک سے سن رہے تھے کہ آپ نے ہم سے ایک سوال کیا! زیدی صاحب، اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ الہیٰ خیر ہو۔ "ہم اور ہمارا خیال" اے آسماں یہ تجھے سوجھی کیا ہے؟ ہم ابھی اس اہم سوال کا کوئی بے ڈھنگا سا جواب ڈھنگ سے دینے کی سوچ ہی رہے تھے کہ آپ نے ہمارے سر سے یہ بوجھ خود ہی اتار کر فرمایا! حال ہی میں یورپ میں آئندہ باقی رہ

جانے والی زبانوں کے تعلق سے ایک بین الاقوامی سروے ہوا ہے جس کی تحقیق کا لب لباب یہ ہے کہ صرف پانچ زبانیں زندہ رہ جائیں گی باقی سب فوت ہونے والی ہیں ہم نے کسی "امید" پر جلدی سے پوچھا وہ پانچ زبانیں کون سی ہیں؟۔ فرمایا(۱) انگریزی ۔(۲) عربی ۔(۳) روسی ۔(۴) چینی ۔ پانچویں زبان یوسفی صاحب نے بتلائی وہ ہمارے ذہن سے اتر گئی غالباً وہ اسپینی تھی (کیوں کہ یورپ کے ایک بڑے حصے اور سارے جنوبی امریکہ پر اس کی عمل داری ہے)

اردو غریب کا کوئی ذکر نہیں تھا ہم کو ہر مرتبہ یہ امید تھی کہ شاید اب اس کا نمبر آجائے ۔ جب سلاے فسانے میں کہیں بھی اس کا دور دور تک پتہ نہ چلا تو بے حد مایوسی ہوئی ۔ یہ مغرب والے بالطبع بڑے ظالم ہوتے ہیں جب کسی چیز پر تحقیق کا بیڑا اٹھاتے ہیں تو اس کا عطر کشید کر کے چھوڑتے ہیں اس فہرست میں اردو کا نام نہ پاکر جس کی (بزعم خود) "سارے جہاں میں دھوم ہے" ۔ ہمارا دل سخت کبیدہ خاطر ہوا ۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے ۔ ساتھ ہی غالب کی اپنے بارے میں ایک پیشین گوئی نے اک گونا ڈھارس بندھائی ۔ فرماتے ہیں!

"نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنائیت و اعانت سے خوب ہو چکا ۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی رہے گا"

ہم کہ بہ صمیم قلب غالب کی پیشین گوئیوں پر ایمان لے آتے ہیں ۔ اس کو سن کر تسلی ہوئی انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا غالب صاحبدل تھا موحد تھا اپنے آقا کا بے ریا فدائی تھا اس کی ہر بات نوائے سروش ہے وہ الہامی ہوتی ہے اتفاقی ہوتی ہے اور وہ رپورٹ بطلان بدیہیات ہے ۔ جب اردو ہی باقی نہ رہے گی تو کیا لوگ غالب کے نام کو چاٹیں گے؟..... فرنگی گھاگ ہمیشہ کی طرح ہمیں پھر چکمہ دے گئے ان زبانوں میں ایک یا تو اردو ہوگی یا پھر باقی رہنے والی زبانوں کی گنتی پانچ نہیں چھ ہوگی.....

اسی طرح ایک مرتبہ اطلاع آئی کہ کسی مقام پر کھان کی کھدائی کے دوران ایک جانور کا ڈھانچہ دستیاب ہوا ۔ لال بجھکڑوں نے سر جوڑ کر یہ دریافت فرمایا کہ یہ ڈھانچہ پچاس ہزار برس پہلے کے کسی جانور کا ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ زمین پر زندگی پچاس ہزار برس پہلے بھی تھی یہ پڑھ کر ہمیں خوب ہنسی آئی گویا، اس کی ولادت باسعادت کے موقع پر وقت اور تاریخ نوٹ کرنے کے لئے قلم دوات لے کر یہ موقعہ واردات پر موجود تھے..... اشتعال میں آکر دوسرے ہی روز ہم نے اعلان کر دیا!" ہماری تحقیق اور علم آثار عتیق کی روشنی میں یہ ڈھانچہ پچاس ہزار نہیں بلکہ "انچاس ہزار نو سو انسٹھ" سال پرانا ہے....... کر لو کیا کر لو گے.......

اور معاملے کا دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ تادم تحریر ہمارے دعوے کی تردید کرنے کی کسی کو بھی جرات نہ ہوئی

(جاری)

★ قلمی معاونین صاف اور خوش خط صفحہ کے ایک جانب لکھیں ۔

★ ہر تخلیق پر اپنا پوسٹل پتہ ضرور لکھیں ۔

ایم۔ اوپیندر حیدرآباد

فٹ پاتھ پر چلیئے اپنی جان بچلیئے

میں اپنے شہر کی ایک سڑک پر چلا جارہا تھا۔ اتنے میں پولس کی جیپ سے ایک اعلان سنائی دیا۔ "پیدل چلنے والوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ مہربانی کر کے وہ سڑک پر نہ چلیں اور فٹ پاتھ کا استعمال کریں تاکہ آپ اپنی جان کی حفاظت کر سکیں۔"

میں انجانے میں کہیئے یا پھر اپنی عادت کے مطابق سڑک پر ہی سہی سلامت چل رہا تھا۔ پولس کا اعلان سن کر چونکا ایک تو قانون سے میں بہت ڈرتا ہوں اور دوسرے اپنی جان مجھے بہت پیاری ہے۔ میں نے سوچا پولس والے بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ آخر فٹ پاتھ پیدل چلنے والوں کے لیئے ہی تو بنایا گیا ہے۔ سڑک تو صرف تیز رفتار گاڑیوں کے لیے ہے۔ میں نے دل ہی دل میں پولس والوں کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے میری جان کو خطرے سے بچالیا۔ اتنے دنوں سے میں نے اپنی جان کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔

------- اور میں فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ دس ہی قدم چلنے کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ دس بیس سیکلیں اس طرح کھڑی کر دی گئیں ہیں کہ فٹ پاتھ پر سے جانے کے لیے راستہ ہی نہیں ہے۔ میں سڑک پر اترنا نہیں چاہتا تھا۔ سیکلوں کو دھیرے دھیرے ہٹاتے ہوئے راستہ بنانے لگا لیکن سیکل تو سیکل ہے۔ کیا ہوا کچھ پتہ نہیں۔ جیسے ہی ایک سیکل کو کچھ ہٹایا تو دوسری سیکل گرنے لگی اور ساتھ میں اس سے لگی ہوئی سبھی سیکلیں گر پڑیں۔ آواز سن کر ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ کر باہر آئے ایک نے کہا "اندھے ہو گیا؟ دیکھ کر نہیں چلتے؟"

میں نے کہا آپ نے فٹ پاتھ پر سیکلیں کیوں رکھی ہیں؟۔

ان میں سے ایک نے کہا کیا بکواس کر رہا ہے۔ فٹ پات تو سیکل رکھنے کے لیئے ہی ہے۔ اتنی بڑی سڑک چھوڑ کر تو فٹ پات پر کیوں چل رہا ہے؟۔

میں نے کہا پولس والے فٹ پاتھ پر چلنے کے لیئے کہہ رہے ہیں۔

اس نے کہا "پولس کی ایسی کی تیسی چل پھٹ"۔ میں آگے بڑھا لگ بھگ پچیس قدم چلا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں۔ -- دس بارہ گائے بیل فٹ پاتھ پر اڈا جمائے ہوئے بیٹھے ہیں اور بے فکری سے جگالی کر رہے ہیں۔ بازو سے نکلنے کی کوشش میں، میں نے دیکھا کہ وہاں پر میونسپل کارپوریشن کا پیشاب خانہ ہے اور اس میں سے پیشاب اس طرح باہر نکل رہا ہے کہ وہاں پر ایک چھوٹا سا کنٹہ بن گیا ہے، جس میں زبردست بو بسی ہوئی ہے۔ اس پیشاب خانہ کے پاس سے گذرنا تو میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں گایوں کی طرف آکر راستہ بنانے کے لیے انہیں اٹھانے کی کوشش کرنے لگا

لیکن دس بار ہش ہش کرنے پر بھی گایوں نے مجھے ایسے نظر انداز کر دیا جیسے جیتا جاگا جیتنے کے بعد اپنے ووٹروں کو کرتا ہے ۔ میں جانوروں سے کب بحث کرتا ۔ ایک طرف پیشاب خانہ اور دوسری طرف "گوماتا" میں پھر سڑک پر آگیا ۔ پر اچانک مجھے پولس والوں کا اعلان یاد آگیا ۔ اس لیے تھوڑی دور چل کر پھر فٹ پاتھ پر آگیا ۔ اب کی بار سو قدم آرام سے چلنے کا موقع مل گیا پھر کیا دیکھتا ہوں کہ فٹ پاتھ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک پانچ فٹ کا چوڑا گڑھا کھدا ہوا تھا ۔ شاید یہ ڈرینج والوں کا ہی کارنامہ تھا ۔ کیونکہ پانی اور ٹیلی فون یا بجلی والے اتنے چوڑے اور گہرے گڑھے نہیں کھودتے ان کے گڑھے تنگ چھوٹے سمارٹ ہوتے ہیں جنہیں آسانی سے پھلانگا جاسکتا ہے ۔ گڑھے کی دونوں طرف مٹی کے جو ٹیلے بنے تھے وہ کافی سخت ہوگئے تھے کچھ جگہ گھانس بھی اگ آئی تھی ۔ مطلب صاف تھا گڑھے کھودے ہوئے کئی مہینے ہو چکے تھے ۔ اسے ڈھانپنے کی فرصت نہیں ملی ہے ۔ میں گڑھے کے کنارے کھڑے ہو کر سوچنے لگا کیا کروں اس میں اتر کر پار کرنے کا ارادہ کیا پر ہمت نہیں ہوئی ۔ ایک تو گڑھا الگ بھگ چھ فٹ گہرا تھا ۔ دوسرے اس میں کیچڑ بھی تھا ۔ میں پھر سڑک پر آنے کے لیے مجبور ہوا ۔ اب جب فٹ پاتھ پر آیا تو گڑھے کے اس پار تھا ۔ میں نے راحت کی سانس لی ۔ چلو گڑھا تو پار ہو گیا ۔

ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے میں فٹ پاتھ پر بے دھڑک چلنے لگا لیکن صرف پچاس قدم ہی چلا تھا کہ میرا راستہ رک گیا ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ فٹ پاتھ پر لگ بھگ آٹھ دس پھلوں کی ٹھیلہ بنڈیاں اس طرح کھڑی ہیں کہ آگے جانے کے لیے راستہ ہی نہیں ہے ۔ کیلے ، انگور ، سنگترے ، تربوز ، پھلوں کا ایک چھوٹا سا مارکیٹ لگا ہوا ہے ۔ اور ان پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے ۔ اچھا ہوا کہ پھینکے گئے کیلوں کے چھلکوں پر میرا پیر نہیں پڑا ۔ میں نے دیکھا کہ ٹھیلوں کے بیچ تھوڑی سی جگہ ہے جس میں سے نکلا جاسکتا ہے ۔ میں اس میں گھسا اور گھبراہٹ میں تربوزوں کے ٹھیلے سے دھکا کھا گیا ۔ اس نے تربوزوں کو "پیرامڈ" کی شکل میں سجا کر رکھا تھا ۔ اوپر کے تیس تربوز نیچے لڑھک گئے ۔ میری قسمت اچھی تھی کہ تربوزوں کی جگہ خربوزے نہیں تھے ۔ تربوز والے نے کہا او صاحب میں آپ کو نکال کر دیکھتا ہوں کیوں گڑبڑ کر رہے ہیں یہ لیجیے بڑا مزے دار ہے دس روپیے دیجیے کہتے ہوئے اس نے ایک بڑا تربوز میرے ہاتھ میں تھمادیا ۔ میں گیا گزرا تربوز لے کر دس روپیے دیئے اور اسی کا فائدہ اٹھا کر اس پتلی گلی سے نکل کر اس طرف آگیا ۔ مجھے خوشی ہوئی کم سے کم اس بار تو سڑک پر آنے کے لیے مجبور ہونا نہیں پڑا ۔ دس روپیے دے کر میں نے اپنے شہری ہونے کا فرض نبھایا ۔

اب پھر فٹ پاتھ پر شان سے چلنے لگا لیکن ایک ہی منٹ میں میری شان میں پھر گستاخی ہو گئی ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ فٹ پاتھ کے ایک کنارے کے کھمبے سے دوسرے کنارے تک جہاں پر ایک پان کی دکان ہے رسیاں بندھی ہوئی ہیں اور ان پر طرح طرح کے رسالے اس طرح لٹکائے گئے ہیں کہ سامنے کا راستہ ہی نظر نہیں آرہا ہے ۔ تقریباً سبھی رسالوں پر ہیروئنوں کی عریاں تصویریں تھیں جنہیں کئی بچے اور بوڑھے غور سے دیکھ رہے تھے ۔ میں رسالوں کو ہٹاتے ہوئے آگے نکل گیا ۔ لیکن میری کوشش میں دس پندرہ رسالے کلپ سے نکل کر نیچے گر گئے ۔ پان والا زور سے چلایا "ارے اندھے کی اولاد کدھر دیکھ رہا ہے" ۔ مجھے بھی غصہ آیا میں نے پلٹ کر کہا "کیا بات کر رہے ہو ، فٹ پاتھ پر قبضہ جمائے ہوئے ہو اور مجھ پر ہی غصہ جھاڑ رہے ہو" ۔ اس نے بھی الٹا کہا ارے میرے باپ اتنی سڑک خالی پڑی ہے اور تجھے فٹ پاتھ پر چلنے کی ہی کیا ضد ہے" ۔ میں نے کہا "لیکن پولس والے تو فٹ پاتھ پر چلنے کے لیے کہہ رہے ہیں" ۔ اب اسے غصہ آگیا ۔ اس

نے پولس والوں کو بھدی گالی دیتے ہوئے کہا" بھیا اگر تم پولس والوں کی باتیں سن کر فٹ پاتھ پر چلو گے تو رات تک گھر نہیں پہنچو گے ۔ خیر تمہاری مرضی لیکن میری دکان تو میں فٹ پاتھ پر ہی لگاؤں گا۔

میں پھر آگے بڑھ گیا اس بار جو اڑچن آئی وہ زبردستی تھی ۔ پورے فٹ پاتھ کو گھیر کر ایک شامیانہ لگایا گیا تھا ۔ یہاں سے دوسری طرف جانے کا سوال ہی نہیں تھا ۔ شامیانے کے اندر شاید دعوت ہو رہی تھی ۔ فلمی گانے بج رہے تھے ۔ اب سڑک پر آنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا ۔ میں سڑک پر آنے کے لیے مڑا مگر شامیانے کی ایک رسی میرے پیر میں اٹک گئی اور ہاتھ میں تربوز لیے میں لڑھک گیا ۔ تربوز تو تربوز تھا اسے کچھ نہیں ہوا لیکن میرے ماتھے اور کنپٹی پر کھرونچیں آگئیں ۔ میرا چشمہ کہیں دور جا کر گرا ۔ کچھ لوگوں نے آکر مجھے اٹھایا ۔ ایک نے تربوز اٹھا کر دیا اور دوسرے نے چشمہ ، چشمہ پھوٹ گیا تھا ایک نے بڑی اپنائیت سے کہا" اتنی بڑی سڑک چھوڑ کر آپ فٹ پاتھ پر کیوں چل رہے ہیں ۔ اب ایک رکشہ لے لیجیئے اور گھر جائیے" ۔ میں جب رکشے میں بیٹھ رہا تھا تو شامیانے میں ایک گیت بج رہا تھا ۔ " اے بھائی ذرا دیکھ کے چلو!"

رکشے میں بیٹھ کر میں سوچ رہا تھا سڑک پر چلنے سے جان جاسکتی ہے اور فٹ پاتھ پر چلنے سے پیر ٹوٹ سکتے ہیں ۔ پھر انسان کہاں چلیں ؟

مرزا کھونچ

گرمی میں

کبھی کھٹمل، کبھی مچھر کی ہے یلغار گرمی میں
ہوا ہے کھاٹ پر سونا بہت دشوار گرمی میں

بنا مرغِ مسلم جان کا آزار گرمی میں
پچانے سے کیا ہے پیٹ نے انکار گرمی میں

کبھی تقریر گرمی میں کبھی تکرار گرمی میں
پگھل جاتا ہے دھیرے دھیرے سارا پیار گرمی میں

تہیہ کرلیا میں نے وہیں شادی رچاؤں گا
جہاں سے مفت مل جائیگی اے سی کار گرمی میں

لگی مجنوں کو تو لیلیٰ کو بھی ڈی ہائیڈریشن ہے
محبت ہوگئی ہے دیکھیے بیمار گرمی میں

ٹپک پڑتا ہے ماتھے کا پسینہ آنکھ میں اس دم
نگاہیں جب ہوا کرتی ہیں ان سے چار گرمی میں

ادھر ہے دھوپ کی شدت ادھر چھاتا ندارد ہے
کہ مرزا کے لیے جینا ہوا دشوار گرمی میں

عرشی مستان، سمستی پور

غزل

آج ہر پارٹی ہے اس پہ کار بند
آج آفس بند کل بازار بند
فرض ہے اپنا ، چھین لیڈر شریف
جب کہیں سنسد میں ہوگی مار بند
مجھ سے بیگم غیظ میں کہنے لگیں
اپنی غربت کا کرو اظہار بند
آج بھی لائے نہ ساڑی عید کی ؟
آج بھی کردوں گی میں افطار بند
لے گئے انگریز ، کوہ نور کو
کچھ اگر چھوڑا تو بس اتوار بند
پیش کل ہوگا بجٹ ایوان میں
سیٹھ کر دو جلد سب بھنڈار بند
جانے کیوں بس میکدے کے سامنے
ہوتی ہے اکثر ہماری کار بند
بھاگ لیں گے قبر سے منکر نکیر
جب کہونگا ، عرض ہے دو چار بند
طنز کرتے تھے پولیس پر بے دھڑک
ہوگئے مستان آخر کار بند

ڈاکٹر ہادی منزہ۔ تیرہل

غزل

حاکم ہمارے سینہ پہ یوں مونگ دل گئے
لے کر وہ ہم سے اوٹ ہمیں کو مسل گئے
ان کی نگاہ ناز میں گرمی عجیب تھی
دیکھے جو ایک بار تو انڈے ابل گئے
جو پیرہن پہن کے کچھ آئیں تھیں لڑکیاں
کیا نوجواں وہ دیکھ کے بوڑھے مچل گئے
جب سے بلندیوں کا ہوا ہے منزہ شوق
تب سے وہ چھونے آسماں ہم کو کچل گئے

مسیح انجم

بونتہ

نامور مزاح نگار مسیح انجم کا 30 مئی 1998ء کو انتقال ہوا۔ پہلی برسی کے موقعہ پر ان کے تین مضامین شگوفہ میں شریکِ اشاعت ہیں (ادارہ)

بونتہ!
میرا بونتہ!!
ابا جان کا بونتہ!
ہینڈلوم ساڑی کا بونتہ!
بونتہ، بونتہ، ایک اور بونتہ!!!

میں بوریئے پر لیٹا مسلسل بڑبڑائے جارہا تھا۔ میرے دانت بج رہے تھے۔ میرا جسم کپکپارہا تھا۔ میری بیوی مجھ پر اڑھانے کے لیے گھر کے سارے افراد کے بونتے اکٹھا کر رہی تھی۔ میرے دوست صمدانی قریب ہی کرسی پر بیٹھے، آنکھیں بند کئے میری بڑ بڑاہٹ سے کچھ اس طرح لطف اندوز ہورہے تھے جیسے ٹیپ ریکارڈر سے مہدی حسن کی گائی ہوئی کوئی غزل سماعت فرما رہے ہوں۔ جب بیوی سارے بونتے اکٹھا کرچکی اور اڑھانے کے لیے میری جانب بڑھی تو صمدانی نے فرائض زوجہ کے درمیان حائل ہوتے ہوئے کہا "! یہ آپ کیا کررہی ہیں؟ انھیں ڈسٹرب DISTURB مت کیجئے۔ ان پر شعر کا نزول ہورہا ہے۔ اگر آپ بونتے اڑھائیں گی تو وہ جو "آمد" کی کیفیت ہے، ختم ہوجائے گی اور کل کے روز نقاد یہی کہیں گے کہ اس نظم میں "آمد" نہیں "آورد" ہے!"

بیوی نے ڈھیر سارے بونتے اڑھاتے ہوئے کہا "میں اتنی بھی جاہل نہیں ہوں کہ شاعری اور بحرانی کیفیت میں تمیز نہ کرسکوں! دراصل ان پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا ہے اور کپکپی کی وجہ سے بونتے اڑھانے کے لیے کہہ رہے ہیں!!"

صمدانی نے شرارتاً کہا "نہیں بھابی! ان پر ملیریا کا نہیں بلکہ جدید شاعری کا حملہ ہوا ہے۔ آپ سن رہی ہیں

نا! وزن اور بحر کی پامالی اور لرزے کی کیفیت یہ سندیسہ دے رہی ہے کہ ان سے ضرور ایک "کھردری نظم" سرزد ہوگی ۔!"

بیوی نے حیرت سے پوچھا "کیا شعر کہتے وقت شاعر کو اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ اس پر کپکپی بھی طاری ہوجاتی ہے اور دانت بھی بجنے لگتے ہیں؟"

صمدانی نے سمجھایا "ہاں بھابی! اس سے کہیں زیادہ ہی۔ پابند شاعر تو اس قدر بدحواس ہوجاتا ہے کہ تخلیقی کرب کے تحت کبھی لیٹ جاتا ہے اور کبھی اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگتا ہے۔ البتہ صرف میٹرنٹی ہاسپٹل نہیں لے جایا جاتا۔"

بیوی نے بھولپن سے سوال کیا "کل تک تو یہ شاعر نہیں تھے۔ یہ ایک دن میں کایا پلٹ کیسے ہوگئی!؟"

صمدانی نے میرے خلاف ورغلانے کے لیے کہا "بھابی! کسی کا کیا بھروسہ؟ انسان کو بگڑتے دیر نہیں لگتی اور شاعری میں تو انسان بہت جلد بگڑ جاتا ہے۔ کل سے آپ دیکھیں گی، یہ مشاعرے پڑھنا شروع کردیں گے ایک آدھ آل انڈیا مشاعرہ پڑھتے ہی اپنے آپ کو "قوم کی امانت" کہلوانا پسند کریں گے۔"

بیوی نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا "آپ کا بھی جواب نہیں۔ آپ میری امانت قوم کو سونپ دے رہے ہیں اگر واقعی "میری امانت" شاعری کے چکر میں پڑکر ہاتھ سے نکل جائے گی تو قوم انھیں کیا دے گی؟"

صمدانی نے برجستہ کہا "آپ بونتہ اڑھا رہی ہیں اور قوم ایک شال کے وعدے پر ٹرخا دے گی۔"

میں جو بڑی دیر سے بخار کی بھٹی میں تپتے اور ڈھیر سارے بونتوں کے نیچے کپکپاتے ہوئے دیور اور بھابی کے مکالمے سن رہا تھا ضبط نہ کرسکا۔ کراہتے ہوئے بولا "صمدانی! میں تمہاری ساری باتیں سن رہا ہوں، تم میری بیوی کو میرے خلاف ورغلا رہے ہو اور میری بڑبڑاہٹ کو جدید شاعری سے تعبیر کر رہے ہو کیا جدید شاعری بڑبڑاہٹ کا دوسرا نام ہے؟"

وہ بولے "بخار کی حالت میں تم نے جو کچھ "عرض کیا ہے" اس میں کم از کم ایک قسم کا ردھم اور بحر تو ہے، جدید شاعری میں یہ بھی نہیں۔ اگر ثبوت چاہتے ہو تو رسائل پیش کرسکتا ہوں۔"

میں نے زچ ہوکر کہا "تم ٹھیرے ہر لفظ کے معنی لغت میں دیکھنے والے یہ جدید شاعری تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اکیسویں صدی کی نسل بڑی آسانی سے سمجھ لے گی۔"

صمدانی نے طنز کیا "یہ تو ٹھیک ہے لیکن اکیسویں صدی کی نسل کے لیے جدید شاعر کو بیسویں صدی کی اسٹیشنری STATIONARY اور نیوز پرنٹ ضائع کرنے کا کیا حق ہے؟"

میں نے کہا "یار! جب تک تم ابہام کو نہ سمجھ پاؤ گے، جدید شاعری تمہاری سمجھ میں نہ آئے گی۔ اگر میں معنی پہنانے بیٹھوں تو بخار کی حالت میں میں نے جو کچھ "عرض کیا ہے" وہ بھی ایک نظم ہے اور "بونتہ" غریبی کی علامت ہے۔"

صمدانی نے قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا "تو پھر "رضائی" "امیری" کی علامت ہوئی۔!"

میری زبان سے بے ساختہ نکلا "بہت خوب! مکرر ارشاد! تم روزانہ اسی طرح زانوئے ادب تہہ کرنے لگو گے تو دوچار دنوں میں جدید شاعری کو پوری طرح سمجھ پاؤ گے۔ فی الحال مجھ پر یہ کرم کرو کہ کسی میڈیکل شاپ

سے ملیریا کے ٹیبلیٹس TABLETS لادو۔"
صمدانی دوا لانے کے لیے چلے گئے ۔ مجھ پر پھر کپکپی طاری ہوگئی اور میں پھر بڑبڑانے لگا :
"بونتہ ! بونتہ اڑھاؤ بونتہ ! "

غالباً آپ نے بونتہ ضرور دیکھا ہوگا۔ نہیں دیکھا ہے تو جانے دیجئے شاید آپ کا تعلق 'رضائی ' یا ' لحاف سے ہے ۔ خیر ہم بتائے دیتے ہیں ۔ ساڑی جب وظیفہ حسن خدمت پر علٰحدہ کردی جاتی ہے تو سگھڑ خواتین اسے بونتہ کا روپ دے دیتی ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ پچپن سالہ مدت ملازمت کو بڑھاکر اٹھاون سالہ کردیا گیا ہو۔ لیکن اس کے لیے ساڑی پر زور مطالبہ نہیں کرتی ! ـــــ بونتہ کیا ہے ؟ ــــ اچھے خاصے پیاچ ورک PATCH WORK کا نام بونتہ ہے ! اس کی تیاری میں گھر کے سارے افراد کے پرانے کپڑے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ مثلاً کی چڈی منی کی فراک، والد کی لنگی ، بہن کا جمپر، بیٹے کا پاجامہ ، بھائی کا بشرٹ بھابی کا پیٹی کوٹ اور شیرخوار کی پھالیاں ۔ جب یہ ساری فہرست سلیقہ سے ترتیب دی جاتی ہے تو اس پر ساڑی کو اڑھاکر بونتہ سی لیا جاتا ہے یہ بونتہ کہاں ہوا ؟ یہ تو ایک ایسا ناول ہوا جس پر ایک خوب صورت ٹائیٹل کور TITLE COVER چڑھا دیا گیا ہو۔ یوں بھی بونتہ ایک ایسے ناول کے مماثل ہوتا ہے جس کے محاسن بھی ہوں اور معائب بھی ۔ اس بونتے کا ہر پیاچ PATCH ناول کا ایک مکمل کردار ہوتا ہے اور ہر کردار کی ایک جیتی جاگتی کہانی بونتے میں سانس لیتی رہتی ہے مگر سوشیل ریفارمرس SOCIAL REFORMERS کو اتنی توفیق کہاں کہ وہ اس ناول کو پڑھیں اور سمجھیں۔

صوتی اعتبار سے "بونتہ" کانوں کو بھلا نہیں لگتا ۔ یہ لفظ سنتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے کسی نے آپ کے کانوں کے قریب تاشے کو زور سے بجاکر آپ کی قوت سماعت کو چیلنج کیا ہو۔ دیکھنے میں بھی "بونتہ" بڑے واہیات قسم کا لگتا ہے ۔ "بونتہ" بولتے ہوئے شرم کا احساس دامن گیر رہتا ہے۔ غریبی ہے ہی کچھ ایسی چیز! جناب ! بونتہ بڑے کام کی چیز ہے ۔ پتھر پر پٹکئے ، پھٹے گا نہیں ، دھوپ میں سکھائیے اس کا رنگ اور نکھر آئے گا ۔ پانی میں بھگوئیے وہ "ہیوی ویٹ چمپین " بن جائے گا ۔ بونتے کو دیکھتے ہی دھوبی کا دم نکل جاتا ہے وہ ہاتھ جوڑ کر یہی کہے گا "میں تو باز آیا بونتہ دھونے سے ! " جب بونتہ ایسا ہو تو اندازہ لگائیے کہ بونتے کے پروردہ کتنے جفاکش اور محنتی نہ ہوتے ہوں گے !

جہاں تک رضائی کا تعلق ہے ، وہ بالکل چھوئی موئی قسم کی ہوتی ہے پانی میں بھگوئیے ، بھیگ کر گولہ بن جائے گی ۔ دھوپ میں سکھائیے ، اس کا کلر CLOUR فیڈ FADE ہوجائے گا۔ مختصر یہ کہ رضائی کو سینت سینت کر رکھنا پڑتا ہے

ہمارے ملک میں شمال والے "بونتہ" کو "گدڑی" کہتے ہیں اور آندھرا کے علاقے والے "بونتہ"۔ نام بدلنے سے غریبی نہیں بدلتی ۔ اے غریبی تیرے کئی نام!

ایک زمانے سے "بونتہ" میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ معاف کیجئے ! غلط بیانی سے کام لیا۔ بچپن ہی سے "بونتہ" میرے تحت الشعور میں چھپا بیٹھا تھا میں نے بونتے پر آنکھیں کھولیں۔ ہوش سنبھالا بھی تو بونتہ برابر

میرے ساتھ تھا۔ بونتہ بچھاؤ، بونتہ اوڑھو۔ گھر میں بونتہ۔ باہر بونتہ حد ہوگئی اسکول میں بھی بونتہ۔ مجھے وہ انگلش کے ٹیچر اکثر یاد آتے ہیں۔ جو اردو زبان میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور لڑکوں کو مارنے کے لیے بہانے کے متلاشی رہتے تھے۔ ایک دن نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ اچانک ہم سے اینگلو اردو

ANGLO-URDU میں سوال کیا "بتاؤ YESTER DAY کسے کہتے ہیں؟"

ہم نے سہل ممتنع میں جواب دیا "میں کل نہیں آیا تھا!"

تو YESTERDAY کے معنی — میں کل نہیں آیا تھا؟" ٹیچر نے "تھا" پر بہت زور دیتے ہوئے پوچھا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے وضاحت کی:

"سر! حقیقت میں میں کل نہیں آیا تھا۔"

غصہ سے پوچھا "کیوں نہیں آئے تھے؟"

"سر! کل بارش ہوئی تھی!" ہم نے قدرت کا سہارا لیا۔ انھوں نے مادی جواز پیش کیا "چھتری لگاکر آنا تھا!"

"سر! چھتری نہیں ہے!"

"تو کمبل اوڑھ کر آنا تھا!"

"کمبل بھی نہیں ہے"

پیٹھ پر ایک زبردست گھونسہ جڑتے ہوئے فرمایا "ارے کمبخت! تو پھر بونتہ اوڑھ کر آنا تھا!"

اس حادثہ کے بعد تو مجھے بونتے سے ایک چڑسی پیدا ہوگئی چنانچہ میں نے اسی روز اپنی ماں سے شکایت کی کہ "ماں! مجھ سے یہ بونتہ سہا نہیں جاتا۔ آخر یہ بونتہ کب تک؟ مجھے تو رضائی چاہیئے رضائی!"

وہ اداس ہوکر بولی "بیٹا! میں کب بونتہ کو پسند کرتی ہوں؟ میں تو شادی کے وقت اپنے ساتھ رضائی لائی تھی لیکن بونتہ میرا مقدر بنا دیا گیا۔ اب تو میرے پاس بونتے کا ڈپلوما DIPLOMA ہے۔ صرف میں ہی کیا، بھارت کی ہر عورت شادی کے وقت اپنے ساتھ رضائی لاتی ہے لیکن مرد اسے بونتے کی ابل بناکر رکھ دیتے ہیں!" — اور پھر ماں نے بونتہ کے سلسلہ حسب و نسب کو خاندان در خاندان اور نسل در نسل گزارتے ہوئے بالآخر دجال سے ملادیا۔ اور بولی "عنقریب دجال بونتہ اوڑھ کر آنے والا ہے۔ وہ ابھی بونتہ سی رہا ہے جیسے ہی وہ بونتہ سی لے گا، نمودار ہوگا۔ پھر دجال کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ خدا نہ دکھائے دجال کے فتنہ کو" —

اور پھر ماں دجال کے فتنے کو دیکھے بغیر "بونتہ" ہمارے حوالے کرگئی کہ سنبھالو، یہ پرکھوں کی امانت!

اس طرح یہ "بونتہ" نئی نسل میں منتقل کردیا گیا! — اور ایک دن ہماری شادی ہوگئی۔ شادی کی پہلی شب ہم نے دلہن سے پوچھا "آپ کی کوالیفیکیشن QUALIFICATION کیا ہے؟

اس نے جواب دیا "یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ ماں سے بولوں گی۔"

"ارے بھئی! میرا مطلب ہے۔ آپ کہاں تک پڑھی ہیں؟"

وہ بولی "مجھے سینا پرونا آتا ہے اور میں بونتہ سینا جانتی ہوں بونتہ سیوں گی۔ بونتہ اوڑھاؤں گی۔!"

اس قسم کی کوالیفیکیشن رکھنے والی لڑکیوں کی ہمارے ملک میں کوئی کمی نہیں۔ لیکن یہ لڑکیاں خلیجی ریاستوں کو برآمد کردی جاتی ہیں۔ وہاں ان کی بڑی مانگ ہے اور یہاں جہیز اور گھوڑے جوڑے کی رقم کی مانگ ہے۔

جب بھی میں ایک ہی خاندان کے سارے افراد کو بونتے اوڑھ کر سوتے ہوئے دیکھتا ہوں تو بڑی الجھن کا شکار ہوجاتا ہوں ۔ میں اس رات کو کبھی نہیں بھول سکتا جو میرے لیے حماقتوں کا ایک طوفان اپنے ساتھ لائی تھی ۔ ہماری شادی کو ہوئے چند ہی دن گزرے تھے ۔ غالباً دوسری یا تیسری جمعگی تھی ہم سسرال میں موج منارہے تھے ۔ ایک دن "بونتہ" کے مسئلہ پر بیوی سے تھوڑی سی ناچاقی ہوگئی اور یہ بات سسرال والوں کو بڑی ناگوار گزری ۔ سسرال کے سارے افراد ہم سے ناراض ہوگئے ۔ اس رات بیوی نے یہی مناسب سمجھا کہ ہم ہجر کی کیفیت سے گزریں اور تارے گنیں۔

جب رات کے بارہ بج چکے تو ہماری پلنگ کے قریب بلی کی آواز سنائی دی ۔ رات کے وقت بلی کی آواز ہماری کمزوری رہی ہے ۔ ہم نے سوچا کہ بلی سے ڈرتے ڈرتے صبح کرنے کے بجائے خوشامد کرکے بیوی کو منالینا چاہیئے ۔ ہم ہمت کرکے دبے پاؤں دالان میں پہنچے ۔ دیکھتے کیا ہیں کہ وہاں کا نقشہ ہی کچھ بدلا ہوا ہے ۔ گھر کے سارے افراد بونتے اوڑھے سورہے تھے ۔ ہمیں یوں لگا جیسے سارے افراد رنگ برنگی ساڑیاں اوڑھے سورہے ہیں۔ ہم ایک عجیب طرح کی ذہنی کش مکش میں مبتلا ہوگئے ہمیں اپنی بیوی کا پتہ لگانا مشکل ہوگیا تھا۔ ہم میں اتنی قوت شامہ تو ہے نہیں کہ سی ۔ آئی ۔ ڈی کے تربیت یافتہ بلڈاگ کی طرح بو، سونگھ سونگھ کر یہ پتہ لگاتے کہ کس بونتے کے نیچے ہماری نصف بہتر محو خواب ہے ۔ کھٹمل یا مچھر بن کر جگانے سے تو رہے ۔ بالآخر انگل کو اپنا قطب نما بنایا اور ایک گٹھری نما چیز کو آہستہ سے ہلاکر کہا :

"اجی اٹھو!"

گٹھری میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور ایک دھیمی آواز سنائی دی "کون ؟"

لہجہ پر پہچان گئے کہ وہ ہماری نصف بہتر نہیں بلکہ ان کی والدہ محترمہ ہیں۔ چنانچہ منمناتے ہوئے جواب دیا ۔ "ہم ہم میں! یعنی کہ آپ کا غلام جسے دامادی کا شرف بخشا گیا ہے ۔"

وہ کسی قدر تیز لہجہ میں بولیں "اتنی رات گئے کیا کام ؟"

ہم نے فدویانہ لہجے میں جواب دیا "قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا تھا ۔ کل کی رنجش کی معافی چاہتا ہوں۔"

انھوں نے مربیانہ لہجہ میں جواب دیا "صبح میں بھی تو حاضر ہوسکتے تھے"

ہم نے تڑسے وہ شعر پڑھ دیا جو زمانۂ طالب علمی میں بغیر سوچے سمجھے ہی بیت بازی کے مقابلوں میں اکثر سنایا کرتے تھے ۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا

آدمی بلبلہ ہے پانی کا

شعر سنتے ہی "مکرر ارشاد" کی بجائے "اچھا جاؤ معاف کیا!" کے جواب سے ہمیں سرفراز فرمائیں۔

بونتہ میں اکیلا ہی نہیں اوڑھتا ۔ بھارت کی نوّے فیصد آبادی بونتہ اوڑھتی ہے ۔ گاؤں گاؤں، شہر شہر، قریہ قریہ، بونتے کی فراوانی ہے اور ہر فرد کے ساتھ تخلص کی طرح بونتہ لگا ہوا ہے ۔ بونتہ بھومیا، بونتہ برہان الدین، بونتہ رام ریڈی، بونتہ کرشنما چاری، بونتہ ملّا، بونتہ غوثیہ بیگم۔ چنانچہ الیکشن کے زمانے میں ہمارے لیڈر اسی بونتہ کو بنیاد بناکر ووٹ مانگنے کے لیے آتے ہیں۔ بعض لیڈر تو بونتے کو کچھ اس طرح اوڑھ لیتے ہیں کہ ان کی

صورت تک دکھائی نہیں دیتی اور وہ مجسم بونتہ بن جاتے ہیں۔ میں اس قسم کے لیڈروں کو جب دیکھتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں کیونکہ اس بونتہ کے اندر دجال چھپا ہوتا ہے۔ لیکن عوام اس کو پہچان نہیں پاتے لہذا وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ دجّال کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جلوس نکلتے ہیں۔ نعرہ بازی شروع ہوجاتی ہے۔

جیتے گا بھئی جیتے گا بونتے والا جیتے گا

اور پھر دجّال الیکشن جیت جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ اقتدار پر آجاتا ہے فوراً بونتہ کو جھٹک دیتا ہے اور رضائی اوڑھ لیتا ہے۔ جب وہ بونتہ ستیہ نارائینا کی بجائے بی۔ ستیہ نارائینا کی نیم پلیٹ NAME PLATE لگاتا ہے۔ اب اس کو عوام سے کئے ہوئے وعدے یاد نہیں رہتے۔ وعدے تو خیر دور کی بات ہوئی۔ عوام کی سیدھی سادی زبان اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنی مادری زبان بھول جاتا ہے اور اقتدار کی زبان میں بات کرنے لگتا ہے۔ یہیں سے ترسیل کا المیہ شروع ہوجاتا ہے۔ عوام اپنی مادری زبان اور سیدھی اردو زبان میں اپنا حق مانگتے ہیں ــــــ ع "روٹی، کپڑا اور مکان"

وہ اقتدار کی زبان میں جواب دیتا ہے ــــ

ع "اپڑی تپڑی، پوتی کا پان"

یہ زبان عوام کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جب صحافت اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے یہ گرہ لگاتی ہے۔

ع پکڑو اپنے لیڈر کے کان

اس طرح اصنافِ سخن میں تین مصرعوں والی نظم "تپائی" کا اضافہ ہوجاتا ہے۔

روٹی کپڑا اور مکان

اپڑی تپڑی پوتی کا پان

پکڑو اپنے لیڈر کے کان

عوام اس "تپائی" کو اپنا نعرہ بناکر لیڈر کی طرف لپکتے ہیں جس کے نتیجہ میں مڈٹرم الیکشن MID-TERM ELECTIONS کی نوبت آجاتی ہے۔ جب کہیں جاکر وہ لیڈر بونتے والوں کی صف میں آکھڑا ہوتا ہے اور پھر "بونتہ" کا احیا عمل میں آتا ہے۔ اس وقت تک لیڈر کی سوجھ بوجھ کافی اچھی ہوجاتی ہے۔ ایسے موقع پر اگر کوئی پریس رپورٹر اس سے پوچھے کہ "بتائیے! اس دنیا میں عارضی کیا ہے؟

لیڈر کا جواب ہوگا ــــ "رضائی!"

اور PERMANENT ؟"

وہ بولے گا "بونتہ"

لہذا ــــــــــــ

بونتہ زندہ باد!

بونتہ پائندہ باد!

"مسیح انجم

نقلستان

جب ملک میں نقل مار کر ہر قسم کے امتحانات کامیاب کرنے والوں کی بہتات ہوگئی اور زندگی کے ہر شعبہ پر نقال ہی نقال چھاگئے تو ان میں سے چند اعلیٰ پائے کے نقالوں نے اپنی ایک سیاسی جماعت فارغ النقل پارٹی " کے نام سے قائم کی اور پھر اپنی ایک علحدہ ریاست " مملکت نقلستان " کا مطالبہ شروع کردیا۔ ابتداء میں اس تحریک کو بڑی شدت کے ساتھ دبانے کی کوشش کی گئی لیکن ہر بار اس پارٹی نے اسی شدت کے ساتھ نعرہ بلند کیا۔ جتنا دباؤگے تم اتنا ہی ابھریں گے ہم"

بالآخر ارباب مقتدر کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ نقل مارتے مارتے اس پارٹی کے اراکین کی عقل ماری گئی ہے اور اب وہ کسی طرح ماننے والے نہیں تو انھوں نے تجرباتی اساس پر ایک علحدہ ریاست " مملکت نقلستان " کے قیام کی منظوری دے دی بس پھر کیا تھا۔ نقالوں نے تالیاں پیٹیں۔ اور گنتی کے چند حقیقی دانشور اپنا اپنا سر پیٹ کر رہ گئے نتیجتاً ان کے سر کے رہے سہے بال بھی جھڑ گئے۔ چنانچہ 31 / مارچ کی رات کو ٹھیک بارہ بج کر ایک سکنڈ پر جب کہ گھڑی " فرسٹ اپریل " کا اعلان کرتی ہے ، ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ الّو کی صدا بلند کرکے " مملکت نقلستان " کے قیام کا اعلان بڑے دھڑلے سے کیا گیا۔ اور دوسرے ہی روز ایک بہت بڑا بورڈ شہر کے بیچوں بیچ نصب کیا گیا جس پر لکھا ہوا تھا :

EXPERIMENTAL STATE TO PROMOTE ACTING AND

DUPLICATING IN EACH AND EVERY FIELD"

قیام ریاست کے ساتھ ساتھ ہی چیف منسٹری کے عہدہ کے لئے فارغ النقل پارٹی " کے اراکین میں زبردست رسہ کشی شروع ہوگئی۔ انھیں ایک ایسے لیڈر کی تلاش تھی جو کسی " چمن " میں پیدا ہوا ہو۔ تاکہ اس کے پرلوک سدھارنے پر تعزیتی جلسہ میں جب مقررین " بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا " پڑھیں تو یہ مصرعہ سورگباش پر مقام پیدائش کے لحاظ سے ٹھیک ٹھیک منطبق ہو، اور مقررین کی جہالت اور کم

علمی پر کوئی حرف نہ آنے پائے کافی تلاش و جستجو کے بعد آخر ایک ایسا "دیدہ ور مل ہی گیا جو "بڑی مشکل سے "کوئی گوڑہ چمن" میں پیدا ہوا تھا اس کو چیف منسٹری کی گدی پر بٹھایا گیا گدی پر بیٹھتے ہی اس نے سب سے پہلا انقلابی قدم یہ اٹھایا کہ سارے کے سارے قلمدان بائے وزارت اپنے ہی پاس رکھ لیئے پارٹی کے اراکین نے جب اس غاصبانہ قبضہ کی جانب توجہ دلائی تو ہزایکسلنی نے مسکراتے ہوئے اپنے رفقاء میں قلمدانوں کی بجائے بٹوؤں کا بٹوارہ کیا البتہ ایک خاتون وزیر کی خدمت میں خواتین کے بین الاقوامی سال کی اہمیت کے پیش نظر ازراہ قدردانی بٹوہ کی بجائے پاندان عنایت فرمایا تاکہ کسی ہنگامی اجلاس کے موقع پر ہنگامہ برپا ہوجائے اور ایک دوسرے پر دانت کچکچانے کی نوبت پیش آئے تو فوراً پان کے بیڑوں کا انتظام ہوسکے۔

اس طرح وہ خاتون "محکمہ سماجی بھلائی" کے پاندان کی مستحق قرار پائیں محکمہ صحت و طبابت کا بٹوہ پارٹی کے ایک ایسے رکن کو دیا گیا جو ہمیشہ کسی نہ کسی درد اور مرض میں مبتلا رہنے کی ایکٹنگ کیا کرتا تھا اور پارٹی میں "دائم المریض" کے نام سے مقبولیت حاصل کرچکا تھا۔ بٹوؤں کی تقسیم کے وقت وہ قوم کے درد میں مبتلا تھا۔

ــــــ محکمہ روڈ ٹرانسپورٹ کا بٹوہ ایک ایسے رکن کو دیا گیا جو موٹروں کے نقلی اسپیر پارٹس کے دھندے کے سلسلہ میں نقل مقام کر جاتا تھا۔

وزارت داخلہ کا بٹوہ پارٹی کے ایک ایسے سینیر رکن کے حصہ میں آیا جو پارٹی کے "داخل خارج رجسٹر" کے اندراجات کیا کرتا تھا۔

محکمہ مال کا بٹوہ جس رکن کو ملا وہ اسے ایک گھنٹہ تک بھی نہیں سنبھال سکا اور عجلت میں کھو ڈالا۔

اس کے بعد چیف منسٹر کو موزوں ترین رفقائے کار نہ مل سکے تو باقی سارے کے سارے بٹوے اپنے بریف کیس میں رکھ لئے۔ دوسرے دن اخبارات میں جب وزرا کی تصاویر معہ بٹوہ و تعارف چھپیں تو عوام نے ایڈیٹروں کے نام احتجاجی مراسلے لکھے۔ لیکن اگلے ہی دن کے اخبارات کے ایک سطری اہم اداریہ نے سارے عوام کو خاموش کردیا کہ :

"جیسی روح ویسے فرشتے"

مختلف محکمے جات کے بٹوؤں کی تقسیم کے بعد نقلستان کی حکومت نے دیانت دار اور اصلی اسنادات رکھنے والے ملازمین کو سارے محکمے جات اور دفاتر سے پاک و صاف کرنے کا تہیہ کرلیا کیوں کہ حکومت کو یہ خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ اصلی اسنادات رکھنے والے ملازمین اپنی اعلیٰ وارفع صلاحیت کی ٹارچ لیکر فارغ النقل ملازمین کے کالے کرتوتوں پر ضرور روشنی ڈالیں گے جس کی وجہ سے دفاتر میں غیر ضروری خلل پیدا ہوجائے گا اور کام میں رکاوٹ پیدا ہوگی لیکن جب مختلف محکموں اور دفتروں سے اس قسم کے ملازمین کی صفائی کا کام شروع ہوا تو حکومت کے ہوش اڑ گئے کیوں کہ تحقیق کرنے پر کوئی ملازم الیسا نہ ملا جس نے اپنے طالب علمی کے دور میں مختلف امتحانات کے موقعوں پر نقل نہ ماری ہو۔ بڑی مشکل سے گنتی کے چند ملازمین ایسے دریافت کئے گئے جو امتحانات کے زمانے میں صرف فارمولے، مقولے، ضابطے، اصطلاحات تعریفات اور سنہ وغیرہ پوائنٹس ـــــ کے

طور پر اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے بالآخر ان سے وضاحت طلب کی گئی کہ آخر وہ کونسی رکاوٹ یا جذبہ تھا جو کھلم کھلا نقل مارنے سے روکتا تھا ؟ اندرون چوبیس گھنٹے صاف صاف نہ بتلائیں تو بیرونِ دفتر کردیا جائے گا اور سندیں ضبط کرلی جائیں گی ایں۔

بیچارے اس نامعقول ایکسپلینیشن EXPLANATION کا کیا معقول جواب دیتے !؟ نتیجتاً اپنی اپنی سندوں کو گلوں میں لٹکائے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور بالآخر روپوش ہوگئے۔

اس کے بعد نقلستان کی حکومت نے ایک اور اہم حکمنامہ جاری کیا کہ آئندہ سے ریاست کے سارے کاروبار نقلی ہوا کریں گے۔ اس حکم نامہ نے تاجروں میں مسرت کی ایک زبردست لہر دوڑادی۔ اس سے پہلے کہ وہ خوشی سے پاگل ہو کر اپنا جامہ پھاڑ لیتے انہیں فوراً اپنے گھاٹے کا خیال آیا اور ان کے ٹریلین کے شرٹس پھٹنے سے رہ گئے۔ پہلے جو تاجر نقلی مال کو " اصلی مال کا لیبل لگا کر بیچا کرتے تھے اب وہ صرف لیبل بدلنے پر اکتفا کرنے لگے۔

اس طرح تاجروں کا کام صرف لیبل بدلنا رہ گیا تھا۔ بدی جب بدی کے ہی روپ میں پیش ہوتی ہے تو وہ " بدی " نہیں رہتی بلکہ سچائی بن جاتی ہے فریب جب فریب ہی کے روپ میں سامنے آتا ہے تو وہ فریب نہیں رہتا، حقیقت بن جاتا ہے یہی حال اس نقلی مال کا ہوا۔ عوام نقلی مال کو خریدتے ہوئے " نقلی " کا لیبل لگا دیکھ کر ایک قسم کی ذہنی آسودگی حاصل کرنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ حکومت کو دعائیں بھی دینے لگے کہ وہ کم از کم دھوکہ اور کوفت کھانے سے تو محفوظ رہے۔

ادھر عوام نے بھی اس حکم نامے کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ کیوں کہ اس سے پہلے کی جو زندگی گزر رہی تھی وہ دو متضاد کیفیتوں کا مجموعہ تھی ایک اصلی اور دوسری نقلی پہلے اگر کسی کی محبوبہ اپنے عاشق کو دغا دے کر کسی " بھگوڑے " عاشق کے ساتھ فرار ہوجاتی تو پہلے عاشق کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کے سر بے وفائی کا الزام تھوپ دے اگر کوئی دوست دوستی کی آڑ میں دشمنی کا خنجر گھونپ دیتا تو وہ قابل گردن زدنی قرار پاتا مگر اس حکم نامہ کے بعد وہ قدریں یکسر بدل گئیں۔ قوم نے چولا بدلا۔ انسان کا چہرہ کہیں کھوگیا۔ مرد اپنے اپنے چہروں پر کئی چہرے چڑھائے گھومنے پھرنے لگے مکر و فریب کا چہرہ، خونی چہرہ، فسادی چہرہ، مردانہ چہرہ، زنانی چہرہ اور " درمیانی چہرہ " عورتیں بھی بھلا چپ کیسے بیٹھتیں میک اپ تو وہ بہت پہلے سے کرتی چلی آرہی تھیں۔ لیکن اب وہ بھی چہرے بدلنے کے آرٹ سے بخوبی واقف ہوگئیں ایکٹریس کا چہرہ کال گرل کا چہرہ، ماڈل گرل کا چہرہ، " دم مارو دم " کا چہرہ، جیب کترن کا چہرہ ڈائن کا چہرہ اور مردانہ چہرہ لیکن ان تمام چہروں میں ممتا کا چہرہ کہیں نظر نہ آتا تھا ان چہروں کے چکر نے انسان کو یہاں تک گرا دیا کہ اس کے دم نکل آئی۔

" نقلستان " نے ریاست کے طلباء کو امتحانات میں نقل مارنے کی کھلی چھوٹ بھی دے دی کیوں کہ سیاسی لیڈروں نے مملکت نقلستان کے قیام کی تحریک چلاتے وقت اسی نقل کا لالچ دے کر طلباء کو تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے لیئے اکسایا تھا۔ چنانچہ قیام نقلستان کے بعد یونیورسٹیوں، کالجوں، اور اسکولوں میں نقل عام ہوگئی۔ اور عام بھی اتنی کہ طلباء میں سوچ سمجھ کر نقل کرنے کی صلاحیت تک معدوم ہوگئی امتحانی ہال میں دوران امتحان اگر کوئی طالب علم اپنے پن کو جھٹکتا تو ہال کے سارے طلباء اس کی نقل کرتے ہوئے اپنے اپنے پن جھٹکنے لگتے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے کا سارا فرش نیلی روشنائی کے دھبوں سے داغدار ہوجاتا اگر کوئی طالبہ اکتا

کر انگڑائی لیتی تو ہال میں موجود ساری لڑکیاں انگڑائیاں لیتیں۔ اگر کوئی طالب علم بیزار ہو کر پہلو بدلتا تو ہال کے سارے لڑکے پہلو بدلتے اور اگر کوئی شرارتاً سوجاتا تو اس کی تقلید میں ہال کے سارے لڑکے اپنی اپنی نشستوں پر سوجاتے۔ یہی نہیں اگر کسی لڑکے کا دوران امتحان مزاج خراب ہوجاتا اور وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر گھر کی راہ لیتا تو ہال کے سارے طلباء کے مزاج بگڑ جاتے اور وہ بھی اپنی اپنی سیٹ پر پرچہ چھوڑ کر اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے فکر ہے کہ وہ پہلے لڑکے کے گھر نہیں پہنچتے تھے ان کی ان حرکتوں کو دیکھ کر یوں لگتا کہ امتحانی ہالوں میں امتحانات نہیں ہورہے ہیں، بلکہ فزیکل ڈسپلے PHYSICAL DISPLAY ہورہا ہے۔

اب ممتحنوں کا کام صرف یہ رہ گیا تھا وہ پرچے جانچنے کی بجائے یہ دیکھیں کہ ایک پرچے کے جوابات دوسرے پرچے کے عین مطابق ہیں یا نہیں اس کے بعد وہ تصدیق کردیتے کہ "نقل مطابق نقل درست ہے۔" بالآخر اس لکھنے کی زحمت سے بچنے کی خاطر ممتحن حضرات نے اس تحریر کی مہریں تیار کروالیں اب ان کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ امتحانات کے زمانہ میں "نقل مطابق نقل درست ہے" کی مہریں کھٹاکھٹ ثبت کریں۔ اس طرح وہ ممتحن کی بجائے "مہر مار" (بہ وزن چڑی مار) بن گئے تھے۔

ادب اور شاعری میں بھی نقالی کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ جو شعرا غالب کی دو غزلوں میں ڈوب کر ایک تیسری غزل لے آتے تھے اب سالم کی سالم غزل مرغ مسلم کی طرح ہڑپ کر جانے لگے۔ مگر انھیں یہ جاننا چاہئے تھا مرغ مسلم تو آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے لیکن غالب مشکل سے بھی ہضم ہو نہیں پاتے۔ چنانچہ مشاعروں میں شعرا غزلیں پڑھتے وقت جب کبھی تلفظ کی غلطیاں کرتے تو سامعین ہوٹنگ کے انداز میں کہتے کہ "ذرا ہجے درست کیجئے اور "بولتا قاعدہ" رواں پڑھنے کی مشق کیجئے۔" شاعروں نے اس ہوٹنگ سے بچنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا وہ مشاعروں میں نقل کی ہوئی کاپیاں پمفلٹ کی شکل میں سامعین میں تقسیم کرنے لگے۔ اس طرح مشاعروں کے سامعین کی حیثیت قارئین کی سی ہوگئی۔ جب کوئی قاری کسی شاعر کے نقلی کلام سے متاثر ہو کر "مکرر ارشاد" کہتا تو شاعر ایک ادائے دلربائی کے ساتھ ایک اور کاربن کاپی قاری کی خدمت میں پیش کردیتا۔ جب قاری "ایک اور عنایت" ہو کہتا تو شاعر اپنی دوسری جیب میں سے ایک اور "نقلی غزل" قاری کی خدمت میں پیش کردیتا۔ بالآخر یہ کلام قارئین کے ہاتھوں ہوتے ہوئے ردی کی دکان پر پہنچ جاتا یا پھر پان کی دکان پر بیڑے باندھنے کے لئے۔ اس طرز نقالی سے ادب کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچا البتہ نقل کرتے کرتے شعرا کی ہینڈ رائٹنگ کافی سنور گئی اور وہ فن کتابت کی باریکیوں سے واقف ہوگئے جوان کے لئے ذریعہ روزگار ثابت ہوا۔

جوں توں کرکے "مملکت نقلستان" نے اپنی نقلی کارگزاری کے پانچ سال مکمل کرلیے۔ ان پانچ سالوں میں وہ تمام نقلی اور مکروہ چہرے جو پہلے سات پردوں میں چھپے تھے، کھلی چھوٹ مل جانے کی وجہ سے سارے کے سارے منظر عام پر آگئے جب انھیں حبس دوام کی سزا دینے کی نوبت آگئی تو انھوں نے تحریری معافی نامے داخل کئے کہ آئندہ سے وہ بااصول و باوقار شہری بن کر رہیں گے۔ یوں بھی حکومت کے پاس ان سارے مکروہ چہروں کی باضابطہ فہرستیں تیار ہو چکی تھیں۔ اور وقت پڑنے پر کسی بھی علت میں ان چہروں کو ناکارہ پرزوں کی طرح سماج سے نکال کر کچرے کے حوالے کیا جاسکتا تھا۔

مسیح انجم

جانا ہمارا اپنے وطن کو اور رول ادا کرنا قاضی کا!

گاؤں میں ہمارے ایک دوست کی بہن کی شادی تھی۔ اور اس شادی میں ہماری شرکت ضروری تھی۔ ویسے، اگر ہم شریک نہ بھی ہوتے تو شادی کے منسوخ یا ملتوی کئے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن ہم نے اس تقریب میں شرکت کرنا اس لیئے ضروری سمجھا کہ شادی کے بعد پردۂ غیب سے ہمارے خیر مقدم کے آثار شائد نمودار ہوں۔ چنانچہ ہم نے عقد مسعود کے موقع پر سلائی ہوئی ٹوئیڈ کی شیروانی زیب تن کی جسے پچھلے بیس سال سے صرف عیدوں کے موقع پر پہنتے اور سینت سینت کر رکھتے چلے آرہے تھے۔ ان ساری سرگرمیوں کو ہماری بیگم بڑی مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ہمارے چہرے پر غضب کی بشاشت رقص کر رہی تھی۔ بالآخر بیگم سے ہمارے چہرے کی بشاشت دیکھی نہ گئی۔ پوچھ بیٹھیں "جس چہرے پر ٹھیکرے برسا کرتے تھے اس پر ملاحت کیوں کھیل رہی ہے؟ اور یہ کہاں کا ارادہ ہے؟"

پہلی بار اپنی بیگم کے منہ سے ملیح کہلائے جانے پر ہم نے جوش میں کہدیا:

"ہم جوش ملیح آبادی ہیں اور اپنے معشوق سے ملنے جارہے ہیں!"

اس جملہ پر، اگر کوئی پڑھی لکھی خاتون ہوتیں تو حضرت جوش مرحوم کی مناسبت سے فوراً اناللہ پڑھتیں۔ لیکن ہماری بیگم تو اردو شاعری اور لٹریچر سے خاصی دور رہی ہیں۔ چنانچہ جب ہم "ملاحت" کی مناسبت سے جوش میں "جوش ملیح آبادی" کہہ دیا تو بیگم نے ہمیں طعنہ دیا "آپ کو دیکھو، اور آپ کا جوش دیکھو! پرسوں ہی دو دانت گرے تھے پرانی دیوار کی اینٹوں کی طرح! اور اب جوش کی بات کر رہے ہیں!"

ہم نے کہا "بیگم تم دانت کو جوش سے کیوں ملاتی ہو؟ دانت کا گرنا ایک الگ بات ہے۔ اور جوش ایک الگ چیز ہے۔ دانت تو پارہ کے استعمال سے بھی جوانی میں گرنے لگتے ہیں!"

بیگم نے حیرت سے کہا "اچھا یہ بات ہے! اب آپ پارہ کا کشتہ بھی استعمال کرنے لگے ہیں؟!"

ہم نے جھنجھلا کر سوٹ کیس سنبھالتے ہوئے کہا "بیگم تم بات کو سمجھتی کیوں نہیں؟ میں نے ایک عام بات کہہ دی تھی جو پارہ سے منسوب ہے۔ اب رہا معشوق کا معاملہ۔ تو جانِ من عرض ہے کہ معشوق سے کے جنس

کی کوئی قید نہیں اور میں جس معشوق سے ملنے جا رہا ہوں، وہ میرا وطن ہے۔"

اچھے شگون سے نکلے تھے، اس لئے وقت پر بس ملی جب ہم بس سے اترے تو ہمارے استقبال کے لئے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ آدم، نہ آدم زاد۔ وہ ایک چھوٹا سا بس اسٹاپ تھا سوچ رکھا تھا کہ کوئی نہیں تو کم از کم ہمارے دوست ربانی صاحب تو ضرور بضرور ہمیں لینے آئیں گے لیکن ہمیں بڑی مایوسی ہوئی ایک تو گرما کا موسم دوسرے مئی کا مہینہ دن کے دس بجے ہی سے سورج سر پر شعلے برسا رہا تھا۔ اس بس اسٹاپ سے ہمارا گاؤں کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اور پیدل چلنا ایک مایہ ناز ادیب کے شایان شان نہ تھا۔ چنانچہ ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تاکہ کہیں کوئی سواری نظر آئے۔ اتفاق کہیئے کہ تھوڑے سے فاصلے پر نیم کے ایک پیڑ کے چھاؤں میں ایک شخص سستاتا نظر آیا۔ اس کے قریب ہی ایک بیل گاڑی لینڈ کی ہوئی تھی اور بیل جگالی کر رہے تھے ہم نے اس شخص کے قریب جا کر "فلم دیوداس" والے دلیپ کمار کے انداز میں پوچھا "اے گاڑی والے! کیا ویکٹور چلو گے؟" آرام میں خلل پاکر موٹی موٹی مونچھوں والے گاڑی بان نے ہمیں قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ ہم اپنی ساری ایکٹنگ بھول گئے۔ تب وہ اپنے لہجہ کو ملائم بناتا ہوا بولا "دورا! (صاحب) یہ گاڑی کرایہ پر چلنے والی گاڑی نہیں۔ یہ تو کچرا منتقل کرنے والی گاڑی ہے!" (حالانکہ کچرے کا استعارہ ہمارے لئے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم، ہم نے اپنے سراپا پر ایک تنقیدی نظر ڈالی) اب سوائے پیدل چلنے کے کوئی اور چارہ نہ تھا لیکن ایک مایہ ناز ادیب پیدل کیسے چل سکتا تھا۔ سواری نہایت ضروری تھی۔ چنانچہ بڑی مشکل سے اسی گاڑی بان کو راضی کیا۔ گاڑی والے نے "شمبالو" کے درخت کی دو، تین لمبی لمبی ٹہنیاں توڑیں۔ اور پھر ان کی مدد سے گاڑی میں دو کمانیں بنائیں۔ اور پھر اپنی پگڑی کو اتار کر ان کمانوں پر ایک چھوٹا سا سائبان بنایا۔ اب ہم شادی میں شرکت کے بہانے، اپنا خیر مقدم کروانے پگڑی کے سائبان تلے، کچرے کی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ اس گاڑی کی حالت اور بیلوں کی چال کو دیکھ کر اے حمید کے ایک انشائیے کا جملہ یاد آگیا "گاڑی کا سب کچھ ہلتا تھا۔ لیکن گاڑی اپنی جگہ سے نہ ہلتی تھی۔" جب تک باگ گاڑی بان کے ہاتھوں میں تنی رہتی بیل اپنی جگہ سے ملنے کا نام تک نہ لیتے تھے۔ اور جیسے ہی وہ باگ ڈھیلی چھوڑ دیتا بیل پلٹ کر بھاگنا شروع کر دیتے۔ بیلوں کا یہ سیاسی کھیل راستہ میں کئی جگہ جاری رہا۔ خیر بڑی مشکل سے گاؤں پہونچے۔ جیسے ہی بیل گاڑی دلہن والوں کے گھر پر پہنچی تو لڑکوں کا ایک شور اٹھا، ایک غلغلہ بلند ہوا "قاضی صاحب آگئے! قاضی صاحب آگئے!"

اس میں بچوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سارا قصور تو ہماری داڑھی کا تھا۔ فسادات میں بھی ایسی ہی صورت حال پیش آتی ہے۔ داڑھی والے کو دیکھنے کے بعد قاتل کو یہ پوچھنے کی زحمت نہیں پڑتی کہ "آپ کا اسم شریف کیا ہے؟" اور اس کا کام اس قدر آسان ہو جاتا ہے کہ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر آپ کا کام تمام کر سکتا ہے ہمارا خیال ہے کہ فسادات میں داڑھی والے کا سڑک سے گزرنا گویا کلین شیو والے کے مقابلے میں زندہ رہنے کے پچاس فیصدی مواقع ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ ہاں! تو بچوں کی آوازوں پر عورتوں نے ادھر ادھر سے جھانکنا شروع کیا۔ کچھ عورتوں نے ہماری شان میں کچھ گستاخانہ ریمارکس بھی پاس کیئے۔ اتنے میں ربانی بھاگے بھاگے مکان سے باہر آئے۔ اور قاضی کے بجائے ہمیں پاکر کچھ مایوس سے ہو گئے۔ پھر انہیں اچانک کچھ یاد آگیا "اچھا ہی ہوا تم ٹھیک وقت پر آگئے۔ دوپہر ہونے کو ہے۔ ابھی تک قاضی صاحب کا پتہ نہیں سارے

مہمان بے چین ہیں۔ شاید تمہیں قاضی بننا پڑے۔ یہاں تو کوئی ایسا آدمی نہیں جو یہ کام انجام دے سکے۔" یہ کہہ کر ربانی نے ہمیں دیوان خانے میں دولہا کے قریب بٹھایا اور خود غڑاپ کے ساتھ مکان میں گھس گئے۔ ادھر ہمارے دل میں تاشے اور دھوڑے بجنے لگے۔ زندگی میں دولہا کا رول تو ادا کر چکے تھے۔ لیکن اب قاضی کا رول ادا کرنے کی بات پر بڑی وحشت سی ہو رہی تھی۔ یوں تو قاضی بننا کوئی معیوب بات نہیں۔ یہ تو بڑا معزز اور منفعت بخش پیشہ ہے۔ دیہات کے قاضی کو تو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ یوں تو ہم نے کئی قاضی دیکھے ہیں۔ بلکہ خود اپنی شادی میں ایک قاضی صاحب کو بھی بھگت چکے ہیں جن کی عرصہ سے تلاش جاری ہے لیکن اب ہم ایک ایسے قاضی صاحب کا ذکر کرنے جارہے ہیں جو ہمارے گاؤں کی ہر شادی میں بعدِ عقد، تناول طعام کے موقع پر یہ کہا کرتے کہ کھٹے کا پرہیز ہے، صرف شوربے سے کھاؤں گا۔ اور پھر شوربے کی آڑ میں ساری بوٹیاں ہضم کرتے۔ دیہات کے رہنے والے یہ بخوبی جانتے ہیں کہ گاؤں میں شادی کے موقع پر بریانی اور "دم کے مرغ" کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ صرف بگھارا کھانا پکایا جاتا اور گوشت کا سالن اور پھر اسکے ساتھ کھٹی دال یا دالچہ ۔ جہاں تک کھٹی دال کا تعلق ہے، وہ بگھارے کھانے کے ساتھ وافر مقدار میں مہیا کی جاتی ہے۔ لیکن گوشت کے سالن پر کڑی نگرانی اور سخت "راشننگ" نافذ کردی جاتی ہے۔ غریب گھرانوں کی شادیوں میں تو مہمانوں کو صرف بوٹی سونگھ سونگھ کر تناول طعام سے فارغ ہونے کی نوبت آتی ہے۔ ایسے موقع پر بعض ہوشیار بزرگ بیماری کے بہانے دال کا پرہیز بتاکر کچھ زائد شوربا حاصل کرلینے میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ گاؤں کی دعوتوں میں بالعموم ہوتا یہ ہے کہ ایک خرانٹ قسم کا آدمی ہر مہمان کی پلیٹ میں چمچے سے گوشت کا سالن ڈالتا چلا جاتا ہے لڑکوں کی پلیٹوں میں تو صرف چچہ جھٹک دیا جاتا ہے۔ اس عمل کو گاؤں والے "سالن اتارنا" کہتے ہیں۔ اس معاملہ میں بڑی دھاندلیاں چلتی ہیں۔ بڑی PARTIALITY برتی جاتی ہے مہمانوں کی صورتیں دیکھ کر دوستی اور حیثیت کے مطابق سالن اتارا جاتا ہے۔ البتہ قاضی صاحب کے سامنے بڑی عقیدت کے ساتھ گوشت کے سالن کا کٹورا رکھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ کٹورا سارے مہمانوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن کس مائی کے لال کی یہ مجال کہ اس کٹورے میں سے ایک بوٹی تو حاصل کرلے!؟ اگر قاضی صاحب کی بڑی نوازش ہوئی تو ان کے آزو بازو یا آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک دو بزرگ مستفید ہوئے۔ ورنہ کٹورے میں کی ساری بوٹیاں قاضی صاحب کے پیٹ میں! ہاں تو ہم جن قاضی صاحب کا ذکر کر رہے تھے، ایک شادی کی دعوت میں ایک ہی دسترخوان پر وہ ہم سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارا بچپن اور ان کا بڑھاپا تھا۔ ان کے سامنے فرائی مٹن سے بھرا کٹورا رکھا ہوا تھا۔ اور ادھر ہماری پلیٹ میں ایک بوٹی "اتاری گئی تھی" جو ہمیں چڑا رہی تھی۔ قاضی صاحب نے بسم اللہ کہہ کر کٹورے میں سے سالن لینے کا ارادہ جو کیا تو اس میں چچہ نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی بسم اللہ ہی غلط ہوگئی۔ فوراً حکم دیا "نعمت خورہ لاؤ!" اب اس نعمت خورہ کی فارسی ترکیب قاضی صاحب جانیں یا آپ جانیں! ہمیں تو اتنی فارسی نہیں آتی۔ ہم وہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اس فارسی ترکیب پر بطور پری کاشن PRECAUTION منتظمین نے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھا۔ ترسیل کا المیہ پیدا ہوگیا تھا! آنکھوں میں کچھ اشارے ہوتے۔ ان اشاروں کی زبان کو سمجھنے تک ادھر کٹورا کبھی کے صاف ہوچکا تھا۔ ایک لائق و فائق منتظم نے بڑی دور کی کوڑی لائی۔ اپنے ماتحت کو

سمجھایا "نعمت خورہ کا مطلب ہے بوٹیوں سے بھرا ہوا کٹورا"۔ فوراً حکم کی تعمیل کی گئی۔ لیکن اس بار بھی قاضی صاحب کا نعمت خورہ کٹورے میں موجود نہیں تھا۔ قاضی صاحبؒ نے پھر حکم صادر فرمایا کہ "نعمت خورہ لاؤ" وہی صاحب پھر بھاگے۔ ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب کی بار منتظم صاحب معہ نعمت خورہ اندر کہیں روپوش ہوجائیں گے۔ لیکن ان کی بھی داد دینی پڑتی کٹورا تو وہ ضرور لائے تھے لیکن چال میں وہ پہلی سی پھرتی نہ تھی اور کٹورہ میں سالن کی مقدار یہ بتارہی تھی کہ اب "نعمت خورہ" قریب الختم ہے۔ جب پانچویں بار بھی قاضی صاحب نے وہی نعمت خورہ کی رٹ لگائی تو ایک منتظم صاحب نے کہا "قاضی صاحب نعمت خورہ تو کبھی کا ختم ہوگیا اب صرف خالی دیگچی باقی رہ گئی ہے۔ حکم ہو تو اسے بھی پیش کردوں" تب قاضی صاحب نے خالص اردو میں فرمایا "کہ اجی حضت! نعمت خورہ کا مطلب ہے مونچھ" کاش کہ پہلے ہی اس کا مطلب پوچھ لیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی!"

خیر! اب آپ نعمت خورہ والے قاضی صاحب کو چھوڑ دیجئے۔ اب ہمارے قاضی بننے کا حال سن لیجئے۔ گیارہ سے بارہ بج گئے۔ لیکن قاضی صاحب کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ادھر مہمانوں کا بھوک سے برا حال ہورہا تھا ہمارے قاضی بننے کے امکانات روشن سے روشن تر ہوتے جارہے تھے۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ قاضی صاحب آگئے ہماری جان میں جان آئی۔ چند آدمی قاضی صاحب کی پیشوائی کے لئے دوڑے انھیں لاکر (بلکہ لادکر) دولھا کے قریب بٹھایا گیا قاضی صاحب نے اپنا بستہ کھولا اور سیاہ نامہ نکالا۔ لیکن جب سیاہ نامہ کی خانہ پری کی نوبت آئی تو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کو اردو نہیں آتی۔ ہم نے کہا "اگر اردو نہ آتی ہو تو تلگو میں خانہ پری کریں" جواب جو ملا اس کا مفہوم یہی تھا کہ تلگو میں بھی ایضاً ایضاً۔ ہم نے کہا "پھر تو انگریزی میں خانہ پری کیجئے۔" انکشاف ہوا کہ انگریزی میں بھی ایضاً ایضاً۔ ان سارے حیرت انگیز انکشافات پر ہم قاضی صاحب کا منہ تکنے لگے۔ تب انہوں نے وضاحت فرمائی کہ اصل قاضی صاحب مستقر کی شادیوں میں مصروف ہیں۔ جب ان کی تشریف آوری کے بارے میں دریافت کیا گیا تو پتہ چلا کہ صاحب موصوف نائب قاضی کی تعریف میں آتے ہیں۔ اور صرف دستخط کرنا جانتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے خواہش کی کہ سیاہ نامہ کی خانہ پری کریں۔ سیاہ نامہ کی خانہ پری کرنا کوئی مشکل کام نہیں سو ہم نے اس کی خانہ پری کردی۔ اور قاضی صاحب نے اپنے دستخط ثبت کیئے۔ اس کے بعد ایجاب و قبول کا مرحلہ درپیش تھا ہمیں اختلاج سا ہونے لگا آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ایجاب و قبول میں اسم عاقد، اسم عاقدہ، بنت، وکالت، مہر معجل یا موجل وغیرہ کچھ اس طرح تسلسل سے لانے پڑتے ہیں جیسے قصیدہ میں تشبیب بعد گریز اس کے بعد مدح، اور پھر اس کے بعد مدعا اور دعا لانا ضروری ہوجاتا ہے۔ ورنہ سارا مطلب و مفہوم ہی غارت ہوجائے۔ بہر حال کچھ ہو، ہم نے جوں توں ایجاب و قبول کروایا۔ ہم نے کیا کہا دولھا نے کیا سنا کس نے کس کو قبول کیا، اللہ ہی جانے! جب اس مرحلہ سے بھی گزر گئے تو خطبہ نکاح کی منزل آئی قاضی صاحب نے بڑا آسان کام یہ کیا کہ زیور طبع سے آراستہ خطبے کی ایک کاپی ہمارے خدمت میں پیش کردی۔ ہم نے سوچا اب بہت ہوگیا۔ چھوٹی انگلی کے اشارے سے، چھوٹی ضرورت کا بہانہ تراش کر فوراً بھاگ نکلنا چاہیئے۔ مگر بھاگتے کدھر سے؟ فرار کے سارے راستے مسدود تھے۔ اس سے آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ ہمیں عربی نہیں آتی ہمیں اتنی عربی تو آتی ہے کہ دیکھ کر پڑھ سکیں اور قبر میں منکر و نکیر کے سوالات کے جوابات دے پائیں۔

لیکن تنہائی میں عقیدت میں ڈوب کر آگے پیچھے ہلتے ہوئے پڑھ لینا ایک الگ بات ہے اور سارے حاضرین کے روبرو بہ بانگِ دہل پڑھنا بڑے دل گردہ کی بات ہے۔

____ آپ اردو میں "موسم" کو "موسم" پڑھ کر یہ جواز پیدا کرسکتے ہیں کہ یہ غلط العوام فصیح ہے اور "سمت" کو سمت" پڑھ کر قائل کرسکتے ہیں کہ یہ غلط العام فصیح ہے، لہذا جائز ہے۔ ____

____ اردو میں شاعروں کی بہتات اسی "غلط العوام فصیح" اور غلط العام فصیح" کی رعایتوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن عربی میں آپ اس طرح کا جواز پیدا کریں تو ہوسکتا ہے کہ خدا معاف کردے، مگر علماء آپ کو بخشیں گے نہیں۔ چنانچہ اسی اندیشہ کے پیشِ نظر ہم نے معذرت چاہتے ہوئے کہا "حاضرین! خدا را آپ ہمارا اس طرح امتحان نہ لیجئے۔ آپ کا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ ہم پکڑے جائیں گے اور علماء کے سامنے ہمارا کورٹ مارشل ہوگا۔ اگر آپ ہمارا امتحان لینا ہی چاہتے ہیں تو اردو میں لیجئے۔ ابھی ادبی اجلاس کنڈکٹ کرکے دکھادیں گے۔ "جناب صدر، جناب صدر" کی مسلسل رٹ لگائے گے۔ خواتین و حضرات کہہ کر دکھادیں گے۔ اگر مصرعہ اٹھانے کے لئے کہا جائے تو (پیٹ میں کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی) وہ بھی کرکے دکھادیں گے۔ حتیٰ کہ شعر کی تقطیع تک کرکے یہ بتلادیں گے کہ کونسا شعر بحر سے خارج ہے اور کس شاعر کو شاعری کے رجسٹر سے خارج کردینا چاہئے" لیکن کسی نے بھی ہمارے عذر کی سماعت نہ فرمائی۔ جب یہ تیر بھی نشانہ پر نہ بیٹھا تو ہم نے ادباً گزارش کی کہ ہمیں کم از کم آدھے گھنٹے کا موقع عطا فرمائیں تاکہ ہجے درست کرکے رواں پڑھنے کی مشق کرلیں۔ ہماری یہ گزارش بھی صدا الصحرا ثابت ہوئی۔ اب ایک آخری حربہ عذرِ شرعی کا باقی رہ گیا تھا۔ چاہا کہ برملا کہہ دیں کہ "طہارت سے نہیں ہوں!" لیکن داڑھی رکھ کر جھوٹ بولنے کے تصور سے کانپ گئے۔ ویسے ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ایجاب و قبول اور خطبہ نکاح کے موقع پر کوئی بھی شخص یہ جاننے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا کہ قاضی صاحب کیا پڑھ رہے ہیں اور نوشہ کو کیا پڑھایا جارہا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کی نظریں تو بادام، مصری، اور کھجور کی پوٹلی تھامے ہوئے شخص پر رہتی ہیں۔ شادی شدہ جوڑوں کو "حجلۂ عروسی" یاد آتا ہے۔ چنانچہ وہ گھر پہنچنے کے بعد پھر سے حجلۂ عروسی کا اہتمام کرلیتے ہیں۔ ہم نے بوڑھوں کو تک محفلِ عقد سے واپس ہوتے ہوئے اپنی بیگمات کے لئے پھول خریدتے اور اپنے ہی مبارک ہاتھوں سے ان کے بالوں میں سجاتے دیکھا۔ یہی نہیں، بعض، بزرگ تو اپنے حجلۂ عروسی کی مہمات اور فتوحات کو کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ کہ اگر ان کی بیگمات سن لیں تو فوراً اپنے شوہروں سے خلع لے لیں!

خیر، جب اتمامِ حجت کے سارے مراحل طے پاچکے تو ہم کھڑے ہوگئے کچھ نوجوانوں نے اپنے سروں پر دستیاں اوڑھ لیں اور کچھ ہپی ہیر کٹ اسٹائل نوجوانوں نے اپنی گردنیں جھکالیں۔ ادھر ہم پر عجیب قسم کی کیفیت طاری تھی۔ دل میں آیا کہ پھوٹ پھوٹ کر رودیں۔ لیکن یہ رونے کا مقام نہیں تھا۔ ہم نے مطبوعہ خطبہ پر ایک نظر ڈالی۔ ایک عجیب طرح کا خوف طاری تھا۔ کہ اگر تلفظ کی غلطی سے ساری دعاؤں کا مطلب غلط ہوجائے تو حشر میں شرمسار ہونا پڑے گا۔ اسی شرمساری کی کیفیت میں ہمارے منہ سے بیساختہ یہ کلمہ نکلا "ربنا!"

چند آوازیں سنائی دیں "آمین!"

ہم نے فوراً گھبرا کر کہا "آمین " کا وقت نہیں آیا!"

جواب میں سنائی دیا آمین!"

ہم نے جھٹ کہا " ارے خدا کے بندو سمجھتے کیوں نہیں!"؟

بہت ساری آوازیں بلند ہوئیں "آمین! ثم آمین"!

ہم نے سوچا کہ اب حاضرین محفل کو سمجھانا گویا آسمان کے تارے توڑلانے کے برابر ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنی ساری قوت، قوت گویائی پر صرف کردی اور اللہ کا نام لے کر جو پڑھنا شروع کیا تو پتہ ہی نہ چلا کہ خطبہ کب ختم ہوا دیکھا تو دولہا میاں قاضی صاحب کے پیٹ میں سر دینے کے لئے بڑے بے قرار نظر آرہے تھے۔ لیکن ادھر قاضی صاحب اپنی فیس، سوا کیلو چاول اور پانچ مٹھی بادام مصری اور کھجور کو اپنے بستے میں باندھنے کی تیاری کررہے تھے۔ میں لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا اور دھکے کھاتا باہر نکل آیا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں نے ان آنسوؤں کو بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے دامن میں جذب کیا اور بڑی دیر تک یہی سوچتا رہا کہ ان آنسوؤں کو کیا نام دوں!؟

غزل

م۔ آصف آرزدی، بہار

دمہ ہو یا ٹی بی کینسر سب کا ہے علاج مگر
اس کی دوا کہاں ملے گی عشق کا جو پے شنٹ ہوا
میرے سب ارمان جلاکر کورٹ سے میرج کرے گا وہ
لخت جگر کی ضد سے گھائل میرا سنٹی منٹ ہوا
آج ہنسیں گی دیکھ کے بیگم چونکہ آج ہی پہلی ہے
اِن کا پہلا ورڈ یہ ہوگا کہنے جی پے منٹ ہوا
بیگم کا اسٹارٹ تھا فیشن لیکن لائٹ آف ہوئی
ڈبہ سوچا اسنو کی ہے فیس پہ کاجل پینٹ ہوا
چور کو اتنا بولڈ کسی نے اس سے پہلے کب دیکھا
لگتا ہے کچھ تھانے سے اب اس کا ایگری منٹ ہوا
میرے دوست کا سر پھاڑا تھا خود ہی اس کی وائف نے
لیکن سرجن سے کب کہتا کیسے ایکسی ڈنٹ ہوا
کل ڈرتا تھا فادر سے میں اب ڈرتا ہوں بچوں سے
آصف ڈرتے رہنا مقدر میرا پرمانٹ ہوا

قطعات

پریشاں حال سارے مرد و زن بچے جواں بوڑھے
مسلماں کچھ بہت ہندو دو اک سردار بیٹھے ہیں
ترے ہی منتظر اے ٹرین اسٹیشن پہ مدت سے
"کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں"

بے وقت صبح سنگل لیٹرن بس ریل ڈبے میں
مسافر سب کے سب اپنا لیے آزار بیٹھے ہیں
وہاں جانے کا موقعہ دیکھئے ملتا ہے کب کس کو
"بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"

غزل

فرید سحر، نرساپور

ان کی قسمت میں تو مل ہے کیا کروں
پاس میرے صرف دل ہے کیا کروں
ایک بونے سے بڑا ہے قد مرا
وہ تو اونچائی میں مل ہے کیا کروں
ختم ہوگئی ایک دن میں میری پے
ان کے میک اپ کا بھی بل ہے کیا کروں
پیار ان سے مجھ کو بیحد ہے مگر
لب پہ ان کے لفظ کل ہے کیا کروں
ان سے وعدہ کرچکا ہوں گولڈ کا
بنک بیلنس اپنا نل ہے کیا کروں
سونچتا ہوں کیوں نہ کرلوں خودکشی
نیند کی بس ایک پل ہے کیا کروں
قرض لینے جانا بھی ہے اب مجھے
فارم وہ بھی کرنا فل ہے کیا کروں
جعلی نوٹوں کا یہ قصہ کب تلک
ملک بھر میں اک تھرل ہے کیا کروں
روز تم سے کیوں سحر وہ لڑتے ہیں
یہ تو ان کی اپنی ول ہے کیا کروں

دل کمبخت تیری شہ اس انجام کو پہنچے
حسینہ سے سر بازار کھاکر مار بیٹھے ہیں
ارے ظالم تو سینے میں اچھلتا کودتا کیا ہے
"تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں"

سریش چوپڑا

انگریزی سے ترجمہ
ڈاکٹر میر گوہر علی خان (حیدرآباد)

"پہلے میں۔ پہلے میں"

اس حادثہ سے میں بیس سال پہلے دوچار ہوا تھا۔ جب میں نیفا (حالیہ اروناچل پردیش) کے ایک پہاڑی اور غیر معروف مقام کا دورہ کر رہا تھا۔ میں بوم ڈی لا (BOMDILA) سے تاوانگ جارہا تھا۔ جو ہمالیہ کی ایک وادی میں واقع ہے۔ تاوانگ کی گھاٹی کو جانے والا راستہ تنگ اور پر خطر ہے۔ اس لئے اس علاقہ کے شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں ایک گیٹ ملتی ہے جہاں سے صرف مقررہ وقتوں پر ہی آنے والی اور جانے والی گاڑیوں کو گزارا جاتا ہے۔ یعنی وقت واحد میں صرف ایک طرف کی گاڑی آ۔یا جا سکتی ہے۔

گر بخش سنگھ میری کار ڈرائیو کر رہے تھے۔ ہمیں گاڑی میں بیٹھے سفر کرتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اچانک ایک پر خطر موڑ آتے ہی ڈرئیور نے اپنی موٹر کو بریک لگادیئے۔ اور اس کے منہ سے ایک موٹی سی گالی نکلی۔ سر اٹھا کر جب میں نے اچھی طرح سے دیکھا تو ادھر سے ایک سرکاری جیپ آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے بانٹ BONNET پر چھوٹی سی رنگین جھنڈی لہرا رہی تھی۔ حالانکہ اس وقت اس تنگ راستے سے گزرنے کا حق ہم ہی کو تھا۔ اب کسی ایک گاڑی کو گزرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ وہ یہ کہ کوئی پہل کر کے اپنی گاڑی کو ریورس میں پیچھے کی جانب لے لے۔ اور ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں راستہ زیادہ وسیع ہو۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہو چلا کہ پہل کون کرے؟

ہمارے گر بخش سنگھ تو انجن کو پوری طرح سے آف کر کے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے بیٹھ گئے تھے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ٹس سے مس ہونے والے نہیں ہیں۔ دوسری طرف سے تیز آواز میں ہارن بجتا ہی رہا۔ جیپ گاڑی کے ڈرائیور کا صبر کا پیمانہ شاید لبریز ہو گیا۔ وہ نیچے اتر پڑے اور گلا پھاڑنے لگے "گاڑی پیچھے کی طرف لے جاؤ۔ جانتے نہیں ڈپٹی کمشنر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں" گر بخش سنگھ نے جھٹ سے جواب دیا۔ "تو کیا ہوا"۔ اس ٹھنڈے سے جواب کی تاب نہ لاکر ڈی۔سی۔ کا ڈرائیور اپنی جیپ کی طرف لوٹ گیا۔ اب کیا تھا ڈی سی۔ خود جیپ سے اتر پڑے اور سڑک کے بیچوں بیچ آکر گر بخش سنگھ کو حکم دیا "پیچھے ہٹ جاؤ۔"

مگر ان کی ڈانٹ کا گر بخش سنگھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ ڈی۔سی۔ اپنی ہتک کب برداشت کرنے والے تھے۔ تقریباً چیخ پڑے۔ "پیچھے ہٹتے ہو کہ نہیں" گر بخش سنگھ نے پنجابی زبان میں الٹا خود ان سے سوال کیا

"آپ ایک رخی راستہ کی پابندی کیوں نہیں کرتے؟"

"میں ڈپٹی کمشنر ہوں۔ تمہیں نہیں معلوم"

"تب تو آپ پر لازم آتا ہے کہ آپ اپنے بنائے ہوئے قاعدے کی ضرور پابندی کریں یہ وقت میری موٹر کے گزرنے کا ہے"

ڈپٹی کمشنر چیں بہ چیں ہوگئے۔ کچھ جواب بن نہ پڑا سبے نیل ومرام جیپ کی طرف لوٹ گئے۔ پورا ایک گھنٹہ یوں ہی گزر گیا۔ کسی نے بھی اپنی گاڑی پیچھے لینے کی کوشش نہیں کی۔ گر بخش سنگھ شاید موٹر کے اندر بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے۔ تازہ ہوا کھانے باہر نکلے۔اور ایک چٹان پر جا بیٹھے۔ایک بے جان بت کی طرح۔اس عرصہ میں کئی گاڑیاں ان دونوں موٹروں کے پیچھے اکٹھی ہو گئیں۔اور ہارن کی بے ہنگم آوازوں سے فضاء میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔سب گاڑی والوں نے گر بخش سنگھ سے بہت منت کی کہ وہ اپنی گاڑی کو پیچھے ہٹالیں۔مگر بے سود۔ڈپٹی کمشنر نے جو بار بار اپنی گھڑی پر نظریں دوڑا رہے تھے بلند آواز میں کہا۔

"اگر تم اس وقت گرداسپور میں ہوتے تو تمہیں اچھا سبق سکھا دیا ہوتا" یہ جملہ جوں ہی گر بخش کے کان کے پردوں کو ٹکرایا۔ان میں ایک ہل چل سی پیدا ہوئی۔اپنا سر جھٹکا اور پوچھا۔

کیا کہا؟ گرداسپور۔کیا تم وہاں کے رہنے والے ہو؟

ان دو جادوئی جملوں نے چمتکار دکھایا۔وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو بہت غور سے دیکھتے رہے۔

"کیا تم بنتا سنگھ کے لڑکے تو نہیں ہو؟ جو فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ پھر ترقی کرتے کرتے ایک بڑا افسر بن گیا" گر بخش نے پوچھا۔

ڈپٹی کمشنر کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر شفق سی کھل اٹھی

"تم ضرور گر بخش۔پریم سنگھ کے بیٹے ہو۔ہم دونوں کے والدین بڑے اچھے دوست تھے"۔

ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر یہ دونوں بغل گیر ہوگئے۔بڑی مدت کے بعد بچھڑے ہوئے ان دوستوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔مگر ان دوستوں نے مل جانے کے بعد بھی بحث جاری رکھی۔پر بدلے ہوئے انداز میں۔گر بخش نے خوشی سے پکارا۔

"اے بنتا سنگھ کے پتر اب میری گڈی پہلے پیچھے ہٹے گی"

ادھر ڈپٹی کمشنر نے آنکھ ماری۔"اوئے گر بخش پہلے میں اپنی جیپ Reverse کئے لیتا ہوں"

نہیں۔نہیں پہلے میں

"نہیں پہلے میں"

اطراف جمع ہوئے ڈرائیور اور سارے لوگ اس ڈرامہ کے دلچسپ اختتام پر خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔

مضطر مجاز

تعارف

شجاع الدین عاطف

میر کے شعر کے لیے ایک غلط بات بہت مشہور ہو گئی ہے کہ وہ پست ہو تو بہت پست ہوتا ہے اور بلند ہو تو بہ غایت بلند۔ اتفاق سے یہی بات مزاح نگاری پر بھی منطبق ہوتی ہے کہ اس صنف میں بھی کوئی درمیانی درجے کی تخلیق نہیں ہوتی۔ یا تو وہ بہت پست، رکیک اور سوقیانہ ہے یا بہ غایت بلند۔ شجاع عاطف کے زیر نظر مجموعے کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بہ غایت بلند درجے کا مزاح ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ یہ رکیک اور سوقیانہ بھی نہیں۔ عاطف کا مزاج طنز سے زیادہ مزاح کی طرف مائل ہے۔ وہ اپنے اٹھ، نو بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ اس لیے شاید انہیں وہ کٹھنائیاں جھیلنی نہیں پڑیں جو عام طور پر خاندان کے بڑے لڑکوں کا مقدر ہوتا ہے۔ عاطف حیدرآباد کے شہرہ آفاق ڈرامہ نگار مخمور قمر یداللہی کے سب سے چھوٹے فرزند ہیں۔ علم اور ادب کا شوق انہیں اپنے گھرانے سے ورثے میں ملا۔ ان کے ایک بھائی موسیٰ کاظم اردو کے ادیب اور شعبہ تدریس سے وابستہ رہے اور اردو اورینٹل کالج کے پرنسپال کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ محمود مہدی بڑے کثیر المطالعہ اور دانشور آدمی ہیں جو شاید اپنی ملازمت کی جھنجھٹوں کے سبب لکھنے کے لیے وقت نکال نہ سکے ایک اور بھائی ممتاز مہدی حیدرآباد کے جانے پہچانے مزاح نگار ہیں۔ عاطف کا وقت زیادہ تر بہ ضمن ملازمت، حیدرآباد بلکہ وطن سے باہر سعودی عرب وغیرہ میں گذرا ہے۔ پچھلے ۹۔۷ سال سے وہ آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔ ان کو بڑی حد تک معاشی فراغت حاصل ہے شاید یہی سبب ہے کہ ان کے مزاح میں طنز کی تلخی کا عنصر بہت کم محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ بڑی حد تک غزل ہی کے فارم کو انہوں نے اپنایا ہے لیکن ان کا مزاح قافیے کا مرہون منت نہیں۔ ان کی نظر زندگی کی بے ڈھنگیوں اور بوالعجبیوں پر ہے یہ بڑی تیز اور تہہ رس ہے۔ تحریف (پیروڈی) ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید انہوں نے اسے یونہی خوش طبعی کے طور پر شروع کیا اور رفتہ رفتہ یہی ٹھرا ہے آخر فن ہمارا ہو گیا" عاطف نہایت فطری شاعر ہیں۔ وہ اتنے ہی شعر کہتے ہیں جتنے ان سے خود بہ خود ہو جاتے ہیں وہ اپنی طبیعت پر زور ڈال کر زبردستی کی شاعری نہیں کرتے۔ غزل کی زمین کے تمام قافیوں کو سامنے رکھ کر وہ ان کے امکانات کو چکانے کی کوشش نہیں کرتے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی غزل میں کہیں دو تین شعر ہی ملتے ہیں یا تو پھر یہ ہوا ہے کہ انہوں نے کم درجے کے اشعار کو رد کر دیا ہے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا ہے تو بہت اچھا کام کیا ہے غالب کی

منت ہے۔ جس پر ہمارے بیش تر شعراء کبھی عمل نہیں کرتے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ان کا مزاح ردیف اور قافیہ کا مرہون منت نہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

میرؔ و غالبؔ ، ٹیپوؔ ، ظفرؔ کو کوئی نہیں پہچانتا اب
شاہ رخ ، گوبندا کو مگر ہر بچہ ہمارا جانے ہے

برابر میں مری بیگم بھی ہیں بیٹھی ہوئی دیکھو
کرو مجھ سے نہ نظروں سے خطاب آہستہ آہستہ

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے میڈیسن بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا کھانا اگر ایک بار ہوتا

دیکھ کر مجھ کو ڈرامے میں کسی نے یہ کہا
اس اداکار سے بندر کا کمال اچھا ہے

تمہارے گھر کا یہ دستر بڑا شہانہ لگے
میں ایک چمچہ چرا لوں اگر برا نہ لگے

کیسے ہنسی چھپاؤں تجھے دیکھنے کے بعد
سرکس کو کیوں میں جاؤں تجھے دیکھنے کے بعد

ایسی اور بہت سی مثالیں ہیں اگر آپ ذرا رک کر ان پر غور کریں تو آپ پر کھل جائے گا کہ ان اشعار میں مزاح نہ ردیف سے پیدا ہوا ہے نہ قافیے سے بلکہ ان خط کشیدہ الفاظ کی وجہ سے ہوا ہے جس سے شاعر کی فطری شوخی اور شرارت کا اظہار ہوتا ہے پہلے شعر میں مشہور فلم ایکٹروں کے ناموں سے جوٹی۔وی کے فیضان سے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئے ہیں دوسرے شعر میں ایک ملی جلی محفل کا پس منظر ہے جس میں "بیوی کا ساتھ" ہونا باعث افزائش مزاح ہو گیا ہے اور ساری رومانویت کا ناس کر رہا ہے۔تیسرے شعر میں میڈیسن" وجہ مزاح ہے جس کی وجہ سے نت نئی بیماریوں کا اظہار ہو رہا ہے چوتھے شعر میں قافیے "کمال" سے نہیں بلکہ "بندر" سے مزاح پیدا ہو رہا ہے۔پانچویں شعر میں عیش و تنعم کی زندگی گذارنے والوں پر "چمچہ چرانے" سے لطیف طنز کیا ہے۔چھٹے شعر میں بھی لفظ "سرکس" مزاح کا باعث ہے جو کہ ردیف ہے نہ قافیہ۔وقس علی ہذا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عاطفؔ کا فن استادانہ نہیں بلکہ نہایت فطری اور سادہ دلانہ ہے۔

فن تحریف میں انہوں نے بڑا کمال پیدا کیا ہے ان کی تحریفوں پر بھی اگر آپ ذرا سی چشم تامل ڈالیں تو دیکھیں گے کہ اکثر و بیش تر صرف ایک لفظ کو بدل کر مزاح پیدا کر دیا ہے۔باقی پورا کا پورا شعر ثابت و سالم ہے۔لیکن آپ متبسم

ہوئے بغیر رہ نہیں سکتے۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ ذائقہ کیا ہے

ان کے میک اپ نے خدا جانے کیا، کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عاطف کے مزاح کی ایک اور اہم خصوصیت اس کا ٹھہراؤ اور شائستگی ہے۔ اس میں قہقہہ اور وزی اور پھکڑ پن نہیں۔ بجز ایک دو جگہ کے سنہ کہیں رکاکت اور سوقیانہ پن ہے۔ سچ پوچھیے تو مزاح نگار کا یہیں بڑا امتحان ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عاطف کو مشاعرے لوٹنے کا شوق نہیں چرایا ہے۔ صرف ان کی حس مزاح کی ودیعت ہے جو انہیں مزاح لکھنے پر مجبور کرتی ہے آپ اس پوری کتاب کو پڑھتے ہوئے مسلسل تبسم ریز رہتے ہیں۔ یہ مزاح ایک مہذب معاشرے کے فرد کا مزاح ہے اور مہذب انسانوں ہی کے لیے ہے کہتے ہیں کہ مزاح کا سب سے بلند مقام وہ مقام ہے جہاں آدمی اپنے آپ پر ہنسنے اور ہنسانے سے نہیں چوکتا۔ اپنی ذات کی کیموں اور بوالعجبیوں پر بہت کم ہی کسی کی نظر جاتی ہے۔ اس کے لیے نہ صرف اعلیٰ ظرفی بلکہ خود بینی بھی درکار ہے ورنہ عام طور پر لوگ سارے جہاں کا جائزہ تو بہ آسانی لے لیتے ہیں لیکن اپنے جہاں اور اپنے آپ سے بے خبر رہتے ہیں۔

چاہتے ہو خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

صرف غالبؔ ہی کہہ سکتا تھا۔ عاطفؔ بھی اس معاملے میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں وہ اپنی شخصیت اور ذات کے سارے بے ڈھنگے پہلوؤں اور بوالعجبیوں سے بھی خوب واقف ہیں اور انہیں بھی ہدف تنقید بنانے سے نہیں چوکتے کہیں اپنی بڑھتی ہوئی توند کا ذکر کرتے ہیں تو کہیں اپنے گنجے پن پر سے پردہ اٹھاتے ہیں کہیں غیر ملکی معاشرے میں خود کو Misfit محسوس کرتے ہیں اور ایسی ہی کئی کمیاں وہ بہ بانگ دہل بیان کرتے ہوئے ہچکچاتے نہیں ہیں۔ یہ ان کی بلند نگاہی ہے۔

یوں تماشہ بن گیا کوئی
سر سے وگ کو اڑا گیا کوئی

لوگوں کا مجھے دیکھ کے یہ کہنا عاطف
چلتا ہے مری توند کا مٹکا مرے آگے

جب میرے راستے میں حجامت کدہ پڑا
بس اپنے گنجے سر کی طرف دیکھنا پڑا

چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

خود پہ بھی ہنس لیا کرتے ہیں یہاں ہم اکثر
خود پہ ہنسنے میں بھی قدرت نے مزہ رکھا ہے

ایسا بھی نہیں کہ عاطف کا مزاح محض خالص مزاح ہے۔ ایک بیدار مغز فنکار کی طرح اپنے اطراف کی سیاسی اور سماجی ناہمواریوں پر بھی ان کی نظر ہے۔ یہ بات اور ہے کہ یہ پہلو ان کے یہاں کم کم ہے مگر ہے ضرور۔ تاریخی شعور کا پرتو بھی جہاں تہاں نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے۔

ٹوٹ جاتی ہے کمر، پھول ہی جاتی ہے سانس
مغلیہ دور کے بابر سے ظفر ہونے تک

سیاست میں نہیں ہے فرق ملنے اور بچھڑنے کا
اسی جتھے سے کولیشن بناؤ جس سے ہم نکلے

سنا تھا جیل جاکر مضمحل ہوجاتے ہیں قیدی
وہاں سے بھی مگر لیڈر ہمارے تازہ دم نکلے

یہ بات بڑی انوکھی اور حوصلہ افزاء ہے کہ حیدرآباد اور "زندہ دلان حیدرآباد" سے دور رہ کر بھی ایک شاعر پر لطف مزاح کے پھول کھلا رہا ہے زیر نظر مجموعہ اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ جسے شروع سے آخر تک آپ پڑھتے ہوئے تبسم ریز ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

انتخاب کلام شجاع الدین عاطفؔ

قطعات

بہت زندہ دل ہیں یہ سڈنی کے شہری
یہاں پہ محبت کا ہر سو عمل ہے
مگر کم ملیں گے یہاں لوگ میریڈ
کہ اک گلی میں ڈی فیکٹو کپل ہے

☆☆☆☆

دیکھا کرتے تھے جنہیں پبلک سے کتراتے ہوئے
آج دیکھا ہے انہیں محفل کو گرماتے ہوئے
وہ جو کالج میں نظر آتے تھے اتراتے ہوئے
آج دیکھا ہے انہیں منے کو بہلاتے ہوئے

غزل

بنت لیلیٰ ہوا کرے کوئی
درد دل دے دیا کرے کوئی
گرتے جاتے ہیں سر سے بال میرے
میرے سر کی دوا کرے کوئی
گر حسینوں کے میلے میں یوں ہی
کھوگیا دل تو کیا کرے کوئی
گھر کا بل ، بنک کا قرض ، انکم ٹیکس
کیسے پیسہ جمع کرے کوئی
جی حضوری میں جو ہوا ناکام
ایسے شوہر کا کیا کرے کوئی
کاش انٹرویو میں ہم سے کل
کچھ نہ پوچھے خدا کرے کوئی
بینک ہی جب کہ لٹ گئی عاطفؔ
کیسے تنخواہ ادا کرے کوئی

پیروڈی

کیسے ہنسی چھپاؤں تجھے دیکھنے کے
سرکس کو کیوں میں جاؤں تجھے دیکھنے کے
ملتے ہی تجھ سے یاد مجھے آئے تیرا فر
کیسے نظر بچاؤں تجھے دیکھنے کے
اس دوستی نے تیری کسی کا نہیں ر
کس سے نظر ملاؤں تجھے دیکھنے کے
آفس تو ہے ، میں ہوں ، سبھی لوگ جاچکے
کیسے میں گھر کو جاؤں تجھے دیکھنے کے بعد
عاطفؔ کے گنجے سر کو جو دیکھا تو بول اٹھیں
زلفیں میں کیا سجاؤں تجھے دیکھنے کے بعد

(۲)

زلفیں یہ مری صرف دکھانے کے لیے ہیں
کچھ بال خضابوں سے چھپانے کے لیے ہیں
جو ساتھ لئے پھرتے ہیں بازار میں حوریں
وہ لوگ مرے دل کو جلانے کے لیے ہیں
یہ چھوڑ کے جاتے ہیں برے وقت میں مجھ کو
احباب مرے جوتے کھلانے کے لیے ہیں
ہر حال میں ہنس بول کے جی لیتے ہیں انسان
ہم لوگ تو ہنسنے یا ہنسانے کے لیے ہیں
معصوم سی باتوں پہ کسی کی نہ جا عاطفؔ
یہ ظاہری انداز پھنسانے کے لیے ہیں

ڈاکٹر علی عباس امید
96/46 جلسی نگر، بھوپال

اسمائل پلیز

(پروفیسر ضمیر الدین کے مجموعہ پر تاثر)

ندہ پرور سلام لے لیجیے   اور پھر احترام دے دیجیے
آپ نے جو کتاب بخشی تھی   پڑھ چکا وہ صحیفہ ارضی
نام اس کا ہے "مسکرائیں حضور"   کیا لکھوں ہنسنے پہ میں ہوں مجبور
پیرہن تو ہے اس کا انگریزی   نکہت اردو سے مگر ہے بسی
پڑھ کے میں اس کتاب کو بہ خدا   ہوگیا ہوں شگفتہ پھولوں سا
حضرت خر ہوں یا کہ شوہر ہو   جگہ دی ہے کتاب میں سب کو
لئے ہے آپ کی جو بحث ہوئی   شک نہیں وہ بھی یادگاری تھی
شاعروں کو تو بخش ہی دیتے   یہ بچارے سدا سے ابتر تھے
ہیں کلرکوں کا ذکر ہے مرغوب   رہے خوشونت وہ تو ہیں مجذوب
A کی جیب اور B کا شغل مٹے   یہ شب و روز کی حقیقت ہے
جو مصائب ہیں جو مسائل ہیں   آپ کے وار سے وہ گھائل ہیں
آپ ہی کہئے میں لکھوں کیا کیا   کھل رہا ہے غضب کا گلدستہ
نقشے مہرباں مسلسل ہیں   بیوی کہنے لگی ہے پاگل ہیں
فن کی خوبی ہے یہ ضمیر الدین   پڑھ کے ہنسنے لگیں سبھی غمگین

ایک صاحب شفیق اور رحمن
جن کا مسکن تھا ملک پاکستان

لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے   سارے ذی ہوش ان کو پڑھتے تھے
کوئی ثانی نہ تھا کوئی ہمسر   سارے جگنو تھے اور وہ اختر
طرز تحریر اور موضوع سب   ان کے حصہ میں تھا بہ فضل رب
چوں کہ ان کا مقام خالی ہے   اس لیے آج خستہ حالی ہے
میں نہیں ہوں یہ کہہ کے شرمندہ   آپ نے کردیا انہیں زندہ
شکریہ پہلے پھر مبارک باد   آپ کو یہ فقیر بھی ہے یاد
میں کہ ادنیٰ سا ایک قاری ہوں   ملتے سب ہیں ان پہ بھاری ہوں
اس لیے مستند ہے رائے مری   کہئے کیسی رہی یہ خوش خبری
آپ نیچر ہیں یہ تو تھا معلوم   ہاں مگر علم تھا بہت موہوم
اس صحیفہ نے راز کھولا ہے   آپ کے سر میں کوئی سودا ہے

کاش جوش جنوں ہو اور شدید
پھر پڑھے اور کچھ نیا امید

شعرائے کرام سے گزارش

میں اقبال سے موجودہ دور تک کے مشہور و معروف شعراء کے کلام کا ایک انتخاب مرتب کر کے کتابی صورت میں لے منظر عام پر لانے کا متمنی ہوں۔ اس انتخاب کی خصوصیت یہ ہوگی کہ شعراء کا کلام اس میں شامل ہوگا وہ خود ان کی ہینڈ رائٹنگ میں ہوگا۔ لہٰذا میں اپنے عہد کے شعراء و شاعرات سے ملتمس ہوں کہ وہ اپنی دو تخلیقات مختصر تعارف اور تصویر کے ساتھ مجھے بھجوانے کی زحمت کریں۔ کلام اور سوانحی اشارے سیاہ روشنائی سے فل اسکیپ سائز کے پیپر پر لکھنے کی زحمت کریں۔ علاوہ ازیں مرحوم شعراء و شاعرات کا کلام خود ان کی ہینڈ رائٹنگ میں جن حضرات کے پاس محفوظ ہو وہ اس کی فوٹو کاپی ارسال کرنے کی زحمت فرمائیں۔ ایسے ترجمہ افراد کا بہ شکریہ کے ساتھ کتاب میں شائع کیا جائے گا۔

اس کام میں اردو کی کئی معتبر شخصیتیں میری مدد کر رہی ہیں۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ یہ مثالی انتخاب ہوگا۔

آپ کی نوازشات کا متمنی

نسیم دہلوی

مکان نمبر ۳۰۰۰ گلی بوچی مسجد، کوچہ مسجد ترکمان گیٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

حیدرآباد

جلد: ۲۲ شمارہ: ۶ جون: ۱۹۹۹ء

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

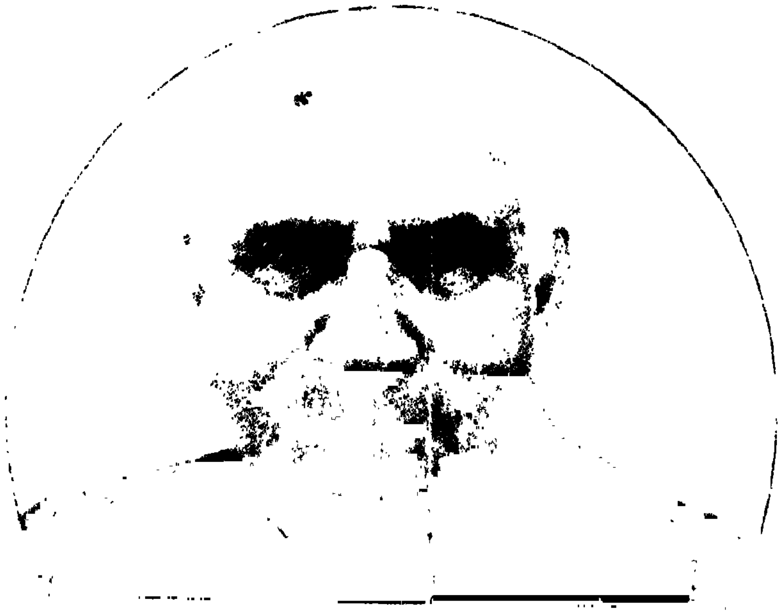
فی پرچہ ۱۲ روپے زر سالانہ: ۱۴۰ روپے بیرونی ممالک [illegible] ۳۰

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

[illegible] حیدرآباد [illegible] 474571 [illegible]

[illegible]

ضمیر جعفری تصویروں میں





حیدرآباد میں منعقدہ ورلڈ ہیومر کانفرنس کے موقع پر ضمیر جعفری کی گلپوشی، مجتبیٰ حسین، ظ انصاری، عطاالحق قاسمی، دلیپ سنگھ، اور فکر تونسوی دیکھے جاسکتے ہیں



زندہ دلان شکاگو کے زیر اہتمام ضمیر جعفری کے اعزاز میں منعقدہ محفل
دائیں سے بائیں: غوثیہ سلطانہ، عطرت حسین، ضمیر جعفری، ڈاکٹر عابد اللہ غازی

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

سگِ لیلیٰ (چوتھی قسط۔4)

پرویز یداللہ مہدی
(ممبئی)

دیدارِ سگِ یار

محبوبہ دلنواز کے دولت خانے میں کتے کی موجودگی کے شک پر یقین کی مہر کیا ثبت ہوئی ہمیں یوں چپ لگ گئی جیسے ہمارے تمام اعضائے صوت و صدا پر مہر سکوت لگ گئی ہو۔ تب بعد ازاں اس نامعقول احساس کی گرمی نے پگھلادیا کہ یہ صرف سنی سنائی بات ہے۔ اور کسی فلسفی نے فرمایا ہے کہ جب تک آنکھوں سے نہ دیکھ لو کسی بات کا یقین نہ کرو۔۔ کاش مذکورہ فلسفی ہمیں کہیں مل جاتے ہم انہیں ہی اس خطرناک مہم پر روانہ کردیتے لیکن متذکرہ صدر فلسفی چونکہ نایافت اور ہم دریافت ہوچکے تھے اس لیے اپنے دریافت ہونے کی پاداش میں ازسر نو اس مہم پر نکلنا پڑا البتہ اس مرتبہ ہم کیل کانٹے سے کسی قدر لیس تھے یعنی ایک عدد دوربین ایک دوست سے مستعار لے لی کیونکہ اس بار خاصی دور سے نزدیک کا نظارہ کرنا چاہتے تھے یعنی "خطرے" کی زد میں آئے بغیر خطرے کا بھرپور جائزہ لینا چاہتے تھے۔!

محبوبہ کے دولت کدے کا بیرونی جغرافیہ پوری طرح ذہن میں تھا نیلے بنگلے کے روبرو ایک پیلا بنگلہ تھا جس میں بلدیہ کا وارڈ آفس تھا اس کی چھت پر سے محبوبہ کے گھر کے اندرونی کوائف کا نہ سہی لان اور پورٹیکو، کا صاف نظارہ کیا جاسکتا تھا اور یہی وہ "مقامات آہ و فغاں" تھے جہاں سگ محبوب، کے پائے جانے کے زیادہ امکانات تھے۔ مذکورہ دفتر میں داخلے کو اصلی رنگ دینے کے لیے اپنے گھر کے نل کے بارے میں دو ایک فرضی شکایتی عرضیاں، ساتھ لے لی تھیں۔ دفتر کی عمارت پانچ منزلہ تھی، اور ہم نے پانچوں منزلیں بخیر و خوبی سر کرلیں، نہ تو کسی نے ہمیں ٹوکا نہ روکا، دفتر کا سارا عملہ اپنے گرد و پیش سے کچھ یوں بے تعلق اور بے نیاز نظر آرہا تھا جیسے ہر شخص حقیقی اور مجازی دونوں منازل سے گزر چکا ہو، ہم نے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور دفتر کی چھت پر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے ہماری منزل صاف نظر آرہی تھی، اسے مزید صاف بلکہ شفاف شکل میں دیکھنے کے لیے ہم نے جھولے میں سے دوربین، نکالی اور آنکھوں سے لگالی۔ دوربین کے آنکھوں سے لگتے ہی یوں لگا جیسے محبوبہ دلنواز کے دولت کدے کا ہرا بھرا لان کھنچ کر ہماری دسترس میں آگیا ہو، گویا ہاتھ بڑھا کر مخملی گھاس کو چھوسکتے تھے لیکن چھونے کی حماقت اس لیے نہیں کی کہ دور کے اس جلوے، کو دوربین

نے " دوردرشن " کی طرح قریب کردیا تھا مخملی سبزے نے آنکھوں میں ٹھنڈک اور طراوٹ کی لہر سی دوڑادی ، لیکن یہ لہر اگلے ہی پل خوف کی لہر میں تبدیل ہوگئی کیونکہ دوربین کے دائرہ کار میں اچانک ایک لمبی سی لپلپاتی لٹکتی رال ٹپکاتی زبان داخل ہوئی ، پھر خوفناک جبڑا پھر بھیانک تھوتھنی اور کان کے کلوزاپ ، دکھائی دیئے پھر سگ محبوب کا شیر جیسا پورا سراپا ۔ دوربین کے نزدیکی " فوکس " میں کتے کے اعضائے رئیسہ و غریبہ کے آتے ہی ظاہر ہے ہمارے اعضائے رئیسہ و غریبہ شل ہوگئے ہوں گے ۔ یوں لگا جیسے سانسوں کا زیروبم ، آئیٹم بم کی زد میں آگیا ۔ اب سے پہلے یوں تو کئی کتے ہمارا بہت کچھ خطا ، کر چکے تھے لیکن زیر نظر بلکہ " زیر دوربین " کتا جو کہ کچھ زیادہ ہی کتا تھا ہمیں حرف غلط " کی طرح " لوح دنیا ! سے مٹا چکا ہوتا اگر اس " آہنی کھمبے " نے ہمیں تھام نہ لیا ہوتا جو مذکورہ عمارت کے ان گوشوں ، کے معبر ہوا کے اخراج میں مدد دیتا تھا جنہیں کارکنان دفتر ہذا رفع ۔ حاجت ، کے بہانے دیگر ضروری امور جیسے تخلیق شعروادب امریکن سٹے اور انڈین مٹکے ، کے اعداد و شمار کی مفصل اسٹڈی " کی غرض سے استعمال کیا کرتے تھے ۔!

ہم کھمبے سے لٹکے لٹکے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے یہی سوچتے رہے کہ خدانخواستہ ہمارے اور ہماری متوقع حادثاتی موت " کے بیچ مسیحا کی طرح یہ آہنی کھمبا نہ آیا ہوتا تو ہماری لاش نیچے سڑک پر ، جدید شاعر محمد علوی کے اس شعر کی عملی تصویر کی صورت پڑی ہوتی

پانچویں منزل سے کودا چاہیئے

خودکشی کے واسطے کیا چاہیئے

کھمبا چونکہ کھمبا تھا ، کمبل نہیں ، وہی کمبل جسے آپ چھوڑنا بھی چاہیں تو وہ آپ کو چھوڑتا نہیں ، اس سے پہلے کہ کھمبا ہم سے اور ہم کھمبے سے جدا ہوکر مذکورہ شعر کے حوالے سے سچ مچ تشریح کلام محمد علوی کر جاتے کہ دفتر ہذا کے کچھ کارکنان جن کا تعلق دفتر کے درجہ ۔ چہارم کے عملے سے تھا وہاں آدھمکے ، پتہ نہیں کس طرح انہیں ہماری موجودگی کا علم ہوگیا تھا ، بہرحال عین وقت پر مذکورہ کارکنان وفد کی شکل میں موقع ۔ واردات پر پہنچ گئے اور ہمیں اپنے ہاتھوں کیچ آؤٹ " CATCH - OUT کرلیا ہم نے کوئی مزاحمت اس لیے نہیں کی کہ پانچ منزل سے گرکر مستقلاً کلین بولڈ ، CLEAN- BOWLED ہونے سے وقتی طور پر کیچ آؤٹ ہونے ہی میں ہماری خیر تھی ۔!

جس وقت یہ وفد ، ہماری مشکیں کس کر جلوس کی شکل میں ، وہاں سے کھینچتے ہوئے لے جانے لگا تو ہم نے ایک بار پھر باحسرت و یاس در محبوب کی طرف دیکھا اور دل کی بات زبان پر لانے کی کوشش کی لیکن نہ آسکی ، اور اگر آتی تو یقیناً اس شعر میں ڈھل کر آتی ۔

تماشا دیدنی ہے دیکھ تو بھی " لان " پہ آکے

شہید ناز کی احباب میت لے کے جاتے ہیں ۔!!

دفتر ہذا کے درجہ ۔ چہارم سے تعلق رکھنے والے جن کارکنان نے ہمیں چھت پر کیچ آؤٹ ، کیا تھا ، وہ یقیناً ۔ دن یہ آوارہ پھرنے والے جانوروں کو پکڑنے کی خدمات انجام دیا کرتے تھے ، لہذا ہم لاکھ کوشش کے

باوجود، ان کی مضبوط گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکے، وہ ہمیں گھسیٹتے ہوئے دفتر ہذا کے ارباب مجاز کے اجلاس تک لے گئے اور مال غنیمت کی پوٹلی کی طرح ہمیں ان کی پیشی میں اس معروضہ کیساتھ پیش کردیا "سرکار یہ نوجوان چوری چھپے دفتر کی چھت پر پہنچ کر وہاں سے کسی پرانی فائیل کی طرح داخل دفتر ہونے کی کوشش کررہا تھا کہ ہم نے اسے بروقت گرفتار کرکے دفتر کی نیک نامی کو بٹہ لگنے سے بچالیا۔!" اجلاس میں موجود ارباب مجاز کے جھمگٹے میں سے ایک "ارباب مجاز" نے جو جثے کے اعتبار سے دفتر ہذا کا مجازی خدا معلوم ہوتا تھا ستائشی نظروں سے اپنے عملے کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں ہم پر مرکوز ہوگئیں اب اس کی نظروں میں ستائش کی جگہ طنز اور تشویش کے رنگ تھے، اس نے تمسخرانہ لہجے میں سوال کیا۔ "کیا تم شادی شدہ ہو نوجوان۔؟"

ہم نے فوراً انکار میں گردن ہلائی جواب میں اس نے تعجب آمیز لہجے میں پوچھا "تو پھر خودکشی کی کوشش کیوں کررہے تھے۔؟"

قبل اس کے کہ ہم جواب میں کچھ منھ سے پھوٹتے دوسرے ارباب مجاز نے جو پہلے ارباب مجاز سے ذرا چھوٹے گریڈ کا ارباب مجاز معلوم ہوتا تھا مودب لہجے میں بولا۔ "سر! شادی شدہ آدمی تو پہلے ہی "خودکشی شدہ" ہوتا ہے اسے دوبارہ خودکشی کرنے کی کیا ضرورت، یہ نوجوان یقیناً کنوارا اور غیر شادی شدہ ہے۔!"

چھوٹے ارباب مجاز کی اس بے تکی دلیل پر بڑے ارباب مجاز نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا پھر ہم سے مخاطب ہوئے۔ "نوجوان تمہارے اناڑی پن سے معلوم ہوتا ہے کہ خودکشی کی یہ تمہاری پہلی کوشش ہے!" اس بار بھی ہمارے جواب دینے سے پہلے چھوٹا ارباب مجاز بیچ میں کود پڑا، بولا۔ "سر یہ اناڑی وناڑی نہیں، کھلاڑی ہے پکا کھلاڑی ـــ شاید آپ نے غور نہیں فرمایا اس نوجوان نے خودکشی کے لیے جگہ کا انتخاب تو بالکل صحیح کیا بس ذرا طریقہ۔ کار کے معاملے میں چوک گیا۔!"

"کیا مطلب ـــ!" بڑے ارباب مجاز نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ سر کہ بلدیہ کی اس عمارت سے کودنے کی بجائے اگر یہ نوجوان کسی کاروبار، دھندے کے لیے لائسنس کی درخواست اپلائی کرتا تو اس کی خودکشی آسان بھی ہوجاتی اور یہ قانون کی زد میں بھی نہیں آتا، یعنی ہنگ لگتی نہ پھٹکری اور رنگ بھی آتا چوکھا ـــ" چھوٹے ارباب مجاز کے اس "ڈپارٹمنٹل" طنز پر بڑے ارباب مجاز کیساتھ دیگر ارباب مجاز نے بھی ہنس کر داد دی پھر بڑے ارباب مجاز نے ہم سے طنزیہ لہجے میں پوچھا "کیوں نوجوان لائسنس چاہیئے تمہیں۔؟"

بڑے ارباب مجاز کے اس طنزیہ فقرے پر اجلاس میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ لائسنس کے ذکر پر ہمیں وہ فرضی "شکایتی عرضیاں" یاد آئیں جو ہمارے گھر کے نل، سے متعلق تھیں، اور جیب میں حفظ ماتقدم کے طور پر موجود تھیں ـــ ہم نے فوراً وہ شکایتی عرضیاں بڑے ارباب مجاز کی خدمت میں پیش کرکے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا ـــ "حضور مائی باپ، نہ تو مجھے بذریعہ۔ لائسنس خودکشی کرنا ہے اور نہ ہی میں نے آپ کے دفتر کا انتخاب اس خطرناک ارادے سے کیا تھا، بلکہ میری یہاں آمد کی غرض و غایت کا مقصد، ان عرضیوں میں واضح طور پر لکھا ہے، خود ملاحظہ فرمائیے حضور۔!!"

بڑے ارباب مجاز نے ہماری پیش کردہ عرضیوں پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد فرمایا۔ "یہ شکایتی عرضیاں تو

واٹر سپلائی کے بارے میں ہیں، اور اس کے لیے تمھیں یہاں آنے کے بجائے واٹرورکس کے ڈپارٹمنٹ کا رخ کرنا چاہیئے تھا۔!" اتنا سننا تھا کہ ہم نے فوراً اپنی فرضی عرضیاں بڑے ارباب مجاز کے ہاتھ سے جھپٹ لیں اور انھیں جیب میں رکھتے ہوئے بولے "بھول ہوگئی حضور! جانا واٹرورکس تھا اور یہاں چلا آیا۔ سوری اینڈ گڈ بائی۔!"

ہم یہ کہہ کر جانے کے لیے پلٹے ہی تھے کہ چھوٹے ارباب مجاز نے ٹوکا۔ "کہاں چلے نوجوان۔!
موصوف نے پھر سے ہمارے قدموں میں بیڑیاں ڈال دیں اور بڑے ارباب مجاز سے مخاطب ہوکر مزید آگ لگانا شروع کیا۔ "سر! آپ نے شاید اس نکتے پر غور نہیں فرمایا یہ جس قدر بھولے نظر آرہے ہیں، اتنے بھولے نہیں ہیں، ۔یہ واٹرورکس کے دفتر جانے کے بجائے یہاں بھول سے آنے کا جو ڈھونگ رچا رہے ہیں اس کی وجہ کیا ہے، آپ کو بتاؤں سر۔!،

"ہاں بھئی بتاؤ۔!، بڑے ارباب مجاز نے بے تابی سے پوچھا جس کے جواب میں چھوٹے ارباب مجاز نے نہایت ڈرامائی انداز میں فرمایا۔ "آپ کو تو پتہ ہے سر، واٹر ورکس کی ان کے وارڈ والی برانچ سنگل اسٹوری بلڈنگ میں ہے جبکہ اپنا وارڈ آفس پانچ منزلہ ہے، ذرا سوچئے خودکشی کے لیے سنگل اسٹوری بلڈنگ کارآمد ہوتی ہے یا پانچ منزلہ۔؟"

"صاف ظاہر ہے پانچ منزلہ عمارت کی چھت سے آدمی کود ے گا تو اس کی ہڈیوں کا سرمہ یقیناً بن جائے گا۔" بڑے ارباب مجاز نے فوراً کہا، اور آگے گویا ہوئے۔ "اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ شکایتی عرضیاں محض ایک بہانہ ہے، نوجوان کا اصل مقصد خودکشی ہے۔"

"بالکل سر ہنڈریڈ پرسنٹ سر۔" چھوٹے ارباب مجاز نے جلتی پر مزید تیل چھڑکتے ہوئے کہا۔
"اب تم ہی کہو اس نوجوان کیساتھ ہمیں کیا سلوک کرنا چاہیئے۔" بڑے ارباب مجاز نے پوچھا وہ بولا۔ وہی جو زندگی کی نعمت کے ساتھ کفران نعمت کرنے والوں کیساتھ کیا جاتا ہے اسے فوراً پولس کے حوالے کردیجے سر۔"

پولس کا نام سنتے ہی ہماری سٹی گم ہوگئی۔

(جاری)

(تیسری قسط)

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

جانا ہمارا پاکستان ، معیت و مساعدت میں جگندر کی

Smile, nothing will happen.
(صورت پہ باروں مہینے محرم کی بجائے ، خبصورت ! کبھی مسکرالیا بھی کرو، سر پر قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی)

دنیائے اردو کی عظیم ترین ہستی سے مل کر جن کی دنیاوی اور علمی وجاہت محتاج تعارف نہیں ہم کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر آپ کی فروتنی ، منکسرالمزاجی اور اعلیٰ ظرفی کا یہ عالم جیسے وہ خود ہمیں سے کچھ مانگ رہے ہوں ، حالانکہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ کچھ اور ہی غمازی کررہا ہے ۔ جنھیں اردو میں کچھ شدہ بدہ حاصل ہوگئی وہ ہواؤں میں اڑنے لگے کوئی غالب کے تو کوئی میر کے منہ آنے لگا مگر ، منھ ہی کی کھانے کے باوجود بھی تنی ہوئی گردنوں کی نسیں ذرا ڈھیلی نہیں پڑتیں ، اپنے آگے کسی کو خاطر میں لانا کسر شان ۔ اپنے لئے "اردو کی آبرو" ، "برصغیر کے ممتاز ادیب" ، ملک الشعراء" ایسے ایسے اور کئی ٹکسالی القاب ڈھال کر لقا کبوتر کی طرح سینہ پھلائے اپنے حاشیہ برداروں کے بیچ غٹرغوں کرتے پھرتے ہیں ۔ ان تماشوں کو دیکھ دیکھ کر ہمیں اسی سوختہ سامان کی یاد بے طرح آجاتی ہے ۔

شرم تم کو مگر نہیں آتی ،

اور جب "اردو کی آبرو" کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ، کانوں سے سنا تو معاملہ بالکل ہی برعکس تھا ۔ نہ کوس انا ولا غیرے کی لن ترانیاں نہ "ہم ہم ، میں میں" کی فراوانیاں تھیں ۔ جو کچھ تھا وہ عجز سامانیاں تھیں ، انکساریاں تھیں تواضع اور خاکساریاں تھیں ۔۔۔

ہم کہ اپنے چہرے پر تھوڑی سنجیدگی اور تھوڑی سی متانت کا کیموفلاژ CAMOUFLAGE پینٹ کرکے گئے تھے دو عرق عرق ہوکر بہہ گیا ۔ سچ ہے سر اٹھاکر چلنے والوں کو یہاں خاک ہی چاٹنی پڑتی ہے اللہ کو بندے کا غرور ، گھمنڈ ، کبر و نخوت اور تمکنت کسی طور پسند نہیں آتا کیوں ؟ ان سارے صفات کا وہی ایک سزاوار ہے ۔ وہ ہرگز پسند نہیں فرماتا کہ یہ فرزند و انسان اس کی ان صفات میں شریک و سہیم ہوکر اس کی ہم سری کرے ۔ "سدرۃ المنتہیٰ" وہ مقام جہاں سے سید الملائیکہ جبرئیل امین بھی پر جل جانے کے خوف سے

ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے ایسے اعلیٰ و ارفع مقام پر باغ عالم کے ہزاروں لاکھوں اقسام کے درختوں کو چھوڑ کر سدرہ (بیری کا درخت) ہی کو کیوں پسند اور منتخب فرمایا گیا۔؟ دوسرے سارے درخت آسمان کی سمت اپنا سر اونچا کئے ہوئے ہیں اور ایک یہی وہ درخت ہے جس کی ثمر والی زمین کی طرف جھکی ہوئی ہے۔۔۔ سچ ہے! جو سر جھکانے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں سرافرازیاں بھی انہی کا نصیب ہوتی ہیں۔۔۔

"ولا تمش فی الارض مرحا انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا"

(زمین پر اکڑ کر نہ چلو تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔)

ان اسرار و رموز سے تو سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر طاقت کی دوا "سانڈے کا تیل" بیچنے والا وہ پہلوانی کاٹھ کا عطائی حکیم بھی خوب واقف ہوتا ہے جو راہ گیروں کو اپنی جانب راغب کرنے کے لئے پان کا یہ موٹا بیڑا گلے میں دبائے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر بڑے عارفانہ اور غضب کے مذکرانہ سکہ بند شعر یہ شعر سناتا ہے

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے — کہ رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے "اصولوں" سے — کہ خوش بو آنہیں سکتی کاغذ کے پھولوں سے

"خر۔ خر ر۔ خر خاخ" (گلے میں پان کی پتی اٹک گئی تھی)

ارے! عوود (اور) اکیا ہی کنڈل مار کر بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا (مصرعہ اولیٰ قاری صاحبان خود لگالیں)۔۔۔

پتہ نہیں بزعم خود جو عظیم دانشور بنے بیٹھے ہیں ان کے "علم بلا" میں یہ آسان سی بات کیوں نہیں سماتی۔؟

وقت گزرتا جارہا تھا یوسفی صاحب بول رہے تھے اور ہم پھول چن رہے تھے۔جی نہ چاہتے ہوئے بھی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہم نے اجازت لی مبین زیدی اور یوسفی صاحب میں امریکہ کے اپنے اپنے پتوں کا "آدان پردان" ہوا کہ جب بھی وہ وہاں تشریف لائیں ملاقات سے شرف بخشیں۔ ہم طوعاً و کرہاً باہر آئے۔ گلے ملے، رخصت لی اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہماری ان گنہ گار آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ دنیائے اردو کا یہ "قطب منار" جس کے آگے ہم بونے ہی نہیں "للی پٹوں" سے بھی گئے گزرے ہیں، اپنے کندھے جھکائے ہاتھ باندھے گیٹ کے آگے اس وقت تک ساکت و صامت کھڑے رہے جب تک کہ ہماری گاڑی ان کے آگے سے گزر نہ گئی۔۔ راستے میں ہمارے پیر تسمہ پا جگندر نے پوچھا! کچھ دیکھا۔؟ ہم نے کہا بہت کچھ۔ پوچھا گیا! کچھ پایا بھی۔؟ اتنا کہ آج ہمیں اپنی تنگ دامنی پر کف افسوس ملنا پڑا۔۔۔

اس نجیب و شریف باپ کے بیٹے سے ایسی شرافت، نیک سرشتی، انکساری اور حلم و تواضع کے سوا اور توقع بھی کیا رکھی جاسکتی ہے جنھیں بیٹے کی محبت جب اپنے مقام سے کراچی کھینچ لاتی تھی تو آتے ہوئے اپنے ساتھ ایک تھیلے میں گھر سے روٹی بھی لے آیا کرتے تھے۔۔۔ ان کے تقوے کی طہارت کو یہ گوارانہ تھا کہ وہ بینکنگ کے پیشے سے وابستہ اپنے بیٹے کے گھر کی وہ روٹی کھائیں جس میں سود کی آمیزش کا شائبہ تھا۔۔۔ اللہ اللہ!

یوسفی صاحب نے اپنے محترم والد صاحب کے انتقال پر جن غم ناک تاثرات کا اظہار فرمایا ہے ان کو پڑھ کر پتھر دل انسان بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پاسکے گا۔

"زندگی میں جس نے ان کی کوئی خدمت نہ کی اسے انھوں نے
کفن کا دینے کی سعادت سے بھی محروم رکھا۔ قبر پر نہ گلاب
تھی چادر تھی نہ چنبیلی کا ڈھیر نہ گھر پر آہ و بکا کا شور۔

وہ تھے تو گھر اتنا بے سروسامان نظر نہیں آتا تھا۔" (زرگزشت)

یوسفی صاحب کے مغموم دل سے نکلی ہوئی اس بے آواز چیخ نے اس وقت ہمیں ایک اور بیٹے کی وہ چیخیں یاد دلائیں جو اپنے باپ کی تلاش میں دنیا جہان کی خاک چھانتا پھر رہا تھا اور زبان سے یہ چند الفاظ جو چیخ کی صورت اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔

I seek , one man, one man Rustom" my father

(میں ایک شخص کی تلاش میں ہوں (وہ ہے) "رستم" میرا باپ (رستم و سہراب۔ فردوسی)

٭ یہاں one man کی تکرار نے ترجمے کو اصل سے کہیں آگے بڑھا دیا اور مترجم میتھیو آرنلڈ کا نام زمانے کی قید سے آزاد ہوگیا۔

... مگر اب یوسفی صاحب خوش قسمت ہیں کہ ایسے معاملے سے دوچار نہیں ہوتے اور جب بیٹے سے ملنے جاتے ہیں تو کوئی تھیلا ان کے ساتھ نہیں ہوتا۔ کیوں۔؟ "حوصلہ مند" صاحبزادے نے اپنی قوت لایموت کی برقراری کے لئے بینکنگ کے پیشے کو ذریعہ معاش نہیں بنایا بلکہ اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر رزاق مطلق کی شکر گزاری میں ایک مسجد میں امامت کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں۔ اور جب ہر دوسرے سال یوسفی صاحب کو بیٹے کی محبت امریکہ کھینچ لے جاتی ہے تو اپنے ذی عزت والد کا فرمانبردار، سعادت مند بیٹا بہو آپ کی اس قدر خاطر و مدارات کرتے ہیں اور اصرار کرکر کے اتنا کھلا دیتے ہیں کہ یوسفی صاحب کا منہ پھر جاتا ہے اس پر بھی وہ لوگ بس نہیں کرتے بابا! تھوڑا اور، بابا! ذرا سا یہ کہے چلے جاتے ہیں اور یوسفی صاحب، نانا، بس بس، جزاک اللہ کہہ کر ٹیبل سے جب اٹھنے لگتے ہیں تو سب سے اخیر میں ننھے پوتے صاحب مرغ کی ایک سالم ٹانگ پلیٹ سے اٹھاکر بڑھاتے ہوئے اپنی توتلی زبان میں فرماتے ہیں "دادا جان! بس یہ ایک ٹانگ اور"۔ اور اس عالم میں کون ایسے کٹھور دل دادا جان ہوں گے جو اپنے دل کے سرور، آنکھوں کے نور پوتے کی شہد میں لپٹی ہوئی اس درخواست کو رد کرکے اس کے کومل دل کو ملول کردیں ... پوتے کے ہاتھ سے ٹانگ لے لیتے ہیں اور اس کی خوشی دیکھنے کی خاطر بعد از کوشش بسیار حلق سے نیچے اتار ہی لیتے ہیں۔ مرغ کی یہ ٹانگ تو کیا اگر پوتا بھونا ہوا سالم بکرا بھی پیش کردے تو کسی دادا جان کو انکار کی جرت نہ ہوگی ...

امریکہ میں بچوں کی اس تواضع اور میزبانی کا جو نتیجہ نکلنا چاہیئے وہ نکلتا ہے آپ کا معدہ احتجاج کرنے لگتا ہے۔ پیٹ میں شائیں شائیں طوفانی ہوائیں، ڈکاروں پر ڈکاریں، جلن، مروڑ نیز "احوال دیگر" کے باعث نظام شکم میں المیا بگوگ بجتا ہے کہ بچوں سے وداع ہو کر کراچی واپس آتے ہی سب سے پہلے ان شکایتوں کے ازالے اور علاج معالجے کے لئے شتابی سے اپنے فیملی ڈاکٹر سے رجوع ہوجاتے ہیں ...

رخصت ہوتے ہوئے ہم نے یوسفی صاحب سے مشفق خواجہ صاحب کا پتہ اور فون نمبر لے لیا جسے دیتے ہوئے انہوں نے اصرار سے فرمایا! "آپ خواجہ صاحب سے ضرور ملیں میں فون سے آپ کے بارے میں انہیں بتلا دوں گا، کل اتوار ہے وہ ہر اتوار کو اپنے یہاں دربار عام لگاتے ہیں، ناظم آباد میں تین منزلہ مکان کی ہر منزل کتابوں سے ٹھسا ٹھس بھری ہوئی ایک بڑی لائبریری ہے جہاں وہ آنے والوں سے ملا کرتے ہیں۔" ہم نے بصد افسوس اپنی مجبوری ظاہر کی اور بتلایا کہ کل ہی شام کی فلائیٹ سے لاہور روانگی ہے، سارا دن اسی کی تیاری اور

آنے والوں سے ملنے ملانے اور وداع لینے میں گزرے گا، ناظم آباد جاکر خواجہ صاحب سے نیاز حاصل کرنے کے لئے وقت نہ نکال پاؤنگا۔ البتہ صبح فون پر اپنا نیاز مندانہ سلام اور ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب کا پیام پہنچادونگا۔

دوسرے دن فون پر خواجہ صاحب سے بات ہوئی "شگوفہ" کے حوالے سے وہ ہم سے واقف ہیں۔ فرمایا! "آپ چلے آیئے خوشی ہوگی" ہم نے اپنی مجبوری اور اسی کی وجہ ظاہر کرتے ہوئے معذرت چاہی اور ملاقات کو آئیندہ پر انحصار رکھنے کی درخواست کرتے ہوئے عرض کیا آج آپ کے دربار کا دن بھی ہے ہماری وجہ سے اس کے معمول میں خلل واقع ہوگا۔ ہنستے ہوئے فرمائے !آپ آیئے تو سہی ، دربار خاص بھی آراستہ ہوجائے گا ۔۔۔

قسمت میں یہ سعادت نہ تھی کہ خواجہ صاحب سے ملاقات ہوتی اور اس دریا سے بھی موتی رول کر ہم اپنا دامن بھر لیتے اپنی مجبوری کا اظہار کرکے معافی چاہی اور رخصتی سلام کیا۔ کچھ دیر بعد یوسفی صاحب سے فون پر بات ہوئی رخصت مانگی اور زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ پروگرام میں شریک ہونے کا وعدہ یاد دلایا۔ تو ہنس کر بولے ! ۔ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

آئیندہ !کراچی شہر کے حالات ، بہادر یار جنگ اکیڈمی ۔ میں حاضری اور محترم خواجہ حمید الدین شاہد صاحب سے ملاقات ۔ کراچی کے گدھے ۔ "شیر خورمہ"۔ جمعگی کا ہنگامہ اور دعوت۔ ایک رہنما کا پارسی صحافی کی گردن پر چاقو رکھ کر پوچھنا کہ اگر میں اب کہوں کہ کلمہ پڑھ لو تو کیا کروگے ۔۔۔؟ اور دھم بول کے آیا شیر

پروفیسر آفاق احمد

(روچسٹر کینٹ ، انگلینڈ)

پولس کے لیے درس شرافت

اگر کوئی پولس والا کسی ملزم سے تفتیش کرنے کے بعد یہ کہے کہ : "آپ کو جو زحمت ہوئی اس کے لیے معافی کا طلبگار ہوں۔" تو یقیناً وہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے گا۔

یا وہ کسی ملزم یا ملزمہ کو "سر" اور "میڈم" کہہ کر مخاطب کرے تو وہ یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ضرور اس کا دماغ چل گیا ہے۔

لیکن امریکہ میں نیویارک سٹی کے MAYOR روڈی گیلیانی نے اپنے شہر کے پولس والوں کے نام یہ گشتی مراسلہ بھیجا ہے کہ جب وہ بدنام سڑکوں پر گشت کے لیے نکلیں تو خود کو مہذب ثابت کرنے کی کوشش کریں۔

نیویارک کے 38 ہزار پولس آفیسرز کے نام جو ہدایتی کارڈ جاری کیے گئے ہیں ان میں پولس والوں سے یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ وہ جب پبلک کے کسی فرد سے گفتگو کریں تو پہلے "ہیلو" کہیں اور پھر "تھینک یو" بھی کہیں۔ جب وہ بالغوں کو خطاب کریں تو ادب کے ساتھ مسٹر، سر اور میڈم کہہ کر بات شروع کریں اور TEENAGERS سے "ینگ لیڈی" اور "ینگ مین" کہنا نہ بھولیں۔ اور اس گشتی کارڈ کے آخر میں انہیں یاد دلایا گیا ہے کہ تفتیش کے بعد پولس آفیسر اس شخص کے سامنے وضاحت کریں کہ اسے کیوں روکا گیا اور کہیں کہ "آپ کو جو زحمت ہوئی اس کے لیے معافی کا طلب گار ہوں۔"

دراصل میئر صاحب کو یہ "درس شرافت" دینے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ حال ہی میں سٹی ہال کے نزدیک پولس کی اندھا دھند گولی باری سے ایک شخص جاں بحق ہوگیا تھا اور اس کی وجہ سے پورا علاقہ تناؤ کا شکار تھا اور مسلسل احتجاج کا سلسلہ جاری تھا۔

ہوا یوں کہ سڑک پر چھوٹا موٹا مال بیچنے والا ایک 22 سالہ افریقی نوجوان امادو ڈیالو کو چار خوش لباس پولس والوں نے اپنی دہشت کا مظاہرہ کرنے کے لئے گولیوں سے بھون ڈالا۔ انھوں نے 41 گولیاں داغیں جن میں سے 19 نے ڈیالو کے جسم کو چھلنی کر دیا۔ ڈیالو کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ نہیں تھا اور جو نہتا تھا اور جسے یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اسے کس قصور میں نشانہ بنایا جارہا ہے۔؟

بعد میں ان آفیسرز کو قتل کے الزام میں معطل کردیا گیا مگر اس واقعہ کو لے کر احتجاجی تحریکات کا سلسلہ جب حد سے بڑھا تو میئر صاحب کو کچھ اور نہ سوجھا اور جھگڑا دور کرنے کے لیے انہوں نے یہ "نسخہ شفا" ڈھونڈ نکالا۔ لیکن پھر شاید یہ سوچ کر کہ اس سے پولس خفا نہ ہو جائے پبلک کو بھی یہ قیمتی مشورہ دیا کہ "وہ بھی پولس آفیسرز کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کرے جیسا کہ وہ اپنے ساتھ چاہتی ہے۔" یعنی پبلک کو بھی پولس والوں کے ساتھ غیر مہذب نہ ہونا چاہیئے۔"

اب میئر صاحب کو کون بتائے کہ بھلا پبلک کی یہ مجال کہاں کہ وہ پولس والوں کے ساتھ کسی قسم کی "گستاخی" کرنا تو درکنار اس کا خیال بھی دل میں لائے!

اب آپ کے ذہن میں ضرور یہ سوال سر اٹھا رہا ہوگا کہ آخر میئر صاحب پولس کو ہدایات دیتے دیتے پبلک کیوں سمجھانے لگے؟

دراصل پولس والوں نے میئر صاحب کے اس "نصیحت نامے" کا برا مانا اور وہ MANHATTAN سڑکوں پر یہ کہتے سنے گئے کہ میئر نے ان کی توہین کی ہے۔ وہ بھلا انہیں یہ بتانے والا کون ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کا برتاؤ کریں۔ تو میئر صاحب نے بھی اپنا انداز بدلا اور پبلک کو سمجھایا:

"بہر حال ہمیں بھی پولس آفیسرز کا احترام کرنا چاہیے جو ہماری جنتا کی زندگی کے تحفظ کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔"

اور پھر کہاں تو وہ "سر" اور "میڈم" کہہ کر مخاطب کرنے کی نصیحت کر رہے تھے کہاں ایک دم پینترا بدل کر کہنے لگے:

"جب آفیسرز کسی کو گرفتار کرتے ہیں تو ان سے یہ امید کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ سر اور میڈم کہہ کر مخاطب کریں گے؟"۔

اب میئر صاحب کو یہ خیال آیا کہ کہیں پبلک اس بات پر برا نہ ماننے لگے کیونکہ ووٹ تو بہرحال وہ ہی دیتی ہے۔ اس لیے پھر دبے لفظوں میں پولس کو نصیحت کرنے لگے کہ: "یہ کوئی بری بات نہیں ہے کہ گرفتاری کے بعد آپ فوراً اپنا پرانا طرز عمل بدلنے کی کوشش کریں جو آپ کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے میں معاون ثابت ہو۔"

ہم سوچتے ہیں کہ نیویارک کے MAYOR نے بہرحال ایک اچھی پہل تو کی۔ کیا ہمارے ملک کی پولس کو بھی کوئی اس طرح کا درس شرافت دے سکتا ہے۔ کم از کم اس کی پہل سے اتنا تو ہوا کہ ایک زمانے سے جسے سب محسوس کر رہے تھے مگر کہنے کی ہمت کوئی نہیں کر رہا تھا۔ کسی نے تو اس کی طرف توجہ دلائی رہی پبلک کو سمجھانے کی بات تو وہ ایسی کون سی غلط ہے؟ یہ بالکل دوسرا معاملہ ہے کہ پبلک اس نکتے پر بغیر سمجھائے ہی عمل پیرا ہے! کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر لے کر تو وہ شاید بچ جائے مگر پولس سے پنگا لیکر اس کا بچنا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے!

محمد برہان حسین
ہمایوں نگر۔ حیدرآباد۔ 28

ہائی ٹیک شہر حیدرآباد بے آب

کوئل کی کوک سنتے ہی خان صاحب کے چہرہ کا رنگ فق ہوگیا شرفو میاں نے پوچھا "کیا ہوا خانصاحب ؟ یہ آواز تو کوئل کی تھی نا؟"

خان صاحب نے کہا "ہاں۔

شرفو میاں نے کہا "مگر آپ کے چہرہ سے کوئل کی کوک نے رنگ ہی اڑادیا جیسے کسی زمانہ میں گھر کے سامنے کتے کے رونے سے لوگ پریشان ہوجاتے تھے اور گھر میں اگر کوئی بیمار ہوتا تو اس کو حسرت سے دیکھتے تھے یا پھر گھر کے نانا۔ دادا قسم کے بزرگ پر فاتحہ پڑھنے خود کو تیار کرلیتے تھے۔"

" ایک ہمارے چچا تھے جو جھنجھلا کر کہتے کہ "کیا ہونے والا ہے پتہ نہیں میرے پاس ایک دن کی بھی رخصت نہیں ہے۔"

خان صاحب نے کہا "میاں! کوئل کی کوک کتے کے رونے سے کہیں زیادہ باعث اذیت ہے۔ چونکہ یہ موسم گرما کے آنے کی اطلاع دیتی ہے اور موسم گرما۔ گرمی کے علاوہ پانی کی کمی لاتا ہے۔ اور گرم سمنٹ کے مکانوں میں گرم دن اور گرم رات کیا غضب ڈھاتے ہیں۔ نہ دن کو چین رہتا ہے نہ ہی رات کو نیند ہو سکتی ہے لیکن حیرت اس پر بھی ہوتی ہے کہ کوئل حیدرآباد شہر سے جاتی کیوں ہے چونکہ حیدرآباد میں موسم گرما ہی رہنے لگا ہے۔ محض چند دن، چند گھنٹوں کے لئے کوئل کا چلا جانا ویسے ہی ہے جیسے بے روزگار داماد چند دن، ماں باپ کے گھر جاتا ہے اور پھر سال بھر سسرال ہی میں پڑا رہتا ہے۔"

خان صاحب نے کہا "چلئے وہ گڑھا دیکھ لیتے ہیں"

شرفو میاں نے اٹھتے ہوئے پوچھا "گڑھا ؟ کونسا ؟"

گھر کے دروازے کے باہر، سیدھی جانب ایک گڑھا تھا اور اس میں نل کا خشک پائپ چھپا ہوا تھا

شرفو میاں نے پوچھا " ارے۔ اس باولی میں تو خشک ریت بھری ہوئی ہے۔" پہلے تو خانصاحب نے اتنی اونچی آواز میں سوال کرنے پر ٹوکا پھر کہا " شرفو بھائی ہمارا شہر دنیا کے الکٹرانک نقشہ پر ابھر آیا ہے۔ وہ دور لدگیا جب نل کی ٹونٹی کھولنے سے پانی نکلتا تھا اور بند کرنے سے بند ہوجاتا تھا۔ اکثر ہم نل کی ٹونٹی سے پانی

مسلسل بہنے پر اس کو درست کراتے تھے۔ آج نل بغیر ٹونٹی کے ہوتے ہیں اور ٹونٹی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔"

شرفو میاں نے آواز نیچی کرتے ہوئے پوچھا "مگر۔یہ باؤلی ۔۔۔"

خانصاحب نے خفا ہو کر ڈانٹا " باؤلی ؟! ۔ کہاں ہے ۔۔۔ یار ہوش کے ناخن لو اتنا کھودنے پر پانی نکل آتا تو ہم اتنے میلے کپڑے نہ پہنتے ہوتے ۔۔۔ ارے میاں ۔یہ گڑھا اس لئے کھودا گیا ہے کہ ہم نل کے پائپ کو زیادہ سے زیادہ گہرائی میں رکھیں تاکہ پائپ کا سارا پانی ادھر آجائے۔"

شرفو میاں نے پوچھا "اوہ !تو پھر سارے محلے کا پانی ادھر ہی گرجاتا ہوگا ۔"

وہ بولے "جی نہیں۔ چونکہ سارے گھروں میں ایسے ہی گڑھے موجود ہیں پہلے ہم نے ایک گز کھودا تھا ،ہمارے پڑوسی نے ڈیڑھ گز کھود لیا ہم نے پھر دو گز کھودا ۔اس کے پاس سے پانی غائب ہوگیا تب اس نے ڈھائی گز کھود لیا۔ "ہم نے تین گز کھود لیا۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب دونوں کے پاس پتھر نکل آیا پڑوسی نے اس پتھر کو بارود سے توڑنے کی کوشش کی اور تین روز حوالات میں گذار کر واپس آیا۔"

شرفو میاں نے پوچھا" پھر کیا ہوا "

"پھر؟۔۔۔ پھر ہم نے پائپ سے پمپ کو جوڑ دیا "

"ارے !یہ تو جرم ہے ۔"

خانصاحب بولے " اب اس محلے کے لوگوں کے لئے تو دو ہی متبادل ہیں ،جرم کرو یا پیاسے مرو۔ اس پر تماشہ یہ ہے کہ نل کو میٹر بھی لگے ہیں اور آب رسانی والوں کو میٹر بڑھتا بھی نظر آتا ہے ،خشک نل کے بل بھی آتے ہیں اور ہم لوگ سپلائی کٹ جانے کے خوف سے بل کی رقم بھی بھرتے ہیں۔ تمھیں تو معلوم ہے ہم ہندوستانی دو سو برس انگریز کی غلامی سے آزادی کی امید میں جیتے رہے پھر اب پچاس سال سے اچھے دنوں کی امید میں جی رہے ہیں اور ہر شخص مرنے سے پہلے ایک درجن بچے پیدا کرجاتا ہے اس امید پر کہ اگر اچھے دن آہی جائیں تو کہیں اس کی نسل محروم نہ رہ جائے ۔"

شہر میں ہر محلہ کے لوگ رات بھر جاگتے ہیں کہ رات میں کبھی نل سے پانی ٹپکنے لگے اور وہ غفلت کی نیند سوتے نہ رہ جائیں ایک سرکاری ملازم سے میں نے پوچھا ۔"بھائی ساری ساری رات جاگنے کے بعد تم دفتر میں دن میں کام کیسے کرتے ہو؟"

وہ بولا "دفتر میں لوگھتا رہتا ہوں۔ بغیر نہائے جانے سے اور میلے کپڑوں سے اس قدر بدبو آتی ہے کہ دفتر میں سب ایک دوسرے سے دور دور رہتے ہیں۔ ایکدفعہ افسر نے قریب آکر بات کی تو میں نے قے کردی ۔وہ بغیر منہ دھوئے آئے تھے افسر لوگ مجھے کبھی کچھ نہیں کہتے الٹا اگر کوئی جگانے کی کوشش کرتا تو اس کو یہ کہہ کر منع کرتے ہیں " بھئی انہیں مت جگایئے بلکہ اس کے سرہانے آہستہ بولو "بے چارہ ٹپ ٹپ پانی بھر کر سو گیا ہے اس حقہ کا "وہ دیکھئے وہ سکشن افسر صاحب میز پر سر رکھے خراٹے لے رہے ہیں۔ شاید ،رات ان کے گھر کے نل میں بھی بکثرت پانی ٹپکا ہے دفتر میں لوگ بلا اطلاع دیئے غائب ہوجاتے ہیں۔ بعد میں بتاتے ہیں کہ گھر سے ٹیلی فون آیا تھا۔: واٹر ورکس کا ٹینکر محلہ میں آیا تھا اور عجلت میں وہ آفیسر کو اطلاع نہ دے سکے۔

اگر کمیونیکشن ٹکنالوجی نے اسی رفتار سے ترقی کی تو N.R.I ہندوستان آکر پانی بھر کر اسی دن، اسی وقت ڈائرکٹ فلائیٹ سے لوٹ جائیں گے

کبھی لوگ دفتر دو پہر میں آتے ہیں اور آفیسر کو بتاتے ہیں "سر! رات نل سے پانی ٹپک رہا تھا، سارے خاندان نے ایک ماہ بعد ایک ایک لوٹا پانی رکھ لیا اور ـــ رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا۔"

آفیسر نے غور سے دیکھ کر کہا "ان حالات میں پانی کے لئے بارہ خون معاف ہیں۔ آپ رخصت لینے کی ضرورت نہیں۔ اور ـــ ارے یہ آپ کی پیشانی پہ زخم کیسا "کیا پانی۔ فساد "ہوا تھا:

میں نے کہا سر! کہ پانی کے برتن پر ٹپکنے کی آواز کا آنا تھا سارا محلہ جاگ پڑا اور دروازہ پر لوگ کیو لگاکر کھڑے ہوگئے اور آہ و زاری سے دل پھٹنے لگا "اجی ہماری اماں کا آخری وقت ہے حلق میں ٹپکانے آدھا گلاس پانی دیدو"

دوسرے نے اس کو ڈھکیل کر کہا ـــ بھائی میرا بھائی پیاس سے مرنے ہی والا ہے چند قطرے پانی اس کو مل جائے گا تو بچ جائے گا"

اس کے پیچھے کے شخص نے کہا "ارے اس کو کیا کروگے وہ تو بے روزگار ہے اس پر ہنگامہ کھڑا ہوگیا جس میں کسی نے خالی گلاس پھینک ماری جو میری پیشانی پر لگی۔ اتنے میں پولیس آگئی دوچار لوگوں کو دھر لیا بڑی مشکل سے انہیں اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر دو گلاس پانی پلانا پڑا جب کہیں جان چھوٹی۔

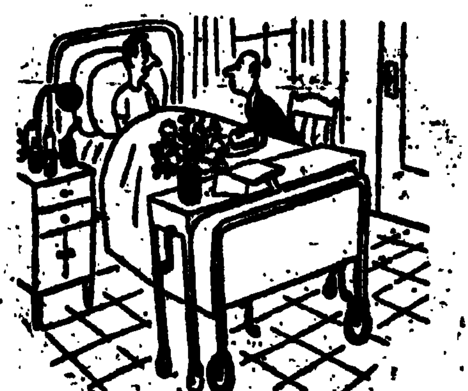
سر!۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوگا کہ ہم جی بھر کر پانی پی سکیں گے۔ کپڑے دھو سکیں گے، نہا سکیں گے"

آفسر نے کہا "وہ صبح کبھی تو آئے گی ـــ وہ صبح کبھی تو آئے گی"

اگرچہ یہ گاتے گاتے راجکپور، مکیش اور ساحر لدھیانوی تینوں مرکھپ گئے اب تو یہ حال ہے۔

مانند ماہئی بے آب بکٹ تڑپا کی ـــ

گھڑا پھوٹ کے روئے تم بے نہائے چلے۔



[illegible]



[illegible]

سوانحی خاکہ

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

ولادت: یکم جنوری ۱۹۱۶ء

نام: ضمیر حسین شاہ

مورث اعلیٰ: سید عبدالخالق

والد: سید حیدر شاہ

والدہ: سیدہ سردار بیگم

برادر اکبر: سید شبیر حسین شاہ

اہلیہ: جہاں آرا

اولاد: سید احتشام ضمیر (بریگیڈیئر) سید امتنان ضمیر (مقیم امریکہ)

مولد و مسکن: موضع چک عبدالخالق، تحصیل و ضلع جہلم (دینہ کے قریب)

تعلیم: بی اے، پنجاب یونیورسٹی کالجوں کے علاوہ درسے گورنمنٹ کالج کیمبل پور (۱۹۳۸ء) اور اسلامیہ کالج لاہور (۱۹۳۸ء)

وسیلہ معاش: ملازمت، تنظیم اور زمین

آغاز زندگی ملازمت میں معمولی دفتری کلرکی سے کیا۔ دہلی اور شملہ میں "بابو گیری"۔ روزنامہ "احسان" لاہور اور مولانا چراغ حسن حسرت کے مشہور فکاہی ہفت روزہ "شیرازہ" لاہور کی مجلس ادارت سے وابستگی۔ ہفت روزہ "سرِ ابہار" لاہور کی ایڈیٹری۔ دوسری عالمی جنگ میں فوج میں بھرتی ہوئے۔ جنوب مشرقی ایشیائی کمان (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) میں کپتانی۔ تعلق شعبہ تعلقات عامہ سے تھا۔ جس میں ان کے رفقا کرنل فیض احمد فیض، میجر چراغ حسن حسرت، کیپٹن ن م راشد، میجر کرنل مسعود احمد اور کیپٹن حسن عسکری (احمد ندیم قاسمی) شامل تھے۔

۱۹۴۸ء میں سنگاپور سے پاکستان مراجعت ۱۹۴۹ء میں کپتانی سے استعفیٰ۔ ۱۹۴۹ء ہی میں کرنل مسعود احمد اور کیپٹن انعام قاضی کی شراکت میں راولپنڈی سے اپنا روزنامہ "بادِ شمال" جاری کیا۔ جو ایک برس سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۵۱ء میں جہلم کے دیہاتی حلقے سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ ہار گئے۔ ۱۹۵۲ء میں فوج میں دوبارہ واپسی۔ میجر کے رینک سے ریٹائرمنٹ۔ چودہ برس تک وہ حکومت پاکستان کے ترقیاتی ادارے کے ڈائریکٹر

تعلقات عامہ رہے بعد میں مختلف وقتوں کے ساتھ پاکستان نیشنل سنٹر کے ایڈیشنل ڈائریکٹر، وزارت معاملات افغان مہاجرین میں مشیر اور اکادمی ادبیات پاکستان سے وابستگی۔

☆ سید ضمیر جعفری کا شمار اسلام آباد کی پہلی اینٹ رکھنے والوں میں ہوتا ہے آپ نے اس کی پلاننگ اور حسن کو دوبالا کرنے کے لئے ان تھک محنت کی اور اس کے کئی مقامات کو خوبصورت ناموں سے موسوم کیا۔



آبلہ پائی

سید ضمیر جعفری

جہلم سے چودہ میل دور ایک گاؤں چک عبدالخالق کے نام سے ہے۔ جو منگلا کے قریب واقع ہے۔ ڈیم کی تعمیر سے پہلے منگلا کا سراغ ہمارے گاؤں کے حوالے سے ملتا تھا۔ یہ گاؤں ہمارے مورث اعلیٰ سید عبدالخالق نے آباد کیا تھا۔ ہمارے بزرگ ایران سے ملتان آئے اور پھر یہاں اس گاؤں میں خیمے گاڑ دیے۔ آج بھی اس گاؤں میں اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد آباد ہیں۔

میں یکم جنوری ۱۹۱۶ کو اسی گاؤں میں پیدا ہوا۔ میرا نام سید ضمیر حسین شاہ رکھا گیا۔ میرے والد کا اسم گرامی سید حیدر شاہ ہے۔

"چک عبدالخالق اپنی طرز کا ایک منفرد گاؤں ہے۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں ہمارے آباؤ اجداد میں سے سید عبدالخالق نے اسے آباد کیا۔ اس گاؤں میں امیر بھی ہیں اور غریب بھی۔ مگر معروف معنوں میں آپ کو یہاں کوئی غریب نہیں ملے گا۔ یہاں ایک دوسرے کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جاتا۔ کوئی کسی کو کمتر نہیں سمجھتا۔ تین چار صدیوں سے آباد یہ گاؤں پھیلا ہی نہیں۔ اور اس کی آبادی بھی زیادہ نہیں ہوئی۔ بس جن کو زندہ رہنا ہوتا ہے وہ سو برس تک بھی زندہ رہتے ہیں اور جنہیں مرنا ہوتا ہے وہ جلدی ہی مر جاتے ہیں۔ ایسے کئی واقعات عہد گزشتہ کے حوالے سے ملتے ہیں کہ اس گاؤں میں آباد ہمارے خاندان کے افراد میں سے کسی نے دنیا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کسی دوسرے نے دنیا پر لات مار دی۔ تخلیق و تخریب کا سلسلہ اس عرصہ چلتا رہا کہ ہمارے خاندان پر اتنا عروج کبھی آیا ہی نہیں کہ زوال بھی آئے"۔

ہم کسان تھے۔ زمین سے رشتہ رہا۔ مجھے جو علمی وراثت ملی ہے۔ میرے دادا سید احمد شاہ کی عطا اور دین ہے۔ آپ ضلع جہلم کے واحد تاریخی مدرسے کے استاد تھے۔ جو قلعہ رہتاس میں واقع تھا' انگریزوں نے اس مدرسے کو باقاعدہ ایک سکول کی شکل دی اور میرے دادا اس کے پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ وہ پچاس ساٹھ برس تک اسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر رہے۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔ اس پورے علاقے میں ان کی بہت عزت تھی۔ ان کو اب بھی لیجنڈری کردار کی حیثیت حاصل ہے اور ان کا ذکر بڑے احترام سے کیا جاتا ہے۔ وہ کچھ طلباء کو اپنے گھر پر بھی رکھتے۔ ان کی کفالت کرتے۔ ان کا کھانا ہماری دادی پکاتی اور چولہے کے پاس بیٹھ کر سب اکٹھے کھانا کھاتے۔

ننھیال کی طرف سے بھی علمی ورثے میں بہت کچھ ملا۔ جس کا شعور قدرے بعد میں ہوا۔ میرے پرنانا سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ

پنجابی پوٹھواری لہجے کے مقبول شاعر تھے۔ ان کا تعلق میرپور آزاد کشمیر سے تھا۔ اس پوٹھوار کے علاقے میں دو ہی عظیم اور مقبول صوفی شاعر گزرے ہیں۔ ایک صاحب سیف الملوک حضرت میاں محمد بخش اور دوسرے میرے پرنانا سید محمد شاہ آپ اپنا کلام لکھتے نہیں تھے۔ ان کے عقیدت مند جو پڑھے لکھے تعداد میں تھے ان کے کلام کو محفوظ کر لیتے تھے۔ لوک ورثہ والوں نے جن کے تذکرے کے نام سے ان کے ابیات اکٹھا کئے ہیں۔ جن کا انتخاب کرنے کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے۔ پیر سید محمد شاہ کی ہیر ۱۹۰۰ء کے آس پاس میں ملک گلاب سنگھ ناشر لاہور نے "ہیر دی ہیر" کے نام سے شائع کی تھی۔ جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی۔ پوٹھوار کے دیہات میں ہیر وارث شاہ کو نہیں پڑھا جاتا اپنے لہجے کی وجہ سے سید محمد شاہ کی ہیر کو اس علاقے میں بے پناہ مقبول حاصل ہے۔ اصل میں زندگی کے ROOTS GRASS کو نہیں ہلایا جاسکتا۔ پیر سید محمد شاہ کی ہیر کی جڑیں اس خطے میں بہت گہری ہیں۔ اسی لئے اسی ہیر کو اس علاقے میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

"منگلا کی وجہ سے اس علاقے کے زیر آب آنے سے پہلے کھیارا شریف میں ہر سال ان کے مزار پر عوامی میلہ لگتا تھا۔ میرے شعری شعور کی چنگاری پیر سید محمد شاہ کی شاعری سے پھوٹی ہے۔ محمد سیف الملوک' جس کی اپنی مقبولیت کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا۔ جسے میلے ٹھیلوں اور گھروں میں پڑھا جاتا تھا۔

○

"میری بے بے جی جنہوں نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ ان کا یہ معمول رہا کہ وہ رات کے پچھلے پہر جس کو ہم لوگ "وڈی سرگی" کہتے ہیں' اٹھ جاتیں پہلے نوافل پڑھتیں پھر کچھ دیر بعد ازاں چار چھ روٹی کی منڈیں" پھر نماز فجر کے لئے مصلے پر بیٹھ جاتیں۔ پھر درود پڑھنے کا مرحلہ آتا۔ نماز کا سلام پھیرنے کے بعد کافی دیر تک ایک لمبی ہزار دانہ تسبیح کے دانوں پر گنتے (پڑھتے) کا وظیفہ چلتا۔ جن میں عربی وظائف کے علاوہ پنجابی کے ابیات بھی شامل ہوتے۔ پنجابی ابیات کو جنہیں "چمن شریف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بے بے جی دھیمی دھیمی۔ رولا (لے) کے ساتھ پڑھتیں۔ آواز کے سوز وگداز' چہرے کے خضوع و خشوع اور استغراق کی گہری کیفیت سے جو ان پر طاری ہوتی یوں لگتا جیسے پنجابی کے یہ ابیات بھی ان کی عبادت کا ہی حصہ تھے۔

"میرے والد محترم بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ ہم نے کبھی انہیں کھل کر ہنستے کم ہی دیکھا ہوگا۔ وہ گھر میں مذہبی رسالے اور اخبارات منگواتے تھے۔ اس دور میں کوئی بھی ایسی تحریر نہیں لکھتا تھا۔ بلکہ ہر تحریر میں ایک خاص اور تربیت ہوتی تھی۔ میرے والد براہ راست ایکسائز انسپکٹر بھرتی ہوئے تھے جو اس زمانے میں ایک بڑی بات تھی۔ اس کے باوجود ان کا جی اس ملازمت میں نہیں لگتا تھا اور انہیں اس محکمے میں ترقی کی بھی کوئی خواہش نہ تھی اس لئے وہ اسی عہدے پر تھے جب ریٹائر ہوئے۔ میرے دادا کو معلوم تھا کہ میرے والد کو اس ملازمت سے کوئی رغبت نہیں۔ میرے والد کا عجیب انداز میں حوصلہ بڑھاتے تھے۔

"میرا بچپن بڑا دلکش اور مصروف تھا۔ بچپن میں گھومتا جہاں کہیں سوانگ ہو ضرور پہنچتا۔ میلے ٹھیلے خواہ اپنے گاؤں سے دس میل دور ہوتے وہاں ضرور جاتا۔ اس زمانے کے میلے ٹھیلے اب کہانی' یادیں ہی باقی ہیں۔ ان میلوں میں نیزہ بازی کے مظاہرے ہوتے۔ کبڈی کے بھی علاقائی مقابلے ہی گرامی علاقے کی انتہائی دل فریبی ہوتی تھیں۔ ان گھٹ پہلوانوں اور جوانوں کے "تیخ" ان میلوں اور تقریبات میں ہوا کرتے۔ مقبول عوامی موسیقار اپنے اپنے علاقے کے وابستہ قوال اور عالم لوہار "چمٹے دو تارے گھڑے اور کنجڑیاں کی سنگت پر سیف الملوک" کے ابیات الاپتے حلقے رہتے۔

"جہاں ہیر کی محفل میں موجود ہوتا سیرت النبیؐ کے جلسوں میں شریک ہوتا۔

○

میرے چار چچا تھے۔ ان میں ایک رئیس تھے۔ دور کے زمانے کے مطابق وہ رئیس رہے۔ انہیں اچھی گھوڑیاں رکھنے کا شوق تھا۔ گھوڑوں کے مقابلے بھی ہوتے اور نیزہ بازی بھی۔ یوں یہ ماحول تھا جس میں ایک طرف روشنی تھی اور دوسری طرف کھیل تماشے' میلے ٹھیلے' اصل واسطہ جن میں میری پرورش ہوئی۔

"ہم دو بھائی تھے اور بہن تھی لیکن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ والد صاحب بسلسلہ ملازمت جہاں جہاں گئے۔ وہاں لگا جاتا رہا۔ مگر بنیادی حیثیت گاؤں کے گھر کو ہی حاصل رہی۔ میرے والد نے اپنی ملازمت کو ہمیشہ عارضی سمجھا اس لئے بھی گاؤں سے اپنا تعلق رہا۔ گاؤں میں آمد و رفت مشکل تھا۔ ہم مشکل جہاں سڑک پر بیٹھ کر چلتے

ہوتی تھی۔ میرے اساتذہ میں منشی نور حسین صاحب فارسی کے قابل تھے۔ بڑی قد آور، وضع کے استاد تھے۔ لمبے بال رکھ چھوڑے تھے۔ گاؤں میں گھر سے پہنتے موصوف چکوال کے رہنے والے تھے۔ انہیں دیکھ کر دل میں احترام پیدا ہوتا تھا۔ آج سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان جیسی وضع قطع کے لوگوں کو آج کے زمانے میں کوئی ملازمت ہی نہیں ملتی۔ بہرحال وہ شاعر تھے وہ مجھ سے کتاب سے شعر پڑھواتے اور دوسرے طالب علموں کو بتاتے کہ شعر ایسے پڑھے جاتے ہیں اور وہ بھی اسی طرح شعر پڑھا کریں۔ میں واقعی ردھم اور آہنگ سے شعر پڑھتا تھا۔ میرا شاعری کے ساتھ شغف بڑھتا رہا۔

ایک طرف تو شاعری کا شعور بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف میرے مشاغل شعریت کی ضد تھے۔ ہمارے زمانے میں ایک کھیل بہت مقبول تھا۔ اب یہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اس زمانے میں یہ کھیل ضلع گجرات اور جہلم کی تحصیل تک ہی محدود تھا۔ اس کھیل کو "تکیاں" کہا جاتا تھا۔ یہ کبڈی کی ایک شکل تھی۔ دو آدمی میدان میں اترتے۔ وہ پیشہ ور بھی ہو سکتے تھے۔ انہوں نے جسم پر زبردست مالش کی ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو باری باری پوری طاقت سے پانچ پانچ مکے مارتے تھے۔ جب مکا مارنے والا مکا مارنے لگتا تو اس کا مدمقابل اس کی کلائی پکڑنے اور روکنے کی کوشش کرتا۔ دوسرا مکا مار کر اسے گرانے کی کوشش کرتا۔ یہ طاقت اور پھرتی کا کھیل تھا۔ ہزاروں لوگ "تکیاں" کے مقابلے دیکھنے گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہو کر آتے تھے۔ میں بھی ان اترا اور مقابلوں میں حصہ لیتا رہا۔

مجھے سکول میں "ذہین لائق" طالب علم گردانا جاتا تھا۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے فرمایا "یا تو تم فرسٹ ڈویژن لو گے یا پھر فیل ہو جاؤ گے" ایسا ہی ہوا اور میں فیل ہو گیا۔ دوسرے برس جب پھر میٹرک کا امتحان دیا تو فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا۔ اصل میں حساب بہت کمزور تھا۔ کالج گیا تو حساب سے جان چھوٹ گئی اور پھر میں نے کالج میں ہمیشہ اچھی سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔ ایک دو نمبروں کی کمی سے فرسٹ ڈویژن رہ جاتی تھی۔ "جگت بازی" میں بہت اچھا رہتا تھا۔ کلاس میں اپنی حاضر جوابی اور مزاح کی وجہ سے ممتاز رہتا۔ مزاح کی حس قدرت نے خود عطا کی تھی۔ جو بعد میں نظم و نثر میں کام آئی۔

جب میں پہلی بار میٹرک میں فیل ہوا تو مجھے کیمبل پور بھیج دیا گیا۔ جہاں میرے چچا محمد شاہ رہتے تھے۔ اس زمانے میں جب والدین یہ چاہتے کہ ان کے بچوں میں نظم و ضبط اور باقاعدگی پیدا ہو تو وہ بچوں کو اپنے بھائیوں یا عزیزوں کے پاس بھجوا دیتے تھے کہ ان کی بہتر اور موثر نگرانی کر سکیں گے۔ میٹرک میں نے کیمبل پور سے پاس کیا گورنمنٹ انٹر کالج سے ایف اے کیا۔

کالج کا یہ زمانہ میری زندگی کا اہم دور تھا۔ جب میں ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوا۔ شاعری تو میں نے شروع کر رکھی تھی لیکن صحیح معنوں میں ادبی اور شعری نشوونما کالج میں ہوئی۔ میں نے باقاعدہ شاعری ۴۰ء کی۔ ایک اور بات بتاتا چلوں کہ میں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ کبھی کسی سے اصلاح لینے کا خیال ہی نہ آیا۔ استفادہ سب سے کیا اور اب تک کرتا ہوں۔

کالج میں ہماری انگریزی کے استاد پروفیسر ایش کمار تھے جو اردو کا بھی بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہ کالج میگزین کے انچارج تھے انہوں نے مجھے اس کا مدیر بنا دیا۔ پروفیسر ایش کمار مظفر گڑھ کے رہنے والے تھے۔ غالب اور اقبال کے شیفتہ تھے۔ تقسیم کے وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔ بعد میں بھارت میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی بنے' بھارت میں انہوں نے غالب اور اقبال کی شاعری اور افکار پر انگریزی میں کتابیں بھی لکھیں۔ افسانہ نگار بھی تھے۔ پروفیسر ایش کمار نے میری ادبی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔

ہاں ایک یادگار واقعہ بیان کروں گا کہ استاد کا احترام کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام جھنگ میں پروفیسر ایش کمار کے شاگرد رہے تھے۔ جب ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبل انعام ملا تو دہلی (بھارت) میں انہیں زبردست استقبالیہ دیا گیا۔ اندرا گاندھی اس تقریب کی صدارت کے لئے آئی تھیں۔ اس تقریب میں پروفیسر ایش کمار آخری نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے انہیں دیکھ لیا اور مسز اندرا گاندھی کو بتایا کہ ان کے استاد آخری نشستوں میں بیٹھے ہیں۔ انہیں سٹیج پر بلانا چاہئے۔ مسز اندرا گاندھی خود پروفیسر ایش کمار کے پاس گئیں اور انہیں اوپر لے آئیں۔

"مجھے اپنی تعریف منظور ہے نہ خود ستائی کہ ملتان کے ایک پروفیسر میانہ صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ پر پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ میرے استاد چراغ حسن حسرت پر پہلے پی ایچ ڈی کریں۔ چراغ حسن حسرت میرے استاد تھے ان کے احترام کا تقاضا تھا کہ میں نے یہ مشورہ دیا۔ اور پروفیسر میانہ نے میرے مشورے کو قبول کر کے مولانا چراغ حسن حسرت پر پی ایچ ڈی کی۔

"کیمبل پور کالج سے میں نے ایف اے کیا اور باقاعدہ شاعری شروع کی۔ غلام جیلانی اصغر بھی اسی کالج میں مجھ سے جونیئر تھے۔"

"بی اے میں داخلے کے لئے میں اسلامیہ کالج لاہور آیا۔ اس زمانے میں عبداللہ یوسف علی کالج کے پرنسپل تھے۔

"علامہ عبداللہ یوسف علی عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت کی وجہ سے اسلامیہ کالج لاہور کا ہندوستان بھر کی درسگاہوں میں منفرد مقام تھا۔ اسلامیہ کالج کا ہر طالب علم ان پر فخر کرتا تھا یہ علامہ عبداللہ یوسف علی کی شخصیت تھی کہ جس نے بعد میں یہ شعور عطا کیا کہ ایک شخص کس طرح پورے عہد کو متاثر کرتا ہے۔ نپولین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اکیلا ایک فوج کے برابر تھا۔ تو علامہ عبداللہ یوسف علی بھی ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔

اسلامیہ کالج لاہور میں آیا تو گویا ادب کے تالاب سے ادب کے بحر اوقیانوس میں آگیا۔ لاہور اور وہ بھی اس صدی کے تیسرے عشرے کا لاہور۔ تو گویا ان علم و ادب کا شہر لاہور، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کا لاہور، کمال صدیقی اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے۔ اختر ہوشیارپوری کا بھی خاصا چرچا تھا۔ یہ ہمارے ہم عصر تھے۔ سیاسی اور مجلسی سرگرمیوں میں حمید نظامی اور مولانا عبدالستار خان نیازی، عبدالسلام خورشید، عبداللہ ملک بہت نمایاں تھے۔ (جسٹس) انوار الحق مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

"اسلامیہ کالج کا میگزین کریسنٹ تھا۔ یہ ایک باوقار مجلہ تھا۔ میں اس میں لکھنے لگا۔ جب میں فورتھ ایئر کا طالب علم تھا تو اس کی ادارت کا اعزاز مجھے حاصل ہوا۔ ڈاکٹر تاثیر کالج سے جا چکے تھے لیکن ان کے ادبی اثرات محسوس کئے جاتے تھے۔ ان کی قائم کردہ بزم فروغ اردو کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ دوسرے اساتذہ میں جناب حمید احمد خاں اور خواجہ دل محمد بہت ممتاز تھے۔ کریسنٹ کی ادارت میرے لئے یقیناً ایک بڑا اعزاز تھی مجھ سے پہلے محمود نظامی اور مرزا ادیب اس کے مدیر رہ چکے تھے۔

میں ذاتی طور پر اختر شیرانی کے نیازمندوں میں شامل ہو گیا۔ اختر شیرانی اپنے مشہور محقق والد حافظ محمود شیرانی کے ساتھ فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے ان کا یہ گھر اسلامیہ کالج کے قریب تھا۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ اختر شیرانی اور حافظ محمود شیرانی ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے ملتے تک نہ تھے۔ اختر شیرانی ایک ادبی جریدہ "رومان" کے نام سے نکالتے تھے۔ اختر شیرانی تو کیا پرچہ نکالتے۔ شیخ محمد نواب صاحب کشمیری بازار لاہور میں رہتے تھے۔ اختر شیرانی ان سے یہ پرچہ نکلواتے تھے۔ میں ریواز ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اختر شیرانی وہاں بھی تشریف لے آتے۔ ان کے نیازمندوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ احمد ندیم قاسمی، اپندر ناتھ اشک (جسٹس) عطا اللہ سجاد، سید محمد جعفری، غلام عباس اور راجہ مہدی علی خاں جیسے لکھنے والے ان کے ہاں آتے جاتے تھے۔

۱۹۳۸ء سب سے دلگداز واقعہ علامہ اقبال کی وفات ہے۔ میں نے لاہور شہر کو کبھی اتنا سوگوار نہیں دیکھا جتنا علامہ اقبال کی وفات کے دن دیکھا۔ مجھے علامہ اقبال کے جنازے میں شرکت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ علامہ اقبال دلوں پر راج کرتے تھے۔ عام آدمی جو علامہ اقبال کے شعروں کو پڑھ سکتے تھے نہ سمجھ سکتے تھے نہ ہی انہوں نے کبھی ان کو دیکھا ہو گا وہ سب اس دن رو رہے تھے۔ وہ لوگوں کے دلوں میں بستے تھے۔

۱۹۳۸ء میں میں نے گریجویشن کر لی۔ اس زمانے میں متعدد اخبارات و جرائد میں شعری گلدستے شائع ہوا کرتے تھے۔ اخبار "ملاپ اور پرتاپ" میں یہ شعری گلدستے زیادہ چھپتے تھے میں بھی ان میں چھپنے لگا۔ کالج میں طالب علمی کے دور میں ہی ادب لطیف، ساقی، ہمایوں اور اخبارات میں میرا کلام شائع ہونے لگا۔ مشاعروں میں بھی پڑھنے لگا۔ مقبول ہو گیا۔ ریڈیو کے مشاعروں میں بھی جانے لگا۔ اور سب سے بڑی بات پیسے لے کر باہر کے مشاعروں میں بھی پڑھنے لگا۔

"لاہور کے ادبی حلقوں میں احسان دانش بہت مقبول تھے۔ قمر جلال آبادی کا بھی چرچا تھا۔ وہ ترنم سے بہت اچھا پڑھتے

تھے۔ تقسیم کے بعد وہ بمبئی چلے گئے۔ لاہور سے خوشتر گرامی کا پرچہ بیسویں صدی نکلتا تھا۔ جو بہت مقبول تھا۔ بیسویں صدی' کا دفتر سب سے منضبط اور بہتر تھا۔

عابد علی عابد' صوفی تبسم' مولانا عبدالمجید سالک' چراغ حسن حسرت' امتیاز علی تاج' نیاز مندان لاہور سے بھی میرے گہرے تعلقات تھے۔ اور وہ جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں ان کا طوطی بولتا تھا تو وہ حفیظ جالندھری تھے جن سے نیاز مندی کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر تعلقات میں گہرائی اور گیرائی آئی اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

مولانا چراغ حسن حسرت سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ آپ احسان' شہباز' زمیندار میں سند باد جہازی کے نام سے مدتوں کالم لکھتے رہے۔ جب انہوں نے اپنا جریدہ "شیرازہ" جاری کیا تو انہوں نے مجھے دیر معاون بنا لیا۔ یہ میرے لئے بڑا اعزاز تھا۔ لیکن میں نے ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین تو کریسنٹ میں ہی لکھنے شروع کئے تھے اب شیرازہ جیسے پرچے میں بھی میرے مزاحیہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ بی اے کرنے کے بعد لاہور میں ٹک گیا۔

"لاہور کا جتنا ذکر کروں کم ہے۔ نابغہ روزگار شخصیات لاہور کا وقار تھیں۔ شیخ سر عبدالقادر ادبی جلسوں کی صدارتیں کرتے۔ مولانا صلاح الدین احمد' مولانا حامد علی خاں' غلام رسول مہر' اور عبدالمجید سالک' مولانا ظفر علی خاں' کن کن کا ذکر کروں۔ میں اہتمام سے ادبی اور سیاسی جلسوں میں شرکت کرتا۔

"زمیندار" کا یہ عروج کا زمانہ تھا۔ ایک منظر ہے کہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ جون کے مہینے میں ایک چلچلاتی دھوپ میں' میں نے مولانا ظفر علی خان کو پیدل چلتے دیکھا۔ میں سائیکل پر سوار تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے پاس "زمیندار" کا دفتر تھا۔ میں نے مولانا ظفر علی خان کو لکشمی چوک تک چلچلاتی دھوپ میں پیدل چلتے دیکھا۔ آج اگر وہ سڑک ان کے نام سے منسوب ہے تو یہ ان کا حق بنتا تھا۔ اس سڑک پر مولانا ظفر علی خان نے انگریزوں کی لاٹھیاں کھائی تھیں۔

"اختر شیرانی' مولانا چراغ حسن حسرت کے بعد جس شخصیت کا اثر مجھ پر بہت گہرا اور دیرپا ہے وہ مولانا صلاح الدین ہیں۔ میں نے ان سے بہت فیض پایا۔ اپنا مجموعہ کلام "قریہ جاں" میں نے مولانا صلاح الدین کے نام معنون کیا ہے۔

"اسی زمانے میں ہمیں بھی ایڈیٹری کی پیش کش ہوئی۔ "سدا بہار" کے نام سے ایک رسالہ اردو بازار سے نکلتا تھا۔ ہماری بھی بڑی تمنا تھی کہ ہم ایڈیٹر بنیں۔ سو یہ آرزو دلچسپ انداز میں پوری ہوئی۔ "سدا بہار" کے مالک عبدالعلیم انصاری تھے' جو مسعود جھنگوان کے بڑے بھائی تھے۔ "سدا بہار" کا دفتر ایک باقاعدہ دفتر تھا۔ بیسویں صدی کی طرح منضبط' کئی کمرے تھے' ٹیلی فون بھی تھا۔ ہمیں بھی ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک علیحدہ کمرہ مل گیا۔ اسی روپے ماہوار' تنخواہ مقرر ہوئی جو اس زمانے میں بڑی معقول تنخواہ تھی۔ ہم بہت خوش ہوئے لیکن ہماری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ "سدا بہار" کے مالک نے ہمیں کہا کہ پرچے کے بس دو چار صفحے آپ کے اختیار میں ہیں۔ باقی قینچی سے کام چلائیں اور وہی چھاپیں۔ ہمیں اسے غزلوں کا رسالہ نہیں بنانا ہے۔ ہم "سدا بہار" کے لئے اچھے تراشوں کا انتخاب کرتے رہے' معیار بھی بنایا مگر چونکہ وہ شاعری چھپنے نہیں دیتے تھے۔ اس لئے ہماری تشفی نہ ہوئی اس رسالے "سدا بہار" میں اشتہار بہت چھپتے تھے اور پرچہ بس دو ڈھائی سو کی تعداد میں شائع کیا جاتا تھا۔ جس امید میں ہم ایڈیٹر بنے تھے وہ تو دم توڑ گئی ہم نے ایڈیٹری چھوڑ دی۔ ادھر گھر والوں کا بھی بڑا دباؤ تھا کہ کوئی ڈھنگ کی ملازمت کرو۔

ہمارے خاندان کا ذریعہ روزگار یا تو کھیتی باڑی تھی یا ملازمت اس وقت ہمارے خاندانی علاقے میں ایک اور رواج بھی تھا کہ کسی ایک فرد کی یہ ذمے داری ہوتی تھی کہ وہ گھر پر رہے' وہ خود کام نہ کرتا تھا۔ اس کی ذمے داری یہ ہوتی کہ کھیتی باڑی پر نظر رکھے۔ گھر پر رہے کہ کوئی زمینوں پر قبضہ نہ کرے۔ بہرحال یہ ایک روایت تھی جو چلی آ رہی تھی کہ گھر کا ایک فرد بے کار رہتا اور گھر ہی رہتا۔ وہ رضاکارانہ گھر پر رہنا قبول کرتا اور اس کی اور اس کے خاندان کی پرورش دوسرے بھائی کرتے تھے۔

"میرا بھی دل کچھ بھر گیا تھا۔ "سدا بہار" کی ایڈیٹری چھوڑ دی' سرکاری نوکری کی عمر بھی نکلتی جا رہی تھی۔ اس لئے جہلم آ گیا۔ اس وقت جہلم میں کئی شاعر اور دوست حضرات جمع تھے۔ ایک سراج الدین ظفر تھے' جو مجھ سے سینئر تھے۔ ان دنوں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر جہلم کا افسر مال لگا ہوا تھا۔ اس نے ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی کی۔ ابھی اس نے شعر کہنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اچکن پہنتا تھا اور اس پر خوب جچتی تھی۔ اسے تو اچکن پہننے کا بہانہ چاہئے تھا۔ یہ اس کی جوانی کا دور تھا۔ میں نے

اسے بڑھاپے میں بھی دیکھا ہے اور یقیناً میں نے بڑھاپے اور جوانی میں ایسا خوبصورت سکھ اس کے سوا کوئی نہیں دیکھا۔ اس وقت جہلم کے ڈپٹی کمشنر فیض الحسن بدرالدین طیب جی تھے جو مسلمانوں کے نامور لیڈر طیب جی کے صاحبزادے تھے۔ انہیں اردو نہیں آتی تھی ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے تھے لیکن مشاعروں کی سرپرستی کرتے۔ اچکن اور چوڑی دار پاجامہ پہن کر مشاعروں میں آتے۔ انہوں نے جہلم میں اردو کی بڑی سرپرستی کی۔

جہلم کے ایس پی اعزاز الدین لوہارو تھے، جو رشتے میں جمیل الدین عالی کے ماموں لگتے تھے۔ ویسے ایک دلچسپ بات بتاؤں میں نے جمیل الدین عالی کے جتنے ماموں دیکھے وہ سب عالی سے عمر میں چھوٹے تھے۔ انہوں نے بھی اردو کی بہت سرپرستی کی۔

اس طرح جہلم میں مقیم بندوبست پی این تھاپڑ تھے۔ وہ بھی ادبی مجلسوں کے سرپرست تھے۔ اسے حسن اتفاق کہئے کہ اس وقت جہلم میں جتنے بڑے سرکاری افسر تھے، وہ سب کے سب اردو اور شعروادب میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اس لئے جہلم میں اس زمانے میں شعری اور ادبی سرگرمیاں بڑے زوروں پر تھیں۔

"ایک اور بات بتاؤں...... دوسری جنگ عظیم میں جب برطانوی ہند میں سونگ پبلسٹی SONG PUBLICITY کا محکمہ قائم ہوا تو چوہدری محمد علی اس میں حفیظ جالندھری کو محکمے کا سربراہ بنا کر لے گئے۔ پی این تھاپڑ بھی اس شعبے میں گئے تو وہ بھی چند افسر کو اپنے ساتھ لے گئے یہ دلچسپ واقعہ ہے"

"میری سرکاری ملازمت کی عمر نکلی جا رہی تھی۔ اس لئے پی این تھاپڑ نے مجھے براہ راست گرداور بھرتی کر لیا اور یہ بھی بتایا کہ جنگ ختم ہوئی تو نائب تحصیلدار بن جاؤ گے۔ بہرحال میں گرداور بن گیا۔"

"اسی زمانے میں، میں نے اپنے علاقے میں مسلم لیگ قائم کی۔ اس علاقے میں سوائے ظفر علی خان کے کوئی دوسرا مسلم لیگی نہیں تھا۔ علاقے میں مسلم لیگ کی تشکیل و تنظیم کے کام میں چوہدری الیاس نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ جس کا بیٹا چوہدری الطاف اب قومی اسمبلی کا رکن ہے۔"

"یہ گرداوری کی ملازمت میرے بس کا روگ نہ تھی۔ مجھے اس سے وحشت ہونے لگی۔ محکمہ مال کی زبان نہ تو مجھ سے پڑھی جاتی تھی اور نہ ہی سمجھ میں آتی تھی۔ اس عرصہ میں ایک بار فوج میں کیپٹن کے لئے بھی درخواست دی۔ انٹرویو راولپنڈی میں ہوا۔ انٹرویو لینے والوں میں ایک اعلیٰ انگریز افسر تھا اور دوسرے سردار بہادر موہن سنگھ، جو کوہ مری راولپنڈی کے مالک تھے اور جن کی کوٹھی میں بعد میں ہمارے صدر مملکت چوہدری فضل الٰہی بھی رہتے رہے۔

بہرحال مجھے ریجیکٹ کر دیا گیا۔ اصل میں ضلع جہلم کے ڈی سی نے اپنی RECOMMENDATION میں یہ لکھ دیا تھا کہ میں شاعر بھی اچھا ہوں۔ اچھا بھلا انٹرویو چل رہا تھا کہ جب میرے شاعر ہونے کا علم ہوا تو مجھے ریجیکٹ کر دیا گیا۔ سردار موہن سنگھ نے البتہ سفارش کی کہ اس کا ڈیل ڈول اچھا ہے مگر کمیشن نہ ملا۔ انہوں نے مجھے رقعہ دیا کہ میں جمعدار کا کمیشن لے لوں۔ اس زمانے میں جمعدار کا عہدہ بھی بہت اہم ہوتا تھا بہرحال میں وہاں انٹرویو دینے دوسرے دن گیا۔ میرا تو خیال تھا کہ جنرل ہارٹلے خود میرا استقبال کرے گا۔ مگر وہاں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ امیدواروں کا ہجوم تھا۔ لوگ امیدواروں کے ساتھ اپنے فوجی میڈلوں سے لدے پھندے آئے تھے۔ اپنے پاس نہ میڈل تھا نہ کسی پرانے فوجی کی سفارش۔ گورکھا صوبیدار آیا۔ اندر لے جایا گیا۔ خوب ٹھوک بجا کر سارے جسم کو ننگا کر کے دیکھا اور پھر ریجیکٹ کر دیا۔ خرابی بتائی KNEES BAD یعنی گھٹنے بجتے ہیں۔ شاعر تھا، دل نے کہا چلو جو بجنے کی چیز ہے بجتی ہے۔

گرداوری چھوڑ چکا تھا۔ دلی چلا گیا۔ وہ ہمارے ایک رشتے دار ایک دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے انہوں نے اسسٹنٹ کی ملازمت دلوا دی۔ اسسٹنٹ کلرک سے ذرا بہتر ہوتا ہے۔ ملازمت وزارت دفاع میں ملی اس لئے اس کے صدقے شملے میں بھی رہے۔

۱۹۴۳ میں فوج کے تعلقات عامہ کے شعبہ میں چلا گیا وہاں کرنل مجید ملک تھے، جی ایچ کیو میں فیض احمد فیض تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔ جو کلکتے میں رہے پھر سنگاپور گئے اور وہاں سے فوج کے تعلقات عامہ کا اخبار "جواب" نکالا۔ مجھے قاہرہ روانہ کیا گیا لیکن واپس آنا پڑا۔ کیونکہ مجھ کو قاہرہ آتے دیکھ کر ہٹلر نے خودکشی کر لی۔ حکم ہوا سنگاپور جاؤ۔ ہم سنگاپور گئے۔ تین برس مشرق بعید میں رہے۔ وہاں مجھے ملایا، انڈونیشیا اور مشرق بعید کے ملکوں کے ادب کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ یہاں کے لوک گیت "جزیروں کے گیت" کے نام سے شائع ہوئے۔

یہ میری زندگی کا سنہرا دور تھا، جوان تھا، سب آسائشیں حاصل تھیں اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں نئی سوچ کے دروازے کھلے اور اس

حقیقت کا شعور حاصل ہوا کہ
"خدا کسی ملک کو فاتح قوموں کی آماجگاہ نہ بنائے"

اس زمانے میں ہی انڈین نیشنل آرمی کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سے بہت سے نظریاتی اختلافات کے باوجود ہندوستان کی آزادی میں اس کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیادیں جن عوامل نے ہلا دیں ان میں انڈین نیشنل آرمی کا بھی بڑا حصہ ہے۔

ملک سر فیروز خان نون اور خان بہادر احمد سعید نے اپنے اخبار "تعمیر" کی چیف ایڈیٹری کی پیش کش کی۔ میں نے یونیفارم اتاری۔ کمیشن سے استعفیٰ دیا، فوج سے ریلیف لے لی۔ اگر میں اس وقت فوج نہ چھوڑتا تو آج یقیناً" ریٹائرڈ جنرل ہوتا۔ اخبار کی چیف ایڈیٹری کے لئے لاہور آگیا۔ لیکن وہ اخبار نہ چل سکا۔ مجھے پالیسی کا اختیار دیا گیا تھا مگر اختلافات ہونے لگے۔ نون صاحب گورنر بن گئے اور اخبار میں ان کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ خان بہادر احمد سعید پروگریسو آدمی تھے۔ یہ اخبار پانچ چھ ماہ ہی چلا، مال روڈ پر دفتر تھا۔ اس اخبار میں میرے ساتھ شوکت تھانوی، عبدالرحیم شبلی، افضل صدیقی (روزنامہ امن کراچی والے)، اختر علی کے علاوہ مولانا نصر اللہ خان عزیز بھی تھے، جو اداریہ لکھا کرتے تھے۔

"تعمیر" لاہور کا قصہ تمام ہوا تو ہم نے راولپنڈی سے باد شمال کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ شاہجہان پور میں چراغ حسن حسرت اردو میں فوجی اخبار "جوان" نکالتے تھے۔ یہ پہلا اردو اخبار تھا جو مشرق بعید سے نکلتا تھا۔ میں نے اس اخبار اور مولانا چراغ حسن حسرت سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس کی Layout وہی تھی جو بعد میں "امروز" میں مولانا چراغ حسن حسرت نے سیٹ کی۔ روزنامہ "جوان" کے بارے میں دو ایک دلچسپ باتیں بتاتا ہوں۔ یہ اخبار لکھنؤ میں ایک چینی چھاپہ خانے میں چھپتا تھا۔ جنہیں اردو کا ایک حرف نہ آتا تھا۔ مگر کاپی جوڑنے والے ایسے باکمال تھے کہ مجال ہے کہ کوئی نقطہ، کشش یا جوڑ ٹوٹ جائے۔ بہرحال بادشمال کے منصوبے میں کئی دوست شامل ہوئے پیسے جمع کئے گئے ایک لاکھ ہزار روپے جمع ہوئے جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ بہرحال اخبار "باد شمال" کالموں میں تو نکلا لیکن چھپی صفحوں میں نکل نہ سکا۔ اشتہار بھی نکالے گئے تھے ہم خود کفیل بھی ہو سکتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اشتہاروں کی فوری ادائیگی نہ ہوتی تھی محدود سرمایہ ہمارے پاس تھا نہیں۔ بینکوں سے یا کسی اور سے قرضہ لینے کے بارے میں ذہن نے سوچا تک نہیں۔ تعمیر اور باد شمال اس علاقے میں تقریباً ایک ساتھ ہی نکلے تھے۔

کچھ خامیاں منصوبہ بندی میں ہو گئیں ڈیکلریشن ملنے میں خاصی دیر ہو گئی۔ چوہدری محمد حسین پولیس برانچ کے انچارج تھے انہوں نے کہا تھا بس جلد ہی ڈیکلریشن مل جائے گا مگر ایسا نہ ہوا ادھر ہم نے عملہ بھرتی کر لیا کاتب حضرات کو لاہور سے راولپنڈی لے آئے اخبار کا ڈیکلریشن ملنے میں تاخیر ہوئی اور خوش نویس حضرات اور دوسرے سٹاف کا خرچہ پڑتا رہا۔ بہرحال یہ اخبار چل نہ سکا۔ حالانکہ یہ لے آؤٹ اور کئی لحاظ سے ایک بہتر اخبار تھا۔ ہاں ایک بات اور اخبار کے نام "باد شمال" کو اکثریت نے ناپسند کیا یہ اعتراض ہوتا تھا کہ اس کا نام اخباروں جیسا نہیں ہے۔ لیکن ایک آدمی ایسا تھا، جس نے اس نام کو بے حد پسند کیا اور وہ تھے شیخ سر عبدالقادر۔ اس لئے کسی اعتراض کو دل پر نہ لگایا کہ شیخ سر عبدالقادر نے یہ نام پسند کیا تھا۔

اخبار بند کرنا پڑا۔ اس اخبار کی وجہ سے ہماری معیشت بہت مضطرب ہوئی جمع پونجی تھی وہ ہاتھ سے نکل گئی۔۔۔ میں پھر اپنے کاموں میں آگیا۔

چھوٹی موٹی اور مقامی سیاست میں ہمارے خاندان کا اثر و رسوخ مسلم تھا۔ اگرچہ ہم خود اسمبلی میں نہ جاسکتے تھے لیکن ہماری مدد کے بغیر کوئی دوسرا بھی اسمبلی میں نہ جاسکتا تھا۔ جانے جی میں کیا آئی کہ ہم [illegible] کے عام انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے میدان میں آگئے۔ ہمارا حریف مسلم لیگ کا ایک امیر آدمی تھا۔ انتخابات ہم ہار گئے۔

[illegible] میں میجر کے رینک پر ریٹائر ہوا اور اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے کے شعبہ تعلقات عامہ کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا اس سے پہلے بھی میں ڈیپوٹیشن پر ترقیاتی ادارے میں آچکا تھا میں نے اس شہر اس دارالحکومت کو اپنی آنکھوں سے بنتے دیکھا۔ پہلی اینٹ رکھنے سے آباد ہونے تک۔ اسلام آباد میرے سامنے بنا۔ اسلام آباد کے علاقوں کے نام میرے تجویز کئے ہوئے ہیں۔ آب پارہ، ...... کچھ

ہوئے نام ہیں۔ اسلام آباد خوبصورت شہر ہے۔ لیکن یہ شہر اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود ملک کی غربت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس شہر کی تعمیر۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بھی بنی۔ ہم شہر بنانے والوں سے گزارشات کرتے رہے کہ اس کے ماسٹر پلان میں آٹھ آٹھ نو نو کنال کے پلاٹ کیوں رکھے گئے ہیں چھوٹے چھوٹے پلاٹ بھی رکھیں۔ تاکہ متوسط طبقے کے لوگ بھی یہاں آسکیں۔ میرے خیال میں تو دس پانچ مرلے سے بڑا کوئی پلاٹ اسلام آباد میں ہونا ہی نہیں چاہئے تھا۔ تب ہمیں دلائل دیئے جاتے تھے کہ ہم نے اس شہر کو تجارتی شہر نہیں بنانا ہے۔ جب کہ اب اسلام آباد ایک بڑا تجارتی شہر بن چکا ہے۔"

نیشنل سنٹر کی ملازمت کے بعد دو سال ایسے بھی آئے جب بے کار رہا۔ پھر وزارت شمالی علاقہ جات میں مشیر تعلقات عامہ کے عہدے پر دو برس تک کام کیا۔ یوں افغان مہاجرین سے براہ راست تعلق قائم ہوا۔ یہ بھی ایک بہت بڑا تجربہ ثابت ہوا۔ افغان مہاجرین کی دیکھ بھال ہماری ذمے داری تھی۔ یوں ان کے جذبے کی آنچ کو بھی قریب سے محسوس کرنے کا موقع ملا۔ افغان مہاجروں میں سے کسی نے مجھے یہ نہ کہا کہ وہ واپس نہیں جائے گا۔ سب اپنے وطن واپس جانے کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ وہ زیادہ تر سرحدوں کے قریب رہنا پسند کرتے تھے تاکہ جلد اپنے وطن واپس جاسکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ افغان مہاجرین کی وجہ سے پاکستان کئی مسائل سے دوچار ہوا۔ ان کی وجہ سے کئی سماجی اور اقتصادی مسائل بھی پیدا ہوئے۔ بعض افغان مہاجرین نے فائدے بھی بہت اٹھائے لیکن میں نے کچھ ایسے مناظر بھی دیکھے جو بہت تکلیف دہ ہیں۔

پشاور کے ناصر باغ کیمپ میں میں نے ایک بہت معمولی اور چھوٹے سے خیمے میں افغانستان کے ایک سابق وزیر اعظم آغائے شفیق کی بیوہ کو انتہائی کسمپرسی کے عالم میں رہتے دیکھا۔

ایک اور واقعہ بھی ہے۔ جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی ایک ادبی اہمیت بھی ہے۔ بلوچستان میں میں افغان مہاجرین کے ایک خیمہ کیمپ میں گیا۔ وہ لوگ خیموں میں رہنا تکلیف دہ مانتے تھے۔ میں نے انہیں محض تسلی دینے کے لئے تقریر جھاڑ دی کہ پہلے لوگ تو خیموں میں ہی رہنا پسند کرتے تھے ان کے بادشاہ اور بھی خیموں کو ترجیح دیتے تھے۔ میں نے ظہیر الدین بابر کی مثال دی کہ وہ خیمے میں رہتا تھا۔

وہاں ایک چودہ پندرہ برس کا افغان لڑکا تھا۔ اس نے برجستہ کہا۔

"آغائے شفیق کیا خیمہ شاہی کیا خیمہ راہی"

میرے محترم کہاں شاہی خیمہ اور کہاں مسافر کا خیمہ۔

میں تو دنگ رہ گیا' لاجواب ہو گیا۔ اس جواب میں جو صداقت ہے اسے جس شعری پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اس نے مجھے افغان لڑکے کی ذہانت سے بھی بے حد متاثر کیا۔

میں اکادمی ادبیات سے بھی وابستہ رہا ہوں۔ جب اکادمی نے اپنا رسالہ "ادبیات" نکالنے کا فیصلہ کیا تو میری خدمات حاصل کیں۔ پروفیسر پریشان خٹک چیئرمین تھے اور غلام ربانی آگرو' ڈائرکٹر جنرل بعد میں جناب شفیق الرحمن بھی اکادمی کے چیئرمین رہے۔ وہ اتنے بڑے ادیب ہیں کہ کسی اکادمی کے لئے یہ اعزاز تھا کہ وہ اس کے چیئرمین تھے۔ ایسے شخص کی موجودگی کسی ادارے کو زینت کدہ بنا دیتی ہے۔

اکادمی ادبیات کے حوالے سے میں کہتا ہوں کہ ابھی تک اکادمی اپنی سمت متعین نہیں کر سکی۔ اکادمی کو زیادہ ٹھوس علمی کام کرنا چاہئے۔ اسے ایسی کتابیں شائع کرنی چاہیں جنہیں عام ناشر شائع کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ پھر اہل قلم کا تبادلہ صرف ملک ہی سے ہو رہا ہے۔ جب کہ دنیا کے دیگر ملکوں اور بالخصوص اسلامی ملکوں کے ساتھ ہمارا ادبی رابطہ زیادہ گہرا اور مستحکم ہونا چاہئے۔ اکادمی کے ذریعے ہم اپنی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو پھیلا سکتے ہیں۔

کاش۔۔۔ میری دعا ہے کہ اس ملک میں اہل قلم کو سرکاری سرپرستی کی احتیاج نہ رہے۔

ویسے بھی اہل قلم کانفرنس کی اہمیت ہی کیا رہ گئی ہے۔ بے نظیر وزیر اعظم تھیں تو ان کے پاس اہل قلم کانفرنس کے لئے وقت نہیں تھا اور اب وزیر اعظم نواز شریف کے پاس بھی وقت نہیں۔۔۔

میں اپنے خدا کا۔۔۔ شکر گزار ہوں' جتنا شکر کروں کم ہے۔ اس نے مجھے عزت دی' مجھے صلاحیتوں سے نوازا' [illegible] شعر کے' [illegible] ہیں' مجھے بہتے مضامین خانے اور صحافتی قلم بھی ملے۔

اسلام آباد ٹیلی ویژن سے ایک باقاعدہ پروگرام "آپ کا خیمہ" کے نام سے بھی کیا تھا اور وہ پروگرام بہت کامیاب رہا۔ [illegible] نے [illegible] رکھا۔ [illegible] نے ہمارے نام سنوارے۔۔۔ ہم خیمے جا رہے ہیں۔

ضمیر جعفری

شفیق الرحمٰن

مقبول شاعر، نثر نگار، کالم نویس اور بذلہ سنج ضمیر جعفری کو کون نہیں جانتا؟ شاید وہ معدودے چند نہ جانتے ہوں جو جان بوجھ کر کسی کو بھی نہیں جاننا چاہتے۔ ضمیر ان خوش نصیب ادیبوں میں سے ہیں جنہیں اردو ادب کی شاندار روایات کے مطابق مشہور ہونے میں کم از کم نوے برس نہیں لگے، بلکہ محض پینتیس سال کے "قلیل" عرصے میں ہی مقبولیت حاصل کر لی۔ (یہ اور بات ہے کہ مغربی ممالک میں مصنفین یہ مرحلہ مہینوں میں طے کر لیتے ہیں)۔

ضمیر جو اب فری لانسر ہیں پی۔این۔سی اسلام آباد کے ڈی۔ڈی۔جی بننے سے پہلے سی۔ڈی۔اے کے ڈی۔پی۔آر تھے جہاں انہیں ٹی۔کیو۔اے بھی ملا تھا۔

اس سے پہلے آپ فوج میں میجر رہے اور اس سے قبل روزنامہ "باد شمال" کے نامہ نویس، مدیر، مالک یعنی سب کچھ "باد شمال" سے پہلے شرق بعید میں (جسے FAR EAST کہا جاتا تھا اور غالباً اب بھی کبھی کبھی کہا جاتا ہے) تعلقات عامہ (اور شاید تعلقات خاصہ) کے سلسلے میں قیام رہا۔ سنگاپور میں جناب چراغ حسن حسرت کی رفاقت میسر تھی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران خاصے اچھے دن دیکھے (ویسے آج کل بھی کچھ وقت برا نہیں گزر رہا ہے)

اس سے پہلے یعنی سمندر پار جانے کی تیاری میں لاہور کے صحافتی گوشوں میں نہایت عمدہ کوچہ گردی کی۔ چنانچہ صحافت سے ہماری ایسی CONFRONTATION رہی کہ صحافت اور ضمیر دونوں مستفیض ہوئے۔ اور اس سے ذرا پہلے اسلامیہ کالج لاہور کے اولڈ بوائے بننے میں مصروف رہے۔ کالج کے رسالے کریسنٹ کو بھی آلاٹ کیا۔

اس سے قبل [illegible] میں وہیں گریجویٹ بن چکے تھے۔ آپ کا کلام ممتاز رسائل میں چھپنے لگا تھا اور لاہور کی مشہور ادبی شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوا کرتیں۔ چونکہ بی۔اے سے پہلے ایف۔اے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا کیمبل پور سے ایف۔اے کی سند لینی پڑی۔ وہاں بھی کالج میگزین کی ادارت نے پیچھا نہ چھوڑا یا VICE VERSA اور ایف۔اے کے لئے دسویں جماعت جہلم سے پاس کی گئی۔ وہاں آپ نے پہلی مرتبہ شعر کہنے شروع کئے اور سکول کے ملک الشعراء تصور کئے جاتے۔ چونکہ میٹرک کیا تھا اس لئے مڈل کلاس میں بھی پاس ہوئے ہوں گے۔ جس کے لئے پرائمری جماعتوں میں پڑھے ہوں گے۔ ان سے قبل لازمی طور پر آپ چھوٹے سے بچے ہوں گے اور موجودہ عمر یعنی 60 ناٹ آؤٹ کے مطابق (جس میں ایک بھی LEG بائی یا OFF بائی شامل نہیں) سنہ انیس سو کچھ کے کسی مہینے میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ پیدائش سے پہلے البتہ آپ گمنام تھے۔

ضمیر جیسے منجھے ہوئے ادبی VETERAN کو طرح طرح کے تجربے ہوئے ہیں اور یہ تجربے اب تک جاری ہیں۔ یہاں تو تنقید برائے تنقید کے سلسلے میں فقط یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ضمیر کا فنون لطیفہ کی جانب کچھ

اور رفعت دکھائی چاہیے تھی۔ یعنی وہ کم از کم تجریدی آرٹ ہی سیکھ لیتے اور کچھ نہیں تو انشائیے۔ (جو کچھ بھی وہ ہوتے ہیں) لکھنے کی کوشش کرتے۔ فن موسیقی کی محبت میں انہیں وائلن یا طبلہ بجانا چاہیے تھا۔ انسانیت کی نبض شناسی کے لئے انہوں نے حکمت کا شغل کیوں نہیں اختیار کیا؟ قدرت کی عظمت، رفعت، وسعت وغیرہ سے آشنا ہونے کے واسطے وہ اونچے پہاڑوں کی مشہور چوٹیاں سر کرنے والی پارٹیوں کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟ خوشنما نظاروں سے بھرپور نظاروں سے فیضان حاصل کرنے کے لئے انہوں نے محکمہ جنگلات میں ملازمت کیوں نہیں کی؟

اور یہ کہ اب تک ایم اے (اردو) کا امتحان تک نہیں دیا۔ بلکہ ابھی تک شاید خضاب بھی نہیں لگایا...... اور کچھ نہیں تو محض اس شعر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کہ۔

دشمن زندگی است موئے سفید
موئے دشمن سیاہ باید کرد

وغیرہ وغیرہ

راقم الحروف ایسی باتوں کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

جہلم کے کوہستانی خطہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لئے نظم، نثر اور گفتگو میں والہانہ خطیبی ہے۔ آپ کے بزرگ نامی گرامی مرشد تھے۔ کچھ قناعت، بے نیازی اور۔

ہو گی بار گراں بندہ نوازی تیری
تو نہ کرتا اگر احسان تو احساں ہوتا

کی دولت ملی ہے۔

شروع شروع کی شاعری سنجیدہ تھی۔ لیکن قسمت...... اور ضمیر جعفری...... کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ اب یہ حال ہے کہ تحریر ہو یا تقریر کچھ بھی نہ ہو...... ہر وقت طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے ہیں۔

لیکن جب کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو ایک طرف ہو کر چپکے سے سنجیدہ شاعری کر جاتے ہیں۔ ان کی صحت مندی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ سپورٹس مین رہ چکے ہیں اور کھلاڑیوں کا مشہور مقولہ ہے کہ:۔

ONCE A SPORTSMAN ALWAYS A SPORTSMAN

آپ کا اپنا ایک شعر ہے۔

تیرے کوچے میں یوں کھڑا ہوں میں
جیسے ہاکی کا گول کیپر ہوں

یعنی جہاں اپنے نظر انداز کئے جانے کا سرسری طور پر گلہ کیا ہے وہاں اپنی اہمیت بھی جتا دی ہے کہ گول کیپر چاہے تو اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ ٹیم کو ہرا سکتا ہے۔ کئی برس ہوئے راولپنڈی میں ویسٹ انڈیز اور مقامی ٹیم کا میچ ہو رہا تھا اس میں فاسٹ بولر ہکس ہے حد فاسٹ بولر HALL کے نابرتوڑ حملوں کا فی البدیہہ ذکر سٹیڈیم میں بیٹھ کر یوں کیا۔

شور اٹھا کہ ہال آتا ہے
کھیل کا انتقال آتا ہے
ہال سے ہال آتی ہے
ہال سے پہلے حال آتا ہے

یا تو یہ اشعار ہال نے سن لئے (اور سمجھ لئے) یا ہماری ٹیم نے ضمیر کا اندازہ درست نکلا۔ اگلے ہی برس لاہور کے ٹیسٹ میچ میں یکے بعد دیگرے تین کھلاڑیوں کو آؤٹ کرکے نہ صرف "ہیٹ ٹرک" کیا بلکہ کھیل کا مکمل طور پر انتقال بھی کر دیا۔

ضمیر کی شاعری کیسی ہے؟ نثر کی کیا خصوصیات ہیں؟ صحافتی تحریروں کا درجہ کیا ہے؟

خوبیاں بیان کرنے لگوں (جو کرنا چاہتا ہوں) تو فطری انکساری کی وجہ سے شاید ضمیر اسے پسند نہ کریں۔ اور اگر الٹی سیدھی تنقید کرنے کی کوشش کروں (جو بالکل نہیں چاہتا) تو پڑھنے والوں کو اچھی نہیں لگے گی۔ لہٰذا باکسنگ کے ریفری کی طرح یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس CORNER میں ضمیر ہیں اور دوسرے کارنر میں ان کا قاری...... اور SECONDS یعنی دیگر لوگ) ادھر ادھر ہو جائیں...... اب قاری جانے اور ضمیر۔ ضمیر کے مجموعوں میں جو کچھ پہلے اور آخری صفحے کے درمیان ہے وہ مقبول ہے اور جو بین السطور ہے وہ اور بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔

- تلوار کی اہمیت کا تو میں قائل ہوں۔ آزادی اور سلامتی کے لئے تلوار کا سہارا لازمی ہوتا ہے لیکن میں تلوار کی آزادی کا حامی نہیں ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ قلم کی طاقت بھی جنگ ختم کرنے کے استعمال کرنی چاہیے۔ جنگ کے لئے نہیں۔ سید ضمیر جعفری

"ست رنگا"

ضمیر جعفری

۱۹۹۳ء

ضمیر کا ایک بار واضح کریں کہ ضمیر مزاحیہ کلام کی وجہ سے بڑا ہے شخصیت کی وجہ سے نہیں۔
آپ کہیں گے کہ میاں تم خود تو نہیں تو کہانیاں کہنے والا ہے تجھے کیسے پتا چلا۔ کہ ضمیر کلام کی وجہ سے بڑا ہے۔
یہ بھی سن لیجئے۔ ہوا یوں کہ ریڈیو پاکستان نے مجھے حکم دیا کہ مزاحیہ پروگرام کرے۔ چار سال میں وہ پروگرام چلاتا رہا۔ یہ پروگرام کمان مرکب تھا

ممتاز مفتی

ضمیر کا خاکہ لکھنے کی میری آرزو بہت پرانی ہے کئی بار لکھنے بیٹھا۔ قلم اٹھایا رک گیا۔ چل نہ سکا۔ حیران ہوا۔ سوچا ضمیر پر لکھنے میں ہچکچاہٹ کیوں۔ عجیب بات ہے لیکن ایسی بھی کیا۔

پھر سوچتے سوچتے ایک روز بھید کھل گیا۔ پتہ چلا کہ ہچکچاہٹ اس لیے ہے لاشعوری طور میں ضمیر کو بڑا مانتا ہوں اور چونکہ ذات کا چھوٹا ہوں اس لیے بڑوں پر بات کرنے سے گھبراتا ہوں۔

صاحبو بڑے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ میں صرف علمی ادبی بڑوں کی بات کروں گا ایک بڑے وہ ہوتے ہیں جو بڑے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ وہ بڑے ہیں۔

ایسے بڑے موجود تو ہیں پر وہ اپنا پتہ نہیں دیتے خود کو پتہ نہیں دیتے دکھائی نہیں دیں گے۔ سیانے کہتے ہیں مٹکی آدھی بھری ہو تو چھلکاتی ہے شور مچاتی ہے بھری ہو تو گمن ہو کر بیٹھ رہتی ہے۔ دوسرے بڑے وہ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ جانیں کہ وہ بڑے ہیں۔ اس قسم کے بڑے آج کے ادب و فن میں عام ملتے ہیں۔ کراچی اور لاہور ایسے بڑوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ضمیر جعفری تیسری قسم کا بڑا ہے۔

تیسری قسم کے بڑے تذبذب کا شکار ہیں۔ بچی کے دو پالنے لگے ہیں پتہ نہیں۔ ہوں جنہیں ہوں؟ نہیں نہیں ہوں۔

ان کی کیفیت جلتی بجھتی حسین سائین جیسی ہے۔ جل گئی تو ہوں بجھ گئی تو نہیں ہوں۔ شک و شبہ کا آرا چلتا رہتا ہے۔

ضمیر جعفری اس بات کا محتاج ہے کہ کوئی اس کے کمرے کی کنڈی بجائے اور ضمیر جعفری آپ بڑے ہیں۔ یہ خوشخبری سن کر ضمیر کا دل پشوری ہو جاتا لیکن دو گھنٹے کے بعد پھر شک و شبہات ابھرتے ہیں۔ حسین سائین بجھ جاتی اور اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔ صاحبو اب ایسا کون ہے جو ہر دو گھنٹے کے بعد ضمیر کمرے کی کنڈی بجاتا رہے۔

جس میں اردو کے جانے پہچانے مزاح نگار شاعروں کی نگارشات پیش کی جاتی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ ضمیر کے کلام کی سطر سطر ہنستی ہے۔ بات ایسی لطافت سے قاری تک پہنچتی ہے کہ پھبتی نہیں۔ گدگداتی ہے فرحت کا احساس چھوڑ جاتی ہے۔

اس پروگرام میں مجھے پتہ چلا کہ ضمیر جعفری مزاحیہ شاعری میں بڑا ہے۔ بہت بڑا۔ مزاحیہ شاعروں کے راستے میں ایک سخت مقام آجاتا ہے بہت جلد انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ ہمارے ہاں قاری اور سامع میں مزاح کی لطافت کا احساس بہت کم ہے۔ لیکن طنز واہ واہ ہوتی ہے لہٰذا وہ فن کو چھوڑ کر واہ واہ کی جانب چل پڑتے ہیں۔

مثلاً انور مسعود بڑے طمطراق سے آیا تھا خالص مزاح کا پیارا ساتھ لایا تھا لیکن جلد ہی واہ واہ نے اپنا جادو جگایا اور وہ طنز کی جانب چل پڑا۔ اور اب طلدار بجلی کی طرح گھلا ہوا جین کمپیئرنگ کے قبرستان میں دفن ہو چکا ہے۔ خدا مغفرت کرے خالص مزاح نگار تھا۔

محمود سرحدی میں مزاح کی بڑی حس تھی ہم امیدیں لگائے بیٹھے تھے لیکن اسے سیاست کھا گئی۔ دلاور فگار نظموں کے بھنور میں الجھ گیا ضمیر جعفری واحد مزاح نگار شاعر ہے جس نے طنز کی واہ واہ کو نظر انداز کر دیا۔ ضمیر طنز کرے بھی تو وہ اتنی لطیف ہوتی ہی کہ پھبتی نہیں۔

لیکن تبصرے میں کیا کر رہا ہوں۔ میں فن کے ایوان میں کیسے آگھسا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے میرا موضوع تو شخصیت ہے۔

شخصیت پر بات کرو تو مشکل یہ ہے کہ ضمیر جعفری کا فن جس قدر لطیف ہے اس کی شخصیت اتنی ہی کثیف ہے۔

یوں سمجھ لیجئے کہ ضمیر کی شخصیت میں اللہ میاں نے کچھ ہوا رکھا ہے وہ چھان پھٹک کے مربے جیسی ہے۔ لیکن شاید آپ چھان پھٹک کے مربے سے

واقف نہ ہوں۔ آپ نے حکیم کے نسخے کا پڑیا ضرور دیکھا ہوگا۔ اس میں نسخہ ہوتا ہے عناب ہوتے ہیں ریشہ خطمی ہوتا ہے۔ استوخودوس ہوتا ہے۔ گل گل ہوتا ہے ابریشم ہوتا ہے پتہ نہیں کیا کیا ہوتا ہے۔

ایسے ہی ضمیر میں ایک سیدھے ایک صوفی ہے ایک بزرگ ہے ایک بذلہ ہے ایک رند ہے ایک مے خوار ہے' ایک درویش ہے' ایک خسیس ہے ایک ہی منصور ہے ایک زن مرید ہے' ایک چنڈو ہے۔ ساتھ ہی ایک مسٹر بھی ہے۔ وہ مسٹر جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ۔

پتا کھلی نالی کھلی ٹھس کھلے کالر کھلا
کھلے کھلے اڑہ کھلے میں کیسی مسٹر کھلا

ضمیر کی شخصیت کے متعلق پورے طور پر وہ لوگ جانتے ہیں جو اس کے قریب رہتے ہیں۔

دوستو دعا کرو کہ ضمیر جعفری کے قریب رہنے کا کسی صاحب قلم کو موقع نہ ملے۔ ملے مل گیا سمجھو وہ پھانسی لگ گیا۔ پرانے زمانے میں ایک مثل مشہور تھی۔

کوڑے سے کسی نے پوچھا تھا تو کیا چاہتا ہے۔ تیرا کوڑا پن دور ہو جائے یا سب لوگ کوڑے ہو جائیں۔

کوڑا بولا میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ کوڑے ہو جائیں۔

صاحبو جان لو کہ ضمیر وہ کوڑا ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ سب لکھنے والوں کو مزاح کا عارضہ لاحق ہو جائے۔ جو صاحب قلم اس کے قریب ہو جاتا ہے ضمیر اس کے دل میں یہ خوش فہمی پیدا کر دیتا ہے کہ "تم میں مزاح کی بڑی صلاحیت ہے"

جناب والا میں ناقد تو نہیں ہوں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مزاح ایک خودرو پودا ہے وہ اگایا نہیں جاتا گملے میں لگایا نہیں جا سکتا۔

صاحبو ہر نثر نگار کی تصنیف میں کہیں کہیں یہاں وہاں' مزاح پیدا ہو جاتا ہے لیکن اگر نثر نگار کو گمان پیدا ہو جائے کہ وہ مزاح نگار ہے اور اسے لانا مزاح پیدا کرنا ہے تو وہ بیچارہ پھانسی لگ جاتا ہے۔

صاحب قلم کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے اس کا انہیں احساس نہیں۔ یہ مشکل بالکل ایسی ہے جیسے آج کل کی خوبصورت ماڈرن لڑکی کو درپیش ہے۔

"آج کل کی ماڈرن لڑکی تو اپنی [illegible] اپنے انداز و اطوار سے زیور ایک خاوند کو پھنسا لینا آسان کام ہے لیکن پھر اسے زندگی بھر Keep کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست کی شادی ہو گئی میں اسے ملنے گیا میں نے حسب دستور اس سے پوچھا میں نے کہا تو نے کیسی بیوی لی ہے تجھے

کہنے لگا یار میں تو مارا گیا۔

میں نے پوچھا کیا ہوا۔

بولا۔ میری بیوی اتنی حسین ہے کہ میں اسے ہاتھ لگاؤں تو وہ میلی ہو جاتی۔

میں نے پوچھا۔ پھر

بولا پھر کیا میں تو اس کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہوں

ایک سال کے بعد مجھے پھر اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا دیکھا کہ جھاڑو ان کو تھا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شوہر پھنسا لینا کچھ مشکل نہیں لیکن پھر اسے عمر بھر Keep کرنا۔ پھانسی لگ جانے کے مترادف ہے۔ یہی مشکل لکھنے والے کی ہے۔ ایک جاذب توجہ کتاب لکھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ پھر اپنے معیار اور زندگی بھر قائم رکھنا پھانسی لگ جانے کے مترادف ہے۔

ضمیر نے کئی ایک صاحب قلم نثر نگاروں کو مزاح نگاری کی خوش فہمی دے انہیں پھانسی پر لٹکا دیا۔

جس طرح ضمیر کی شخصیت ست رنگی ہے ایسے ہی اس کا فن ہمہ رنگ ہے۔ ضمیر سنجیدہ کلام لکھتا ہے مزاحیہ کلام لکھتا ہے رزمیہ نظمیں لکھتا ہے جیسے بہت بڑا مجاہد ہو۔ لی گیت دیکھو تو لگتا ہے جیسے پاکستان کے میں گھل گھل کر پتہ نہیں کیا بن چکا ہو۔ سوہنیے ---- پنجاب کے اردو میں ایسا ترجمہ کرتا ہے جیسے ابھی ابھی خرقہ ولایت وصول کر کے گورمکھی کی لکھی ہوئی منظوم نظموں کا ترجمہ ایسے کرتا ہے کہ اصل شرما جا

بہت پرانی بات ہے سردیوں کا موسم تھا ان دنوں موسم سرما میں مری پر برف طاری ہو جایا کرتا تھا۔ اتفاق سے مری کے ایک ہوٹل میں چند شعرا اکٹھے وہاں کسی نے کوک شاستری کلام چلا دیا۔ اس رات ضمیر جعفری نے شاستری کلام کی وہ وہ بلند زبانیں ماریں کہ پنڈت کوکا شرم سے پانی پانی ہو میں نے اپنے شاستر میں یہ عظیم نسخہ جات کیوں نہ درج کیے۔

اس روز مجھے پتہ چلا کہ ضمیر نے کیا بہت کچھ ہے مجھے پایا بہت کم ہے۔

ضمیر کی شخصیت کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ایک آرام طلب فرد ہے۔ میری دانست میں وہ زندگی بھر عشق و شق کے جھنجھٹ میں نہیں پڑا۔ شوق صرف صبر آزما ہی نہیں مشقت طلب بھی ہے۔ کون کھڑکیاں دیواریں پھلانگے۔ رت جگے کرے۔ وہ مشہور زمانہ شعر حضرت میر نے لکھا تھا کہ

ہو گا کسی دیوار کے سائے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اس [illegible] سے ضمیر کا [illegible] شاستری کلام [illegible]

ست اشتیاق حسین ہومیو ڈاکٹر ایک روز مسکراتا ہوا میرے پاس آیا کہنے
ہم تو خالص الو کے پٹھے ہیں۔
کیا وہ کیسے۔
ساری عمر اللہ تلے میں گزار دی۔
ہوا کیا۔ کھل کر بات کر۔
۔ آج میں نے ایک حقیقی دانشور کی زیارت کی ہے سبحان اللہ بیٹس
آلو ہم
دکھا ہوا کیا۔
آج میرے مطب میں ایک مریض آیا۔ اس نے اپنے مسئلے بتلائے۔
نے کہا گھبرایئے نہیں۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں صرف حرارت غریزی کی کمی
ں آپ کو ایک ٹانک لکھ کر دیتا ہوں۔
وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔
ڈاکٹر صاحب مجھے کیوں مشقت میں ڈالتے ہیں آپ۔ کیا آپ کے پاس
دا نہیں جو میں اپنی بیوی کو کھلا دوں۔

لگتا ہے ضمیر ایسا ہی غیر منطقی آرام طلب ہے۔ یہ بھی ہمارے لئے Blessing in Disgu ہے ضمیر زعفرانی نثر بھی لکھتا ہے۔ مزاح لکھتا کالم لکھتا ہے۔ خاکے لکھتا ہے۔ نثر رواں انداز میں لکھے جاتا ہے۔ اگر وہ کر توجہ اور محنت سے نثر لکھتا تو ہم نثر نگاروں کے لیے مشکل پڑ جاتی۔
ے ایک دوست نے مجھے ضمیر کا خاکہ لکھتے ہوئے دیکھا کہنے لگا یار۔ میں تو شاعری نہیں مانتا۔
ے میں نے حیرت سے پوچھا۔
لا ضمیر میں شاعرانہ بات ہی نہیں۔
طلب

ہاں۔ شاعر لوگ اپنا نام اچھالنے کی نسبت دوسرے شعرا اور ادیبوں میں ے نکالنے کے زیادہ شوقین ہوتے ہیں۔ ضمیر نے آج تک کبھی دوسروں کی نہیں کی۔ ضمیر کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ کوئی اسے گالی نہیں دیتا۔ نہ وہ کسی پالتا ہے نہ جدوجہد کرتا ہے۔ البتہ اسے اپنا نام اچھالنے کا بہت شوق سے شک ضمیر کو اپنا نام اچھالنے کا بہت شوق ہے لیکن اسے نام اچھالنے کا فن آتا۔ سمجھتا ہے کہ کام سے نام اچھلتا ہے۔ لکھے جاتا ہے لکھے جاتا ہے اندھا دھند کام کئے جاتا ہے جیسے کام کھل جا سم سم ہو۔
نام اچھالنے کا فن کسی کسی کو آتا ہے ہر کسی نے اپنا طریق واردات کر رکھا ہے۔ منٹو بڑی محنت سے گالی کھاتا تھا

میں نے توجہ طلبی کے لئے بڑا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ ہمارے لاہور کے دو بھائیوں نے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کا شغل اپنا رکھا ہے۔ مقصد عیب جوئی نہیں بلکہ توجہ طلبی ہے انہوں نے در پردہ آپس میں سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ ہم احمق ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ دو لوٹ ہے۔ دراصل انہوں نے یہ بھید پالیا ہے کہ پراپیگنڈا کبھی حق نہیں ہوتا۔ صاحبو سلف پروجیکشن بہت بڑا آرٹ ہے آپ نے اس خاتون کی کہانی سنی ہوگی جس نے اپنی نئی ہیرے کی انگوٹھی دکھانے کے لیے اپنے گھر کو آگ لگا دی تھی اور دور دور کرنے والوں کو انگوٹھی دکھا دکھا کر کہتی تھی سب کچھ جل گیا صرف یہ انگوٹھی بچ گئی ہے۔ سلف پروجیکشن کے لیے لوگوں نے بڑے منفرد طریقے ایجاد کئے۔ کرشن چندر جیسا بہت بڑا پیرو کار تھا لیکن زندگی بھر غریب نواز کا ڈھونگ رچائے رکھا جوش نے تفاخر کو اپنائے رکھا۔ میرا جی نے بیراگی کا سوانگ بھرا۔
ضمیر بہت گھوما پھرا شخص ہے۔ دنیا کے تمام ممالک میں گھوم پھر آیا ہے۔
کہا جاتا ہے کہ ضمیر سیاحت پسند ہے۔
مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میری دانست میں یہ سیاحت پسندی نہیں بلکہ لذت آوارگی ہے۔ اس کی ساری زندگی لذت آوارگی کی شاہد ہے پہلے کلرکی کی پھر فوج میں بھرتی ہو گیا فوج سے مستعفی ہونے کے بعد گاؤں میں آکر الیکشن لڑا سودا بازی کی اور پھر سے فوج میں پبلسٹی آفیسر بن گیا۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد سی ڈی اے میں پبلک ریلیشن افسر بن گیا پھر افغانستان کے ڈائریکٹوریٹ میں پبلسٹی افسر بن گیا وہاں سے فارغ ہوا تو اکادمی میں ایڈیٹری جا سنبھالی۔ یعنی ساری زندگی یہاں سے اڑا وہاں جا بیٹھا کی مصداق گزار دی۔ اگر کسی ایک جگہ جم کر بیٹھ جاتا تو اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے پتہ نہیں کس عہدے پر پہنچتا۔
ملک ملک گھومنے پھرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گھر میں گھروالی کا راج ہے۔ وہاں پابندیاں ہیں۔ ضمیر کو جی حضور کا رول ادا کرنا پڑتا ہے لہٰذا آوارگی کے بغیر چارہ کار نہیں۔
ضمیر نے حال ہی میں اپنی کہانی قومی ڈائجسٹ میں شائع کی ہے۔ بڑے دلکش انداز میں اپنی طبعی آوارگی کا اظہار کیا ہے۔
قدرت نے اس فن کار کو رولنگ سٹون کا خاصہ اس لئے عطا کر دیا تاکہ پاؤں نہ جم جائے۔ اس کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو اور وہ MOSS اکٹھی نہ کر سکے۔ چونکہ MOSS فنکار کی دشمن ہے وہ زنگ آلود کر دیتی ہے۔
اسے آوارگی اس لیے بخشی گئی کہ اس کی حساسیت میں نت نئے چراغ روشن ہوں۔ صاحبو اللہ جسے چاہے عزت عطا کرے۔

سید ضمیر جعفری

شخصیت اور شاعری

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

۴

بعض شخصیات اس قدر دل آویز ہوتی ہیں کہ ان کے بارے میں گفتگو کرنے کی خواہش بھی اپنے بارے میں گفتگو کرنے کا بہانہ معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے اکثر و بیشتر حضرات کو دوسروں کے بہانے اپنے اوپر گفتگو کرتے دیکھا ہے۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے کہ سخن فہمی اور طرفداری میں مقابلہ ہونے لگتا ہے۔ میں اس اہل علم کی محفل میں ضمیر جعفری صاحب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اپنے معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ اہل دانش کی محفل ہے اور اس لئے میں ضمیر جعفری صاحب کی تفہیم کے سلسلہ میں اپنی لغزشوں کے لئے پیشگی معافی کا خواستگار ہوں۔

صاحبو! اس وقت ضمیر جعفری صاحب اپنی زندگی کے اسی سال کے سنگ میل سے صرف کچھ ہاتھ ہی دور ہیں۔ ان کا اصل نام سید ضمیر حسین شاہ ہے۔ سلطان العارفین سید محمد شاہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاید اسی لئے پوٹھوہار کے علاقہ کی ایک بڑی گدی کے پیروکاروں کے لئے خصوصی توجہ کے مرکز رہے ہیں۔ میں ان کا ایک عرصہ سے نیاز مند ہوں۔ گزشتہ دس سال کے اندر اندرون ملک ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ اور بیرون ملک سفر کے دوران انہیں قریب سے دیکھا ہے علاوہ ازیں میں ان کے بہت ہی قریبی دوستوں کا قریبی دوست ہونے کی وجہ سے اور سب سے زیادہ ڈاکٹر طارق محمود مرزا سے قربت کے باعث ضمیر جعفری صاحب پر لکھی گئی کتاب "چمن" پڑھی۔ لیکن اس کتاب کو نہ بھی پڑھوں تو میں ان کی کتاب زمستاں کی تاریخ اور جغرافیہ سے کسی قدر واقف ہوں۔ ممکن ہے کہ ضمیر جعفری کی شاعری کے سخن فہم ہونے کا دعویٰ نہ کرسکوں لیکن میں ان کی شاعری کا طرفدار ضرور ہوں۔ میں ان کی شاعری کو اس قبیلہ کی شاعری سمجھتا ہوں جو ترقی پذیر ملکوں میں منافقت، ریاکاری، بے انصافی اور حسول سے قیم دوری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہی ہے۔

ضمیر جعفری کی شاعری اور شعری روایت ایک شاعر خود آگاہ اور دنیا آگاہ فرد کی شاعری اور شعری روایت ہے ان کی مزاحیہ شاعری دراصل ہماری زندگی کی ناہمواریوں اور قابل طنز رخ کو براہ راست بے نقاب کرتی ہے اور ان کی سنجیدہ شاعری زندگی کی بصیرت افروز اقدار سے محبت کی شاعری ہے۔ شاعری کا ایک حصہ نشتر زنی کرتا ہے تو دوسرا حصہ شب غم کے ستائے ہوؤں کو سکون بخشتا ہے۔ شاعری خواہ سنجیدہ ہو یا مزاحیہ مال کار خود کو پانے کی جستجو ہی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خود کو پانے کا عمل بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ انگلیاں فگار ہوتی ہیں اور پاؤں میں آبلے بھی پڑتے ہیں۔

سید ضمیر جعفری میرے بزرگ دوست ہیں اور مجھے ان کے ساتھ اپنی دوستی پر ناز ہے۔ گزشتہ دس سال میں شاید ہی ایسا کبھی ہوا ہو کہ وہ کراچی آئے ہوں اور میری ان کے ساتھ بے تکلفی کی نشستیں نہ رہی ہوں۔ ناروے اور انگلستان کے سفر کے دوران خوش قسمتی سے سیاست، شاعری، شعری روایت، کلاسیکی شاعری، جدید شاعری، ترقی پسند شاعری، نئی شاعری اور مغربی شاعری کے موضوعات پر گفتگو کے اتنے مواقع فراہم ہوئے کہ میں یہ بات بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ضمیر جعفری ایک پرخلوص اور باضمیر شاعر ہیں۔ وہ ناکامیوں اور آنسوؤں کے ساتھ بھی کھ

ا کے بغیر نہیں رہے لیکن اس قدر عمرگی کے ساتھ کہ یہ حضرات
مترائے بغیر نہ رہ سکے۔ آخر وہ کون سا احتجاج ہے جو ان کی ظریفانہ
ی میں نہیں ملتا اور وہ کون سا رخ ہے جو ان کی سنجیدہ شاعری کو
عہد کی عصری حسیت کا آئینہ دار نہیں بناتا۔

میں سب سے پہلے ضمیر جعفری کی شخصیت کے اس بنیادی رخ کی
۔ آتا ہوں جو علم و ادب سے بہت گہرے لگاؤ کا آئینہ دار ہی نہیں
بہت اچھا تعارف بھی ہے۔ جنگ عظیم دوم کے دوران برٹش انڈین
ا کے ایک افسر کی حیثیت سے انہوں نے ملایا اور انڈونیشیا کی
ب کی اہم صنف سخن پنتون سے بغظ امروزی کے لئے ملائی زبان
رس حاصل کی RAFFLES LIBRARY جو سنگاپور کے بانی کے نام پر
ئی تی تب اس میں موجود پنتون کی کتابوں کو کھنگال کر رکھ دیا!
اوپر ملایا کے لوگوں سے ملائی بولنے کی شرط عائد کی اور بقول مولانا
، حسن حسرت، سید ضمیر جعفری نے "پنتون" جمع کرنے اور
، اردو کا لباس پہنانے میں جس محنت اور جانکاہی سے کام لیا ہے
ت وہی لوگ واقف ہیں جو اس کے ساتھ ملایا میں موجود تھے۔
نے خود دیکھا ہے کہ کسی دکان پر کھڑے ہیں۔ دکان دار سے مول
ل رہے ہیں۔ وہ انگریزی سمجھ سکتا ہے لیکن انہیں اصرار ہے کہ
زبان ہی میں گفتگو کریں گے اس لئے "بہابچا ہر گاہبا" کئے جا رہے
جہاں کوئی فقرہ نہیں سوجھتا وہاں اشاروں سے مطلب ادا کر دیتے
۔۔ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ اردو زبان میں اس سرزمین کے
ا ایک کتاب بھی موجود نہیں ہے اور یہ کام ضمیر جعفری ہی نے کر
ا کہ اردو زبان کو ملائی زبان کی شاعری کے بہترین رخ سے متعارف
۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ملائی اور انڈونیشی اور اردو زبانوں کی
سیلی جینیس کو قریب لانے میں سید ضمیر جعفری نے اہم کردا
ہے تو زیادہ غلط نہ ہوگا۔

ضمیر جعفری انگریزی ادب اور بالخصوص انگریزی مزاح کے رسیا ہیں
انہوں نے اسکاٹس DOGGERELS BALLADS اور نظموں کو اردو کے
پ میں ڈھالنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی
، شاعری میں زبان وبیان کے ساتھ برتاؤ میں اینگلو سیکسن
ANGLO SAX خوبی یعنی کثافت شاید جابجا ملتی ہے۔ وہ الفاظ کو بہت

بہت دانائی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ان کی نثر اور نظم بہت تہہ دار
ہوتی ہے ایک مدت سے میں اپنی رائے پر قائم ہوں کہ ضمیر جعفری جس
قدر اچھے انسان ہیں اسی قدر اچھے نثار اور اچھے شاعر ہیں۔ حالانکہ
خاصی تعداد میں بہت واجبی ذہانت کے حامل، حاسد اور تنگ نظر افراد بھی
اچھی نثر اور اچھی شاعری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔
معلوم ہوتا ہے کہ کمال فن ایسے لوگوں کو اچھا انسان بنانے کے کام سے
صاف مکر گیا۔

ضمیر جعفری اردو کے ممتاز مزاح نویس ہیں۔ ان کی خوش قسمتی یہ
رہی ہے کہ مولانا چراغ حسن حسرت ان کے رہنما اور پرنصار میں قیام
پذیر اردو کے ہم عصر مزاح نگاروں کا پورا قافلہ ان کے ساتھ رہا انہوں
نے ایک طرح سے اس ملک میں مزاح اور اچھے مزاح کی ضرورت کا
احساس دلایا جب ہمارے صاحبان اقتدار اپنی کج فہمیوں اور ناعاقبت
اندیشانہ حرکات کی وجہ سے پوری قوم کو ہدف استہزاء بنائے ہوئے
تھے۔ مزاح نگار آمروں سے مزاح کے ہتھیاروں سے لڑتا ہے جب کہ
طالع آزما خوشامد اور چاپلوسی کی لوری دیتے رہتے ہیں۔ میرے خیال
میں ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری نے وہی کام کیا جو حبیب جالب
اور بعض دوسرے شعراء کی احتجاجی شاعری نے۔ ضمیر جعفری کی پراعتماد
شخصیت کا مزاح (HUMOUR) بھی پراعتماد ہے ان کا مزاح مشاہدہ اور
مطالعہ کے سنجوگ سے تخلیق پاتا ہے۔ نظریہ سازش یا سنار کی دکان میں
زیوارت کے بجائے الفاظ اچھالنے سے نہیں۔ اس لئے ان کے مزاح کا
عمل فی الفور ہوتا ہے اور وہ "آنا فانا" میں جزو ذہن بن جاتا ہے۔

میں ضمیر جعفری کی خوبصورت نثر و نظم کا دلدادہ ہوں۔ خوبصورت
نثر کا بطور خاص۔ خوبصورت نثر بھی کیا چیز ہے۔ تحریر کیا گیا ہے کہ
انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ آسکر وائلڈ کی خوبصورت نثر کی گرویدہ تھیں۔ وہ
آئرستانی ادیب کو ڈنر پر مدعو کرنا چاہتی تھیں لیکن آسکر بھی بلا کا طناز
تھا۔ ہر دعوت کا جواب جھلاہٹ سے دیا کرتا۔ کہلا بھیجا کہ میں انگلستان
کی ملکہ کے ساتھ اس وقت تک ڈنر نہیں کروں گا جب تک انگلستان
فرانس سے نیپولین کے حملے کی معافی نہیں مانگ لیتا۔ اور وہ صرف
اس لئے کہ فرانسیسی خوبصورت نثر لکھتے ہیں اور انگریز اس میدان میں
فرانسیسیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیسے لوگ تھے اور کیا ملک تھا۔

جہاں یہ گزرے ممکن تھے۔ ہمارے وقت کے بیشتر بقول خود "روحانی لوگ" بھی انکساری کی دولت سے محروم ہیں اور اپنے ذہنوں میں جاگیردارانہ FEUDAL انداز رکھتے ہیں اگر یہ لوگ پرائیویٹ جیل خانے نہیں بنا پاتے تو پھر پرائیویٹ جہنم ہی سہی۔ لطف یہ ہے کہ یہی حضرات ان جنتوں کے دروازوں پر سنتری بنے بیٹھے نظر آتے ہیں۔

ضمیر جعفری صاحب سے پہلی ملاقات کراچی کے مشہور و معروف صنعت کار و بزنس مین جناب فضل حسن مرحوم کے گھر ہوئی تھی۔ وہ محمد حسن عسکری، سلیم احمد مشتاق احمد یوسفی اور ضمیر جعفری کا اکثر ذکر کیا کرتے۔ ان سب سے ہی بہت محبت کرتے تھے ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو اچھی تحریروں کے نمونے سنایا کرتے تھے۔ ضمیر جعفری نے اپنے مضمون میں میرے اور ان کے مابین خلوص اور دوستی کے رشتہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جسے زیر بحث لانے کا یہ موقع نہیں۔ ضمیر جعفری صاحب سے میں نے فضل حسن مرحوم کے معیار پسندیدگی کی بابت سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ اچھی نثر پتنگ کی کینہ کی طرح کبھی ادھر اور کبھی ادھر نہیں ہوتی بلکہ اچھی شاعری کی طرح دل پر راست اثر کرتی ہے۔ ضمیر جعفری کی نثر کا بھی یہی حال ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ سادہ، سلیس، برمحل اور موثر نثر لکھنے پر اس طرح قادر ہیں جس طرح وہ دوسروں کی دلگیری کے کام میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ وہ مزاح لکھتے وقت بعض مزاح نویس حضرات کی طرح کسی محاذ جنگ پر نہیں ہوتے بلکہ آپ سے سرگوشی کے لہجہ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ آپ کے ہنسنے کی رفتار ان کی آہستہ خرامی سے ہمیشہ زیادہ رہتی ہے۔ ضمیر جعفری کے مزاح کے لئے کسی قسم کے فلیچرازم (FLETCHERISM) کی ضرورت نہیں۔ آہستہ آہستہ چبانے کے عمل کی ہے۔ تاکہ مزاح [illegible] کے بند کا لقمہ منہ تک پہنچتے پہنچتے دودھ کی طرح سیال بن چکا ہو۔

ضمیر جعفری متعدد نثری کتابوں کے مصنف ہیں۔ بطور خاص "اڑتے خاکے" اور "کتابی چہرے" وغیرہ وغیرہ لیکن یوں لگتا ہے کہ وہ ابھی تک اپنی "نثر" کی انفرادیت سے واقف نہیں ہیں ورنہ وہ بدستور ابھی تک تذبذب کا شکار نہ ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر جعفری نے انگریزوں سے عسکری تربیت کے ساتھ ساتھ نثر کے بارے میں ROYAL SOCIETY کی مخصوص ہدایات پر بھی عمل کیا ہے وہ جس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس علاقے کے بیشتر ادباء اردو زبان کو بہت ذمہ داری اور [illegible] کے ساتھ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔"

میرے خیال میں ادیب شاعروں کو اپنے قارئین کے ساتھ ساتھ مریدوں کا حلقہ اثر رکھنا چاہئے۔ لیکن ضمیر جعفری صاحب کو ہمیشہ اپنے ہی حال میں مست دیکھا وہ مریدوں کی عقیدت بھی کمال کفایت ہی سے وصول کرتے رہے۔ وہ ایک درد مند انسان ہیں اور اس لئے ان کی نثر و نظم دونوں میں بڑی برکت ہے۔ انہوں نے بہت لکھا ہے لیکن اگر وہ کچھ بھی نہ لکھتے تو صرف "جزیرے کے گیت" "مافی الضمیر" "اڑتے خاکے" اور "کتابی چہرے" ہی ان کی عظمت منوانے کے لئے کافی قرار پاتے۔ انہوں نے میاں محمد بخش کی "سیف الملوک" کا بھی منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ ایک نثری ترجمہ ہمارے دوست شفیع عقیل نے بھی کیا ہے اور اسے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے ایک ترجمہ "من کے تار" کے نام سے سلطان العارفین سید محمد شاہ کی ابیات کا ترجمہ ہے اور یہ دونوں بڑے کام ہیں۔ لیکن اگر مجھ سے کہا جائے کہ ان کی شاعری کا بنیادی وصف کیا ہے تو میں صرف اس قدر کہوں گا۔ جذبہ کی تہذیب، خوبصورت تمثیل گری، روایت اور روایات کا حسین امتزاج، مزاحیہ شاعری سے نقد زندگی اور سنجیدہ شاعری سے تہذیب زندگی کا ایک ایسا مہتم بالشان کام جو ساٹھ سال سے جاری ہے وہ بلاشک و شبہ اردو زبان کے ایک بہت ہی ہمہ جہت اور ہرفن مولا ادیب ہیں۔ وہ اور ممتاز مفتی بہ اعتبار عمر سینئر ادباء میں شمار ہوتے ہیں۔ ممتاز مفتی صرف فکشن سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ ضمیر جعفری صحافت، ادب، شاعری، کالم نویسی، ڈراما، خاکہ نگاری وغیرہ وغیرہ کے شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ اس عمر میں بھی ماشا اللہ مشاعروں کی صعوبتیں جھیلتے ہیں اور اپنے میزبانوں کو ان صعوبتوں کے بارے میں پتہ تک نہیں ہونے دیتے۔ ضمیر جعفری کی ذات اور ان کی شاعری میں بھی یک گونہ مطابقت ہے۔ اس ذات میں شاعری کی کارفرمائی۔۔۔ اور ان کی شاعری میں ذات کی کرشمہ سازی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ میں نے جعفری صاحب کو بہ حیثیت قاری، سامع، دوست، علم اللسان کے طالب علم، علاقائی زبان کے ادب کے رسیا، لوک ادب کے شناور اور ملکی معاملات کے بارے میں ایک CONCERNED CITIZEN کے طور پر دیکھا ہے:

میں نے ضمیر جعفری کو اب سے پہلے ان کی شاعری کے ذریعہ جانا مجھے یوں لگا کہ وہ شاید میرے ہی لئے شاعری کر رہے ہوں۔ ایک طرف مجاز، جذبی اور فیض احمد فیض کی شاعری تھی اور دوسری طرف ضمیر جعفری صاحب کی ہلکی پھلکی شاعری۔ کیا میں اعتراف کروں کہ مجھے مزاحیہ شاعری محض اس لئے پسند تھی کہ فیض کی رومان پرور فضا کے بعد ذہن یکسر مختلف صورت حال کا بھی طالب ہوتا ہے۔ ضمیر جعفری صاحب میری نوجوانی کے دنوں میں اپنی شاعری کے بارے میں میری تشنگی بجھا نہ پائے اس حقیقت میں کیا کلام ہے کہ جب میں اسکول میں تھا تو اس وقت شاعری محض شاعری نہ تھی زندگی گزارنے کا ایک انداز بھی تھی۔

جب میں نے ہم عصر شعراء کا مطالعہ شروع کیا تو میری نظر سے ضمیر جعفری کی شعری تخلیقات بھی گذریں۔ مجھے ان کی زبان اور بیان میں ایک انفرادیت نظر آئی اور وہ یہ کہ ان کی زبان باریک سے باریک مفہوم ادا کرنے پر قادر تھی ان کا سب سے پہلا شعری مجموعہ جو میری نظر سے گزرا وہ "جزیروں کے گیت" تھا۔ مغربی شاعروں کے اثرات کے تحت نظم معریٰ، نظم آزاد، اور سونیٹس SONNETS وغیرہ سامنے آئیں۔ بعض تخلیقات پسند بھی آئی تھیں۔ سید ضمیر جعفری نے کمال ہی کر دیا۔ کیا یہ کمال نہیں کہ انگریزوں کی فوج کا ایک نوجوان افسر جاپانی فاشزم سے مقابلہ کرنے ملایا پہنچے اور وہاں سے ملائی زبان کی صنف سخن پنتون (PONTON) سے اس قدر متاثر ہو کہ وہ وہاں سے یہ صنف اپنے ساتھ لے آئے اور اسے اردو کے قالب اور پنجابی ماہیا کی روح میں اس طرح ڈھال دے کہ پنتون کا تعلق پوٹھوہار سے قائم ہو جائے میرے خیال میں تو اس کمال پر انہیں جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے اس کتاب پر چراغ حسن حسرت نے مقدمہ تحریر کیا تھا اور یہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ ضمیر جعفری کی پنتون کے تراجم نے مجھے اس قدر قائل تعلق پیدا ہوا کہ انہوں نے اکثر و بیشتر پنتونوں کی سطروں میں سے ایک کو پوٹھوہار کے گیتوں میں موجود "گٹکاوٹ" کو شامل کر کے ایک نئی زندگی دے دی۔

ضمیر جعفری نے پنتون کو پنجاب کے ماہیا اور سرحد کے ٹپوں کے رنگ سے ملا دیا اور کمال ہی کر دیا۔ پنتون اور ماہیا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پنتون کے چار مصرعوں میں وزن یا قافیہ کی شرط نہیں ہوتی۔ ماہیا کا پہلا مصرعہ آدھا ہوتا ہے جس کا دوسرے مصرعے سے بہ اعتبار معنی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ضمیر جعفری متعدد شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ "کارزار"۔ "لہو ترنگ"۔ "جزیروں کے گیت"۔ "مافی الضمیر"۔ "میرے پیار کی زمین"۔ "ولایتی زعفران" (انگریزی نظموں کا ترجمہ) "من میلہ"۔ "متاع ضمیر"۔ "[illegible] وطن"۔ مسدس بدحالی وغیرہ وغیرہ مجھے ان کی طویل مثنوی "بکر شیر خان" بطور خاص پسند ہے۔ یہ SCOTISH BALLAD کے انداز میں تحریر ہوئی ہے اور اگر کسی اردو مثنوی پر انگریزی بلکہ SCOTISH اثرات دیکھنے ہوں تو "بکر شیر خان" کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔

حیرت ہے کہ ضمیر جعفری زیادہ تر ایک مزاح نگار شاعر اور نثار کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ جب کہ وہ ایک سنجیدہ غزل گو بھی ہیں۔ مثلاً ان کے مندرجہ ذیل اشعار۔

پایانِ شب سراغِ سحر بھی نہیں رہا
منزل تو کیا ملے گی سفر بھی نہیں رہا
یہ بے حسی کہ جیسے رگوں میں لہو نہ ہو
یہ بے دلی کہ موت کا ڈر بھی نہیں رہا
جس میں کبھی کبھی اتر آتی تھی چاندنی
دیوار میں وہ روزنِ در بھی نہیں رہا
قندیلِ آرزو کے بغیر آرزو ضمیر
دستار گر گئی ہے تو سر بھی نہیں رہا

سید ضمیر جعفری برطانوی اور پاک افواج کے لئے سید ضمیر حسین شاہ کے نام سے ملازمت کے رجسٹر پر رہے۔ وہ جنگ عظیم اول کے زمانے میں چار پانچ سال کے بچے تھے اور اب ۸۲ سال کے جوان ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ان کا جوانی اور بڑھاپے سے نکاح ہو چکا ہے۔ ناآسودگی کے احساس سے تعمیر و تشکیل کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ سید ضمیر جعفری کی شاعری اس مخصوص احساس ناآسودگی کی شاعری ہے۔

مجتبیٰ حسین

(دہلی)

بہ یادِ ضمیرؔ جعفری

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ان دنوں ہماری زندگی میں دو کاموں کی بڑی گنجائش نکلتی چلی جارہی ہے۔ پرسہ دینا اور دوسروں کی مزاج پرسی کرنا۔ بعض اوقات تو ایک ہی دن میں دو دو پرسوں اور تین تین پرسیوں (مزاج کی) کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ماشاءاللہ پچھلے دنوں تو ہم نے بھی دوستوں کو یہ نادر موقع عطا کیا کہ وہ ہماری مزاج پرسی کرسکیں۔ دو ایک دن تو لوگ بڑی نیک نیتی کے ساتھ ہماری مزاج پرسی کرنے کو آتے رہے لیکن بعد میں انجان بن گئے تو خود ہمیں اپنی مزاج پرسی کروانے کے لئے احباب کے پاس جانا پڑا۔ آپ نے اس حسینہ کا قصہ تو ضرور سنا ہوگا جس نے اپنے ایک چاہنے والے سے پوچھا تھا "اگر تم میرے پاس آؤگے تو میرے لئے کیا لاؤ گے اور اگر میں تمہارے پاس آؤں تو تم مجھے کیا دوگے"۔

ہم حیدرآباد سے چلنے لگے تو یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ ہمارے کرم فرما اردو کے مایہ ناز ادیب اور مستند مزاحیہ شاعر حضرت ضمیر جعفری بھی اس دنیا سے چل بسے۔ اس اطلاع سے ایک ہفتہ پہلے حسن چشتی کی معرفت یہ خبر "سیاست" میں شائع ہوئی تھی کہ ضمیر جعفری کی حالت تشویشناک ہے اور وہ موت سے آخری جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔ 83 سالہ ریٹائرڈ میجر ضمیر جعفری پیشہ کے اعتبار سے فوجی تھے لیکن ہمیں اندیشہ تھا کہ اس بار وہ موت سے جنگ ہار جائیں گے۔ ضمیر جعفری سے ہمارے پندرہ برس پرانے شخصی مراسم تھے۔ اسی کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ان سے دلی میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ پھر 1986 میں جب زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے حیدرآباد میں عالمی طنز و مزاح کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں شرکت کے لئے وہ پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے حیدرآباد آئے تھے۔ معظم جاہی مارکیٹ کے ہوٹل سمپورنا میں جہاں اب میڈی کیر اسپتال قائم ہے ان کا قیام رہا تھا۔ وہ لفظوں کو کچھ ایسی چابکدستی کے ساتھ استعمال کرتے تھے کہ لفظوں کے معنی و مفہوم کے سارے گوشے نہ صرف روشن ہوجاتے تھے۔ بلکہ نئے گوشے بھی نکل آتے تھے۔ ضمیر جعفری نے بیسویں صدی کے سارے اہم واقعات اور حوادث کو نہ صرف جھیلا تھا بلکہ اپنی تخلیقات میں انھیں برتا بھی تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ اپنے پیر و مرشد مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ برما کے محاذ پر تعینات تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت ان کے لئے استاد، فلسفی، دوست، رہنما، پیر و مرشد سب کچھ تھے۔ مولانا کے کئی

حسین رازان کے سینہ میں دفن تھے جن کا اظہار وہ اپنے دلچسپ پیرایہ میں کچھ اس طرح کرتے تھے کہ راز پوری طرح افشاء ہونے کے باوجود راز ہی برقرار رہتا تھا۔ مولانا کو گذرے ہوئے برسوں بیت چکے تھے لیکن ضمیر جعفری یا حسین راز ان کے سینہ میں دفن تھے جن کا اظہار وہ اپنے دلچسپ پیرایہ میں کچھ اس طرح کرتے تھے کہ راز پوری طرح افشاء ہونے کے باوجود راز ہی برقرار رہتا تھا۔ مولانا کو گذرے ہوئے برسوں بیت چکے تھے لیکن ضمیر جعفری اپنی تحریروں میں ہردم ان کی یاد کو تازہ کرتے رہتے تھے وہ سچ مچ جاندیدہ آدمی تھے بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ وہ غیر منقسم ہندوستان اور اس کے ملے جلے کلچر کی ایک انمول نشانی تھے۔

ضمیر جعفری کو نظم اور نثر دونوں پر بے پناہ قدرت تھی اور وہ اپنے پیچھے دو درجن سے زیادہ تصانیف چھوڑ گئے۔ اپنے گہرے علمی تبحر، عملی زندگی کے وسیع تجربے اور اپنے مزاج کی بوقلمونی کے باوجود وہ عجز و انکسار کا ایک ایسا عجیب و غریب پیکر تھے کہ ہم جیسے چھوٹے لوگ ان سے مل کر یا تو خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے تھے یا پھر غلط فہمی میں۔ وہ ہمیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ہمیں طنز و مزاح کا لال قلعہ اور چارمینار وغیرہ تو کہتے ہی تھے ایک بار تو "تاج محل" بھی کہہ دیا تھا۔ ۱۹۸۷ء میں ہم پاکستان گئے تو ان سے اسلام آباد میں کئی ملاقاتیں رہیں جہاں وہ اکاڈمی ادبیات پاکستان کے رسالہ کے مدیر تھے۔ برسوں وہ راولپنڈی سے ایک مزاحیہ رسالہ "اردو [illegible]" کے نام سے نکالتے رہے جس کی مجلس ادارت میں ان کے علاوہ کرنل محمد خان، ڈاکٹر صفدر محمود اور سلطان رشک شامل تھے۔ ہمارے مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر بڑی محبت سے اپنے رسالہ میں چھاپتے رہتے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں جدہ کے ہند پاک کی جشن مزاح میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ہمارے بارے میں کچھ ایسی فراخدلی کا مظاہرہ کیا کہ بعد میں ہمیں ان سے کئی بار پوچھنا پڑا کہ انھوں نے اپنی تقریر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے کیا وہ ان سے سچ مچ متفق ہیں۔ ضمیر جعفری شاعری کے علاوہ خاکہ نگاری سفر نامہ نگاری اور کالم نگاری میں بھی اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کی تحریر اور تقریر دونوں میں کچھ جادو ہوا کرتا کہ جو کوئی ان کی باتیں سنتا ان کے سحر میں ڈوب کر سرشار اور نہال ہو جایا کرتا تھا۔ ایک زمانہ میں حفیظ جالندھری کے ارادتمندوں میں بھی شامل رہے بلکہ ایک ہی دفتر میں کام بھی کیا۔ بعد میں کچھ ایسا ہوا کہ ضمیر جعفری کا تبادلہ کسی دور دراز مقام پر ہو گیا۔ طویل عرصہ بعد جب حفیظ جالندھری سے ان کی ملاقات ہوئی اور ضمیر جعفری نے اپنا تازہ کلام انھیں سنایا تو حفیظ صاحب نے کہا "میاں! تمہارے کلام میں بڑی گہرائی، معنویت اور تہہ داری پیدا ہوتی جارہی ہے" اس پر ضمیر جعفری نے بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیا "حضور! یہ سب آپ سے دور رہنے کا فیض ہے" ان کی ایک مشہور غزل کا ایک مصرعہ بھی اب یاد آرہا ہے

غزل میں جتنی باتیں ہیں مسلمانوں کی باتیں ہیں

ان کی ایک تازہ غزل کے مطلع کو بڑی شہرت ملی ہمارے مسائل کو آسان کر

گلشن کو یارب مسلمان کر

ضمیر جعفری آخر دن تک سرگرم عمل رہے۔ لاس اینجلس (امریکہ) کے ہفتہ وار اخبار "اردو لنک" میں ان کی وہ ڈائری بھی چھپ رہی تھی جو انھوں نے برصغیر کی تقسیم سے پہلے لکھی تھی۔

سید حسین احمد زاہدی
40/1، جان نگر روڈ، کلکتہ۔

سید ضمیر جعفری کی ظرافت

سید ضمیر جعفری کی رحلت سے اردو کے مزاحیہ ادب کا ایک درخشندہ باب بند ہوگیا۔ وہ اردو کے ایک اہم طنز و مزاح نگار تھے۔ ان کا تعلق اس سنہرے دور سے ہے جب اردو کے ظریفانہ ادب پر شباب آیا ہوا تھا۔ اہم مزاح نگاروں کی ایک کھیپ اردو ادب میں طنز و مزاح کے گل و بوٹے کھلا رہی تھی۔ مجید لاہوری ، سید محمد جعفری ، حاجی لق لق ، کنہیالال کپور ، عاشق محمد غوری ، ظریف جبلپوری ، پنڈت ہری چند اختر ، فرقت کاکوروی ، صوفی تبسم جیسے اہم مزاح نگاروں کا تعلق اسی دور سے ہے۔

سید ضمیر جعفری نے لاہور کے اسلامیہ کالج سے تعلیم حاصل کی۔ طالب علمی سے ہی آپ کی طبیعت ظرافت کی طرف مائل تھی۔ مزاح نگاروں کی تحریروں کے مطالعے نے آپ کے اندر بھی لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ آپ نے کئی تخلیقات سپرد قلم کیں جو اس دور کے اہم پرچہ "شیرازہ" میں چھپیں۔ آپ شیرازہ کے مستقل لکھنے والوں میں تھے۔ بعد میں آپ کی تحریریں دوسرے اہم رسائل میں بھی جگہ پانے لگیں۔ آپ کے دلکش اور نکھرے اسلوب نے جلد ہی قبولِ عام کی سند حاصل کی اور مختصر عرصے میں آپ کا شمار اردو کے اہم اور نمائندہ مزاح نگاروں میں ہونے لگا۔

ضمیر جعفری کی تحریروں میں طنز کی چبھن کے ساتھ بلا کی دلکشی ملتی ہے۔ ان کی نظریں بڑی تیز اور مشاہدہ کافی گہرا تھا۔ وہ علمیت اور ذکاوت میں بے مثل تھے۔ انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ سیاسی بے اعتدالیوں کو طشت از بام کیا ہے۔ سماجی خرابیوں اور گراوٹ کا عکس بھی ان کی شاعری میں ملتا ہے ہر طرح کی سماجی و سیاسی ناہمواریوں کو انہوں نے بیدریغ اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اردو کے ایک مزاح نگار شاعر شیخ نذیر نے ضمیر جعفری کی خوبیاں کا احاطہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

خاندانی سیّدوں کی آل ہیں ، میجر ضمیر
نیک ہیں ، خوش بخت ہیں ، خوشحال ہیں میجر ضمیر

شاعر و افسر بلند اقبال ہیں میجر ضمیر
اس لئے کچھ فیٹ ہیں کچھ بال ہیں میجر ضمیر
آپ اپنے وقت کے ملا نصر الدین ہیں
شعر فکر آفریں ہیں، چٹکلے نمکین ہیں
ان کی رنگ آرائیوں سے محفلیں رنگین ہیں
قہقہوں کا دائمی بھونچال ہیں، میجر ضمیر
شعر خوانی میں ترنم کا عجب انداز ہے
لے میں کافی تیکھی ہے، گونجتی آواز ہے
خود توانا ہیں، پہ ساز در گلو ناساز ہے
سر ملاتے ہیں مگر بے تال ہیں، میجر ضمیر

سید ضمیر جعفری کے یہاں سنجیدہ ظرافت ملتی ہے۔ عامیانہ باتوں اور لفظوں کی بازی گری سے انہوں نے ہمیشہ پرہیز کیا۔ وہ الفاظ کی شعبدہ گری کے بجائے خیالات کی جادوگری سے ظرافت کے جادو جگاتے ہیں اور ہمارے لئے لطف و انبساط کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ انہوں نے اگر کبھی الفاظ کی مدد سے مزاح تخلیق کیا بھی ہے تو معیار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے

گرد نے ملتان تک اس طرح گردانا مجھے ۔۔۔ میری بیوی نے بڑی مشکل سے پہچانا مجھے
ایسی قسمت کہاں ضمیر اپنی ۔۔۔ آ کے پیچھے سے ہتا کرے کوئی

ضمیر جعفری کے مزاح کا معیار بہت بلند ہے۔ وہ عامیانہ پن اور پھکڑپن سے ہمیشہ اپنا دامن بچاتے رہے ان کے یہاں طنز میں بھی بہت حد تک سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ ان کے کلام میں کہیں کسی طرح کی تلخی یا تیکھا پن نہیں ہے۔ کلام میں شوخی سے زیادہ لطیف مزاح کی آمیزش ہوتی ہے جس سے سنجیدگی اور ظرافت کا ایک حسین امتزاج جنم لیتا ہے۔

شوق سے لخت جگر نور نظر پیدا کرو ۔۔۔ ظالمو! تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو

وہ سب کو تھوڑا شربت دیدار دیتے ہیں ۔۔۔ مگر مصروف ہیں، اتوار کے اتوار دیتے ہیں

ان کی نظم "وبائے الاٹمنٹ" کا ایک بند دیکھئے۔

لوکل مہاجرین پہ تازہ نکھار دیکھ ۔۔۔ مونچھوں کے تاؤ دیکھ نظر کی بہار دیکھ
موٹر پہ اڑ رہا ہے وہ تلا کمہار دیکھ ۔۔۔ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
اے مرحبا یہ حسن ادائے الاٹمنٹ

ضمیر جعفری کا مشاہدہ بہت تیز ہے یہی وجہ ہے کہ سماج کے مضحک پہلوؤں پر ان کی نظر فوراً پڑ جاتی ہے اور وہیں سے ان کو اپنی شاعری کا خام مواد ملتا ہے۔ ان کی زود اثر طبیعت اور ظریف فطرت ہر قسم کے مضحک پہلوؤں کو شاعری کا روپ دینے میں بڑی چابکدستی دکھاتی ہے۔ ان کی ذہانت، طباعی اور قادر الکلامی کا ہر شخص قائل تھا۔ طبیعت و ذکاوت کے ساتھ باریک بینی کی فطرت نے ان کے فن کو جلا بخشی۔

"نسوانی فطرت" کا ضمیر جعفری نے بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا۔ بسیار گوئی عورت کی فطرت ہے۔ دو عورتیں اگر ایک جگہ ہوں تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چپ نہیں رہ سکتیں۔ ان کے درمیان جب گفتگو چھڑتی ہے تو سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے اور دنیا جہاں کے معاملات زیر بحث آتے جاتے ہیں۔ بسیار گوئی، گرم گفتاری، طعن و تشنیع اور شکوہ شکایت عورت کی کمزوری ہے۔ جس کا وہ برملا اظہار کرتی رہتی ہے۔ ضمیر جعفری نے عورتوں کی فطرت کا عمدہ نمونہ "عورتوں کی اسمبلی اور وزارت" میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے ایک فرضی اسمبلی کا منظر پیش کیا ہے جہاں نمائندگی کا حق صرف عورتوں کو ہے لیکن جو وہاں عوامی مسائل پر گفتگو کرنے کے بجائے ذاتی پریشانیوں کو زیر بحث لاتی ہیں۔ اس نظم کے ذریعہ ضمیر جعفری نے نسوانی فطرت کے بعض مخصوص رجحانات اور کمزوریوں پر چوٹ کی ہے۔ چند بند اس نظم کے پیش خدمت ہیں:

یہ شانوں پہ زرکار آنچل اچھالے ادھر سے ادھر مست زلفوں کو ڈالے
میاں اور بچے خدا کے حوالے حسین ہاتھ میں نرم قاتل سنبھالے
مباحث میں یوں گرم گفتار ہیں سب
کہ بس لڑنے مرنے پہ تیار ہیں سب

بوا کو تو دیکھو نہ گھٹنا نہ پاتا فقط اک غرارہ فقط ایک چھاتا
نہیں کچھ بھی نامِ خدا آتا جاتا بحث ہاتھ میں جیسے دھوبن کا کھاتا
ادھر اصغری بھڑ گئی اکبری سے
ادھر طفل رونے لگے کیلری سے

یہ آواز شور و شغب بولتی ہیں یہ انداز غیظ و غضب بولتی ہیں
نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں یہ جب بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں
شہادت کی انگشت اقبال پر ہے
کبھی ناک پر ہے کبھی گال پر ہے

کھچوں میں گوٹے کناری کی باتیں بہو کی کفایت شعاری کی باتیں
پڑوسن کی پرہیزگاری کی باتیں غرض ہر بیاہی کنواری کی باتیں
بلنیڈ اور ٹائی پہ "کٹ" ہو رہی ہے
مگر عطر و رنگم کی ہٹ ہو رہی ہے

ضمیر جعفری نے ایسے مسلمانوں کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے جو عبادت کو ظاہرداری بناکر پیش کرتے ہیں تاکہ دوسروں کے دلوں پر ان کے تقوی و پرہیزگاری کا سکہ بیٹھ جائے۔ نماز، روزہ اور دیگر عبادات کا مقصد انسان کے اندر کسرِ نفسی پیدا کرنا ہے لیکن اب عبادت بھی دکھاوے کی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔

اے میری بیوی! مرے رستے سے کچھ کترا کے چل اے مرے بچو! ذرا ہشیار! میں روزے سے ہوں
شام کو بہر زیارت آتو سکتا ہوں مگر لوٹ کرلیں دوست، رشتے دار، میں روزے سے ہوں
تو یہ کہتا ہے بہ لحن تر کوئی غزل میں یہ کہتا ہوں برخوردار! میں روزے سے ہوں

موجودہ دور کی قوالی کو بھی ضمیر جعفری اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ صوفی اور اہل نظر ہمیشہ قوالی کے شائق رہے ہیں۔ قوالی میں بلند پایہ کلام اور سر و تال کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جب محفل سماع میں قوال اپنے ساز و آواز کا جادو جگاتے ہیں تو سننے والوں پر وجد طاری ہوجاتا ہے اور وہ بے خودی و مستی میں ڈوب جاتے ہیں۔ بدلتے وقت کے ساتھ فن قوالی پر بھی زوال آگیا۔ اب پہلے جیسی شائستگی، متانت، موزوں کلامی اور ساز و آواز مفقود ہے۔ آج کے قوال لفظوں کو توڑ مروڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کی بے سری آوازیں اور فن موسیقی سے ناواقفیت سننے والوں کو بے لطف کردیتی ہے۔ ضمیر جعفری نے ایسی ہی ایک قوالی کی محفل کا مذاق اپنی نظم "کل شب جہاں میں تھا" میں اڑایا ہے۔ چند بند پیش خدمت ہیں۔

گانے والے راگ میں ٹھمراگ کے استاد تھے
عقل میں "ہم زلف" تھے اور شکل میں ہمزاد تھے
تال میں بھونچال تھے، سر سر تیاں ایجاد تھے
یعنی اس فن کے پرانے صاحب اولاد تھے
ابتدا یہ تھی کہ وہ طبلوں کو سمجھاتے رہے
انتہا یہ تھی کہ طبلے آپ ہی گاتے رہے

لفظ کو رگڑیں بہت، معنی کو پھیلائیں بہت
شعر کم گائیں مگر مفہوم سمجھائیں بہت
تھاپ بل کھائے نہ کھائے آپ بل کھائیں بہت
در مقفل ہے مگر زنجیر کھڑکائیں بہت
گردش معنی میں اسکیندر کہیں، دارا کہیں
شعر کو ٹانکا کہیں، شاعر کو دے مارا کہیں

آخری گھمسان میں مہمان بھی گانے لگے
سر سے عاری، تان سے انجان بھی گانے لگے
لان میں بیٹھے ہوئے دربان بھی گانے لگے
اچھے اچھے معتبر انسان بھی گانے لگے
دست و بازو، چشم و ابرو گوش و سر چلتے رہے
شام کو چلے جو بیٹھے رات بھر چلتے رہے

ضمیر جعفری اسی راہ کے مسافر ہیں جس راہ پر اکبر الہ آبادی تمام زندگی چلتے رہے ان کے دم سے اردو میں سنجیدہ و معنی خیز ظرافت کی روایت تابندہ و پائندہ تھی۔

عورتوں کی اسمبلی

یہ نرگس وہ نسرین، یہ سنبل وہ لالہ
گلابی سی گل رخ، غزل سی غزالہ

نظر میں ستارے، جبیں پر اجالا
جو دیکھے پکارے ارے مار ڈالا

نہ کیوں دل نشیں ہو یہ تقریر سادہ
کہ الفاظ کم ہیں تبسم زیادہ

"نوبیاہی" میں گوٹے کناری کی باتیں
بہو کی کفایت شعاری کی باتیں

پڑوسن کی پرہیزگاری کی باتیں
غرض ہر بیاہی کنواری کی باتیں

شہادت کی انگشت اقبال پر ہے
کبھی ناک پر ہے کبھی گال پر ہے

بہ انداز غیض و غضب بولتی ہیں
بہ آواز شور و شغب بولتی ہیں

نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں
یہ جب بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں

نہ یہ سن رہی ہے نہ وہ سن رہی ہے
یہ دل بھن رہی ہے وہ جاں بن رہی ہے

کوئی گھر میں طرز بیاں چھوڑ آئی
کوئی کار میں چابیاں چھوڑ آئی

یہ ہر بحث کو ندمیاں چھوڑ آئی
وہ سب فائلیں نیم جاں چھوڑ آئی

حقائق کی سنگینیوں نے صدا دی
تو یہ فاتح زندگی مسکرا دی

جو اوڑھے ہوئے شال ہے چارخانی
زمیں پر کوئی شعلۂ آسمانی

ہمہ بے یقینی، ہمہ بدگمانی
ذرا دیکھنا اس کی آتش بیانی

وزارت کو مارے ہے یوں گھگھوسے
کوئی ساس لڑتی ہو جیسے بہو سے

بیماری کا نام

زندگی ہے مختلف جذبوں کی ہمواری کا نام
آدمی ہے شلجم اور گاجر کی ترکاری کا نام

علم الماری کا، مکتب چار دیواری کا نام
ملن اک نشاستہ ہے، مومن خاں جیساری کا نام

اُس نے کی پہلے پہل پیمائش صحرائے نجد
قیس ہے دراصل اک مشہور پٹواری کا نام

عشق ہرجائی بھی ہو تو درد کم ہوتا نہیں
اک ذرا تبدیل ہو جاتا ہے بیماری کا نام

مدتوں دزدیدہ دزدیدہ نظر سے دیکھنا
عشق بھی ہے اک طرح کی چور بازاری کا نام

میں نے تو اپنے لیے آوارگی تجویز کی
تو نے کیا رکھا ہے اپنی خود گرفتاری کا نام

بات تو جب ہے بدل جائے سرشت انسان کی
یوں تو رکھ دینے کو رکھ دو اونٹ پر لاری کا نام

دل ہو یا دلبر ہو، دانائی کہ بالائی ضمیر
زندگی ہے بعض اشیاء کی خریداری کا نام

غزل

جو انساں نوع انسانی کا استحصال کرتے ہیں
نہایت ریشمی الفاظ استعمال کرتے ہیں

کبھی ہم ۔۔۔ میں اک مجلس اقبال کرتے ہیں
پھر اس کے بعد جو کرتے ہیں وہ قوال کرتے ہیں

جہاں میں زعفرانی دالے، ہنر والے، خبر والے
عموماً دوسروں کا مال استعمال کرتے ہیں

بسا اوقات کھلتا ہی نہیں منشا حسینوں کا
قمیضیں سبز رکھتے ہیں، دوپٹے لال کرتے ہیں

جہاں کی تیز رفتاری کو روکا تو ہے کچھ ہم نے
جسے جو آج کرنا ہے وہ اگلے سال کرتے ہیں

بچارا مرد مومن بھی تو آخر پیٹ رکھتا ہے
بچارے لوگ بھی دعوتی تو استعمال کرتے ہیں

جزاک اللہ ضمیر اس تیرے طرز نے نوازی پہ
ترے اشعار آنسو ہیں مگر خوشحال کرتے ہیں

مسز ولیم

مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو
کبھی مکھن کبھی پتھر کبھی افیون تھی یارو

فرانسیسی بھی انگریزوں میں بات کرتی تھی
وہ دن گلیوں میں رہتی تھی کلب میں رات کرتی تھی
شطرنج میں پرانی جنبلوں کو مات کرتی تھی
گئی گزری سہی لیکن گزر اوقات کرتی تھی

تلوّن کیش اتنی، جنوری میں جُون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

وہ آنکھیں بحرِ اٹلانٹک کے نیلے پانیوں جیسی
بدن یونانیوں جیسا، نظر مصرانیوں جیسی
جوانی میں بکنگھم کی جواں ملکانیوں جیسی
طبیعت نا ملائم — مستقل استانیوں جیسی

وہ خود مجرم تھی خود منصف تھی خود قانون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

بڑی بی زندگی سے والہانہ پیار رکھتی تھی
رسیلی آنکھ تازہ روغنی رخسار رکھتی تھی
گھڑی پرس اور چھتری ہر گھڑی تیار رکھتی تھی
مگر انگلستان میں — عاشق سمندر پار رکھتی تھی

کبھی گنگھرا کبھی پتلون ہی پتلون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو

شب آ کر جب سرجان ینگ آتے تھے گھر اُس کے
کئی کوششوں سے ڈاکٹر چنگ آتے تھے گھر اُس کے
لنگ آتے تھے اور پی پی کے بینگ آتے تھے گھر اُس کے
گریجویٹ ایل ایل بی لنگ آتے تھے گھر اُس کے
سول سروس کے عرفان کنگ آتے تھے گھر اُس کے
جری جرنیل آمادہ بجنگ آتے تھے گھر اُس کے
امیر البحر نیوی کے نہنگ آتے تھے گھر اُس کے
پولس کے محرمان خشت و سنگ آتے تھے گھر اُس کے
کئی شاعر فقط دیدار منگ آتے تھے گھر اُس کے
زر و زیور جواہر رنگ رنگ آتے تھے گھر اُس کے
شلنگ آتے تھے اور سبز تھے شلنگ آتے تھے گھر اُس کے

وہ شب گردوں کے حق میں مستقل شب خون تھی یارو
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو



تھرڈ ورلڈ کے بچو

میں تمہیں بتاتا ہوں
حرفِ مدعا لکھنا
کوئی لفظ کب لکھنا
کس کے نام کیا لکھنا

درد کو دوا لکھنا
حبس کو ہوا لکھنا
قہر کو کرم کہنا
بھوک کو غذا لکھنا
امریکہ کو ان داتا
روس کو خدا لکھنا
قبر کو قبا لکھنا
قبض کو کشادہ لکھنا
ریگ کو حنا لکھنا
سنگ کو صبا لکھنا
جس کا رنگ گورا ہو
اُس کو بے وفا لکھنا
سوگ اک سوئمبر ہے
روگ کو شفا لکھنا
زخم " سے خلد کی ابلا
ہ " سے بس ہرا لکھنا
مرنے سے مرحبا لکھے
ہجر کو جزا لکھنا
شمر کی حویلی پر
حرفِ کربلا لکھنا

تھرڈ ورلڈ کے بچو!

ہم تمہارے ورثے میں
رات چھوڑے جاتے ہیں
چار سُو لٹیروں کی
گھات چھوڑے جاتے ہیں
ظلمت و فلاکت کے
ساتھ چھوڑے جاتے ہیں
تم کو ان بلاؤں کے
ہاتھ چھوڑے جاتے ہیں



مُسدّسِ بدحالی

سیاست کا ہر پہلواں لڑ رہا ہے
یہاں لڑ رہا ہے، وہاں لڑ رہا ہے
بیاں کے مقابل بیاں لڑ رہا ہے
"حسابِ دلِ دوستاں" لڑ رہا ہے
ستارہ نظر مہ جبیں لڑ رہے ہیں
یہ حد ہے کہ پردہ نشیں لڑ رہے ہیں

مزاجوں میں یوں "لیڈری" آگئی ہے
کہ گھر گھر کی اپنی الگ "پارٹی" ہے
کوئی "شیر" ہے تو کوئی "لومڑی" ہے
یہی اپنی لے دے کے "انڈسٹری" ہے
نہ منزل نہ جادہ نہ کوئی ارادہ
رضاکار کم یاب، لیڈر زیادہ

کل شب جہاں میں تھا

[ہمارے محلے کے ایک اعلیٰ افسر کو قوالی سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ ایک مرتبہ ایسے اناڑی قوالوں کو پکڑ لائے جو کچے راگ میں کچے تان پلٹے لگانے اور الفاظ کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے کے ماہر تھے۔ ماتحت محلے کی چار راتیں اسی شور و غوغا کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ (م ن)]

پے بہ پے قوالیوں کی پالیاں ہونے لگیں
دن نکمّے اور راتیں کالیاں ہونے لگیں
رفتہ رفتہ تالیاں بے تالیاں ہونے لگیں
ہوتے ہوتے مشتعل گھر والیاں ہونے لگیں

اک میاں اُچھلا تو بیوی نے کہا اے جانِ من!
"تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!"

ضمیر کا گھر

[مجھے کچھ عرصہ ایک خستہ حال سے چوبی مکان (HUT) کے نصف حصے میں رہنے کا اتفاق ہُوا۔ مالک مکان نے ہٹ کے دو حصوں کو الگ الگ کرایہ داروں میں کچھ اس طرح تقسیم کیا تھا کہ آدمی خواہ کسی حصے میں رہے ضروریات کی اکثر چیزیں دوسرے حصے میں رہ جاتی تھیں۔ (ض)]

لکڑی کی 'نصف ہٹ' میں بسیرا ہے آج کل
فدوی بشر نہیں ہے 'بٹیرا' ہے آج کل
دو 'کمریاں' کہ عرض ہے جن میں نہ طول ہے
جینا اگر یہی ہے تو مرنا فضول ہے
جو چیز جس جگہ تھی ضروری، وہیں نہیں
چھت بے تکلفی میں کہیں ہے کہیں نہیں
آواز جو بلند ہوئی پار ہو گئی
اب گھر میں بات چیت بھی دشوار ہو گئی
پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے چھت بھی چلی ہوئی
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی
دیوار اِس طرف ہے تو شہتیر اُس طرف
جلسہ اِدھر ہے نعرۂ تکبیر اُس طرف
اسٹور اِس طرف تو کچن دوسری طرف
بلب اِس طرف نکلے ہیں بٹن دوسری طرف
شاعر اِدھر ہے، مشقِ سخن دوسری طرف
زن اِس طرف بپا ہے 'بزن' دوسری طرف
صحنِ چمن کی نہر، بلین دوسری طرف
نلکے کا دھڑ اِدھر ہے تو ٹونٹن دوسری طرف
بیلیں اُگی ہوئی ہیں ترے در کے سامنے
کدو اچھل رہے ہیں مرے گھر کے سامنے
مرغوں کا شوق ہے جو اُدھر کے مکین کو
اچھی سزا ملی ہے اِدھر کی زمین کو

بیوی کی قبر پر

میری بیوی
قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
وہ بھی ہے آرام سے
اور میں بھی ہوں آرام سے

...گھی کے ساتھ

گو زندگی کے ساتھ ہیں شرمندگی کے ساتھ
اٹھی ہے ساتھ کار کے اردلی بے کلی کے ساتھ

یہ حادثہ عجیب ہوا آدمی کے ساتھ
تاریک ہو گئی ہے نظر روشنی کے ساتھ

دونوں کو ان کے ظرفِ مروت کی داد دو
راشد کے گھر میں شامِ غزل جعفری کے ساتھ

ہم سے بھی چھوڑ دیں گے مگر آپ شیخ جی
کچھ روز جا کے رہیے کسی آدمی کے ساتھ

حافظ کی لے میں شعر تو ممکن نہیں ضمیر
طبلہ بجا رہے ہیں ذرا فارسی کے ساتھ

تھا فیصلہ غلط کہ نہایت غلط، مگر
بندے عسل نے ووٹ دیا پارٹی کے ساتھ

کام آتا نہیں

نام اگر دیکھو تو کس شجرے میں نام آتا نہیں
کام اگر پوچھو تو کوئی خاص کام آتا نہیں

پڑھ رہا ہوں علم جس میں وہ زباں میری نہیں
کر رہا ہوں عشق جس سے اس کا نام آتا نہیں

اپنی روٹی خود پکا سر کر اب شادی کے بعد
حسن آتا ہے حسنِ انتظام آتا نہیں

بحث ہم دونوں میں جب ہوگی تو سمجھا کیجئے ہو
مجھ کو علم اور آپ کو علمِ کلام آتا نہیں

کچھ ہنر کچھ جستجو کچھ سعی اے شوخِ نظر
صرف اک بیلون کس لینے سے کام آتا نہیں

بھائی مولا بخش کس کس فلسفے کو ووٹ دے
بھائی مولا بخش کو اپنا بھی نام آتا نہیں

میکدے سے بس اب اتنا ہی تعلق ہے ضمیر
مے کی خوشبو مجھ تک آ جاتی ہے جام آتا نہیں

[illegible] (آسٹریلیا) [illegible]

۱۵/ اپریل ۱۹۹۹ء

محب و مخدومی ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب! سلام مسنون!

[illegible] شگوفہ [illegible] شمارہ [illegible]

[illegible]

[illegible] شگوفہ [illegible]

[illegible]

۲۰/ اپریل ۱۹۹۹ء

محترم ڈاکٹر صاحب! سلام و نیاز!

[illegible] شگوفہ [illegible]

[illegible]

۲۳ ... گلی ...

مکان ۴/۱ اسلام آباد (پاکستان)

۳۰ دسمبر ۱۹۸۹ء

فون ۸۵۶۲۹۰

مکرمی ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب

آداب!

"شگوفہ" بابت ماہ ... ملا ہے۔ آپ کی توجہ کا شکریہ

شکر گزار ہوں۔ "شگوفہ" نے تو [illegible]

میرے بارے چند چیزیں ارسال کر رہا ہوں۔ پسند آئیں تو شائع کر دیں

ورنہ — جو تیری رضا ہے سو کر!

اسلام آباد میں ... کی ایک ... پروگرام "بزم ظرافت"

سے ... نشر ہوتا ہے۔ ایک ... میں بھی ... پڑھا ہوا فقرہ

تھے۔ آپ کے لئے یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ جب میں نے

پڑھا گیا کہ ... آپ کے لئے ... کو ... جانے

کہ وہ ... میں ... کہیں ... — البتہ ...

نشر کیا گیا۔ ... پڑھا

کہیں میں کیا خوب ... آ گیا

دل کی تسکین آ گیا ... تسکین آ گیا

"گنبد ..." میں دکن کے ... کا طلسم

آ گیا — ... آ گیا

... صاحب — ... صاحب ... ادب

... افسوس ... بارے ... —

... میں ... لکھ ...

آپ کا

ضمیر

دے کے خط (مراسلے)

بر شگوفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

شگوفہ میں آپ نے میری دو عدد غزلیں اور متفرق اشعار شائع کئے تھے پہلی غزل سے ایک شعر

اس میں بارود ہی جب نہ ہو
توما رائفل کا بے کار ہے

دوسری غزل سے

ان کو گمان کھاکو بگڑی ہے
ان کو جاڑا ہے کیا کیا جائے

ڈال دیا گیا۔ مجھے چند برس پہلے جاوید وششت مرحوم کے مضمون "رس گلہ" کے ساتھ روا رکھا گیا سلوک یاد آگیا۔ آپ نے اس مضمون سے نظیر اکبرآبادی کا ایک شعر

"کتنا ہے میٹھا یار کا بوسہ
ہونٹ سے چپکے ہونٹ بہت"

غائب کر دیا تھا۔ بعد میں مضمون نگار کے احتجاج پر ایک کامراسلہ مع سابقہ حذف کردہ شعر شائع کر دیا گیا تھا۔

مجھے اندازہ ہے کہ آپ شگوفہ کو "باطہارت"، "باوضو"، اور ثقہ پرچہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ادبی زندگی سے ہٹ کر عملی زندگی میں بھی لستے ہی باوضو، اور باریش ہوجائیں۔

محمد علی رفعت، کھمم

*****

مکرمی جناب مصطفیٰ کمال صاحب

ایک مدت بعد شہر ریاض میں "شگوفہ" کی مانوس مہک نے سرشار کردیا۔ ایک دوست کے ہوبی گدان میں اسے سجا دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ خدا عمر دراز کرے آپ کی اور شگوفہ کی۔

آپ خصوصی نمبر تو نکالتے رہتے ہیں اگر مسیح انجم صاحب کے اعزاز میں بھی کوئی خصوصی نمبر نکالیں تو بہت مناسب ہے۔ مرحوم کا مضمون "سفید شہر" آج تک ذہن میں تازہ ہے۔ اللہ حافظ

ابو نبیل خواجہ مسیح الدین، ریاض

*****

مکرمی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال

تازہ شگوفہ ملا۔ اردو یونیورسٹی میں صبح سے شام ہوجاتی ہے۔ پھر شگوفہ کی تزئین کے لیے وقت کس طرح نکالتے ہیں؟ اتنی پابندی سے آج کے زمانے میں رسالہ نکالنا وہ بھی اردو میں۔۔۔ حیرانی ہوتی ہے۔۔ بہرحال آپ نے ایک تاریخ لکھ دی ہے تازہ شمارے میں مضامین پسند آئے۔ نظم کا حصہ بھی خوب ہے۔ سرورق بہت خوب ہے۔ تنقیدی مضامین کی شمولیت سے شگوفہ کا حسن پروقار ہوگیا۔ کم از کم ایک تنقیدی مضمون ہر ماہ شائع کیجیے۔ تازہ شمارہ میں شائع شدہ مضامین نظم و نثر کا تنقیدی جائزہ اگلے شمارے میں شائع کیا جائے تو یہ ایک مستقل فیچر بھی ہوجائے گا اور ہم سب کو اپنے عیب و ہنر بھی نظر آنے لگیں گے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید پروفیسر شفیق صلاح یہ کام بڑی خوبی سے انجام دے سکیں گے اگر یہ ذمہ داری آپ ان پر ڈالیں؟

فضل جاوید، حیدرآباد

*****

مکرمی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال

جناب مسیح انجم مرحوم کے برسی کے سلسلے میں جو آپ نے ان کے مضامین شائع فرمائے ہیں۔ بہت خوب ہیں خصوصاً "بوتنہ" مرحوم سے میرے تعلقات آخری وقت قائم ہوئے تھے جب وہ رہنمائے دکن میں کام کرتے تھے۔ بڑے ہی مخلص اور شریف انسان تھے۔

ڈاکٹر میر گوہر علی خان، حیدرآباد

*****

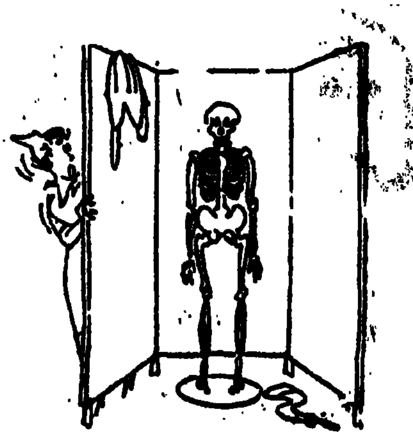
مکرمی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال

منہ سے پھول جھڑنے کا محاورہ شروع سے پڑھتے اور سنتے میں ضرور آیا ہے مگر اس کو اس قدر خوبصورتی سے پہلی بار سنے روپ میں آپ کے رسالے میں پڑھنے کو ملا (منہ کھلتے ہی لوگ پھول چننے لگیں) جس کو زبان پر پورا قابو ہوتا ہے وہی ایسی بلاغت پیدا کرسکتا ہے طالب صاحب کا مضمون پڑھ کر طبیعت خود شگوفہ ہوجاتی ہے "۱۰" کے بغیر ہماری گالیوں کا یتیم ہوجانا کی بلاغت کا جواب نہیں کس صفائی سے ہندی پر اچھوتا وار ہے۔ قلندر کا کردار خوب ہے یہ وہی اقبال والا قلندر معلوم ہوتا ہے۔

افتخار انصاری حیدرآباد



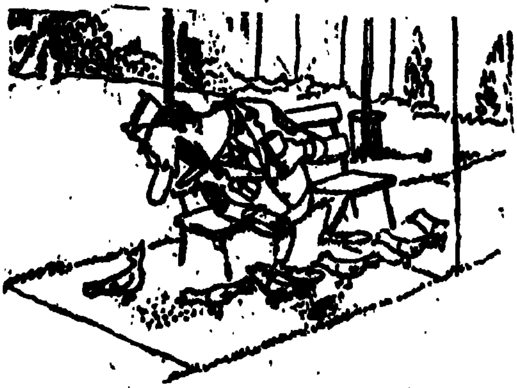
میں آپ کو نیند کی گولیاں دوں گا آپ کے شوہر کو آرام کی ضرورت ہے



آپ کو کم کرتے کرتے بہت دبلی ہو گئی

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست



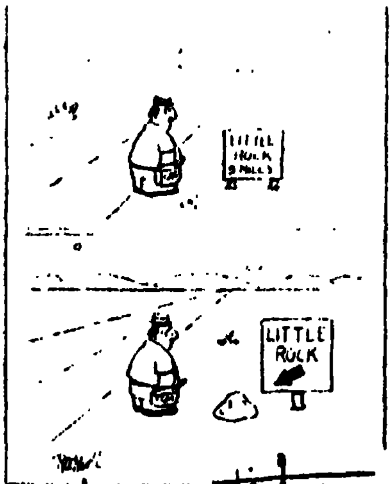
اتنیں آؤ تب پتہ لس گے



ڈاکٹر صاحب سے کہئے میری بیماری واپس آگئی ہے، میری فیس واپس کر دیں۔



تمہیں صفائی کا بہت شوق ہے نا! اس لئے دو روپے آتے جب سے سالگرہ
کا تحفہ لیتا آیا ہوں۔





Reprinted from The Saturday Evening Post • 1961



ڈاکٹر نے ہر روز چار کیلے کھانے کے لئے کہا تھا۔ چنانچہ
کل ہی کیلے کے چھلکے پر سے پاؤں پھسل گیا۔

مجتبیٰ حسین

کچھ میرے کالم کے بارے میں
("میرا کالم" کی رسم اجراء کے موقعہ پر پڑھی گئی ایک تحریر)

"میرا کالم" کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کالموں کے اس انتخاب کی اشاعت کے ذریعہ میرے ادبی سفر نے پورا ایک دائرہ مکمل کر لیا ہے۔ گویا لگ بھگ چار دہے پہلے جہاں سے میں چلا تھا پھر وہیں واپس آگیا ہوں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

آدمی کو کبھی کبھی پیچھے مڑکر بھی دیکھ لینا چاہیے۔ وہاں کچھ نظر آئے یا نہ آئے اس ایکسر سائز سے اس کی گردن تو ٹھیک رہتی ہے۔ اسپنڈ ولائٹس (Spondylitis) کی بیماری کے لئے بہت مفید ہے۔ آج میں پیچھے مڑکر دیکھنے لگا ہوں تو مجھے 12 / اگست 1962ء کا وہ دن یاد آرہا ہے جب میں حسب معمول اپنے کام پر دفتر "سیاست" پہنچا تو میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور عابد علی خان ایڈیٹر "سیاست" نے مجھے ہدایت دی کہ میں اس دن کا طنزیہ کالم "شیشہ و تیشہ" لکھ دوں۔ یہ محض ایک اتفاق تھا۔ میں نے سوچا کہ اخبار میں آدمی کو بہت سے کام چلاؤ کام کرنے پڑتے ہیں۔ چلو یہ کام بھی کر دیتے ہیں۔ یوں بھی نوجوانی میں آدمی بہت سے کام چلاؤ کام کرنے کے لئے ہر دم نہ صرف تیار رہتا ہے بلکہ موقع کا متلاشی بھی رہتا ہے۔ مگر اس وقت کا کام چلاؤ کام ہی اب میری ادبی زندگی کا بنیادی کام بن گیا ہے بلکہ یہی میری بنیادی شناخت بھی ہے۔ کیا بتاؤں میری زندگی ایسے ہی اتفاقات سے بھری ہوئی ہے۔ کئی برس پہلے کی بات ہے میں ایک بار عجلت میں یونیورسٹی جانے کے لئے گھر سے نکل رہا تھا کہ اچانک میری شیروانی کا بٹن ٹوٹ گیا۔ میں نے شیروانی کا بٹن ٹانکنے کے لئے اپنی کزن سسٹر سے کہا۔ اس بیچاری نے تو بٹن ٹانک دیا مگر اس چھوٹے سے واقعہ کے بعد مجھے نہ جانے کیا ہو گیا کہ میں اپنے آپ ہی خود اپنی شیروانی کے بٹن توڑنے اور انھیں اپنی کزن سسٹر سے ٹنکوانے کا ماہر بن گیا۔ یہاں تک کہ میرے خاندان والوں نے بٹن کے بجائے میری کزن کو میری زندگی سے ٹانک دیا۔ اکثر سوچتا ہوں کہ برسوں پہلے اگر میری شیروانی کا بٹن نہ ٹوٹا ہوتا تو آج میری زندگی مختلف ہوتی۔ کیا کریں ہونی اسی طرح ہو کر رہتی ہے۔ بہر حال مزاح نگاری کے میدان میں میرا داخلہ دریا میں اس آدمی کی چھلانگ کی طرح تھا جسے ایک ڈوبتے ہوئے بچے کو بچانے کے لئے کسی نے دھکا دے کر دریا میں گرا دیا تھا۔ یہ آدمی تو خیر بچہ کو ڈوبنے سے بچا کر یہ پوچھنے کے لئے دریا سے باہر نکل آیا تھا کہ "بتاؤ مجھے کس نے دھکا دیا" لیکن میرا معاملہ یہ ہے کہ میں پچھلے اڑتیس برسوں سے دریا میں ہوں۔ مزاح نگاری کو تو خیر ڈوبنے سے بچا نہ سکا لیکن اپنی ڈھٹائی پر افسوس ہوتا ہے کہ نہ تو خود ڈوبا اور نہ ہی دریا سے نکل کر کنارے پر آیا۔ آکر بھی کیا کرتا کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے اس دریا میں [illegible] ہی دو چند لوگوں نے دھکا دے کر گرایا تھا۔ ان کی

زندگی میں جب ان سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی تو اب ان کے گزر جانے کے بعد کس سے پوچھوں ۔ میری دعا ہے کہ خدا مجھے ہی مجھے فرق ورپانہ کرے لیکن ان دونوں بزرگوں کو غریق رحمت ضرور کردے (آمین)

مزاح نگاری کی خاطر میں نے اڑتیس برس پہلے شعوری طور پر جس خوشدلی، خوش مذاقی، خوش کلامی، خوش ذوقی اور خوش وقتی کو اپنایا تھا اسے آج میری زندگی کے فطری رجحان کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے ۔ چنانچہ میری نگاہ وہیں جاتی ہے جہاں خوشدلی کا سامان ہو ۔ خدا شکر خورے کو نہ صرف شکر دیتا ہے بلکہ بہت مہربان ہو تو شوگر کی بیماری تک دے دیتا ہے ۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے ۔ بس ایک برائی مجھ میں یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اکثر لوگ جہاں رو دیتے ہیں وہاں میں ہنس دیتا ہوں ۔ ایک پرانی مثال ہے کہ اگر ایک گلاس میں پانی آدھا بھرا ہوا ہو تو مایوس اور قنوطیت زدہ آدمی کی نظر میں یہ آدھا گلاس خالی ہوگا لیکن رجائیت پسند آدمی کے لئے یہی گلاس پانی سے آدھا بھرا ہوا ہوگا ۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ گلاس چاہے پانی سے آدھا خالی ہو یا بھرا ہوا اگر اس میں پانی کی چند بوندیں موجود نہ ہوں تو مجھے یا تو گلاس نظر نہیں آتا یا پھر میں اس کی طرف دیکھتا ہی نہیں ۔ میں نے کالم نگاری سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا ۔ لگ بھگ پندرہ برسوں تک روزانہ کالم نگاری کی ۔ میری کالم نگاری پر سے ابھی ایک برس بھی نہیں گزرا تھا کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسے صاحب طرز ادیب نے اپنے اخبار "صدق جدید" میں اکتوبر 1963 میں لکھا تھا "روزنامہ سیاست" خاصا سنجیدہ، شریفانہ معقول، پر معلومات پرچہ ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اپنا ظریفانہ کالم خوب نبھائے ہوئے ہے ورنہ لوگ ظرافت اور توہین، دل آزاری یا پھکڑ کے درمیان فرق ہی نظر انداز کر جاتے ہیں"۔

مجھ جیسے کم سواد، گمنام اور مبتدی ادیب کے لئے مولانا کی رائے خود میرے لئے ایک حیرتناک انکشاف سے کم نہ تھی ۔ پھر تو میں نے طنز و مزاح کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ۔ کالم نگاری کے بعد میں نے انشائیے، شخصی خاکے، سفرنامے، رپورتاژ، محفلوں کی رودادیں نہ جانے کیا کیا لکھا مگر سب میں مزاحیہ اسلوب کو برقرار رکھا ۔ پھر یوں ہوا کہ اگست 1993 میں محبوب حسین جگر مرحوم پہلی اور آخری بار دہلی آئے تو ظہیر الدین علی خان کی تجویز پر انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں پھر سے "سیاست" کے سنڈے ایڈیشن کے لئے مزاحیہ کالم لکھنا شروع کروں ۔ میں نے خواہش کی کہ اب اس کالم کا عنوان "مزاحیہ کالم" نہیں بلکہ "میرا کالم" رکھا جائے تاکہ میں کچھ اپنی باتیں بھی کہہ سکوں ۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ سترہ اٹھارہ برس کے وقفہ کے بعد اپنی کالم نگاری کے دوسرے دور کا پہلا کالم بھی میں نے اگست کی بارہ تاریخ کو ہی لکھا اور اس طرح میں نے اپنے ادبی سفر کا پورا ایک دائرہ مکمل کر لیا ۔ اب پچھلے چھ برسوں سے ہر ہفتہ بڑی پابندی کے ساتھ اپنے کالم کے ذریعہ اپنے قارئین سے باتیں کرتا چلا آرہا ہوں ۔ دنیا میں اب ایسی کوئی نئی بات نہیں رہ گئی ہے جو کروڑوں برس پرانی دنیا میں پہلے نہ کہی گئی ہو ۔ ارسطو اور افلاطون سے لے کر آج کے مشاہیر تک سب نے اپنے اپنے ڈھنگ سے ساری باتیں کہہ دی ہیں ۔ لہٰذا اب بات کی اہمیت نہیں رہ گئی ہے البتہ اہمیت اس بات کی رہ گئی ہے کہ آپ کس ڈھنگ سے اپنی بات کہتے ہیں ۔ اب جب کہ ساری باتیں بہت پہلے کہی جا چکی ہیں تو ادب اب صرف ایک طرز ادا کا نام رہ گیا ہے ۔

زینت آپا (زینت ساجدہ) کا شمار میرے اولین کرم فرماؤں میں ہوتا ہے ۔ انھیں یاد ہوگا کہ تیس برس پہلے حیدرآباد میں اچانک یہ افواہ اڑی تھی کہ گنڈی پیٹ کا بند ٹوٹ گیا ہے ۔ اس افواہ کے نتیجہ میں جو افراتفری سارے شہر

میں بھی ۔ تھی اس کے ۔ بہت سے چشم دید گواہ اب بھی موجود ہیں ۔ اتفاق سے اس افواہ کے بارے میں مجھے اور زینت آپا دونوں کو یہ موقعہ ملا تھا کہ ہم "سیاست" کے ایک ہی صفحہ پر اپنے اپنے ڈھنگ سے اظہار خیال کریں ۔ مضامین کی اشاعت کی دو دن بعد زینت آپا مل گئیں تو بولیں "ارے معزّے ۔ تو نے اپنے مضمون میں ساری جھوٹی اور من گھڑت باتیں لکھیں ہیں جب کہ میں نے اپنے تجربات اور مشاہدات بیان کئے ہیں" ۔ میں نے کہا "زینت آپا! یہ بھی خوب رہی ۔ ایک جھوٹی افواہ پر آپ نے پورا ایک مضمون لکھ دیا ۔ اب اگر میں زیب داستان کے طور پر اپنی طرف سے سوچ کر کچھ باتیں بڑھا دیتا ہوں تو اس میں قباحت کیا ہے تاہم میں نے جو باتیں لکھی ہیں وہ سب سچی ہیں" ۔

بولیں "جھوٹا کہیں کا ۔ تو جس زیب داستان کا ذکر کر رہا ہے اس میں داستان چھوٹی اور زیب بڑا ہو جاتا ہے" ۔

اب میں زینت آپا کو کیسے بتاتا کہ جب فوٹو گرافی میں Enlargemet کو برا نہیں سمجھا جاتا تو اسے ادب میں برا کیوں سمجھا جائے ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میرے مضامین میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ سب کی سب سچی ہوتی ہیں ۔ میری کارستانی صرف اتنی ہوتی ہے کہ میں انھیں ذرا سا ان‌لارج کر دیتا ہوں ۔ میں فکشن (Fiction) نہیں لکھتا بلکہ Fact اور Fiction دونوں کو ملا کر Faction لکھتا ہوں ۔ اپنی کالم نگاری کے سلسلہ میں مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا ہے ۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اس کتاب کی اشاعت کے لئے حسامی بک ڈپو کے مالکان ، قاسم صاحب اور نصیر احمد کا شکریہ ادا نہ کروں ۔ حسامی بک ڈپو تقریباً ایک سو سال سے دینی کتابوں کی اشاعت کا اہم مرکز رہا ہے ۔ گویا ایک طویل عرصہ تک وہ ایسی کتابیں چھاپتے رہے جن کے مصنفین کو رائلٹی دینے کی کوئی پبلشر ہمت نہیں کر سکتا ۔ ایک بات اور عرض کر دوں کہ میری کتابوں کو بھی وہ ایک عرصہ تک دینی کتب ہی سمجھ کر چھاپتے رہے ۔ ایک دن بولے "آپ اپنی کتابوں میں ہنسی مذاق کی باتیں لکھتے ہیں جب کہ ہم تو دینی کتابوں کے پبلشر ہیں" ۔ میں نے انھیں سمجھایا "لوگوں میں ہنسی کی دولت بانٹنا بھی تو ایک بنیادی اور انسانی فریضہ ہے ۔ اس طرح آپ میری کتابوں کو بھی دینی کتابیں ہی سمجھ لیں ۔ رہی رائلٹی کی بات تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنی کتاب کے صدقہ میں آپ کو اتنا نوازا ہے کہ اس میں سے ہم جیسے ہزاروں مصنف نوازے جا سکتے ہیں" ۔ میری بات پر کچھ اس طرح ایمان لے آئے کہ آج تک میری کتابیں چھاپتے چلے آ رہے ہیں ۔

مدیر شگوفہ مصطفیٰ کمال کا ممنون ہوں کہ انھوں نے نہ صرف ان کالموں کے انتخاب میں مدد کی بلکہ اس کی اشاعت کے مراحل میں حصہ ادا کرنے کے علاوہ اس کتاب کا پیش لفظ بھی لکھا ۔ پرانے دوست ہونے کے باوجود انھوں نے میری مزاح نگاری کے بارے میں آج تک کوئی رائے نہیں دی تھی ۔ مگر اب وہ بھی رائے دے کر پکڑے جا چکے ہیں کب تک چھپے گی کیری پتوں کی آڑ میں ۔ تاہم اتنا عرض کر دوں کہ انھوں نے میری کالم نگاری کے بارے میں اتنی اچھی رائے دی ہے کہ لوگ شاید ہی ان کی رائے پر یقین کریں ۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس کتاب کی رسم اجرا ء پروفیسر افضل محمد نے انجام دی جو ہیں تو میرے بہت ہی پرانے دوست لیکن ہمیشہ نئے دکھائی دیتے ہیں ۔ بہت عرصہ پہلے عثمانیہ یونیورسٹی میں وہ میرے ہم مکتب رہ چکے ہیں ۔ اب ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے ہیں تو کیا ہوا ۔ ایک زمانہ میں تو پڑھے لکھے آدمی تھے ۔

زندہ دلان حیدرآباد سے میرا تعلق چولی اور جوبن کا سا ہے ۔ میں ارباب زندہ دلان اور بطور خاص نمائندہ ...

ممنون ہوں کہ کچھ مہینے پہلے جب اس کتاب کا مسودہ کمپوزنگ کے لئے پریس میں دیا جا رہا تھا تو انھوں نے اسی وقت اس کتاب کی رسم اجرا کی تاریخ مقرر کر دی تھی۔ ان کی محبتوں کے قرض کے بوجھ تلے میں اتنا دب چکا ہوں کہ جب بھی وہ میرے روبرو ہوتے ہیں تو میرا قد کچھ ہمیشہ ان کے قد سے چھوٹا نظر آتا ہے۔ خدا ہر ایک کو ایسا قد شناس اور قدر پیما دوست عطا کرے۔ میں جیلانی بانو صاحبہ، خالد قادری، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے مجھ ناچیز کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا جیسے میں بھی واقعی کوئی چیز ہوں۔ میں آخر میں اپنے تمام مداحوں اور اپنے کالم کے ان تمام قارئین کا تہہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے مجھ پر بے شمار محبتیں نچھاور کیں۔

ایک خوشگوار شام جناب مجتبیٰ کے نام

حلیم افسر

۱۹ جون ۱۹۹۹ء کی بھیگی شام شہرآفاق طنزو مزاح نگار کی کتاب "میرا کالم" (جو ۹۵ کالموں (مضامین) پر مشتمل ہے) کی رسم اجراء مدینہ ایجوکیشن سنٹر ناسپلی حیدرآباد کے خوبصورت اور مزین ہال میں محترمہ زینت ساجدہ صاحبہ کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر افضل محمد وائس چانسلر ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، محترمہ جیلانی بانو، ڈاکٹر لطف الرحمن وزیر اقلیتی امور ریاست بہار نے بطور مہمانان خصوصی شرکت فرمائی۔ دیگر قابل ذکر مقررین میں ڈاکٹر رحمت یوسف زئی ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ایڈیٹر شگوفہ اور جناب خالد قادری نے مصنف کے فن اور شخصیت پر اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کئے۔ شرکائے محفل میں مداحوں کی خاصی تعداد کے علاوہ شہر حیدرآباد کی ادبی اور سرکردہ ممتاز خواتین اور حضرات بلالحاظ مذہب و ملت شامل تھے۔

مقررین نے جناب مجتبیٰ حسین کے فن اور ان کی شخصیت کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ وہ نہ صرف ظرافت اور شرافت کا ایک حسین پیکر ہیں بلکہ وہ ایک بہترین انسان، سچے دوست، بے لوث خدمت گار اور بیش بہا خوبیوں کی شخصیت کے مالک ہیں۔ اپنے سینے میں وہ ایک ہمدرد اور درد مند دل رکھتے ہیں جس میں وہ افراد اور سماج کے دکھ درد کو سمو کر نہایت ظریفانہ انداز میں اپنی تحریروں کے ذریعہ قارئین کو روشناس کرواتے ہیں تاکہ ان کی تحریریں پڑھ کر وہ نہ صرف مسکرائیں اور قہقہے لگائیں ساتھ ہی اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی تراوٹ بھی محسوس کریں۔ اپنی طنزو مزاح سے لبریز تحریروں کے ذریعہ وہ سامعین اور قارئین کو اچھے اور برے میں تمیز کرنے اور اچھائیوں کو اپنانے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔

مقررین میں اس حقیقت کا انکشاف کیا گیا کہ مصنف نے اپنی تحریروں میں کبھی بھی کسی شخصیت کی تذلیل یا تضحیک نہیں فرمائی۔ یہاں تک کہ بعض بے تکلف احباب کی خاکہ نگاری میں بھی مخاطب کی خوبیوں اور کمزوریوں کا اس احتیاط سے اظہار کیا ہے کہ وہ باعث رنجش نہ ہو۔ بسا اوقات اپنے ہاتھوں کی کمیوں اور اپنی کمزوریوں اور شرارتوں کو بھی ضبط تحریر کیا ہے۔ ان کی درپردہ مسکراہٹ اور ہنسی کے پس پردہ چند درد لمحات اور تلخ واقعات بھی ہیں۔ ان کے ہنستے ہوئے چہرے کو بغور پڑھنے سے یہ شعر ذہن کو مترشح آتا ہے۔

کہ تو ہی میرے درد کا مفہوم کھ سکے ... جو تو زمانے کے ... ہے

یوسف ناظم

مظہر امام۔ وہ امام میں مقتدی

مظہر امام کو غزل گوئی میں وہی رتبہ حاصل ہے جو ہماری جنگ آزادی میں سبھاش چندر بوس کو حاصل تھا۔ مظہر امام معتبر بلکہ معروف غزل گو شاعر ہیں لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ان کی شناخت اور شہرت کی اصل وجہ آزاد غزل ہے۔ ہندوستان کا آزاد ہونا، ان کے لیے کافی نہیں تھا اس لیے انہوں نے اطمینان کی سانس اس وقت لی یعنی اس وقت تک نہیں لی جب تک ہماری کہنہ غزل آزاد نہیں ہو گئی۔ مظہر امام صرف اسماً یا رسماً امام نہیں ہیں وہ عملاً بھی وہی ہیں جو اسماً ہیں اور یہ رسم تو برائے نام ہے ورنہ اصل میں تو وہ کام ہے جس کی وجہ سے وہ عمامے اور قرغل کے بغیر بھی امام ہیں۔ اس اعزاز اور قابل رشک منصب کے باوجود کسی کا اتباع کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی ہمارے یہاں ایک روایت رہی ہے۔ اس طرز عمل سے آدمی کا جذبہ اجتہاد متاثر نہیں ہوتا اور آدمی، حسب معمول صف اول میں مقیم رہتا ہے۔ مظہر امام نے اکبر الہ آبادی کے تتبع میں ترک وطن کیا اور بکومت اسی شہر کی اختیار کی جسے شہروں میں انتخاب مانا جاتا ہے۔ اگر وہ باضابطہ مقتدی بننا پسند کرتے تو واسطے میں الہ آباد میں اتر پڑتے۔ لیکن الہ آباد میں اتنا ادبی خلفشار اور ثقافتی انتشار کہاں ہے جتنا کہ دلی میں ہے اور اب تو جب سے ذوق کا مزار بنا ہے وہاں گہما گہمی زیادہ ہو گئی ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ذوق اور غالب میں جو ٹھنی تھی وہاں دونوں کی رحلت کے بعد بھی ٹھنی رہے گی اور دو سو سال گذر جانے پر بھی برقرار رہے گی۔

اکبر الہ آبادی اور مظہر امام کے بائیوڈاٹا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی کے معاملے میں صرف اہل تحقیق (جنہیں دوسرے کے اعمال و اشغال کی ٹوہ کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا) جانتے ہیں کہ ان کا تعلق بہار سے تھا اور یہ ایک لحاظ سے ان کا خفیہ ایجنڈا رہا جب کہ میرے ممدوح مظہر امام علانیہ طور پر بہار کے پیدائشی متوطن مشہور رہے۔ کشمیر کی غزلیں کہنے کی غرض سے کشمیر ضرور گئے لیکن ان کا وطن بہار ہی رہا اور شاید یہی وجہ تھی کہ جب پروفیسر رئیس نے کئی سال پہلے اپنے رسالے میں مظہر امام کا تعارف کراتے ہوئے انہیں بہار کا شاعر لکھ دیا۔ میرا خیال ہے مظہر امام ان دنوں زود رنج آدمی تھے وہ فوراً بپھر گئے اور چوں کہ انہیں روزانہ کے حالات اور واقعات کی خبر رہتی تھی۔ انہیں پتہ چل گیا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ جونہی قمر رئیس کا تعارف، ان کی (گہری) نظر سے گزرا انہوں نے فی الفور ایک سادہ دل بندے کی طرح اپنا ردعمل ان الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ اگر قمر رئیس انہیں اردو کا شاعر لکھتے اور درجہ بندی میں کسی بھی مقام پر انہیں نصب کرتے تو وہ ہرگز ہرگز شکایت نہ کرتے۔ حالانکہ جن دنوں یہ عمل اور ردعمل ہوا مجھے مظہر امام سے قربت حاصل نہ تھی لیکن مجھے بہرحال بڑا معلوم ہوا کہ صرف بہار میں پیدا ہو جانے کی وجہ

سے کسی کل اردو سطح کے شاعر کو بہار کا شاعر کہہ دینا یقیناً شاعر کی دل شکنی کا باعث ہو سکتا ہے اور میں نے اپنے دل میں اس کا جواز یہ سوچا تھا کہ کیا ہم نے کبھی، کلیم الدین احمد کو عظیم آباد کا باشندہ نقاد کہا ہے..... قمر رئیس نے جہاں تک میرا خیال ہے مظہر امام کے رد عمل کو بہت دنوں تک برداشت کیا لیکن جب یہ صدمہ ان سے زیادہ برداشت نہ ہو سکا تو انہوں نے سوچا شاید ترک وطن سے انہیں دل کا سکون حاصل ہو اور وہ تاشقند چلے گئے۔ دلی والے جب ترک وطن کرتے ہیں تو عام طور پر تاشقند ہی جاتے ہیں۔ دنیا میں اتنے خوبصورت نام کا دوسرا شہر ہے کہاں)..... میں سمجھتا ہوں کہ مظہر امام نے بھی قمر رئیس کے دلی سے تخلیے کے بعد بھی دلی کی مستقل سکونت اختیار کی (یوں سکون مجھے دونوں کا عزیز ہے)

مظہر امام کی مصروفیات پر واقعی رشک آتا ہے۔ لکھنا پڑھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے لیکن چونکہ یہ محاورہ سرے ہی سے غلط ہے بلکہ بے معنی ہے اس لیے وہ اس پر سوتے ہیں شب و روز جاگتے رہتے ہیں۔ لکھنے سے زیادہ پڑھتے ہیں اور پڑھنے سے زیادہ لکھتے ہیں۔ ان کا حافظہ بہت مضبوط ہے۔ انہیں ہر بات یاد رہتی ہے کس نے کب کیا لکھا تھا۔ یہ تینوں امور انہیں اسی طرح یاد رہتے ہیں گویا یہ تینوں امور انہوں نے انجام دیئے تھے۔ ان کے حافظے کی زد سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ لیکن یہ صرف تنظیم میں منقسم ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بخت سکندرانہ ہے لیکن مزاج فقیرانہ۔ بس یہ ہے کہ یہ صدا نہیں دیتے۔ تھوڑی دیر متوحش رہتے ہیں لیکن اس سے پہلے کہ دل کی دھڑکن تیز اور نبض کی رفتار سست ہو جائے۔ یہ معتدل ہو جاتے ہیں اور یہی امام کا منصب ہونا چاہیے۔

ادب میں نہایت مودبانہ انداز میں یہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہے ہیں۔ آج سے کوئی بیس پچیس سال پہلے اچانک ان کے دل میں خیال آیا بلکہ شاید وسوسہ پیدا ہوا کہ ادب میں جمود نمودار ہو رہا ہے۔ شاید اس کی چاپ انہوں نے سن لی تھی۔ انہیں بلکہ یہ احساس ہوا کہ اگر اس نازک لمحے میں وہ چپ بیٹھے رہے اور آنے والے جمود کی مزاحمت میں انہوں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تو ادب گیا ہاتھ سے۔ انہوں نے بعجلت ممکنہ مٹی کو نرم کیا (یہ مٹی اس زمین کی تھی جس میں شاعر غزل کہا کرتے ہیں) پتہ نہیں مٹی کو نرم کرنے کے لیے جو خام مال انہوں نے استعمال کیا وہ آنسو تھے یا عرق انفعال، اور انہوں نے آزاد غزل کا بیج بو دیا (یہ بیج اس سے کوئی بیس پچیس سال پہلے بھی بو چکے تھے مگر اس وقت ان کے آنسو یا تو خشک تھے یا ان کے عرق انفعال میں مٹی کو نم کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی اس لیے آزاد غزل کی کونپل پوری طرح نہیں پھوٹی۔ اتفاق سے اس مرتبہ ساعت سعید تھی اور نیت نیک۔ انہوں نے مزید آبیاری کی جو ابر سانی سے ملتی جلتی ہوگی اور چند ہی دنوں میں فصل لہلہانے لگی۔ جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی کی کیفیت پیدا ہو گئی اور اس دوسری مرتبہ کی کوشش سے پیدا ہونے والی نوزائیدہ آزاد غزل کی وہ دھوم مچی کہ اس میں موسیقیت اور کانیکی کے اوصاف و اطوار کے بارے میں تفہیمی اور تلقینی مضامین شائع ہو گئے۔ اب یہ بات آئی گئی کی طرح گزر گئی۔ لیکن مظہر امام کی بروقت مدافلت اور مدافعت سے ادب میں وارد ہونے والا جمود کا کام لوٹ گیا۔ کہتے ہیں ان دنوں ہر شخص نے نئے تجزیے کی غزل کہی لیکن خود اس غزل کو شاید شاعروں کی صحبت پسند نہیں آئی۔ عام بھی چونکہ اس کا آزاد تھا اس لیے اس نئے کسی کی سنی نہیں۔ خود مظہر امام نے اپنی اس نور چشمی پر اپنا دست شفقت زیادہ دیر نہیں رکھا۔ (ہاتھ وہیں دھرا رہتا تو پھر یہ لکھتے کیسے؟)

مظہر امام کے متعلق مشہور ہے کہ یہ سن شعور کو پہلے پہنچے اور سن بلوغ کو بعد میں۔ اس تقدیم و تاخیر کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کس وقت کیا ہو جائے گا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ویسے یہ قاعدے میں رہے (قاعدے میں تو تھے ہی) ادب میں، بلوغ کے مقابلے میں شعور کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے اور یہی چیز دیرپا بھی ہوتی ہے۔ مظہر امام نے اسے نہ صرف اچھی طرح برتا بلکہ اس کے رنگ و روغن میں بھی مزید، جمالیات، پیدا کیں اور غزل کے تن بدن کی لسانیات یعنی اس کی باڈی لینگویج کو اتنا مرغن و مزین بنایا کہ اردو غزل لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن گئی۔ خود آزاد غزل نے بھی ان کی اتالیقی میں اچھے دن دیکھے۔ انہوں نے نئی نویلی غزل کے حق میں وہی کارنامہ انجام دیا جو تاریخ ہند میں بیرم خاں نے مہابلی جلال الدین اکبر کے لیے انجام دیا تھا۔ کہتے ہیں نصیر الدین ہمایوں مرحوم کی روح ہمیشہ بیرم خاں کے ساتھ رہی۔ بعض لوگ جن میں، میں (بظاہر) شامل نہیں ہوں آزاد غزل کی ولادت باسعادت کو ولادت باقیامت کہا کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ لیکن اب ان باتوں کو دہرانے سے فائدہ کیا ہے۔ لوگوں نے تو آزاد غزل کے لیے پولیو انجکشن بھی تجویز کئے تھے۔ لوگوں کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے کہ ادیبوں شاعروں میں جب بھی شکر رنجی کے پیدا ہونے کی واردات ہوئی ہے لوگ اس کے لیے بھی انسولین انجکشن تجویز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ انسولین انجکشن، شکر کی بیماری کا علاج ہیں۔ شکر رنجی کا علاج تو ہمارے ہندوستان میں حکیم اجمل خاں کے پاس بھی نہیں تھا۔ شکر رنجی سے میرے ممدوح مظہر امام کو بھی خالی دلچسپی رہی ہے لیکن صرف لمحاتی اور موقتی۔ متمدن آدمی ہیں اس لیے اپنی خشمگینی کو رباعی بلکہ ثلثیے (میں ثلاثی کو ہمیشہ ثلثیا کہتا ہوں) کی حد تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ مصرعوں کی فضول خرچی کو زبان کا زیاں جانتے ہیں۔ ان کی یہ لمحاتی دلچسپی بھی مثنوی سحر البیان سے کم نہیں ہوتی اور ایسا نہیں ہے کہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یا غالب ایوارڈ نے ان کے طرز بیان اور انداز تخاطب میں محاسن شعری پیدا کئے ہوں۔ یہ تو ان کا خالص ذاتی (اور صفاتی) سرمایہ ہے۔ دولت مند آدمی ہیں۔ مظہر امام لباس و پوشش کے سلسلے میں صرف متمدن نہیں، متدین شخص ہیں۔ بڑی دیانت داری کے ساتھ خود کو ملبوس و ملفوف کرتے ہیں اور گھر سے باہر آنے سے پہلے دیکھ لیتے ہیں کہ (پیشانی کے علاوہ) کپڑوں پر تو کوئی شکن نہیں آئی۔ ممکن ہے کسی سے مشورہ سخن بھی کرتے ہوں۔ یہ نفاست بھی کسی استری کی دین معلوم ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میک اپ نہیں کرتے لیکن ان کی تصویریں تاثر یہی دیتی ہیں کہ انہیں سجایا سنوارا گیا ہے۔ بعض موقعوں پر اہتمام بھی کتنا خوش گوار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اہتمام کہاں ہے۔ ان کی علمی ادبی حیثیت بھی گل بوٹے نہیں چاہتی۔ ان کے بارے میں پی ایچ ڈی کے مقالے تو صرف برائے اعتراف ہیں اور ان کا منافع، ان ہی کے کھاتے میں لکھا گیا ہے جن کے قلم سے یہ مقالے برآمد ہوئے ہیں۔ ان کی قامت کی درازی کا باعث، کوئی مصنوعی طرہ نہیں بلکہ ان کا ادبی وطیرہ ہے۔ ممبئی میں ایک مرتبہ ان سے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔ آکاش وانی کا مشاعرہ تھا اور چوں کہ مشاعرے میں شاعروں کے علاوہ کچھ سخن فہموں کی بھی ضرورت پڑتی ہے اس لیے میں سامعین کی صف میں موجود تھا اور شہ نشین سے قدرے فاصلے پر۔ لیکن مظہر امام کی متجسس آنکھوں سے بچنا محال تھا (ان کی تنقیدی بصیرت ہمیشہ ان کی بینائی کو تیز کرتی رہی) وہ شہ نشین سے اتر کر مجھ سے ملنے آئے (ان دنوں اسٹیج سے کون نیچے اترتا ہے لیکن انہیں ان کے تمدن نے اس عمل پر مجبور کیا) بانہیں کھولیں (باچھیں بھی کھولی ہونگی) اور بغل گیر ہوگئے۔ متبسم تو تھے ہی لیکن آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں۔ یہ سب کچھ میری زبان

بندی کے لیے تھا۔ لیکن میں نے بہر حال فرمائش کر دی کہ آج وہ ایک آزاد غزل سنا دیں۔ ہنسے اور اپنے محور پر واپس ہو گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے ایک چوتھائی مشاعرہ تو لوٹ ہی لیا تھا۔ وہ غزل بڑے اہتمام سے کہتے ہیں۔ سناتے بھی اس طرح ہیں جیسے شعر پڑھ رہے ہوں۔ شعر سنانے سے پہلے اپنے شعر کی وضاحت میں کوئی تعارفی تقریر نہیں کرتے۔ میں نے سنا ہے اس طرح ان کا ضمیر مطمئن رہتا ہے۔ ممکن ہے ان کے اس رویے کی وجہ سے مشاعرے کے بعد سامعین نے ان سے آٹو گراف لینے کے لیے مطلب یہ کہ آٹو گراف دینے کے لیے فرمائش تو کی ہو لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ان کا ضمیر بہر حال مطمئن رہا۔

مظہر امام باہر سے جتنے غمگین اور سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں اندر سے اتنے ہی مسطح اور ہموار ہیں۔ مسطح سے میری مراد (حالانکہ مراد کس کی بر آئی ہے) یہ ہے کہ ان میں اونچ نیچ کم ہے۔ حس مزاح وافر مقدار میں موجود ہے اور وہ اس کے برمحل استعمال میں خاصے فراخ دل ہیں۔ انہیں ورغلایا جائے تو وہ غیبت میں بھی دامے درمے اور سخنے حصہ لیتے ہیں۔ ان سے ایک مرتبہ ایک خاتون کا ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ میں تو انہیں بنی نوع انسان سے بے حد ہمدردی رکھنے والی شخصیت مانتا ہوں۔ مظہر امام چونکے (وہ بعض وقت چونکتے بھی ہیں خاص طور پر جب کسی مشاعرے سے واپس آکر سوتے ہیں تو صبح چونک کر ہی اٹھتے ہیں کہ ارے نو بج گئے) چونکنے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا وہ بنی نوع انسان کی ہمدرد کیسے ہو گئیں۔ میں نے سند پیش کی کہ موصوف نے شادی نہیں کی اور اس طرح ایک انسانی جان ضائع ہونے سے بچ گئی۔ یہ بنی نوع انسان کی ہمدردی نہیں تو اور کیا ہے۔ مظہر امام قہقہہ لگا کر ہنسنے کے عادی نہیں ہیں۔ کسی نے منع کر دیا ہو گا لیکن کافی دیر تک متحرک رہے۔ میں سمجھ گیا اندر ہی اندر ہنس رہے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ بظاہر سے زیادہ بباطن کے آدمی ہیں۔ انگریزی میں شاید ایسے شخص کو انٹروورٹ کہا جاتا ہے۔ اشعار میں البتہ خوب کھلتے ہیں۔ ان کے تعلق سے حال ہی میں ایک کتاب منظر عام پر آئی ہے جو میری نظر سے نہیں گزری لیکن مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ صاحب تصنیف نے جو خود بھی کسی گوشے سے امام ہیں (شاید امام اعظم ہیں) ان کی شاعری کے بارے میں کوئی نتیجہ بھی اخذ کیا ہے۔ خوشی کی بات ہے ورنہ عام طور پر یونیورسٹی کے مقالوں میں نتیجہ اخذ نہیں کیا جاتا حذف کیا جاتا ہے.....

میں ان کی حس مزاح کے بارے میں رائے دے رہا تھا۔ یہ کسی نہ کسی شعر میں یعنی ان کے اپنے شعر میں جاگ پڑتی ہے۔ اس وقت ایک شعر یاد آگیا۔ سن لیجیے۔

خیریت پوچھتے ہیں لوگ بڑے طنز کے ساتھ　　جرم بس یہ ہے کہ ایک شوخ کا ہمسایہ ہوں

میں کیوں پوچھوں کہ کیا انہوں نے کبھی حق شفعہ کی طرف توجہ کی یا یونہی انہیں شفا ہو گئی۔ بہر حال ان کے اس شعر نے داغ کا ایک شعر یاد دلایا۔

شوخی سے ٹھہرتی نہیں قاتل کی نظر آج　　برقی نظر دیکھیے گرتی ہے کدھر آج

لیکن داغ کھلی کتاب تھے۔ ان سے کچھ پوچھنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔

غزل

مظہر مجاز

معرعوں کا تال میل نہیں ہے جناب من — یعنی غزل ہے، کھیل نہیں ہے جناب من
ہر ایک کے یہ ہاتھ نہیں آتی ہاتھوں ہاتھ — ہر اک سے اس کو میل نہیں ہے جناب من
ہر اک شجر پہ چڑھ کے لپٹتی نہیں کبھی — جنگل کی کوئی بیل نہیں ہے جناب من
تخییل کی نہیں یہ چڑی ماری اے عزیز! — بچوں کی یہ غلیل نہیں ہے جناب من
خون دل و جگر کا طلب کرتی ہے یہ دان — ہرنی کی یہ کلیل نہیں ہے جناب من
معنی کا حسن دیکھنا ہے آنکھ کھول کر — اندھوں کی یہ بریل نہیں ہے جناب من
آفاق میں بھرپور تخیل کی ہے اڑان — الفاظ کی یہ جیل نہیں ہے جناب من
یہ قافیہ عصا نہیں اندھے کے ہاتھ کا — یا اونٹ کی نکیل نہیں ہے جناب من
سانچے میں اک ڈھلی ہوئی ہے سر سے پانو تک — بے ڈول اور ڈیل نہیں ہے جناب من
ہاں یہ بھی سچ ہے ہر کس و ناکس کے واسطے — اس کی گلوں میں تیل نہیں ہے جناب من
ملتا ہے اس کا روح معانی سے سلسلہ — لفظوں کی آل بیل نہیں ہے جناب من
ہے اس کا ظرف حرف غزل گو کا امتحاں — وہ فیل ہیں، یہ فیل نہیں ہے جناب من
میلے میں قافیوں کے، ردائف کی بھیڑ میں — معرعوں کی ریل پیل نہیں ہے جناب من
القصہ شاہ زادیٔ ملکِ مقال ہے — المختصر معمول نہیں ہے جناب من

مظہر یہ ہے امانتِ الہام و آگہی
یعنی برائے سیل نہیں ہے جناب من

***

باتزغ بہاری
کلکتہ

نیکی کر دریا میں ڈال

میں نے بیگم سے کہا ، اے میری پیاری اہلیہ
اے میری جان تمنا ، اے میری زہرہ جبین
سن کے بولی اہلیہ ، ہو کام سے فرصت اگر
تم جو کرتی ہو اکیلی گھر کے سارے کام کاج
دیکھ کر صحت تمہاری مجھ کو ہوتا ہے ملال
پھول سا کھلتا ہوا چہرہ خزاں کی زد میں ہے
دیکھ کر چہرہ تمہارا اے میری زہرہ جمال
گھر میں لاؤں کچھ پریورتن تمہارے واسطے
تاکہ چھٹکارا ملے تم کو گھریلو کام سے
ضبط کی قوت جو حد سے اکسپائر ہوگئی
میرے گھر میں آگیا پھر تو اچانک زلزلہ
جی میں آئے جو تمہارے وہ کرو ٹوکے گا کون
خوب گلچھرے اڑاؤ ٹھاٹ سے شام و سحر
میں نے بیگم کو دکھایا راستہ تعمیر کا
کس قدر ہوتا ہے ناقص صنف نازک کا دماغ
اب کوئی شوہر نہ دے گا اہلیہ کو مشورے
کس طرح میکے نکل بھاگی وہ ہرجائی نہ پوچھ

تم سے اک ٹاپک پہ کرنا ہے ضروری مشور
چند لمحوں کے لئے بیٹھو ذرا میرے قری
عرض کی میں نے ، اے میری ہمنشین و ہم
بانی دی وے ، ہو نہ جاؤ مبتلائے اختلا
آگیا ہے وقت سے پہلے جوانی پہ زوا
حسن کے بارود کا فقدان خال و خد میں ہ
اب تو شدت سے مجھے ہونے لگا ہے یہ خیا
عقد ثانی کرکے اک سوکن تمہارے واسطے
رات دن بیٹھی رہو کھٹئے پہ بس آرام سے
سنتے ہی یہ اہلیہ ناگاہ فائر ہوگئی
کھاکے پیچ و تاب یوں بیگم نے مجھ سے یہ کہ
عقد ثانی شوق سے کرلو تمہیں روکے گا کون
ہو مبارک گھر تمہیں یہ میں تو چلی ابو کے گھر
" سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا "
تیرگی شب میں تو میں نے جلایا تھا چراغ
قول ہے پرکھوں کا نیکی کے زیاں لئے
" کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ "

حال ایسے میں ہوا یہ باتزغ دلگیر کا
" صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا "

مرزا کھونچ
بھیا ٹولہ، بیتیا
بہار 845438

کچھ کچھ ہوتا ہے

کچھ کچھ ہونا ہی زندگی کی علامت ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے اور جب تک مر نہیں جاتا، اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے، تب بھی وہ اس جنجال سے نجات نہیں پاتا۔ پہلے اسے کچھ کچھ ہوتا تھا، اب اس کے نام پر کچھ کچھ ہوتا ہے۔ جب سے دنیا قائم ہے۔ تب سے آج تک، کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں کچھ کچھ ہوتا آیا ہے۔ کہیں حکومت بدل رہی ہے تو کہیں جنگ ہو رہی ہے۔ کہیں زلزلہ کا زور ہے تو کہیں سیلاب سے لوگ دو دو ہاتھ کر رہے ہیں کبھی کبھی خشک سالی گلے لگاتی ہے تو کبھی آگ زنی کے لیے چندہ ہو رہا ہے اور جب تک دنیا رہے گی کچھ کچھ ہوتا رہے گا۔
چونکہ کچھ کچھ ہونا زندگی کی علامت ہے، اس لیے ہر ذی روح اپنے کو زندہ ثابت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ صرف جاگنے کی حالت میں کچھ کچھ ہوتا ہے۔ نیند میں بھی یہ عمل جاری رہتا ہے۔ خواب میں لات چلانا ہنسنا، رونا، بڑبڑانا اور ساری دنیا کا بے تاج بادشاہ بن جانا، نیند میں کچھ کچھ ہونے کی علامت ہے۔ کچھ کچھ ہونا ایک فطری عمل ہے اور فطرت سے بغاوت کرنے کا مطلب ہے موت کو دعوت دینا۔ یہ تو معلوم ہوگا کہ کچھ کچھ ہوتا ہے لیکن یہ کیا بلا ہے کسی کو نہیں معلوم یہ کیسے ہوتا ہے یہ بھی پتہ نہیں ہے، لیکن ہوتا ہے اور اس کے ہونے کے بعد کیا نتیجہ نکلتا ہے سبھی بخوبی جانتے ہیں۔ اس کی شکل و شباہت کیسی ہے، یہ آج بھی وضاحت طلب ہے نہ اس کے مقدار کا کچھ پتہ ہے اور نہ ہی اسے شمار کیا جاسکتا ہے لیکن بغیر کچھ کچھ ہوئے کام نہیں ہوتا۔ زندہ قومیں وہ ہوا کرتی ہیں جن کے یہاں ہمیشہ کچھ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ کبھی خاموش بیٹھنا نہیں چاہتیں۔ وہ امن کے لیے جنگ کرتی ہیں تو کرتی ہی چلی جاتی ہیں اور اس وقت تک جنگ کرتی ہیں جب تک انہیں یہ پتہ نہ چل جائے کہ اب امن کو کہیں سے بھی خطرہ نہیں ہے۔ امن کے دشمنوں کے ساتھ ساتھ ان کے بال بچے بھی ملک عدم کو پہنچ گئے ہیں۔ جب کوئی رہے گا نہیں تو ہو کا عالم ہوگا اور ایسی حالت میں امن کو کہیں سے خطرہ نہیں رہتا۔ اور امن کے بعد بھی یہ قومیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھا کرتی ہیں۔ مزید امن قائم کرنے کے لیے ہتھیار بناتی ہیں۔ اور جب ہتھیاروں کا ذخیرہ ہو جاتا ہے تو اس کے استعمال کے لیے بھی کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیتی ہیں اور جواز ملتے ہی پھر کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ ایک طرف انسان ہلاک ہوتے ہیں تو دوسری طرف انسانی زندگی کو بچانے کے لیے دوائیں ایجاد ہوتی ہیں۔ حفاظتی اقدام ہوتے ہیں۔ اور جہاں کچھ کچھ نہیں ہوتا ہے وہ قوم مردہ قوم کہلاتی ہے۔

جس ملک میں ہمیشہ کچھ کچھ ہوتا رہتا ہے، وہ ملک ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے اور حرکت میں برکت ہے۔ وہ ملک

اگر معاشی نہیں تو سیاسی طور سے ضرور زندہ ملک کہلاتا ہے۔ معاشی ترقی کے لیے کچھ کچھ ہو جانا بہت ضروری ہے۔ اس لیے اس ترقی کو اور مستحکم بنانے کے لیے کمیشن اور دستور کا رواج قائم ہے۔ دفتر میں جب تک کچھ کچھ نہ ہو کام کرنے میں من نہیں لگتا اور یہ کسی بھی ملک کے لیے مضر ہے کہ دفتر میں کام کرنے کو دل نہ چاہے۔ دل لگانے کے لیے یہاں بھی کچھ کچھ ہوتا ہے، یعنی دستوری ملتی ہے اور ہڑتال ہوتی ہے۔ اسی ہڑتال کی وجہ سے کام کرنے میں تیزی آتی ہے اور جب جیب میں کچھ کچھ ہونے لگے تو سمجھ لیجیے کہ اپنی معاشی ترقی شروع ہو گئی۔ سیاسی ترقی کے لیے بھی کچھ کچھ ہو جانا بہت ضروری ہے۔ مثلاً کرسی کے لیے جنگ، سیاسی پارٹیوں کی بے تحاشہ پیدائش، حکومت گرانا پھر اسے اٹھانا، عوام کو فرقوں میں بانٹنا، امیری اور غریبی کے بیچ دوری بڑھانا، اس مذہب سے اس مذہب کو لڑانا، کچھ کچھ ہونے کی نشانی ہے۔ اس طرح ملک میں کچھ کچھ ہوتے رہنے سے وہ ملک جمود کا شکار نہیں ہوتا۔ خون کی حرارت بڑھتی رہتی ہے اور جہاں لوگوں کے خون میں زیادہ حرارت پائی جاتی ہے وہاں کی پولیس دن رات گردش میں رہتی ہے ہمارے یہاں کے رہنماؤں کو دوسری جگہوں کے رہنماؤں سے زیادہ کچھ کچھ ہوتا ہے۔ کبھی تو چاروں طرف چیخ و پکار سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ ایسی بات نہیں ہے کہ یہاں کی عوام کو کچھ کچھ نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے مگر کبھی کبھی۔ لیکن جب عوام کو کچھ کچھ ہونے لگتا ہے اس وقت کا عالم بیان سے باہر ہے۔

میرے ایک دوست پروفیسر رحمن ہیں۔ وہ کالج میں فزکس کے استاد ہیں۔ وہ "فیزی کل چینج" کا ایک بہترین نمونہ ہیں۔ فوراً بیمار پڑتے ہیں اور فوراً ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ دنیا کے سارے علوم پر وہ علم طبیعات کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مذہب، سیاست اور محبت میں بھی طبیعات ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ ایک شام جب میں ان سے ملنے گیا تو ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو وہ بستر پر دراز آنکھیں موندے ایک گانے کا ٹکڑا "کیا کروں ہائے کچھ کچھ ہوتا ہے" گنگنا رہے تھے۔ میں ایک طرف کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد انہیں احساس ہوا کہ بغل میں کوئی بیٹھا ہے۔ تو فوراً انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں سامنے مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے

"کہیئے مرزا، کب آئے"

بس ابھی، ابھی، میں نے جواب دیا "آج آپ بڑے اچھے موڈ میں ہیں اس سے پہلے میں نے آپ کو ایسی حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شاعری کرنے کا شوق چرایا ہے یا گھر سے کوئی خوش خبری آئی ہے"۔ میں ان سے پوچھ بیٹھا۔

"نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ کہاں شاعری اور کہاں فزکس۔ حالانکہ بغیر فزکس کے شاعری بھی مکمل نہیں ہے، لیکن شاعری اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ ابھی ابھی ریڈیو سے ایک گانا آرہا تھا "کیا کروں ہائے کچھ کچھ ہوتا ہے"، وہی گنگنا رہا تھا۔ ظالم نے کیا گیت لکھا ہے۔ یہ گانا نہیں مکمل فزکس ہے۔ نیوٹن کو جب کچھ کچھ ہونے لگا تو وہ سیب کے باغ میں ٹہلنے نکل پڑا اور وہاں اسے جو ہاتھ لگا وہ آپ سبھی جانتے ہیں۔ آرشمیدس کو جب کچھ کچھ ہونے لگا تو ندی میں نہانے نکل پڑا اور وہاں سے "لا آف فلوٹیشن" لے آیا۔ اس طرح جتنے بھی سائنس داں گزرے ہیں، انہیں جب بھی کچھ کچھ ہوا ہے انہوں نے دنیا کو ایک نئی چیز دے ڈالی ہے۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اللہ کرے آپ کو بھی کچھ کچھ ہو، اور آپ بھی دنیا کو ایک نئی چیز دے ڈالیں، تاکہ آپ کے ساتھ میرا بھی نام جانے کہ میں آپ کے دوستوں میں ہوں" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ضرور، ضرور، کئی دنوں سے لگ رہا ہے کہ مجھے بھی کچھ کچھ ہونے والا ہے۔ کیونکہ بہت دنوں سے میں بھی نرکس کے طالب علموں کو ایک گیس پیپر دینے کے موڈ میں ہوں۔ اس کی اشاعت پر آپ کا نام بھی دے ڈالوں گا اس طرح میرے ساتھ آپ کا بھی نام ہو جائے گا۔"

ابھی وہ کچھ اور کہنے والے تھے کہ ایک صاحب اور ان سے ملنے آگئے اور باتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور میں اس وقت اللہ سے دعا مانگنے لگا کہ "یا اللہ انہیں کچھ کچھ بھی نہ ہو ورنہ ان کے ساتھ میری بھی عاقبت خراب ہو جائے گی"

انسانی زندگی میں محبت کی اہمیت بڑی زبردست ہے۔ جب تک دل میں کچھ کچھ نہ ہو دو دل نہیں مل پاتے ہیں۔ اگر دل میں کچھ کچھ نہ ہو تو محبت کا نام سن کر ہی ڈر لگنے لگتا ہے۔ اس سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں ہو پاتی ہے۔ رقیب روسیاہ سے نپٹنے کے نام پر ہی پسینہ چھوٹنے لگتا ہے سگ لیلیٰ کا خونخوار چہرہ دور سے ہی راستہ بدلوا دیتا ہے۔ لیلیٰ کی والدہ کی آواز سن کر ہی کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے، سارا جسم اگنی میزائل کی طرح فائر ہو جاتا ہے۔ نگاہیں چار کیا، چھ یا آٹھ بھی ہونے لگتی ہیں۔ کچھ کچھ ہوتے ہی گیدڑ شیر بن جاتا ہے۔ جیب ہلکی ہونے لگتی ہے۔ بنا جودہ سوئیوں کی پرواہ کئے سگ لیلیٰ سے بوس و کنار شروع ہو جاتا ہے۔ دوستوں کی محفلوں سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔ نگاہیں در جاناں پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اور جب یہ کچھ کچھ ادھر بھی ہونے لگتا ہے تو کچھ ہی دنوں میں دونوں کے پینڈ بج جاتے ہیں۔ الا دولتی زندگی کی گاڑی چھک چھک چلنے لگتی ہے۔ لیکن جب یہ کچھ کچھ ہاتھ پیر پھیلانے لگتا ہے تو گاڑی رک رک کر چلنے لگتی ہے۔ کبھی کبھی یہ گاڑی اپنا راستہ بھی بدل دیتی ہے جس کی وجہ سے لڑکا والدین کے گھر کا راستہ بھول جاتا ہے۔ عقیقہ، سگائی، ولیمہ اور چہلم کے موقع پر کچھ کچھ ہونا، ان تقریبوں کو زینت بخشتا ہے۔

زندگی کے ہر شعبہ میں بغیر کچھ کچھ ہوئے کام نہیں چلتا۔ ادب بھی ہماری سماجی زندگی کا ایک مہذب ترین شعبہ ہے جہاں تہذیبی روایات کا ہر دم خیال رکھا جاتا ہے۔ ناپاک سے ناپاک ارادوں کو پاکیزگی کے ساتھ پیش کرنے کے گر بتائے جاتے ہیں۔ مصرعے اڑانے کے جائز طریقے بتائے جاتے ہیں۔ سہرہ رخ پہ گھونگھٹ لگا کر عوام کے سامنے کیسے پیش کیا جائے اس کی جان کاری ملتی ہے۔ لیکن یہ ہر ایرے غیرے کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے الگ قسم کا دل اور عجب طرح کا کلیجہ چاہیے۔ شاعر یا افسانہ نگار کوئی یوں ہی نہیں بن جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر کوئی اپنا مصرع گنگنانے کی دھن میں رہتا، کوئی کسی کی سنتا نہیں۔ شاعر اور سامعین کا فرق نہیں رہ جاتا۔ اس لیے بغیر دل میں کچھ کچھ ہوئے ایک عام آدمی شاعر یا افسانہ نگار نہیں بن سکتا۔ ایک شاعر کو دیکھیے جب اس کے دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے تو وہ شاعری کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو مگر اپنے شعروں میں دور کی کوڑی لاتا ہے۔ محبوب سے ملنے کی خاطر چہار دیواری تو نہیں پھاند سکتا لیکن بات کرتا ہے تارے توڑ لانے کی۔ اور جب تک دل میں کچھ کچھ نہ ہو یہ بات دماغ میں آ ہی نہیں سکتی۔ ایک افسانہ نگار کے دل میں جیسے ہی کچھ کچھ ہونے لگتا ہے تو فوراً کہانی کے کئی پلاٹ سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے نظر آتے ہیں۔ اور جب دل میں مزید کچھ کچھ ہونے لگتا ہے تو وہ اپنے افسانے کو ایسا کھینچتا ہے کہ ناول بن جاتا ہے شاعر غزل کو ایسا مروڑتا ہے کہ وہ ایک آزاد نظم بن جاتی ہے۔ مضمون نگار کے دل میں جب کچھ کچھ ہوتا ہے تو وہ اپنے مضمون کو ایسا کھینچتا ہے کہ وہ ریسرچ اسکالر کا تھیسس بن جاتا ہے۔

صرف پڑھ کر کوئی طالب علم پاس تو کر سکتا ہے مگر امتیازی نمبر لے نہیں آسکتے۔ امتیازی نمبر پانے کے لئے بھی

کچھ کچھ ہونا ضروری ہے ساب لڑکے کا کام صرف امتحان دینا ہے باقی کا کام اس کے والد محترم کرتے ہیں سوزنہ لڑکے کو نہ نوکری ملے گی نہ جہیز ـ جب آپ کو اپنے بیٹے کے لئے دل میں کچھ کچھ ہوگا تو آپ اپنی کمائی پر ضرورت سے زیادہ دھیان دیجئے ـ ایک کا پانچ کرنے کی کوشش کریںگے ـ لیکن ذرا احتیاط سے اس میں ذرا بھی بداحتیاطی برتی گئی کہ گئے کام سے ـ جب تک آپ کے دل میں اپنے پڑوسیوں کے لئے کچھ کچھ نہ ہو آپ کا رہنا وہاں بیکار ہے ـ آپکا لڑکا پڑوسیوں کے لڑکوں سے ہمیشہ پٹتا رہے گا ـ اس لئے رعب دار زندگی گزارنے کے لئے آپ کے دل میں پڑوسیوں کے لئے کچھ کچھ ہونا چاہیئے ـ اگر پڑوسیوں کے لئے آپ کے دل میں درد نہیں ہے تو کم سے کم انہیں درد فراہم کرنے کا کام ضرور کرنا چاہیئے ـ

میرے کہنے کا مطلب ہے کہ جب تک دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے اس وقت تک باہر بھی کچھ کچھ ہوتا ہے اور جہاں دل میں کچھ کچھ ہونا بند ہوا سمجھ لیجیئے کہ آپ گئے کام سے آپ کا تبادلہ عالم بالا پر جلد ہونے والا ہے ـ محبت کرنی ہو، نفرت کرنی ہو، یہاں تک کہ عبادت کرنی ہو تب بھی دل میں کچھ کچھ ہونا چاہیئے ـ یہ کیا کہ منہ اٹھائے مسجد گئے دو ٹکر لگائی اور چلے آئے ـ جب تک دل میں کچھ کچھ نہ ہو عبادت میں مزہ نہیں آتا ہے ـ لوگ تعظیم سے نہیں تو کم سے کم جل کر ہی کہیں "دیکھو، نمازی صاحب جا رہے ہیں" جب تک آپ کے دل میں کچھ کچھ نہیں ہوتا آپ کی خیرات ایک چونی سے آگے نہیں بڑھتی ـ آپ کا دیا ہوا چندہ سب سے کم نظر آتا ہے ـ عبادت کے لئے دل میں کچھ کچھ ہونا چاہیئے جس کے کرنٹ سے آپ کی عبادت کی بیٹری چارج ہو سکے ـ اللہ کا دل میں ڈر بھی کچھ کچھ ہونے کی ایک قسم ہے اگر دل میں کچھ کچھ نہ ہو تو جینا بیکار ہے ـ

مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

زندہ دلی، رہبری، خودکشی، دل لگی، دوستی، دشمنی، عاشقی، سخاوت، عبادت، بغاوت، محبت، یہ ساری چیزیں اس وقت وقوع پذیر ہوتی ہیں جب دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے ـ



ڈاکٹر سید عباس متقی

حیدرآباد

خدا بچائے "انوجیلیشن" سے

آج کل ٹہلنے کی سزا پا رہا ہوں ۔ مجھے پتہ ہی نہیں کہ یہ سزا کس خطا پر دی گئی ہے ۔ شاید مدرس ہونے کی پاداش میں سزا کی یہ مدت کوئی نصف ماہ کی ہوتی ہے جو کاٹے نہیں کٹتی ۔ گویا مجرموں کو "کالا پانی" اور مدرسوں کو "انوجیلیشن" بس ٹہلتے رہیے ، ٹہلتے رہیے ۔ اپنے ٹہلنے کے انداز و رفتار پر مجھے خود پر کسی نہ کسی جانور کا گمان ہونے لگتا ہے ۔ مثلاً جب میں ٹہلنے کی بسم اللہ کرتا ہوں اور تازہ دم ہوتا ہوں اور پاؤں پوری توانائی سے اٹھتے اور پڑتے ہیں تو خود کو پنجرے کا شیر سمجھتا ہوں ۔ فطری طور سے اس وقت پورا ماحول ساکت بلکہ مجھ سے مرعوب سا رہتا ہے ۔ کچھ وقت گزر جانے کے بعد قدرے تھک جاتا ہوں اور ٹہلنے کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے تو خود پر "گھانے کے بیل" کا گمان ہونے لگتا ہے ۔ پاؤں وزنی ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتا ہوں ۔ "یہ شور سا کہاں سے اٹھتا ہے" اور جب بہت زیادہ تھک جاتا ہوں تو کچھوے کی رفتار سے رینگنے لگتا ہوں اور پھر آخری آخری لمحوں میں زوال آفتاب کا سایہ بن کر سرکنے لگتا ہوں اقبال نے شاید یہ مصرعہ "چلنا چلنا مدام چلنا" شاید "انوجیلیشن" کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا ۔ چلنا اور مدام چلنا شاید ایک نگران کار امتحان ہی کا حق ہے دوسرا اس فرضی منصبی کی ادائیگی کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔

ٹہلنے کے علاوہ نگران کار کے ذمہ "ایڈیشنل" کی سپلائی کی زائد ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے ۔ اور نگران کار "ایڈیشنل" کے نام پر رقص کرتا ہوا آنگن کے ٹیڑھے ہونے کا ماتم بھی کرتا نظر آتا ہے چنانچہ میں مشرق میں ہوتا ہوں اور مغرب سے آواز آتی ہے ۔ "سر..... ایڈیشنل" میں مغرب میں ہوتا ہوں تو شمال و جنوب سے کوئی زنانہ کوئی مردانہ آواز گونجتی ہے "سر..... ایڈیشنل اب تو میں خواب میں بھی غلام گردش کا عادی ہو گیا ہوں ۔ رات کو اچانک اٹھ بیٹھا..... بیگم بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں ۔ بیگم سے پوچھ بیٹھا "ایڈیشنل چاہیے" ۔ دودھ والا دودھ ڈال کر جانے لگا تو میں نے کہا ۔ کیا بھائی ۔ تھوڑا ایڈیشنل ۔ بازار سے لنگی خریدی تو سوال کر بیٹھا ۔ کیوں بھائی اس میں ایڈیشنل نہیں ہے ۔ طلباء پانی کے لیے اٹھتے ہیں یا ایڈیشنل کے لیے اور سر ۔ سر کہہ کر مرا بھیجا چاٹ جاتے ہیں پتہ نہیں کس گناہ کی یہ سزا مل رہی ہے ۔ تھکن کی وجہ سے ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ پانی کی اجازت مانگنے والے کو ایڈیشنل تھما دیا اور ایڈیشنل مانگنے والے کو پانی پینے باہر بھیج دیا ۔

امتحان دینے والے سارے طلبا آرام سے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے ، اپنی اپنی جوابی بیاض پر جھکے اپنا اپنا لکھ رہے ہیں اور میں ہوں کہ بیٹھنے کے آرام کو ترستا ہوا بس ٹہلے جا رہا ہوں ۔ کرسی تو کجا اسٹول تک نہیں ہے کہ ترستی اور لرزتی ،

ٹانگوں کو ٹکنے کی سعادت نصیب ہوتی۔

ایں سعادت بزورِ کرسی نیست

ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میرا جنم ہی ٹہلنے کے لیے ہوا ہے۔ میں جس سنٹر پرانو یجیلیشن کی مزاکات رہا ہوں اس کے ذمہ دار لتنے قاعدے اور قانون کے لوگ ہیں کہ محض بچوں کی بہتر نگہداشت کے لیے اساتذہ کو ٹہلا دیتے ہیں اور کرسی یا اسٹول کا تک اہتمام نہیں کرتے ان میں شاید خوف ہے کہ اگر اسٹول رکھ دیا جائے تو استاد اپنی عادت دیرینہ کے تحت اس پر جو ٹکے گا تو پھر اٹھے گا نہیں۔ شاید انہیں یقین ہے کہ اساتذہ حضرت داغ کی طرح کوئی شئے ہوتے ہیں۔ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے۔ غالباً میں ان اساتذہ میں سے نہیں ہوں جو محض بیٹھے رہنے کو پڑھانے کا نعم البدل جان کر اور اپنے درجے کی کرسی کو ام، ال، اے کی کرسی کا درجہ دے کر عرصہ درس گنواتے اور فرائض تدریس فراموش کرتے ہیں میں ٹہل ٹہل کر پڑھانے کا عادی ہوں۔ جو نکہ یہ "پڑھانا اور ٹہلنا" کوئی ڈھائی گھنٹے کا کوئی مسلسل ناگوار تجربہ نہیں ہوتا اس لیے روح کی گہرائیوں پر گراں نہیں گزرتا۔ کس کم بخت میں اتنی ہمت، نامردی اور بے نیازی ہے کہ ڈھائی گھنٹے کا طویل عرصہ چپ چاپ سنجیدہ اور عقابی نظر لیے ٹہل ٹہل کر گزار دے۔

طرز زحمت یہ کہ "یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری" والا معاملہ مسلسل طاری ہے کوئی بات کرنے والا ہے نہ سننے والا۔ کاش ایسا ہی معاملہ اگر پارلیمنٹ میں بھی در آتے تو اقبال کے اس مشہور خیال "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی تصدیق ہو۔ کسی لڑکے یا لڑکی سے اک آدھ بات کرنے کی کوشش بھی رائیگاں جاتی ہے کہ سارے طلبا کو لکھنا اور صرف لکھنا ہے انہیں بات کرنے کی کیا آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ بلکہ بعض طلبا۔ اتنا لکھتے ہیں کہ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں یہ لوگ محض لکھنے کو تو کامیابی کی دلیل نہ سمجھ رہے ہوں۔ کامیابی نوشتہ تقدیر میں لکھی ہونی چاہیے۔ فی زمانہ علم و لیاقت سے ترقی ممکن نہیں البتہ رشوت و سیاست سے اس کا حصول ممکن ہے مجھے تو ان بچوں کے انہماک خامہ فرسائی پر حیرت ہونے لگتی ہے کہ آخر یہ کس ملک میں قلم چلا رہے ہیں جہاں مدت ہوئی قلم کا وقار مجروح ہو چکا ہے۔ اگر یہ درجہ اول سے بھی کامیاب ہو جائیں تو کیا ہوگا ممکن ہے میری طرح بے نیل و مرام گردان لئے جائیں۔ کار گزاریوں سے منزلیں نہیں ملتیں تملق و مداہنت سے ملتی ہیں۔ ٹہلتے ہوئے ہندوستانی کے ذہن میں اگر اس قسم کے فلسفیانہ خیالات نہ در آئیں تو خود ٹہلنے کی توہین ہے۔ ٹہل ٹہل کر جب میں تھک جاتا ہوں اور تھکے ہوئے بچے کی طرح کسی بچے کی بغل میں بیٹھتا ہوں تو معاً "احساس تنزل" مکرر کھڑا بلکہ ٹہلا دیتا ہے۔

ان ویجیلیشن اگر محض ٹہلنے کا نام ہوتا تو کوئی بات نہ تھی کہ یہ کام بہادر شیر اور شیر سے بہادر بادہ خوار بھی کر لیتا ہے لیکن کئی بار بلکہ بار بار ایڈیشنل تقسیم کرنا پڑتا ہے اور بچے ایڈیشنل اس فراخ دلی سے مانگتے ہیں جیسے جہیز مانگ رہے ہوں۔ نیز بچوں سے ہاتھ جوڑ کر اپیل کرنی پڑتی ہے کہ اگر کسی کے پاس "زادِ راہ" ہو تو وہ میرے حوالے کر دے ورنہ اسے "پولیس" یا (Flying Squad) کے حوالے کر دیا جائے گا۔ بچے جب "واقعی پولیس" سے نہیں ڈرتے تو یہ "وقتی پولیس" سے کیا ڈریں گے۔ میں بچوں کو چیک بھی کرتا ہوں مگر پتہ نہیں یہ "زادِ راہ" کن "منزلوں" میں رکھ چھوڑ دیتے ہیں کہ چشم انگشت محروم زادِ راہ قرار پاتی ہے۔ کیا مجال جو کوئی بچہ کوئی پرزہ وقت سے پہلے نکال باہر کر دے۔ پرزہ ہو یا چلتا پرزہ وقت پر ہی نمودار ہوتا ہے بچوں کو پھر اپنی آبرو و ملازمت کی دہائی دینی پڑتی ہے کہ اگر بچوں کے پاس

سے کوئی پردہ برآمد ہوگا تو ہمیں شعبہ سے برآمد کر دیا جائے گا۔ صاحبان ذی ہوش نے جب مری دہائی نہیں سنی ہے تو طالبان ذی جوش میری دہائی کیا سنیں گے۔

امتحانات کے زمانے میں فلائنگ اسکواڈ ایک "ہوا" ہوتا ہے۔ فراعنہ وقت و نوادر ہر زمانہ کی ونونہ انگیزی دیکھنے لائق ہوتی ہے۔ جب سنٹر پر فلائنگ اسکواڈ اپنی روایتی جبر و اقتدار کے ساتھ آدھمکتا ہے تو بچوں پر تو کوئی اثر نہیں ہوتا میری گھگھی بندھ جاتی ہے۔ ماحول کو سانپ ہی نہیں ہر موذی جانور سونگھ جاتا ہے۔ چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں اور ہوائیں سیٹی بجاتی ہوئی طوفان مچانے لگتی ہیں۔ اس قدر گرد و غبار اڑتا ہے کہ "کوئی صورت نظر نہیں آتی" اور اتنی افراتفری پھیل جاتی ہے کہ "کوئی امید بر نہیں آتی"۔ وہ نگران کار جو کاہل اور سست رفتار تھے اپنے آپ کو اپنی مرضی کے بغیر کنجی دے کر دوڑنے لگتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کئی ساسیں بیک وقت اپنی بہو پر رعب جمانے چلی آئی ہوں اور بلا تحقیق اس کے چال و چلن پر شبہ کر رہی ہوں ایک احمق تو میری جیبیں ٹٹولنے لگا۔ جب میری جیب سے مری بیگم کو کچھ نہیں ملتا تو فلائنگ اسکواڈ کو کیا ملے گا۔ اس کا دست تلاش مرے جیب سے قلاش برآمد ہوتا ہے۔ پتہ نہیں ان حضرات میں محکمہ پولیس محکمہ بلدیہ اور محکمہ انکم ٹیکس کے ملے جلے اثرات کیوں پیدا ہو جاتے ہیں۔ صورت و سیرت سے یہ لوگ انسانوں کے فرتے کے معلوم نہیں ہوتے۔ میں بھی سوچنے لگتا ہوں یہ چاند لوگ اور ان کی چاندنی دس پندرہ دنوں کی ہے۔ میں نے اپنے آفیسر کے آگے دست سوال دراز کیا تھا کہ ایک نالائق کو یہ لیاقت طلب کام نہ سونپا جائے مگر اب میں خدا کے حضور دست دعا دراز کروں گا۔

غزلیں

احمد علوی
185/8 منیر آباد، لساری روڈ، میرٹھ

بیکار تیرے "علوی" اب ویوز ہورہے ہیں — اچھے تھے شعر جتنے سب فیوز ہورہے ہیں
اب دوستی کا مطلب شاید یہی رہا ہے — تم یوز کررہے ہو ہم یوز ہورہے ہیں
باتوں پہ اب کسی کو ہوتا نہیں بھروسہ — آکاش وانی والی ہم نیوز ہورہے ہیں
میرا خیال ہے کہ ایکسپورٹ ان کا کردو — بے کار انڈیا میں کنفیوز ہورہے ہیں
یورپ میں ان کی اچھی قیمت ملے گی ہم کو — اس کنٹری میں لیڈر مس یوز ہورہے ہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رؤف رحیم

جب گرو مہرباں نہیں ہوتا — کوئی مصرعہ رواں نہیں ہوتا
کیسے کیسے جواں ہوئے بوڑھے — کوئی بوڑھا جواں نہیں ہوتا
آئینے کو غزل سناتا ہوں — جب کوئی قدر داں نہیں ہوتا
بھیک ملتی ہے سب کو سانسوں کی — کون بھکو میاں نہیں ہوتا
کوئی ابن فلاں نہیں ہوتی — کوئی بنت فلاں نہیں ہوتا
پیاس لے کر وہاں پہ جاتا ہوں — جس جگہ پر کنواں نہیں ہوتا
شہر امن و اماں وہی ہے اب — جس میں امن و اماں نہیں ہوتا
مجھ سے وہ کھل کے بات کرتے ہیں — جب عدودر میاں نہیں ہوتا
دال ہانڈی میں خود ہی گلتی ہے — دال کا امتحاں نہیں ہوتا
ہم ہیں چمگادڑوں کی طرح رحیم — اس لئے آشیاں نہیں ہوتا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

روشن کرنال۔ کریم نگر

نو پرابلم

اب تو بن گئے لیڈر ہم نوپرابلم — جتنا کھائے غم پر غم نو پرابلم
اپنے پاس ہے ایٹم بم نوپرابلم — دنیا ہم پر ہے برہم نو پرابلم
جلنے والے جلتے ہیں جلا کریں — آگے بڑھتے رہیں گے ہم نوپرابلم
سنسد کیا ہے سارا اکھاڑا کشتی کا — جوتم پٹی ہے پیہم نوپرابلم
لیڈر کے کھیلوں سے ہی ہوتی ہے — سرکاریں درہم برہم نوپرابلم
سی ایم، پی ایم سب رشوت لیتے ہیں — پھر بھی [illegible] ہے اتم نو پرابلم
بچے پیدا حد سے زیادہ ہونے لگے — پڑھنے [illegible] راشن کم نو پرابلم
سنسدی خانے اوپن ہیں بار کھلے — پی لو سنسدی پی لو رم نوپرابلم
پی کر کرنل گھر جاؤ [illegible] تم نوپرابلم

منظور الامین

3 B فیرویو، روڈ نمبر 7 بنجارہ ہلز حیدرآباد۔ 34

حجابِ گل اٹھا کے دیکھ

(شاعرانِ کرام سے معذرت کے ساتھ)

صاحبو اس مضمون کی ابتدا ہی میں ہم یہ واضح کردیں کہ ہم خود شعر کہتے ہیں اور شاعروں کی بہت عزت کرتے ہیں، شاعر کو تلمیذ رحمٰن کہا گیا ہے دنیا کی ہر زبان میں ایسے شاعر گذرے ہیں جن کا کلام ملوک الکلام کا درجہ رکھتا ہے اس قبیل کے شعرا میں ہومر؟ شیکسپیر، گوئٹے، فردوسی، سعدی، کالی داس غالب، اقبال وغیرہ کے نام فوراً زبان پر آتے ہیں لیکن یہ شعرا مستثنیات میں سے ہیں اور آپ تو جانتے ہیں مستثنیات سے کلیات نہیں بنتے۔

جہاں ایک طرف بلند پایہ شاعروں کو بادشاہوں نے خلعتوں سے نوازا ہے وہاں انھیں بادشاہوں نے نظرانداز بھی کیا ہے، کہتے ہیں فردوسی نے شاہ محمود غزنوی کے فرمان پر شاہنامہ تصنیف کیا شاہ کا وعدہ تھا کہ وہ شاعر کو ہر شعر پر ایک دینار عطا کریگا، لیکن شاہنامہ لکھے جانے کے بعد شاہ محمود اپنے وعدے سے پھر گیا، فردوسی کا دل ٹوٹ گیا بادشاہ کے اس ناز یبا سلوک کی بنا پر، ---- ویسے اس دنیا میں ایسے بے شمار شاعر بھی ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے وثوق سے کہ وہ حضرت جبرئیل سے تعلیم ہیں، جن کے پاس نہ علم و عرفان ہے نہ معنی و ادراک، اسی لئے اکثر ایسے شاعروں کی کھلّی بھی اڑائی جاتی رہی ہے ان کے ساتھ گستاخی بھی کی جاتی ہے،

ایک شخص نے ایسے ہی شاعروں کے بارے میں کس طرح کے جذبات کا اظہار کیا ہے ذرا ان الفاظ کو پڑھ کر اندازہ لگائیں:

ادھر جھولی پسارے ہے ادھر کو بھیک مانگے ہے،

بھکاری شعر گو کو روز فکر آب و دانہ ہے

جہاں جلیل القدر بادشاہوں نے عظیم الرتبت شاعروں کی ہر طرح مدد کی ہے وہاں لٹیروں، ڈاکوؤں اور چوروں نے ان سے حقارت کا سلوک بھی کیا ہے، شیخ سعدی نے اس مضمون کی ایک حکایت بیان کی ہے جو کچھ اس طرح ہے،

ایک بار ایک شاعر ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گیا اور اس کی تعریف میں ایک قصیدہ پڑھا ، ڈاکو ان پڑھ ، جاہل بلکہ خر ناشخص تھا اس نے اپنے حالی موالیوں کو حکم دیا کہ شاعر کے کپڑے اتار دو اور اسے تن برہنہ کر کے گاؤں سے باہر نکال دو ، شاعر کے ساتھ یہی ہوا ، بے چارہ ننگ دھڑنگ چلا جارہا تھا وہ موسم سرما تھا اور خوب برف باری ہوئی تھی ، شاعر کو ننگا دیکھ کر کتے اس کے پیچھے پڑ گئے شاعر نے چاہا کہ پتھر اٹھائے اور کتوں کو مار بھگائے لیکن زمین پر برف جمی ہوئی تھی اسے کوئی پتھر نہیں مل سکا ، شاعر نے فی البدیہہ کہا یہاں کے لوگ کتنے کمینے ہیں کہ سگاں را کشادہ اندو سنگ رابستہ مطلب کتوں کو تو آزاد کر رکھا ہے اور پتھروں کو باندھ دیا ہے ،

جس طرح ہر سر گھٹے کو قلندر نہیں مانا جاسکتا نہ ہی ہر آئینہ ساز سکندر ہوتا ہے اس طرح ہر تک بند کو شاعر نہیں کہہ سکتے اگر اس طرح سے تک بندی کر کے کوئی شخص شاعر ہونے کا دعویدار ہوتا ہے تو ایسی شاعری کو دور ہی سے سلام :

گرمی اچھی نہیں تک سوچئے ٹھنڈا ہو کر

ریل پنجاب کو جاتی ہے بھنڈا ہو کر

اچھا شعر اچھے عطر یا مشک کی طرح ہوتا ہے جو اپنی خوشبو کے لئے عطار کی تعریف یا شاعر کی توصیف کا محتاج نہیں ہوا کرتا ، اور گھٹیا شعر تو بس گھٹیا ہی ہوا کرتا ہے ، گھٹیا شاعری ہر دور میں ہوتی رہی ہے یہ آج کے دور کا ہی خاصہ نہیں ، مولانا حالی نے اس کے لئے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں فرماتے ہیں :

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر

عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر

دوسری جگہ رقم طراز ہیں :

"شاعروں نے نامہ ، اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی غزل کہی تو پاک شبدوں کی بولیاں بولیں قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور باد خوانوں کے منہ پھیر دئیے ... شاعری کی بدولت جھوٹا عاشق بننا پڑا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے ۔ عبث جھوٹ بکنا اگر نا روا ہے

تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے ۔ مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے

گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے

جہنم کو بھر دینگے شاعر ہمارے

۔ گھٹیا شعر کی بات چلی ہے تو ایک واقعہ یاد آیا ، برسوں پہلے کی بات ہے ملک کے یوم جمہوریہ کے موقع پر ہر سال دلی کے لال قلعے میں ہمہ لسانی مشاعرہ ہوا کرتا ہے ، اب یہ ایک روایت بن گئی ہے ، غالباً یہ سن پچاس یا اکیاون کی بات ہے دلی کے ایک ایسے ہی مشاعرے میں وزیراعظم جواہر لعل نہرو کو بحیثیت مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا ، ہندی کے مشہور کوی دنکر جی اس مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے وزیراعظم کی بطور خاص ضیافت گل پوشی کی گئی مشاعرہ شروع ہوگیا ، وزیراعظم اس محفل کا حصہ ہوتے ہوئے اپنے خیالوں میں غرق

تھے ، ـــ سب سے جدا سب کے رفیق ـــ وہ سوتے جاگتے ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود کے خواب دیکھا کرتے تھے اس وقت وہ ایسے ہی کسی خواب کی دنیا میں پہنچ گئے تھے ۔ ان کے گلے میں جو ہار تھا انھوں نے اسے اتارا نہیں اور غیر شعوری طور پر پھولوں کو چھوتے رہے ۔ اتفاق سے پھول پرونے کے بعد مالی ہار سے سوئی نکالنا بھول گیا تھا ، اچانک سوئی جواہر لعل جی کو چبھ گئی انھوں نے منہ سا بنایا پھر آہستہ سے ہار میں سے وہ سوئی انھوں نے نکال لی اور ہتھیلی پر رکھ کر صدر مشاعرہ کو دی ، ونکر جی حیران تھے انھوں نے پوچھا "پنڈت جی اس سوئی کا میں کیا کروں" جواہر لعل کی حس مزاح جاگ اٹھی اور انھوں نے جواب دیا "دنکر جی یوں کیجئے کہ جو شاعر سب سے گھٹیا شعر سنائے اسے یہ چبھو دیجئے اور دنکر جی کی حیرانی قہقہے میں بدل گئی ، محفل لالہ زار ہو گئی !

ویسے شاعر بھی اپنی عزت آپ نہیں رکھ لیتے ۔ ہم ایک ایسے شاعر کو جانتے ہیں جنھوں نے اپنے دیوان کی کئی کاپیاں جوتوں کی ایک دکان کے مالک کے پاس رکھوادی تھیں تاکہ جوتوں کے ساتھ دیوان بھی بکتا رہے۔ ہوا یہ کہ دکان کے مالک کا جوتا تو چل گیا لیکن شاعر کا دیوان رہ گیا ، دکان کا مالک معصوم سا شخص تھا اور شعر و سخن سے نابلد وہ شرمندہ سا تھا کہ دیوان کوئی خریدنے کو تیار نہیں تھا آخر شاعر نے دکاندار سے کہا "جب بھی مجھے ضرورت پیش آئے کہ میں ایک نیا جوتا خریدوں یا اپنے بچوں کے لئے نئے جوتے خریدوں ان کی قیمت کے طور پر آپ اس دیوان کی ہر بار دو یا تین کاپیاں رکھ لیا کیجئے گا "

ویسے سچ تو یہ ہے کہ اچھے کلام کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ایک شاعر نے کہا بھی تو ہے

شاعر کے نغمے ، نغموں کی مستی

جس دام لے لے ، اس دام سستی

یہ بھی سچ ہے کہ کوی اور شاعر اپنا کلام بیچتے آئے ہیں ہندی کے ایک کوی نے لکھا ہے میں گیت بیچتا ہوں ، میں طرح طرح کے گیت بیچتا ہوں یہ گیت ذرا سونے میں لکھا تھا یہ گیت وہاں پونے میں لکھا تھا میں قسم قسم کے گیت بیچتا ہوں ،

اور گیت نہ بیچے بیچارہ شاعر تو کھائے کہاں سے ؟

اپنے گیتوں کو میں بازار میں لے آیا ہوں

آج بازار میں نیلام اٹھے گا ان کا

بعض بزرگ شاعر جو کہنہ مشق ہیں وہ نوجوانوں کو ـــ جو دراصل خود شاعر نہیں ہوتے ـــ مشاعرے میں پڑھنے کے لئے غزلیں بیچتے ہیں ـــ خرید و متاع ہنر بیچتا ہوں ـــ آؤ جوانو ، دوانو " یہ رہا غزل کا مطلع ، قیمت آٹھ آنے اور یہ حسن مطلع میں دل بیچتا ہوں جگر بیچتا ہوں ، ـــ قیمت چھ آنے اور یہ ایک شعر جو توجہ طلب ہے قیمت چار آنے اور یہ رہا مقطع قیمت دو آنے بعد نوجوان آنکھ بڑھ کر غزل خرید لیتے ہیں اور مشاعرے میں لک لک کر اپنے نام سے اسے سناتے ہیں اور داد وصول کرتے ہیں ، اس کا اندازہ کئے بغیر کہ دیکھتا ہوں کہ داد پاتا ہوں ۔ سوچتا ہوں کہ جگ ہنسائی ہے ،

یہ بھی ایک افسوسناک امر ہے کہ بعض مرتبہ اچھے شاعروں کا کلام کوڑیوں کے مول بھی بکتا ہے یاد آیا

لندن میں عزیزی ملٹن کی فردوس گمشدہ
Paradise Lost کل دس پاؤنڈ میں بکی تھی ؛ لندن ہی کے بعض جاہلوں نے یہ کتاب اس لئے نہیں خریدی تھی کہ بس، وہ ایک ہی شعر سے واقف تھے :

ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں؟

دیکھا گیا ہے کہ اکثر شاعر غریب کی درگت بنتی آئی ہے مثلاً

میں نے کہا کہ " بزم ناز چاہئے غیر سے ، تہی

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ " یوں " ؟

" مانگ کھا " شاعر کے بارے میں یہ شعر بھی ملاحظہ ہو، شاعر کی کہانی خود اپنی زبانی :

شاید مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہوں آپ

محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

آپ ملک میں کہیں بھی چلے جائیں ہر جگہ آپ کو مقامی شاعروں کی ایک پوری ٹیم ضرور مل جاتی ہے ہر شہر کے کوچہ کوچہ میں شباب کے شاعر دستیاب ہیں اور دربدر انقلاب کے شاعر ملتے ہیں ، قوم کی قوم ہو جہاں " فنکار " کس سے ممکن ہے شاعروں کا شمار ، اور دوستو اور بزرگو یہ بات صرف اردو زبان کے شاعروں پر ہی صادق نہیں آتی دنیا کی سبھی زبانوں میں شاعروں کا Inflation ہے ، بہتات ہے ، اس موضوع پر ایک واقعہ یاد آیا ، انگلستان کے فرمانروا ایڈورڈ اول نے جب صوبہ ویلس فتح کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ علاقہ ویلس شاعروں سے پٹا پڑا ہے اس نے حکم دیا کہ سب ہی مقامی شاعروں کو تہ تیغ کر دیا جائے چنانچہ یہی ہوا (مشہور انگریزی شاعر تھامس گرے) Thomas gray کی نظم THE BARD اسی موضوع پر ہے

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں

جو شعر گو ہیں وہ ہیں مجرم رسن بہ گلو

مغل بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں دلی میں ایک مجذوب رہتے تھے جنکا نام تھا سرمد ، ان کا مزار دلی کی جامع مسجد کے سامنے ہے سرمد فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے ان کی یہ رباعی مشہور ہوئی

سرما بگذشت وایں دل زار ہماں
... گرما بگذشت وایں دل زار ہماں
القصہ تمام سرد و گرم عالم
... برما بگذشت وایں دل زار ہماں

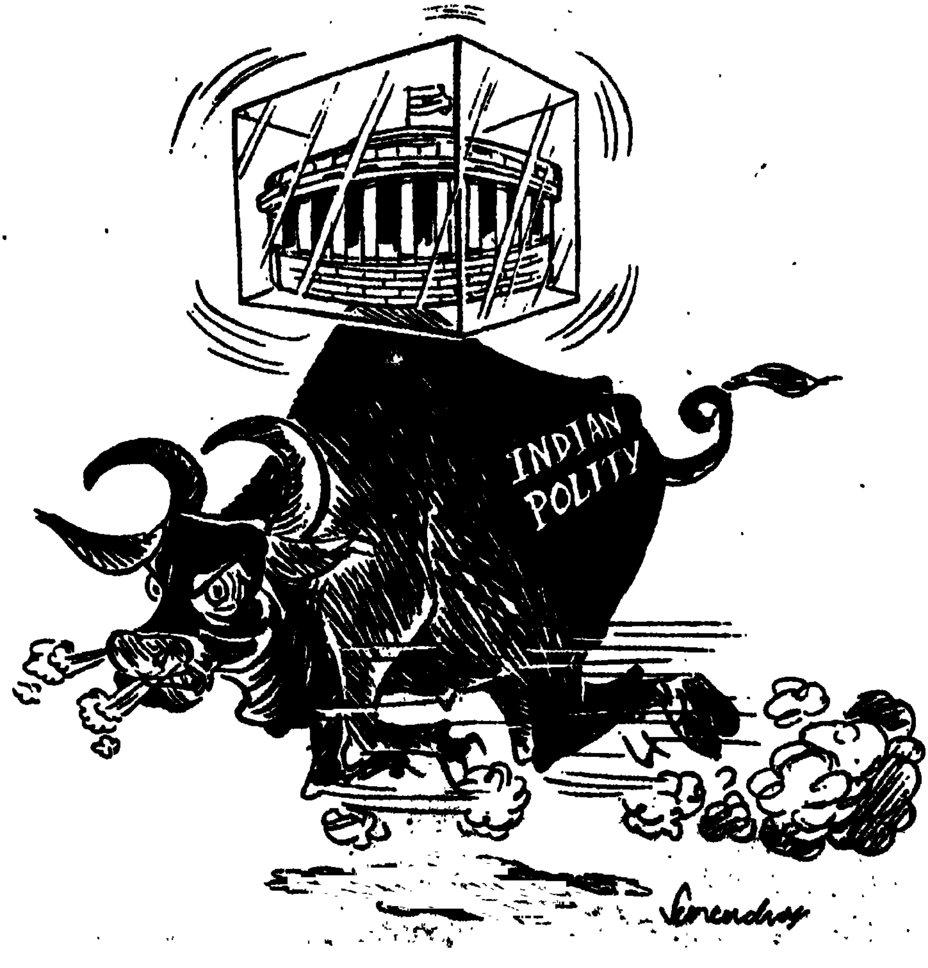
(ترجمہ) سردی گذری پر اُس دل کی حالت ہے وہی گرمی گذری پر اس دل کی حالت ہے وہی اس تمام زمانے

بھر کی دھوپ اور چھاؤں گذری پر اس دل کی حالت ہے وہی کہتے ہیں سرمد کسی بھی قسم کے ملبوس کو ننگ وجود گردانتے لگے تھے اس کی پاداش میں اورنگ زیب نے انھیں شہید کردیا ۔

ہندی کی مشہور سنت شاعرہ میرا بائی کو جسے سری کرشن سے بڑی عقیدت تھی، راجپوت رانا نے زہر دے کر مروادیا تھا اور آخر میں کسی شاعر کے ایک شعر میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ :

بلندیاں جو عطا شاعروں کو عشق نے کیں

انھیں میں ایک بلندی فرازِ دار بھی ہے



غزلیں

اقبال شانہ
حقل، سعودی عرب

اگر معشوق اپنا بے وفا ہوگا تو کیا ہوگا
کوئی اس کا بھی "ہیرو" دوسرا ہوگا تو کیا ہوا

لگا بیٹھے ہو امیدیں بڑی فرزند سے اپنے
اگر "الو کا پٹھا" جب بڑا ہوگا تو کیا ہوگا

اگر ای۔ میل کی اس تیز رفتاری کے عالم میں
کبوتر چونچ میں خط لالیا ہوگا تو کیا ہوگا

میں کوئی بل کلنٹن تو نہیں جو تم کو چاہوں گا
تمہارا حسن حسن "مونیکا" ہوگا تو کیا ہوگا

یقیناً ورلڈ کپ لے آئیں گے انگلینڈ سے لیکن
خدا نہ خواستہ "کپ چائے" کا ہوگا تو کیا ہوگا

تصور سے ہی اس کے ہو رہی ہے اتنی گھبراہٹ
اگر اس شوخ کا جب سامنا ہوگا تو کیا ہوگا

یہ مانا بند ہم پر ہوگئے ہیں سارے دروازے
کوئی کھڑکی سے لیکن جھانکتا ہوگا تو کیا ہوگا

میں آجاؤں گا ہمت باندھ کر گھر تک تری جاناں
گلی میں تیری کتا بھونکتا ہوگا تو کیا ہوگا

شب فرقت گزاری ہم نے بھوکے پیٹ رو رو کر
اگرچہ صبح غائب ناشتہ ہوگا تو کیا ہوگا

کہ اب یہ سوچنے پر ہوگئے مجبور ہم یارو
اگر لیڈر ہمارا باوفا ہوگا تو کیا ہوگا

بھلا بدخواہیاں کب تک چلیں گی آپ کی شانہ
فرشتہ موت کا سر پر کھڑا ہوگا تو کیا ہوگا

محترمہ

راز دل نہ چھپائیں محترمہ
عمر اپنی بتائیں محترمہ

آپ کتنی حسین لگتی ہیں
آپ کو کیا بتائیں محترمہ

بے کلی آپ کی ہے نس نس میں
چین سے بیٹھ جائیں محترمہ

چھوڑیئے میری شاعری کیا ہے
کوئی گانا سنائیں محترمہ

میرے دل کی حسین کھیتی میں
بکریاں نہ چرائیں محترمہ

آپ سے عاشقی میری توبہ
جائیں منہ دھوکے آئیں محترمہ

اب وہ بیمار عشق ہے "یا گیا"
نبض ہی دیکھ آئیں محترمہ

آپ کے غم میں دل دھڑک جائے
پھیپھڑے پھڑ پھڑائیں محترمہ

میری ان گرم گرم آہوں پر
اپنی زلفیں سکھائیں محترمہ

لنچ پر نہ سہی کبھی ہم کو
چائے پر ہی بلائیں محترمہ

دودھ جیسے سفید دانتوں میں
انگلیاں نہ چبائیں محترمہ

نصف ایمان ہے صفائی بھی
گھر میں جھاڑو لگائیں محترمہ

شاعری کر رہا ہوں میں شانہ
آپ بچے سلائیں محترمہ

فضل جاوید
MIG ، 1862 کالونی
آر۔ سی پورم، حیدرآباد

گھر کا ڈاکٹر

کسی اچھے حکیم، وید یا ڈاکٹر سے مراسم رکھنے کے یوں تو بہت سے فائدہ ہیں۔ ایک تو دل کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ وقت بے وقت ان کا دروازہ بے جھجک کھٹکھٹایا جاسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ پاس پڑوس اور عزیز و اقارب میں ہمارا مرتبہ بلند رہتا ہے۔ کیوں کہ انہیں علم ہوتا ہے کہ فلاں ڈاکٹر یا حکیم سے ہمارے اچھے تعلقات ہیں۔ معدودے چند پیشوں میں یہی تو ایک ایسا پروفیشن ہے جس کے آگے بڑے سے بڑا شخص دو زانو ہو جاتا ہے۔ اگر ڈاکٹر پہچان کا ہو تو یہ احساس رہتا ہے کہ وہ بطور خاص ہماری جانچ کر کے اچھی سے اچھی دوائیں تجویز کرے گا۔ اس کے مطب میں قطار میں لگنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بسا اوقات نمونے کی دوائیں مفت میں مل جاتی ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر سے دوستی گھاٹے کا سودا نہیں۔ یہ اچانک ڈاکٹروں کا خیال ہمارے ذہن میں اس لیے آیا کہ ابھی ابھی ڈاکٹر انور کا خط آیا کہ وہ ہفتہ عشرہ میں ہمارے شہر پہنچ رہے ہیں کیونکہ ان کی پوسٹنگ بطور ہاوز سرجن یہاں کے سرکاری دواخانے میں ہوئی ہے۔ ہمارے بچپن کے ساتھی ہیں۔ انٹر پاس ہوتے ہی ہم ان سے الگ ہو گئے کیونکہ ہمیں مردہ لاشوں کے تصور ہی سے ڈر لگتا تھا۔ لاشوں کو چیرنے پھاڑنے کا تصور تک ہم نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ہم نے دوسرا راستہ چن لیا اور ہمارے یہ دوست نہ جانے کتنے زندوں کو مار کر طب کی ڈگری لیے ہمارے شہر آ رہے تھے۔

خط پڑھ کر ہم بے حد خوش ہوئے کہ چلو ہمارا ابھی کوئی فیملی ڈاکٹر ہے بلکہ گھر کا ڈاکٹر ہے۔ بیگم کو جیسے ہی پتہ چلا آندھی کی طرح یہ خبر آس پاس کے گھروں میں پہنچ گئی۔ فون کھڑکھڑائے گئے۔ دور دراز کے عزیزوں کو خبر کی گئی۔ اس تشہیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی ہمارا دیوان خانہ اچھا خاصہ دواخانہ بن گیا۔ مریضوں کا تانتا بندھتا جا رہا تھا بڑی مشکلوں سے ہم انہیں سمجھا پائے کہ ابھی ڈاکٹر کا تقرر ہوا ہے ان کے جوائن ہونے میں ابھی وقت ہے۔ ہم سے وعدہ لے کر کہ ڈاکٹر صاحب سے انہیں ضرور ملائیں گے وہ دفع ہوئے۔ اور جاتے جاتے اپنے امراض کی تفصیل بھی دیتے گئے کہ ڈاکٹر صاحب کو دکھا دیں۔ اب یہ روز کا معمول بن گیا۔

دراصل ہماری کالونی شہر سے دور ایک پر فضا مقام پر ہے۔ اچھے ڈاکٹروں کے لیے شہر تک جانا پڑتا ہے اور شاید بیگم نے انہیں یہ تاثر دیا تھا کہ ڈاکٹر انور کا قیام ہمارے یہاں ہوگا۔ مریضوں کی کثرت کا اندازہ کر کے ڈاکٹر انور کو مطلع کر دیا کہ اپنی زنبیل میں دوائیں زیادہ مقدار میں بھر لائیں۔ اللہ اللہ کر کے وہ دن بھی آگیا جب ہم انہیں اسٹیشن سے اپنے گھر لے آئے۔ لان پر موجود سبھی مریضوں نے ان کا استقبال کیا۔ اس سے پہلے کہ ہم انہیں اندر لے جاتے۔ ڈاکٹر انور

ہمیں یکسر نظر انداز کر کے مریضوں کے ساتھ لان پر بیٹھ گئے اور یکے بعد دیگرے مریضوں کی تشخیص کرنے لگے۔ ایک گھنٹہ میں انہوں نے سب کو نپٹا دیا اور گھر میں داخل ہوئے سفر کی تکان ان کے چہرے سے غائب ہو گئی تھی۔ شاید نئے ڈاکٹر کو مریضوں کا اس طرح استقبال کرنا اچھا لگا تھا۔ چہرے پر کچھ اس طرح کا اطمینان، اور مسرت کا ملا جلا احساس ابھ آیا جیسے کسی شاعر کو غیر متوقعہ طور پر سامعین مل گئے ہوں اور فرمائش کر کر کے اس کا کلام سن رہے ہوں۔

بیگم کے ہاتھوں کا بنا کھانا اتنا لذیذ لگا کہ انہوں نے خود ہی کہہ دیا کہ ہر اتوار کا لنچ ہمارے پاس ہی ہوگا۔ ان کے ٹھہرنے کا انتظام شہر میں تھا۔ اب ہر اتوار ہمارا گھر کلینک بن جاتا۔ ہم ڈاکٹر تو بن نہ سکے لیکن ان دنوں کچھ کچھ کمپاونڈ ضرور بن گئے۔ فخر سے ہمارا سینہ گز بھر کا ہو جاتا جب کوئی مریض آکر کہتا کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں شفاء ہے۔ اب ہ اتوار کو ڈاکٹر انور کے ساتھ ڈاکٹر اقبال بھی آنے لگے۔

جب سے ڈاکٹروں کا ہمارے یہاں آنا جانا شروع ہوا ہے۔ سارا محلہ مستفید ہو رہا ہے۔ لیکن ایسی مفت ک سہولتیں مہیا ہونے کے باوجود ہمارے ہاں کوئی بیمار نہیں پڑا۔ سردرد تو کجا چھینک تک نہیں آرہی تھی۔ مریضوں سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر انور اور ڈاکٹر اقبال ہسپتال کے دلچسپ قصے چھیڑ دیتے۔ مریضوں کو آہ و بکا کے درمیا ڈاکٹروں اور نرسوں کے رومانس، سینیر ڈاکٹروں کا ہاوز سرجنوں سے سوتیلا برتاؤ۔ ڈاکٹروں کا مریضوں کے بیڈ نمبر وا سے پہچانا جانا جیسے ڈاکٹر شرما پانچ نمبر والے۔ نو نمبر کے ڈاکٹر حیدر۔ سات نمبر والے ڈاکٹر وجے لکشمی۔ وارڈ بوئے پورے وارڈ کا انچارج ہوتا ہے۔ اسے نہ صرف مریضوں کا حسب نسب معلوم رہتا ہے بلکہ ڈاکٹروں، نرسوں اور سار محلے کے بارے میں پوری معلومات رہتی ہیں۔ اس لیے اس کی ہر جائز و ناجائز حرکت کو یہ لوگ نظر انداز کرتے رہتے ہیں اور اسی قسم کی بہت سی باتیں۔

ایک اتوار مریضوں کے معائنے کے بعد لنچ کے لیے بیٹھے تو ڈاکٹر انور نے ہمیں گھورتے ہوئے کہا۔ یار جاوی تمہاری آنکھوں میں کچھ بے اعتدالی دیکھ رہا ہوں۔ اس نے میری نبض پکڑ کر اسٹیتھسکوپ سے سینے اور پیٹھ کا معا بھی شروع کر دیا۔ آخر ڈاکٹر انور نے بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔ "بھابھی! جاوید کو کل ہسپتال بھیج دیں کچھ ضروری ٹس کروالیں گے۔" بیگم گھبرائیں۔ "بھائی صاحب! کیا ہوا نہیں؟" "کچھ نہیں بھابھی.... ہر انسان کو سال میں کم از کم ای دفعہ ضرور اپنا میڈیکل چیک اپ کروالینا چاہیے۔ یہ ایک روٹین چیک اپ ہے۔ ایک دو دن میں واپس بھجوادیں گے"

ڈاکٹر انور کی اس وضاحت سے بیگم مطمئن ہو گئیں۔ دوسرے دن ہم ہسپتال پہنچے ہم نے موقعہ غنیمت جا سوچا مفت میں پورا طبی معائنہ ہو جائے گا اور اطمینان یہ کہ سب معائنے ہمارے دوست ڈاکٹر کی نگرانی میں ہوں گے ہم ہسپتال میں بھرتی ہو گئے۔ پہلا دن بڑی مشکلوں سے گزرا۔ جنرل وارڈ میں ہمیں رکھا گیا تھا۔ آس پاس مریضوں کی و پکار اور تکلیف کی شدت سے تڑپنے کا منظر بڑا کربناک تھا۔ ڈاکٹر آتے سب مریضوں کی مزاج پرسی کرتے اور ہمیں نظر انداز کر کے چلے جاتے۔ بڑی دیر بعد ڈاکٹر انور آئے تو دل کو اطمینان ہوا۔ آتے ہی انہوں نے کچھ اس طرح کی با شروع کر دیں جیسے ہم ہسپتال میں نہیں اپنے گھر پر ہوں۔ آخر بڑی مشکلوں سے انہیں یاد دلایا گیا کہ ہم میڈیکل چ اپ کے لیے بھرتی کئے گئے ہیں۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ یار ابھی تو آئے ہو۔ کچھ دن آرام کرو۔ فرصت سے ہم چیک اپ کریں گے۔ اپنی روزمرہ کی مصروفیتوں سے کچھ دنوں کے لے منحرف ہو جانا بھی صحت پر خوشگوار اثر ڈالتا۔

اس طرح ہمیں دلاسا دے کر وہ چلتے بنے۔

ہمیں اسپتال میں بھرتی ہوئے آٹھ دن بیت چکے تھے۔اس درمیان میں کئی قسم کے ایکسرے، ECG، خون پیشاب، اسٹول کے ٹسٹ ہوچکے۔ ہیبت ناک مشینوں کے سامنے میں رکھا گیا۔ یہ معائنے جاری تھے لیکن جب ہم رپورٹ کی بات کرتے تو کوئی بھی تشفی بخش جواب نہیں دیتا۔ نہ جانے کیوں اب ہمیں احساس ہونے لگا کہ ہم کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہوچکے ہیں۔

اسپتال میں مریضوں کی ایک اسوسی ایشن بنی ہوئی تھی۔اس کا جنرل سکریٹری اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا تھا۔ سب مریض ہمارے بستر کے اردگرد جمع ہوگئے۔اور جنرل سکریٹری کی پوسٹ کا آفر دیا بلکہ مصر ہوگئے کہ اسے ہم قبول کرلیں بڑی مشکلوں سے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ ابھی تک ہم پوری طرح سے مریض ثابت نہیں ہو پائے ہیں۔ سرکاری دواخانے کا عجیب نظام تھا۔ مریض بھرتی ہوکر جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ مفت کا کھانا، آرام دہ بستر، دونوں وقت چائے، دودھ، پھل سب مہیا۔اب اور کیا چاہیے۔پرانے بیڈ خالی نہ ہوں تو نئے مریضوں کی بھرتی کیسے ہو۔اس کے پیش نظر اس ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا تھا جس میں یہ طے کیا گیا کہ مریض ایک مہینے سے زیادہ داخل نہیں رہ سکتا۔

دسویں شام ڈاکٹر انور ہمارے پاس آئے۔شام کی چائے ہمارے ہی بیڈ پر منگوائی ہم اسپتال اور اس کے معائنوں سے تنگ آچکے تھے۔دریافت کیا کہ چھٹی کب ہوگی؟ ہماری تشخیص کا کیا بنا؟ کیا واقعی ہمیں کوئی بیماری لاحق ہوگئی ہے؟۔ڈاکٹر انور نے کہا "یار جاوید! گھبراؤ نہیں کچھ زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔اچھا ہوا کہ وقت پر ہم تمہیں اسپتال لے آئے۔ہمارے اندر ہی اندر ایک ڈر گھر کرنے لگا "یار انور صاف صاف بتاؤ آخر ہمیں ہوا کیا ہے؟" "کچھ نہیں یار! ابھی کچھ دن تمہیں اسپتال میں رکھنا پڑے گا۔ تھوڑے ٹسٹ باقی ہیں اس کے بعد تمہارے خون کے نمونے ہم باہر بھجوا رہے ہیں دراصل ڈاکٹر اقبال اور میرے درمیان اختلاف رائے ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ ہم تمہارے کیس کو بمبئی کے ایک خصوصی اسپتال سے رجوع کرکے صحیح نتیجہ پر پہنچیں۔"

اس رات ہم سو نہ سکے۔جبراً آنکھیں موندیں تو عجیب عجیب سے خواب نظروں میں اترنے لگے۔ملک الموت کو ہم نے قریب سے دیکھا۔پچھلے دس دنوں میں آس پاس کے چار بستر خالی ہوچکے تھے۔اب موصوف آہستہ آہستہ ہمارے پلنگ کی طرف بڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔مارے ڈر کے آنکھیں کھل گئیں۔سامنے نرس کو کھڑا پایا۔"ذرا اس مشین پر کھڑے ہوجائیں" وہ مسکراتے ہوئے بولی دل کو اطمینان ہوا کہ ملک الموت مونث نہیں ہوسکتے۔نرس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا وزن دن بہ دن گھٹتا جارہا ہے۔نرس کی بات سن کر ہمیں کمزوری محسوس ہونے لگی اور چکر سے آنے لگے۔کچھ ہی دنوں میں ہماری یہ حالت ہوگئی کہ نرس کے سہارے کے بغیر کھڑے بھی نہیں ہوسکتے تھے۔

ایک دن اچانک ہمیں دوسرے وارڈ میں منتقل کردیا گیا۔یہاں کے مریض اپنی آخری سانسیں گنتے نظر آرہے تھے۔ہمارے ڈاکٹر دوست تو ایسے بیگانے نکلے کہ لاکھ پوچھنے پر بھی ہمارا مرض نہیں بتاتے تھے۔پاس والے مریض نے ہم سے پوچھا "آپ کے کتنے دن رہ گئے ہیں؟" "کیا مطلب؟ ہم نے گھبرا کر غصہ سے پوچھا۔وہ بولا" بھئی یہاں آنے والے سب مریض دن گنتے رہتے ہیں۔ہم دسویں دن جانے والے ہیں۔وہ آٹھ نمبر والا ساتویں دن۔چھ نمبر والا چھ دن۔وہ

جو تین فیروالا ہے اس کی مدت آج ختم ہورہی ہے۔ اس کے بیٹے وکیل کو لے آئے ہیں اور جلدی جلدی دستخط کروا رہے ہیں کہ کہیں سائن کرنے سے پہلے چل بسا تو جائیداد کے بٹوارے میں سب بھائی آپس میں لڑ مریں گے۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہوگیا اور خالی خالی آنکھوں سے چھت کو گھورنے لگا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے منتخب مریضوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ ہر ایک کی آنکھیں الوداع کہتی دکھائی دے رہی تھیں۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ یہ کینسر کا وارڈ ہے۔ کیا ہمیں بھی کینسر ہے؟ اس خیال کے آتے ہی سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ہم نے ڈاکٹر انور کو بلوایا لیکن اس سے قبل اسپتال کے بڑے سرجن ڈاکٹر داس آگئے۔ انہوں نے ہماری کیس شیٹ دیکھ کر جونیرس سے پوچھا کہ یہ کیس تو ڈاکٹر انور اور ڈاکٹر اقبال کا ہے پھر اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ جونیر ڈاکٹرس نے جواب دیا کہ وہ دونوں اسی مریض پر کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر انور کی تحقیق بتاتی ہے کہ یہ کینسر کا مریض ہے لیکن ڈاکٹر اقبال اسے ایڈز کا پیشنٹ تسلیم کرتے ہیں" اوہ گاڈ" کہتے ہوئے ڈاکٹر داس نے ہماری فائیل منگوائی اور اس کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ اور پھر فوراً ہمارا خون سیرنج میں لے کر ایک ڈاکٹر سے بولے کہ اس کی رپورٹ ابھی چاہیئے۔ پھر انہوں نے ڈاکٹر انور اور اقبال کو بلوایا۔ بڑی دیر تک ڈاکٹروں میں بحث چلتی رہی۔ نہ جانے کن کن خطرناک بیماریوں کے نام لئے جارہے تھے۔ بیچ بیچ میں ڈاکٹر داس، انور اور اقبال کو ڈانٹتے بھی رہے۔ اس درمیان ہمارے خون کی رپورٹ آگئی۔ سب ڈاکٹر حیرانی سے اس رپورٹ کو دیکھنے لگے۔ بالآخر ڈاکٹر داس نے سکوت توڑا اور ہمیں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔" جاوید! آپ بالکل تندرست ہیں۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ ڈاکٹر انور اور ڈاکٹر اقبال بھی پوری طرح آپ کی اس حالت کے ذمہ دار نہیں ہیں کیونکہ الگ الگ مریضوں کے خون کی رپورٹس لیب (Lab) کی غلطی سے آپ کے نام موسوم ہوگئے۔ اب آپ گھر جاسکتے ہیں۔ کمزوری رفع کرنے کے لئے دواؤں کی نہیں چوزوں کا شوربہ اور مچھلی کا سوپ کافی ہے۔ اور پھر مسکرا کر انور اور اقبال کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔" ان دو ملاؤں کے بیچ مرغی حرام ہوتے ہوتے رہ گئی"۔

ڈاکٹر داس کے اس مژدہ جانفزا کو سن کر فرط جذبات سے مغلوب ہو کر ہم نے انہیں گلے لگالیا۔ ہماری کمزوری ست غائب ہوگئی تقریباً دوڑتے ہوئے ہم اپنی کار تک آئے۔ گھر پہنچتے پہنچتے گھر کے ڈاکٹر کا خوش آئند تصور ذہن سے پوری طرح مٹ چکا تھا۔

غزلیں

کوثر صدیقی
76-A [illegible] بھوپال

(۱)

گھر جمائی سے تو بہتر ہے کہ مجھ ہوتا
کم سے کم میری دولتی کا تو کچھ ڈر ہوتا
سولر ہوگیا میں اس کو بڑی بات سمجھ
یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ میں میجر ہوتا
اور بھی ہوتی جو اولاد تو کیا ہوتا تھا
مسری ہوتا کوئی گدا گر ہوتا
"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"
میں نے چاہا ہی نہیں ورنہ میں لیڈر ہوتا
"مراحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا"
کیبنٹ رینک کا میں کاش منسٹر ہوتا
قرض کی پچھلی رقم لے مری محبوب نہ مانگ
کاش تقدیر میں سکھ رام کا بستر ہوتا
کچھ سزا دلشکنی کے لئے ہونا تھی ضرور
جیل جانے کا حسینوں کو بھی کچھ ڈر ہوتا
باربرداری ہی قسمت تھی ہماری کوثرؔ —
اونٹ اگر اونٹ نہ ہوتا تو وہ خچر ہوتا

(۲)

شہر میں جتنے بھی رشتے دار ہیں
کچھ اپاہج ہیں تو کچھ بیمار ہیں
شیر بھی کھانے لگے بیچارے گھاس
گاندھی وادی یگ کی پیداوار ہیں
صحن مسجد سے نکل کر ڈھونڈیئے
مولوی صاحب بھی بادہ خوار ہیں
کھا رہی ہیں باگڑیں ہی کھیت کو
چور ہی فصلوں کے پہرے دار ہیں
باپ دادا جن کے چوکیدار تھے
خوبیٔ قسمت سے تھانیدار ہیں
جد امجد جن کے تھانیدار تھے
شومیٔ قسمت سے چوکیدار ہیں
چور اچکے اہل منصب ہوگئے
اہل حرمت اب ذلیل و خوار ہیں
انگلی کٹواکر بنے ہیں جو شہید
اب حکومت کے وہ پنشن خوار ہیں

غزل

سراج زلفی

اس فارمولے پر ہی تو پاشو میاں چلا | ہوں سو لہ سو ۔ ہزار کے ۔ ایسے دکاں چلا
سورج چلا جو دن میں تو ۔ شب چندرماں چلا | جب میں چلا تو ساتھ مرے آسماں چلا
پتنی ہے تو ۔ پتی کا ادب احترام کر | چپ بیٹھ ۔ میرے سامنے تو مت زباں چلا
بن جا کسی کروڑ پتی کا ۔ ڈرائیور | اور پھر تو کاریں ۔ نت نئی لے شیر خاں چلا
کاروں سے ۔ اسکوٹروں سے تو ہوتے ہیں حادثے | کر احتیاط ۔ بیلوں کی اب بگھیاں چلا
تنگ آگیا تھا ۔ بیوی سے بچوں سے وہ سراج ! | تڑوا کے رشتے ناطوں کی اب بیڑیاں چلا

سید اسد اللہ حسینی چکر (حیدرآباد)
کیلی فورنیا، شمالی امریکہ

غزلیں

(طرح: اب اس کے ہاتھ میں دل کی کتاب کیا دینا)

۱

وہ بد مذاق ہے دیوانہ صرف کوکن کا　　ہماری بزم میں اس کو شراب کیا دینا
جو پوچھی میں خموشی کی وجہ تو بولے　　تجھے اے جاہل مطلق جواب کیا دینا
جو بے وقوف سبق پڑھ کے بھول جاتا ہو　　"اب اس کے ہاتھ میں دل کی کتاب کیا دینا"
ہے اک حسین کو "بڈروم" کی تلاش مگر　　ترا پتہ دل خانہ خراب کیا دینا
جب اس کے رحم و کرم کا کوئی حساب نہیں　　تو ہم گناہوں کا اپنے حساب کیا دینا
یہ کہہ کے بخشا غفور الرحیم نے چکر　　"بہت ہی ویک ہے" اس کو عذاب کیا دینا

۲

جوانی اگر تم نے یونہی گذاری　　تو پھر زندگی بھر رہو گی کنواری
پڑا ہی رہونگا میں مفلوج بن کر　　اگر تم کرو میری تیمارداری
جہنم ہی بن جائیگی زندگانی　　رہیگی اگر ساتھ ممی تمہاری :
میں بزدل نہیں، پر مری جان ہو تم　　مجھے اس لئے ہے مری جان پیاری
نہوں آپ شادی سے مایوس چکر　　کوئی مل ہی جائیگی قسمت کی ماری

۳

نہ بیوی کو شوہر کا کچھ اعتبار　　نہ شوہر کو بیوی پہ کچھ اختیار
یہ کافر نہ چھوڑے تمہیں عمر بھر　　لبوں سے اگر لگ گئی ایکبار
اڑاؤنگا میں بھی مزے "بیچ" پر　　جہیز میں اگر مل گئی ایک کار
مجھے معاف رکھیں مرے سامعین　　غزل اک سناتا نہیں بار بار
جو مرجائے معشوق تو غم نہ کر　　رہے سر سلامت تو شملے ہزار
یہ امریکہ وہ ملک ہے کہ جہاں　　بلا سود چلتا نہیں کاروبار
کمی دلرباؤں کی یاں کچھ نہیں　　اگر ایک ڈھونڈو ملینگے ہزار
جو چکر کے دل کی ہوئی "سرجری"　　تو اب مل رہا ہے سکون و قرار

سنگ میلی (پانچویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی
(ممبئی)

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

اس سے پہلے کہ بلدیہ کے وارڈ آفس کا بڑا ارباب مجاز چھوٹے ارباب مجاز کے مشورے پر عمل درآمد کرتا یعنی پولس کو جائے وقوعہ پر بلاکر ہمیں پولس کے حوالے کرتا ہم نے اپنی عافیت اسی میں جانی کہ اصلیت اگل دی جائے چنانچہ گھگھیائے ہوئے لہجے میں اقبالی بیان دینا شروع کردیا " حضور مائی باپ یہ سچ ہے کہ نل کے تعلق سے یہ شکایتی عرضیاں فرضی ہیں جھوٹی ہیں اصل میں میں کسی طرح آپ کے دفتر کی عمارت کی چھت پر پہنچنا چاہتا تھا لیکن خدا گواہ ہے حضور اس کے پیچھے جیساکہ آپ کے یہ صلاح کار یہ مشیر باتدبیر کہہ رہے ہیں میری خودکشی کی نیت ہرگز نہیں تھی ۔ میں دراصل آپ کے دفتر کی چھت پر چڑھ کر ایک کتے کا دیدار کرنا چاہتا تھا حضور ۔!"

بڑے ارباب مجاز نے چونک کر پوچھا " کتا ؟ کیسا کتا ۔؟"

عرض کیا ۔" وہی حضور جس کے چار پاؤں دو کان ایک خونخوار جبڑا اور ایک ٹیڑھی دم ہوتی ہے !"

بڑے ارباب مجاز جھنجھلا کر بولے ۔" میں نے کتے کے اسپیر پارٹس SPARE PARTS کے بارے میں نہیں پوچھا ، میں دراصل یہ پوچھ رہا ہوں ، جس کتے کی تم بات کررہے ہو وہ کس کا کتا ہے ۔؟"

ہم نے شرماتے ہوئے کہا ۔۔ " حضور وہ میری گررل فرینڈ ، یعنی کہ محبوبہ کا کتا ہے ۔!"

بڑے ارباب مجاز طنزیہ لہجے میں بولے ۔" کیس آہستہ آہستہ سیرئیس ٹرن ۔ لے رہا ہے ، پہلے اس میں کتا گھسا اور اب محبوبہ بھی گھس آئی ۔!"

چھوٹے ارباب مجاز نے فوراً دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا " گھسی وسی کچھ نہیں سر بلکہ کتا اور محبوبہ دونوں کو خودکشی کے اس کیس میں زبردستی گھسایا جارہا ہے ۔!" چھوٹا ارباب مجاز جانے کیوں ہم سے دشمنی پر تلا ہوا تھا شاید آج گھر سے ناشتے کے بجائے بیوی کی گھڑکیاں کھاکر آیا تھا ، مزید بولا ۔۔ " مجھے تو سرا س کا کتا اور محبوبہ دونوں اس کی فرضی شکایتی عرضیوں کی طرح فرضی معلوم ہوتے ہیں ۔۔ " اس سے پہلے کہ بڑا

ارباب مجاز چھوٹے کی دلیل کو سچ باور کرلیا ہم نے فوراً ثبوت کے طور پر اپنے کندھے سے لٹکے جھولے میں سے دوربین نکال کر اس معروضہ کے ساتھ اس کی خدمت میں پیش کردی ۔ "حضور میری بات کے ثبوت کے طور پر دوربین ملاحظہ فرمائیے جو میں اپنی محبوبہ کے کتے کا نزدیک سے دیدار کرنے کی غرض سے اپنے ساتھ لایا ہوں ۔۔۔!"

بڑے ارباب مجاز نے دوربین کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے تشویشناک لہجے میں کہا ۔۔۔ "کیس واقعی الجھتا چلا جارہا ہے ۔ نوجوان جس کتے کا تم ذکر کررہے ہو وہ واقعی اپنا کوئی وجود رکھتا ہے یا اپنے کیس کو کمپلک کرنے کے لیے تم نے اسے زبردستی پیدا کیا ہے ۔۔؟"

ہمارے کچھ کہنے سے پہلے چھوٹا ارباب مجاز بول اٹھا ۔۔۔ "جناب اس نوجوان سے کیا پوچھتے ہیں، میرا دعوی ہے محبوبہ کا یہ کتا یقیناً اسی کا پیدا کردہ ہے ۔!"

ہم نے جھنجلا کر کہا ۔۔۔ "کیسی انہونی بات کرتے ہیں آپ جناب؟ آج تک کسی انسان نے کتے کو پیدا کیا ہے؟"

چھوٹے ارباب مجاز نے پچھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا ۔۔۔ "کسی اور کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا لیکن تم ضرور پیدا کرسکتے ہو، بلکہ تم نے پیدا کیا ہے اپنے آپ کو الزام خودکشی کے کیس سے بچانے کے لیے پہلے تم نے ایک عدد کتا پیدا کیا پھر ایک عدد محبوبہ پیدا کی جب یہ دونوں ناکام ہوگئے تو یہ دوربین پیدا کرڈالی ۔!"

چھوٹے ارباب مجاز کی ان زوردار دلیلوں نے کیس کا رخ ہی پلٹ دیا، جس دوربین کو ہم نے اپنے بچاؤ کے ثبوت کے طور پر پیش کیا تھا، اسی ثبوت کو ہمارے خلاف استعمال کرکے ہمارے ناکردہ جرم پر مہر تصدیق ثبت کرڈالی ۔ اس سے پہلے کہ بڑے ارباب مجاز ہمارے خلاف کوئی حتمی فیصلہ صادر فرماتے دفتر ہذا کا ایک عدد چپراسی دوڑتا ہوا آیا اور ہانپتے ہوئے بولا ۔۔۔ "سرکار اسپیشل آفیسر صاحب کی گاڑی ادھر آرہی ۔۔۔" یہ خبر کسی بم کی طرح وہاں پھٹی اجلاس میں موجود سارے ارباب مجاز کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور جب اس شاک کا اثر کم ہوا تو دونوں بڑے اور چھوٹے ارباب مجاز باہر کی طرف دوڑے اور دیگر ارباب مجاز اپنے اپنے کیبنوں کی طرف لپک لیے ۔

بلدیہ کے جن اسپیشل آفیسر کی آمد کا بم چپراسی نے پھوڑا تھا ان کے بارے میں ہم نے اخباروں میں بہت کچھ پڑھا تھا ان دنوں بلدیہ کے ان نئے اسپیشل آفیسر کے کارناموں سے سارے اخبارات بھرے ہوتے تھے اور ان خبروں کو پڑھ کر ہم ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے کہ بلدیہ کے کسی بھی برانچ آفس میں اچانک دھاوا بول کر اپنے ماتحتوں کو خفقان میں مبتلا کرنا نئے اسپیشل آفیسر کی پالیسی تھی جس آفس میں معائنہ کے لیے جاتے تھے، عہدہ دار افسروں اور کلرکوں کو معطل کیے بغیر ٹلتے نہیں تھے ۔ دفتر ہذا میں ان کی یہ اچانک آمد ہمارے حق میں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے کے مترادف تھی ، چنانچہ موصوف کی اچانک آمد کے نتیجے میں دفتر ہذا میں مچنے والی بھگدڑ سے پورا پورا فائدہ اٹھاکر ہم اجلاس سے بہ یک بینی و دو گوش باہر نکلے اور مرکزی برآمدے سے ہوکر باہر جانے والی سیڑھیوں تک پہنچے ہی تھے کہ سامنے ہی سے بڑے اور چھوٹے دونوں ارباب مجاز اسپیشل آفیسر کو

اپنے گھیرے میں لیے ہوئے آتے دکھائی دیئے اور ہمارے لیے اس وقت نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن۔! اقدام خودکشی کے جس فرضی اور جھوٹے کیس میں ہمیں الجھایا گیا تھا اس سے گلو خلاصی کا ابھی چونکہ وقت نہیں آیا تھا اس لیے بچتے بچتے اس میں دوبارہ پھر پھنس گئے۔ بقول شاعر

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

اور اس بار جانِ عزیز، کو مرحلہ اور کٹھن درپیش تھا کہ ہمارے خلاف دفتر ہذا کے چھوٹے اور بڑے ارباب مجاز کیساتھ ان کے بلدیہ کے اسپیشل آفیسر بھی اپنے تمام تر کرّوفر سمیت شامل تھے۔ ہم ایکبار پھر رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے لہذا چھوٹے ارباب مجاز کی اذیت پسند طبیعت یقیناً باغ باغ ہوگئی تھی چنانچہ خوشی سے پھولانہ سماتے ہوئے بولا —— "ہماری نظروں سے بچ کر یہاں سے بھاگنا آسان نہیں۔ اب تو بڑے صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں اتفاق سے، اب انہیں بھی معلوم ہوجائے گا کہ بلدیہ کے اس وارڈ آفس کو لوگ خودکشی کی غرض سے استعمال کرنے لگے ہیں۔!! " یہ اطلاع اسپیشل آفیسر کے لیے یقیناً نئی بھی تھی اور چونکانے والی بھی لہذا وہ حیرت زدہ لہجے میں بولے۔ "آفیسر اپنی اس بات کی تھرو پراپر چینل THROUGH PROPER CHANEL وضاحت کرو۔؟" اسپیشل آفیسر کی اس تھرو پراپر چینل وضاحت کا آرڈر سنتے ہی چھوٹے ارباب مجاز نے کسی مشین کی طرح فرفرفرفر فرانے کیساتھ وہ ساری باتیں دہرادیں جو ہمارے حوالے سے پیش آئی تھیں البتہ اس میں کتے کا ذکر قصداً نہیں کیا بس اس بات پر پورا زور صرف کردیا کہ اگر دفتر ہذا کا فورتھ کلاس عملہ بروقت چھت پر نہ پہنچ گیا ہوتا تو ہم چھت پر سے چھلانگ لگاکر دفتر ہذا کی صاف و بے داغ پیشانی پر ایک بدنما داغ لگا چکے ہوتے۔!

چھوٹے ارباب مجاز کی بات مکمل ہوتے ہی، اسپیشل آفیسر نے بڑے ارباب مجاز کی طرف تھرو پراپر چینل، کی عینک سے دیکھا غالباً وہ "چھوٹے" کی اطلاع کی توثیق "بڑے" کے ذریعہ چاہتے تھے چنانچہ بڑے موصوف نے نہ صرف چھوٹے کی بات کی لفظ بہ لفظ تصدیق کروائی بلکہ اس سارے "ڈرامے" کا کریڈٹ، بھی خود لے گئے یہ کہہ کرکہ یہ سب کچھ انہی کے اشارے پر ہوا ہے۔ اس سے غالباً وہ اسپیشل آفیسر پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ وہ صحیح معنوں میں اس وارڈ آفس کے انچارج ہیں چنانچہ نہ صرف اس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے بلکہ ان کے آگے پیچھے، نیچے اوپر جو کچھ ہوتا ہے اس سے بھی پوری طرح باخبر رہتے ہیں۔ تھرو پراپر چینل والی اس وضاحت پر اسپیشل آفیسر نے ہمیں ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے تشویشناک لہجے میں فرمایا۔ "مجھے اس نوجوان کے دماغ میں کچھ خلل معلوم ہوتا ہے [illegible] کی ضرورت ہے اسے فوراً تھرو پراپر چینل، مینٹل ہاسپٹل روانہ کردیا جائے۔!"

مینٹل ہاسپٹل کا نام سنتے ہی ہمارے ہاتھ پاؤں میں تھرتھری چھوٹ گئی ہم نے گڑگڑا کر کہا۔ "حضور مائی باپ آپ نے تھرو پراپر چینل صرف یک طرفہ بات سن کر فیصلہ دے دیا ہمارا تھرو اس ناچیز کے چینل سے بھی تو

کچھ داد فریاد سنیئے ۔ حضور یہ تو میرے دماغ میں خلل ہے اور نہ ہی میں یہاں خودکشی کی نیت سے آیا تھا ، مجھے تو ایک کتے کی کشش یہاں کھینچ لائی حضور ۔!"

"کتے کی کشش ۔!" اسپیشل آفیسر نے سوالیہ لہجے میں پوچھا ، اور پھر ہمارے جواب دینے سے پہلے خود ہی بول اٹھے ۔ "کہیں تم تھرو پراپر چینل میرے شاہی بہادر کی تو بات نہیں کر رہے ہو ۔؟"

اسپیشل آفیسر کا لہجہ ایک دم بدل گیا ، ساری کرختگی غائب ہوگئی ساری رعونت ہوا ہوگئی ادھر ہم بھی فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے یعنی جب موصوف کی بات پر غور کیا تو ہمیں معاملے کی تہہ میں ایک عدد کتا بیٹھا دکھائی دیا جو سو فیصدی اسپیشل آفیسر کا چہیتا کتا شاہی بہادر تھا ، ہم نے جھٹ پینترا بدل کر انتہائی چاپلوسانہ لہجے میں کہا ۔ "کیا مردم شناس آدمی ہیں حضور والا آپ صرف مردم شناس نہیں سگ شناس کتا شناس بھی ہیں ، کیا خوب پہچانا آپ نے اس وقت واللہ آپ کے شاہی بہادر کی شہرت ہی تو مجھے یہاں کھینچ لائی ہے حضور اس کی ایک جھلک کی خاطر ہی تو یہ ساری مصیبتیں جھیل رہا ہوں میں ۔ خودکشی کا الزام پولس تھانے ، پاگل خانے تک جانے کو تیار ہوگیا ہوں میں ، صرف اور صرف شاہی بہادر کی خاطر آپ کے شاہی بہادر کی خاطر حضور ۔!!!"

ہمارا یہ وقتی واویلا کارگر ثابت ہوا ، اسپیشل آفیسر ہماری اس شاہی نوازی سے اسقدر متاثر ہوئے کہ دفتر ہذا کے چھوٹے بڑے دونوں ارباب مجاز کو قہر آلود نظروں سے کچھ دیر تک گھورتے رہے پھر بڑی ہی شفقت آمیز نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولے ۔ "شاہی بہادر کے لیے تمہارے دل میں یہ پیار یہ عقیدت تھرو پراپر چینل قابل ستائش ہے نوجوان لیکن افسوس ، ان دنوں شاہی بہادر کی طبیعت ناساز ہے ، پتہ نہیں اسے کس بد خواہ کی نظر لگ گئی اس کا کھانا پینا کھیلنا کودنا سب بند ہوگیا ہے ، شاید تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا نوجوان اس میں شاہی بہادر کی درازیٔ عمر اور مکمل صحت یابی کے لیے بے شمار ہی خواہوں ، قدر دانوں اور شاہی بہادر کے پروانوں کے تھرو پراپر چینل خطوط چھپے ہیں ۔" اتنا کہہ کر موصوف نے اپنا وزیٹنگ کارڈ ہمارے حوالے کیا اور کہا "کسی بھی روز شام میں پانچ اور چھ بجے کے درمیان تھرو پراپر چینل شاہی بہادر کی عیادت کو آسکتے ہو ۔" پھر وہ دونوں ارباب مجاز سے مخاطب ہوکر بولے ۔ "جس انسان کے دل میں کتوں کے لیے تھرو پراپر چینل اتنا پیار ، اتنی عقیدت ہو ، زندگی پر سے اس کا اعتقاد ، کبھی نہیں اٹھ سکتا ، جانے دو اس نوجوان کو ۔" اسپیشل آفیسر کے منہ سے نکلے ہوئے یہ کلمات محض الفاظ نہیں بلکہ ہمارے حق میں مژدۂ آزادی تھے ۔۔۔!!!

(جاری)

سید طالب حسین زیدی

جانا ہمارا پاکستان

معیت و مساعدت میں جگودرکی۔ ۴

پولیس کی ڈائیری میں، ڈنڈے کی شاعری میں فل اسٹاپ نہ کاما

جب ہم حیدرآباد سے چلے تھے اس وقت یہاں جس کسی سے بھی پاکستان جانے کا تذکرہ آتا تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے اور منع کرتے کہ کراچی کے حالات اس قابل نہیں ہیں کہ وہاں جانے کے متعلق سوچا بھی جائے۔ مگر جب ہم اپنے جی کو کڑا کر کے وہاں پہنچ ہی گئے تو دیکھا کہ معاملہ بالکل برعکس ہے، بڑا امن و امان تھا۔ نہ ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں نہ اغوا قتل اور قفل شکنی کی وارداتیں اور نہ "تعذیب خانوں" کی خونچکاں داستانیں۔ میاں محمد نواز شریف وزیر آعظم نے عہد کیا ہے کہ کراچی شہر کو جو پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے اس خون آشامی، بدنظمی اور غنڈہ گردی سے پاک کر کے رہیں گے اور ان کی قائم کردہ فوجی عدالتوں کے قیام کے ذریعہ مہینوں میں نہیں۔ ہفتے عشرے میں مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا کر ساری مکدر فضاء کو پاک وصاف کر دیا جائے گا۔ اس عہد کے اعلان کے ساتھ ہی سارے فتنہ پرداز جو دن دہاڑے کلاشنکوف اور اے کے سینتیس رائفلیں لئے دندناتے پھرا کرتے تھے چوہوں کی مانند اپنی اپنی بلوں میں گھس گئے تھے۔

ایک حد درجہ الم ناک واقعہ جو ہمارے پہنچنے سے چند ہی دن پہلے وقوع پذیر ہوا تھا وہ تھا نہایت شریف، حلیم الطبع، حاتم دوراں، اور مرنجاں مرنج ملک و ملت کی ہمدرد ترین شخصیت ہمدرد دواخانے کے مالک حکیم محمد سعید صاحب کی شہادت، جنہیں درندہ صفت، مفاد پرست، ملک و قوم کے بدخواہ عناصر کی انگلیوں پر تھرکنے والے، ہتیاروں نے گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ان سے کروڑوں روپے کا مطالبہ کیا گیا تھا نہ ملنے کی صورت میں ایسی خبیث و کربناک حرکت کی گئی کہ سارے ملک میں صف ماتم بچھ گئی...... حکیم صاحب کی شہادت سے پہلے بھی ایک نڈر و بے باک صحافی "تکبیر" کے مدیر اعلیٰ صلاح الدین صاحب کو بھی شہید کیا گیا تھا جو ہمیشہ شرپسند درندوں کے گھناؤنے جرائم، کمینہ پن کی حرکتوں پر سے نہایت جرت مندی سے پردہ اٹھا کر انہیں ملک و قوم کے سامنے لایا کرتے تھے وہ بھی اسی طرح ہلاک ہوئے۔

اپنے دوست جہانگیر حسین صابر کے ساتھ ان کی کار میں ایک مرتبہ آدھی رات کو ایسی گلیوں میں گزر ہوا جو کبھی شرفاء کے لئے انتہائی غیر محفوظ اور خطرناک سمجھی جاتی تھیں لیکن اب اتنی ہی بے ضرر اور پرسکون ہیں۔ صابر نے بتایا ایک مہینہ پہلے تک ان گلیوں میں کسی اجنبی شریف آدمی کا اس وقت داخل ہونا اپنے آپ کو جان بوجھ کر ہلاکت میں ڈالنے

کے مترادف تھا۔ رانفلیں تانے دس بیس نوجوان اسے گھیر لیتے اور اس پر خواہ مخواہ حکومت کی ایجنسی کا جاسوس ہونے فردِ جرم عائد کر کے اوٹ پٹانگ سوالات کی بوچھار کر دیتے وہ لاکھ کہتا کہ میں اپنے دوست یا رشتے دار سے ملنے آیا ہوں، اس کی ہر بات کو جھوٹ قرار دے کر اسے گھسیٹتے ہوئے اپنے بنائے ہوئے تعذیب خانے میں لے جا کر اتنا مارتے قریب المرگ ہو جاتا پھر بھی اس سے اپنی مرضی کا مطلب نہ نکلوا پاتے تو ڈرل مشین سے اس کے گھٹنوں میں سوراخ ڈال جان ہی سے مار ڈالتے......

زندہ دل لٹیرے!

لٹیروں کا یہ حال تھا کہ کسی گھر میں گھس کر مکینوں پر جو ٹی وی ڈرامہ دیکھنے میں محو رہتے یا بے خبر سوتے رہتے رانفلیں تان کر کھڑے ہو جاتے کہ ذرا سی حرکت پر سر میں سوراخ بن جائے گا اور پھر سارے گھر کا صفایا ہو جاتا۔ ٹرک میں مالِ غنیمت لاد کر بڑے اطمینان سے روانہ ہو جاتے۔ پڑوسیوں کو علم بھی ہو جاتا تو وہ اپنی خیر مناتے ہوئے دم سادھے رہتے ورنہ دو چار کا "خون" ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ان لٹیروں کی بعض کی زندہ دلی کے قصے بھی سننے میں آئے ہیں۔ شب خون مار کر ٹرک کے لوڈ ہو جانے کے بعد خاتونِ خانہ یا کسی بزرگ خاتون سے کہا جاتا، بی بی! یہ آنسو پونچھو، ہم بہت تھک گئے ہیں بھوک بھی خوب لگ رہی ہے فریج کھول کر دیکھو کچھ کھانے پینے کو ہو تو لے آؤ۔ اتنے ہم کیا پی لیں تم چار پانچ پیالے گرم گرم چائے کے بنا لاؤ، مولا تمہیں بھوکوں کا پیٹ بھرنے پر بڑا اجر دے گا.....

خاتون یہ سن کر جل بھن جاتی۔ اللہ تمہیں غارت کرے کیسے بے شرم بے حیا مشٹنڈے ہو۔ گھر کے اور ہاتھوں میں ایک تار تک نہ چھوڑا کان بھی نوچ لیے۔ بے غیرتو اوپر سے اپنا دوزخ بھرنے کے کہہ رہے ہو۔ تم پر غیب کی پڑے۔ تمہارے گھر بھی لٹیں، ستیاناس ہو!......

"بی بی! چراغ جلے کیوں ایل فیل بک رہی ہو، نیم شبی کی آدھی رات کا وقت ہے یہ ہر طرف چار سمت بلاؤں کے نزول کا وقت ہے۔ ایسے مادقت کیوں جھوٹ بولتی ہو۔ شکر کرو کئی کلو وزن ڈھوئے پھرا کرتی تھیں اس بوجھ سے چھٹکارا دلا کر ہاتھوں میں تمہارے سہاگ کی نشانی یہ دو کنگن چھوڑ تو دیے ہیں کہ اس مبارک نیکی کے بدلے میں مولا میری گھر والی کا سہاگ بھی قائم رکھے۔ آمین......"

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

(ذرا چور کی دیدہ دلیری تو دیکھو، اپنے ہاتھ میں چراغ لیے آیا ہے)

کراچی میں اس بار محرموں اور شادی کے ہنگاموں کی وہ خرافات دیکھنے میں نہیں آئی جو پچھلی مرتبہ ہمارے دورۂ پاکستان کے موقع پر دیکھنے میں آئی تھی۔ شادیوں کی تقاریب میں اب حکومت نے کھانوں کی بہتات اور فضول خرچی پر سخت پابندی عائد کر دی ہے۔ خلاف ورزی کی صورت میں جرمانہ تین تا پانچ لاکھ روپے بھگتنا پڑتا ہے۔ مجال ہے کہ اب کوئی کھلے بندوں عالی شان شادی خانوں میں اس کی جرأت کر سکے ہاں، مگر ایک کہیے جیسے لوگ ہر قانونی پابندی کا توڑ ڈھونڈ ہی نکالتے ہیں۔ سو، نکاح کی محفل میں شریک ہونے والوں کو پہلے اپنے گھر بلا کر خوب خاطر تواضع کی جاتی ہے اور پھر سارے پیٹ بھرے صرف آئس کریم کھانے اور میٹھی چیزوں کی خاطر شادی خانے جا کر گئے ہاتھوں نکاح کی محفل میں شرکت کر کے گونہ بھی بھگتا لیں...... وہ محل اور قصر نما شادی خانے [illegible]

کرتی تھی، ان کی سجاوٹ، خوش اخلاقی اور روشنیوں کی بہار دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ کاش!.........

ایک دن بہادر یار جنگ اکادمی سراج الدولہ روڈ بہادر آباد بھی جانا ہوا جہاں محترم خواجہ حمید الدین شاہد صاحب موجودہ چیرمین اور اکادمی کے دوسرے سرگرم حیدرآبادی حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ہمارے ایک دوست مسعود بیگ صاحب (علامہ حیرت بدایونی کے داماد بیگ صاحب کے چھوٹے بھائی) سے ہم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ خواجہ صاحب سے ملنے اور اکادمی دیکھنے کا ارادہ ہے انہوں نے فرمایا، میں خود بھی اکثر وہاں جاتا رہتا ہوں، خواجہ صاحب اپنی علالت کے باعث گھٹنوں میں کبھی ایک آدھ بار وہاں تشریف لاتے ہیں۔ یہاں ان سے وقت لے کر کل آپ کو لے چلوں گا۔ معلوم ہوا خواجہ صاحب نہایت خندہ پیشانی سے ملاقات کے لیئے آمادہ ہوگئے اور دوسرے دن گیارہ بجے کا وقت مقرر ہوا۔ ہم جب وہاں پہنچے تو اکادمی کی عالی شان عمارت کے کانفرنس ہال میں خواجہ صاحب اور دیگر اصحاب کو اپنا منتظر پایا۔ وہ منظر بھولا نہیں جاتا جب خواجہ صاحب نے نم آنکھوں اور رندھے گلے سے بغل گیر ہو کر ہمارا استقبال کیا، اپنے سارے حیدرآبادی احباب کی نام بنام خیریت دریافت کی اور سلام پہنچایا۔ لائبریری اور اکادمی کی سیر کروائی اور اکادمی کی طرف سے حیدرآباد مرحوم پر شائع شدہ ڈھیر ساری تاریخی کتابیں عنایت فرمائیں۔ حیدرآباد کے ذکر پر بے کل ہوئے جارہے تھے، اس قدر ضعیف و ناتواں ہوگئے ہیں کہ انہیں مشکل ہی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ اس بات کو دیکھ کر جی بہت خوش اور مطمئین ہوا کہ حیدرآباد کے عالی حوصلہ سپوتوں نے دیار غیر میں اس کی یادوں کی شمع کی تو لو فروزاں کر رکھا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد رخصت لی اور دل میں ایک کسک سی لیے اپنے دوستوں ضمیر الدین اور مسعود بیگ کے ساتھ سوغات میں ملی کتابوں کا بنڈل لادے ڈیرے پر جب واپس ہو رہے تھے تو جگندر نے ہمارے ایک کوکا لگایا۔

چار پائے برو کتاب چند

دھم بول کے آیا شیرا (کتابوں کو پیٹھ پر لادنے سے گدھا عالم نہیں بن جاتا)

پاکستان میں اب حیدرآبادیوں کی تیسری نسل پروان چڑھ رہی ہے جو اس کی بو قلمونیوں کو اپنے سینے میں بسائے ہوئے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھی ہوئی ہے۔ ایک دن شام کے وقت ہم اپنے لنگوٹیا یاروں ضمیر اور جہانگیر کے ہمراہ حیدرآباد کالونی کی زیارت کے واسطے وہاں گئے۔ کراچی سنٹرل جیل کے قریب سے گزرتے ہوئے جہاں آج کل پاکستان کے بڑے بڑے "مائیگرس" سرکار کی میزبانی کا لطف اٹھارہے ہیں ان ہی میں وہ "مائیگروں کے مائیگر" بھی ہیں جنہیں کل تک "مسٹر ٹمرٹی پرسنٹ (30%)" کے لقب سے بلایا جاتا تھا.......

ان کے تصور ہی سے گھبرا کر جب ہم کالونی میں داخل ہوئے تو وہاں کا نقشہ، لوگوں کی صورتیں اور لباس دیکھنے اور دکانوں کے سائن بورڈ پڑھنے سے ایسا لگا جیسے حیدرآباد سرکاری جالی کے "شالی بنڈہ" (شاہ علی بنڈہ) مغل پورہ، پنچ محلہ یالا لا یالا لو یاقوت پورہ فرحان میں نکل آئے ہیں۔ چار مینار و مکہ مسجد، دکن اچار، گھر گر میلہ، گورے میاں کا ہوٹل، گجرات کا "خانقہ گلی".... ساری فضا پر حیدرآبادیت چھائی ہوئی تھی.... سڑک پر ہماری کار کے آگے بچوں کا ایک غول بیابانی شور مچاتا ہوا ہاتھوں میں چھڑیاں، بانس، نیم کے "ڈالے" (ڈالے) پٹنے ہوئے ملچتا کودتا ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر اسی طرح ایک دوسرے پر فقرے چست کرتا ہوا نظر آیا جیسے حیدرآباد میں علموں اور نشانوں کے آگے تماشہ ہوتا

ہے۔ جب ہم قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ کسی "حضرت کی ووڑنا" (حضرت کی درگاہ) کے عرس کے سلسلے میں یہ دھوم دھڑکا ہو رہا ہے۔ اور کیسا دھوم دھڑکا۔؟......

"یالی دولا۔ دھوم بول کے آیا شیر۔ چھتر گٹی نال صاحب۔ چھتر گٹی مال صاحب۔ اباکا بنا سہرا۔

اوہو کا بنا سہرا۔ آیا دیکھو، چنچل، آیا دیکھو، کوئلہ۔ اسے آیا دیکھو ڈبل پورہ (دبیرہ پورہ)"

یہ ہلڑ بازی کرتے ہوئے دو لڑکے کسی بات پر آپس میں گتھم گتھا ہوگئے اور دوسرے انہیں اپنے نرغے میں لے کر ناچنے اور مزے لیتے ہوئے انہیں جوش دلانے لگے۔ "کیا خوب چلی دستی.... کیا خوب چلی دستی...... جگندر اس تماشے کو نہایت انہماک اور دل چسپی سے دیکھتا ہوا خود بھی بے اختیار ہوگیا۔ شرارت پھوٹی اور کار کی کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر اسی لے میں پوچھا! "کاہے پہ چلی دستی" جواب آیا، موز (کیلا) پہ چلی دستی..... کیا خوب چلی دستی۔ اور جب بچوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کار والے بھی اپنے ہی "گیرائیں" لگتے ہیں تو ان دونوں لڑاکو مرغوں پر خط کشید کھینچ کر ہماری کار کے اطراف جمع ہو کر ناچنے لگے۔ "یالی دولا۔ دھم بول کے آیا شیر! آہ!"

جہانگیر نے بڑی مشکل سے ان کے نرغے سے کار نکالی اور یہ جا وہ جا۔ پیچھے سے آوازیں آتی رہیں۔ "چھتر گٹی مال صاحب......" ہمیں جگندر کی اس بچکانہ حرکت پر بے حد غصہ آیا، پوچھا تجھے یہ کیا سوجھی تھی؟ خواہ مخواہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ بیٹھا۔ بولا! تمہارا حیدر آباد سرکار عالی چھتر گٹی نال صاحب اور یالی دولا ہی سے تو عبارت ہے اور انہی مزوں کو لوٹنے کی خاطر تو ہم وہاں پڑے ہوئے ہیں..... ہم لاجواب ہوگئے قصہ رفع ہوگیا۔

ہا! حیدر آباد فرخندہ بنیاد مرحوم خدا تجھے بھی دلی کی طرح کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے تیری عطر بیز ہواؤں کی مہک میرے پانی کی شیرینی اور تیری آسودہ حالی وسیر چشمی کی شہرت، ہندوستان، افغانستان اور ایران و عرب سے کیسی کیسی باکمال ہستیوں کو کھینچ لایا کرتی تھی اور وہ تیری غریب پروری و میزبانی سے آسودہ حال ہو کر اپنے وطنوں کو بھول جاتے اور تیری ہی خاک کا پیوند ہو جاتے تھے۔ مگر، آہ! دلی کے سے تیری نصیب نہ ہوئے، کوئی محمد حسین آزاد یہاں بھی پیدا ہوتا اور تیرے درخشاں و تابندہ تاریخ کو "آب حیات" پلا کر دوام بخشتا۔ اب جو کچھ بھی ہے وہ اگلوں کے سینوں میں دفن ہے انہی سے کچھ سن سنا لیتے ہیں۔ مگر یہ بھی کب تک؟ رہے نام اللہ کا۔

تکیہ بر اختر شب مکن کایں عیار

تاج کاؤس ربود و کمر کیخسرو !!

(رات کے ستارے پر بھروسہ مت کر کہ چال باز نے کیکاؤس اور کیخسرو جیسے فلک شکوہ تاجداروں کے تخت و تاج بھی مٹی میں ملا کر چھوڑے)

یالی دولا والے بچوں سے بچکر جب ہم ذرا آگے بڑھے تو سڑک کے بیچوں بیچ ایک خچر کھڑا نظر آیا۔ ہم نے پوچھا یہ یہاں کیسے۔؟ جہانگیر بولے، صاحبزادے! یہ خچر نہیں، گدھا ہے...... کرنل کے گدھے بڑے بڑے گدھے ہوتے ہیں اپنے پچھلے دورے میں ہم نے جو گدھا گاڑیاں دیکھی تھیں وہ اب نظر نہیں آئیں جن پر دھوبی ایک ٹرک لوڈ کپڑوں کی لادی لاد کر گھاٹ لے جایا کرتے تھے جنھیں یہ گدھا نہایت سبک خرامی سے کھینچتا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کے دھوبی اپنے گدھوں کو جلیبیاں اور دودھ کھلا پلا کر بڑے چاؤ سے پالا کرتے تھے۔ اب یہ ان گدھوں کا کام تو ٹرالی سے لیا جاتا

ہے۔ حیدر آبادی گدھے جو کراچی کے قد قامت گدھوں کے سامنے بونے لگتے تھے اپنے جثے اور طاقت سے زیادہ بار پیٹھ پر لادا کرتے تھے بوجھ ڈھونے سے ان کی دونوں پچھلی ٹانگیں آپس میں مل کر اس قدر گھسی جاتی تھیں کہ زخمی ہوجاتیں اور ان سے خون رستا رہتا تھا اور دھوبی۔؟ محکمہ انسداد بے رحمی بر جانوران، سرکار عالی" کو منہ چڑاتا ہوا ان پر لادی لاد کر دھڑلے سے گھاٹ لے جایا کرتا تھا۔ مگر جب سے کرشن چندر نے ایک گدھے کو ملک کا نیتا بنادیا سب سے سارے گدھے اپنی پشتینی ڈیوٹی کو دولتی مار کر ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے ہوئے اسی کے اطراف گھوم رہے ہیں......

کراچی میں ایک پارسی صحافی مشہور کالم نگار ہے جس کا کالم انگریزی اخباروں "ڈان" وغیرہ میں مستقل چھپتے اور شوق و توجہ سے پڑھے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ پاکستان کی ایک بڑی مذہبی سیاسی جماعت کے "بڑے مولانا" سے انٹرویو لینے ان کے پاس پہنچا۔ اس کے منہ کھولنے سے پہلے خود مولانا نے اس سے پوچھا! تم لوگ ایران چھوڑ کر ہندوستان کیوں چلے آئے؟۔ اس نے جواب دیا! ہمارے ملک پر عربوں کا قبضہ ہوجانے کے بعد مجبوراً وہاں سے بھاگنا پڑا، ہندوستان پڑوسی ملک تھا اس لئے یہاں پناہ لینے چلے آئے۔ مولانا نے فرمایا! نہیں نہیں تم تاریخ کو مسخ کر رہے ہو حقیقت اس کے برعکس ہے۔ صحافی دبے لفظوں پوچھا، کیا ایرانیوں نے عرب پر قبضہ کر لیا تھا؟..... مولانا اس کی چوٹ کو پی کر بولے۔ اب جب تم یہاں پاکستان میں رہتے ہو تو اسلام کیوں قبول نہیں کرلیتے؟...... اس نے جواب دیا! ہر آدمی کو اپنا دین پیارا ہوتا ہے اس لئے وہ کسی دوسرے کو اختیار نہیں کرتا...... یہ سن کر مولانا بہت جز بز ہوئے اور پھر یکایک بجلی سی کوندی انہوں نے اپنی شیروانی کی جیب سے ایک چاقو نکالا اور کھولا، پھر صحافی کی گردن پر رکھ کر بولے اور کیا بولے؟۔ اب میں تم سے اگر یہ کہوں کہ کلمہ پڑھ لو تو تم کیا کروگے؟۔ بے چارے نے گھگیاتے ہوئے جواب دیا۔ سچ! اب میں وہی کروں گا جو ایسی صورت حال کا سامنا ہونے پر کرنا چاہیئے...... اور پھر اس حرفوں کے بنے ہوئے صحافی نے (جس کا نام اب یاد نہیں آرہا ہے) دوسرے ہی دن اخباروں کے کالموں میں نمک مرچ لگا کر یہ سارا پول کھول کر رکھ دیا......

ہائے اقبال!

کار مومن فکر تدبیر و جہاد
کار ملا فی سبیل اللہ فساد

غزلیں

محبوب بانجھوی بلاسپور۔ایم۔پی

کھانسی سردی بخار ہے میں ہوں یعنی موسم کی مار ہے میں ہوں
قبر میں پاؤں میرے لٹکے ہیں موت کا انتظار ہے میں ہوں
ایک بیوی ہے آٹھ بچے ہیں فضل پروردگار ہے میں ہوں
وہی گندم کی فکر شام و سحر راشنوں کی قطار ہے میں ہوں
آسماں چھو رہی ہے مہنگائی وہی اپنی پکار ہے میں ہوں
یہ نتیجہ ہے بس میں چڑھنے کا دامن تار تار ہے میں ہوں !
اف تقاضہ وہی ہے بنیئے کا وہی سر پر ادھار ہے میں ہوں
وہی بیگم کا چڑچڑا پن ہے وہی بیلن کی مار ہے میں ہوں
آج بھی چھوٹ جانے کی گاڑی ان کا سولہ سنگار ہے میں ہوں
دل کی دنیا ہوئی ہے زیر و زبر ان کی نظروں کا وار ہے میں ہوں
وہی اپنی سواری خر ہے وہی جوتوں کا ہار ہے میں ہوں
خاک بدلی ہے زندگی میری وہی لیل و نہار ہے میں ہوں
باغِ ہستی میں ہے خزاں ہی خزاں دور فصلِ بہار ہے میں ہوں !

پھر بھی محبوب شکر ہے اس کا
رحمت کردگار ہے میں ہوں !

پاگل عادل آبادی

اب کے پینڈنگ میں ہم رہ گئے بی کے گنجے کا دم رہ گئے
جھانج اخبار میں بٹ گئی لکھے لوٹا صنم رہ گئے
گلگلے کھا رہے ہیں گدھے بھوکے اہل قلم رہ گئے
نمبر راکٹ میں جا پہنچے بیل بندی میں ہم رہ گئے
تجھ کو نوازش نے اولاد کی بال تاؤ کے کم رہ گئے
بانگ دینے لگے مرغیاں انڈے دینے کو ہم رہ گئے
مرگئے جو حیا دار تھے بے حیا بے شرم رہ گئے
[illegible] کو ماکر [illegible] [illegible] رہ گئے

شہناز اسلم
کنگ کوٹھی روڈ، حیدرآباد

محفل عقد اور ڈنر

حیدرآباد میں شادی کا سیزن بھی اب تو گرمی سردی کے سیزن کی طرح آنے جانے لگا ہے۔ ادھر شوہر کے آفس میں دعوت ناموں کی بھرمار، ادھر گھر اور رشتہ داروں کے ملنے جلنے والوں کے ہاں سے بلاوے آتے رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی دعوت نامہ وصول ہوتا ہے تو کارڈ کو کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا جاتا ہے۔ دن میں کئی بار یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ بھئی فلاں تاریخ کو نفیس منزل جانا ہے اور فلاں کو بنجارہ فنکشن ہال میں دعوت ہے۔ یہ بھی بطور خاص دیکھا جاتا ہے کہ ڈنر کس دعوت نامے میں ہے اور کس میں صرف محفل نکاح کی شرکت ہے اس اعتبار سے پروگرام بنائے جاتے ہیں۔ کتنا پیسہ تو بیوٹی پارلر اور بوتیک یا ٹیلر کی نظر ہو جاتا ہے اور پھر لفافے پیش کرنے کا بجٹ علحدہ۔ گاڑی کے لیے پٹرول بھی لینا ہے۔ بہرحال شادی کسی کی اور کچھ مر کسی کا۔ شادی کا کارڈ آتے ہی بی بی تو خوش ہو جاتا ہے کہ لوگوں سے ملاقاتیں ہوں گی کپڑوں کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ یہ کپڑے شادی کے دن یہ ولیمے کے دن۔ مرزا صاحب پوری تیاریوں کے ساتھ کسی بھی تقریب خانہ آبادی میں شرکت کے لیے کمربستہ ہیں۔ ان کا حال وہی تھا، بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانے۔ وہ اپنے میزبان اور ان کی روایات مہمان نوازی کو بھی ذہن کے پردے پر لے آتے اور انہیں یاد آجاتا کہ خان صاحب کے بڑے بیٹے کے ولیمے میں کیا کیا ڈشیں تیار ہوئی تھیں۔ اب چھوٹے اور آخری بیٹے کی شادی ہے بہترین کھانے کا انتظام ہوگا ادھر دل میں ابھی سے لڈو پھوٹ رہے ہیں اور رات کے کھانے کا خیال دل میں بسائے ڈنر کے کپڑوں کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔

ادھر تائی ماں کے گھر سے بیٹی کی شادی کا کارڈ جو آیا تو سب سے پہلے مرزا صاحب نے کارڈ کو بغور پڑھا۔ پروگرام پر نظر ڈالی رات آٹھ بجے آمد بارات نو بجے نکاح۔ دس بجے رخصتی۔ کارڈ کو کئی بار پڑھا اور دیکھا گیا۔ مگر یہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا کہ گھر سے کھانا کھا کر جائیں یا واپس آکر کھانا کھائیں۔ اگر گھر سے کھا کر نکلے تو نکاح میں شریک نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا مرزا صاحب اپنے اہل و عیال کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے۔ شادی خانہ مہمانوں سے پر ہو گیا تھا۔ رات دس بجے تک بارات کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اللہ اللہ کرکے ساڑھے گیارہ بجے دولہا اور باراتیوں کی آمد ہوئی نکاح کی رسم اور مبارک بادیوں کے بعد دور بیٹھے کے چند رشتہ داروں کے ہاتھ گرم مشروبات کی بوتلیں تھما دی گئیں۔ بعض نے ٹھنڈی چائے پینے کو ترجیح دی۔ اسی طرح آدھی رات تک مشروبات کا سلسلہ چلتا رہا۔ انتہائی قریبی عزیزوں اور خصوصی مہمانوں کو رخصتی کے بعد رات کے دو بجے تک کے لیے میں رکھے گئے ڈنر کے لیے روک لیا گیا۔ جب کہ

مرزا صاحب جیسے اور مہمان اپنی قسمت کو کوستے ہوئے قل ھو اللہ پڑھتی ہوئی آنتوں کے ساتھ گھروں کو روانہ ہوئے۔ گھر جانے کے بعد اتنی رات گئے کھانا کیا کھایا جاتا؟

مجھے کئی سال پہلے کی ایک دعوت یاد آرہی ہے۔ قریبی لوگوں کا گھر کے سامنے ہی گراؤنڈ میں کرسیاں ڈال کر بٹھانے کا انتظام تھا۔ دعوت زوروں پر چل رہی تھی۔ جن صاحب کے گھر یہ دعوت تھی وہ کچھ پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے اور کچھ فاصلے پر باتوں میں معروف اپنے چھوٹے بھائی سے کچھ کہنا چاہتے تھے کہ لائٹ چلی گئی۔ ان صاحب نے موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنے بھائی کے کان میں کہا کہ "جتنے حرام زادوں کو بلایا تھا سب آگئے اور کھانا کم پڑ گیا"۔

اتفاق سے یہ بات جن کے کان میں کہی گئی تھی وہ میزبان کے بھائی نہیں بلکہ میرے بڑے بھائی تھے۔ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے ایک حرام زادہ تو جا رہا ہے۔ باقی کو آپ سنبھالیں۔ یہ سننا ہی تھا کہ ان صاحب کا چہرہ فق ہو گیا دراصل جس کرسی پر وہ اپنے بھائی کو بیٹھا دیکھ رہے تھے۔ کرنٹ غائب ہوتے ہی وہ وہاں سے اٹھ گئے اور میرے بڑے بھائی وہاں بیٹھ گئے تھے۔ بڑے بھائی نے اپنے ارکان خاندان کو بھی اشارے سے بلایا اور موقع کی نزاکت بتلائی آدھی رات کو بھوکے ماندے سب گھر لوٹ گئے۔

قلمی معاونین سے التماس
اپنے مضامین صاف اور خوش خط صفحے کے ایک جانب لکھیں۔
ہر تخلیق پر اپنا پوسٹل پتہ ضرور لکھیں۔

امریکہ سے "سخن ور حصہ چہارم" اور "گفتنی" کی اشاعت

لاس اینجلس (امریکہ میں مقیم اردو کی ممتاز شاعرہ، ادیبہ اور صحافی سلطانہ مہر "سخن ور حصہ چہارم" (جس میں شعراء و شاعرات کا تعارف، کلام اور تصاویر شامل ہوں گی) اور نثر نگاروں کا تذکرہ بعنوان "گفتنی" ترتیب دے رہی ہیں۔ سخن ور حصہ اول میں جو (۴۰۶) صفحات پر مشتمل ہے (٦٠) معروف پاکستانی شعراء کا تعارف شامل ہے۔ سخن ور دوم میں جو (۵۲۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ بیرون پاکستان رہنے والے ۸۸ شعراء و شاعرات شامل ہیں۔ حصہ سوم میں امریکہ اور پاکستان کے ۸۲ شعراء و شاعرات شامل ہیں۔ سلطانہ مہر اب سخن ور چہارم اور "گفتنی" اسی اہتمام سے شائع کرنا چاہتی ہیں۔ اس سلسلے میں جناب حسن چشتی، جنرل سکریٹری، بزم اردو، شکاگو، نے دنیا کے کسی بھی حصہ میں مقیم شعراء و شاعرات اور نثر نگاروں سے خواہش کی ہے کہ وہ اپنا تعارف، اپنی تصویر، اپنا کلام، اور سیاہ بال پوائنٹ پن سے لکھا ہوا اپنا ایک شعر، دستخط اور تاریخ کے ساتھ حسب ذیل پتے پر جلد سے جلد روانہ فرمائیں۔

Sultana Mehr,
20673, East Walnut,
Canyon Road,
Walnut,
California 91789, U.S.A
Phone : (909) 444-0065
Fax : (909) 444-0077

وی سی پال بھل
انگریزی سے ترجمہ: ڈاکٹر میر گوہر علی خان

ٹویوٹا کا مالک

آج کل ہندوستان میں موٹر گاڑیوں کی تعداد میں بے تحاشہ اضافہ ہو رہا ہے یوں لگتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہندوستان کی اضافہ آبادی کا گراف اس کے مقابلہ میں بہت نیچے گر جائے گا۔ ایمبیسڈر اور پدمنی کا زمانہ تو گیا اب تو جدھر دیکھو راستوں پر ماروتی کاریں، چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی ہیں۔ کیوں نہ ہو؟ " ماروتی " کو عوام کی کار (PEOPLE,S CAR) کا خطاب جو دیا گیا ہے۔ مگر پھر بھی بدیشی کاروں کا مقابلہ ہندوستانی موٹر گاڑیاں کہاں کر سکتی ہیں؟ خصوصاً جاپان نے تو ساری دنیا پر اپنی موٹروں کی ڈھاک بٹھا دی ہے۔ اور ٹویاٹا (TOYOTA) تو اس ملک کی ٹوپی میں شتر مرغ کے ایک پر کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ قیمتی کاروں کے مالکین خود اپنی گاڑیوں کو چلانے کی خواہش کبھی پوری نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ ذمہ داری تو ان کے شوفروں نے لے لی ہے۔

لیکن میرے دوست سرجن سنگھ کی بات الگ ہے۔ ان کا بچپن پاکستان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں گزرا۔ جہاں کے لوگ موٹر گاڑیوں کو دیکھنے کے لئے ترستے تھے۔ انہوں نے خود مجھ سے کہا کہ ایک دفعہ جب وہ پرائمری اسکول میں تھے تو گاؤں میں یہ خبر گرم ہوئی کہ ضلع کلکٹر نے ایک نئی کار خریدی ہے۔ سرجن سنگھ کے سر میں یہ سودا سمایا کہ وہ وہاں جائیں اور اس گاڑی کو دیکھیں جو بیل کی مدد سے نہیں کھینچی جاتی۔ وہ اسکول جانے کے بجائے اپنے چند ساتھیوں کو لے کر ضلع کے مستقر پہنچ گئے۔ اور جب موٹر گاڑی کا نظارہ کر کے رات دیر گئے گھر لوٹے تو والد نے ان کی خوب پٹائی کی اور اسکول میں الگ ماسٹر نے ان کی چمڑی ادھیڑ دی۔

ملک کی تقسیم کے بعد وہ ہندوستان چلے آئے۔ جہاں بڑی کد و کاوش کے بعد انہیں انڈین فارن سروس میں اچھا سا عہدہ مل گیا۔ یورپ کے ایک ملک میں جب ان کی تعیناتی ہوئی تو وہ اپنے ساتھ ایک نئی نویلی بجی دھجی TOYOTA لے آئے۔ اس پر یہ ایسے ریجھے کہ شاید ان کی بیوی اس سے خار کھانے لگی ہو۔ یہ بات بیس سال پرانی ہے۔ اب تو ان کی ٹویوٹا کے انجر پنجر بھی ڈھیلے ہو چکے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ ابھی بھی اسے اپنے سینے سے لگائے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ " بھئی ٹویوٹا تو ٹویوٹا ہی ہوتی ہے "۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ دلی کی ایک سڑک پر سرجن سنگھ اپنی گاڑی کو خود دھکیل رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بجائے جھینپنے کے ٹویوٹا کے بنانے والوں کے سر الزام تھوپنے لگے۔ " جناب آج کل جاپان کے لوگ بھی ایماندار نہیں رہے۔ میں نے جب یہ گاڑی خریدی تھی تو مجھ سے کہا گیا تھا کہ اس کی بیٹری (BATTERY) تادم حیات چلے گی۔ مگر دیکھیے آج تو داغ مفارقت دینے کے درپے ہے "۔ اب ان سے کون کہے کہ

جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے آپ سمجھتے ہیں کہ جب تک آپ کی سانس چلتی رہے گی تب تک یہ جنتری بھی زندہ سلامت رہے گی۔

سرجن سنگھ ایک چھوٹے سے قد کے آدمی ہیں۔ یعنی ۵ فیٹ ۲ انچ سنگھ اپنی پگڑی کو ایسا کوک کلف دیتے ہیں کہ وہ ان کے قد میں ایک یا دو انچ کا اضافہ کر دیتی ہے۔ سال گزشتہ میں جب دلی گیا تھا تو مجھ سے فائیو اسٹار ہوٹل میں ملنے آئے تھے جہاں میں مقیم تھا۔ کچھ دیر ٹھیرے پھر ملنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہوئے۔ چند منٹ بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور سرجن سنگھ غصہ میں بھرے میرے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھ پر خواہ مخواہ برس پڑے۔ "آپ دوسری مرتبہ دلی آئیں تو میں اس شرط پر آپ سے مل سکتا ہوں کہ آپ ان فائیو اسٹار ہوٹلوں میں نہیں ٹھریں گے"۔

فائیو اسٹار ہوٹلیں اکثر وجیہ اور اونچے قد کے اشخاص کو خوبصورت وردی پہنا کر باب الداخلہ کے پاس متعین کر دیتی ہیں۔ ان کی ڈیوٹی یہ ہوتی ہے کہ وہ آنے والوں کا استقبال کریں۔ ان کی موٹریں صحیح جگہ پر پارک کروائیں اور وہ جب رخصت ہونے لگیں تو ان کے شوفروں کو اشارہ کریں کہ ان صاحبوں کی گاڑیاں پورٹیکو میں لے آئیں..... ان کے برافروختہ ہونے کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

سرجن سنگھ میرا کمرہ چھوڑ کر نیچے اترے تو باب الداخلہ پر اس وجیہ لم تڑنگ Valet (پورٹیکو پر متعین محافظ) کے ساتھ دلی کی چند معزز خواتین بھی وہاں موجود تھیں۔ ان کو دیکھ کر سرجن سنگھ کی رال ٹپک پڑی۔ جب وہ اپنی دھلی دھلائی ٹویوٹا میں واپس ہونے لگے تو تھوڑی دیر کے لئے پھر سے ان خواتین کو دیکھنے کی خواہش ہوئی اور اپنی گاڑی کو پورٹیکو کے سامنے کچھ دیر کے لئے روک دی۔ اچانک Valet آگے بڑھا کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور ایک خاتون سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"میڈم آپ کا شوفر آپ کی گاڑی لے آیا ہے"

ادارہ شگوفہ سے حسب ذیل مزاحیہ کتب حاصل کی جاسکتی ہیں

امریکہ میری عینک سے	یوسف ناظم	سفرنامہ	۵۰ روپے
الغرض	یوسف ناظم	مضامین	۳۰ روپے
واہ حیدرآباد	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
سنگ گزیدہ	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
طرفہ تماشہ	مسیح انجم	مضامین	۴۰ روپے
قل ایم سدی	مصطفیٰ علی بیگ	کلام	۸۰ روپے
ہنسی کے پردے میں	طالب خوندمیری	"	۱۰۰ روپے
شانہ بہ شانہ	اقبال شانہ	"	۵۰ روپے
کچوکے	پرویز یداللہ مہدی	"	۶۵ روپے

تبصرہ نگار:
ڈاکٹر یوسف اعظمی
شکاگو، امریکہ

اوراق مورخ

مصنف: ڈاکٹر سید داؤد اشرف

ڈاکٹر داؤد اشرف ایک دہائی سے مسلسل مستند اور معتبر دستاویزات کی روشنی میں بیسویں صدی کی اہم ادبی شخصیتوں کو اردو زبان کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں۔ ان کا جمع کردہ تحقیقی مواد ریاست حیدرآباد کے آخری حکمراں نواب میر عثمان علی خان کی خدمات پر روشنی ڈالتا ہے اور ایک حکمراں کی علم و ادب کی قدر دانی کا مظہر ہے۔ یہ قدر دانی، انسان دوستی سے عبارت ہونے کے ساتھ ساتھ، اپنی سرحدوں سے آگے، تعلیمی اداروں کی سرپرستی اور علم و ادب کے فروغ سے عبارت ہے۔

داؤد اشرف صاحب کی یہ کتاب ان کی تحقیقی کاوشوں کا تسلسل ہے۔ اس سے قبل ان کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب میں وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، سر راس مسعود، جوش ملیح آبادی کی ریاست حیدرآباد سے وابستگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے مرحلے میں، بعض ان سوالات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، جو بعض دوسری تحریروں کی روشنی میں شک و شبہ کی فضا کو جنم دیتے رہے ہیں۔ ادبی منظر سے ہٹ کر سیاسی طریق کار پر بھی بعض گوشے سامنے آئے ہیں۔ گاندھی جی کا دورہ حیدرآباد اور مولانا شوکت علی سے متعلق مواد، اس رخ کو واضح کرتا ہے۔ مصنف نے ریاست حیدرآباد کی فیض رسانی کا ذکر وسیع المشربی کے ساتھ انجام دیا ہے۔

"مولوی عبدالحق اور ریاست حیدرآباد" مضمون میں مصنف نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ، بابائے اردو کے مشن پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو کی پہلی، منفرد نوعیت کی لغت کی تیاری کے لیے ریاست کی ہمت افزائی کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بعض دستاویزات کی نقل چھاپ دی گئی ہے۔ جس سے اس کے استناد میں شک کی گنجائش نہیں رہتی۔

"جوش ملیح آبادی اور ریاست حیدرآباد" نے دراصل نئے گوشے وا کئے ہیں۔ جوش کی کتاب یادوں کی برات کی اشاعت کے بعد، بے شمار سوالات لوگوں کے ذہنوں میں اٹھتے رہے ہیں۔ یادوں کی برات، جوش کا نثری "کارنامہ" ہے جو شاعرانہ مبالغہ سے بھرپور ہے۔ جو دستاویز اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں ان سے معروضی انداز میں، شاعر کی انا اور شکست انا غیر مستند تفصیلات اور شاہی طریق کار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ایک اور مضمون بھی جوش سے متعلق شامل

ہے جو دارالترجمہ میں ان کی ملازمت کا احاطہ کرتا ہے۔

ریاست حیدرآباد نے اسلامی علوم کے سلسلے میں بھی بہت نمایاں خدمات انجام دیں۔ نواب عماد الملک کا ترجمہ قرآن مجید، اس سلسلے میں، قارئین کی تفہیم کے لیے معاون ہے۔ اسی طرح جامعہ نظامیہ کے بانی فضیلت جنگ بہادر سے متعلق مواد، ہمیں ریاست حیدرآباد کے حکمراں کی مذہبی وابستگی کو سمجھنے میں آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ "مسجد الاقصیٰ بیت المقدس کی مرمت اور تزئین نو" مضمون بھی وسیع تناظر میں اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس مضمون سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انگریز بہادر کی ابرو کے تیور پر بھی نظر رکھنا حکمران کے لیے ناگزیر تھا۔

اس کتاب میں شامل مواد سے قارئین کو اس بات کا واضح پتہ چلتا ہے کہ سرکاری امداد، اسلامی اداروں کے علاوہ دوسرے مذہبی اداروں کو بھی فراخ دلی کے ساتھ دی گئی۔ یہ ایک حکمران کی انصاف پسندی کا واضح ثبوت ہے۔ اسی لیے وہ مختلف مذہبی وحدتوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتے رہے ہیں۔ آصف سابع کی سیاسی حکمت عملی سے اختلاف ممکن ہے، مگر اس روشن خیالی پر متضاد آراء کا امکان کم ہے۔

گاندھی جی کا دورہ، حیدرآباد، ایک حساس مسئلہ کا احاطہ کرتا ہے اس سلسلے میں کتاب میں شامل مضمون اور ماخذ حقیقی صورت حال کو اپنے سیاق و سباق میں سمجھنے میں رہنمائی کرتے ہیں۔ مولانا شوکت علی کے لیے امداد، ان کی ملی اور مذہبی خدمات کا جرات مندانہ اقدام ہے۔ اس مضمون میں شہزادوں کے لیے ترکی خاندان سے ازدواجی رشتوں کو استوار کرنے کے سلسلے میں دلچسپ حقائق ہیں۔ "ریاست حیدرآباد کی فیض رسانی" مضمون سے جہاں مہا بھارت کی اشاعت، بنارس ہندو یونیورسٹی کے لیے امداد کا ذکر ہے، وہاں ریاست میں اجنتا کے غاروں کی بازیافت، ان کی درستگی اور تحفظ کے لیے ریاستی خدمات کا کارنامہ بھی، قارئین محسوس کرسکتے ہیں۔

مصنف نے مضمون "آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ کی تعمیر اور افتتاحی تقریب" بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ آرٹس کالج کی عمارت، خوبصورتی، شان اور عظمت کے علاوہ، ایک ہمہ جہتی کلچر کی آئینہ دار ہے۔ اس کتاب سے عدلیہ اور عاملہ کی علاحدگی اور بیگار کی لعنت جیسی قانونی بصیرت، دور اندیشی، اور سماجی روشن خیالی کی مثالیں سامنے آتی ہیں

مصنف نے بہت معتدل اور محتاط انداز میں مختلف فرمانوں کے بیچ پھیلی ہوئی کہانیوں، واقعات اور ہلکی ہلکی رنجشوں کو سمیٹا ہے۔ اوراق مورخ، دور عثمانی کی یاد تازہ کرتا ہے اور حیدرآباد کے روشن چہرے کی تصویر پیش کرتا ہے۔

یہ کتاب شگوفہ پبلیکیشنز کی جانب سے شائع کی گئی ہے، جس کا بنیادی مقصد طنز و مزاح سے متعلق کتابوں کی اشاعت ہے مگر اس ادارہ نے ادھر سنجیدگی سے دوسری نوعیت کی کتابوں کی اشاعت کو بھی، اپنے دامن میں جگہ دی ہے کتاب نامور آرکائیوسٹ سعادت علی خان کی محنت کا مرقع ہے۔ اس کتاب کی قیمت ایک سو روپے ہے۔ اس کتاب کو قارئین، دفتر شگوفہ 31 ، مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد یا روزنامہ سیاست سے حاصل کرسکتے ہیں۔

راہی
(ہندی سے ترجمہ) ف۔ م۔ سلیم
حیدرآباد

چپل چرانے کا چسکا

بے چاری منیکا گاندھی آنند پور صاحب میں خواتین کے ایک جلسہ کو مخاطب کرکے جیسے ہی اسٹیج سے نیچے اتریں تو دیکھا کہ کوئی چپل چور ان کی خوبصورت ملائم اور سفید چپل لے کر فرار ہوگیا ہے۔ منیکا گاندھی کے برہنہ پیر ہونے کے غم سے ہمیں ہمدردی ہے وہ اس لیے کہ وہ اکلوتی ایسی منتری ہیں جو انسانوں سے زیادہ جانوروں کو بچانے میں یقین رکھتی ہیں۔ چپل کی چوری کے اس واقعہ سے کئی سوال اچانک اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے منیکا کی چپلیں کس نے چرائیں؟ چور نے منیکا کی ہی چپلیں کیوں چرائی جبکہ وہاں یقیناً دوسری چپلیں بھی پڑی ہوں گی؟ کیا چور دہلی سے ہی ساتھ آیا تھا یا لوکل تھا؟ کہیں اس چپل کی چوری میں اماں سے للیتا کا ہاتھ تو نہیں؟ ایسا تو نہیں کہ حریف پارٹیاں اب یہ کہیں کہ جس سرکار کے منتری اپنی چپلوں تک کی حفاظت نہیں کرسکتے وہ دیش کی حفاظت کیا خاک کریں گے؟ کیا چپل کی چوری کی رپورٹ درج ہوئی ہے؟ اگر پولیس کے روزنامچے میں چوری کی رپورٹ ہی نہیں لکھوائی گئی تو چپل مل جانے پر اس کو کس کے سپرد کیا جائے گا؟ منیکا جی کی چپل چوری ہوجانے سے ہمیں اس قدر ذہنی تکلیف ہوئی ہے تو ہماری اپنی چپلیں کوئی چور لے جائے تو کیا بیتے گی، یہ سوچ کر ہی پھریری سی آجاتی ہے۔ ہماری یادداشت میں ایسے کئی واقعات ہیں کہ راجہ مہاراجا بھی چپل پہننا بھول گئے تھے۔ سداما اپنے دوست کی آمد کی خبر سن کر دوارکا کے راجہ کرشن نے چپل بھی نہیں پہنی اور دوڑ کر اپنے دوست کا استقبال کیا۔ اسی طرح بادشاہ ظل سبحانی محمد جلال الدین اکبر جب شیخ سلیم چشتی سے اولاد مانگنے گئے تب انہوں نے ننگے پیر ہی اپنا سفر کیا تھا۔ یہ تو کچھ مہاپرشوں کے قصے ہیں۔ ہماری نظر میں عالم کی سب مہان ناری (ہماری شریک حیات) نے اپنی 23 سالہ شادی شدہ زندگی میں ایک بار بھی ہمیں چپل کے ساتھ باورچی خانہ میں نہیں گھسنے دیا۔

ادھر جمہوریت میں ہمارے نمائندے چپل کا بہترین استعمال کرتے ہیں بحث مباحثہ کرتے کرتے کب جوتم پیزار شروع ہوگی اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ کچھ لوگوں کو چپل چلانے اور کچھ کو چپل چرانے کا چسکا لگ جاتا ہے۔

ہمارے ایک تاجر دوست ہیں، بڑے بھگت ہیں صبح شام مندر جاتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ سے پریشان ہیں۔ ایک دن صبح صبح مل گئے اور بولے یار ایک چور نے بڑا پریشان کر رکھا ہے اب تک چار جوڑی جوتے چپل پار کرچکا ہے بڑی مشکل ہے من سے بھگوان کے سامنے کھڑا رہتا ہوں لیکن من چپلوں میں ہی دھرا رہتا ہے۔ نہ جانے کب چور لے اڑے۔

ہم نے اپنی پوری دماغی قوت کو یکجا کرکے صلاح دی۔ بھائی آپ مندر جائیں تو کار لے کر جائیں چپل کار میں چھوڑ لاک کرکے مندر میں جائیں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور چائے کی دعوت دے دی۔

اس واقعہ کے بیس دن بعد پھر ان سے ملاقات ہوئی اس دن بھی ان کے پیروں میں چپل نہیں تھے۔ ننگے پیر بدحواس چہرہ، پھولتی سانس، ہمیں دیکھتے ہی بڑبڑانے لگے، برا ہو تمہارا اچھا معقول صلاح دیتے ہو۔ ہم نے کہا، بھائی بتاؤ بھی کیا قصہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ چپل چور چپلوں کے ساتھ ہماری کار بھی چرالے گیا۔

چپل چوری کا ایک اور قصہ ہمیں یاد آتا ہے۔ ہمارے شہر میں ایک بہت بڑا جشن ہوا تھا ایک لاکھ افراد کے لیے بیٹھنے کا پنڈال بنایا گیا۔ جشن سے پہلے نکالے جانے والے جلوس کی نمائندگی کرنے والے ہاتھی پر بیٹھنے والوں کی بولی لگی شہر کی ایک مشہور الکٹرانک کمپنی کے مالک نے اکہتر ہزار میں یہ بولی چھڑائی۔ بڑا بھاری جلوس نکلا۔ لیکن جب جلوس ختم ہونے کے بعد ہاتھی پر سوار شخص نیچے اترے تو دیکھا کہ کوئی چور ان کی چپل چرالے گیا ہے۔ وہ بپھر کر چلانے لگے۔ کسی نے ان سے کہا بھائی صاحب آپ نے اکہتر ہزار روپیئے ابھی ابھی بولی میں لگائے کیا چپل اس سے بیش قیمت تھی۔ وہ بڑبڑائے ہاں کل ہی خریدی تھی اکہتر روپیوں میں۔ کہاں اکہتر ہزار اور کہاں اکہتر روپے لیکن چپل کی چوری کا دکھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسٹیج سے اتر کر اپنی چپل نہ پاکر منیکا گاندھی پر کیا گذری ہوگی!

اداریہ

نامور کارٹونسٹ عزیز حیدرآبادی کا پچھلے دنوں کراچی میں انتقال ہوگیا۔ عزیز کارٹونسٹ کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا۔ حالات نے انہیں ہجرت کے لیے مجبور کردیا لیکن بنیادی طور پر وہ حیدرآباد کے تھے۔ زبان، لب و لہجہ، تہذیب ہر اعتبار سے وہ پکے "حیدرآبادی" تھے۔ عرصہ قبل وہ جب حیدرآباد آئے تو سب سے پہلے انہوں نے وطن کی مٹی کو چوما اور سجدہ ریزہ ہوگئے۔ اپنے قدیم دوستوں سے گلے مل مل کر روتے رہے۔ خالص دکنی لب و لہجہ میں وہ گفتگو کرتے اور درمیان میں تلگو کے الفاظ اور جملے ادا کرکے عجب خوشی محسوس کرتے۔ دوران قیام انہوں نے شگوفہ کے لیے ٹائٹل اور کارٹون بنائے۔ وہ ہر روز دفتر شگوفہ آتے اور اپنی پرلطف گفتگو سے محفل کو قہقہہ زار بنادیا کرتے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں زندہ دلان حیدرآباد کا ایک وفد طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی پہنچا تو مہمان نوازی میں پیش پیش رہے۔ عزیز کارٹونسٹ ایک معصوم صفت، پرخلوص اور سراپا محبت انسان تھے۔ ان کے قلم میں ایک جادو تھا۔ دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کرچکے تھے۔ اور عالمی شہرت کے حامل شخصیتوں سے وہ مل چکے تھے۔ ہم بہت جلد اس منفرد کارٹونسٹ کے کارٹونوں کا ایک انتخاب شگوفہ میں شائع کریں گے۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد ۳۲ شمارہ ۸ حیدرآباد

اگست ۱۹۹۹ء

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز: ڈاکٹر عابد معز

سرورق: سعادت علی خان

قیمت فی پرچہ: ۱۲ روپے زر سالانہ ۱۴۰ روپے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد۔ فون (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064



عاتق شاہ

ایک یادگار گروپ فوٹو۔



ایستادہ: شاذ تمکنت، وحید اختر، عوض سعید، ابن احمد تاب
کرسیوں پر: شاہد صدیقی، عاتق شاہ، احمد مکی، سرور ڈنڈا، سلیمان اریب، قمر ساحری، نور محمد نور
فرش پر: منوہر لال بہار، خیرات ندیم، اقبال متین، سردار سلیم وغیرہ



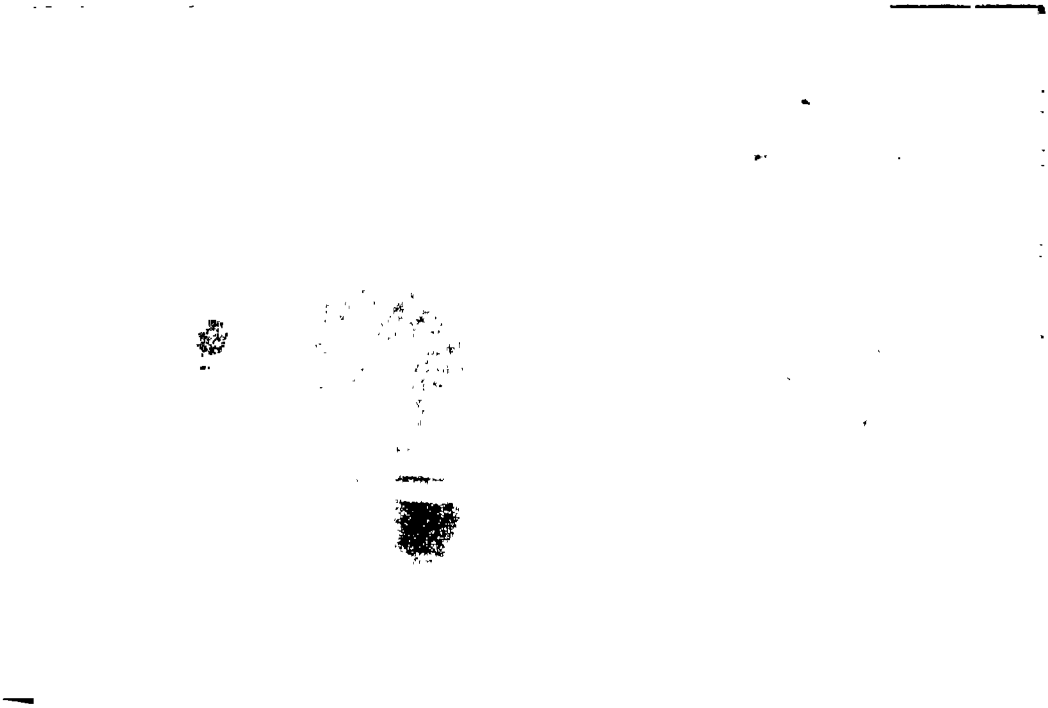
ایک جلسہ میں دائیں سے بائیں بھارت چند کھنہ، عزیز قیسی، مجتبیٰ حسین، عاتق شاہ اور احمد جلیس



احمد فراز کے ساتھ ایک فوٹو



اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے جسٹس صغیر احمد صاحب عاتق شاہ کو مجموعی خدمات پر
اعزاز عطا کر رہے ہیں۔ صدر اکیڈمی جناب سید رحمت علی اسٹیج پر موجود ہیں



کراچی میں نامور ادیب مشتاق احمد یوسفی سے جناب طالب حسین زیدی کی ملاقات

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)



ادارہ شگوفہ سے حسب ذیل مزاحیہ کتب حاصل کی جا سکتی ہیں

مریکہ میری عینک سے	یوسف ناظم	سفر نامہ	۵۰ روپے
البتہ	یوسف ناظم	مضامین	۳۰ روپے
واہ حیدرآباد	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
سگ گزیدہ	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
طرفہ تماشہ	مسیح انجم	مضامین	۴۰ روپے
آئی ایم ساری	مصطفیٰ علی بیگ	کلام	۸۰ روپے
سخن کے پردے میں	طالب خوندمیری	〃	۱۰۰ روپے
بہ فرض محال	خواہ مخواہ	〃	۷۵ روپے
شانہ بہ شانہ	اقبال شانہ	〃	۵۰ روپے
کچوکے	پرویز یداللہ مہدی	〃	۶۵ روپے
سفر لخت لخت	مجتبیٰ حسین	سفر نامہ	۲۵ روپے
درگت	ٹی این راز	کلام	۷۰ روپے
کیا مذاق ہے	اسمٰعیل آذر	کلام	۵۰ روپے
الف تماشہ	[illegible]	کلام	۳۰ روپے

یوسف ناظم
ممبئی

تلاش گمشدہ۔ ایک اشتہار

نام: شاہد علی خاں عرف مدار د۔ قبیلہ: فرخ آبادی پٹھان (جو شاید آفریدی ہوتے ہیں اور چونکہ ان کے آباو اجداد باہر سے یہاں آئے تھے اس لیے یہ لوگ حسباً اور نسباً غیر ملکی ہیں۔ ان کے راشن کارڈ ضبط اور پاسپورٹ منسوخ کیے جانے چاہیں۔ اس مشق میں تھوڑی سی تاخیر ہوجائے تو حرج نہیں لیکن رائے دہندگان کی فہرست سے ان کا نام فوراً سے پیشتر خارج کیا جانا چاہیے۔

عمر: ۵۰ اور ۶۵ کے درمیان۔ حلیہ: پہلے ٹھیک تھا۔ اب اس کی پروف ریڈنگ ہونی چاہیے۔

قد: اوسط کے تقریباً قریب۔ رنگ: بدلتا رہتا ہے۔ بدلنا ہی چاہیے۔ دلی میں رہتے ہیں۔

پیشہ: اردو کتابوں کی امید و بیم والی تجارت۔

مزاج: پہلے ٹھیک تھا۔ اب صوفیانہ ہے۔ کچھ دنوں تک متصوفانہ بھی رہا۔

عادتیں: کسی کے بھی خط کا جواب نہیں دیتا اس ڈر سے کہ جواب دیں گے تو ایک خط اور آجائے گا تو مصیبت ہوجائے گی۔ دن میں چالیس سگریٹیں پینا۔ کم پڑجائیں تو دس اور پی لینا۔ چائے بھی پیتے رہنا۔ کسی سے بات کرنا تو اس طرح کہ جس سے بھی بات کریں وہ سمجھے کہ کسی اور سے مخاطب ہیں۔ جب تک ممبئی میں تھے ہر بات پر ہنستے تھے جب سے شہر کا نام بدلا ہے یہ بھی بدل گئے ہیں حالانکہ اس شہر میں رہتے نہیں ہیں۔ جس دن شہر کا نام بدلا تھا اس دن سنا یہ ہے کہ ان کے سینے پر سانپ لوٹ گیا تھا۔ (اسے انہوں نے بڑی مشکل سے لوٹایا لیکن اسے کبھی کبھی یاد ضرور کرلیتے ہیں) ممبئی میں اپنے قیام کے دوران، وہ گڑ ضرور کھاتے تھے اور ماہ رمضان میں تو روزے اسی لیے رکھتے تھے کہ افطار میں رگڑا کھائیں گے۔ افطار کی کم سے کم ایک دعوت ضرور کرتے تھے اور غیر روزہ داروں کی خاطر میں بچھ بچھ جاتے تھے (لوگوں کے منع کرنے پر فوراً اٹھ جاتے تھے)۔

کچھ معلومات اور: مکتبہ جامعہ شاخ ممبئی کی منیجری کے دوران مکتبے پر شام کے اوقات میں خاص طور پر لوگوں کا جمگھٹا ہوا کرتا تھا۔ اور فٹ پاتھ پر چلنے والے حیرت سے دیکھتے تھے کہ اردو کی کتابوں کی دکان پر اتنی بھیڑ۔ (انہیں اندر کا حال معلوم نہیں تھا)۔ قریب کی ہوٹل کا باہر والا، ہوٹل کے لیے باہر والا ہوگا لیکن وہ اس شاخ کا اندر والا تھا۔ صرف چائے کی دوسری اور دوسری کے بعد تیسری قسط لانے ہوٹل جاتا تھا۔ اکثر لوگ تو اسے مکتبے کا ملازم سمجھتے تھے۔ چائے کے ساتھ پانی ضرور لاتا تھا لیکن احتیاط یہ کرتا تھا کہ چائے میں انگلیاں نہیں ڈبوتا تھا۔ افسوس کرتا ہوگا کہ کاش چائے بھی پانی ہی کی طرح ٹھنڈی ہوتی۔ ان کے زمانے میں یعنی شاہد علی خان کے عہد مہتمی میں (یہ مہتمم کے لفظ سے ماخوذ ہے) مکتبے

میں ہر عمر کے لوگ جمع ہوتے تھے اور کسی پر یہ پابندی نہیں تھی کہ اسے کتابوں سے دلچسپی ہو۔ مولانا شہاب تو جو مکتبے سے متصل پورٹ ٹرسٹ کے مکانوں میں سے کسی ایک مکان میں رہائش پذیر تھے گھر جانے سے پہلے اس شاخ پر کچھ دیر کے لیے ٹھہرنا لازمی سمجھتے تھے۔ تصدیق بھائی جن کا ایک شکستہ اور نیم پسماندہ پریس تھا پہلے ہی سے بیٹھے رہتے تھے۔ باقر مہدی آتے تو پہلے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے جوتے پالش کرنے والے سے اپنے جوتوں پر پالش کرواتے تھے اور پھر عنان گفتگو اپنے ہاتھوں میں اس طرح لیتے کہ قطع کلام کا کسی کو حوصلہ نہ ہوتا۔ کبھی کبھی جان نثار اختر بھی پہنچ جاتے لیکن واپسی ان کی بڑی کٹھن ہوتی۔ مکتبے کی سمت سے دوسری سمت کے فٹ پاتھ پر آنے میں ان کا ایک گھنٹہ صرف ہوجاتا۔ سکندر علی وجد بھی مکتبہ کے قتیل تھے۔ گھر جاتے وقت ایک درجن کیلے خریدنا ان کا معمول تھا۔ شہر بمبئی میں وہ تنہا خریدار تھے جنہیں دوکان دار یہ ایک درجن کیلے لفافے میں بند کرکے دیتا تھا (اس زمانے میں کسی چیز کی بھی پلاسٹک سرجری نہیں ہوتی تھی۔ خریداروں کو اپنا انتظام خود کرنا پڑتا تھا۔ ساحر لدھیانوی بھی پہنچ جاتے تھے لیکن وہ خاص طور پر مکتبے کے طالب علم نہیں تھے۔ اسی زمانے میں ایک پرچہ "دور حیات" بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا دفتر مکتبے کے عقب والی عمارت میں تھا۔ قیصر مظہر اس کے مدیر تھے۔ ساحر لدھیانوی کبھی کبھی اس پرچے میں چھپتے تھے۔ سو وہاں جاتے تو یہاں بھی آجاتے تھے (یہاں سے مراد مکتبہ ہے) بزرگوں اور متقدمین میں حارث صاحب اور دسنوی صاحب بھی کبھی کبھار مکتبے کی رونق بڑھا دیتے تھے۔ متوسلین میں محمود چھابرا، ذکریا شریف اور حیدر پٹھان تھے۔ اور لوگ بھی تھے۔ ندا فاضلی جب بمبئی آئے تو یہی مکتبہ ان کی شام کی جائے رہائش تھی۔ ایک اور صاحب تھے نادر اور نایاب کتابوں کے بیوپاری ان کا روزانہ آنا تقریباً یقینی تھا۔ جس دن وہ مکتبہ نہیں آتے مکتبہ سونا سونا لگتا۔ ان کا نام بھی حیدر تھا کرلا میں مکان تھا اور محمد علی روڈ پر دوکان۔ شاہد علی خان سے ان کی بہت زیادہ بے تکلفی تھی اور ان کا کبھی جی چاہا تو اپنے گھر پر پائے کی دعوت مقرر کرتے تھے۔ (دعوت بڑی ہوتی تھی کیوں کہ پائے بھی بڑے بڑے ہوتے تھے) ایک اور دوست تھے شاہد علی خان کے شفیق چودھری۔ ان کے پاس ایک پرانی موٹر تھی جو ڈھکیلنے سے چلتی تھی اور جو کوئی بھی اس کار کے دروازے سے لگ کر بیٹھتا تھا کہیں نہ کہیں باہر گر پڑتا تھا۔ کار میں ہارن کی ضرورت نہیں تھی وہ خود اتنا شور کرتی تھی کہ راہگیر ڈر کے مارے اچھل کر فٹ پاتھ پر چڑھ جاتے تھے۔ ریاض خاں بھی اکثر و بیشتر مکتبے میں آتے تھے بات نہیں کرتے تھے ان کا منہ کبھی خالی نہیں رہا جتنے سگریٹ شاہد علی خاں پیتے تھے اتنے ہی پان یہ کھاتے تھے لیکن بے حد شریف آدمی تھے۔ محمود سروش اور ڈاکٹر عالی جعفری صاحب کی موجودگی کی وجہ سے مکتبہ جامعہ کی فضا غیر ضروری طور پر علمی ہوجاتی تھی۔ عالی جعفری تو زیادہ نہیں بولتے تھے لیکن محمود سروش کی گفتگو سننے کے لیے سب لوگ ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ بعد کے آنے والوں میں مجی رضا، انور خاں اور عظمت اختر شامل تھے۔ عظمت اختر تو پہلے مکتبہ جامعہ کے نصف منیجر بھی رہ چکے تھے اور اسی رعایت سے شاہد علی خان کے سامنے سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ (اب بھی شاید وہ اپنی روایت پر قائم ہیں) انہوں نے اب اپنی آپ بیتی، لکھنی شروع کی ہے جو ایک لحاظ سے شہر بمبئی میں ترقی پسند تحریک کی بھی کہانی ہے۔ عظمت اختر جسمانی طور پر کمزور ہیں لیکن حافظے کے اعتبار سے شہ زور ہیں۔ بمبئی کی خالص بلکہ نخالص بولی پر انہیں عبور حاصل ہے۔ کہاں کہاں سے الفاظ اور تراکیب ڈھونڈ کر لاتے ہیں پتہ نہیں۔ لڑکپن میں اچھے خاصے فراڈ تھے۔ اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلتے لیکن اسکول کبھی نہیں پہنچتے۔ ان کی آپ بیتی، ایسی ہے لوگ بڑے شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ یہ ساری

باتیں، کہانیاں، حکایتیں، مکتبہ جامعہ کے شاہد علی خان کی وجہ سے منصہ، شہود پر آئیں وہی شاہد علی خان جن کی گمشدگی اب سب کی تشویش کا باعث ہے۔ قصہ یوں ہے کہ

روداد گمشدگی: جب مکتبہ جامعہ دلی کے جنرل منیجر غلام ربانی تاباں اپنی خدمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کے جانشین کی تلاش شروع ہوئی۔ اس وقت مکتبہ جامعہ ڈوب رہا تھا اور جانکنی کے عالم میں تھا۔ لمیٹڈ ادارہ ہونے کی وجہ سے منیجر کا انتخاب مجلس نظما کے دائرہ اختیار میں تھا۔ مجلس نظما کے اراکین میں سے کچھ اراکین نے شاہد علی خان کو بچشم خود غور سے دیکھا تھا۔ وہ ان دنوں قابل دید بھی تھے اور ان کی کارگزاری کی بھی معقول حد تک شہرت تھی۔ کرنل بشیر حسین زیدی اور ممبئی کے صاحبان نے انہیں دیکھ کر اور دوسرے نظما نے انہیں دیکھے بغیر جنرل منیجر کی خدمت کے لیے پسند کر لیا۔ یہ کئی سال پرانی واردات ہے۔ دو بلکہ دو سے زیادہ دہائیاں تو گزر چکی ہوں گی۔ کہا جاتا ہے دلی میں انہوں نے مکتبہ جامعہ کی کچھ ایسی سونوگرافی اور بعد میں فزیکل تھریپی کی کہ مکتبہ جامعہ جو تقریبا عالم نزع میں تھا آہستہ آہستہ روبصحت ہوتا گیا۔ (لیکن شاہد علی خان کی صحت کو ڈانواں ڈول کرنے کا کارنامہ بھی مکتبہ ہی نے انجام دیا) لیکن مکتبہ کی صحت عامہ اور شاہد علی خان کی ناصحت ہمارا موضوع نہیں ہے ہمارا موضوع جو تشویش انگیز ہے ان کی گمشدگی ہے۔ شاہد علی خان بہ ثبات عقل و حواس گم ہوئے ہیں صورت حال مختلف ہوتی تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ ممبئی سے دلی منتقل ہونے کے بعد وہ ہر سال بلکہ کبھی کبھی سال میں دو مرتبہ ممبئی میں چند دنوں کے لیے مقیم ہو جاتے تھے اور اس کے نتیجہ میں جے جے اسپتال کے مقابل اور مخالف فٹ پاتھ پر کے ہوٹل الماس کا باہر والا از سر نو مکتبہ جامعہ کا ہمہ وقتی اندر والا ہو جاتا تھا..... مکتبے کے مستقل ملاقاتیوں کی فہرست تو یوں بھی بے حد مختصر ہو گئی ہے لیکن جو بھی بچے کچے لوگ رہ گئے ہیں وہ شاہد علی خان کی موجودگی میں اس گلی محلے کی ہیرا پھیری سے چوکے نہیں..... اب خود شاہد علی خان جیسے انڈر گراونڈ ہو گئے ہیں اور ان کی روپوشی، گمشدگی کی حد سے آگے نکل گئی ہے۔

یہ تحریر اصل میں "تلاش گمشدہ" کے سلسلے کی تحریر ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں "انڈیا موسٹ وانٹیڈ" کے ادارے کی خدمات حاصل کی جائیں لیکن شاہد علی خان کے قریبی دوستوں نے اس رائے کی شدت سے مخالفت کی اور کہا کہ شاہد علی خان سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا ہے اس لیے انڈیا موسٹ وانٹیڈ سے رجوع ہونے کی تجویز نہ صرف غیر ضروری بلکہ نہایت نامناسب ہے۔

ان حالات میں باتفاق آرا یہ طے کیا گیا ہے کہ جو صاحب بھی اس اشتہار کے ممدوح کی تلاش کر کے ممبئی پہنچائیں گے انہیں اخراجات سفر کے علاوہ ان کی خدمت میں ایک قیمتی شال اور ایک لفافہ پیش کیا جائے گا اس کے علاوہ ان کے نام مکتبہ جامعہ کا ادبی رسالہ کتاب نما ایک سال کے لیے اور ان کے بچوں کے نام دو سال کے لیے پیام تعلیم بلا قیمت جاری کر دیا جائے گا۔ بشرطیہ ہے کہ جن صاحب کو تلاش کر کے ممبئی پہنچایا جائے وہ اصلی شاہد علی خان ہوں۔

نوٹ: ان کی تصویر یعنی کوئی حالیہ تصویر مہیا نہیں ہے لیکن ان کی ایک پرانی تصویر جو شاید ۱۹۴۰ء عیسوی کی ہے ی ٹی وی پر اتوار کے دن ۱۰ بجے ناظرین کے ملاحظے کے لیے پیش کی جائے گی نہ وہ چونکہ ہندوستان سے باہر کبھی گئے ہی نہیں ہیں اس لیے تصویر صرف ہندوستانی ناظرین ہی کے لیے دکھائی جائے گی۔

بخار الیکشن کا

محبوب راہی
بارسی ٹاکلی

سر کے اوپر ہے بار الیکشن کا
دل کے اندر بخار الیکشن کا

خیر سے ہم بھی آج رکھتے ہیں
تجربہ تین چار الیکشن کا

میرے قدموں کے نیچے پھیلا ہے
دور تک خار زار الیکشن کا

آگیا ہے خدا خدا کرکے
تھا بہت انتظار الیکشن کا

نکٹوؤں اور بدھوؤں کو بھی
چڑھ رہا ہے بخار الیکشن کا

گر رہا ہے سروں پہ لوگوں کے
ہر گھڑی آبشار الیکشن کا

آج تک میں سمجھ نہیں پایا
فائدہ کیا ہے یار الیکشن کا

بار بار آئیں کاش یہ دن رات
جشن ہو بار بار الیکشن کا

جیت سب کے نصیب میں ہے کہاں
کچھ پہنتے ہیں ہار الیکشن کا

دن بدن باوقار لوگوں میں
گر رہا ہے وقار الیکشن کا

کھا رہے ہیں مزے سے اب وہ بھی
چٹپٹے اچار الیکشن کا

سوانگ اس سے بڑے ہیں اے راہی
کیا ہے آخر شمار الیکشن کا

خدا کے فضل سے **

وارڈ ممبر ہوں خدا کے فضل سے
میں بھی لیڈر ہوں خدا کے فضل سے

خار تھا جب تک سیاست میں نہ تھا
اب گل تر ہوں خدا کے فضل سے

خاک تھا جس تس کے پیروں کی کبھی
ان دنوں سر ہوں خدا کے فضل سے

پہلے میں اک قطرۂ ناچیز تھا
اب سمندر ہوں خدا کے فضل سے

محض اک بندہ تھا لیکن ان دنوں
بندہ پرور ہوں خدا کے فضل سے

غنڈہ گردی کرتا ہوں ہاؤس میں بھی
اب بھی لوفر ہوں خدا کے فضل سے

شہر بھر میں سب سے بدتر تھا کبھی
سب سے بہتر ہوں خدا کے فضل سے

ہے سیاست ہی مقدر اب مرا
میں سکندر ہوں خدا کے فضل سے

لد گئے وہ دن کہ جب کمتر تھا میں
اب تو برتر ہوں خدا کے فضل سے

حکمرانی گھر سے باہر ہے مری
گھر میں نوکر ہوں خدا کے فضل سے

بس نہیں بیوی پہ چلتا کچھ مرا
ویسے شوہر ہوں خدا کے فضل سے

کوڑی کوڑی کو کبھی محتاج تھا
اب تونگر ہوں خدا کے فضل سے

جوتے، چپلیں، گھونسے، لاتیں، گالیاں
سب کا خوگر ہوں خدا کے فضل سے

نابلد ہوں شعر سے یکسر تو کیا
اک سخنور ہوں خدا کے فضل سے

خلق راہی راہزن کہتا رہے
میں تو رہبر ہوں خدا کے فضل سے

کچھ عاتق شاہ کے بارے میں

پیدائشی اور اصلی نام: شیر محمد شاہ خان
سرکاری اور قلمی نام: عاتق شاہ
تعلیم: یم۔اے عثمانیہ
ملازمت:
مئی ۱۹۶۵ء کو بہ حیثیت لکچرر اور صدر شعبہ اردو پیپلس آرٹس اینڈ سائنس کالج ناندیڑ میں ملازمت میں داخل ہوئے۔
۷ اگست ۱۹۷۰ء کو بہ حیثیت لکچرر اور صدر شعبہ اردو، سردار پٹیل کالج، سکندرآباد کو جائین کیا اور ۳ نومبر ۱۹۹۱ء کو وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔
پہلی تخلیق:
حیدرآباد کے اخبار "میزان" کے سنڈے ایڈیشن میں ۲۱ مئی ۴۵ء کو پہلا افسانوی انشائیہ "گرگٹ" شائع ہوا۔
رسائل جن میں چھپے:
عمر خیام (لاہور) ادب لطیف (لاہور) افکار بھوپال، گفتگو، بمبئی، کتاب، لکھنو، شاعر بمبئی، نظام، بمبئی، رباب حیدرآباد، ایوان حیدرآباد۔
افسانے:
۱۔ فٹ پاتھ کی شہزادی ۔ مئی ۱۹۴۸ء۔
۲۔ ایک وقت کا کھانا ۔ مارچ ۱۹۵۲ء۔
۳۔ اندھیری ۔ نومبر ۱۹۵۴ء۔
۴۔ سائی ذیر شکنتلا ۔ یکم سپتمبر ۱۹۵۵ء۔
۵۔ ہم جنم جنم کے ساتھی ۔ جون ۱۹۶۸ء۔
۶۔ راستے کی کہانی ۔ نومبر ۱۹۶۸ء۔
۷۔ منٹ کی خاموشی ۔ ڈسمبر ۱۹۸۶ء۔ (انعام یافتہ اردو اکیڈمی آندھراپردیش، انعام یافتہ اردو اکیڈمی، بہار، پٹنہ)

۱۹۸۷ء

طنز و مزاح:

چالیس قدم ۔ جون ۱۹۶۷ء

انڈین کانجو ۔ دسمبر ۱۹۷۹ء (انعام یافتہ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش ۔ ۱۹۸۰ء)

ماموں کی بکریاں ۔ دسمبر ۱۹۹۶ء

رپورتاژ:

عابد روڈ سے کمرشیل اسٹریٹ تک ۔ جون ۱۹۶۶ء

جب خالی ہاتھ ۔ مئی ۱۹۷۲ء (انعام یافتہ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش و اردو اکیڈمی یوپی ۔ لکھنو)

نثری تمثیل:

میں کتھا سناتا ہوں ۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۲ء

(انعام یافتہ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، انعام یافتہ اردو اکیڈمی یوپی ۔ لکھنو)

سوانح ۔ میں جیتوں گا ۱۹۹۴ء

مجموعی خدمات:

اردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے بہ اعتراف مجموعی خدمات سند توصیف نامہ مورخہ ۹ نومبر ۱۹۹۴ء کو بمقام جوبلی ہال، باغ عامہ، حیدرآباد میں عاتق شاہ کو انعام سے نوازا گیا۔

انتقال : ۳۰ مئی ۱۹۹۹ء

بنیادی طور پر میں طنز نگار ہوں ۔ اور طنز میری کہانیوں اور تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے ۔ اگر کسی کو میرے طنز میں ایک میٹھی میٹھی کڑواہٹ کا احساس ہو تو اسے منہ بنانے کی ضرورت نہیں ۔ کیونکہ اس میں میرا کوئی قصور ہے اور نہ میری تحریر کی کسی خامی کو دخل ہے ۔ طنز کا یہ زہر تو زندگی سے آیا ہے ۔ اور آپ جانتے ہیں کہ آج کے آدمی کو جو زندگی ملی ہے وہ کیسی ہے ۔ میں اس عجیب و غریب زندگی کے مختلف چہروں اور اس کے جسم میں دوڑتے ہوئے اس زہر کو پیش کرتا ہوں جسے موجودہ خود غرض سماج نے سینکڑوں معصوم انسانوں کو دیا ہے ۔ زہر کا اثر زائل کرنے کے لئے کبھی کبھی زہر کا پینا بھی ضروری ہو جاتا ہے ۔ اس لئے اس زہر کو قبول کیجئے عاتق شاہ

رعد سرشار
حیدرآباد

اس کے گھر کا دروازہ گم ہو گیا ہے

(عاتق شاہ کی موت پر)

"اس کے گھر کا دروازہ گم ہو گیا۔ آج سے پہلے وہ ہر روز باہر نکلتا۔ گلی کا فاصلہ طے کر کے سڑک پر آتا اور پھر سڑک پار کر کے سامنے والی ہوٹل میں بیٹھ جاتا پھر پیالی سے گھونٹ گھونٹ ایرانی چائے چسکیاں لے لے کر پینے لگتا لیکن آج سے اسے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا" یہ جملے عاتق شاہ نے اپنی کسی کہانی کے ہیرو کی نعش کو دفنا کر واپس آنے کے بعد لکھے تھے۔

۲۱ مئی ۱۹۹۹ء کی دوپہر چلچلاتی دھوپ میں عاتق شاہ کے مردہ جسم کو ایک کثیر مجمع کی موجودگی میں "شانتی نگر کے پرسکون قبرستان میں دفن کر کے جب سب واپس ہو رہے تھے تو نہ جانے کیوں مجھے اس کے لکھے ہوئے وہ جملے یاد آنے لگے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے گھر کے دروازے سے باہر نکلتا، روزگار کی تلاش میں، پھر دفتر میں کلرکی کرنے اور پھر کالج میں پڑھانے کے لیے شام ہوتے ہوتے یا آدھی رات کو گھر واپس ہوتا تو آج سے پہلے اس کے گھر کا دروازہ گم نہیں ہوا تھا۔

عاتق شاہ نصف صدی سے زائد عرصہ تک میرا دوست رہا۔ سہا برس ایسے گزرے جب ہم دونوں ہر روز ملے بغیر نہیں رہتے۔ شہر کی کسی ہوٹل میں کسی سڑک کی نکڑ پر کسی پارک میں اس کے یا میرے گھر پر ہم ملتے اور آدھی آدھی رات تک بحث و مباحثہ کرتے رہتے۔ ہماری نوعمری کا دور تھا۔ ملے پلی میں جناب اختر حسن مرحوم ایڈیٹر روزنامہ "پیام" کے گھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس منعقد ہوتے تھے جن میں شاعر، ادیب، نقاد اور دوسرے اہل ذوق شریک ہوتے، اہل قلم اپنی اپنی نگارشات پیش کرتے پھر اس تحریک کے سرخیل ان پر تنقید و تبصرے کرتے۔ تنقید و تبصرے، فن ادب اہلیت پر نہیں کرتے بلکہ یہ دیکھا جاتا تھا کہ انجمن جس نظریے کا پرچار کرتی ہے سنائے جانے والے افکارات ان کے بنے تلے پیمانوں پر پورے اترتے ہیں کہ نہیں؟ ان دنوں ابراہیم جلیس مرحوم برصغیر کے بڑے قد آور افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگے تھے۔ وہ حیدرآباد ہی میں رہتے تھے اور ان جلسوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ انجمن کے ایسے ہی ایک اجلاس میں عاتق شاہ نے اپنا ایک انشائیہ "گرگٹ" سنایا تھا اس وقت ان کی عمر بمشکل

بیس یا اکیس سال کی ہوگی اس انشائیہ پر تنقید بھی ہوئی اور تعریف بھی ابراہیم جلیس نے اس مضمون کو خوب سراہا۔ جلیس نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ عاتق شاہ کی یہ پہلی تخلیق حیدرآباد کے ایک کثیر الاشاعت اخبار کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوئی۔ پھر جلد ہی اس کے افسانے ہندوستان کے معیاری رسائل میں چھپنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد ہی عاتق شاہ کے افسانوں کا ایک مجموعہ "فٹ پاتھ کی شہزادی" چھپ کر بازار میں آگیا۔

شروع سے ہوتا آیا ہے کہ اہل قلم اپنی شہرت و پذیرائی کے لیے گروہیں اور سنڈیکیٹ بناتے ہیں اور پھر میڈیا میں پبلسٹی ملتی ہے۔ آج کل تو یہ بیماری عام ہو گئی ہے۔ عاتق شاہ کسی گروپ میں شامل نہیں تھا وہ سب کا دوست تھا۔ سب کی عزت کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک فن کار کو چاہے چھوٹا ہو یا بڑا اپنی تخلیق کے اظہار کے لیے بڑے کرب و اضطراب سے گزرنا پڑتا ہے۔ دنیا میں ہر ایک کی پسند الگ الگ ہوتی ہے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ چند بندھے ٹکے اصولوں کی کسوٹی پر جانچ کر اس کی تعریف یا مذمت کرنا بڑی ناانصافی کی بات ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہر چھوٹے بڑے سے خلوص سے ملتا اور ہر ایک کی عزت کرتا تھا۔ اسی لیے اس کی جان پہچان رکھنے والوں اور دوستوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا وہ اپنے فن پاروں، اپنی کہانیوں کو بلا جھجک پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتا۔ وہ کبھی بھی اپنے افسانوں کے مجموعوں کو شائع کرنے کسی پبلیشر یا انجمن سے رجوع نہیں ہوا۔ کہانیوں کے انتخاب کے بعد کتاب کا مسودہ تیار کر لیتا۔ پھر ہر دوست نیز جان پہچان والے سے مل کر کتاب کی قیمت پیشگی وصول کرتا۔ ذات کا پٹھان تھا اس لیے دوسروں سے پیسہ وصول کرنے کے طریقے اچھی طرح جانتا تھا۔ رقم وصول کرکے باقاعدہ رسید دیتا اور پھر جمع شدہ سرمائے سے اپنا مجموعہ شائع کرتا۔ اس طریقہ کو اس نے "عاتق شاہی اسکیم" کا نام دے رکھا تھا۔ اس طرح اس نے کوئی چودہ پندرہ مجموعے شائع کیے۔ ادبی حلقوں میں جہاں سنڈیکیٹ اور گروپ بازی چلتی ہے عاتق شاہ کی کبھی پذیرائی نہیں ہوئی۔ جہاں تک اس کے فن یا اس کی لکھی ہوئی کہانیوں کا تعلق ہے۔ میں اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کروں گا۔ عاتق شاہ کی زندگی میں اس کے ساتھ اس عنوان پر مجھ سے بڑے گرما گرم مباحث ہوئے اور آپس میں اختلاف بھی رہا۔ وہ مطالعہ کے عادی نہیں تھا۔ ہر لحہ بدلتی قدروں اور حالات پر اس کی نظر بڑی مشکل سے جمتی تھی، اسکا خیال تھا کہ وہ اپنے اطراف کے ماحول میں موجود کرداروں کو تلاش کرتا ہے اور اپنی کہانیوں میں پیش کرتا ہے اس کے لیے مطالعے کی ضرورت نہیں اس سماج میں رہ بس کر ان کو پہچان لینا کافی ہے لیکن آج کی دنیا میں سماجی اقدار میں تبدیلیوں کی رفتار اتنی تند و تیز ہے کہ نسل در نسل کے درمیان تفاوت کا وقفہ ایک دو سال سے زیادہ نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس وقفہ میں دن بدن کمی آتی جا رہی ہے ہر چیز کے معیار بدل گئے ہیں، اظہار کے طریقے بدلے ہیں الفاظ کے معنی و مطلب بدلتے جا رہے ہیں۔ الکٹرانک میڈیا نے دور دراز علاقوں تک ان تبدیلیوں کو قبول کرنے عام لوگوں کے ذہنوں کو تیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان حالات میں اپنے ارد گرد رہنے والوں کو دیکھ کر کہانی کے کردار تلاش کرنا کتنا صحیح ہے مجھے

معلوم نہیں ۔عاتق شاہ سے ان عنوانات پر بارہا بات چیت رہی ۔میں نے اس کی کسی کہانی پر تنقید نہیں کی لیکن اس معاملے میں ہم کبھی متفق نہیں ہوئے۔

عاتق شاہ کی زندگی بڑی محنت جدو جہد اور آزمائش کی زندگی رہی ،بچپن ہی سے ایک بڑے کنبے کی کفالت کا بوجھ اس کے کندھوں پر پڑا تھا اس ذمہ داری کو پورا کرنے اس نے کسی سے مدد طلب نہ کی، کسی سے جھوٹ نہیں بولا اور نہ کسی کو دھوکا دیا ایک خود دار اور بہادر انسان کی طرح وہ زندگی بھر بڑی بے جگری اور جوانمردی سے مسائل کا مقابلہ کرتا رہا کمسنی میں ابھی چہرے پر سبزہ بھی نمودار نہیں ہوا تھا کہ اس نے نظام آرمی میں کلرک کی حیثیت سے نوکری کر لی اس کے والد بستر سے لگ چکے تھے اور پندرہ سال تک بستر سے لگے رہے عاتق نوکری کرتا رہا ۔پولیس ایکشن کے بعد ہزاروں سرکاری ملازمین کی طرح اس کی نوکری بھی جاتی رہی اس وقت وہ میٹرک بھی کامیاب نہیں کیا تھا ۔بہت بعد میں وہ قمر ساحری کے ساتھ علی گڈھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا ۔برخواست شدہ فوجی ملازمین کی باز آبادکاری کی اسکیم کے تحت وہ ایک سرکاری محکمہ میں ٹائپسٹ ہو گیا ۔لیکن چند ہی برسوں بعد ریاست حیدرآباد کو لسانی بنیادوں پر تقسیم کر دیا گیا ۔حیدرآباد کے مسلم خاندانوں کا پولیس ایکشن کے بعد پہلے ہی شیرازہ بکھر چکا تھا لسانی تقسیم کے بعد رہے سہے خاندان بھی تقسیم ہو گئے ۔ریاستی اسمبلی میں کسی نے کہا تلگو بولنے والے تو تلنگانہ میں رہیں گے ، مراٹھی بولنے والے مہاراشٹرا اور کنڑ بولنے والے کرناٹک جائیں گے ۔اردو داں ملازمین کو کیوں ان تینوں علاقوں میں بھیجا جا رہا ہے تو اس وقت کے چیف منسٹر بی رام کشن راؤ نے اسمبلی میں جواب دیا تھا کہ اگر اردو داں ملازمین حکومت کے احکام کے خلاف ہیں تو پھر جہاں اردو کا علاقہ ہے وہاں چلے جائیں ۔یہ وہ زمانہ تھا جب اس قسم کے جواب پر کوئی احتجاج کرنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا ۔عاتق شاہ کرناٹک کے حصہ میں آیا" عابد روڈ سے کمرشیل اسٹریٹ تک " اس کا ناولٹ ایسے ہی خاندانوں کی داستان ہے جو نسلوں سے حیدرآباد میں رہنے کے بعد جڑوں سے اکھاڑ دیئے گئے تھے نسلی تطہیر کی طرح زبان کے حاملین کو بڑی بے دردی سے قافلوں کی شکل میں یہاں سے نکال دیا گیا۔

اس رد و بدل میں بے شمار ناانصافیوں کے ازالے کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہوئی اور چند ملازمین کو حیدرآباد واپس کر دیا گیا ان میں عاتق شاہ بھی تھا یہاں آنے کے بعد اس نے ایوننگ کالج سے گریجویشن کیا پھر عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم ۔اے کیا درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرنے سرکاری ملازمت چھوڑ دی ۔یہاں موقع نہ ملا تو ناندیڑ مہاراشٹرا میں ایک کالج میں لکچرر ہو گیا ۔پھر وہی بن باس ہاتھ آیا اپنی شفیق ماں، بھائی بہنوں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر وہ ناندیڑ چلا گیا ۔پانچ سال بعد حیدرآباد واپس آکر سردار پٹیل کالج میں لکچرار اور صدر شعبہ اردو بنا اور اسی حیثیت سے وظیفے پر سبکدوش ہو گیا۔

عاتق شاہ بڑا وسیع المشرب آدمی تھا، اس کا ایک ہندو دوست تھا ۔پار تھا سارتھی نائیڈو جس کو وہ اپنے حقیقی

بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ رضاکار دور اور پھر پولیس ایکشن کے بعد قومی سیاست نے گنگا جمنی تہذیب کے آفریدہ، شہر حیدرآباد میں رہنے والے مسلمان کو مسلمان اور ہندو کو ہندو کر دیا اور وہ اب تک ہیں ایسے پرآشوب دور میں عاتق اور پارتھا سارتھی نائیڈو چوبیس گھنٹے ایک ساتھ رہتے تھے نائیڈو بڑا کھرا آدمی تھا اس کا تعلق سروجنی نائیڈو کے خاندان سے تھا۔ عاتق شاہ نے اپنے پہلے مجموعے "فٹ پاتھ کی شہزادی" میں پارتھا سارتھی نائیڈو کا ایک کیری کیچر بھی لکھا ہے۔ نائیڈو عاتق کے خاندان کا ایک فرد تھا عاتق کی والدہ نائیڈو کو اپنا بیٹا کہتی تھیں۔ عاتق شاہ پولیس ایکشن سے پہلے محلہ چیل بازار میں رہتا تھا اس کا بھانجہ غیاث متین جو اب عثمانیہ یونی ورسٹی میں صدر شعبہ اردو ہے بچہ تھا شاید اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھتا تھا۔

اپنی نصف صدی کی دوستی میں، میں نے عاتق شاہ کو کبھی روتے ہوتے نہیں دیکھا وہ اپنے آنسوؤں کو اپنی کہانیاں لکھنے کے لیے استعمال ہونے والی روشنائی میں گھول دیتا تھا۔ وہ تو رنج و غم کا خوگر ہو چکا تھا۔ غم میں مسکرانا اس کی عادت بن چکی تھی۔ اسی عالم میں اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زندگی کی ہر مصیبت اور ہر غم کو کھڑا للکار رہا ہے کہ ہاں میں مقابلے کے لیے تیار ہوں۔ سچ وہ زندگی کی ہر مصیبت کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا رہا اور کامیاب رہا۔ خدا نے اس کے حصہ میں بے حساب مصائب دیئے تھے اور انہیں جھیلنے کا بڑا حوصلہ اور ہمت بھی۔ تین مرتبہ میں نے عاتق شاہ کو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا تھا ایک تو اپنے دوست پارتھا سارتھی نائیڈو کی موت پر، پھر اپنی عزیزوں کی رحلت پر اور پھر اپنے جوان بھائی کے یکایک گزر جانے پر ان تینوں کی مفارقت نے عاتق شاہ کی قوت برداشت کو شکست دی تھی۔ عاتق کا کسی غم یا مصیبت میں ہار جانا میرے لئے کوئی معمولی بات نہ تھی، وہ تو صرف ہنستا اور قہقہہ لگانا جانتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ پاکستان کے احمد فراز چند سال پہلے حیدرآباد آئے تھے چار پانچ دن یہاں قیام رہا تھا میں اور عاتق ان سے ملنے گئے تھے۔ "پاکستان میں اردو ادب کے موجودہ رجحان" موضوع بحث رہا۔ دوران گفتگو احمد فراز نے کہا کہ "میں سرحدی پٹھان ہوں اردو میری مادری زبان نہیں ہے" عاتق شاہ اس جملے کو سن کر بھڑک اٹھا اور پھر کھڑا ہو گیا اپنے قد و قامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا فراز صاحب میں بھی سرحدی پٹھان ہوں میرے آبا و اجداد آپ کے علاقہ سے یہاں دکن میں آئے تھے میری مادری زبان تو اردو ہے اور میں بھی آپ کی طرح اردو کی روٹی کھاتا ہوں۔ احمد فراز بھی تو ہیکل آدمی ہیں وہ بھی عاتق شاہ کے بازو کھڑے ہو گئے اور دونوں پٹھانوں کی طرح زور زور سے قہقہے لگانے لگے ایسے وقت کسی فوٹو گرافر نے دونوں کو بے ساختہ ہنستے ہوئے اسناپ کر لیا یہ تصویر حیدرآباد کے کسی اردو روزنامہ میں شائع بھی ہوئی تھی۔

میں گزشتہ آٹھ ماہ تک اپنے بچوں کے ہاں جدہ (سعودی عرب) میں مقیم رہا اور اواخر اپریل ۹۹ء میں حیدرآباد

واپس ہوا۔ میرے قیام کے دوران احمد فراز جدہ آئے تھے میں ان سے ملنے گیا تو وہ پہلے مجھے پہچان نہ سکے میں نے جب عاتق شاہ کے اس ریمارک کی یاد دلائی تو انہیں یاد آیا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ان سے گفتگو کے بعد جب میں وہاں سے چلنے لگا تو فراز نے کہا تم جب حیدرآباد جاؤ تو عاتق شاہ تک میرا اسلام پہونچا دینا۔اسی طرح اردو کے مشہور شاعر قمر ساحری جو ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے اور چالیس سال سے وہاں رہتے ہیں۔جدہ آئے ہوئے تھے اور اپنی بیٹی داماد کے ہاں مقیم تھے۔شریف اسلم نے دونوں کو جدہ میں ہماری موجودگی کی اطلاع دی۔قمر ساحری عاتق شاہ کے ہم مکتب، ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے تھے۔ان سے میری بھی بڑی دوستی رہی جدہ میں ہم چالیس سال بعد ایک دوسرے سے ملے تو گلے مل کر خوب روئے اور پھر پرانی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے بڑی دیر تک ہنستے رہے۔قمر ساحری نے حیدرآباد میں اپنے ایک ایک دوست کی کیفیت پوچھی خصوصاً ساحری نواس لاہوتی کو یاد کرکے بڑے مغموم ہونے لگے۔ان کی ان یادوں کو بھگانے کے لئے میں نے ان سے کہا قمر صاحب ساری زندگی الحاد و ایمان کے درمیان جھولتے ہوئے گزر گئی اب اس مقدس مقام پر آنے کا موقع ملا ہے تو اپنے گناہوں کی معافی کے لیے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا تو کرنا تھا۔قمر نے کہا ہاں یار خوب خوب دعا کی لیکن کیا کروں بے اختیار لاہوتی کی مغفرت کے لیے بھی دعا کر ڈالی! ہنسنے ہنسانے سے ان کے دل کا بوجھ جب ہلکا ہوا تو عاتق شاہ کی شکایت کرنے لگے کہ اس کو کراچی سے انہوں نے کئی خطوط لکھے لیکن کسی خط کا بھی جواب نہ ملا۔میں نے کہا عاتق شاہ کسی کے خط کا جواب نہیں دیتا ہے مجھے معلوم ہے اپنی جوانی میں وہ اپنی محبوبہ کے خطوط کا جواب بھی نہیں دیتا تھا اس لیے عاشق نامراد رہا۔وہ تو صرف افسانے لکھتا ہے قمر ساحری نے عاتق شاہ تک ان کا سلام پہونچانے کے لیے کہا اور کراچی چلے گئے کچھ ماہ بعد میں حیدرآباد واپس ہوا اور عاتق شاہ سے ملنے اس کے گھر گیا۔مجھے یقین تھا وہ ہمیشہ کی طرح اپنی باہیں کشادہ کرے گا میں اس سے لپٹ جاؤں گا۔دیر تک لپٹا رہوں گا۔وقفہ وقفہ سے ملنے والا دوست ایک طویل عرصہ کے بعد اس سے مل رہا ہو تو اندازہ لگائیے اسے کتنی خوشی ہوتی۔پھر ہم لوگ بیٹھے چائے کے دور پر دور چلاتے۔وہ سارے حالات پوچھے گا جو میرے سفر کے دوران پیش آئے۔لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔جب میں اس کے گھر میں داخل ہوا تو ایک پلنگ پر عاتق شاہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔تب معلوم ہوا کہ پہلے اس کے ایک ہاتھ اور پیر پر فالج کا حملہ ہوا تھا پھر کچھ ماہ بعد دماغ کا بڑا حصہ مفلوج ہو چکا ہے۔

۱۲ مئی کی صبح کی ابتدائی ساعتوں میں ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے میں نیند سے ہوشیار ہوا اس طرف داؤد اشرف بات کر رہا تھا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسکے حلق میں اس کی آواز پھنس گئی۔میں سمجھ گیا کہ عاتق شاہ اس دنیا میں نہیں رہا۔رات کے دس بجے وہ موت سے ہار مان کر چلا گیا۔اس کہانی کے ہیرو کی طرح۔ اس کے گھر کا دروازہ اس کے لیے گم ہو گیا۔

سید مصطفیٰ کمال

تو مشق ناز کر......

عاتق شاہ سے میری دوستی مسابقت کے جذبہ سے شروع ہوئی۔ ایم۔اے میں ہم ہم جماعت تھے۔ لیکن کالج سے نکلنے کے بعد صحت مند مسابقت کا یہ جذبہ اٹوٹ محبت میں بدل گیا..... آج میں عاتق شاہ سے خود کو الگ نہیں پاتا۔ ان کی خوشی اور ان کا غم، میری خوشی اور میرا غم ہے۔ ان کا کام میرا کام ہے۔ عاتق شاہ کے کاموں کی طویل فہرست میں ایک مستقل کام تخلیقات کی اشاعت ہے۔ لکھنے اور چھپنے کے معاملہ میں عاتق شاہ تھکتے نہیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلم کے جولانی میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

۱۹۶۸ میں جب میں نے "شگوفہ" نکالنا شروع کیا تو عاتق شاہ اردو افسانے میں ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس ابتدائی دور میں شگوفہ کے لیے طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کے حصول میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ بعض سنجیدہ لکھنے والوں نے میری فرمائش پر شگوفہ کے لیے مزاحیہ مضامین انشائیے اور ڈرامے لکھے اس طرح "شگوفہ" کی پابندی اشاعت میں خالص مزاح نگاروں کے علاوہ دوسرے ادیبوں کے تعاون کو بھی دخل رہا۔ عاتق شاہ، طنز و مزاح کی اس نئی تحریک کے آغاز سے بہت پہلے افسانوں کے علاوہ طنزیہ مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ میری خواہش پر انہوں نے شگوفہ کے مزاج کو ملحوظ رکھ کر کئی ایک ہلکے پھلکے مضامین لکھے، جو وقتاً فوقتاً "شگوفہ" میں شائع ہوتے رہے۔ ان طنزیہ مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کی ترغیب بھی میں نے دی تھی..... مجھے خوشی ہے کہ عاتق شاہ کے مضامین کے اس مجموعہ سے "شگوفہ" کے زیر اہتمام کتابوں کی اشاعت کا باضابطہ آغاز ہو رہا ہے۔ میں اسے نیک شگون اس لیے بھی سمجھتا ہوں کہ ایک کثیر التصانیف ادیب کی کتاب سے مطبوعات کے سلسلہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ یقین ہے کہ یہ سلسلہ دراز ہوگا۔ اور رسالہ شگوفہ کی طرح اس کی مطبوعات کے سلسلہ کو مقبولیت حاصل ہوگی۔ یہ چند سطور میں ناقد، نہیں بلکہ ناشر کی حیثیت لکھ رہا ہوں۔ اس لیے زیر نظر مضامین کی ادبی حیثیت کے بارے میں کچھ لکھنے کا کوئی موقع نہیں۔ تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عاتق شاہ نے اپنے انشائیوں اور طنزیہ مضامین کے لیے نئے نئے عنوانات چنے ہیں۔ عام روش کے برخلاف انہوں نے بڑے چونکا دینے والے موضوعات کو برتا ہے ان کے لکھنے کا انداز بھی ان کا اپنا ہے۔ عام طور پر افسانہ نگار اپنے مخصوص اسلوب سے بہت کم انحراف کر پاتا ہے۔ چنانچہ عاتق شاہ کے طنزیہ مضامین پر بھی افسانوی لب و لہجہ غالب ہے۔ وہ بڑے معصوم انداز میں کبھی راست طور پر اور کبھی علامتوں کا سہارا لے کر طنز کے تیر چلاتے گزر جاتے ہیں اور یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ ان کے طنزیہ کے تیکھے پن میں ہنسی کی پھلواری میں لازماً شریک رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عاتق شاہ کے یہ طنزیہ مضامین آزادی کے بعد وجود میں آنے والے ادبی سرمایہ میں اپنی نوعیت کا منفرد اضافہ ہیں۔

(عاتق شاہ کی کتاب "انڈین کا جو" کا مقدمہ

عاتق شاہ

قینچی

قینچی بڑے کام کی چیز ہے۔ کوئی چاہے تو اسے چاقو کی طرح بھی استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن چاقو، چاقو ہے اور قینچی، قینچی۔ اچھی قینچی سو روپیوں سے لے کر دو ہزار روپیوں تک آتی ہے۔ جاپان یا جرمنی کی قینچی نہ صرف معیاری ہوتی ہے بلکہ برسوں چلتی ہے۔ آنکھیں بند کر کے اسے خریدا جا سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے دیس میں ڈپلیکیٹ قینچیاں بھی بننے لگی ہیں جن پر میڈ ان جاپان یا جرمنی کندہ ہوتا ہے۔ ان کی شناخت مشکل ہے۔ مشکل کیا بلکہ ناممکن ہے۔ کوئی اصلی اور نقلی دواؤں کو نہ پہچان سکے تو انہیں کیا پہچانے گا۔ یہ تو مریض کے موت کے بعد یا قینچی کے ناکارہ ہونے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے لیکن چاقو کے معاملے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ یہاں چاقو اصلی اور اور بجنل ملتے ہیں۔ چھوٹے بڑے اور قسم قسم کے۔ شہر کی کسی بھی سڑک اور شاہراہ پر نکل جائیے۔ آپ کو فٹ پاتھوں پر بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے چاقو نظر آئیں گے۔

کوئی بھی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر چاقو خرید سکتا ہے لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ آپ اپنے لباس کے اندرونی جیبوں میں اسے اس طرح چھپالیں کہ پولیس کے ہاتھ وہاں تک نہ پہنچ سکیں! کوئی کہہ سکتا ہے کہ بھئی یہ کیا تک ہے! جب کھلے بازار میں چاقو فروخت ہو رہا ہے تو اسے خرید کر جیب میں رکھنا یا گھر میں رکھنا کون سا جرم ہے؟ اس معقول سوال کا کوئی نامعقول ہی جواب دے سکتا ہے۔ ویسے اپنی تسلی کی خاطر کسی بھی زبان کے ایڈیٹر کو خط لکھا جا سکتا ہے کہ مفاد عامہ کی خاطر اسے مراسلوں کے کالم میں چھاپے اور بتائے کہ جب چاقو بیچنے والا مجرم نہیں تو خریدنے والا کیونکر مجرم کہلایا جا سکتا ہے؟ یقین ہے کہ اس پر ہر پڑھا لکھا دانشور اظہار خیال کرے گا۔ اور عوام کی معلومات میں اضافہ کرے گا۔ اگر اس موضوع پر آل انڈیا بنیادوں پر شہر کے کسی ایر کنڈیشنڈ ہال میں سیمنار ہی منعقد ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔ قومی مفاد میں یہ بے حد ضروری ہے۔ چند گھنٹوں کی گفتگو کے بعد کچھ تو بات بنے گی۔ اگر نہیں تو ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ دور دراز کے مقامات پر رہنے والے بچھڑے دوست ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور کچھ کھا پی کر، ہنس بول کر پھر کسی دوسرے سیمنار میں ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو جائیں گے!

قینچی ایک ایسا آلہ ہے جو لوہے کی آڑھی ترچھی اور سیدھی سیدھی سلاخوں کو جوڑ کر بنایا جاتا ہے۔ قینچی چلانا ایک مشہور محاورہ ہے جس میں ایک پہلوان دوسرے حریف پہلوان کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگیں ڈال کر اسے چت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیت اسی کی ہوتی ہے جس کی ٹانگوں میں دم ہے اور بازوؤں میں قوت ہے۔ مغلیہ دور میں اس فن کو

بہت بڑھاوا ملا اور جیتنے والے پہلوانوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ ہندوستان پر قبضے کے بعد انگریز سامراج نے نہ صرف اسی خوب صورت فن کو باقی رکھا بلکہ اسے آرٹ کا درجہ دے کر دیسی ریاستوں کے حکمرانوں، رجواڑوں اور کم و بیش تمام عوام کو کشتیوں کے مقابلوں، مرغوں کی لڑائیوں اور پتنگ بازی کے دل چسپ تماشوں میں مصروف رکھا۔

قینچی چلانے سے بات چلی اور بیچ میں انگریز آگیا اور انگریز کو آنا ہی چاہیے تھا۔ انگریز کے بغیر کوئی بات آگے بڑھتی ہے اور نہ ختم ہوتی ہے۔ اب دیکھیے نا۔ انگریز کو یہاں سے رخصت ہوئے قریب قریب نصف صدی ہو رہی ہے لیکن ہم انگریزی زبان بول کر اور اس کے چھوڑے ہوئے لباس کو پہن کر اس حد تک اکڑتے ہیں کہ انگریز بھی شرما جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم سب اس نازک مسئلہ پر غور کرنا نہیں چاہتے اور ہمیں غور کرنا بھی نہیں چاہیے۔ ایسی لاحاصل اور فضول باتوں پر توجہ دینے سے دماغ متاثر ہوتا ہے۔ اور اس کا اثر معدہ پر پڑتا ہے۔ نتیجتاً کھٹی ڈکاریں آتی ہیں اور دن میں آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگتے ہیں۔ لہٰذا اچھا کھائیے۔ اچھا پہنئے اور بڑھیا سوٹ پہنیے اور مرجائیے۔ کلچر ولچر کی بات تو ان فالتو قسم کے لوگوں کا پروپگنڈہ ہے جو دنیا میں کسی کام کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کے جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی۔ البتہ آپ کو کچھ شوق ہے تو کلچرل پروگراموں کی سرپرستی میں کوئی ہرج نہیں۔ کبھی کبھار آرٹ اور کلچر پر ایک آدھ پمفلٹ پڑھ کر اظہار خیال بھی کر لیجئے لیکن شرط یہی ہے کہ ایسے جلسوں میں بڑھیا اور معیاری سوٹ زیب تن کر کے جائیں۔ ایسے کہ کوٹ اور پتلون کی کریز میں رتی برابر بھی جھول نہ آنے پائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ٹیلر بھی موڈرن ہو۔ اور بدلتے ہوئے جدید فیشن کے لباس کی وضع قطع سے اچھی طرح واقف ہو۔ اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ ٹیلر فل سوٹ کی اسٹیچنگ کے لیے دو ہزار روپے لے رہا ہے یا تین ہزار۔ یاد رہے کہ قیمتی کپڑا "درزی" جیسے اناڑی کے ہاتھوں میں جا کر اپنا سارا حسن کھو دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہی "درزی" اگر راتوں رات "ٹیلر" بن جائے اور اپنی دکان پر ٹیلرنگ سنٹر کا بورڈ لگا کر کاروبار شروع کردے تو اس کے یہاں اسٹیچنگ کروانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کم از کم کسی معترض کو کوٹ یا شرٹ کا کالر الٹ کر بتایا تو جا سکتا کہ دیکھو....... لیبل دیکھو....... دیکھو....... دیکھو اس کی اسٹیچنگ کہاں ہوئی ہے۔ بی۔ بی ٹیلرنگ سنٹر ڈپلوما ہولڈر لندن انسٹی ٹیوٹ

کٹنگ ٹیبل پر شرٹ پتلون میں ملبوس ٹیلر منہ میں سگریٹ دبائے اور گلے میں ٹیپ ڈالے جب قینچی چلاتا ہے تو ٹیلرنگ شاپ کے صوفوں میں دھنسے ہوئے وائٹ کالر اسکالر بڑی پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھتے ہیں۔ اور شاید یہ بھی سوچتے ہیں کہ کاش وہ بھی ٹیلر ہوتے۔ خواہ مخواہ انہوں نے عمر عزیز کو داؤ پر لگا کر اتنی بڑی بڑی ڈگریاں لیں اور ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ اگر کوئی ٹیلر کی لیٹ کار سے متاثر ہو کر اپنا پیشہ بدلنے کی کوشش کرے تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہوگا۔ کیونکہ اسکالر یا لکچرر آخری عمر میں ٹیلر بننے کے بعد سارے شہر کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ وہ ایسا لباس تیار کرے گا کہ پہننے والے کا حلیہ ہی بگڑ جائے۔ لیکن ٹیلر اگر لکچرر یا پروفیسر بن جائے تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ سنا ہے کہ ٹیلر حضرات کبھی اپنے بچوں کے لیے کپڑا نہیں خریدتے۔ گاہکوں کے کپڑوں میں سے اتنا بچا لیتے ہیں کہ ان کی گھریلو ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محض افواہ ہو اور کسی دل جلے نے یہ خبر اڑائی ہو۔ لیکن قینچی کی کرامات سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قینچی بڑے کام کی چیز ہے۔ سہاگ سے لے کر نیلر کی کٹنگ ٹیبل تک وہ یوں کر کر چلتی ہے جیسے کسی خاتون کے منہ میں زبان۔ یہ بھی ایک محاورہ ہے جو مرد حضرات نے خواتین کے تعلق سے وضع کیا...... (حالانکہ محاورے وضع نہیں ہوتے) قینچی کی طرح عورتوں کی نہیں بلکہ مردوں اور صرف مردوں کی زبان چلتی رہتی ہے (استثنائی صورتوں کو چھوڑتے ہوئے) دن بھر اور رات کے بڑے حصے تک وہ مسلسل بولتے جاتے ہیں۔ دراصل اس محاورے کے ذریعہ عورتوں کو بدنام کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ایک ہی سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ مردوں کے ہاتھوں میں چونکہ قلم تھا، اس لیے انہوں نے اپنے قلم کا ناجائز استعمال کیا۔ اگر اس قلم کو چھین کر عورتوں کے ہاتھوں میں دے دیا جائے تو پتہ چلے گا کہ عورتوں کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے یا مردوں کی طرح!

میڈیکل سائنس میں قینچی کا بہت ہی اہم اور مثبت رول ہے۔ معمولی سرجری سے لے کر ہارٹ کے آپریشن تک اور ہارٹ کے آپریشن سے لے کر "سیزیرین بے بی" تک قینچی نے تخلیقی کام انجام دیا ہے۔ سائنس کی دنیا میں یہ وہ کارنامہ ہے جسے انسانیت کبھی نہیں بھلا سکتی۔ لیکن کہا یہ کہ الجھن کی کوئی بات نہیں ہے کہ اردو میں اس "بے بی" کو آخر کس نام سے پکارا جائے؟ قینچی کا بیٹا یا بیٹی کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پتھر کو اٹھا کر کسی کے منہ پر مار دے۔ یورپ کے سائنس داں بڑی آسانی کے ساتھ آلتو فالتو قسم کے لفظ کا استعمال کر لیتے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ایسے الفاظ سے کتنی مضحکہ خیز سچویشن پیدا ہو جاتی ہے لیکن اب ہم اردو والوں کا کام ہے کہ لفظی ترجمے کی بجائے کوئی موزوں اور مناسب نام تجویز کریں۔ اصل میں اس کا تعلق بڑی حد تک عصری حسیت سے ہے۔ ویسے صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

اگر قینچی نہ ہوتی تو اس سماج کا ہر فرد بالوں سے ڈھکا ہوا وہ ریچھ ہوتا جو جنگل سے بھاگ آیا ہو۔ یہ قینچی کا فیض ہے جس نے آدمی کو آدمی باقی رکھا۔ حجام یا ہیر ڈریسر کے ہاتھوں میں جب قینچی تیز تیز چلنے لگتی ہے تو کر کر اور چق چق کی ہلکی سی موسیقی چاروں طرف پھیلنے لگتی ہے اور ترشے ہوئے بال جب کندھوں سے ہوتے ہوئے فرش پر گرنے لگتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے سر پر سے منوں بوجھ ہٹ گیا ہے اور طویل بیماری کے بعد مریض شفایاب ہو کر زندگی کی طرف قدم اٹھا رہا ہے۔ لیکن ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے سروں پر بالوں کا منوں بوجھ لیے کیسے گھومتے ہیں۔ بہر حال ہمت کی داد دینی پڑتی ہے!

لیکن قینچی کے چند منفی پہلو بھی ہیں۔ جہاں تک ادبی حلقوں کا تعلق ہے اردو کے کم و بیش تمام نقادوں کے ہاتھوں میں ایک ایک قینچی ہے۔ بڑی قینچی بڑے نقاد کی نشان دہی کرتی ہے اور چھوٹی قینچی چھوٹے نقاد کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ چھوٹا نقاد بڑا نقاد کہلانے کے شوق میں چھوٹی قینچی پھینک کر بڑے سائز کی قینچی بازار سے خرید لاتا ہے۔ لیکن اس بات کا وہ ضرور خیال رکھتا ہے کہ وہ میڈ ان انگلینڈ یا امریکہ ہو۔ کسی کا خیال ہے کہ آج اردو ادب کو ایک صدام حسین کی ضرورت ہے جو نقادوں کی شیخوں جیسی حرکات ختم کر کے عوامی اور سائنٹفک نکتہ نگاہ سے ادب کا جائزہ لینے کی پابندی لگائے۔ یہ ایک انتہائی تشویشناک خیال ہے۔ فکر اس بات کی ہے کہ یتیموں کے سر پر شفقت سے اپنا ہاتھ رکھو!

ان کے علاوہ قینچیاں اور بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ سنسر بورڈ کے ممبروں، انکم ٹیکس کے عہدہ

داروں، سیلز ٹیکس کے افسروں، ٹھیکیداروں، سرجنوں اور مامور فوٹوگرافوں سے لے کر بڑے بڑے سرمایہ دار تک کاروبار میں ملوث ہیں سبھاں میں نے جان بوجھ کر وکلا کا ذکر نہیں کیا کیوں کہ سید عبدالقدوس ایڈوکیٹ میرے دوست ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پیشے سے تعلق رکھنے والے حضرات کے خلاف کچھ کہہ کر اپنی دوستی پر حرف لاؤں ویسے میری رائے محفوظ ہے!

اور تو اور اس وقت میرے ہاتھ میں بھی قینچی ہے!

اب میں آپ سے کیا چھپاؤں، اس خوب صورت آلے کی مدد سے میں اپنے ماہواری بجٹ کی مسلسل تخفیف کر رہا ہوں۔ ضروریاتِ زندگی کی ایک ایک چیز چھوڑنے کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ دال پر گزارا ہو رہا ہے۔ سوچتا ہوں آخر اس کی بھی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ آدمی صاف اور کھلی ہوا پر گزارا کرے!

اس سے پہلے کہ مدیر کا قلم قینچی کا فرض انجام دے میں قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان کی ترجمانی سے مستعفی ہوں!

عاشق شاہ

نیو ایر

نیا سال آدھی رات کو دبے پاؤں ایک چور کی طرح گھر میں داخل ہوتا ہے اور پچھلا سال بنا کچھ کہے ماضی کے سارے سرمائے کو سمیٹ کر غائب ہوجاتا ہے اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون گیا اور کون آیا۔

لیکن نئے سال کی صبح صبح بڑے زور سے کال بل بجتی ہے یا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے اور آواز سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ضرور مکان دار اپنا پانچ مہینوں کا بقایا وصول کرنے آیا ہے۔ یا پھر کوئی ساہوکار آخری الٹی میٹم دینے آیا ہے کہ اب بھی اگر واجب الادا قرضہ ادا نہ کیا جائے تو وہ عدالت میں ہم سے ملاقات کرے گا۔ ڈر اور خوف کے ملے جلے احساسات کے ساتھ دروازہ کھولنے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی ساہوکار نہیں بلکہ ہمارا دوست ہے۔ لیکن غیر متوقع طور پر اتنی صبح.....!

ہم حیرت سے اس کا منہ تکتے ہیں.....!

اور وہ اپنے میلے پیلے کم از کم تیس دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہماری حیرانی پر اظہار افسوس کرتا ہے اور ہماری جہالت کا مذاق اڑاتا ہوا ایک اہم اطلاع دیتا ہے کہ آج نئے سال کا پہلا دن ہے۔

اوہو...... نیا سال...... پہلا دن...... پہلا دن......!!

ہم آپ ہی آپ بڑبڑاتے ہیں۔ اور ایک طرح سے اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ جواباً ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ لہٰذا ہم ہنسنے لگتے ہیں۔

ہی ہی...... ہاہا...... سال کا پہلا دن......!!

ہماری ہنسی کا کوئی مطلب نہیں ہوتا اور یہ اس شخص کی ہنسی سے بڑی مشابہ ہوتی ہے جس نے بھرے بازار میں اپنی کسی بے وقوفی کا مظاہرہ کیا ہو اور اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے ہنسی کا سہارا لے رہا ہو۔ ورنہ یہاں ہنسی کا کون سا موقع ہے۔

اس عجیب و غریب صورت حال پر ہمارا دوست قہقہہ لگاتا ہے، کھنکارتا ہے اور پھر اپنی ٹائی کو درست کرتے بڑے سنجیدہ مگر خوشگوار انداز میں مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہتا ہے..... وش یو ہیپی نیو ایئر......!"

ساتھ ہی ہمارے دماغ کے سارے بند دریچے کھل جاتے ہیں اور فوراً ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ اب ہمیں کیا کہنا چاہیے ۔ لہٰذا ہم بھی گلے کو صاف کرکے اور اپنے باسی چہرے پر مسکراہٹ کی مصنوعی چمک پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

وِش یو ہیپی نیو ایر ۔"

سیم ٹو یو......!

سیم ٹو یو......!!

اور بے تکلفی کی صورت میں گلے بھی ملنا پڑتا ہے ۔

ہمارا یہی تجربہ ہے اور اب تک جتنے سال ہماری زندگی میں چپکے سے داخل ہوئے ہیں ۔ ان کی اطلاع ہمیں باقاعدہ چند مخلص دوستوں کے توسط سے ملتی رہی ہے اور ہم کبھی کبھی سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ اگر ایسے دوست ہمیں نصیب نہ ہوتے تو زندگی کتنی بے کیف ہوتی اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہمارے آس پاس کیا ہو رہا ہے ۔ آس پاس کی بات کو جانے دیجئے ۔ ہم کو اپنے بارے میں جتنا کچھ بھی علم ہے وہ محض دوستوں کی وجہ سے ۔ مثلاً ہم بیمار پڑنے والے ہیں تو ہم سے پہلے ہمارے دوستوں کو اس کا علم ہو جاتا ہے اور وہ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ پرسوں اتوار کی شام کو ہم پر فلو کا حملہ ہونے والا ہے لہٰذا ہوشیار...... ہوشیار یا پھر ہم پیر کی صبح سے بے حد صحت مند نظر آتے ہیں ۔ ضرور دال میں کالا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ یا پھر ہمیں ان ضرورتوں کا احساس دلوایا جاتا ہے جس کے لئے ہم نے کبھی بے چینی محسوس نہیں کی ۔ مثال کے طور پر فوراً ہمیں ایک جوڑا ایمبیسڈر شوز خرید لینا چاہیے کیوں کہ موجودہ شوز پنجے کو داب رہا ہے اور انگوٹھے میں درد ہے یا ہمیں اس مکان کا تخلیہ کرکے کسی ایک ایسے گھر میں منتقل ہو جانا چاہیے جو صاف روشن اور ہوادار ہو ۔ کیونکہ یہاں ہمیں ہر قسم کی تکلیف ہے ۔ اور اگر جرأت رندانہ ہو تو ہمیں اپنی ملازمت چھوڑ کر کوئی ایسا بزنس شروع کرنا چاہیے جس میں لاکھوں کی آمدنی ہو ۔ یا پھر اپنی بیوی کو طلاق دے کر کسی ایسی خاتون کا شوہر بن جانا چاہیے جو ایک ہی رات میں ہمیں لکھ پتی بنا دے ۔ صرف اس لئے کہ ہمارا پیشہ اور ہماری بیوی خود ہماری طبیعت اور مزاج سے مختلف ہے اور ہمارا مزاج کیسا ہے یہ ہم نہیں جانتے ، ہمارے دوست جانتے ہیں ۔

بخدا ہم اپنے دوستوں کے بے حد ممنون ہیں ۔ یہ ہمارا قدم قدم پر ساتھ دیتے ہیں اور ان ہی کی بدولت ہر نئے سال کے پہلے دن اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ عمر عزیز کے کتنے سال سڑکوں ، ہوٹلوں اور سینماؤں کی نذر ہو گئے ۔

یہاں ہمیں دوستوں کی شکایت مقصود نہیں ۔ صرف یہ عرض کرنا تھا کہ نئے سال کی خوشی میں بچھڑے ہوئے اور ناراض دوست ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں ۔ اگر کسی وجہ سے تعلقات میں زیادہ کشیدگی ہے تو نئے سال کی آمد سے فائدہ اٹھا کر پھر دوستی کی تجدید ہو سکتی ہے ۔ یہی نہیں کسی جانی پہچانی خاتون کے گھر جا کر مبارکباد دینے میں اس کا

شوہر بھی آپ کے اخلاق کا قائل ہو جائے گا۔ اور یہ سوچے گا کہ اس زمانے میں جہاں ہر شخص کاروباری بنتا جارہا ہے آپ غنیمت ہیں ۔ بڑے بڑے تاجر اس اخلاقی حربے سے گاہکوں کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں ۔ اخباروں میں تین تین چار چار کالموں کے اشتہار چھپوا کر جہاں وہ نئے سال کی مبارک باد دیتے ہیں، وہیں نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے اپنی فرم، کمپنی یا اپنی دکان کا نام نوٹ کرنے کی درخواست کرتے ہیں بلکہ بار بار اشتہار چھپوا کر آپ کو اپنے بزنس اور ٹریڈ مارک کا حافظ بنا دیتے ہیں تاکہ انہیں سال بھر آپ کی خدمت کا موقعہ حاصل رہے اور آپ ایک نئے سال کے کیلنڈر کے عوض انہیں پورا سال یاد کرتے رہیں ۔ فرق اتنا ہے کہ عوام کی زندگی میں نیا سال صرف ایک دن کے لئے آتا ہے اور باقی تین سو چونسٹھ دن لالہ سیٹھ کروڑی مل کی دکان اور گھر میں رہتا ہے۔

انگریزوں کے راج میں بھی نیا سال آتا تھا، آتا کیا، انگریز باقاعدہ اسے لاتے تھے اور ٹھیک رات کے بارہ بجے وائٹ ہارس کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کا استقبال کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی عزیز رعایا کو بھی اپنی خوشیوں میں اس طرح شریک کر لیتے تھے کہ ایک دن پہلے ملازمین سرکار کو تنخواہ بانٹ دی جاتی تھی ۔ لہٰذا دونوں اپنے اپنے انداز میں جشن مناتے تھے ۔ آج بھی انگریزوں کی اس روایت کو اسی انداز میں اپنایا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عوام کی بھلائی کی خاطر سرکاری ملازمین کو پیشگی تنخواہیں ایصال نہیں کی جاتیں ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ نئے سال کی خوشی میں مہینے بھر کا بجٹ ایک ہی دن میں ٹھکانے لگا دیں اس لیے سرکاری ملازمین اور کارخانوں میں کام کرنے والے لاکھوں مزدور بغیر تنخواہ کے خالی خولی ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے پھرتے ہیں ۔ چھٹی کا دن جو ٹھیرا۔

سچ پوچھئے تو نئے سال کے پہلے دن چھٹی اس لئے دی جاتی ہے کہ عوام اپنے تعلقات استوار کریں اور قومی یکجہتی کے مفید فارمولے کو اپنی عملی زندگی میں برتیں ۔ ہندو، مسلمان سے ملتے ہیں ۔ مسلمان ہندوؤں سے ملتے ہیں اور پھر یہ ہندو مسلمان دونوں اس ملک میں رہنے والی دوسری اقلیتوں سے مل کر کہتے ہیں، نیا سال مبارک......!

ہمارا ہر چھوٹا بڑا لیڈر اس خوشگوار صورت حال اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے منظر کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور فوراً عام عام ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس طلب کر کے کہتا ہے کہ پچھلے سال کو بھول جاؤ ۔ کیونکہ پچھلا سال مصیبتوں اور پریشانیوں کا سال تھا لیکن نیا سال نئی توقعات اور نئی اسکیموں کے ساتھ آیا ہے ۔ اس لئے عوام کو پر امید ہونا چاہیے اور مسکراتے ہوئے بڑے صبر کے ساتھ نئے سال اور نئے سال کے چیلنج کو قبول کرنا چاہیے۔

نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر عوام کے رہنما اپنے ملک اور بیرون ملک کے عوام کے نام خوشحالی اور نیک تمناؤں کے پیامات بھیجتے ہیں ۔ یہ پیامات ان کے اپنے اور ریجنل نہیں ہوتے بلکہ ان کے اپنے سکریٹری صاحبان کے ڈرافٹ شدہ ہوتے ہیں جو خاص اسی مقصد کے لئے ملازم رکھے جاتے ہیں ۔ البتہ دستخط ان کی اپنی اور ریجنل ہوتی ہے ، ویسے یہ پیامات بڑے اہم ہوتے ہیں ۔ ان میں پانچ سالہ منصوبوں کا ذکر ہوتا ہے اور ان اسکیموں کا بھی جو فی الحال پیتا لوگوں کے

دماغوں میں ہیں ۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ صرف بڑے حضرات ہی پیامات بھیجیں ۔ ہر بالغ مرد اور عورت کو یہ آزادی حاصل ہے کہ نئے سال کے پہلے دن وہ کسی کو بھی مخاطب کرے ۔ گریٹنگ کارڈ اس کی ایک خوبصورت شکل ہے ۔ عام طور پر اسے ایک خوبصورت کاغذ پر چھپوایا جاتا ہے ۔ لیکن اگر جیب اسکی اجازت نہ دے تو سائیکلو اسٹائیل کروالیا جاسکتا ہے ۔ ورنہ سمجھ دار آدمی ہاتھ سے ہی لکھ کر اس ضرورت کو پورا کرلیتے ہیں ۔ گریٹنگ کارڈ میں صرف ان مشہور مفکرین یا ادیبوں کے اقوال زرین ہوتے ہیں جن کا تعلق بیرون ممالک سے ہے ۔ دیسی ادیبوں کے کسی قول کو بغیر حوالے کے نقل کرنا ممنوع ہے ۔ اگر کسی نے ایسی غلطی کی تو اسے جاہل اور قدامت پرست سمجھا جائے گا ۔ ہمیشہ مغربی ادیبوں اور شاعروں کے کسی نہ کسی قول کو پیش کرنا چاہیے ۔ لیکن قول ایسا ہونا چاہیے جو خود بھیجنے والے کی سمجھ میں نہ آسکے ۔ اس سے دو فائدے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ گریٹنگ کارڈ وصول کرنے والوں پر بھیجنے والے کا رعب پڑجائے گا ۔ دوسرا یہ کہ بھیجنے والے کو جواباً قسم قسم کے گریٹنگ کارڈس ملیں گے ۔ جن کی نمائش کا وہ کسی مناسب موقع پر اہتمام کرسکتا ہے ۔

گریٹنگ کارڈ بھیجنا ایک کلچرڈ سوسائٹی کی علامت ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ بھیجنے والا کتنا کلچرڈ ہے یا نہیں ۔ گریٹنگ کارڈ صرف ان حضرات کو بھیجنے چاہیں جن سے کبھی دور کا تعلق رہا ہے یا پھر جن کی حیثیت محض ایک اجنبی کی سی ہے ۔ اپنے دوست ، احباب اور رشتہ داروں کو کبھی بھول کر بھی نہیں بھیجنا چاہیے کیوں کہ اپنے تو اپنے ہی ہوتے ہیں ، دوسروں کو اور غیروں کو اپنانا کمال ہے ۔ البتہ ان لوگوں کو گریٹنگ کارڈ ضرور بھیجئے جو آپ کو قطعاً نہیں جانتے ۔ تاکہ وہ آپ کے نام کو یاد رکھ سکیں ۔ کسی ملک کی ادبی یا سیاسی شخصیت کو گریٹنگ کارڈ بھیجنا مستحسن ہے ۔ اگر اس شخصیت کے پرسنل سکریٹری کی طرف سے آپ کو جواب مل جائے تو کیا کہنے ۔ آپ اس تعلق سے اخبارات میں نیوز جاری کرواکر اپنے احباب اور عوام کو متاثر کرسکتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ فلاں ملک یا ریاست کے صدر یا وزیر اعلیٰ سے آپ کے تعلقات بے حد خوشگوار ہیں ۔

نئے سال کے پہلے دن کیا کیا نہیں ہوتا ۔ ماتحت اپنے عہدہ داروں کو سلام کرنے جاتے ہیں ۔ بیوی اپنے شوہر سے ساڑی مانگتی ہے ، بچے معافی کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ محبوبائیں اپنے اپنے عاشقوں سے کسی بڑھیا تحفے کے لئے اصرار کرتی ہیں ۔ فلم انڈسٹری کے مشہور ایکٹر اور ایکٹریس اپنی نئی فلم دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں ۔ اخبارات اور رسائل اپنا اسپیشل نمبر نکالتے ہیں ۔ ملک کے تمام پارکوں اور تفریحی مقامات پر رات کے بارہ بجے تک گہما گہمی رہتی ہے ، جیلوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں ۔ سیاسی اور غیر سیاسی قیدی اپنی مقررہ میعاد سے پہلے سڑکوں اور گلی کوچوں میں آزادانہ گھومتے نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ پرسوں ہی ہم نے ایک عادی مجرم کو دیکھا جس نے جیل جانے سے پہلے ہمارے جھونپڑے پر اپنی نظر ڈالی تھی اور جسے ہتاز اور پڑیو پہلے گیا تھا ۔ اس مجرم کو عدالت نے کئی ٹائیکلوں ، ٹرانسسٹر اور دوسرے قیمتی سامان چرانے کے جرم میں دو سال قید با مشقت کی سزا دی تھی ۔

لیکن اب......!

ہم نے اسے حیرت سے منہ کھول کر دیکھا۔

اور جب ہم نے اس کی اس غیر متوقع رہائی کا سبب پوچھا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا، واہ صاحب یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ مجھ جاہیے ۔ نئے سال کی معافی ۔ پھر اس نے اپنا تھیلا کر کہا، صاحب! نیا سال مبارک......!

اور ہم نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ہمارے کسی نئے ریڈیو کے بارے میں استفسار کر رہا ہے......!

نجومی اور فقیر نفسیات کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک پیشین گوئی کرتا ہے، دوسرا دعائیں دیتا ہے کسی نئے سال کے موقع پر ایک موڈرن پامسٹ نے ہمارا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ ہم پانچ سال کے اندر اندر ڈھائی لاکھ کے مالک بن جائیں گے۔ کیسے اور کیونکر۔ یہ تفصیل اس نے نہیں بتائی۔ لیکن مشہور پامسٹ کیرو کے حوالے سے اس نے بڑے وثوق سے کہا تھا اور کیرو ہماری دکھتی رگ تھا۔ لہٰذا ہم نے یقین کر لیا اور لکھ پتی بننے کے لئے ہم نے ریس کے گھوڑے ہی نہیں دوڑائے بلکہ خود گھوڑوں کے پیچھے بھاگتے رہے اور ہر اس لاٹری کا ٹکٹ خریدا جو بازار میں نظر آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ سال کیا دس سال گزر گئے اور کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اور پھر ایک ایسے ہی نئے سال کی سہانی صبح ایک اور موڈرن پامسٹ نے ہمیں یہ خوشخبری سنائی کہ منسٹر بننا ہماری تقدیر ہے۔ لہٰذا ہمیں فوراً الکشن لڑنا چاہیے۔ صرف اس لئے کہ ہمارے ہاتھ کی ریکھائیں یہی کہتی ہیں۔ کیا جانے اس بار یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہو۔ اس لئے آج کل ہم سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ کیوں نہ اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیں اور الکشن لڑیں۔

فقیر بھی معمولی خیرات کے عوض کسی کو ایک بڑی دعا دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ کبھی تو وہ کسی کو کسی ریاست کے تخت پر بٹھا دیتا ہے اور کبھی اس کے جی میں آجائے تو ایک بڑا ملک ہی دے دے۔

اللہ کے نام پر دیتا جا......!

کسی فقیر کی کھنکتی ہوئی آواز آئی اور بغیر کسی لالچ کے ہم نے چلتے چلتے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی ابھری ہوئی ہتھیلی پر دس پیسے رکھ دیئے۔

لیکن فقیر نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم نے وجہ پوچھی۔ وہ بڑے انداز سے کہنے لگا۔ واہ مائی باپ واہ، یاد نہیں آج سال کا پہلا دن ہے۔ اگر آج اتنی خیرات سے لے لوں تو سال بھر یہی خیرات ملتی رہے گی۔ مائی باپ کو خدا سلامت رکھے۔ آج تو میں آپ سے لڑ کر پلاؤ کھاؤں گا...... پلاؤ...... ہی ہی...... فقیر بغلیں بجا بجا کر ناچنے لگا۔

اور ہم اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر آگے بڑھ گئے۔

اور نیا سال پیچھے پیچھے ماضی کی ویران وادیوں کی طرف ایک گیند کی طرح لڑھکتا چلا گیا۔

عاتق شاہ

واک آوٹ

واک آوٹ کی پارلیمنٹ یا اسمبلی میں کوئی اہمیت ہو تو ہو لیکن پبلک کے پاس یعنی عوام کے پاس کچھ نہیں۔ ان کے لئے تو واک اوٹ ایک کھیل ہے۔ یا ایک ایسی بات جیسے کوئی خفا ہو کر کھانا نہ کھائے۔ یا پھر غصہ میں آکر اپنے پیر پٹخنے لگے۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ پیر پٹخنے اور تالی بجانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اس نازک فرق کو بھول جاتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے حضرات تالی بجانے لگتے ہیں اور عورتیں پیر پٹخنے لگ جاتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پہلے مردوں کا تالی بجانا معیوب سمجھا جاتا تھا، لیکن آج کل عورتوں کا تالی بجانا برا سمجھا جا رہا ہے۔ اس لئے پیر پٹخنے والی خواتین ہائی جمپ اور لانگ جمپ کے مقابلوں میں حصہ لے رہی ہیں اور مرد بیڈ منٹن کھیل رہے ہیں۔

ویسے نازک کھیلوں سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ پاؤں میں چوٹ نہیں آتی۔ یہاں تک کہ کلائی میں بھی موچ کا امکان کم ہوتا ہے۔ لیکن لانگ جمپ اور ہائی جمپ میں ہمیشہ کولھے یا پیر کے فریکچر کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لئے خواتین ہائی جمپ کے بعد کسی کلینک کا رخ کرتی ہیں ورنہ نارمل حالات میں سستانے کے لئے کسی ہوٹل یا پکچر ہاؤس میں وقت گزارنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ اور مرد بے چارے بیڈ منٹن کے بعد چولھے کی آگ سے اپنے نرم نرم ہاتھوں کو سینکتے ہیں۔ ظاہر ہے مرد کے لیے یہ لمحہ بڑا ہی جان لیوا ثابت ہوتا ہے جب وہ بیوی کی غیر حاضری میں کچن کا انچارج بن جائے اور منّا یا منّی کو بجائے دودھ کے چاول کی پیچ پلائے۔ اور اس سے زیادہ نازک اور جان لیوا لمحہ وہ ہوتا ہے جب بیوی رات کے ایک بجے سکنڈ شو دیکھنے کے بعد تھکی تھکائی گھر میں داخل ہوتی ہے اور شوہر اسی لمحہ اور اسی دروازے سے گھر کے باہر چلا جاتا ہے جس سے بیوی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ پولیٹکل سائنس کی زبان میں اس حرکت کو واک آوٹ کہتے ہیں۔

واک آوٹ کی کئی قسمیں ہیں اور ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی دو قسمیں بڑی پوپلر ہیں۔ ایک وہ جس میں ناراض آدمی سر جھکا کر خاموشی سے باہر چلا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں وہی ناراض آدمی اپنی مٹھیوں کو بھینچ کر نعرے لگاتا ہے، چیختا ہے اور پیروں کو زمین پر پٹک پٹک کر دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی چھوٹی سی دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔

واک آوٹ جمہوری زندگی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ معلوم نہیں وہ دنیا کی کون سی پہلی شخصیت تھی جس نے واک آوٹ جیسے حربے کو دریافت کیا اور انسان کو اپنی برہمی اور ناراضگی کے اظہار کا ایک آسان طریقہ سکھایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس طریقے کو عوامی سطح پر اتنا برتا گیا ہے کہ اب واک آوٹ ایک سستی قسم کی چیز ہو کر رہ گیا ہے، جس کو دیکھو وہ اپنے اپنے انداز میں واک آوٹ کر رہا ہے۔ کیا طالب علم، کیا استاد، کیا نرس، کیا ڈاکٹر، کیا کسان کیا مزدور اور

کیا زمین دار، کیا کلرک اور کیا باس، غرض سب ہی اپنی بات دوسرے کو سنوانا چاہتے ہیں۔ اور دوسرا اپنی۔ اس شور و غل اور ہنگامے میں کسی کی آواز سنائی نہیں دیتی اور نہ پتہ چلتا ہے کہ کون واک آوٹ کر رہا ہے۔

واک آوٹ ہمیشہ اپوزیشن پارٹی کی طرف سے ہوتا ہے۔ خواہ اسمبلی میں ہو یا پارلیمنٹ میں یا گھر میں۔ ان دونوں میں بنیادی فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ اور اسمبلی کی ساری کارروائی اخبارات میں چھپتی ہے اور گھروں کی نہیں۔ اگر گھروں کی تفصیلات بھی چھپنے لگیں تو عوام اسمبلی اور پارلیمنٹ کو بھول جائیں اور روزانہ اخبارات کی اشاعت دگنی تگنی ہو جائے۔ گھروں میں اپوزیشن پارٹی کی لیڈر ہمیشہ عورت ہوتی ہے اور وہ بھی بیوی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی کوئی دوسری عورت برسر اقتدار آجائے۔ ایسی صورت میں اپوزیشن اور بھی مستحکم ہو جاتی ہے۔ ورنہ بیوی خواہ وہ جاہل ہو یا دنیا کی بڑی انٹلکچوئل اپوزیشن کی کرسی پر اپنے بچوں اور بچیوں کے ساتھ بیٹھنا زیادہ پسند کرتی ہے اور مرد بے چارے کو ہر ناخوشگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ادھر پیاز کی قیمت بڑھی ادھر شوہر کو بیوی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑتا ہے کہ وہ ہر مہینہ دیئے جانے والے مقررہ پیسوں میں اضافہ کیوں نہیں کرتا۔ اس کے برعکس جہاں بیوی کمانے والی ہو اور شوہر گھر میں بچوں کو سنبھالتا ہو تو وہاں سرے سے اپوزیشن ہوتا ہی نہیں۔ کیا مجال جو شوہر اپنی بیوی سے یہ دریافت کرے کہ رات میں وہ کس کی اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر آئی تھی۔

ارے ہوگا کوئی۔ بے روزگار شوہر آفس کے ان رموز کو کیا سمجھے!

اگر کوئی شوہر اس رمز کو سمجھنے پر اصرار کرے تو بیوی مستقلاً شوہر کی زندگی سے واک آوٹ کر جاتی ہے۔ اس عمل کو مذہبی زبان میں خلع اور سرکاری زبان میں طلاق کہتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر شوہر کو اپنی بیوی کا آفس کے کسی افسر کی اسکوٹر کے پیچھے بیٹھنا پسند نہ آئے تو اسے بھی یہ قانونی حق پہنچتا ہے کہ بیوی کو اپنی زندگی سے اور اپنے گھر سے نکال دے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اسی وقت مہر کی رقم اپنی بیوی کو ادا کرے۔ ورنہ شوہر اکثر بیوی سے سمجھوتہ کرتا ہے۔ سمجھوتہ کیا، بیوی کے باس کے سگریٹ لانے کے لیے وہ بیوی اور افسر دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بازار چلا جاتا ہے۔

عام طور پر گھریلو زندگی میں واک آوٹ کی دلچسپ قسم وہ ہوتی ہے جب شروع شروع میں کمرے سے کھسر پھسر کی آوازیں آتی ہیں اور پھر آہستہ سے دروازہ کھلتا ہے، اور بیوی باہر آکر والان میں اپنی ساس یا نند یا اپنے بچوں کے بازو سو جاتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ شوہر محترم باہر آکر اپنے بھائی یا بچے کے ساتھ سو جائے۔

واک آوٹ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی، گھر سے ہو یا اقوام متحدہ کی کسی اسمبلی کے فلور سے وہ اٹھتا ہوا تیز قدم ہے جسے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن کسی گروہ طبقے، قوم یا فرد کا بدترین واک آوٹ وہ ہوتا ہے جب وہ خفا ہو کر دنیا ہی کو چھوڑ دے۔ ان حضرات کے یہاں ایک ٹکنیکل غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ واک آوٹ کی پوری تعریف سے واقف نہیں ہوتے۔ واک آوٹ کسی خاص مسئلے پر اپنی ناراضگی کا ایک جذباتی رد عمل ہے جو لمحاتی ہوتا ہے۔ جیسے ہی منظر بدلے اور دوسرا موضوع زیر بحث آئے وہ سب کے سب واپس آجاتے ہیں اور زندگی کی بھرپور دلچسپیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کس ملک کے انٹلکچویل نے ان سے کہہ دیا کہ واک آوٹ کرنے والا جا کر لوٹتا نہیں۔

عاشق شاہ

ہوائی چپل

چپلوں میں چپل ہوائی چپل ہے۔

اور جس کے پاس ہوائی چپل ہے اس کے پاس گویا سب کچھ ہے اور جو اس نعمت سے محروم ہے وہ دنیا کا ناکارہ ین آدمی ہے۔

بھلا غور کیجئے کہ آخر وہ آدمی ہی کیا جس کے پاس ایک ہوائی چپل نہیں، یعنی ہوائی چپل نہ رکھنا اور وہ بھی اس ڈرن زمانے میں حیرت کی بات نہیں بلکہ مضحکہ خیز بات بھی ہے۔

کسی بھی محفل میں جائیے، باغ میں چہل قدمی کیجئے، ریلوے پلیٹ فارم پر ٹہلئے یا اپنے کسی دوست اور عزیز کے رجائیے، دیکھنے والے کی پہلی نظر آپ کی چہرے پر سے ہوتی ہوئی پیروں پر آکر ٹک جائے گی۔ اب یہ بات کہ پیروں اور رے کا آپس میں کیا تعلق ہے دوسری بحث کو چھیڑتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پیر پیر ہیں اور چہرہ چہرہ۔ اور ان دونوں بیچ میں ایک طویل فاصلہ ہے۔ مگر انسان کی اس کمزوری کا کیا کیا جائے کہ وہ اس معاملے میں اوپر سے نیچے آتا ہے۔ اور نی منفعت کے لیے نیچے سے اوپر جاتا ہے۔ تضاد اپنی جگہ باقی ہے جس کا بالکلیہ تعلق فرائیڈ سے ہے۔ لیکن فرائیڈ بھی ور اور تحت الشعور کی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے دماغ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پیروں تک پہنچنے کے لیے شاید اسے صدیاں ۔ جائیں۔ اس لیے پیر آج بھی جسم کے اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے اور یہ دنیا کے عظیم مفکروں اور دانشوروں کی جہ کا مرکز نہ بن سکے۔ البتہ اردو غزل کے قدیم شاعروں نے محبوبہ کے پاؤں کی خوبصورتی کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ ن ان بے چاروں کے ساتھ ایک المیہ یہ ہوا کہ یہ اپنی محبوبہ کے قدموں پر جان دینے کی حسرت کو لئے مرگئے۔ لیکن دبہ کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ کم از کم قبر پر جاکر دو پھول تو چڑھاتی۔ آخر اس میں اس کا کیا جاتا۔ ایک پھول اپنی طرف سے اور سرا رقیب روسیاہ کی طرف سے۔

صرف اردو شاعری میں ہی نہیں بلکہ اردو نثر میں بھی، داستانوں میں محبوبہ کے پیروں کی خوبصورتی کا ذکر ملتا ہے ن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر محبوبہ کے پیر خوب صورت ہوں۔ اگر واقعی خوب صورت ہیں تو اس کے اچھے چہرے کا ل ہونا ضروری نہیں۔ چہرے کو دیکھ کر پیر کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اور اسی طرح پیروں کو دیکھ کر چہرے کے

بارے میں کوئی رائے نہیں قائم کی جاسکتی بعض وقت تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ پورے جسم میں صرف پیر ہی خوبصورت ہوتے ہیں اور پیروں کے علاوہ کوئی چیز خوب صورت نہیں ہوتی۔ بہرحال کچھ بھی ہو، غیر شعوری طور پر نظریں اوپر سے نیچے کی طرف پھسلتی ہیں۔

بھدے اور بدنما پیر پلاسٹک سرجری کے ذریعہ بدلے تو نہیں جاسکتے البتہ ایک خوبصورت چپل کی جوڑ اس کمی کو پورا کر سکتی ہے۔اس لیے حقیقت سے واقف ہوئے بغیر دیکھنے والا اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک سی محسوس کرنے لگتا ہے۔

چپل اصل میں صنفِ نازک کے استعمال کے لیے ایجاد ہوئی تھی۔اس لئے اس کے کردار میں سو فیصد نسائیت ہے۔نازک سی، ہلکی پھلکی اور رنگ برنگی۔

مگر ہوا یوں کہ مرد نے صنفِ نازک کو اپنانے کے بعد اس سے متعلق ہر شئے کو بطور حق استعمال کرنے لگا۔ سوائے ساڑی، بلاؤز اور چوڑیوں کے۔البتہ جہاں تک چپل کا معاملہ ہے، اب یہ عورت مرد دونوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔خیر گھر کی چار دیواری کی حد تک چپل کا استعمال ٹھیک ہے، ورنہ باہر کی دنیا میں جب مرد اپنے موٹے موٹے پاؤں کو ایک نازک سی شئے میں ٹھونس کر مستانہ وار چلتا ہے تو بڑا لجلجا اور ڈھیلا ڈھالا سا لگتا ہے۔

حد یہ ہے کہ بعض زندہ دل شوہر اپنی بیویوں کی خوب صورت نازک سی چپلوں میں اپنے گز بھر پاؤں کی صرف انگلیوں کو ڈالے شہر کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔دھول سے اٹے ہوئے پاؤں اور حسین چپل کی تباہی پر اگر آپ نے توجہ دلائی تو ہنس کر ارشاد فرمائیں گے کہ بھائی جلدی میں نکل گیا۔اور اس وقت میں جب نکل رہا تھا میری چپل تمہاری بھابی کے پیر میں تھی اور بھابی غسل خانے میں تھیں۔

یہی نہیں اگر آپ کو کسی کے یہاں مہمان بننے کی سعادت نصیب ہوئی ہو تو اس بات کا ضرور اندازہ ہوا ہوگا کہ صابن اور تولیہ سے لے کر چپل تک آپ نے میزبان اور اس کے افراد خاندان کی استعمال کی ہے۔ بعض گھرانوں میں اس چپل نے عشق کی آگ کو بھڑکانے کا کام بھی انجام دیا ہے۔ مثلاً چپل کی خوبصورتی کو دیکھ کر چپل والی پر عاشق ہوگئے شادی کے بعد ہی پتہ چلا کہ چپل نے عاشق کو صاف صاف دھوکہ دیا ہے۔ مگر اس میں دھوکے کی کیا بات ہے۔

چپل کا اپنا ایک رول ہے، کردار ہے، اور اس کا اپنا ایک چہرہ ہے۔ کبھی یہ دلوں کو جوڑتی ہے تو کبھی دلوں کو توڑتی ہے۔رقیب روسیاہ کی مزاج پرسی اس سے کی جاتی ہے۔یہ دوسری بات ہے کہ اس عمل کے بعد بھی رقیب کی بت کا نشہ نہیں اترتا۔

لیکن ان شخصی رشتوں اور ناطوں سے ہٹ کر سماجی اور سیاسی سطح پر چپل سے بڑے بڑے کام کئے جاتے ہیں۔ معزز ارکان اسمبلی و پارلیمنٹ کسی بل یا تحریک کے خلاف بطور اظہار ناراضگی اپنی اپنی چپلوں کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اور چپلوں کی مدد سے میز کو بجاتے ہیں اور باقاعدہ انگریزی میوزک شروع ہو جاتی ہے۔اس کا شدید رد عمل یہ ہوا کہ

عوام آج کل اپنے رہنماؤں کے نقش قدم پر چل کر چپلوں کا آزادانہ استعمال کر رہے ہیں۔ بول چال کی زبان میں ہر تین چار فقروں کے بعد ایک آدھ چپل آ ہی جاتی ہے۔

آج کل پبلک اپنے رہنماؤں کے پڑھائے ہوئے سبق کو اس طرح دہرا رہی ہے کہ عوامی جلسوں میں شہ نشین پر چپل پھینک رہی ہے۔

ایک حساس قومی رہنما نے برہم ہو کر کہا تھا، مجھے آج ہی پتہ چلا کہ آپ کے شہر میں چپلوں کا کاروبار اتنے بڑے پیمانے پر چل رہا ہے۔

حالانکہ لیڈر کا مقصد یہ تھا کہ چپل پھینکنے والوں کو عبرت دلائی جائے۔ مگر اس کا اثر الٹا ہوا اور پانچ منٹ تک چپلوں کی بارش ہوتی رہی۔ قسم قسم اور رنگ برنگی چپلوں کی۔

اصل میں چپل ہمارے تہذیبی سفر کا ایک حصہ ہے۔ ورنہ وہ تقریب ہی کیا جس میں چپلوں کا تبادلہ عمل میں نہ آئے۔ شوز، سینڈل، اونچی ایڑی کی جوتی اور فوجی نما جوتوں کو یہ سہولت حاصل نہیں جو ایک عدد چپل مہیا کرتی ہے۔ یوں بھی ہمارا ملک گرم ہے۔ اس لئے آب و ہوا اور مزاج کے اعتبار سے چپل ہی ایک ایسی موزوں ترین شئے ہے جو دن بھر ایک اچھے رفیق کی طرح ساتھ دیتی ہے اور رات کو سوتے وقت سرہانے کا تکیہ بن جاتی ہے۔ نرم، ملائم اور آرام بخش۔

سچ تو یہ ہے کہ آج چپل آدمی کا مقدر بن گئی ہے۔

قسم قسم کی خوبصورت چپلوں اور چمکیلے جوتوں کی صنعت میں ہمارے ملک نے جو ترقی کی ہے اس کا مقابلہ ایشیا کا کیا دنیا کا کوئی ملک نہیں کر سکتا۔ آزادی کے بعد ہم نے چپلوں اور جوتوں کے کاروبار کو نہ صرف آگے بڑھایا ہے۔ بلکہ انٹرنیشنل مارکٹ میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے۔ اس لیے جب کبھی کسی ملک کو جوتوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو فوراً ہمیں اپنا آرڈر بک کرواتا ہے۔

جوتا ہو یا چپل اس سے کسی حال اور کسی صورت مفر ممکن نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ چپل قومی اور شخصی زندگی میں ہماری شخصیت کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔

اگر چپل اپنی ذاتی نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ویسے سمجھدار لوگ کبھی دکان جاکر چپل نہیں خریدتے بلکہ مسجد جاکر اپنی ضرورت پوری کرلیتے ہیں۔ آخر خدا کا گھر کس کام کے لئے ہے۔ بہر حال چپل کی کرامت دیکھئے۔ اپنے گھر میں ہوں یا کسی کے گھر میں اللہ کا نام لے کر کسی بھی سائز کی چپل میں پیر ڈالئے یوں محسوس ہوگا جیسے ساتویں خلا باز آپ ہی ہیں۔ تلوے بڑی ملائمت محسوس کریں گے جیسے کسی نے آپ کے قدموں میں کشمیری قالین بچھا دیا ہو اور اس کے بعد میلوں دور کے فاصلے آپ چٹکی بجاتے ہوئے طے کرلیں گے۔

چپل کے استعمال پر لباس کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ جیسے آپ شوز کو دھوتی یا لنگی پر نہیں پہن سکتے۔ اگر پہن

لیں تو آپ اجڈ اور گنوار سمجھے جائیں گے۔ لیکن آپ چپل کو بلا تکلف شلوار، پاجامے، دھوتی، پتلون، شیروانی اور سوٹ پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اور کوئی اللہ کا بندہ اس کی طرف توجہ بھی نہ دے گا۔

یہ سادگی صرف چپل کے حصے میں آئی ہے اور یہ اس کے کردار کا دوسرا اہم پہلو ہے۔ کھدر کے کپڑوں پر چپل خواہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو چپکنے لگتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کھدر چپل کے لیے اور چپل کھدر کے لیے ہے۔ وہ پوپلر چپل ہوائی بھی ہو سکتی ہے یا کوئی اور لیکن ہوگی تو وہ چپل ہی۔ مگر ایک پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ انسان کی سب سے بڑی نشانی یہی ہوتی ہے کہ وہ پوپلر قسم کی چیز کو استعمال کرے۔ حد یہ کہ آج کل نوجوان صرف اس لڑکی کو پسند کر رہے ہیں جو پوپلر ہو۔ ورنہ سماج اس شخص کو اوٹ آف ڈیٹ سمجھ کر بلدیہ کی کنڈی میں پھینک دے گا۔

اور یوں بھی غور کیجئے کہ کیا وہ آدمی، آدمی کہلانے کا مستحق ہے جس کے پاس ایک چپل بھی نہیں۔

ابھی حال حال کی بات ہے کہ شہر کے ایک بڑے تاجر کی ساتویں لڑکی مس زرینہ کی شادی میں مجھے شرکت کا موقع ملا۔ دعوت انتہائی پر تکلف تھی۔ کلکٹر، سکریٹری، فوجی افسر، پولیس افسر اور منسٹر سے لے کر گورنر صاحب تک اس تقریب میں شریک تھے۔ ڈنر کے بعد جہیز کے سامان کو نمائش کے لیے پیش کیا گیا جو تین بڑے ہالوں میں سجایا گیا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد یوں لگا کہ میں کسی میوزیم میں بغیر ٹکٹ کے گھس آیا ہوں۔ ہر شخص عش عش کر رہا تھا۔

لیکن میرے ایک دوست نے کہا، بھئی! سب کچھ ٹھیک ہے مگر جہیز میں ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے۔

سب نے بڑی حیرانی سے پوچھا، وہ کیا؟

میرے دوست نے کہا، ہوائی چپل!

ایک دوسرے منچلے دوست نے تائید کرتے ہوئے کہا، بالکل ٹھیک، لیکن ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے، اور وہ ہے فیملی پلاننگ پر ایک معقول کتاب۔

اس پر سب ہنس پڑے۔

بات ویسے مذاق کی تھی، لیکن میرے بے تکلف دوستوں نے بڑی سنجیدگی سے حالات کا اپنے انداز میں تجزیہ کیا تھا بظاہر فیملی پلاننگ کی کتاب اور چپل میں کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ کس طرح میرے دوستوں نے چپل کی پیداوار اور انسانی آبادی میں مطابقت پیدا کرنے کا ایک طریقہ بتایا ہے۔ ورنہ ایک جمہوری ملک کے آزاد شہری کا اس سے بڑھ کر اور کیا المیہ ہوگا کہ وہ پیدائش کے ساتھ ہی ایک عدد چپل اپنے نام رجسٹر نہ کروا سکے۔ اور عمر بھر ننگے پیر کھردری زمین پر چلتا رہے۔

عاتق

ہم خاک نشینوں کی

ابراہیم جلیس زمین کے آدمی تھے۔ان کے قدم ہمیشہ زمین پر ٹکے رہے۔انہوں نے آخری سانس تک زمین پر والوں کے درد کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔یہ دوسری بات ہے کہ وہ ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہو۔ لیکن انہوں نے کبھی اپنی خوش حالی کی عینک سے دوسروں کی تباہ حالی کو نہیں دیکھا اور نہ اپنی خوش حالی کو خود کے باعث اعزاز سمجھا۔اسے وہ محض ایک اتفاق سمجھتے تھے۔یہی نہیں بلکہ وہ آسودگی کے تخت سے اتر کر زمین پر آگئے خاک نشینوں میں رل مل کر ان کی آواز میں اپنی آواز کو بھی شامل کر لیا کہ:!

ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے!

یہ پولیس ایکشن سے پہلے کا وہ زمانہ ہے جب جلیس علی گڑھ یونی ورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری سے لے کر ارادوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ حیدرآباد آئے اور میں اپنے والد کے انتقال کے تیسرے دن ہائی اسکول کا امتحان ؟ کر حیدرآباد آرمی سرپلس ہارسس ڈپو لیبر کور میں بحیثیت سولجر کلرک بھرتی ہو گیا۔قدرت ہم نے دونوں کو الگ اا راستوں پر ڈالا تھا لیکن ایک قدر ہم دونوں میں مشترک تھی اور وہ قدر تھی انسان سے دوستی کی اور اس سے بے پناہ کی!

جلیس صرف عمر میں نہیں بلکہ قابلیت میں بھی بڑے تھے لیکن اس کے باوجود پہلی ملاقات میں وہ مجھ سے یوں جیسے میں اور وہ ایک ہی اسکول، ایک ہی یونیورسٹی ایک ہی محلے اور گلی کے ساتھی ہیں!

بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔قہقہہ لگایا اور قیمتی سگریٹ آفر کی۔

مسلم ضیائی کے کمرے سے لے کر نظامیہ ہوٹل تک جلیس کا یہی حاصل رہا۔جب بھی ملتے قہقہے لگاتے ہو اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے‘‘ لطیفے سناتے ہوئے اور خود آگے بڑھ کر ہوٹل کا بل ادا کرتے ہوئے۔بہر انہوں نے کبھی بھی اور کسی وقت بھی مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں کسی طرح بھی ان سے کم ہوں۔بلاشبہ جلیس کی بڑائی تھی اور بڑے آدمی کی نشانی یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کو بھی مساوی درجہ دیتا ہے اور اپنے برابر ہے ورنہ چھوٹا آدمی ہر وقت میں میں اور تو تو کی چکر میں لگا رہتا ہے!

۱۹۴۶ء سے میں نے لکھنا شروع کیا۔اور مئی ۱۹۴۸ء میں میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ ’’تخت پاتھ کی شہزادی‘‘ کے سے شائع ہوا۔اس وقت تک جلیس کی شہرت افسانہ نگار کی حیثیت سے سارے ملک میں پھیل چکی تھی۔ایسے

جلیس کے مقابلے میں عوام کے سامنے اور ادبی محفلوں میں اپنی کہانیوں کو پیش کرنا بڑی بات نہیں تو معمولی بات بھی نہیں تھی۔

مخدوم کے بعد دوسری شخصیت جلیس کی تھی جو حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا ایک اہم کردار تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں کئی بار انہوں نے اور میں نے ساتھ ساتھ کہانیاں پڑھیں۔ بحث مباحثے ہوئے۔ سخت گفتگو ہوئی لیکن جلیس دوسری ہی ملاقات میں آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتے بلکہ گلے ملتے بالکل اسی طرح دو وکیل عدالت میں جج کے سامنے سخت بحث کرتے ہیں۔ جھگڑا کرتے ہیں لیکن جب باہر نکلتے ہیں تو ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے...... مسکراتے ہوئے سا

وہ پیار بھی کیسا پیار تھا اور وہ مخالفت بھی کیسی مخالفت تھی جس میں شرافت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا۔

آج جب میں جلیس کے بارے میں سوچتا ہوں تو یادوں کا ایک قافلہ نظروں کے سامنے گزر جاتا ہے۔

نظامیہ ہوٹل

مسلم ضیائی کا کمرہ!

اور سید سعد اللہ قادری ایڈیٹر "قلم" کا گھر!

دوستوں کا ہجوم، جلیس ان میں گھرے ہوئے......

ماجد، شمس الدین فاروقی، معین الدین کولاس، سید امداد اللہ قادری، سید احمد اللہ قادری، محمد علی میر، اظہر رضوی، مسلم ضیائی، قمر ساحری، شہریار، شفقت رضوی اور نجانے کتنے جام اور کتنے چہرے......

اب کچھ بھی تو یاد نہیں آتا!

صرف جلیس کا چہرہ ابھرتا ہے۔ اس ابراہیم جلیس کا جس نے اپنے وطن حیدرآباد کو چاہا ہی نہیں بلکہ حیدرآباد کے ہر ادیب اور شاعر کا بڑے فخر سے ذکر کیا۔

مجھے جلیس کی یہی ادا پسند تھی۔ ورنہ حیدرآبادی تو ہمیشہ خود کو دوسروں کے حوالے کر دیتا ہے اور اتنا احساس کمتری کا شکار رہتا ہے کہ سر اٹھا کر بات نہیں کرتا۔ لیکن جلیس نے ایسا نہیں کیا۔...... ادبی، تہذیبی اور صحافتی زندگی میں بھی اور ذاتی زندگی میں بھی...... یہی جلیس کی انفرادیت تھی!

میں اس سے ہٹ کر جلیس کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے واقف نہیں ہوں اور نہ یہ جانتا ہوں کہ جلیس نے اپنی نجی زندگی میں کیا کیا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جلیس نے اپنے قلم سے ہتیار کا کام کیا!

سچ پوچھیے تو جلیس کے ہاتھ میں قلم نہیں تھا بلکہ ایک بندوق تھی۔ ایک ایسی بندوق جو ہمیشہ ظالم اور قاتل کو اپنا نشانہ بناتی تھی۔ لیکن ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ جلیس کا نشانہ چوک گیا۔

اس طوفان میں ایک جلیس کا کیا ذکر اچھے اچھے متوازن فکر و ذہن کے لوگ بھی بہہ گئے۔ اکثر ادیب اور شاعر

شدید جذباتیت کا شکار ہو کر مارچ پاسٹ کرنے لگے۔ لیکن اس وقت بھی چند انسان دوست ادیب اور شاعر باقی بچے تھے جنہوں نے خود کو الگ رکھا۔ ان میں سلیمان اریب، قمر ساحری، اختر حسن، عابد علی خان، محبوب حسین جگر، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر زینت ساجدہ اور ڈاکٹر عالم خوندمیری قابل ذکر ہیں۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا!

یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ مسلم ضیائی کا مجرد گاہ والا کمرہ ادیبوں اور شاعروں کا ایک طرح سے اڈہ تھا۔ مسلم ضیائی کے تعارف پر جلیس نے اس طرح مصافحہ کیا جیسے وہ مجھ سے مدتوں سے واقف ہیں۔ حالاں کہ حقیقت اس کے خلاف تھی!

یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جلیس سے ملنے کے بعد کبھی اجنبیت کا احساس ہوا اور نہ کسی نے از راہ کرم یہ اطلاع دی کہ میں کسی غیر معمولی ادیب سے ملا ہوں بلکہ پہلی ہی ملاقات میں، میں نے یہ تاثر لیا کہ جلیس بھی ہم میں سے ایک ہیں۔ کوئی غیر نہیں اور میرا یہ تاثر یا احساس آخر وقت تک باقی رہا۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جلیس میں ادیبوں یا فن کاروں میں پائی جانے والی وہ سستی قسم کی "انا" نہیں تھی جو انہیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر لے جاتی یا پھر انہیں اپنی ذات کے خول میں اس طرح بند کر دیتی ہے کہ وہ دوسروں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے جلیس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوسرے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی اچھی صلاحیتوں کو نہ صرف اپریشیٹ کرتے بلکہ ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں جلیس کے قریب ہو گیا اس زمانے میں میں حیدرآباد آرمی میں کلرک کم ٹائپسٹ تھا اور صبح صبح تیز تیز سیکل کی پینڈلیں مارتے ہوئے اپنے آفس سرجلس بارسس ڈپو کو جاتا جو لکڑی کے پل کے آگے تھا۔ راستے میں جلیس کا گھر پڑتا تھا جو حمایت نگر میں تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جس کے نچلے حصے میں جلیس رہتے تھے اور اوپری حصے میں ایک اینگلو انڈین خاندان! صبح و شام میرا ادھر سے گزر ہوتا اور جلیس سے کسی نہ کسی لمحے میں سلام علیک ہو جاتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جلیس صبح صبح اپنے چھوٹے سے ورانڈے میں کھڑے رہتے اور اونچی آواز میں میرا نام لے کر پکارتے۔ میں اشارے سے جواب دیتا۔ مجھے معاف کریں، یہ ملٹری کی نوکری ہے۔ ایک ایک لمحے اور ایک ایک پل کا حساب دینا پڑتا ہے۔ ورنہ کورٹ مارشل۔ جلیس قہقہہ مار کر اصرار سے مجھے روک لیتے اور کہتے چائے پی کر جائیے کورٹ مارشل نہیں ہوگا۔ یہ میرا ذمہ۔

سکنڈ لفٹننٹ تاج شہریار سے جلیس کی دوستی تھی جو حیدرآباد آرمی ہیڈ کوارٹر سے نکلنے والے فوجی رسالے "جاں نثار" کے ایڈیٹر تھے۔ اس رسالے میں میری ایک کہانی بھی چھپی تھی اور جلیس شاید یہ کہنا چاہتے تھے کہ ان کے تعلقات سکنڈ لفٹننٹ تاج کی طرح اور دوسرے افسروں سے بھی ہیں۔ اس لیے مجھے نوکری کے تعلق سے اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیے بہر حال جلیس ایک محض دوست ہی نہیں بلکہ نڈر اور بے باک آدمی بھی تھے۔ ان سے ملنے کے بعد کم از کم میں یہ محسوس کرتا تھا جیسے جلیس کارپوریشن میں ایک گزیٹیڈ افسر نہیں بلکہ حیدرآباد آرمی میں میرے ساتھ کام کرتے ہیں۔ ایک فوجی کا دوسرے غیر فوجی کے بارے میں یہ احساس، اپنائیت کی ایک بہترین مثال نہیں تو اور کیا ہے۔

آج جلیس نہیں ہیں۔ سنا کہ وہ اپنی بیوی، بچوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو روتا چھوڑ کر چلے گئے۔ جلیس کی

یہ ڈرامائی حرکت ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی ہے مجھے یقین نہیں آتا کہ جلیس یا جلیس جیسے دل گردے کا آدمی اتنا جلد ہار مان لے گا اور تیکھے چبھتے ہوئے طنز اور زہر میں بجھے ہوئے سارے ہتھیاروں کو یوں چپکے سے اپنے مقابل کے سامنے رکھ دے گا۔

پتہ نہیں جلیس نے ایسا کیوں کیا؟ وجہ کچھ بھی ہو۔

لیکن جلیس نے اچانک یوں موت کے فرشتے سے ہاتھ ملا کر سب کو چونکا دیا ہے اور اب سب جلیس کی بات کر رہے ہیں۔

مجھے بھی جلیس کی، ماضی کی اور زندگی کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے۔

جلیس میرے دوست تھے۔ سب کے دوست تھے اور دوستوں کے بغیر وہ ایک منٹ تنہا نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ سو فی صد محفل کے آدمی تھے۔ گھنٹوں بے تکان بولتے، ہنستے، قہقہے لگاتے اور لطیفے سنا کر دوستوں کو ہنساتے۔ اگر اس بیچ میں کوئی دوست نہ آئے تو اس کے لیے بے چین ہو جاتے!

مسلم ضیائی کے کمرے کے علاوہ نظامیہ وہ واحد ہوٹل تھی جہاں شہر کے سارے ادیب، شاعر، صحافی، وکیل، ڈاکٹر، عالم اور دانشور جمع ہوتے اور گھنٹوں مختلف موضوعات پر بات کرتے۔ نظامیہ کو وہی اہمیت حاصل تھی جو بعد میں اورینٹ کو حاصل ہوئی۔ نظامیہ کا مالک صاحب ذوق تھا۔ کرسیاں بید کی بنی ہوئی انتہائی آرام دہ تھیں۔ کافی یا چائے یا کھانا سپلائی کرنے والے بیرے بھی انتہائی شستہ مذاق کے حامل تھے۔ کیا مجال جو کسی سے پوچھ لے کہ کیوں صاحب ایک چائے پی کر یہاں بیٹھے بیٹھے پورا دن گزار دیا۔ آخر بات کیا ہے گھر کیوں نہیں جاتے؟

میں نہیں جانتا تھا کہ جلیس کن اوقات میں اپنے سرکاری کاموں سے نپٹتے لیکن نظامیہ میں وہ اکثر دن میں نظر آتے اور ادیبوں و شاعروں کو کیپسٹن سگریٹ آفر کرتے۔

میں تکلف کرتا تو وہ اصرار کرتے اور کہتے بھئی آپ کیسے افسانہ نگار ہیں۔ بغیر سگریٹ پیئے افسانہ کیسے لکھیں گے

ہمیں نہیں بلکہ کبھی مجھے یا کسی اور ساتھی کو اپنی برانڈ کا سگریٹ نہیں پینے دیتے۔

جلیس نے ہمیشہ اچھے سگریٹ پیے۔ اچھے کھانے کھائے اور اچھا کپڑا پہنا اور اچھی شان دار زندگی گزاری۔ کہا جاتا ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۸ سال تھی لیکن ان چھ بہ برسوں میں انہوں نے ایک صدی گزار دی۔ دو صدیاں گزار دیں انہوں نے زندگی کو دیکھا، تھا، چکھا۔ یہی نہیں بلکہ اسے برتا بھی اور اس انداز سے برتا کہ وہ شہر حیدرآباد کی ناک بن گئے تھا

میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اس وقت جلیس حیدرآباد کے ادبی حلقوں کی محبوب شخصیت تھے۔ ان کے مجموعے زرد چہرے چالیس کروڑ بھکاری چور بازار اور تکونا دیس بازار میں آچکے تھے۔ اور اردو دنیا میں یہ اپنے تیکھے طنز اور اسلوب کی وجہ سے اپنا ایک مقام بنا چکے تھے اور میں نیا نیا اس میدان میں داخل ہوا تھا۔ میری کہانیاں حیدرآباد کے

اخبار میزان، رسالہ رباب کے علاوہ بمبئی سے قدوس صہبائی کی ادارت میں نکلنے والے نظام، صہبا لکھنوی کے افکار لاہور کے عمر خیام اور مرزا ادیب کے ادب لطیف میں چھپ چکی تھیں۔ اس طرح میں اردو دنیا میں مشہور نہیں تو اجنبی بھی نہیں تھا۔ لیکن جلیس کے مقابلے میں یا جلیس کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں کہانیاں پڑھنا اور مختلف اعتراضات کا جواب دینا مشکل نہیں تو اتنا آسان کام بھی نہیں تھا۔ لیکن میری فوجیت کام آگئی اور میں آہستہ آہستہ اپنے پڑھنے اور سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔

لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں جو لے پلی میں اختر حسن صاحب کے گھر پر منعقد ہوا تھا بڑا ہنگامہ رہا۔ اس جلسے میں جلیس نے اور میں نے کہانی سنائی۔ جلیس کی کہانی پر بڑی واہ، واہ ہوئی۔ اور میری کہانی پر خود جلیس نے بڑا اعتراض کیا اور کہا کہ عاتق شاہ صاحب نے اس کہانی میں فاشزم کا پرچار کیا ہے۔

اس کہانی میں بڑھتی ہوئی آبادی کے تعلق سے ایک شدید اور گہرا طنز تھا اور اس میں بتایا گیا تھا کہ بغیر کسی ذمہ داری کو قبول کیے بچے پیدا کرنا ایک سماجی گناہ ہے۔

کہانی صیغہ واحد متکلم میں پیش کی گئی تھی اور اس کے مرکزی کردار نے کہا تھا، میری ماں نے غلطی کی تھی میرے باپ نے غلطی کی تھی اور ان دونوں کی غلطیوں کا نتیجہ، میں پیدا ہوا۔ لہٰذا میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا جس کی بدولت مستقبل کا کوئی دوسرا آدمی یہ کہہ سکے کہ آج سے بیس سال پہلے میری ماں نے میرے باپ نے!

یہ کہانی میرے پہلے مجموعے "فٹ پاتھ کی شہزادی" میں غلطی کے نام سے شامل ہے۔

اس کہانی پر بڑی سخت بحثیں ہوئیں۔ ترکی بہ ترکی میں نے سب کا جواب دیا۔ پچانوے فی صد جلیس کی تائید میں تھے۔ اور پانچ فی صد میری حمایت میں بول رہے تھے۔

مجھے یاد ہے میری تائید میں بولنے والوں میں ڈی پی مترا، پروفیسر قادری،، مسلم ضیائی اور رند سرشار قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا کہنا یہ تھا کہ کہانی کا مرکزی کردار نئی نسل کی نمائندگی کرتا ہے جو فرسٹریشن کا شکار ہو چکا ہے ورنہ فاشزم کے پرچار سے اس کہانی کا دور سے بھی تعلق نہیں!

بہر حال میٹنگ ختم ہو گئی لیکن یہ بات قریبی دوستوں کے ذہنوں میں تازہ تھی۔ میں بھی چند دنوں کے لیے نظامیہ نہیں گیا اور جب گیا تو جلیس نے کہا، بھئی عاتق شاہ! آپ تو ہم سے خفا ہو گئے۔ میں نے کہا تھا خفا ہوں گا۔ آپ مجھے فاشسٹ کہیں تو کیا مجھے اس پر خوش ہونا چاہیے!؟

اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ اور جلیس نے کیا کہا۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ اور نظامیہ میں مختلف میزوں کے قریب کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دوست ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

اس میٹنگ کی تفصیل سنانے کا مقصد یہی تھا کہ ادیبوں اور شاعروں میں بھی اس زمانے میں اختلافات ہوتے

تھے اور کسی بھی سماج میں ایسا ہونا ایک فطری بات ہے لیکن ایسے نہیں کہ ایک پیگ پر بہک جانے والے سفلی انا کا مظاہرہ سڑکوں پر کریں یا پھر ایک دوسرے کی قابلیت کا سر دے کر کے خاندان کے شجرہ پر نظر ڈالیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ اردو دنیا میں آج تک اتنا عظیم فن کار پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ مستقبل میں اس کی توقع ہے۔ اب غالب کے بعد لے دے کے یہی ایک رہ جاتا ہے۔

جلیس جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ تہذیب اور اس کے لوٹ کھسوٹ کرنے والے کرداروں کے سخت مخالف تھے لیکن اس کے باوجود اس تہذیب کی اچھائیوں کے وہ نمائندے بھی تھے۔ جلیس پرانی اور نئی تہذیب کے بیچ کی ایک کڑی تھے اور آج وہ کڑی ٹوٹ گئی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب اچھائیوں اور صحت مند انسانی قدروں کو پوچھنے والا کوئی نہیں رہا کیوں کہ اب یہ سننے میں آرہا ہے کہ اچھائی برائی صرف انسانی قدریں ہیں۔ سچ اور جھوٹ صرف الفاظ ہیں۔ خود غرضی اور لعمان داوی محض لغت کے لفظ ہیں۔ ورنہ اصل میں ذات ہے اور ذات کے سوا کچھ نہیں نہ انسانی سماج ہے اور نہ انسانوں کا آپس میں کوئی خونی یا سماجی رشتہ...... اس طرح میں نہیں جانتا کہ جلیس کو اب کس نظریے کے خانے میں رکھا جائے! کیوں کہ آج ہم جس زمانے میں سانس لے رہے ہیں اس میں انسان کی موت کی بھی تقسیم عمل میں آتی ہے اور ایک نظریہ فکر رکھنے والا گروپ، دوسرے گروپ سے وابستہ شخص کی موت کا ماتم نہیں کرتا کیوں کہ ان کے نزدیک مرنے والا انسان نہیں ہوتا بلکہ انسان کے سوا کچھ اور ہوتا ہے۔ شاید ایک نظریہ...... ایک نام...... ایک تحریک یا پتہ نہیں کیا کچھ۔

آج مصلحت پسندی کہاں نہیں ہے۔ موت بھی اس کی زد سے بچ نہ سکی۔ اظہار تعزیت کے جلسے بھی اس کا شکار ہیں۔ انسان کا ماتم کم ہوتا ہے اور عہدے یا اس کے اثر و رسوخ کا اظہار زیادہ!

یہ صحیح ہے کہ ابراہیم جلیس وقت کے سیلاب میں بہہ گئے تھے لیکن ایک جلیس پر کیا منحصر تھا میں نے اس وقت کے بڑے بڑے رستموں اور سورماؤں کو دیکھا جو ایک تنکے کی طرح بہہ رہے تھے۔

کہاں ہیں وہ لوگ؟

اور کہاں ہیں ان کی بڑی بڑی باتیں؟

باقی جانے کہاں کہاں چلے گئے!

شفقت رضوی (افسانہ نگار) ماجد (افسانہ نگار) معین الدین کولاس (بزم اقبال) حبیب اللہ اوج (میزان) حمید الدین شاہد، نظر حیدرآبادی، شاہد صدیقی اور ایسے کئی چہرے نظروں سے اوجھل ہوگئے اور نظروں کے سامنے جو رہے ہیں ان کے نام نہیں گنواؤں گا اور اس سے حاصل بھی کیا! جاننے والے جانتے ہیں کہ انہوں نے وقت کو دھوکا دیا وقت نے انہیں دھوکہ دیا۔ وقت نے جو سب سے بڑا جج ہے!

لیکن ایک بات اپنی جگہ اہم ہے اور کم از کم میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ وقت کبھی کسی کو نہیں بخشتا۔ ایک ایک لمحے کا حساب سب کو دینا پڑتا ہے۔

ابراہیم جلیس بھی چلے گئے اور جاکر اس وقت آئے جب وہ دو ملک ایک کہانی لکھ چکے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی درجنوں کتابیں بازار میں آچکی تھیں۔ اس وقت دنیا بدل چکی تھی۔ لیکن حیدر آباد نے انہیں گلے لگایا ان کی آمد پر اردو ہال میں بڑا شاندار جلسہ ہوا۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ گھر پر ان سے ملاقات ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگے بڑھ کر گلے ملے۔ بہت دیر تک باتیں ہوئیں۔ اور نام لے کر ایک ایک کو پوچھتے رہے۔ اور میں نے محسوس کیا کہ ابراہیم جلیس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی گزرے ہوئے اور لڑتے ہوئے وقت نے ان کی انسانیت کو ختم نہیں کیا اور جب تک کسی فن کار میں انسانیت باقی ہے اس کے قلم کی سیاہی نہیں سوکھتی ورنہ اس طویل عرصے میں میں نے ایسے کئی فن کاروں کو دیکھا ہے جو غم ذات میں مبتلا ہو کر آئینے کے سامنے بیٹھ گئے اور خود کے علاوہ دنیا اور اس کی ہر شئے کو بھلا دیا۔

آج وہ ادیب یا شاعر جو اونچی اونچی آوازوں میں ادب کی بات کرتے ہیں۔ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اگر پیدا بھی ہوئے تھے تو نہیں جانتے تھے کہ ادیب یا فن کار کی گمراہی، قاری کو کسی چوراہے پر لا کر چھوڑ دیتی ہے اور اب بھی ایسے انٹلکچوئیل باقی ہیں جو پنکھے کے نیچے بیٹھ کر ادب، آرٹ اور فن کے مسائل پر بات کرتے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ جب فنکار کسی بھول کا شکار ہو کر شدید جذباتیت کا اظہار ادب میں کرنے لگتا ہے تو ادب کا کیا حشر ہوتا ہے!

میں اس تعلق سے کچھ نہیں کہوں گا۔ کیوں کہ ہم سب اس سے واقف ہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جلیس اپنے بندوق والے قلم کو لے کر جہاں جہاں گئے وہاں وہاں انہوں نے سینکڑوں انسانوں کو متاثر کیا۔ جلیس کے قلم میں بے پناہ طاقت تھی وہ اپنے تیکھا اور چبھتے طنز سے جاگیردارانہ نظام کے خلاف آخر دم تک لڑتے رہے۔

زرد چہرے ہوں یا چالیس کروڑ بھکاری یا چور بازار، یا ان کی کوئی کتاب اٹھالیجیے اس میں ان کا چبھتا ہوا طنز آ کر اپنے پڑھنے والے کے دل و دماغ کو اس طرح متاثر کرتا ہے کہ وہ مصنف کے ساتھ زندگی کی ان تلخ اور بے رحم حقیقتوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے جس پر اس انداز سے اس کی نظر پہلے کبھی نہیں گئی تھی!

ادب کے ایوان میں ابراہیم جلیس کی آواز پہلی آواز ہے جو بڑے اعتماد اور پروقار انداز میں گونجی اور لاکھوں سننے والوں کو اپنا ہم خیال بنا کر ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئی۔ لیکن کیوں؟

اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ خاک نشینوں کی وکالت کرتے کرتے چپکے سے خاک میں سو جانے والے وکیل ابراہیم جلیس کو کیا اس بات کا پتہ تھا کہ پہلے سے زیادہ اب عوام کو ان کی ضرورت ہے۔ ابھی تو قلم کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی! آخر ان میں اتنا ڈسپلن کہاں سے آگیا کہ ایک ایک لمحے کا حساب کرنے بیٹھ گئے۔

جلیس رک جاؤ......

رک جاؤ......

منہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

بہت سوچ اور سمجھ کر ہی یہاں دیوان چھپوانا
بڑے گھاٹے کا سودا ہے میاں دیوان چھپوانا

کوئی زر دار جب ہو مہرباں دیوان چھپوانا
پھٹا بھٹ اور بے وہم و گماں دیوان چھپوانا

کٹوتی کرکے ماہانہ بجٹ میں لے تو لیتے ہیں
مصیبت ہے برائے دوستاں دیوان چھپوانا

کسی کے سامنے دامن کو پھیلانے سے اچھا ہے
اکٹھا کرکے برسوں کوڑیاں دیوان چھپوانا

وہ اب آبائی گھر کو بیچ کر کٹیا میں رہتا ہے
کہا کرتے تھے جس کے باپ ماں دیوان چھپوانا

یہی ہے کارگر نسخہ غریبی دور کرنے کا
مبارک ان کو اپنا آٹھواں دیوان چھپوانا

کچھ اعلیٰ شاعروں نے اک نیا فیشن نکالا ہے
گرانی کے زمانے میں گراں دیوان چھپوانا

رہے نقصان کی زد میں ڈھنڈورا پیٹنے والے
تم اسے منہ پھٹ، اچانک ناگہاں دیوان چھپوانا

☆☆☆☆☆☆

علم سے دو قدم ہے جہل آگے
ایک پل پیچھے ایک پل آگے

راستہ کوئی دینے والا نہیں
تجھ میں جرأت ہو تو نکل آگے

ہم گھڑی اپنے ساتھ رکھتے ہیں
وقت کہتا ہے ہم سے چل آگے

چوٹ سے تجربہ ملا ہے مجھے
گر گیا ہے تو پھر سنبھل آگے

جو مرے نقش پا پہ چلتے تھے
چل رہے ہیں وہ آج کل آگے

ہوگئی ان کی کھوپڑی ماتھا
جن کے ماتھے پہ تھی نہ شکل آگے

تو نے دھرتی میں بیج ڈال دیا
اب تو ملتے ہیں تجھ کو پھل آگے

تم بھی لوٹو مشاعرہ منہ پھٹ
بھاگتی جائے ہے غزل آگے

☆☆☆☆☆☆☆

اسرار جامعی (دہلی)

اردو مردہ باد

اسرار اپنے شہر میں نکلا تھا اک جلوس
اردو کے دشمنان "نصیحت مآب" کا
نعرہ لگا رہے تھے بڑے زور و شور سے
وہ اردو مردہ باد کا اور انقلاب کا

شیریں زبان

اردو کا ایک آدمی ہے انجمن میں چپ
ایسانہ جس سے اردو سے وہ بدگمان ہے
"شوگر" کا وہ مریض ہے پرہیز ہے اسے
اردو کو لوگ کہتے ہیں "شیریں زبان" ہے

اردو زباں

اردو جسے کہتے ہیں یہ اک ایسی زبان ہے
جس کا نہ کوئی خاص وطن ہے نہ مکاں ہے
جو گھر بھی نظر آئے کسی نام سے اس کے
"میونس" کا وہ ملبہ ہے سیاست کی دکاں ہے

کمرے میں

ایسے بیٹھے کمرے میں
کمرہ جیسے کمرے میں

تم ہو تو یوں لگتا ہے
دنیا میرے کمرے میں

لیلیٰ بھٹکے صحرا میں
مجنوں بیٹھے کمرے میں

سہمے سہمے رہتے ہیں
ہم بیگم کے کمرے میں

شعر کہیں یا جھک ماریں
اپنے اپنے کمرے میں

تالہ ہم کیسے کھولیں
چابی بھولے کمرے میں

وہ گھر سے باہر لیکن
جوتے ان کے کمرے میں

جب میں ان کے گھر میں تھا
وہ تھے میرے کمرے میں

چوری چوری جلتے ہیں
وہ ساجن کے کمرے میں

شانہ صاحب رہتے ہیں
اتنے چھوٹے سے کمرے میں

اقبال شانہ، حقل

مارا تو کیا مارا

نشانہ تاک کر کسی کی کمر، مارا تو کیا
بڑی مشکل سے اک چوہا اگر مارا تو کیا

غلط فہمی سے جنگل میں گدھے پر داغ دی گ
سمجھ کر شیر یارو ہم نے خر مارا تو کیا

کچل ڈالا بڑی ہمت سے مردہ سانپ کو ہم ـ
اندھیرے میں یہ لیکن جانور مارا تو کیا

حقیقت میں تو پیارے ایک بھی مچھر نہیں
مگر مچھ تو نے سینے میں مگر مارا تو کیا

میاں زخمی کبوتر سا میرا دل پھڑ پھڑا ا
جو کس کر یار نے تیر نظر مارا تو کیا

بڑی مشکل سے میں نے توڑ ڈالا تیرا درو
تیرے در پر جو میں نے اپنا سر مارا تو کیا

بڑے بے درد نکلے جان جاناں تیرے گھر وا ـ
تیری چوکھٹ سے ہم کو باندھ کر مارا تو کیا

ہمیشہ زندگی نے تھپڑوں ہی سے نوازا ـ
میرے منہ پر طمانچہ تو نے گر مارا تو کیا

میرے سر پر تو بارش پتھروں کی روز ہوتی ـ
جنوں میں میں نے گر پتھر پر سر مارا تو کیا

گیا شیطان مارا شاعری کی چوٹ پر شانہ
جو میں نے شعر اس پر پھونک کر مارا تو کیا

سگ لیلیٰ (چھٹویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی

اس رہائی سے اسیری اچھی

بلدیہ کے اسپیشل آفیسر کے کتے ناہی کے لیے جس تڑپ جس پیار جس خلوص کا ہم نے مظاہرہ کیا تھا اس سے متاثر ہوکر صاحب موصوف نے ہمیں باعزت بری کردیا تھا چنانچہ جواباً کتے کے مالک کی خدمت میں فرشی سلام بجالاتے ہوئے جانے کے لیے پلٹے ہی تھے کہ چھوٹا ارباب مجاز جوکہ ایک نمبر کا فتنہ پرداز تھا ایکبار پھر ہمارے راستے میں روڑے اٹکاتے ہوئے بولا ــــ "جناب والا آپ کا حکم اور ناہی بہادر کے لیے اس نوجوان کا جذبہ۔ عقیدت دونوں مجھ حقیر فقیر کے سرآنکھوں پر، لیکن جناب والا یہ نوجوان چھت پر جس مشکوک حالت میں پایا گیا، وہ ابھی تک صاف نہیں ہوئی، اس سے دفتر کی نیک نامی کیساتھ آپ کی آفیسرانہ شان پر بھی حرف آسکتا ہے۔!" فتنہ پرداز ارباب مجاز کے اس فتنہ پرور نکتے پر اسپیشل آفیسر کا ششش و پنج میں گرفتار ہونا لازمی تھا، چنانچہ وہ سر تھامے سوچتے رہے اور اس دوران میں ہم قہر درویش برجان درویش کے مصداق اندر ہی اندر کھولتے رہے، بس نہیں چلتا تھا ورنہ اس فتنہ پرداز کو اسی طرح گھسیٹتے ہوئے چھت پر لے گئے ہوتے جس طرح گھسیٹتے ہوئے ہمیں نیچے لایا گیا تھا پھر اسے چھت پر سے کسی پاپ کی گٹھڑی کی طرح نیچے پھینک دیتے کہ بہت خودکشی کی رٹ لگائے جارہا تھا ذرا دیکھ خودکشی ہوتی کیا ہے۔ ــــ ہم انہی سوچوں میں اپنا خون جلاتے رہے ادھر اسپیشل آفیسر شاید کسی نتیجے پر پہنچ چکے تھے، دونوں ارباب مجاز کو ایکساتھ مخاطب کرکے بولے ــــ "دفتری کاروائی بھی تھرد پراپر چینل ضروری ہے ورنہ پولس والے خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بناڈالیں گے۔" اتنا کہہ کر وہ ہم سے مخاطب ہوئے فرمایا ــــ "تم ایسا کرو نوجوان اپنے علاقے کے کونسلر یا۔ ایم۔ ایل۔ اے سے کنڈکٹ سرٹی فیکیٹ، حاصل کرکے اندرون ایک ہفتہ تھرو پراپر چینل دفتر میں داخل کردو ــــ!"

ہم نے جواب میں بلاچوں چرا کئے سات سلام کئے کہ چلو فی الحال کسی طرح پیچھا تو چھوٹا۔ اور واپسی کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ چھوٹا ارباب مجاز عرف فتنہ پرداز کسی بلی کی طرح ایکبار پھر ہمارا راستہ کاٹتا۔ ہماری دوربین کو جھپٹتا ہوا بولا۔ "یہ بطور ضمانت ہمارے پاس رہے گی کنڈکٹ سرٹی فیکیٹ لے آیئے اور

اپنی امانت واپس لے جائیے۔" ہم نے شکایت آمیز نظروں سے اسپیشل آفیسر کی طرف دیکھا کہ دیکھئے آپ کی ناک تلے آپ کے شاہی بہادر کے چاہنے والے کیساتھ کیسا بے ڈھنگا سلوک کیا جارہا ہے، موصوف ہماری آنکھوں سے جھلکتی یہ تحریر پڑھ کر بے بسی سے اپنے کندھے اچکاتے ہوئے بولے۔ "یہ لوگ بھی اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہیں، اور انہیں تھرد پراپر چینل اپنے فرائض کو بجالانے سے کوئی نہیں روک سکتا!"

اسپیشل آفیسر کے اس کورے جواب پر ہم مرے مرے قدموں سے برآمدے تک پہنچے تھے کہ انھوں نے بآواز بلند فرمایا ـــ "نوجوان شاہی بہادر سے ملنے آنا ضرور اس سے مل کر کتوں کے لیے تمہارے دل میں جو جذبہ عقیدت ہے وہ تھرد پراپر چینل اور گہرا ہو جائے گا ـــ!!"

ہم نے بنا پلٹے چلتے چلتے ہی انہیں جواب دیا۔ جی ضرور حاضر ہوں گا حضور۔!"

ہم دفتر ہذا کی بیرونی پھاٹک تک پہنچے تھے کہ پھاٹک کے ساتھ لگے ایک حجرے میں سے ایک منحوس صورت والے بڑے میاں نمودار ہوئے اور ہمارا راستہ روک کر بآواز بلند مسکرانے لگے "کھی کھی کھی کھی۔ کیا سرکار اتنی جلدی اپنی جان بچانے والے کو بھول گئے۔ اتی قیمتی جان بچانے کا کچھ تو انعام دیونا سرکار ـــ!!"

اس وضاحت پر ہمیں یاد آیا کہ چپڑاسیوں کے جس وفد نے ہمیں رنگے ہاتھوں چھت پر گرفتار کیا تھا اس میں یہ منحوس صورت بڑے میاں سب سے زیادہ پیش پیش تھے کم بخت اسی بڈھے نے تو سارا کھیل بگاڑا تھا اور اب انعام مانگ رہا ہے ہمارا دل جل بھن کر کباب ہوگیا، چنانچہ جلے بھنے لہجے میں جواب دیا۔ "افسوس بڑے میاں، تم نے اپنے ہاتھوں سے انعام کا چانس خود ہی کھودیا ـــ"

بڑے میاں نے طنزیہ لہجے میں کہا ـــ "چانس کھودیا۔؟ وہ کیسے کار۔؟"

ہم نے جواباً لفظوں سے ان کے چٹکیاں کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ ایسے کہ مجھے بچانے کے بجائے تم نے اگر دھکا لگادیا ہوتا تو تمہیں انعام ضرور ملتا۔!"

جواب میں بڑے میاں نے زہرناک لہجے میں کہا۔ "اگر یہ بات ہے سرکار تو ایک کوشش اور کر کے دیکھ لیو، چاہے ابھی کرد یا کچھ دنوں کے بعد، ایسے نیک کاموں کے واسطے ہمارے دفتر کے دروازے ہمیشہ کھلے ہیں سرکار۔! مگر میرا انعام ہر حال مکو بھولو ـ!!" اتنا کہہ کر کم بخت اپنی ہتیلی کھجلاتے لگا اور ہم خون کے گھونٹ پیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ظالم نے پیچھے سے ہانک لگا کر یہ فقرہ ہماری طرف اچھال دیا ـ "غصہ تھوک دیو سرکار آج اگر جیب میں مال نئیں ہے تو کوئی بات نئیں اگلے وقت غریب کے چائے پانی کا ضرور خیال رکھنا، میں بھی آپ کی دوربن" کا خیال رکھوں گا۔"

کم بخت نے دوربین کے حوالے سے آخری چرکا ایسا لگایا کہ گھر پہنچ کر بھی اس کی جلن برابر محسوس ہوتی رہی بلکہ لمحہ بہ لمحہ اس کی شدت میں اضافہ ہوتا رہا۔!

نزدیک سے دیدار سگ یاز کی خاطر جس دوست سے دوربین مستعار لی تھی اس سے تب تک منھ چھپائے پھرتا تھا جب تک کہ دوربین دوبارہ واپس حاصل نہیں کرلیتے، اس دوران میں بازار کا چکر بھی لگا آئے کہ اگر سو پچاس میں نئی دوربین مل گئی تو خرید کر دیدیں گے لیکن جب بازار کی خاک چھانی تو پتہ چلا کہ وہ دوربین تو امپورٹیڈ ہے اور اس کی قیمت ہزار پندرہ سو سے کم نہیں اب ہمارے پیش نظر بس ایک ہی مسئلہ

تھا، لوگ موصوف کو بال تو تسلیم کرتے تھے لیکن کھال کا! اس تعلق سے لوگوں میں اختلاف تھا بہر حال ہماری روداد سن کر چٹکی سے سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے بولے۔ "نو پرابلم آپ ایک کنڈکٹ سرٹی فی کیٹ کی بات کرتے ہیں میں کئی سرٹی فیکٹوں بلکہ ڈپلوماؤں کی بارش کروادوں گا۔ آپ ایسا کیجئے کل دوپہر میں ہوٹل اشلیند میں مجھ سے ملئے، اور ہاں گھر سے کھانا کھاکر مت آیئے کل میں آپ کیساتھ لنچ کروں گا اب جائیے بے فکر ہو کر گھر جائیے نو پرابلم۔!!" موصوف چونکہ سیاسی لوگوں سے ساز باز رکھتے تھے اس لیے گھما پھرا کر بات کرنے کے عادی تھے تب ہی تو اشاروں اشاروں میں واضح کردیا تھا کہ کل کے لنچ، کا صرفہ خرچہ ہمیں ہی اٹھانا ہے۔

!

اگلے روز مسٹر نو پرابلم نے نہ صرف یہ کہ ہمارے صرفے خرچے پر ڈٹ کر لنچ کھایا بلکہ اگلے تین چار روز کے سگریٹ اور پان کے کوٹے کا بھاری بوجھ بھی ہماری ناتواں جیب پر ڈالا پھر کہیں علاقے کے ایم۔ایل۔اے کے دفتر کے درشن کرائے جس وقت ہم وہاں پہنچے بجائے ایم۔ایل۔اے کے ضرورت مندوں کے ایک ریلے نے ہمارا سواگت کیا لیکن بد نصیبی چونکہ پہلی مرتبہ کسی ایم۔ایل۔اے کے دفتر لے گئی تھی اس لیے اپنی ناتجربہ کاری کے نتیجے میں ضرورت مندوں کی اس بھیڑ میں ہماری نظریں ایم۔ایل۔اے مہاشے کو تلاش کرنے لگیں لیکن افسوس نظر کا راؤنڈ کھو کھلی سیپیوں کی اس بھیڑ میں ایم۔ایل۔اے کو مانند موتی ڈھونڈ نکالنے میں ناکام رہا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے بھانت بھانت کی اس بھیڑ میں ہر شخص ہمیں مشکوک و مشتبہ نظر آیا، ہر بندہ کفن چور دکھائی دیا، بالفاظ دیگر ہر شخص زمین دوز (انڈر گراؤنڈ) عرف دو نمبر کے کاروبار کا بے تاج بادشاہ معلوم ہوا۔ ہم مسٹر نو پرابلمؔ کے ہمراہ ایک کونے میں بیٹھ کر اپنی باری کا یا یوں کہیئے ایم۔ایل۔اے مہاشے کی آمد سعید کا اسی طرح انتظار کرنے لگے جیسے پیاسی زمین بارش کے چھینٹوں کی راہ دیکھتی ہے۔!
ایم۔یل۔اے کا دفتر اس وقت اچھی خاصی چوپال کا نقشہ پیش کررہا تھا اور جو بھنبھناہٹ، گفتگو کے نام پر وہاں جاری و ساری تھی، اس سے اگرچہ ہم لاتعلق تھے لیکن انسانی کانوں کو بند کرنے کا چونکہ کوئی سوئچ نہیں ہوتا اور اگر بفرض محال ہوتا بھی اسے آن آف ON- OFF کرنا انسان کے اختیار میں یقیناً نہیں ہوتا چنانچہ ہمارے پھوٹے کانوں میں جو کلمات زبردستی پڑتے رہے وہ بڑے ہی عجیب و غریب بلکہ علامتی اور ابہام آلودہ تھے، بلکہ ہم تو کہتے ہیں گفتگو کے اس بھنبھناتے سلسلے کو ٹیپ رکارڈ پر "رکارڈ" کرکے بعد ازاں تحریری شکل میں کاغذ پر منتقل کرکے اگر اردو کے جدید ماہنامے "شب دیگ" کو بھیج دیا جائے تو سر فہرست افسانوں میں جگہ پاسکتا ہے۔ نمونے کے طور پر چند فقرے پیش ہیں۔

- سمینٹ کا ٹھیکہ ــــ سیٹھ گھاسی مل باسی مل گھاس منڈی والا کو گھاس پھوس کے بھاؤ ــــ
  تو اگر مہربان ہوجائے یہ زمیں آسمان ہوجائے ــــ!!
- شکر کا کوٹہ ــــ سیٹھ دھیلا چند دمڑی لال کے نام ایک دم سستے دام ــــ
  سچ کہا ہے کسی نے جدھر ہری، ادھر چری
- ایران کی کھاد برآمد کرنے کا پرمٹ، ہوم منسٹر کی دھرم پتنی کے بھائی کے نام ــــ سچ ہے
  ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف

● چھ مہینے ہوگئے پکے وعدے کے باوجود زندہ و مردہ چمڑا درآمد کرنے کا لائیسنس جاری نہیں ہوا بیوی بچے ہوا پانی بدلنے کی خاطر سوئیزرلینڈ جانے کو تڑپ رہے ہیں اور بار بار طعنے دے رہے ہیں ـــ
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

● ملاوٹ کی فیکٹری چالو کرنے کا گرین سگنل، منسٹری کی طرف سے مل چکا ہے لیکن متعلقہ آفیسر اڑنگا ڈال رہا ہے سالے کی مٹھی گرم کرتے کرتے تجوری ٹھنڈی ہوگئی، کم بخت نہ تو ڈکار لیوے ہے نہ پٹھے پر ہاتھ رکھنے دیوے ہے، سمجھ میں نہیں آتا سالے کا کیا کیا جاوے ـــ
مار دیا جاوے کہ چھوڑ دیا جاوے ـــ! (جاری)

سید طالب حسین زیدی

جانا ہمارا پاکستان، معیت و مساعدت میں جگندر کی

(پانچویں قسط)

لاہور کی روانگی سے دو روز پہلے فاروق اور زرتاج دلہن* کی پانچویں جمعگی (آخری) اور دلہن کی ہاتھ برتانی کے سلسلے میں دعوت ہوئی۔ "جمعگی" پاکستانیوں اور شمالی ہند والوں کے لئے ایک نئی چیز ہے اور حیدرآبادیوں کے لئے شادی کے بعد ایک "ڈھکوسلہ" خاندان کے قریبی رشتے دار اور دوست ہر جمعہ کو دولہا دلہن اور رشتے داروں کو اپنے گھر بلاکر دعوت کا اہتمام کر کے عروس و عروسہ کو پھولوں کے ہار پہنا کر تحفے تحائف دیتے ہیں۔ پانچویں جمعگی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوتی ہے جو دلہا کے گھر انجام پاتی ہے اس کے بعد دلہن کا دلہنا پا ختم اور چولھا ہانڈی کے کاروبار شروع۔ اسی دن شادی کے بعد پہلی مرتبہ سسرال میں دلہن سے پوریاں بنوا کر پکوان کی ابتداء کروائی جاتی ہے۔ اس رسم کو "دلہن کی ہاتھ برتانی" کہا جاتا ہے۔ آخری جمعگی میں اس وقت بڑی "گت" ہوتی ہے۔

جب دلہا دلہن دونوں پوریاں بیلتے ہیں (دلہا اس لئے کہ آئندہ زندگی کی گاڑی کو دونوں مل کر کھینچیں) سارا سامان دلہن کے مائیکے والے اپنے ساتھ لاتے ہیں، گندھے ہوئے آٹے سے دونوں گرد بیلن سنبھال کر پوریاں بیلنے لگتے ہیں یہ گویا ایک طرح سے مقابلہ ہوتا ہے کہ دیکھیں کون زیادہ پوریاں بناتے ہیں۔ دونوں طرف کی چچازاد، ماموں زاد خالہ زاد بہنیں اپنے اپنے پہلوان کا دل اور ہمت بڑھانے کے لیے ایک دوسرے پر چوٹیں بھی چلتی ہیں۔ دلہن والیاں کہتی ہیں "لگتا ہے دلہا بھائی سخت کام چور ہیں ہماری بہن کو دیکھو کیسے مشین کی طرح ہاتھ چل رہا ہے۔ نازک نار تھک گئی ہوگی۔ ادھر والیاں جواب دیتی ہیں لئی ہاں! ابھی دیکھ لینا مشین کو کیسا زنگ لگتا ہے۔ چلو فاروق ادکھانا ذرا تیزی۔ فاروق بڑا پھرتیلا لڑکا ہے اس نے کہا بھائی! دراصل میں "لیڈیز فرسٹ" کی روایت نہیں توڑنا چاہتا تھا مگر جب بات ایسی ہے تو لو..... پھر اس نے جو بیلن چلایا تو ایک اور دو نہیں بلکہ ایک کے مقابلے میں چار چار پوریاں بیل کر ڈھیر لگا دیا دلہن والے کھسیانے ہوگئے اور کھمبا نوچتے ہوئے بولے ذرا اپنی پوریوں کی شکل تو دیکھنا جیسے سری لنکا کا نقشہ بنایا گیا ہے ادھر ہماری بنو کے ہاتھ کی صفائی دیکھو ذرا سی دیر ہوئی تو کیا ہو خود چندا جیسی ہے اور اس کی بیلی ہوئی پوریاں بھی چاند ہی کی طرح گول..... مخالف پارٹی بولی اجی ہاں، مگر اس نزاکت سے ناشتہ تیار ہونے تک ہمارے بھیا کے دفتر کا وقت نکل جائے گا اور بغیر ناشتے اسے بھاگنا پڑے گا۔ لے بھائی فاروق تو تو گیا کام سے۔ ادھر سے جواب آیا، ایسا ہی منہ اندھیرے اگر دفتر جانا ہے تو اپنے بھیا ہی سے کہو اپنی یہ جغرافیہ کے نقشوں والی پھرتی دکھا کر ناشتہ خود ہی بنالیا کریں

---

* دلہن کا نام مریم ہے مگر حیدرآبادی روایت کے مطابق یہ نام سسرال والوں نے اسے دیا۔

.....دلہا بھائی کے ہاتھ کی پھرتی دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے میاں جی کسی ماہر باورچی کے ہاتھ کے نیچے سے نکلے ہیں.....

اس دھماچوکڑی کے اختتام کے بعد ساس صاحبہ ساری محفل کو چپ کراکر گھر کی چابیاں بہو کے حوالے کرتے ہوئے فرماتی ہیں لو بہو اب سنبھالو اپنا گھر ہم تو کرتے کرتے تھک گئے۔

اب ہمارا آخری "وخت" ہے ذرا اللہ اللہ کر لینے دو۔ ہماری امی جان نے تو تیسرے دن ہی چولھا چوکی پر ہم کو بٹھا دیا تھا تم نے تو پورے پانچ جمعے لگائے ہیں..... آج سے تم ہی اس گھر کی مختار کل ہو۔ یہ سن کر دلہن کے مائکے والیوں میں سے کسی نے دلہن کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی فرمائی!

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

دوسرے دن صبح ناشتے پر شاہینہ (ہماری بھتیجی) نے اپنے گھر ناظم آباد بلایا تھا۔ دسترخوان دیکھ کر حیدرآباد یاد آگیا کھچڑی اور اس کے چار یار "گھی، قیمہ، پاپڑ اور آچار" پراٹھے، آملیٹ، کچی املی کی چٹنی، شاہینہ نے ہم سے کہا چچا میاں! یہ حیدرآبادی ناشتہ میں نے آپ کی خاطر تیار کیا ہے۔ ہم نے پوچھا! تم نے یہ سیکھا کہاں سے؟ بولی! دادی اماں پچھلی دفعہ جب یہاں آئی تھیں تو تین چار روز میرے پاس بھی رہیں اور یہ سب انہوں ہی نے سکھایا ہے اور اب آپ کے داماد ہر دوسرے دن اسی ناشتے کی فرمائش کر دیتے ہیں۔ (جگندر بولا۔ دامادوں کا تو کام ہی فرمائشیں کرنا ہے)

ناشتے کے بعد کٹوروں میں "شیر فرما" تھا اس کو پیتے اور کھاتے ہوئے ہمیں بے تحاشا مخدومی مشتاق احمد یوسفی صاحب یاد آ گئے۔ سوچا چلو، چلتے چلتے آپ کی معلومات میں تھوڑا سا قیمتی اضافہ کیوں نہ کر دیا جائے۔ ایک مقام پر آپ رقم طراز ہیں (چراغ تلے) "ستو اور فالودہ ہی دو ایسی چیزیں ہیں جنہیں اردو محاورے کے مطابق بہ یک وقت کھایا پیا جا سکتا ہے"..... ہنگام مطالعہ خیال آیا تھا یوسفی صاحب کی یہ محدود معلومات حیدرآبادی سے دوری کا نتیجہ ہے۔

لیکن محترم یوسفی صاحب! حیدرآباد سے قریب ہونے کی سہولت آپ کو آج بھی حاصل ہے۔ یوں کریں کبھی پہلی شوال کو حیدرآباد کالونی کی طرف نکل جائیں سامنے سے جو صاحب دوہری گھوگی (پاجامہ) جس کا ریشمی نالا گھٹنوں سے نیچے ٹخنوں کو چھوتی ہوئی مشجر کی پھول دار شیروانی کے نیچے لٹکتا ہوا ہو، پیروں میں فرشی جوتا اور سر پر پھندنے والی فیض کیپ (رومی ٹوپی) جمائے نظر آئیں۔ بس ان کو مارگٹ بلائیے اور چپاک سے نواب صاحب! عید مبارک "کہیے" ۔ وہ مارے خوشی کے پھولنے کے بجائے اپنی شیروانی کے دامن کو برابر کرتے ہوئے دوہرے ہو کر اول تو سات فرشی سلام پیش کریں گے پھر مصافحہ کے بعد بھینچ بھینچ معانقہ کر کے دست بستہ نہایت عاجزیت سے عرض کریں گے۔ تقصیرا (حضور اور "عوالی جاہ" کا حیدرآباد ہم منصب) (تقصیر) سامنے ہی غریب خانہ ہے تھوڑی، زحمت فرما کر "قدم رنجہ" فرمائیں، عطر پان، قبول فرما کر شیر خورمہ (قورمہ) نوش کریں تو باعث عزت افزائی ہوگا......

اب یہ یوسفی صاحب پر منحصر ہے کہ حصول علم کی خاطر خندہ پیشانی سے تقصیر کی درخواست "قبول" فرما کر چلے تقصیر "کہتے ہوئے غریب خانے میں تشریف لے جائیں۔ اپنے دیوان خانے میں بے داغ سفید چاندنی بچھے فرش پر گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا کر وہ عطر اور پان سے پہلے شیر خورمہ پیش کریں گے جس میں دودھ کے ساتھ سویاں، کشمش، چرونجی چھوارا اور پستے بادام کی ہوائی ہوگی۔ اردو محاورے کے عین مطابق آپ کو بہ یک وقت کھانے پینے اور چبانے کا مزا بھ

آئے گا بلکہ ستو، فالودے سے کچھ سوا ہی آئے گا اور پچھتاوے کی ایک لہر دل کو چھوتے ہوئے گزرے گی کہ افسوس ایک عمر گزاری پڑوس میں رہتے ہوئے بھی میر صاحب کی صحبت فیض اثر سے محروم ہی رہے..... ("پڑوس" اس لیے کہ خیابان بدر (اس پتے کو:- چاہیے لکھ رکھیں فلک پر ملک) ڈیفنس اور حیدرآباد کالونی کے درمیان فاصلہ کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں ہے) شیر خرما اور گاجر کا حلوہ یہ دو میٹھے ہی ایسے سریع الحس واقع ہوئے ہیں کہ ان میں گھی منہ سے بولتا ہے۔ کم ذات (گھی) سے ان کا مزا اور مزاج دونوں مکدر ہو جاتے ہیں.....

مسلمانوں نے اپنے دسترخوان پر جتنی توجہ اور توانائی صرف کی ہے اس کا ایک فیصد بھی اگر سائنس اور دیگر متداول علوم پر لگاتے تو آج چاہ نخشب سے "ڈاکٹر" عطا بن مقنع کے قیاسی چاند کو حقیقت کا روپ دے کر مشرقی افق سے طلوع کر رہے ہوتے.....

خدا جھوٹ نہ بلوائے ہم نے جب بھی "الوان نعمت اور شاہی دسترخوان" کا مطالعہ کیا تو لگا، یہ کھانے بنانے کی ترکیبیں نہیں ہیں بلکہ طب یونانی کے مبہی و مقوی نسخوں کا طومار ہیں۔ ایک مقام پر ہم نے دیکھا ماش کی دال "جوہر شاہی اشرفی" سے نکھر رہی تھی.....

یہ ہمارے حکیمانِ یونان کی بڑی گہری سیاست تھی کہ جب ان کی کڑوی کسیلی دواؤں سے بادشاہوں اور رئیسوں کے منہ کا ذائقہ بگڑنے لگا تو انہوں نے ان کو راضی رکھنے کے لیے اپنے کشتوں اور معجونوں کے سارے مفردات حلوؤں، یخنیوں اور یخنیوں میں داخل کر دیئے اور رئیس دسترخوان سے اٹھتے ہی بجائے عدالت کرنے کے سید حاحرم کا رخ اختیار کرنے لگے..... اور انعام بطور شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خان کو اکبر شاہ ثانی نے اپنا مختار کل اور وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ مخفی مباد کہ یہ وزیر اعظم انگریز ریذیڈنٹ فریزر کو خود اکبر شاہ ثانی سے بھی زیادہ پسند آگیا تھا..... نتیجہ معلوم کرنے کے لیے تاریخ ہند دور وسطی کے صفحات موجود ہیں قارئین کرام براہ کرم ہم کو اس قضیے میں نہ الجھائیں کہ ہمارے منہ زور قلم سے کہیں کوئی ایسی ویسی راز کی بات نکل گئی تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی.....

لکھنؤ کے ایک نواب صاحب نے اپنے نئے باورچی سے اس کا امتحان لینے کی خاطر پوچھا، لٹی اچھن میاں! ذرا یہ تو بتاؤ کھانوں میں سب سے اچھی چیز کون سی ہوتی ہے؟" اچھن میاں نے جواب دیا، حضور! کھانے کی چیز تو ایک ہی ہے "قورمہ اور باقی سب رئیسوں کی "مرمزو گیاں" ہیں..... مسلمان موجودہ دور میں اپنے نکبت و افلاس کا بڑا رونا روتے ہیں مگر ان کے دسترخوان سے اٹھتی ہوئی مشکبار خوشبوئیں ان کی تمام شکایتوں کی نفی کرتی ہیں..... آنجہانی چیف منسٹر سنجیوا ریڈی صاحب (بعد میں صدر مملکت) جنہیں مسلمان بڑی ممنوعیت سے اپنی دعوتوں میں مدعو کرنے کو اپنے لیے باعث فخر و مباہات سمجھتے تھے ایک مرتبہ وہ جب ویسی ہی دعوت میں دسترخوان پر بیٹھے تو انواع و اقسام کے کھانوں کی بہتات اور ان سے اٹھتی ہوئی اشتہا انگیز خوشبو پر رال ٹپکاتے ہوئے بولے بھئی ایسے رچ (Rich) کھانوں سے سجے ہوئے دسترخوان کو دیکھ کر یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان مفلوک الحال ہو گئے ہیں.....

ہمارا حیدرآباد اپنے کھانوں کے ذائقے کے باعث عالم گیر شہرت رکھتا ہے، سو، شمالی ہند والے بھی جو حیدرآباد کی ہر بات میں مین میکھ نکالنے کی عادی تھے وہ بھی ان کے کھانوں پر آستینیں چڑھا کر ٹوٹ پڑتے تھے۔ آج بھی کراچی کے دسترخوان اسی حیدرآباد کے جام سے اپنی رونق قائم رکھے ہوئے ہیں.....

ایڈ وینا ماؤنٹ بیٹن پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنے جب بھی ہندوستان کے دورے پر آیا کرتے تھے تو پنڈت نہ جو "اور اور " شوق ہائے رسا خیز اندازہ کے ساتھ ساتھ اچھے کھانوں کے بھی شوقین بھی تھے۔ اسے ہمیشہ ایلورہ اجنتہ کی سیر کروانے حیدر آباد ضرور لاتے۔ عزیز الرحمن صاحب مرحوم اس زمانے میں سرکاری میزبانی کے محکمہ "عامرہ" کے مہتمم تھے اور پنڈت جی کے لئے وہی اپنی نگرانی میں کھانے تیار کرواتے تھے۔ جہاں جہاں وہ جاتے یہ بھی ہم رکاب ہوتے، پنڈت جی ہمیشہ ان سے یہ ضرور پوچھا کرتے، عزیز استاذ ہمیں کیا کھلا رہے ہو؟ بھئی ہم تو حیدر آباد آتے ہی ہیں اچھی اچھی چیزیں کھانے کے لیے.....

ہم یوسفی صاحب سے بجا طور پر اب یہ توقع رکھیں گے کہ وہ "چراغ تلے" کے آئندہ ایڈیشن میں ستو اور فالودے کے ساتھ "شیر خرمے" کا ذکر فرمائیں گے.....

ہمیں تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ حیدر آباد مرحوم کی ساری داستان جو دو سخا اور حکایت بخشش و عطا میں سے لے دے کے "ہندوستانیوں" کو صرف اتنا ہی یاد رہ گیا ہے، حیدر آبادی قمیص کو (خمیص) اور قیمے کو "خیمہ" بولتے ہیں ...... ان بے چاروں کا حلق ق کو خ بنا دیتا ہے سو، یہ ان کی طبیعیاتی مجبوری ہے اب اتنی سی بات کو لے کر شمال اور پاکستان والے ٹیلی وژن کے اسکرینوں پر تک ان کا "مذاق" تو نہ اڑائیں...... ان کی آنکھ کی اس معمولی سے تنکے تو دیکھ لیتے ہیں مگر خود کی آنکھوں میں پڑا ہوا شہتیر نہ پکڑا گیا۔ پیش کو ہٹا کر "زبر" کا لگا دینا احکومت، حکم، حضور اس کے علاوہ سیالکوٹیوں کا "ک"...... میاں علی بکھیں ا ذرا یکہ (حقہ) تو لے آنا اور بلکسریوں کا "نے" "پیچھے" کام آنے والوں" نے "آکر کیا قصے سنانے تھے (بجنگ آمد)۔ "میں نے تو ست رانگ چا پیناواں"......

اتنی نہ بڑھا پاکئی داماں کی حکایت　　　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا "بند قبا" دیکھ

آخر کار کراچی سے رخصت سفر باندھنے کا دن آ ہی گیا جب کا دھڑکا لگا ہوا تھا تین ہفتوں سے زیادہ قیام رہا، ہمارے حق میں ہر دن روز عید اور ہر شب، شب برات تھی، شام پانچ بجے لاہور کے لیے فلائیٹ تھی۔ سارے "اپنے، دور نزدیک کے رشتے دار اور احباب وداع کرنے کے لئے آ رہے تھے۔ ہمارے دونوں دوست ضمیر اور جہانگیر حسین صابر دوپہر ہی سے آ گئے تاکہ ہم کو اپنے ساتھ ایرپورٹ لے چلیں، ہمیں وہ الفاظ نہیں آتے جن کی مدد سے اس وقت اور کیفیت حزن و ملال کی عکاسی کر سکیں جب رخصت ہونے لگے بچے ہم سے لپٹ پڑے اور بڑے سر پر ہاتھ رکھ کر پھر ملنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ گیٹ سے باہر آئے گاڑی میں بیٹھے تو نظریں بے اختیار رخصت کرنے والوں کے چہروں میں جمی ہوئی تھیں اور اس وقت تک جمی رہیں جب تک کہ گاڑی ایک موڑ پر نہ پہنچ گئی اس کے بعد سارا منظر دھندلا گیا۔

رخصت کے واقعات کا اتنا تو ہوش ہے　　　　دیکھا کئے ہم ان کو جہاں تک نظر گئی!!

برسوں بعد بچھڑے ہوؤں سے ملے اور ان کی بے پناہ محبتوں، چاہتوں کی سوغات اپنے ساتھ لے چلے۔ ایرپورٹ آ گیا اور وہ دو لنگوٹیا یار بھی گلے مل کر رخصت ہو گئے جن کا زیادہ تر وقت قیام کے دوران ہمارے ساتھ ہی گزرا.....

کیا رنگ و بو و باد سحر سب ہیں گرم راہ　　　　کیا ہے جو اس چمن میں ہے ایسی چلا چلی

(جاری)

مرزا کھونچ
نیا ٹولہ ۔ بیتیا (بہار)

چمچہ بنانے والے

شاید یہی ہے قسمت کی مار کھانے والے
چمچے بنے ہوئے ہیں چمچہ بنانے والے

سرحد پر لڑنے والوں سے کم نہیں ذرا بھی
لفظوں کی دشمنی پہ گولی چلانے والے

کھانا بنانا جانم ، آتا نہیں تو کیا ہے
تم صاف کردو برتن ، ہم ہیں پکانے والے

بھاڑا بڑھا کر ، کردوں گا دور غربت
بس ووٹ مجھ کو دینا ، رکشہ چلانے والے

سب کو کھلاؤں گا میں چائے کے ساتھ بسکٹ
جو ہیں مری غزل پہ تالی بجانے والے

لڑنے کی بات آئی تو منھ چھپاکے بھاگے
ہر پل بہادری کا قصہ سنانے والے

کرتے نہیں ہیں کوئی بھی کام دفتروں میں
صاحب کے پیچھے پیچھے ہم دم ہلانے والے

پردے کے کام سارے پردے پہ ہورہے ہیں
پردے میں چھپ گئے ہیں پردہ گرانے والے

مرزا نظر کی بجلی اب فیل ہوگئی ہے
جھٹکا نہیں لگے گا آنکھیں لڑانے والے

شبنم کارواری

متفرق

ہچکی کے ساتھ جس کو کبھی یاد کیا تھا
آئی جو ایک چھینک تو اس کو بھلا دیا

☆☆☆☆☆

راضی نہیں ماں باپ مگر ہوگی یہ شادی
سگنل کے نہ ہونے سے ٹرافک نہیں رکتی

☆☆☆☆☆

بے درد کو دماغ سے ہم نے جھٹک دیا
سردی کو گویا ناک سے ہم نے پٹک دیا

☆☆☆☆☆

ملائیں گڑ میں گر املی تو تو گڑ میٹھا نہیں رہتا
پسر بن جائے گھر داماد تو بیٹا نہیں رہتا

☆☆☆☆☆

ابتدائے عقد ہے ہنستا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے بجتا ہے کیا

احسن امام احسن (دھنباد)

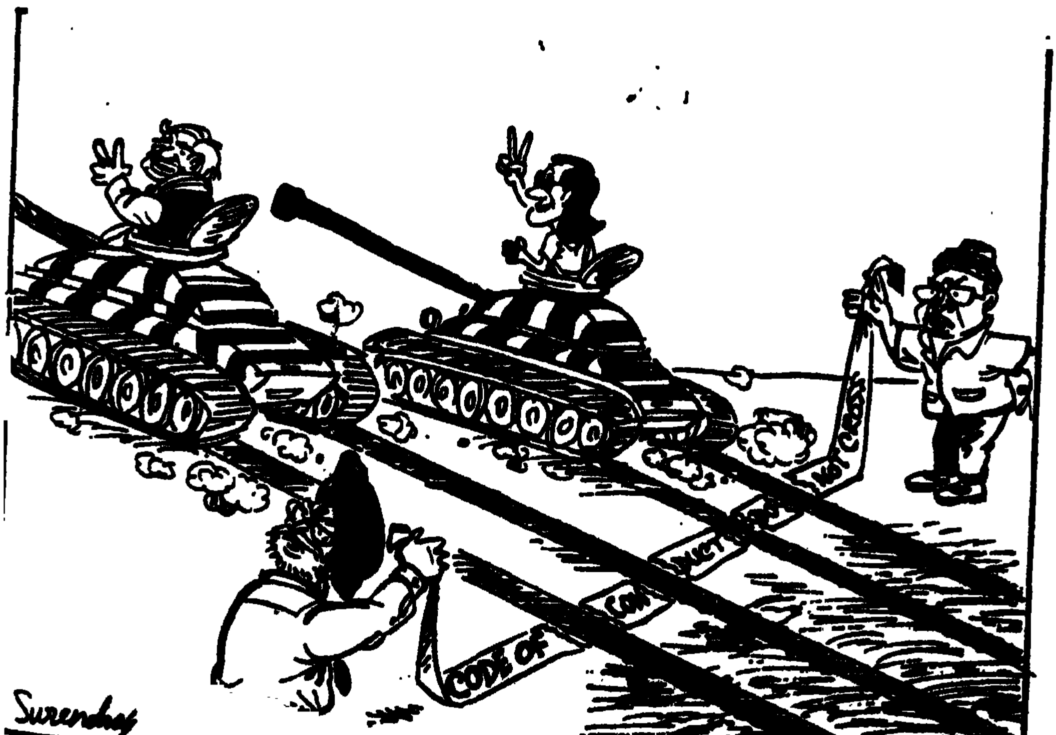
غزل

اس کا دنیا میں بولا بالا ہے
دھن بہت جس کے پاس کالا ہے
عشق کے الوؤں کو پہچانو
تن ہے گورا تو چہرہ کالا ہے
یہ زمانے نے کردیا ثابت
قیس کی بلی اب بھی خالا ہے
ہوگیا ہے ٹرانسفر جن کا
تلخ ان کا ہر اک نوالا ہے
ایک خطہ صفت کے باعث آج
شہر میں ہر طرف اجالا ہے
ایک بیوی تو ہے مگر احسن
کوئی سالی نہ کوئی سالا ہے

اداریہ

نامور افسانہ نگار و طنز نگار عاتق شاہ کو اس شمارے کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا جارہا ہے۔ عاتق شاہ کے رفیق اور قریبی دوست رند سر شار نے عاتق شاہ کی شخصیت اور فن پر ایک دلچسپ اور وقیع مضمون لکھا ہے۔ عاتق شاہ بہ ظاہر ایک کھلی کتاب کیطرح تھے۔ لیکن رند سر شار کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ عاتق شاہ کی شخصیت کے بعض گوشوں سے ہم واقف ہی نہیں تھے۔ عاتق شاہ کے منفرد اسلوب میں لکھے گئے انشائیوں کا ایک مختصر انتخاب بھی زیر نظر شمارہ میں شریک ہے۔ عاتق شاہ نے بے شمار خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان کا اپنے سینیئر رفیق ابراہیم جلیس کے انتقال پر لکھا ہوا خاکہ اس شمارے میں شامل کیا جارہا ہے۔ اس مضمون کے توسط سے حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین کے ابتدائی دور کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ عاتق شاہ آج ہم میں نہیں لیکن ادبی محفلوں میں عاتق شاہ کی کمی کا احساس ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔

○ مدیر شگوفہ کی بائیں آنکھ میں موتیا اتر آیا تھا۔ جس کے آپریشن کی وجہ سے اگست کا یہ شمارہ تاخیر سے شائع ہورہا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ ستمبر کا شمارہ وقت پر شائع ہو۔



زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد ۳۲ شمارہ ۹ حیدرآباد

ستمبر ۱۹۹۹ء

قیمت فی پرچہ: ۱۲ روپے زرِ سالانہ ۱۳۰ روپے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ۲۱ ،ت ـ گوادر ترز، معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد۔ فون: آفس 4745716 رہائش 4576064

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

کمپیوٹر کمپوزنگ: EAN کمپیوٹر سنٹر، چنچل گوڑہ، حیدرآباد، فون نمبر 4529428


مشن تکمیل
آئیے تمام ہندوستانی
چاہے وہ کوئی بھی ہوں
کہیں بھی ہوں
اس ۵۳ ر ویں یوم آزادی پر
عہد کریں کہ وہ
اپنے خاندان ،
اپنے معاشرے
اور سب سے بڑھ کر اپنے ملک کے تئیں
بھرپور انداز میں
اپنا فرض انجام دیں گے.....
۱۵ ر اگست ۱۹۹۹ء

نسیم سحر
جدہ

اعتماد صدیقی۔ ایک گم شدہ انسان

(یہ خاکہ جدہ میں جناب اعتماد صدیقی کی حیدرآباد دکن واپسی سے قبل سجائے جانے والی الوداعی تقریب میں پڑھا گیا)

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں اعتماد صدیقی کا خاکہ لکھوں! کچھ دوستوں نے یہ اطلاع پاکر حیران ہو کر پوچھا: "واقعی لکھو گے؟"

انہیں یقین تھا کہ میں انکار میں جواب دوں گا۔

بات بھی ٹھیک ہے۔ بھلا اعتماد پر خاکہ اب کیوں لکھا جائے؟ خاکہ لکھنے کا وقت تو وہ تھا جب اعتماد صدیقی جدہ کی ادبی محفلوں کی جان تھے، ادبی لحاظ سے بڑے متحرک اور سرگرم تھے اور ان سے مجھے کوئی فائدہ بھی پہنچ سکتا تھا۔ اب تو ان کا یہ حال ہے گویا۔

راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے

اس وقت میں ان پر کچھ نہ لکھ سکا تو بھلا اب کیا لکھوں گا۔ سوائے اس کے کہ وہ میرے قریب ترین دوست ہیں، رفیق کار ہیں ہم مزاج ہیں، میری شاعری کے ہر مصرعے کے اور میری نثری تحریروں کے ہر جملے کے پہلے سامع ہیں اور میں بھی ان کے ہر شعر کا اولین سامع ہوں، مگر خاکہ لکھنے کا وقت تو گزر چکا۔ جس شخص کے پاسپورٹ پر "خروج نہائی (FINAL EXIT)" کی مہر لگ چکی ہو پھر بھلا اس سے کیا لینا دینا، پھر تو آنکھیں ماتھے پر رکھ لینا ہی مناسب رہتا ہے کیونکہ اب کے بچھڑے ہوئے تو شاید کبھی خوابوں میں بھی نہ ملیں۔ خاکہ لکھنے کے لئے تھوڑی سی گنجائش اس صورت میں بھی نکالی جا سکتی تھی اگر وہ پاکستانی ہوتے، تب میری چھٹیوں کے دوران میں وہ وہاں میرے لئے مشاعرے کراتے! مگر وہ تو انڈیا جا رہے ہیں اب بھلا ان پر کیا لکھنا!

میں نے خاکہ لکھنے کی حامی اس لئے بھی نہیں بھری کہ اس صورت میں مجھے اعتراف کرنا پڑتا کہ بیس سال پہلے جب میں جدے آیا تھا اور ادبی حلقوں میں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا تو یہ اعتماد صدیقی ہی تھے جنہوں نے پہلی مرتبہ حلقہ ارباب ذوق کی ایک تقریب میں مجھے مدعو کیا۔ میری پہلی کتاب جدہ آنے سے پہلے ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکی تھی مگر جدہ میں یہ کون جانتا تھا، اعتماد ہی یہاں کی ادبی محفلوں میں میرے داخلے کی چابی ہے۔ اگر میں خاکہ لکھوں اور یہ اعتراف کر لوں تو پھر ان بہت سے ادیبوں شاعروں کا کیا بنے گا جو اعتماد کے ذریعے ہی اپنی ادبی شناخت کروانے میں کامیاب ہونے مگر لب معترض ہیں کہ وہ تو خود بخود شاخ پر اگ آئے تھے! نہ بھئی، مجھ سے خاکہ نہ لکھا جائے گا کیونکہ ان کا خاکہ لکھنے میں مجھے ان

کے ادبی مقام کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایک کم گو مگر اعلیٰ درجہ کے شاعر ہیں، ان کی غزلوں میں فکر کے ساتھ ساتھ رومانیت کی ایک زیریں رو انہیں پرکشش اور مترنم بناتی ہے اور میری شاعری کی حیثیت ان کی شاعری کے مقابلے میں وہی ہے جو بریانی (وہ بھی حیدرآبادی) کے سامنے خشکہ چاول کی ہوتی ہے۔ یہ تسلیم کرنے سے تو میرا اپنا ادبی قد کاٹھ کم ہو جائے گا۔ بھلا میں کیوں ان کا خاکہ لکھوں! بھلا میرا ان کا کیا مقابلہ! میری تو کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، میں ایک ایسے شاعر پر کیوں لکھوں جس کا ابھی تک پہلا مجموعہ بھی شائع نہیں ہوا۔ بلکہ جس کے شائع ہونے کی مستقبل قریب ہی کیا مستقبل بعید میں بھی کوئی امید نہیں! جس انداز میں وہ اپنے ایک ایک مصرعے کو گھستے اور چمکاتے رہتے ہیں اس سے تو آئندہ پچاس سال میں بھی ان کی کتاب شائع ہونے کی کوئی امید نہیں۔ مانا کہ ہر تخلیق کار کی طرح انہوں نے بھی کائنات اکبر کی رعنائیاں اپنی ذات میں اتار کر پھر ان سے ایک کائنات اصغر تخلیق کی ہے مگر اعتماد صدیقی کو دیکھ کر مجھے وہ خوب صورت قالین بننے والا یاد آتا ہے جس نے عمدہ نقش و نگار اور رنگوں سے قالین بنا ہے مگر تاحال اس قالین کا رخ اسی کی طرف ہے اور ناظر کی جانب قالین کا الٹا رخ ہے جس پر رکھے ہوئے رنگین دھاگوں کا ایک ڈھیر ہی دکھائی دیتا ہے۔ چلئے وعدہ رہا کہ جب اس قالین کا رخ میری یعنی ہم سب کی طرف ہو گا میں بھی ان کے فن کے حوالے سے کچھ لکھوں گا۔ فی الحال کچھ لکھنے کا فائدہ اس لئے بھی نہیں کہ پبلک ریلیشننگ کے سلسلے میں اعتماد صدیقی اپنی ذات کے لئے بالکل کمزور ہیں میڈیا سے ان کے تعلقات نہیں ہیں میں نے ان پر کچھ لکھا تو وہ شائع ہی نہیں ہوگا۔ میرے لئے بھی بہتر یہی ہے کہ ان پر لکھنے کی بجائے میڈیا کے کسی آدمی پر لکھوں تاکہ آم کے آم گٹھلیوں کے دام والا حساب ہو جائے۔

اعتماد صدیقی پر کچھ نہ لکھنے کی ایک وجہ اور بھی ہے، موصوف کو کالج کی پروفیسری چھوڑے ایک عرصہ ہو گیا ہے مگر ذہنی پروفیسری یعنی غیر حاضر دماغی ابھی تک زور شور سے جاری ہے۔ ان پر لکھنے کا فائدہ کیا وہ تو بہت جلد بھول جائیں گے کہ میں نے ان پر کوئی احسان کیا ہے اور جواباً انہیں بھی مجھ پر کوئی احسان کرنا چاہیئے! ایسے بھلکڑ شخص پر مجھے کچھ دلچسپ واقعات یاد آگئے، آپ بھی سماعت فرمائیے۔

* رات کے دو بجے میرے ہم سفر نے یکدم ایک چوک کے عین درمیان پہنچ کر کہا۔ "ذرا گاڑی روکئے۔ میں نے کسی نہ کسی طرح گاڑی ایک محفوظ جگہ پر روکی تو وہ حیران پریشان سا چاروں جانب دیکھ کر بولا نسیم بھائی میرا گھر کہاں ہے؟" واضح رہے کہ میں ایک مشاعرے کے اختتام پر انہیں پہلی مرتبہ ان کے گھر ڈراپ کرنے جارہا تھا۔

* خاتون خانہ منتظر تھیں کہ کب شوہر صاحب ہوٹل سے کھانا پیک کروا کر لاتے ہیں مہمان بھی بے چین سے ہو رہے تھے۔ بارے گھر کے باہر ایک ٹیکسی رکنے کی آواز آئی اور پھر دروازے کھلے، بند ہوئے، ٹیکسی کے جانے کی آواز بھی آگئی اور شوہر صاحب بھی آگئے۔ بیگم نے لپک کر دروازہ کھولا تو شوہر کے دونوں ہاتھ سکندر کی طرح خالی پائے معلوم ہوا کہ جلدی میں کھانے کے پارسل تو ٹیکسی میں ہی بھول آئے ہیں!

* وہ صاحب بڑی دیر سے سوچوں میں ڈوبے مسلسل سگرٹ کے کش لگا رہے تھے۔ بار بار ان کا ہاتھ منہ کی طرف جاتا، ایک بھرپور کش لگاتے اور پھر منہ آسمان کی جانب کر کے دھواں چھوڑتے، پھر اگلا کش اور مزید دھواں۔ پھر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے

مگر صاحب دھواں نظر نہیں آرہا تھا، سگرٹ کی راکھ بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی، سگرٹ بھی موجود نہیں تھی۔ صرف وہ صاحب موجود تھے اور سوچوں میں اس قدر گم تھے کہ بغیر سگرٹ کے سگرٹ نوشی کر رہے تھے مکمل التزام کے ساتھ!

تو اب آپ نے کچھ اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ ایک گمشدہ انسان ہیں۔ کئی مرتبہ ہم نے انہیں اپنے ہاں مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی جو قبول ہوئی مگر یہ پہنچ نہیں سکے۔ بعد میں بڑی سادگی سے کہا "نسیم بھائی میں تو بالکل بھول ہی گیا تھا۔ اسی لئے آج ان کے اعزاز میں ہونے والی اس تقریب میں بھی مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں اس میں شریک ہونا بھی نہ بھول جائیں۔ مگر دیوانہ بکار خویش ہشیار! اس بھلکڑ آدمی کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اپنا کوئی شعر آج تک نہیں بھولے۔ اساتذہ کے ہزاروں اشعار یاد ہیں۔ سو یہ آپ نے انہیں مشاعروں میں بیاض کھول کر اپنے شعر سناتے دیکھا ہوگا۔ اس کی وجہ حافظے کی کمزوری نہیں ہے بلکہ ان کی فطرت کا شرمیلا پن ہے جس کے تحت بیاض کو ایک ڈھال کی طرح استعمال کرتے ہیں، ان کے اور سامعین کے درمیان حائل رہنے والی یہ ڈھال کبھی کبھی ان کے اور مائیک کے درمیان بھی حائل ہو جاتی ہے تاکہ ان کے خوب صورت شعر ان کانوں تک نہ پہنچیں جو انہیں پرکھ نہیں سکتے۔ کبھی کبھی اسی جذبے کے تحت مشاعرہ ہی گول کر جاتے ہیں اور سبب پوچھو تو کہتے ہیں کیا کروں نسیم بھائی بس لڑھک گیا تھا۔ یہ لڑھک جانے کا قصہ بھی عجیب ہے کہ کئی مرتبہ یہ بیٹھے بیٹھے سرِ شام لڑھک گئے تو پھر اگلی صبح ہی آنکھ کھلی۔ اس میں ان کی سستی یا کاہلی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اصل میں اعتماد بھائی کو جہاں کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے وہیں بیماریاں بھی اپنے جسمِ ناتواں میں جمع کرتے رہتے ہیں اور بیماریاں بھی کچھ اتنی مختصر اور طویل بحروں کی ہیں اور ان کا چناؤ انہوں نے اس التزام کے ساتھ کیا ہے کہ ہر بیماری دوسری بیماری سے متضاد اور متصادم ہو۔ چنانچہ ایک کا علاج کرتے ہیں تو دوسری کئی بیماریوں میں برکت پیدا ہوتی ہے ایک سے بچنے کے۔ پرہیز کرتے ہیں تو یہ پرہیز دوسری بیماریوں کے ضمن میں بدپرہیزی بن جاتی ہے۔ چنانچہ اب وہ کسی بیماری کے بارے میں پرہیز نہیں کرتے بلکہ علاج بھی نہیں کراتے کہ اب پرہیز اور علاج بھی ان کے لئے خطرناک ثابت ہو چکے ہیں اب ان کا علاج لاعلاجی میں اور ان کا پرہیز بدپرہیزی میں ہے۔ اسی لئے ان کی شخصیت میں مٹھاس بہت زیادہ ہے اور وہ شاعر سے زیادہ شوگر فیکٹری نظر آنے لگے ہیں۔ یہ لڑھکنا اور بھول جانا اسی فیکٹری کی بائی پراڈکٹس ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے ایک اور کمال یہ دکھایا ہے کہ کولسٹرول کو بھی اساتذہ کے کلام کی طرح اپنے لہو میں رچا بسا لیا ہے اور اس بے تحاشا ٹریفک سے ان کی خون کی نالیوں میں CONGESTION پیدا ہو گئی ہے۔ غالب کے تتبع میں یہ لہو کے رگوں میں دوڑتے پھرنے کے تو پہلے ہی قائل نہ تھے، اب ایک تو ان کے بدن میں لہو رہا ہی نہیں کہ اپنا سارا لہو یہ سگرٹ نوشی کے ذریعے دھوئیں میں تبدیل کر کے اڑا چکے ہیں اگر کوئی ایک آدھ قطرہ لہو کا ہے بھی تو اسے ان کی خون کی نالیوں میں آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ملتا۔ شاعر آدمی ہیں اس لئے لہو کی بجائے چائے پر گزارا کر رہے ہیں جس کے بارے میں ان کا نظریہ ہے کہ اچھی پی لی خراب پی لی جیسی بھی ملی شراب پی لی۔ صرف ایک مرتبہ انہوں نے چائے پینے سے انکار کیا تھا۔ جب میرے کمرے میں آئے اور میں نے چائے کی آفر کی تو انہوں نے اپنا سر مشرق سے مغرب تک ہلا دیا۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا، پندرہ منٹ کے بعد پھر پوچھا پھر اسی طرح انکار میں سر ہلا دیا، مزید پندرہ منٹ گزر گئے تو میں نے کہا اعتماد بھائی اب تو چائے پی ہی لیجیے۔ فوراً بولے اتنی دیر سے میں تو یہی کہہ رہا ہوں کہ

ہاں جانے دیں گے۔ اس روز مجھے حیدرآبادی ہاں کے طریقہ کا پتہ چلا۔ ایک اور لفظ کے حیدرآبادی معنی بھی اعتماد صدیقی کے ذریعے ہی پتہ چلے، وہ لفظ ہے "پرسوں" یعنی جو کام کبھی نہ کرنا ہو اس کے لئے یہ لفظ بڑا موزوں ہے اور اعتماد بھائی نے بے شمار کام پرسوں پر ٹال رکھے ہیں۔ اس لئے تو میں نے بھی سوچا ہے کہ اعتماد صدیقی کا خاکہ بھی پرسوں ہی لکھا جائے اخاکہ نہ لکھنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ میں اعتماد صدیقی کو مزید کسی TENSION میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا پہلے ہی وہ دیوانگی کی حد تک اس شوق میں مبتلا ہیں۔ آفس میں جب تک رہے ہمیشہ ٹینشن میں رہے، کوئی ایک کاغذ بھی ہاتھ میں ہو تو یوں دوہرے ہو کر بوجھل قدموں سے چلتے جیسے کسی اوسٹ کا بوجھ لد گیا ہو۔ گھر میں یہ ٹینشن کہ برسوں سے تنہائی کے شب و روز گزارنے پر مجبور ہیں، حالانکہ باقاعدہ شادی شدہ ہیں، بچوں والے ہیں مگر بال بچے حیدرآباد میں ہیں، یہاں یہ لاکھ گنگناتے رہیں کہ کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہاتھ نہیں، مگر یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں، ہجر کی ہر رات کی TENSION ان کے چہرے پر کسی شوقین رنڈوے یا محروم بیوہ کی طرح لکھی رہتی ہے۔ یوں یہ دن رات کسی نہ کسی ٹینشن میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ انہیں ہمیشہ سے بھی زیادہ شدید ٹینشن میں دیکھا سبب پوچھا تو پتہ چلا کہ آج اس بات کی ٹینشن ہے کہ کوئی ٹینشن کیوں نہیں ہے! سگرٹ نوش تو بلا کے تھے۔ جب سگرٹ نوشی ایک سو گیارہویں مرتبہ ترک کر دی اور ایک سو بارہویں مرتبہ شروع نہیں کی تو یہ وجہ ان کی ٹینشن میں اضافے کا باعث بنی، اس ٹینشن میں یہ ٹینشن مزید شامل ہو گئی کہ انہوں نے سگرٹ چھوڑے تو شاعری نے انہیں چھوڑ دیا۔ اب بھی اگر کبھی کبھار روز ابر و شب مہتاب میں کوئی غزل کہہ لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سگرٹ نوشی ترک کرنے سے پہلے وہ آئندہ پچاس ساٹھ سال کے حصے کے سگرٹ بھی پی چکے تھے۔ چنانچہ اسی اسٹاک شدہ پرانے دھوئیں کی مدد سے تازہ بہ تازہ شعر کہہ لیتے ہیں مگر جیسا کہ میں نے کہا روز ابر و شب مہتاب کی شرط ہے سو جدہ میں روز ابر سال میں ایک آدھ مرتبہ ہی دکھائی دیتا ہے اور شب مہتاب دیکھنے کے لئے آنگن یا چھت درکار ہے، جدہ کی فلیٹ زدہ زندگی میں یہ کہاں میسر ہے!

صاحبو، آپ نے میری شکایات کی تفصیل سے میری طرح یہی نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ اعتماد صدیقی پر خاکہ لکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پھر بھی از راہ دوستی سوچا تھا کہ کچھ نہ کچھ لکھ ہی ڈالوں اور کچھ یہ داستاں بھی بیان کر دوں کہ ایک بہترین دوست، ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر کن لوگوں کی وجہ سے اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور ہوا۔

مگر اب اس سب کا کیا فائدہ؟ ان کی خاطر میں دوسروں سے دشمنی کیوں مول لوں؟ وہ تو اب جا رہے ہیں مگر مجھے تو یہیں رہنا ہے!

قلمی معاونین تخلیقات پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیں

اظہر احسن صدیقی
کراچی

ایک گھنٹے میں جوانی کے.....

ہم اور ہمارے دوست احباب آج کل عمر کے جس دور سے گزر رہے ہیں وہ بڑا خطرناک ہے۔ صحیح عمر تو آج کل شاید ہی کوئی بتاتا ہو۔ مگر ہم آپ کو اتنا بتائے دیتے ہیں کہ ہم عمر کے اس حصے سے گزر رہے ہیں کہ جب انسان کا شمار نہ جوانوں میں ہوتا ہے اور نہ بوڑھوں میں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ بڑھاپے کا آغاز ہو چکا ہے مگر دل یہ حقیقت تسلیم کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوتا کہ واقعی ایسا ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں پیش آنے والے چند واقعات ہمارے خیال کی تصدیق کے لئے کافی ہوں گے۔ ابھی کچھ روز کی بات ہے کہ ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے ایک دوست اور ہم عمر ایک دم سے کچھ زیادہ ہی چاق وچوبند رہنے لگے ہیں۔ وہ جو کبھی لباس کے معاملے میں زیادہ محتاط نہیں تھے دیکھا گیا کہ بہت ہی نفاست اور سلیقہ سے کپڑے پہننے لگے ہیں۔ کپڑوں پر استری بھی کچھ زیادہ ہی محنت سے کی جانے لگی ہے۔ جوتے اس قدر چمکتے ہوئے کہ آدمی کو اپنا عکس نظر آجائے۔ پھر خط بھی جو پہلے ہفتہ میں شاید ایک دفعہ بنایا جاتا تھا اب دو تین بار بنایا جانے لگا ہے۔ بال بھی بڑی نفاست سے جمائے جانے لگے ہیں۔ یہ تبدیلیاں ایسی نہ تھیں کہ جن پر حیرت نہ ہوتی یا روز مرہ ملنے جلنے والے حضرات کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کراتیں۔ گو معاملہ ذاتی نوعیت کا تھا مگر کیونکہ دوست احباب میں چہ میگوئیاں ہونی شروع ہو گئی تھیں اور یار دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر مسکرانا بھی شروع کر دیا تھا۔ بلکہ دو ایک منچلوں نے تو دبے الفاظ میں عقد ثانی کی طرف اشارے کنایوں میں پیش قدمی کا ذکر کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس لئے ہم سے مزید صبر نہ ہو سکا اور ہم اس اچانک تبدیلی کی وجہ پوچھ ہی بیٹھے۔ پہلے تو شرما کر خاموش ہو گئے جس سے ہمارے خدشات کو اور تقویت پہنچی۔ مگر پھر بقول شخصے "پبلک کے بے حد اصرار" پر بولے۔ بلکہ ہم سے الٹا سوال کر ڈالا "کیا میں واقعی بوڑھا لگتا ہوں؟" ہم نے جواب دیا۔ "بوڑھے لگیں آپ کے دشمن آخر قصہ کیا ہے یہ آپ ایک دم سے اس قدر اسمارٹ اور تک سک سے درست کیوں رہنے لگے جبکہ ہم نے اتنے عرصے میں آپ کو لباس اور تراش خراش پر اتنی توجہ دیتے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے" کہنے لگے "بات دراصل یہ ہے کہ مجھے یہ لگتا ہے کہ لوگ مجھے بوڑھا سمجھنے لگے ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے میں بس میں سفر کر رہا تھا تو کنڈکٹر بار بار مجھے ہدایت دے رہا تھا کہ چاچا جی آگے بڑھ جاؤ۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ کیا میں اتنا عمر رسیدہ لگتا ہوں" ہم نے فوراً ان کی ہمت بندھائی اور ان کی ہاں میں ہاں ملائی کیونکہ یہ نہ صرف ہمارے بلکہ جیسے بہت سے ہمارے ہم عمروں کے دل کی آواز تھی۔

اپنی عمر چھپانا اور دوسروں کی عمر زیادہ بتانا کہا جاتا ہے کہ عورتوں کی کمزوری ہے مگر آج کل یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مرد حضرات بھی اس سلسلے میں عورتوں کی روایتی کمزوری [illegible] سے کچھ زیادہ پیچھے نہیں ہیں۔ اس عمر میں میاں

بیوی میں صحیح عمر متنازعہ کا ایک محبوب مشغلہ بن جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو بوڑھا ہونے کے طعنے سے نوازا جاتا ہے اور کبھی کبھی ایک دوسرے کو حسب موقع بڑی بی یا بڑے میاں، کے القاب سے سرفراز فرمایا جاتا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست اپنی بیوی سے باہر آنے جانے کے سلسلے میں جھگڑا کر رہے تھے "بڑی بی تم بہت ہی سست اور کاہل ہو گئی ہو ہر جگہ آنے جانے سے گھبراتی ہو اور پھر مجھے اکیلے جانا پڑتا ہے اور پھر دوستوں کے لئے سیدھے سوالات کا جواب بھی دینا پڑتا ہے۔ کوئی پوچھتا ہے کہ کیا لڑائی ہو گئی اور کوئی کہتا ہے کہ تنگ آکر یار روٹھ کر میکے چلی گئی ہے۔ اگر تمہارا یہی حال رہا تو مجھے سچ مچ دوسرا انتظام کرنا پڑے گا" بیوی یہ سن کر خاموشی سے یہ طعنہ سہہ گئیں۔ مگر کیوں کہ وہ بھی کم نہیں تھیں اس لئے جواب کے لئے موقع کی تاک میں رہیں جو جلد ہی انہیں قدرت نے فراہم کر دیا۔ اگلے روز انہوں نے بڑے خوش ہو ہو کر ہمیں اپنے شوہر کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ ہوا یوں کہ شوہر نامدار صبح کو برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ساتھ ہی صبح کے اخبار کا مطالعہ بھی جاری تھا کہ حسب دستور جمعدارنی بھی صفائی کے لئے معہ ایک عدد چھوٹے بچے کے پہنچ گئی۔ جمعدارنی تو اپنے کام میں لگ گئی مگر چھوٹا بچہ بار بار کھیلتا ہوا برآمدے کی طرف چلا جاتا تھا۔ ایک آدھ دفعہ تو میں نے سمجھایا مگر پھر عاجز آکر ڈانٹ پلائی "دیکھ ادھر نہ جا ورنہ پٹائی کر دوں گی۔ دیکھ نہیں رہا کہ ادھر "بڈھا" بیٹھا ناشتہ کر رہا ہے۔ ناراض ہوگا"۔ بیگم کا تو حساب برابر ہو گیا مگر گھر آکر ہمیں کئی دفعہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بار بار اپنے سفید بالوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کالے بالوں کی گھٹتی ہوئی اقلیت کے نیچے چھپانے کی ناکام کوشش کرنی پڑی۔ دراصل انسان کو خود اپنے بڑھاپے کا اتنا احساس نہیں ہوتا جتنا دوسرے لوگ اس کو کراتے رہتے ہیں۔ ہمیں اس مقولے سے قطعی اختلاف ہے اور ہمارے اختلافی نوٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل عمر وہ ہے جو دوسروں کو نظر آئے اور جو وہ سمجھیں۔ ایسا تو بار ہا ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے کہ ہم بڑے شوق سے کرکٹ میچ دیکھ رہے ہیں یا سینما میں بیٹھے ہوئے ہیں اور کوئی ہوٹل کا بیرا یا عوامی زبان میں باہر والا بار بار مخاطب ہو رہا ہو "اے چاچاجی ذرا بوتل پکڑا دینا" یا "بڑے صاحب ذرا پلیٹ آگے بڑھا دینا" اور ہم بڑے اطمینان سے اپنے اطراف میں دیکھ رہے ہیں کہ یہ کس آدمی سے کہہ رہے ہیں اور کس کو آواز دے رہا ہے۔ اکثر اس بات سے ہم بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں کہ چاچاجی اور بڑے صاحب کے القاب سے اور خطاب سے جس کو نوازا جا رہا ہے وہ خود ہماری ہی ذات والا صفات ہے۔ کیا کریں دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں یہ جو کمبخت مانتا ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اس بات کا احساس دن میں دو چار مرتبہ ضرور کرا دیا جاتا ہے۔ ویسے جب اس سلسلے میں دوست احباب سے گفتگو ہوتی ہے تو یہ جان کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ اس انجمن میں ہم تنہا ہی نہیں ہیں۔ یہاں ہمارے راز داں بہت ہیں۔ چند روز پہلے کی بات ہے کہ ہمارے دوست کا ایک لڑکا جوڈو کراٹے میں انعام لے کر آیا اور والد صاحب کے سامنے اپنی مہارت اور لیاقت کے قصے بیان کرنے لگا کہ کس طرح وہ لکڑی کے کئی موٹے موٹے تختوں کو بیک وقت ہاتھ کے ایک اشارے سے ایک ہی وار میں توڑ سکتا ہے اور اسی طرح کے کئی اور کمالات بھی دکھا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے والد صاحب بھی جوانی میں ڈنڈ پیلتے رہتے تھے اور پہلوانی اور کشتی کا شوق رکھتے تھے۔ بزعم خود جوانی میں جسمانی طاقت کا ایک اعلیٰ اور قابل رشک نمونہ تھے ان سے بھلا یہ کیسے برداشت ہوتا۔ چنانچہ باسی کڑہی میں بھی ابال آہی گیا کہنے لگے "یہ کیا کمال ہے یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ لاؤ لکڑی کے تختے۔" وقتی جوش میں موصوف نے یہ بات بالکل فراموش کر دی کہ ان کی جوانی رخصت ہو چکی تھی اور

بڑھاپے نے قویٰ مضمحل کرنے شروع کر دئے تھے ۔ بچے بھی شوق میں فوراً تختے اٹھالائے اور انہیں قاعدے کے مطابق لگا کر رکھ دیا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک بڑا اچھا تلا ہاتھ مارا اور ایک آہ کے ساتھ ہاتھ پکڑ کر رہ گئے ۔ تختے تو خیران سے کیا ٹوٹتے البتہ دو چار ہڈیاں ضرور چٹخ گئیں جن کا عرصہ تک علاج کراتے رہے ۔ بچوں کے سامنے جو سبکی ہوئی اور جو شرمندگی اٹھانی پڑی وہ علحدہ ۔

بزرگی کے معاملے میں ہم کچھ زیادہ ہی خوش قسمت واقع ہوئے ہیں ۔ خاندان میں کچھ اس قسم کی رشتہ داریاں ہیں کہ چچا ماموں وغیرہ تو خیر ہم پیدائشی ہی تھے اور نہایت کم سنی میں رشتہ کے نانا اور دادا بھی بن گئے تھے ۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ماں باپ نے بچپن میں ہی حج کرادیا ۔ جو رہی سہی کسر تھی بزرگی میں وہ حاجی کہلانے نے ختم کر دی ۔ اس لئے جب لوگوں نے سچ مچ ہمیں چچا جی اور بڑے صاحب (ویسے بعض نے بڑے میاں بھی کہا جو ہمیں لکھتے ہوئے شرم آرہی ہے) وغیرہ کے القاب سے نوازنا شروع کیا تو ہمیں قطعی برا نہیں لگا کیونکہ ہمارے کان تو ان رشتوں سے بہت عرصہ سے آشنا تھے ۔ البتہ اصل تکلیف تو اس وقت شروع ہوئی جب خواتین نے سوشل حلقوں میں ہمیں "انکل" کہنا شروع کر دیا ۔ یہ حملہ بڑا غیر متوقع تھا جس کے لئے ہم قطعی طور پر تیار نہیں تھے ۔ ماں باپ کے طفیل بچپن میں فریضہ حج ادا کرنے سے جو بزرگی عطا ہوئی تھی اس نے طرح طرح کے گل کھلائے اور بعض اوقات عجب مضحکہ خیز واقعات اور حالات کو جنم دیا ایک دفعہ ہمارے پڑوس میں کوئی تقریب تھی اور حسب دستور پورے گھر کے سامان فرنیچر اور کراکری پر پڑوسیوں کا قبضہ تھا ۔ اس سامان میں ہمارے کمرے کا سامان بھی شامل تھا ۔ کیونکہ امتحان قریب تھے ہم نے ایک عزیزہ کو بی پڑوسن کی خدمت میں بھیجا کہ کم از کم ایک عدد کرسی واپس کر دیں تاکہ اس پر بیٹھ کر لکھ پڑھ سکیں ۔ حج کی نسبت سے ہم بچپن سے ہی "حاجی میاں" کہلاتے ہیں ۔ ہماری عزیزہ نے جاکر مدعا عرض کیا" حاجی میاں نے سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ ایک عدد کرسی اگر واپس کر دیں تو عنایت ہوگی" لگے ہاتھوں جواب بھی سن لیجئے ۔ مگر اس سے پہلے یہ بتادیں کہ پڑوسن نے ہمیں پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا ۔ فرمانے لگیں ۔ "اے ہے کیا مصیبت ہے ۔ بڑے میاں اگر ایک دن کرسی پر نہیں بیٹھیں گے تو کیا آفت آجائے گی ۔ میرے گھر میں بھی آخر شادی کے مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں" ہماری عزیزہ جب واپس آئیں تو پیٹ دبائے ہوئے ۔ ان کا ہنسی کے مارے برا حال تھا بچپن میں یہ تو بارہا ہوا ہے کہ ہمارے والدین کے پاس مہمان یا رشتہ دار بیٹھے ہیں بات چیت ہو رہی ہے اور اس درمیان میں کسی وجہ سے "حاجی میاں" کی طلبی ہو گئی اور مہمان ہمارے آنے سے پہلے مودب ہونے لگے اور پھر ہمارا سن اور قد و قامت دیکھ کر بڑے حیرت زدہ ہوتے یا پھر اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکے ۔

پچھلے سال کی بات ہے کہ دوسروں کی دیکھا دیکھی ہمیں بھی شوق چرایا کہ تیرنا سیکھا جائے گرمیوں میں اکثر دوست احباب کو ہم دیکھتے ہیں کہ کلب میں تیراکی کے تالاب کے کنارے مع بال بچوں کے بیٹھے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد تالاب میں غوطہ لگاتے ہیں ۔ کبھی اس کنارے سے اس کنارے تک اور کبھی اس کنارے سے اس کنارے تک گویا ادھر ڈوبے ادھر نکلے کی تفسیر بنے ہوئے ہیں ۔ اس شغل میں بچے بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے ۔ ہم ان کو دیکھ دیکھ کر اکثر رشک کرتے تھے ۔ آخر کار بچوں کے غیرت دلانے اور کچھ اپنے دیرینہ شوق کی وجہ سے اس باسی کڑھی میں ابال آہی گیا اور ہم نے بھی سوئمنگ کلا کر پیراکوں میں شامل ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا ۔ دقت یہ آپڑی تھی کہ پانی سے ہمارا کبھی واسطہ

نہیں رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ گیلا اور ٹھنڈا بھی ہوتا ہے اور ہم گرمیوں میں بھی گرم پانی سے نہانے کے عادی ہیں۔ اس امید پر کہ شاید جاڑے کے اصول کے مطابق گرمیوں میں گرم پانی سے نہانے سے شاید ٹھنڈک پہنچتی ہو۔ ہماری اور پانی کی قربت صرف منہ دھونے اور نہانے کی حد تک رہی تھی اور اس قربت میں بھی سردیوں کے موسم میں کافی فاصلے ہوجاتے تھے۔ دقت یہ تھی کہ ہم اپنے دوست احباب پر یہ ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ہمیں تیرنا بالکل نہیں آتا کیونکہ ہم نے ان سے پہلے ہی اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے یہ کہہ دیا تھا کہ ہمیں آج کل مشق نہیں رہی ہے۔ چنانچہ تیرنا سیکھنے کے لئے کلب کے کوچ کی خدمات حاصل کی گئیں مگر ہم ایسے وقت میں سیکھنا چاہتے تھے کہ کوئی ہمیں سیکھتے ہوئے نہ دیکھے اور ہمارا راز افشا نہ ہوجائے اس لیے ہم نے اور ہمارے جیسے دو ایک دوست احباب نے جو محرم راز بھی تھے یہ فیصلہ کیا کہ دوپہر کے وقت سیکھنا شروع کیا جائے۔ یہ وقت وہ ہوتا ہے جب کلب میں سب سے کم لوگ ہوتے ہیں۔ کیونکہ موسم بھی گرمی کا تھا اس لئے اس بات کا کافی امکان تھا کہ لوگ باگ ہمیں سیکھتے ہوئے نہیں دیکھ سکیں گے۔ پہلے ہی دن دوپہر کو ہم تیراکی کے نئے لباس سے لیس ہو کر پہنچ گئے۔ کپڑے بدلنے کے لیے جب آئینے میں اپنا سراپا ملاحظہ کیا تو یقین کرنے کو جی نہیں چاہا کہ یہ ہم ہی ہیں۔ توند پر نظر پڑی تو کافی شرم آئی مگر اپنے کو یقین دلانے کی کافی کوشش کی کہ یہ توند نہیں ہے صرف دوپہر کے کھانے کا ذرا سا اثر ہے جو تھوڑی سے مشق کے بعد جاتا رہے گا۔ استاد مکرم نے اپنے شاگردان رشید کو کافی غور سے دیکھا اور مسکراہٹ چھپانے کی سعی ناکام فرمائی لیکن ہمارے چہروں پر عزم و ہمت کے نشان دیکھ کر خاموش رہے۔ ہماری بد نصیبی کہ ہمارا تجربہ اور ہمارا حلیہ دیکھ کر انہوں نے ابتدائی تعلیم بالغان کے لئے بچوں کا تالاب منتخب کیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ تالاب اس وقت خالی تھا اور ہم بغیر کسی جھجھک کے اللہ کا نام لے کر کود پڑے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس میں پانی کہیں بھی ایک ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا مگر افسوس کہ ہماری خوش قسمتی نے زیادہ دیر تک ہمارا ساتھ نہیں دیا اور تھوڑی دیر میں چند بچے وہاں آگئے۔ پہلے تو شاید انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ یہ اتنے چھوٹے چھوٹے نونہال یہاں کیا کر رہے ہیں مگر جب پھر انہوں نے ہماری طفلانہ حرکتیں دیکھیں اور اپنے تالاب پر قبضہ مخالفانہ پایا تو فقرے بازی پر اتر آئے۔ ایسے ایسے فقرے چست کیے کہ طبیعت صاف ہو گئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہر فقرے میں سارا زور ہماری عمر پر ہوتا تھا۔ مثلاً ایک صاحبزادے نے شرم دلائی "ارے شرم کرو اتنا بڈھا آدمی بچوں کے تالاب میں تیرنا سیکھ رہا ہے"۔ دوسرے نے دعوت مبارزت دی "آؤ ریس لگاتے ہو تیرنے کی"۔ ہم نے فوراً پہلو تہی سے کام لیتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ والد صاحب کو بھیج دیں گے ان سے ریس لگائیں گے۔ اگلے دن اس کام سے توبہ کرلی۔

ہمارے ایک دوست ہیں عمر تو ان کی کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے لیکن دیکھنے میں کچھ زیادہ ہی لگتے ہیں۔ ویسے اب ہم اپنے ساتھیوں اور دوست احباب کی عمریں بھی کم بتانے لگے ہیں تاکہ وہ بھی ہماری عمر بتاتے وقت اس بات کا پاس رکھیں۔ ہمارے یہ دوست ایسے علاقہ میں رہائش پذیر تھے جہاں آس پاس کئی کالج اور کئی درسگاہیں تھیں وہ خود بھی کتنی ہی اعلیٰ ڈگریاں لے چکے تھے اور ان کے ہاں اکثر اساتذہ اور طلبہ کا اجتماع رہتا تھا۔ جو ان کے زمانہ طالب علمی کے تجربات اور مشاہدات سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ موصوف کی اس وقت تک شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور عمر کے معاملے میں کافی زود حس واقع ہوئے تھے۔ انہی دنوں انہیں ایک غیر ملکی تعلیمی ادارے میں سال بھر کے لیے مزید تعلیم کا

وظیفہ ملا۔ کیوں کہ آدمی بہت مقبول تھے اس لیے اس کا کافی چرچہ ہوا اور ایک روز محفل جمی ہوئی تھی اور اس مشہور ادارے کا ذکر ہو رہا تھا جہاں ان کو مزید تعلیم کے لیے جانا تھا کہ ان کے متعدد شاگردوں اور پرستاروں میں سے ایک نے کہیں بے ساختگی میں کہہ دیا "بھائی صاحب اب آپ اس ادھیڑ عمر میں کہاں مزید تعلیم کے لئے جائیں گے" یہ سنتے ہی موصوف چراغ پا ہو گئے اور تن بدن میں آگ لگ گئی اور پھر جو اس غریب پر بے بھاؤ کی پڑی ہیں تو توبہ ہی بھلی۔ پہلے تو انگریزی زبان میں فصاحت اور بلاغت کے دریا بہائے گئے اور پھر جب اس سے بھی تسلی نہیں ہوئی تو پھر اردو کا سہارا لیا سنا ہے ان سے کافی عرصہ تک تعلقات اچھے نہیں رہے اور وہ بھی اپنے کیے پر پشیمان ہوتا رہا۔

دفاتر اور دیگر اداروں میں خواہ وہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری کام کرنے والوں کی عمر کا معاملہ پوشیدہ نہیں ہوتا خاص طور پر ایسے اداروں میں جہاں کام کرنے والوں کے تمام کوائف معہ پیدائش کے چھاپے جاتے ہیں اور تمام دوسرے لوگوں کو بھی معلوم ہوتے ہیں مگر داد دینی چاہیئے ایسے کم عمر لوگوں کو جو پھر بھی ڈنڈی مار جاتے ہیں اور کچھ نہ کچھ حصہ عمر کا مزید چھپا جاتے ہیں۔ تعجب تو شادی شدہ لوگوں پر ہوتا ہے جو اس قسم کی حرکت کرتے ہیں حالانکہ یہ بات جلد ہی سب پر عیاں ہو جاتی ہے مگر پھر بھی بعض حضرات عادات سے مجبور ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی ہیں جو عمر کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہیں اور کیونکہ وہ اس بات سے چڑتے ہیں اس لیے دوست احباب بھی کوئی نہ کوئی موقع ایسا نکال لیتے ہیں جو عمر کا سوال پیدا ہو جائے اور پھر دفتروں میں تو ایسے مواقع آئے دن آتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی کوئی فہرست تیار ہو رہی ہے اور کبھی ترقی کا سوال ہے تو کبھی سینیارٹی کا۔ ایک روز دوست احباب ان کے دفتر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ہوئی کہ چند دوسرے اداروں سے کچھ آسامیوں کے لئے درخواستیں طلب کی گئی ہیں تو ہمارے ہاں سے کس کس نے درخواست دی ہے۔ ہم میں سے اکثر نے درخواست بھیجی ہوئی تھی اس لیے اتفاقاً ہم بھی ان سے پوچھ بیٹھے کہ کیا آپ نے بھی درخواست بھیج دی ہے۔ انہوں نے "ہوں" کہہ کر ٹال دیا۔ ہم نے بھی اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جب چائے پی کر سب چلنے لگے تو ہمیں قریب بلایا اور ایک ہاتھ سے پردہ کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ایک کاغذ کے پرزے پر پنسل سے تحریر کیا "میری عمر ۳۵ سال سے زیادہ ہے"۔ واضح رہے کہ ان جگہوں کے لیے عمر کی حد ۳۵ سال تھی۔ ہمیں ان کی حماقت پر بڑے زور کی ہنسی آئی اور ہم نے وہیں پر ان کی عمر کا اعلان کر دیا جس پر وہ بہت ناراض ہوئے حالانکہ ہم نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ وہاں جتنے بھی حضرات بیٹھے ہیں سب کا تعلق اسی دفتر سے تھا اور یہ بات سب کو معلوم بھی تھی۔ ہمارے ان ہی دوست نے جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا شادی کے وقت تو بالکل حد ہی کر دی۔ اول تو وہ اپنی اس عمر کے باوجود پورے دولہا بنے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ دولہا کے تمام لوازمات سہرا پگڑی وغیرہ سے آراستہ ہوئے اور پھر اس سج دھج سے بارات روانہ ہوئی کہ صرف رانوں کے درمیان گھوڑے اور پہلو میں تلوار کی کسر رہ گئی تھی۔ دوست احباب نے بھی انہیں تماشا بنا کر اپنے ارمان خوب نکالے اور اگلے پچھلے تمام بدلے چکا دیئے۔ وہ اس حلیہ میں اس قدر آرام اور سکون سے مسند پر بیٹھے تھے کہ یار لوگوں کو پریشانی لاحق ہونے لگی تھی کہ کہیں کوئی غیر معمولی حرکت ان سے سرزد نہ ہو جائے۔ خدا خدا کر کے قاضی صاحب تشریف لائے اور فارم وغیرہ بھرنے لگے۔ پھر نکاح شروع ہوا اور حسب دستور قاضی صاحب نے دولہا کا نام اور والد صاحب کا نام پوچھا۔ اب یہ قاضی صاحب کی بدنصیبی تھی یا دوست احباب کی شرارت کہ قاضی صاحب دولہا سے ان

کی عمر بھی پوچھ بیٹھے ۔ بس ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ رنگ تو پہلے ہی سانولا تھا غصے سے بالکل کالا ہو گیا ۔ کیسا سہرا اور کیسا کسی کا لحاظ ایک دم پھٹ پڑے "عمر کیوں پوچھتا ہے نکاح پڑھاؤ" ۔ قاضی صاحب نے جو دولہا کو ایک دم اس طرح بے تکلف ہوتے دیکھا تو سٹپٹا گئے ۔ دونوں طرف کے بزرگوں نے مل کر معاملہ رفع دفع کیا ورنہ موصوف تو اس سوال پر اڑ کر چل دینے کے موڈ میں تھے ۔ ویسے اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے جب تک یہاں رہے دوست احباب کے لیے ہنسی اور دلچسپی کا سامان مہیا کرتے رہے ۔

اکثر مرد حضرات کو ہم نے دیکھا ہے کہ جوانی میں عطر سینٹ اور پوڈر کے علاوہ میک اپ کے سامان سے مبرا رہتے ہیں ۔ مگر جب عمر جوانی کی حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو پھر بیگم کی طرح ان کی سنگھار میز پر بھی سنگھار کی اشیاء کی تعداد بڑھنے لگتی ہے جن میں خضاب، مہندی وغیرہ شامل ہوتے ہیں ۔ شروع شروع میں تو سفید بالوں کے سلسلہ میں موچنے سے کام چلایا جاتا ہے مگر جب بھنوؤں میں سفید بالوں کی تعداد کالوں سے زیادہ ہو جاتی ہے تو پھر مجبوراً خضاب کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ اسی طرح جب بالوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے معدوم ہو جاتی ہے تو پھر "یا وگ تیرا ہی آسرا ہے" کا ورد کرنا پڑتا ہے ۔ وگ کے استعمال میں بھی یار لوگ بڑی فیاضی سے کام لیتے ہیں ۔ وگ بھی ایسی استعمال کریں گے جس کو لگا کر جوان سے بھی زیادہ نوجوان لگیں ۔ اور پھر اس کے ساتھ کپڑے بھی نہ صرف چست پہنیں گے بلکہ رنگوں کے استعمال میں بھی زیادہ توجہ شوخ رنگوں کی طرف ہوگی ۔ پتلون ایسی چست پہنیں گے کہ معلوم ہوگا پہن کر دوبارہ سلوائی گئی ہے ۔ جہاں کسی تقریب میں جانا ہوگا تو بجائے اپنے ہم عمروں کے جوانوں میں بیٹھنا زیادہ پسند کریں گے اور اس سلسلے میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص روا نہیں رکھتے بلکہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو جائیں ۔ اور اگر اللہ توفیق دے جو کہ انسان کے بس کا کام نہیں تو اپنے آپ کو جوان کہلوانے اور جوان رکھنے کے لیے کسی نوجوان خاتون سے شادی کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا سارا وجود زبان حال سے اس شعر کی تفسیر بنا ہوا ہے ۔

ضعف و ناطاقتی اعضاء ہر دم
ایک گھٹنے میں جوانی ہے بڑھا کیا کیا کچھ

محمد شاہد عظیم
حیدرآباد

پڑیئے گر بیمار...

لیجئے صاحب بالآخر ہم بھی بیمار بن گئے دکھاوے کے لئے نہیں بلکہ حقیقی معنی میں۔ ہماری بیگم صاحبہ کی عرصہ سے بڑی آرزو تھی کہ ہم کچھ دنوں کے لئے ہی بیمار ہوجائیں تاکہ وہ اردو ناولوں اور ہندی فلموں کی ہیروئنوں کی طرح جی جان سے ہماری تیمارداری کر سکیں اور خود کو ایک مثالی بیوی ثابت کر سکیں۔ لوگ دعا کرتے ہیں کہ خدا ان کے دشمن کو بھی بیمار نہ ڈالے لیکن ایک ہماری بیگم صاحبہ ہیں کہ اپنے خداوند مجازی کی بیماری کی دعا مانگتی ہیں اور اسی آرزو میں جئے جارہی ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں دو تین بار نزلہ بخار اور کھانسی میں مبتلا ہوچکے ہیں لیکن اسے کیا کہا جائے کہ بیگم سرے سے انھیں بیماریاں ہی نہیں مانتی۔ ان بیماریوں میں زیادہ سے زیادہ محلہ کے قریبی ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا ہے جو رنگین ہری پیلی گولیوں سے بھلا چنگا کر دیتے ہیں۔ ہم نے مرزا اور ان کی بیوی کو اکثر مختلف اسپتالوں کے چکر کاٹتے دیکھا تھا۔ مرزا کا تعلق چونکہ محکمہ صحت و طبابت سے ہے اس لئے ہم عرصہ تک یہ سمجھتے رہے کہ اسپتالوں کے دورے شاید ان کی ڈیوٹی میں شامل ہیں لیکن شوہر کے دوروں سے بیوی کا تعلق ہماری سمجھ میں نہیں آسکا۔ ہمیں یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ مختلف اسپتالوں میں وقفہ وقفہ سے کبھی طویل یا مختصر قیام کے بعد ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئے کہ مرزا نے دراصل اسپتالوں کو اپنا دوسرا گھر بنایا ہے جہاں تبدیلی آب و ہوا کے لئے آتے جاتے ہیں مرزا اپنے دوستوں میں ہمیشہ اپنی بیوی کا ڈھنڈورا پیٹتے اور یہ کہتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے کہ ان کی بیوی جس جی جان سے ان کی تیمارداری کرتی ہے ویسی شاید ہی کوئی دوسری کرتی ہوگی۔ دراصل مرزا اور ان کی بیوی کے ان دوروں نے ہماری بیگم کے دل میں یہ مریضانہ خواہش پیدا کر دی تھی کہ ہم بھی بیمار ہوجائیں۔ مرزا سے ہماری دوستی ۲۵ سال پرانی ہے لیکن ہمیں آج تک یہ نہیں معلوم کہ آخر انھیں کونسی بیماری ہے۔ مرزا جب بھی ملتے مسمی صورت بنا کر کہتے "بیمار ہوں" اور بیماریوں کے مختلف نام بتاتے ان میں سے بعض بیماریوں کے نام ایسے تھے جو ہم نے کبھی نہیں سنے تھے بلکہ میڈیکل ڈکشنریوں میں بھی یہ نام نہیں ہوں گے۔ جس طرح خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں اور اتارے گئے صحیفوں پر ایمان لانے کی ہدایت دی گئی ہے اسی طرح ہم مرزا کی بیماریوں پر یقین بلکہ ایمان رکھتے ہیں۔ خیر مرزا کی بیماریوں کے ذکر کو ہم آئندہ کے لئے چھوڑتے ہیں اور اپنی بیماری کی طرف آتے ہیں۔

بیگم صاحبہ کے ارمانوں کو دیکھ کر ہم نے سوچا کہ کچھ دنوں کے لئے بیمار پڑجانے میں کیا ہرج ہے۔ ان کی خوشی کے لئے ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے ہمیں بیمار ہونے کا چونکہ کوئی سابقہ تجربہ نہیں تھا اس لئے ڈر رہے تھے کہ ہم شاید بیگم صاحبہ کے ارمان پورے نہ کر سکیں جو پہلے ہی آنسوؤں میں بہہ گئے ہیں لیکن جب انسان ٹھان لے تو کیا نہیں ہوسکتا

بہت دنوں تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا آخر کس طرح بیمار بنیں ۔ بیماری کی رخصت کی درخواستیں لکھنا اور استفادہ کرنا علیحدہ بات ہے ۔ ہماری ایک داڑھ گر گئی تو ہم نے حسب عادت کوئی توجہ نہیں دی ، آج کے مسائلی دور میں داڑھوں ، دانتوں کے گرنے کی کون فکر کرتا ہے جو ہم کرتے ۔ ہم نے ایک دن محسوس کیا کہ داڑھ کی خالی جگہ تھوڑا سا گوشت اگ آیا ہے ۔ بے ضرر سا گوشت جس سے کھانے پینے یا بولنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہم نے جو موقع دیا تو یہ گوشت پھیل گیا ۔ کچھ دنوں بعد ایک اور داڑھ ہلنے لگا ایسا ہلا کہ خود ہم بھی ہل گئے بلکہ دہل گئے ۔ ایک صبح جب جاگے تو ایک گال پھولا ہوا تھا دوسرے دن ایک گٹھلی نے سر ابھارا اب ہمارا ماتھا ٹھنکا ۔ دوڑے دوڑے ایک ڈنٹل سرجن کے پاس پہنچے جو ایک سو روپے فی دانت کے ٹھوک حساب سے دانت نکالتا تھا ۔ ہمیں دیکھ کر خوشی سے ڈاکٹر کی باچھیں کھل گئیں (کیونکہ ہمارے منہ میں ابھی کافی دانت ہیں) امکانی مستقل گاہک کو یعنی ہمیں فوراً ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ایک عجیب و غریب کرسی پر لٹا دیا گیا ۔ عجیب و غریب اس لئے کہ ایسی ٹیڑھی میڑھی کرسی ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی ڈاکٹر صاحب نے جب ہمارا منہ کھلوایا تو ان کی زبان سے فوراً یہ نکلا "ارے آپ یہ کیا کر لئے" ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم سے کونسی غلطی سرزد ہو گئی ۔ ہم نے بمشکل اپنی تکلیف اور آنے کا مقصد مختصر لفظوں میں بیان کیا کیونکہ ہم باہر مریضوں کی بھیڑ دیکھ چکے تھے بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ مستقل مریض ہیں یعنی کلینک کے لئے ان کی بااجرت ہمہ وقتی خدمات حاصل کی گئی ہیں تاکہ کلینک آباد دکھائی دے اور نئے آنے والے بھیڑ دیکھ کر ڈاکٹر کی مصروفیت و مقبولیت کا اندازہ کر کے ادھر ہی کھنچے چلے آئیں ۔ ڈاکٹر نے ایک ٹارچ کی مدد سے منہ میں روشنی ڈالی اور ایک آلہ سے دانتوں کو ٹھوک بجا کر دیکھا تو ہماری ہمت بندھی ۔ ہم نے اپنی پریشانی کے بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر صاحب نے ہنکار بھرا "ہوں" ۔ ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کے بعد شہر کے ایک بڑے دواخانہ کو جانے کی ہدایت دی ہم ناشاد و نامراد باہر نکلے تو ملازم نے ۵۰ روپے فیس دینے کا مطالبہ کیا ۔ ایک لمحہ کے لئے ہمیں شدید غصہ آگیا ایک عجیب و غریب کرسی پر لٹانے ، منہ کھول کر دانتوں کو کھٹکھٹانے اور بڑے ہسپتال جانے کا مشورہ دینے کے لئے جس میں بمشکل ۵ منٹ لگے ہوں گے ۵۰ روپے مانگنا سچ کھٹکتا ہے ۔ ہم نے ملازم کو ۵۰ روپے تھما کر فوری سیڑھیاں اتر جانے میں عافیت سمجھی ۔

بڑے دواخانہ میں بیگم صاحبہ کی ایک سہیلی مل گئیں ہمیں اس پر مسرت ہوئی بلکہ ہمارا سینہ فخر سے پھول گیا کہ بیگم صاحبہ کی سہیلیوں کا حلقہ کتنا وسیع ہے جہاں بھی جائیں کوئی نہ کوئی مل جاتی ہے ۔ ہمیں ایک بنچ پر جس پر اور بھی مریض اپنی باری کے منتظر تھے بٹھا دیا گیا بیگم صاحبہ ادھر ادھر منڈلاتی اور مختلف کمروں میں جھانکتی رہیں ان کی سہیلی ہمیں فوری بڑی ڈاکٹرنی سے ملانے کا وعدہ کر کے ایسی غائب ہوئی کہ کچھ مت پوچھئے ۔ انتظار کی گھڑیاں ہیں کہ گزر نہیں رہی تھیں ۔ بہر حال نصف گھنٹہ بعد وہ برآمد ہوئیں اور ان کی قیادت میں ہم بڑی ڈاکٹرنی کے سامنے پیش ہوئے ۔ اس دواخانہ میں مرد مریضوں کو صرف خاتون ڈاکٹر اور خواتین کو مرد ڈاکٹر دیکھتے ہیں نہیں معلوم اس میں کیا بھید یا بہتر علاج کا کونسا طبی پہلو مضمر ہے ۔ ڈاکٹرنی صاحبہ اپنے مجسم اور بھولی بھالی صورت کے باعث رامائن کی کوئی دیوی دکھائی دے رہی تھیں ایک رجسٹر کے مطالعہ میں غرق لیڈی ڈاکٹر نے ایک نظر ہمیں دیکھا پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئیں پھر انھوں نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں ۴، ۵ ہاؤز سرجن گھیرے ہوئے تھے اس وقت ہم اس قدر حواس باختہ

تھے کہ ان ڈاکٹروں پر ہماری نظر ہی نہیں پڑی تھی۔ خیر ایک ڈاکٹر نے ہمیں اس عجیب و غریب کرسی پر جس سے پہلے بھی
الا پڑ چکا تھا لٹا دیا۔ اس کے بعد ہم پر جو بیتی کچھ مت پوچھئے بس یوں سمجھئے کہ بیتی ہی چلی گئی۔ ڈاکٹروں نے مختلف
والات کئے اس ہمہ لسانی پنچ کے سوالات کے جوابات دیتے دیتے ہمارا صبر جاتا رہا۔ تمام سوالات نہایت بے تکے مہمل
ور بڑی حد تک نامعقول تھے جن کا ہماری موجودہ بیماری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تمام ڈاکٹروں کا ایک مشترکہ سوال
تھا کہ آپ نے ایسی بھیانک غلطی کیوں کی اور پہلے ہی ہسپتال کیوں نہیں آئے۔ ان احمقوں کو کون سمجھاتا کہ کہیں
بیماری بھی پوچھ کر آتی ہے ہم اگر ایسی بھیانک غلطیاں نہ کریں یعنی بیماریاں نہ پالیں تو ڈاکٹروں کو کون پوچھے گا ان
کی روٹی اور روزگار کیسے چلیں گے۔ ان لوگوں نے اچانک جرح ختم کر دی ہم نے بھی چین کی سانس لی کہ چلو جان چھوٹی
ہم کرسی سے اٹھ گئے تو ایک ڈاکٹر نے اس کے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے سوچا کہ یہ لوگ مرض کی جڑ تک پہنچ گئے
ہیں دوسرے کمرے میں لے جا کر دوا دی جائے گی۔ ہم ایک طویل ورانڈے سے گزر کر جو کسی طرح ختم نہیں ہوتا تھا
ایک اور کمرہ میں پہنچے ہمیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے صبر و تحمل کا اصلی امتحان تو اب شروع ہونے والا ہے ایک
سنسان اور ویران سے کمرہ میں لے جا کر ہمیں ایک نوجوان ڈاکٹر کے حوالے کر دیا گیا اس کمرہ میں بھی وہی عجیب و غریب
کرسی ہماری منتظر تھی۔ ہمیں بہ خوبی معلوم تھا کہ اب کیا کرنا ہے اس لئے ڈاکٹر کے کہنے سے قبل خود ہی آرام سے لیٹ
گئے پھر ایک مرتبہ سوالات کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم سوال و جواب کے اس سیشن سے نہ صرف
اکتا گئے تھے بلکہ اعصاب شکن سوالات نے ہمیں جھنجھلا دیا تھا ڈاکٹر نے ایک لمبی چوڑی ڈائری نکالی اور پہلا سوال داغا ہمیں
نے دیکھا کہ ڈاکٹر تمام جوابات نوٹ کرتا جا رہا ہے، یہ سوالات بھی نہایت بے ہودہ قسم کے تھے ڈاکٹر نے جب یہ پوچھا
کہ کیا آپ کبھی شراب پیتے تھے، تو ہمیں شدید غصہ آگیا۔ خدا گواہ ہے کہ ہم نے ساری عمر صرف پانی، چائے یا کافی کے سوا
کچھ نہیں پیا صبر کے گھونٹ پینا ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ سگریٹ نوشی اور شراب نوشی کے بارے میں سوالات نہیں تھے
بلکہ بہتان تراشی تھی۔ ہم ابھی اس صدمہ سے سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ ڈاکٹر نے ایک اور سوال داغا کیا کبھی آپ کو
کوئی جنسی بیماری تھی۔ ڈاکٹر برابر اشتعال دلا رہا تھا اور ہمارے پاس صبر کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہمیں
گمان گزرا کہ یہ ڈاکٹر جو ہمارے کسی نادیدہ دشمن کا آلہ کار ہے ناکردہ گناہوں کا زبردستی اعتراف کرا کے اسے اخبار
انجام میں چھپوانے کا ارادہ رکھتا ہے ہمیں ڈاکٹر کی عقل سلیم پر رونا آیا کہ کمبخت کو یہ تک نہیں معلوم کہ گناہ کرنے کے
لئے جرات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہم میں کبھی بھی نہیں رہی۔

ہم نے گھڑی پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ جرح نصف گھنٹہ طویل ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر کی دلچسپی انہماک اور نوٹ لینے کی
رفتار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جلد گلو خلاصی ملنا مشکل ہے اس اثناء میں ایک ڈاکٹر نے کھڑکی سے اندر جھانکا۔ شاید
ہسپتال کے تمام ڈاکٹر آج ہمارا انٹرویو لینے پر تل گئے تھے اس وقت ہم جس اذیت اور ذہنی کرب سے گزر رہے تھے اس
کا صرف ہمیں ہی اندازہ تھا۔ ہمیں اس کمرہ میں کم و بیش ۴۵ منٹ قیام کے دوران اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر کس قدر معروف
رہتے ہیں۔ ڈاکٹر نے جو ہمارا انٹرویو لے رہا تھا کئی فائلوں پر دستخط کئے دو تین ماتحتوں کو بلا کر کوئی ہدایت دی ایک آیا
سے جو اتفاقاً یا عمداً اندر آگئی تھی مسکرا کر بات چیت کی فون پر کسی کو شام میں ملاقات کا وقت دیا ڈاکٹر جس تیزی سے
اپنے فرائض انجام دے رہا تھا اسے دیکھ کر ہم کچھ دیر کے لئے اپنا مرض بھول گئے۔ ہمیں اچانک یہ خیال آیا کہ اس کمبخت

کا تعلق کسی اشاعتی ادارہ سے ضرور ہے اور وہ یہ نوٹ مکمل کر کے کوئی ناول چھپوانے کا ارادہ رکھتا ہے وہ تو اچھا ہوا کہ بیگم صاحبہ جو ہمارے ڈیڑھ گھنٹہ سے مفقود الخبر ہوجانے کے باعث پریشان ہو گئی تھیں ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے کسی فرشتہ کی طرح وہاں پہنچ گئیں۔ بیگم کا اس طرح اچانک چلے آنا ہمارے حق میں بہتر ثابت ہوا کیونکہ ڈاکٹر کے جان لیوا سوالات سے نجات مل گئی۔ ڈاکٹر کے مہمل سوالات سے جن کی ایک دو مثالیں ہم اوپر پیش کر چکے ہیں ہمیں نہ جانے کیوں یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہماری بیماری سے نہیں بلکہ ان سوالات سے موت یقینی ہے۔ ہم تھکے ماندے سوالات کی بوچھار سے لہولہان کمرے سے باہر آئے تو معلوم ہوا کہ اب ڈیوٹی ڈاکٹر سے ملنا ہے یہ سوچ کر نہ جانے یہ مرحلہ کس قدر پر خطر ہوگا ہماری روح تک لرز گئی۔

ہمیں ایک اور ڈاکٹر کے سامنے بٹھا دیا گیا سابقہ تجربہ کی روشنی میں اس مرتبہ ہم خود شروع ہوگئے یعنی جلدی جلدی اپنے کوائف بیان کئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی مہابھارت کا کوئی کردار دکھائی دے رہے تھے۔ اول تو ان کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں جو ڈاکٹری کے پیشہ سے قطعی میل نہیں کھاتی تھیں۔ اوپر سے خوب موٹے تازے چہرہ پر چربی کی نہ جانے کتنی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ مجھے یہ راون کے بھائی کمبھ کرن دکھائی دئے۔ کمبھ کرن ۶ مہینے سوتا اور ۶ مہینے جاگتا تھا ہمیں کمبھ کرن کا خیال اس لئے آیا کہ ہم جب وہاں پہنچے تو یہ صاحب جھپکی لے کر ترو تازہ ہو چکے تھے جو ڈاکٹر ہمیں وہاں لے گیا تھا اس نے مختصر لفظوں میں بتایا کہ وہ معائنہ کر چکے ہیں ڈیوٹی آفیسر صاحب چونکہ اب تک گویا نہیں ہوئے اس لئے ہمیں خیال ہوا کہ گونگے ہوں گے ساتھ ہی مسرت بھی ہوئی کہ جسمانی معذورین کے کوٹہ میں اب ڈاکٹر بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ جس ڈاکٹر کے ساتھ میں آیا تھا اس نے ایک رجسٹر میری طرف سرکاتے ہوئے کہا کہ اس پر دستخط کر دیجیے ہم ابھی اپنا قلم ٹٹول رہے تھے کہ جونیر ڈاکٹر نے سامنے میز پر پڑا ہوا قلم ہمارے ہاتھ میں تھما دیا ہم نے دستخط کرنے کی کوشش کی پین کو دو تین بار جھٹکا اب کو ایک کاغذ پر گھسا شاید سیاہی خشک ہو گئی تھی اس مرحلہ پر کمبھ کرن متبسم ہوئے اور فرمایا الق جناب چار دن سے قلم نکالا ہی نہیں شاید سیاہی ختم ہو گئی۔ میں جس ڈاکٹر کے ساتھ آیا تھا اس نے ایک چٹھی پر جلدی جلدی لکھ کر ہمیں تھما دی۔ ڈیڑھ گھنٹے تک ڈاکٹروں کے نامعقول سوالات بھگتنے کے بعد ہمیں ایک اور اسپتال جانے کا مشورہ دیا گیا!....

اردو نامہ

ظفر کمالی (سیوان)

نہیں پڑھتے کبھی اخبار اردو — بنے ہیں قافلہ سالار اردو
گھروں سے جن کے رخصت ہو رہی ہے — خطاب ان کو ملا معمار اردو
اُرد کی جمع جو اردو کو سمجھیں — انہیں کے ہاتھ ہے پتوار اردو
مجاہد ہیں ذرا پوچھو ہوا میں — چلے گی کب تلک تلوار اردو
سمٹتے جا رہے ہیں پڑھنے والے — مگر پھیلا ہے کاروبار اردو
کہیں ہے جشن کا ہنگامہ برپا — کہیں ہے شور سے می نار اردو
کتب خانے ہیں قاری کو ترستے — سجا ہے ہر طرف دربار اردو
کرم ہے یا ستم وہ ناگری میں — کرائیں گے ہمیں دیدار اردو
یہ دیواروں پہ رومن میں لکھا ہے — بنے گی جلد ہی سرکار اردو
"مرے بچے نہیں اردو سے واقف" — یہ بولے فخریہ سردار اردو
ستم کے واسطے ہے جان اس کی — طمانچے کے لیے رخسار اردو
سمجھتے ہیں کبھی فٹ بال اس کو — وہ جس کا نام ہے دستار اردو
سدا انکار کے پردے میں دیکھا — یہاں ہوتے ہوئے اقرار اردو
اسے دینے چلے ہیں غسل صحت — مرا جاتا ہے جو بیمار اردو
بہکتے ہیں ہمیشہ بن پیے ہی — بڑے بھولے ہیں یہ میخوار اردو
ابھی فرصت نہیں خدمت سے اپنی — کریں کیا اور خدمت گار اردو
مجاور مقبرے کے ہم بنیں گے — بنے گا اس پہ جب مینار اردو
حکومت کے چڑھاوے کی رقم سے — منایا جائے گا تہوار اردو
گدائی میں ہی اب نکلا کرے گی — نظر آتے ہیں یہ آثار اردو
دھماکے کی صدا آئی کدھر سے — گری کیا پھر کہیں دیوار اردو
کتابوں کی اشاعت تیز تر ہے — رہے گی ست ہی رفتار اردو
ضرورت سے زیادہ ہو رہا ہے — عرب میں آج کل پرچار اردو
عقیقے میں چلے جاتے ہیں شاعر — بھنانے کے لیے دینار اردو
بھلا نقاد کیوں پیچھے رہیں گے — ہے ان کے پاس بھی منقار اردو
اناڑی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہے — بدکتا ہے بہت رہوار اردو
غلط کو بھی غلط اس نے لکھا ہے — وہی جس نے لکھی "معیار اردو"
خریدیں چل کے اک انعام ہم بھی — لگا ہے ان دنوں بازار اردو
کریں کیا جوتیاں چٹخا رہے ہیں — جہاں بھی دیکھیے فن کار اردو
رہے جو زندگی بھر گل کھلاتے — کھلائیں گے وہی گلزار اردو
زمانہ شوق سے پتلون پہنے — ظفر کو چاہیے شلوار اردو

اقبال ہاشمی
فلک نما، حیدر آباد

کہہ مکرنیاں

(۱)
سانجھ سویرے گاتا گائے
رات کو بستر میں تڑ پائے
جاؤں کہاں بستر سے اٹھ کر
اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی مچھر

(۲)
بانہوں میں لے کر وہ ڈولے
ساتھ مرے کھائے ہچکولے
لیکن وہ لنگڑا نا لولا
اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی جھولا

(۳)
میرے ماتھے کو وہ چومے
ساتھ رہے وہ سانجھ سویرے
پاس نہ پھٹکے اس کے نندیا
اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی بندیا

(۴)
مجھ سے لپٹ کر خود بل کھائے
مجھ کو خوشبو سے مہکائے
مجھ پہ دیتا ہے وہ پہرہ
اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی گجرا

(۵)
پاؤں نہ پل بھر میرے چھوڑے
میں کہ موڑوں وہ بھی موڑے
چلتے پھرتے کردے گھائل
اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی پائل

(۶)
دن بھر ڈولے میرے سر پہ
رات کو بن جائے وہ بستر
ساتھ نہ چھوڑے میرا پل بھر
اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی چادر

(۷)
نیر بہائے ساون میں وہ
دل تڑپائے ساون میں وہ
انگ بھگوئے میرا پاگل
اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی بادل

(۸)
میں جھوموں تو وہ بھی جھومے
میں ڈولوں تو وہ بھی ڈولے
میں ہوں چندا اور وہ ہالا
اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی بالا

محمد اسد اللہ
ناگپور

اوپر والے لوگ

(یک بابی ڈراما)

کردار انور، نجمہ، شبانہ، ذاکر، شاذیہ، کولر والا
منظر ڈرائنگ روم

انور چلو بھئی، جان چھوٹی، مکان ڈھونڈنے کی اس مصیبت سے۔ بھئی نجمہ ذرا چائے تو پلاؤ

نجمہ ہاں ہاں، کیوں نہیں، شبانہ کا کپڑے دھونا ہو گیا ہے۔ اب وہ چائے ہی بنا رہی ہے۔ دیکھئے نا یہاں تو نل بھی وقت پر آتا ہے۔ جیسا ہم چاہتے تھے۔ ایک وہ چھاونی والا گھر تھا منحوس۔ وہاں وقت پر صرف قرض مانگنے والے اور فقیر ہی آتے تھے۔

انور وہ تو یہاں بھی آئیں گے۔ بھلا ان سے کب جان چھوٹی ہے۔

نجمہ مگر جی آپ کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے اس مکان کے لئے۔

انور بیلنے پڑے۔ میرے جوتے کے تلے گھس گھس کر پاپڑ ہو گئے۔ خدا خدا کر کے یہ مکان ملا

نجمہ مکان نہ ہوا، کسی نکھٹو بیٹے دولہے کے لئے دلہن ڈھونڈنے نکلے تھے، ہم

انور کیا تشبیہہ دی ہے بیگم تم نے Exact مکان کی تلاش میں نکلو تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مکان والا اپنا مکان کرائے پر نہیں اٹھا رہا ہے بلکہ اپنی لڑکی بیاہنے جا رہا ہے..... چال چلن کیسا ہے؟ انکم کتنی ہے؟ شادی شدہ ہو یا کنوارے؟ اور کنوارے کیوں ہو؟ ماں باپ بھی ساتھ رہیں گے؟ کوئی بیماری تو نہیں۔ ایک مکان والے سے تو میں نے کہہ بھی دیا تھا کہ مکان ڈھونڈنے کے علاوہ مجھے کوئی بیماری نہیں۔

نجمہ داماد میں بھی تو لوگ یہی کچھ دیکھتے ہیں نا کہ وہ کماؤ پوت ہو، کرایہ دار بھی تو ایک طرح کا داماد ہی ہوا نا۔ بلکہ گھر داماد

انور اس سول ایریا میں رہنے کی تو بات ہی نرالی ہے۔ یہاں نہ ان پڑھ اور جنگلی پڑوسی تنگ کریں گے نہ ان کے وہ شریر بچے جو رات دن ہمارے گھر میں ڈٹے رہتے، ان کی وہ گالی گلوج اور توڑ پھوڑ

نجمہ اللہ توبہ..... وہ جھاپرو نگر والے مکان میں کس قدر پریشانی تھی۔ گندگی، شور، بدبو اور اس کے علاوہ آس پاس والے کبھی چٹنی مانگنے چلے آ رہے ہیں اور کبھی آنے کے لئے پریشان کر رہے ہیں۔ پڑوس کی بوا تو ہر دو دن بعد مکسر میں مسالہ پسوانے چلی آتی۔ جی چاہتا تھا کسی دن اسی کو مکسر میں ڈال کر بٹن دبا دوں

انور اور تمہیں پتہ ہے اس کھاتے پیتے پڑھے لکھے محلہ میں رہنے کا سب سے بڑا فائدہ کیا ہے۔

نجمہ میرے لئے تو یہاں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آنگن میں کڑی پتہ کا پیڑ ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔

انور تم عورتوں کا سارا دھیان بس کھانے پکانے ہی میں رہتا ہے۔ دیکھو یہاں پڑوسیوں کا درد سر نہیں۔ تین دن ہوگئے کسی نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ جیسے یہ انسانوں کی بستی نہیں قبرستان ہو

نجمہ اور ایک اس جھونپڑ پٹی کے لوگ تھے۔ ہماری ذاتی زندگی کے بارے میں وہ ہم سے زیادہ جانتے تھے۔ ایک دن وہاں کی زیبن نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں کی کوئی لڑکی آپ کے ساتھ آفس میں کام کرتی تھی اور آپ دونوں ساتھ میں ایک ہی بس میں جاتے تھے۔

انور خیر اسے چھوڑو۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس سول ایریا میں رہنے والوں کا اپنا ایک وقار ہے۔ یہاں رہنے والے خواہ کتنے ہی مفلس کیوں نہ ہوں۔ لوگ انہیں تعلیم یافتہ اور مالدار سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہاں بھی لوگ آسمان سے تو ٹپکتے نہیں۔ آتے ان ہی علاقوں سے ہیں جہاں پہلے ان کی مٹی پلید ہو رہی تھی یہاں آکر مالدار بن جاتے ہیں

نجمہ یوں بھی جس کی جیب خالی ہو کیا یہاں مرنے کے لئے آئے گا؟

انور یہاں رہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شبانہ کے لئے اچھے رشتے آنے لگیں گے۔

نجمہ ہاں جی۔ سب سے بڑی فکر تو اسی کی لگی ہے۔ لیجئے وہ چائے لے کر آگئی۔

انور ایک آدھ ہفتہ میں وہ لوگ بس آنے ہی والے ہیں۔ میں انہیں اس نئے مکان کا پتہ لکھ کر بھجوا چکا ہوں۔ بات تو جمی جمائی ہے بس وہ لوگ لڑکی دیکھنا چاہتے ہیں۔

نجمہ اچھا میں جاتی ہوں ادھر کچن میں کھانا بھی پکانا ہے (جاتی ہے)

(کال بیل کی آواز، انور دروازہ کھولتا ہے)

انور کون ہے۔ کیا بات ہے؟

کولر والا کولر والا صاحب، پے منٹ چاہیے،

انور کاہے کا پے منٹ، ہم نے تو کوئی کولر نہیں خریدا

کولر والا کاہے کو خالی پیلی جھوٹ بولتا صاحب۔ تم نے پچھلے مہینے انسٹالمنٹ پر کولر اٹھایا تھا نا

انور وہ ہم نہیں ہے۔ جس نے کولر اٹھایا تھا وہ اوپر چلا گیا۔

کولر والا کیا؟ اوپر چلا گیا؟ اتنی جلدی ٹھنڈا ہو گیا۔ کیا جوردار کولر ہے۔ لنگز اسٹ کولر ایسا ہی ہوتا۔ کمرہ تو کمرہ آدمی کو بھی ٹھنڈا کر دیتا۔ کمرہ کے مالک۔ وہ تو گیا اوپر اب ہم یہ کولر کو لے کر جائے گا۔ اے رام داس چل اٹھا یہ کولر

انور ارے نہیں نہیں۔ بھئی یہ کولر تو ہمارا ہے جس نے تم سے لیا ہے وہ بڑے میاں اوپر....

کولر والا ارے ہم کو اوپر نیچے کچھ نہیں معلوم۔ ہمارا دو ہجار روپیہ باقی ہے۔ ابھی بڈھا مر گیا اپنی موت سے ہم کو کاہے موت مار رہے ہو۔ ہم تو اسے بیچ کر اپنی رقم کھڑی کرے گا۔ کوئی کھیل تماشہ ہے کیا۔

انور ارے میری پوری بات تو سنو وہ یہاں رہتا تھا اب اوپر کے کمرہ میں رہنے کے لئے گیا ہے۔

کولروالا وصت تیری کی ارے پہلے کاہے نہیں بتایا۔ہم سمجھا کہ مرنے کو گیا ہے اوپر۔ایسے بولو نا کہ رہنے کو گیا ہے۔مگر تم لوگ کاہے کو آیا۔یہاں

انور رہنے کو۔ میاکرایہ دار ہے ہم

کولروالا ہاں۔تو ایک تھوبو ڈوانگاکے رکھو یہاں میا کرایہ دار ہے اور یہاں رہنے کو آیا ہے۔اچھا۔چل بے رام داس اوپر (جاتا ہے)

انور عجیب عجیب سر پھرے لوگ بھرے پڑے ہیں (کپڑے تبدیل کرنے لگتا ہے لنگی پہن رہا ہے تبھی ذاکر آتا ہے)

ذاکر السلام علیکم

انور وعلیکم السلام

ذاکر کیا میں اندر آسکتا ہوں

انور اندر ؟.... اندر کا مطلب کیا ؟ کیا اب کچن میں گھسنے کا ارادہ ہے۔اندر تو آپ آہی چکے ہیں۔معاف کیجئے۔میں نے آپ کو پہچانا نہیں مگر ٹھہریئے میں ذرا کپڑے بدل کر آتا ہوں (اندر جاکر لنگی پہن کر آتا ہوں)

ذاکر آپ کو ایسا لگتا:. نہیں کہ آپ نے مجھے کہیں دیکھا ہے

انور جی بالکل نہیں

ذاکر ایسا لگتا ہے آپ آر کیسٹرا بالکل نہیں دیکھتے اور شاید ٹی وی بھی نہیں۔

انور جی آرکیسٹرا جیسی واہیات چیز تو میں دیکھتا ہی نہیں اور ٹی وی پر بھی انڈیا موسٹ وانٹیڈ اور Missing بہت دنوں سے نہیں دیکھا شاید اسی لئے آپ کو پہچان نہیں پارہا ہوں۔

ذاکر جی بندہ کو ذاکر......کہتے ہیں۔میں ٹی وی اور اسٹیج آرٹسٹ ہوں۔میمکری پروگرام پیش کرتا ہوں۔سائڈ بزنس کے طور پر بیکری چلاتا ہوں۔شاعری سے بھی شوق فرماتا ہوں۔جب سنا کہ یہاں آپ کی تشریف آوری ہوئی تو مزاج پرسی کے لئے چلا آیا۔میں آپ کا پڑوسی ہوں۔یہاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ؟

انور آنے جانے والوں کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں اور یہ تکلیف پتہ نہیں آج صبح ہی سے کیوں شروع ہوئی تین دنوں تک تو کسی نے جھانک کر بھی نہیں۔. دیکھا۔

ذاکر یہاں لوگوں کو تانک جھانک کی عادت نہیں ہے۔مگر صرف تین دن تک اس کے بعد تو آپ کے یہاں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ جائے گا۔مگر خیر یہ تکلیف بس چند دنوں کی ہے۔

انور کیوں کیا اس کے بعد یہاں کرفیو لگنے والا ہے

ذاکر جی نہیں اس کے بعد آپ اس کے عادی ہوجائیں گے۔میں بھی جب پہلی مرتبہ یہاں آیا تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔گھر میں سامان رکھتے ہی گیٹ بند کرنے گیا تو ایک فقیر اندر گھس چکا تھا۔
بھائی صاحب۔میں اندھا فقیر ہوں ، کچھ دلوائیے۔
میں نے کہا۔ارے یہ مکان خالی ہے یہاں کوئی نہیں ہے یہاں پر وہ بولا
بھائی صاحب۔میں اتنا بھی اندھا نہیں ہوں۔ابھی تو آپ کا سامان ٹرک سے اترا ہے۔میں نے کہا۔اچھا یہ لو اور

ملو یہاں ہے
"صاحب یہ تو جوتی ہے ۔آپ ادھر سول ایریا میں نئے آئے ہیں اس لئے بول رہا ہوں ادھر تو ایک آنکھ والے فقیر کو بھی کوئی دو روپیہ سے کم بھیک نہیں دیتا ۔صاحب آپ کو کیا بولوں میں خود بھی جب لیبر ایریا میں جاتا ہوں تو اٹھنی سے کم بھیک نہیں دیتا ۔صاحب آپ یہ جوتی رکھ لیو کوئی دیکھے گا تو آپ کی پوزیشن ڈاؤن ہوگی ۔

انور ارے واہ آپ تو بڑی زوردار اداکاری کر لیتے ہیں ۔

ذاکر شکریہ ۔ شکریہ ۔ ذرہ نوازی اور صاحب فقیر گیا تو ایک سیلز مین آیا ۔صاحب پلیز آپ کے پانچ منٹ لوں گا ۔ میر A.B.C.D ایریا کی ایک مینوفیکچرنگ کمپنی گمنام لمیٹڈ بدنام لمیٹڈ کا سیلز مین ہوں ۔ہمارے پاس سوئی سے لے کر سویاں تک اور شیمپو سے لے کر لمپو اور ریٹا ڈور ٹک ڈور ٹو ڈور ڈیلیوری کا بہترین انتظام ہے ۔ ہما انٹرپرائز مینز ٹی ہوم بھی چلاتا ہے اور اسی لئے ہم لیبر اور سرونٹ سے لے کر اگر کسی پارٹی کو چاہیے تو منسٹر بھ سپلائی کرتے ہیں ۔مگر پارٹی دیکھ کر
میں نے کہا ۔دیکھو مجھے آفس جانے میں دیر ہو رہی ہے ۔
اس نے کہا ۔بس آپ کے صرف پانچ منٹ لوں گا ۔
میں نے کہا ۔میرے پاس ٹائم نہیں ہے ۔دیر ہو رہی ہے ۔
وہ بولا ۔ میرے پاس ٹائم بھی ہے ۔بتایئے آپ کو کس ٹائپ کا ٹائم چاہیے ۔ایلیو تھ آور ، زیرو آور ، لنچ ٹا لوک مت ٹائمز ، ہندوستان ٹائمز اور ٹائمز کمپنی کی وال کلاک ، رسٹ واچ
میں نے کہا ۔ارے بیوقوف ۔ٹائم یعنی وقت سے ۔وہ نہیں ہے میرے پاس ۔
اس نے کہا ۔ہاں ہاں وہ بھی ہے میرے پاس ۔اچھا وقت ، برا وقت ، اول وقت آخر وقت ۔آڑا وقت ۔ کڑوا وقت گزرا وقت آنے والا وقت فرصت کا وقت ۔
میں نے کہا ۔تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے دنیا کی ہر چیز تمہارے پاس بیچنے کے لئے موجود ہے ۔
وہ بولا ۔ہاں ہے
میں نے پوچھا ۔تاج محل ہے تمہارے پاس ؟
وہ بولا ۔آپ خریدیں گے ؟
میں نے کہا ۔ہاں ۔خریدوں گا
وہ بولا ۔یہ لیجئے ۔تاج محل چائے ۔واہ تاج !

انور واہ یار مان گئے ۔استاد ذاکر حسین صاحب

ذاکر شکریہ اچھا چلتا ہوں ۔کسی چیز کی ضرورت ہو تو یاد کیجئے ۔ویسے میں زیادہ تر ٹور پر رہتا ہوں ۔اسلام علیکم

انور ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ یہ گوشہ عافیت ہے مگر یہاں تو طرح طرح کے چلنے والوں سے ایک پل چین نہیں ۔ اب کون ہے ؟

شاذیہ خان صاحب ہیں گھر پر؟
انور آپ کون ہیں؟ (شاذیہ اندر آتی ہے)
شاذیہ میں شاذی ہوں روبی ہوگی تو اسے ارجنٹلی بھیج دو کہ شاذی آئی ہے
انور خان صاحب تو نہیں ہیں گھر پر اب وہ یہاں نہیں رہتے وہ دراصل
شاذیہ Surprising اب کیوں نہیں رہتے۔ پہلے تو رہا کرتے تھے
انور وہ دراصل ہمارے مالک.....
شاذیہ ہاں یہ تو مجھے آپ کا حلیہ دیکھ کر ہی پتہ چل گیا کہ وہ آپ کے مالک ہیں اور آپ ان کے نوکر
انور اوہ! دیکھئے میڈم آپ حد سے آگے بڑھ رہی ہیں۔
شاذیہ اوہ یو سلی مین تم مجھے میری حد بتاؤ گے تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔ اوہ گاڈ! اس ایریا میں تو نوکروں کے بھی وہ بھاؤ بڑھے ہوئے ہیں کہ کیا کبھی پیاز کے بڑھے ہوں گے۔ ایسی ہی ایک وہ ہماری کام کرنے والی ہے کہتی ہے۔ گندے کپڑے اور برتن نہیں دھوؤں گی۔
انور دیکھئے میڈم یہ نوکر کتھا کہیں اور جاکر سنائیے۔ خان صاحب میرے مالک نہیں اس مکان کے مالک ہیں اور میں ان کا نیا کرایہ دار ہوں۔ اے مالک رحم کر۔
شاذیہ اوہ! تو اتنی دیر سے بتایا کیوں نہیں۔ بائی دی وے۔ اس کا کرایہ کیا ہے۔
انور جی۔ ہزار روپیہ اور بجلی پانی کا بل علحدہ
شاذیہ خان صاحب نے مجھے بتایا بھی نہیں مجھے بھی تو اپنے ایک کزن کے لئے چاہئے تھا۔ لوگ بھی کیسے کیسوں کو بسا لیتے ہیں۔ مگر انہوں نے آپ کو اوپر والا کمرہ کیوں نہیں دیا۔ خود کیوں اوپر چلے گئے۔
انور اللہ کی مرضی ویسے تھوڑی سی ان کی مرضی بھی تھی۔ کرایہ دار کے سر پر سوار رہنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے نا
شاذیہ یو آر رائٹ۔ ویسے وہ آپ کو اوپر رہنے دینے والے بھی نہیں تھے۔ جس آدمی نے اپنے سر پر ایک بال رہنے نہیں دیا وہ آپ کو اپنے اوپر کیوں برداشت کرے گا اوہ!۔ اور اب تو مجھے بھی اوپر چڑھ کر جانا پڑے گا اور پھر نیچے بھی آنا پڑے گا۔ہاؤ فولش How Foolish مگر خیر۔ آپ ایسا کیجئے نا۔ پلیز میرا ایک کام کر دیجئے۔
انور آپ کا کام، گیا کام سے (بڑبڑاتا ہے)
شاذیہ یہ میری بہن کی شادی کا کارڈ ہے۔ پلیز اسے اوپر دے دیجئے۔ ویسے آپ اس محلہ میں آئے ہیں بائی دی وے تو کارڈ آپ کو بھی دینا چاہیے نا۔
انور جی، بائی دی وے
شاذیہ مگر بس یہ ایک ہی کارڈ بچا ہے میرے پاس۔ آپ تو خیر اپنے ہی ہیں۔ یہ کارڈ میری ایک سہیلی کو دینا ہے۔ آپ ویسے ہی آجائیے گا۔ آئیں گے نا! اچھا میں چلتی ہوں بائے۔ بائے (جاتی ہے)
انور ہاں میڈم ضرور آجاؤں گا۔ ایک ایسی جگہ جس کا مجھے علم نہیں جہاں مجھے بلایا بھی نہیں گیا۔ میں تو آپ کا اپنا ہوں نا

نجمہ واہ واہ واہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کون تھی وہ؟ دو منٹ ملک ملک کر باتیں کیا کیں کہ آپ نے اپنے آپ سے باتیں کرنا شروع کر دیں

انور وہ ۔ وہ ۔ بیگم وہ کوئی پڑوسن اوپر اوپر

نجمہ ہاں ہاں ۔ زیادہ ہکلانے کی ضرورت نہیں ۔ دروازے کے پیچھے سے میں سب سن رہی تھی کیا نک چڑھی عورت تھی ۔ نوکر کہا اس نے آپ کو گھر میں کہتی ہوں قصور آپ کا بھی ہے ۔ آپ ہمیشہ لنگی بنیان میں ڈٹے رہتے ہیں ۔ کوئی ملنے والا آئے تو ڈھنگ کے کپڑے تو پہن لیا کیجئے ۔ معلوم ہے ہم اب سول ایریا میں رہنے لگے ہیں ۔

انور بھاڑ میں گیا یہ سول ایریا ۔ یہاں تو ہر دو منٹ بعد کوئی ملنے والا سر پر بیٹھا ہوا ہے ۔ کیا میں رات دن سوٹیڈ بوٹیڈ رہوں ۔ ان ملنے والوں (بیل کی آواز) پھر کون نازل ہو گیا؟ اب تو یہ بیل ہی نکال پھینکتا ہوں ۔

بنٹی گڈ مارننگ انکل ۔ اس میٹھے نیم کی تھوڑی سی پتیاں توڑنی ہیں توڑ لوں

انور یہ پیڑ ہمارا نہیں ہے ۔ ان سے پوچھو اوپر جا کر اور توڑ لو

بنٹی انکل جب وہ یہاں رہتے تھے تو ہمیں توڑنے دیتے تھے توڑ لوں

انور ارے تو پھر توڑ لو نا مجھ سے پوچھ کیا رہے ہو

بنٹی اچھا تو توڑ لوں؟

انور اچھی مصیبت میں پھنس گیا ہوں

شبانہ ابو، امی چلئے نا ۔ اندر کھانا رکھ دیا گیا ہے ۔

انور ہاں بیٹے چلو، اب خدا کرے کھانے کے دوران کوئی نہ آئے

شبانہ یہی تو یہاں سب سے بڑی مصیبت ہے ۔ کل ہم لوگ کھانے کے لئے بیٹھے ہی تھے کہ کچھ مہمان ٹپک پڑے ۔ اوپر والوں کے مہمان تھے ۔ وہ لوگ لاک مار کر کہیں گئے ہوئے تھے دن بھر انہیں اٹنڈ کرنا پڑا ۔

نجمہ اچھا میں دیکھتی ہوں ذرا آئیے ۔ بہت دیر ہو چکی ہے ۔

شبانہ ابو کل ایک اور پرابلم ہو گیا ۔ کل آپ بیس روپئے دے گئے تھے نا دودھ کے لئے ۔ گھر میں بس اتنی ہی بیس کی نوٹ تھی ۔ اسی دوران ایک چندے والے بھی نازل ہو گئے ۔ اس سے پہلے بھی وہ دو بار آ چکے تھے ۔

انور تم نے انہیں بتایا نہیں کہ ابھی تنخواہ نہیں ہوئی ہے

شبانہ میں نے انہیں بہت کوشش کی سمجھانے کی کہ ابھی ابو دل نہیں ملا ہے تنخواہ نہیں ہوئی ۔ مگر ایسا لگتا ہے یہ لوگ سمجھتے ہیں ہم بہانے بنا رہے ہیں ۔ میں نے سوچا ۔ یہ پھر آ کر تنگ کریں گے ۔ آپ نے بیس روپے دیئے ہیں تو دس روپیوں کا دودھ کا پیکٹ منگوالوں گی دس انہیں دے دیتی ہوں ۔ مگر آپ جانتے ہیں کیا ہوا؟

انور کیا؟

شبانہ انہوں نے پورے بیس روپے رکھ لئے ۔ کہنے لگے دس روپئے اس مہینے کے اور دس پچھلے مہینے کے اور اس کے بعد وہ اوپر والوں کے مہمان آ گئے اور گھر میں چائے بنانے کے لئے دودھ کا قطرہ تک نہیں تھا ۔

بنٹی انکل ہم کری پتے توڑ رہے ہیں تو ہمارا ہاتھ نہیں پہنچ رہا ہے ۔ آپ توڑ دیجئے نا

انور اچھا بھئی چلو جاتا ہے۔

شبانہ یہاں سات سال سے ستر سال کی ہر قسم کی مصیبتیں پل پل وارد ہوتی رہتی ہیں۔ خدا رحم کرے۔ یہی حال رہا تو پاگل ہو جائیں گے۔

(باہر سے زور سے آواز سنائی دیتی ہے)

آواز ارے یہ کون پیڑ پر چڑھ رہا ہے۔ بدماش کہیں کا۔ اتر نیچے اتر۔ اپنے باپ کا مال سمجھ کر توڑ رہا ہے۔ تیرے باپ نے لگایا تھا کیا یہ پیڑ۔ حرام خور کہیں کا (شبانہ باہر دوڑ کر جاتی ہے)

(اندھیرا)

بیل کی آواز۔ (دوسرا دن۔ دیوار پر لگے کیلنڈر میں تاریخ بدل چکی ہے)

نجمہ کون ہے؟

انور یہ میں ہوں (اندر آتا ہے) پہلے یہ بتاؤ میرے پیچھے کوئی آیا تھا۔

نجمہ یہ پوچھئے کون نہیں آیا تھا۔ یہاں تو اوپر والوں کے نام کی مالا جپتے جپتے پورا شہر کیو لگائے کھڑا ہے۔

انور تم بھی بے وقت کیا لے بیٹھی ہو۔ میرا مطلب ہے۔ سفید بالوں میں مہندی لگائے ہوئے ایک بڑے میاں

نجمہ ہاں وہ مہدی حسن

انور ہاں اور وہ ایک چشمہ پہنے موٹی سی بڑی بی

نجمہ ہاں وہ چشم بد دور

انور ہاں اور ان کے ساتھ ایک خوب صورت سا نوجوان

نجمہ ہاں جیسے شاہ رخ خاں، وہ پوری ٹیم آئی تھی۔ زور آور خاں کا مکان پوچھ رہے تھے۔ بھیج دیا میں نے اوپر۔ اور ہاں تمہیں ایک خوشخبری سناؤں وہ اوپر والی لڑکی جو ہمیشہ ناک میں دم کئے رہتی تھی۔ تین دنوں وہ تیسں بار کبھی پیاز، کبھی اچار اور نہ جانے کیا کیا مانگ کر لے گئی۔ اب جلد ہی ٹلنے والی ہے۔ اس کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ ابھی اکتیسویں بار آئی تھی یہ خوش خبری دینے کے لئے۔

انور افوہ! ہائے نجمہ کہیں وہ تو نہیں ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے میں پوچھ رہا ہوں۔ شبانہ کے رشتہ کے سلسلہ میں کوئی یہاں نہیں آیا؟

نجمہ نہیں اس سلسلہ میں تو کوئی نہیں آیا۔

انور آج آفس میں مینجمنٹ کی میٹنگ تھی اس لئے مجھے چھٹی نہیں مل سکی۔ وہ لوگ شبانہ کو دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ میں نے ساری بات طے کر کے انہیں یہاں بھیجا تھا۔
صرف شبانہ کو دیکھنا باقی تھا۔

نجمہ اوئی اللہ وہی لوگ تو اوپر گئے تھے۔ انہیں اوپر والی لڑکی پسند آ گئی اور بات بھی پکی ہو گئی۔

انور ہائے نجمہ تم نے یہ کیا کیا سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا

(پردہ گرتا ہے)

اسرار جامعی

غزل پیمائی

شاعری کا گرم سارے ملک میں بازار ہے
جس کو دیکھو وہ قلم کاغذ لئے تیار ہے
تیز بیماری کی جتنی آجکل رفتار ہے
بس اُسی درجہ فزوں غزلوں کی پیداوار ہے
ہر گلی کوچے میں ہے شعری نشستوں کی دکاں
ذہن کو بیمار رکھنے کا یہ کاروبار ہے
یہ بھی اک دستور سا ہے ان نشستوں کے لئے
ہے مقرر ہر سنیچر یا کوئی اتوار ہے
مبتدی ، استاد ، تک بندو عطائی جو بھی ہے
شعر سازی کے جنوں میں مست ہے سرشار ہے
ایک پیالی چائے رکھ کر دوستوں کے درمیاں
بے تکی بحثیں ہیں گھنٹوں بے سبب تکرار ہے
جو بھی شاعر ہے اُسے دیکھو تو ہفتوں قبل سے
بس ردیف و قافیہ سے برسر پیکار ہے
قافیے جتنے لغت میں مل سکے سب چن لئے
ان کو مصرعوں میں کھپایا اور غزل تیار ہے
مولوی حالی ہو یا مسٹر کلیم الدین ہوں
ان کی نظروں میں غزل بے ربطیِ افکار ہے
پھر بھی ان پڑھ لوگ ہوں ، یا ہوں ادب کے ڈاکٹر
جانے کیوں ، اس شوخ چنچل سے سبھی کو پیار ہے
دورِ نو کا ہو سخنور یا پرانی نسل کا
محفلوں میں جو بھی ہے اک دوسرے کا یار ہے
اک ادائے خاص سے اکڑے ہوئے بیٹھیں گے سب
جو بھی شاعر ہے بزعم خود بڑا فنکار ہے
شعر سننے سے زیادہ خود سنانے کے لئے
نزع کی حالت میں ہے بے تابیٔ اظہار ہے
بانس پر چڑھنا اترنا جس طرح کا کام ہے
یہ غزل پیمائی بھی ویسا ہی شغل اسرار ہے

جامعہ نگر

پیام مسرت

بچپن کے ایک دوست مرے گھر پہ آئے
میرے لئے پیامِ مسرت وہ لائے

یعنی کہ ان کے بیٹے کی شادی میں جاؤں
اور ساتھ ان کے مرغ مسلم اڑاؤں

میں نے کہا کہ آپ تکلف نہ
مشغول ہوں میں آپ مجھے بخش

بولے برات آپ نہیں جائیں گے
سن لیجیے ! نہ جاؤں گا سمدھی کے میں بھ

یہ بات سن کے میں بھی مروت میں
کی عرض "ہے قبول" مجھے حکم آ

خوش ہوکے میرے دوست نے اک لسٹ د
شجرہ تھا خاندان کا ، جس میں لکھا

بولے کہ نور چشم کا سہرا لکھیں
مصرعوں میں جن کے نام ، ہر اک فٹ کریں

میں نے کہا کہ بھائی مرے ایسی شر
ممکن نہیں کہ لکھ سکوں ، میں سہر

اس لسٹ میں تو ، سیکڑوں لوگوں کے نا
سب نام ایک لسٹ میں کیسے کھپاؤں

کھیتی میں شعر کے نہیں ممکن کہ ہل
بحر رجز میں یعنی کہ بحر رمل

بولے وہ آکے طیش میں اک کا
مت جائیے برات اب آرام

متین عمادی
منگل تالاب، پٹنہ

خراٹا

الفاظ کی ساخت بھی عجیب و غریب ہوتی ہے اس میں حسن بھی ہے اور قبح بھی ۔ بعض الفاظ بہت ملائم اور نرم و نازک جسم و جان رکھتے ہیں ۔ بعض کی ساخت سے کھر درا پن ظاہر ہوتا ہے ۔ ان کی ادائی میں ثقالت نظر آتی ہے ۔ خراٹا ان ایسے ہی ثقیل لفظوں میں ایک ہے خرا + ٹا ۔ خراٹا ۔ نہ "خرا" کے کوئی معنی اور نہ "ٹا" کے ۔ ہاں اگر خراٹا کا سر کاٹ دیجئے یعنی شروع کے دو حروف لے لیجئے تو خر بن جائے گا ۔ یعنی گدھا ہے ۔ یہ ایسا جانور ہے جس کی آواز کریہہ اور سماعت پہ بار ہوتی ہے ۔ شاید اسی آواز کی مناسبت سے اس کا نام خراٹا پڑ گیا ہوگا ۔ بہر کیف اپنی نوعیت کا یہ عجوبہ لفظ ہے میری اس تمہید سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں لسانیات کا ماہر ہوں اور خراٹا کو لسانی اعتبار سے دیکھنا چاہتا ہوں ۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کی پیدائش نے مجھے فکر کے دلدل میں ڈال دیا ہے ۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں ۔ کہ قدرت نے اس کے جنم میں کیا راز چھپا رکھا ہے ۔ حضرت علامہ اقبال اپنی نظم میں فرماتے ہیں

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی جگنو کو روشنی دی
روشن کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کو آرسی دی

اگر علامہ اقبال اس دنیا میں موجود ہوتے تو میں ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور کہتا حضور آپ کے تمام اشعار بے مثل ہیں ۔ قدرت نے پروانے کو تپش بخشی یہ سچ ہے ۔ سحر کو بانکی دلہن کی طرح سجایا یہ صداقت ہے ۔ شبنم کو لال جوڑا پہنا کر اس کے ہاتھوں میں آئینہ دے دیا یہ بھی درست ہے لیکن آپ کا یہ مصرع

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی

مجھے نہیں جچا ۔ آپ کا یہ دعویٰ غلط دکھائی دیتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ قدرت نے خراٹے کو کیا دیا ۔ ایک بے ہنگم سی آواز ۔ ایک بے سری صدا ۔ پھر یہاں دلبری کا کوئی معاملہ بھی نہیں آتا ہے ۔ دوسروں کی نیند میں خلل ڈالنے کا معاملہ ضرور ہے ۔ اسی طرح ایک اور شاعر اسمٰعیل میرٹھی اپنی نظم خدا کی قدرت میں فرماتے ہیں

ہر چیز کی ہے ادا نرالی حکمت سے نہیں ہے کوئی خالی

ان کے شعر کے مصرع اولیٰ پر توجہ دیجئے تو یقیناً آپ کو خراٹے کی ادا نرالی نظر آئے گی لیکن مصرع ثانی

حکمت سے نہیں ہے کوئی خالی

قابل اعتراض ہے ۔ آپ ہی سوچئے کہ خراٹے کی پیدائش میں کیا حکمت ہے ؟ اس سلسلے میں میں نے ڈاکٹروں سے پوچھا کہ

خراٹے کا کیا سبب ہے۔ وہ بولے یہ ایک مرض ہے۔ حلق کی رگ سے اس کا تعلق ہے سانس کی نلی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اسی وجہ سے یہ آواز نکلتی ہے۔ ڈاکٹروں کی اس منطق سے میں مطمئن نہیں ہوا۔ آخر سانس کی نلی میں رکاوٹ نیند کے وقت کیوں ہوتی ہے۔ جاگنے کی حالت میں رکاوٹ کہاں چلی جاتی ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ خراٹا پہرادار ہے۔ لفظ پہرادار پر آپ حیرت زدہ نہ ہوں۔ بہت سے لوگ ایسی بے تکی اور دور از فہم کوڑی لائیں گے کہ آپ سمجھنے سے قاصر ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہ طرہ۔ امتیاز غالب کو حاصل ہے۔ لیکن موجودہ دور کے جدید ترین شعرا نے بھی ان کی تقلید پر کمر باندھی ہے۔ وہ غالب کا ایک ہی رخ دیکھتے ہیں۔ ان کی سہل پسندی کی طرف نہیں دیکھتے صرف مشکل پسندی پر نظر ہے۔ آپ ایک مصرع سے دوسرے مصرع کا ربط جوڑتے رہئے معنی نکالتے رہئے اور درد سر مول لیتے رہئے۔ میں آپ کے سر میں درد پیدا کرنا نہیں چاہتا اور آپ کو مریض بنا کر کسی ڈاکٹر کے یہاں بھی نہیں بھیجنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ آج کا ڈاکٹر لمبا لفافہ بنانے میں ماہر ہوتا ہے اور مرض کی تشخیص میں کورا۔ پیشاب جانچ، خون جانچ، اسٹول جانچ کے بغیر وہ آپ کا علاج نہیں کرے گا۔ اگر ان جانچوں سے مرض کا کچھ پتہ نہ چلا تو ایکسرے اور الٹراساونڈ کی نوبت آئے گی صاحب ایک درد سر دے کر میں آپ کو ڈاکٹر کی لوٹ میں کیوں ڈالوں۔ میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ خراٹا ایک پہرادار ہے۔ پہراداری کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ قدیم زمانہ میں کوتوال سے یہ کام لیا جاتا تھا رفتہ رفتہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ تھانہ کی بنیاد پڑی اور پہراداری تھانے کے ذمہ چلی گئی۔ ہر تھانے کی پولس کی یہ ڈیوٹی ہو گئی کہ رات کو گشت لگائے چور ڈاکو کو پکڑے مگر اس کو کیا کہئے کہ زمانے کی تبدیلی نے پولیس کے مزاج میں بھی تبدیلی پیدا کر دی آج کی پولیس چور ڈاکو کو پکڑنے کی بجائے مال مسروقہ کی حصہ دار ہوتی ہے اور بھائی پولس پر کیا الزام گھوٹالوں نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم سب ایک ہیں۔

خراٹا یقیناً پہرادار ہے آپ کی اطلاع کے لئے یہ عرض ہے کہ روح دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک سیلانی اور ایک جسمانی۔ جسمانی روح مستقل جسم کے اندر رہتی ہے۔ موت کے بعد ہی وہ جسم چھوڑتی ہے۔ سیلانی روح نیند کی حالت میں سیر کو نکل جاتی ہے اور خراٹے کو پہرادار بنا کر جاتی ہے۔ جب وہ واپس لوٹتی ہے تو انسان جاگ جاتا ہے اور خراٹے کی پہراداری ختم ہو جاتی ہے۔

خراٹا لینے والوں کی کیفیت کا مطالعہ کیجئے تو عجیب و غریب خوش رنگ مناظر سامنے آئیں گے کبھی یہ محسوس ہوگا کہ خراٹا پھوٹتا بنتا بلبلہ ہے اور پیٹ کے محیط میں بے شمار لہریں پیدا کر رہا ہے۔ بعض خراٹا لینے والوں کی ناک ایسا پھڑپھڑاتی ہے جیسے کوئی زخمی کبوتر آخری سانس لے رہا ہو۔ بعض خراٹا لینے والوں کا منہ کھل جاتا ہے اور دونوں ہونٹوں میں ایسی لرزش ہوتی ہے جیسے آگ پر چڑھی ہوئی دیگچی کا ڈھکن بھاپ کے زور سے اٹھ رہا ہے اور بیٹھ رہا ہے۔ حلق اور گلے سے ایسی آواز نکل رہی ہے جیسے پریشر کوکر سیٹی دے رہا ہے کہ کھانا تیاری پر ہے۔ بعض خراٹا اتنا زور اور اور فل والیوم (full volume) میں ہوتا ہے کہ آپ خراٹا لینے والوں کے قریب سو نہیں سکتے۔ اخبار میں یہ خبر آئی تھی کہ یورپ کے ایک خطہ میں بہت سی عورتوں نے اپنے شوہر سے اس لئے طلاق لے لی کہ وہ زوردار خراٹے لے کر ان کی نیند خراب کرتا تھا۔ خدانخواستہ مغرب کی نقل میں ہندوستانی مستورات میں یہ ہوا چل پڑی تو کیا ہوگا۔ ویسے میں گوش گذار دوں کہ خراٹا صرف مرد ہی نہیں لیتے عورتیں بھی لیتی ہیں۔ بعض عورتیں اتنا زوردار خراٹا بھرتی ہیں کہ ا

کے صنف نازک ہونے میں شک ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ان کو جگا کر یہ کہہ دوں کہ تم صنف نازک ہو اپنی حد میں رہو۔

خراٹے سے متعلق ایک دوسری خبر اخبار میں یہ بھی آئی تھی کہ روس نے انجکشن کی شکل میں خراٹوں کے روکنے کی دوا تیار کرلی ہے۔اس خبر کو پڑھ کر پاکستان کے مزاحیہ نگار شاعر دلاور فگار نے اپنا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا

روسیون نے خواب کی آواز کو دابا تو ہے
روح میں یوں بھی ہوا قائم نہ سناٹا تو پھر ؟
روس خراٹوں کا رستہ روکتا ہے تو مگر
رخ بدل کر ہوگیا خارج یہ خراٹا تو پھر ؟

دلاور فگار کو یہ خدشہ ہے کہ خراٹے نے اپنا رخ بدل دیا یعنی راستہ بدل دیا تو کیا ہوگا لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر انجکشن کاری ایکشن (Reaction) ہو گیا تو کیا ہوگا ؟ کیا آپ ایک نہ شد دو شد والی مصیبت کو پسند کریں گے ؟ میری رائے ہے کہ بفرض محال خراٹا روکنے کا انجکشن ایجاد بھی ہو گیا ہے تو اس کو لینے کی غلطی نہ کیجے گا۔یہاں نقلی دواؤں کی بھیڑ میں اصلی دوا لاپتہ ہو جاتی ہے۔ایسی صورت میں ری ایکشن لازم ہے۔

خراٹے میں آپ کو عروض کی تمام بحریں نظر آئیں گی۔سالم اور مزاحف بحروں کی بے شمار جلوہ گری دیکھنے کو ملے گی۔انتہا ہی نہیں رباعی اور ہائیکو کا اظہار بھی خراٹے میں ملے گا۔جس طرح بحروں سے کئی نام ہیں ایسی طرح خراٹوں کے بھی کئی نام دیئے جاسکتے ہیں۔جیسے دھیمی گتی والا خراٹا، شور انگیز خراٹا، سانپ کا پھن چھوڑنے والا خراٹا، ذبیحہ کے وقت جانور کے حلق سے نکلنے والی آواز والا خراٹا غصہ میں غراتی ہوئی بلی والا خراٹا، جوالا مکھی کی طرح منہ سے پھین پھینکنے والا خراٹا وغیرہ وغیرہ۔

خراٹے کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ سنئے کہ مجھے ایک شب ہارٹ کے مریض کی تیمار داری میں اسپتال میں رہنا پڑ گیا۔میرا مریض انتہائی نگہداشت میں تھا۔اور وہاں تمام ہی مریض ایسے تھے جو انتہائی نگہداشت کی صورت حال سے دوچار تھے۔ہر مریض کے ساتھ ایک دو تیمار دار بھی تھے۔جب رات تھوڑی بیتی تو کچھ مریض اور کچھ اس کے تیمار داروں نے خراٹے کا مقابلہ شروع کر دیا۔رات کی ڈیوٹی والی نرس کو بہت غصہ آیا۔وہ کہنے لگی ایسی صورت میں مریض کو سکون کیسے ملے گا جب کہ سکون کی بے حد ضرورت ہے۔جی چاہتا ہے سب کے منہ پر ٹیپ لگا دوں۔وہ بے چاری ہر ایک کا شانہ ہلا ہلا کر جگانے لگی جب سب جاگ گئے تو خود ایک ایزی چیئر پر آرام فرما ہو گئی اور آنکھ بند کر لی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود نیند کی آغوش میں پہنچ کر خراٹا لینے لگی اور میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔

ایں خانہ تمام آفتاب است

خراٹا لینے والوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر اس سے کہئے کہ تم بہت خراٹے لیتے ہو تو اس کو یقین نہ آئے گا اور آپ ہی کو جھوٹا سمجھے گا۔اس لئے میں نے اپنی بیوی سے کبھی نہیں کہا کہ تم بہت خراٹے لیتی ہو۔وہ مجھے جھوٹا بنانے میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ویسے جہاں تک برداشت کی بات ہے۔بہت سے باظرف مرد بیوی کی ڈانٹ تک برداشت کر لیتے ہیں۔میں نے خراٹا برداشت کر لیا تو کیا مضائقہ ہے اور پھر زن و شو کی محبت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جب وہ میرے خراٹے برداشت کر رہی ہے تو میں اس کے خراٹے کیوں نہ برداشت کر دوں ؟

ماہنامہ شگوفہ

رؤف رحیم، حیدرآباد

غزل

محفل میں کم سے کم تو رہے چاٹے اور بن
میں کیسے بھوکے پیٹ دکھاؤں گا اپنا فن

دشمن بنی ہے جان کی میری وہ جان من
سنتے ہیں میری جان کا بھائی ہے تارزن

پرہیز نے بڑھا دی ہے معدہ کی یوں جلن
دیوانہ وار چیخ رہا ہوں چکن ، مٹن

کیا چال ہے یہ عقل کی ، کیا ہوش کا چلن
مجھ کو لوگ کہنے لگے آہوئے ختن

آزاد ہوکے آج بھی آزاد ہم نہیں
وہ بھی الگ گھٹن تھی ، ہے یہ بھی الگ گھٹن

ہیں نوجوان آج کے چالو بہت جناب
بس چال دیکھتے ہیں نہیں دیکھتے چلن

میں آئینے کے سامنے پڑھتا ہوں اپنے شعر
جب کاٹنے کو آتا ہے مجھ کو اکیلا پن

اس کا بھی جشن آج مناتے ہیں یار لوگ
جو آج تک بھی کہتا ہے اس جشن کو جشن

پھیلے گھٹالے اور ہے اسکام کی وباء
کیسے ترقی پائے گا یارو مرا وطن

تازی کا کوئی شوق نہیں ہے مجھے مگر
سارے بتوں سے اچھا لگے مجھ کو تاڑ بن

کھپ جائے گی کسی بھی حسیں زلف میں رحیم
میری پتنگ عشق جو کھانے لگی ہے کن

اکتوبر ۱۹۹۹ء

فرید سحر، نرساپور

غزل

"بیوی نامہ"

سبق الٹا پڑھا دیا تو نے
مجھ کو بھولا بنا دیا تو نے

تیرے پیچھے ہی میں تو رہتا ہوں
کیسا جادو کرا دیا تو نے

مجھ کو دلہن بنانے لایا تھا
اپنا نوکر بنا دیا تو نے

زن مریدوں کے اک رجسٹر میں
نام میرا لکھا دیا تو نے

لوگ کہتے تھے مجھ کو دیو آنند
جانی واکر بنا دیا تو نے

دانت کو اک بچا کے رکھا تھا
وہ بھی آخر گرا دیا تو نے

گھر کو آتے ہی کس صفائی سے
میرا بٹوہ اڑا دیا تو نے

میری زلفوں کے سب دیوانے تھے
مجھ کو گنجا بنا دیا تو نے

مجھ سے سپنے میں پٹ رہی تھی تو
نیند سے کیوں جگا دیا تو نے

سگ لیلیٰ (ساتویں قسط) پرویز یداللہ مہدی

اتم سے اتم ملے نیچ سے نیچ

ایم۔ایل۔اے مہاشے کے نجی دفتر میں حاجت مندوں کے مابین جو علامتی گفتگو جاری و ساری تھی اس میں ہم اس قدر کھوگئے تھے کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ایم۔ایل۔اے مہاشے کی سواری باد بہاری تشریف لائی کب ایک ایک کر کے حاجت مند وہاں سے رخصت ہوئے اور کس چال میں رخصت ہوئے یعنی بامراد رخصت ہوئے یا نامراد ہم واپس اپنے حواسوں میں اس وقت آئے جب مسٹر نوپرابلم نے چٹکی بجاکر اپنی سگریٹ کا گل اور ہماری ہستی دونوں کو ایک ساتھ جھٹکا۔ ہوش میں آتے ہی ہم نے فوراً اپنے اطراف واکناف کا جائزہ لیا تو ایم۔ایل۔اے مہاشے کو اپنی ہی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتے پایا۔ ہم نے بڑبڑا کر مسٹر نوپرابلم کی طرف دیکھا کہ بھیا اس سے پہلے کہ یہ نام نہاد قوم کا خدمت گار معروفیت کی آڑ لے کر اڑن چھو ہوجائے ہماری آمد کا مقصد اس کے گوش گزار کردے۔ ہمیں مسٹر نوپرابلم کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتا دیکھ کر، ایم۔ایل۔اے مہاشے نے بھی اپنی مشتبہ نظروں کا فوکس انہی کی طرف کردیا۔ اب دونوں ہی ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں تولنے لگے لیکن نظروں کا یہ تول مول نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکا یعنی ایم۔ایل۔اے مہاشے مسٹر نوپرابلم کو پہچان نہیں سکے اس سے کم از کم اس مفروضے پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی کہ ہمارے اکثر لیڈر حضرات ووٹ وصولنے کے بعد اپنے ووٹروں، اپنے خیر خواہوں سبھی کو اگلے الیکشن تک کے لیے بھول جاتے ہیں۔

مسٹر نوپرابلم بھی چونکہ ایم۔ایل۔اے مہاشے کی طرح ڈھیٹ اور چکنے گھڑے تھے لہذا کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے ایکبار پھر اپنا تعارف کروایا جس میں ان تمام ملاقاتوں کے حوالے شامل تھے جو اب تک ایم۔ایل۔اے مہاشے سے ہوچکی تھیں اس حوالے میں یہ بات خاص طور سے یاد دلائی گئی کہ ہر ملاقات میں، پچھلی ملاقاتوں کے حوالے ہی سے تجدید تعارف کروایا گیا اس تفصیلی تعارفی کاروائی کا مثبت اثر یہ ہوا کہ ایم۔ایل۔اے مہاشے کی نظروں سے جھلکتا شبہ کا رنگ کسی قدر کم ہوا بلکہ یوں کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ موصوف کی صرف ایک

آنکھ میں اپنائیت کا رنگ نظر آیا، دوسری آنکھ بدستور مشتبہ تھی، ہوسکتا ہے جس میں اپنائیت کا رنگ نظر آیا وہ آنکھ پتھر کی ہو۔ تعارف کے بعد مسٹر نوپرابلم نے اپنی اور ہماری موصوف کے دفتر میں حاضری کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی، اور ہمیں آگے کردیا۔ حرف مدعا سنتے ہی ایم۔ایل۔اے مہاشے کے لبوں پر ایک طنز میں ڈوبی مسکراہٹ پھیل گئی پھر اس مسکراہٹ کو چیرتی ہوئی ان کی کرخت آواز سنائی دی "ہی ہی ہی آپ کو کنڈکٹ سرٹی فی کیٹ چاہیے یعنی اخلاقی صداقت نامہ ـــ" ہم نے جواباً سرہلاکر اقرار کیا تو ہماری ذات پر زہرناک لہجے میں حملہ کیا ـــ "پھر تو ضرور تم سے کوئی غیر اخلاقی حرکت سرزد ہوئی ہوگی ـــ کہیں تم نے اپنے پڑوسی کی جوان بیٹی کا اغوا تو نہیں کرڈالا ـــ؟"

"جی نہیں ـــ" ہم نے سٹپٹا کر کہا۔ ہمارے انکار پر بوالہوسوں کی طرح بائیں آنکھ دباکر بولے "ہی ہی ہی پھر تو ضرور تم نے پڑوسی کی بیوی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔؟ کیوں۔؟" اتنا کہہ کر وہ یوں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے جیسے خیالوں ہی خیالوں میں خود ہمارے پڑوسی کی بیوی پر اپنے چکنے چپڑے ڈورے، ڈال رہے ہوں ہم نے ایکبار پھر زہر کے گھونٹ پیتے ہوئے انکار میں گردن ہلائی۔ جھنجھلاکر بولے۔ "نہ تم نے چھوری کا اغواء کیا، نہ ریپ کیا، نہ پڑوسن پر ہاتھ صاف کیا۔ تو پھر آخر تم نے ایسا کون سا جرم کیا جو تمہیں کنڈکٹ سرٹی فی کیٹ کی ضرورت آن پڑی۔!" اتنا کہہ کر اچانک جھٹکہ کھاکر بولے۔ "میں سمجھ گیا تم سے کون سی غیر اخلاقی حرکت ہوئی ہے۔ ادھر میرا دھیان پہلے نہیں گیا اصل میں تم ذرا دوسرے ذوق کے آدمی معلوم ہوتے ہو، تم نے یقیناً پڑوسی ہی کو بھگالے جانے کی کوشش کی ہوگی۔ ہی ہی ہی ـــ" ایم۔ایل۔اے مہاشے کا قہقہہ ایکبار پھر بلند ہوا۔ ایم۔ایل۔اے مہاشے کے ان رکیک حملوں سے جہاں ان کی گھٹیا ذہنیت کا اندازہ ہوا، وہیں یہ بات بھی کھل گئی کہ مہاشے جیسے خود تھے دوسروں کو بھی ویسا ہی سمجھتے تھے، اور ان کے اس بے ہودہ تصور کو پاش پاش کرنا ضروری تھا لہذا ہم نے شال میں لپٹ کر عرض کیا۔ "ہوسکتا ہے آپ سے کنڈکٹ سرٹی فی کیٹ لینے کے ایسے ہی بداخلاق اور بدقماش قسم کے لوگ آتے ہوں، یوں بھی کہاوت مشہور ہے الم سے الم ملے نیچ سے نیچ ـــ!" ہمارے اس براہ راست طنز پر اس سے پہلے کہ مہاشے جی کچھ کہتے مسٹر نوپرابلم بگڑی بات بنانے کی خاطر لفظوں کی کمک لے کر بیچ میں کود پڑے "ان کا مطلب یہ ہے مہاراج کہ یہ ویسے نہیں ہیں، جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں، یہ بہت ہی بااخلاق اور باکردار نوجوان ہیں، میں اس کی گارنٹی لیتا ہوں نوپرابلم ـــ!!"

"آپ کس بنا پر ان کی گارنٹی لے رہے ہیں ـــ" مہاشے جی نے طنزیہ لہجے میں وار کیا۔ مسٹر نوپرابلم چھٹاک سے بولے ـــ "اس بنا پر مہاراج کہ جس پڑوسی کے حوالے سے آپ نے ان کے کیرکٹر کا مرڈر کرنے کی کوشش کی ہے اس پڑوسی کو نوپرابلم میں اچھی طرح جانتا ہوں، آپ کو شک ہے کہ انہوں نے پڑوسی کی جوان بیٹی کا اغواء کیا ہے تو آپ کا یہ شک یوں بے بنیاد ہے حضور کہ ان کے پڑوسی کی کوئی بیٹی ہی نہیں ہے نوپرابلم اب رہا دوسرا الزام، پڑوسی کی بیوی پر ڈورے ڈالنے والا تو نوپرابلم یہ پڑوسی کی بیوی پر ڈورے ڈال ہی نہیں سکتے کیونکہ پڑوسی کی کوئی بیوی ہے ہی نہیں اس نے شادی ہی نہیں کی، اب رہی تیسری بات پڑوسی کو بھگالے جانے والی تو نوپرابلم وہ خود نہیں کرسکے چھ مہینے ہوئے ملک سے باہر بھاگ چکا ہے ـــ!!"

یوں مسٹر نوپرابلم کی بروقت مداخلت اور ٹھوس معلومات نے بات کو بگڑنے سے بال بال بچالیا اور ایم۔ ایل۔ اے مہاشے ہماری کردار کشی کے پروگرام کو یک لخت منسوخ کر کے اصل موضوع پر آگئے "آپ اپنا مسئلہ بتائیں جناب۔!" ہم نے جواباً بلدیہ کے وارڈ آفس میں پیش آنے والے واقعات مختصراً ان کے گوش گزار کر دیئے البتہ احتیاط یہ برتی کہ ان میں محبوبہ کا ذکر بالکل نہیں آنے دیا بات صرف کتے کے دیدار تک ہی محدود رکھی لیکن ایم۔ ایل۔ اے مہاشے اس بات کو بھی اپنے انداز میں لے اڑے، اپنی مخصوص "ہی ہی ہی کے ساتھ فرمایا۔۔۔ "تو گویا میں نے آپ کو ٹھیک ہی پہچانا کہ آپ کسی نہ کسی کے عشق میں ضرور مبتلا ہیں چلیے انسان کے نہ سہی کتے ہی کے سہی۔ ہی ہی ہی اس بات پر ملاؤ ہاتھ۔۔۔!" اتنا کہہ کر مہاشے جی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا ہم ان کی اس کھلی چوٹ پر اس قدر ہکا بکا تھے کہ جواب میں مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھانا بھی بھول گئے۔ مہاشے جی نے خود ہی اپنے دوسرے ہاتھ کو زحمت دی یعنی اپنے بائیں ہاتھ سے ہمارا داہنا ہاتھ تھاما اور پھر اسے اپنے داہنے ہاتھ سے بھینچتے ہوئے بولے۔ "ہی ہی ہی آج مدتوں بعد ایک ہم خیال ہم ذوق بلکہ ہم سگ سے ملاقات ہوئی ہے بقول شاعر۔

کند ہم سگ بہ ہم سگ ڈاگ بہ ڈاگ

السیشین بہ السیشین، بلڈاگ بہ بلڈاگ۔۔۔"

مہاشے جی کے اس انکشاف پر ایکبار پھر ہم پر وحشت طاری ہوگئی بقول شاعر۔۔۔

میں اسے وحشت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں

مجھ سے پہلے ہر جگہ کتوں کے افسانے گئے۔۔۔!

نہ جانے کیوں ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اپنی کتا پرستی کے اظہار کے طور پر ایم۔ ایل۔ اے مہاشے نے جو شعر چھوڑا تھا اور جس میں السیشین، بلڈاگ جیسے خونخوار کتوں کا کھلم کھلا ذکر تھا اس پر اپنی بات کو ختم کرنا وہ یقیناً اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہوں گے لہذا اگلے کسی بھی پل شعر کے پیچھے اپنے اصلی شیروں عرف کتوں کو ضرور چھوڑیں گے، ہم نے سوچا اس سے پہلے کہ مہاشے جی اپنے پالتو کتے ہم پر چھوڑ دیں ہمیں میدان چھوڑ دینا چاہیئے ابھی ہم نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنایا ہی تھا کہ انہوں نے اچانک اپنے کھادی کے جیکٹ کے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پلک جھپکتے میں اون کا ایک گولا سا نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا جو پہلے تو کسی گیند کی طرح میز پر لڑھکتا رہا پھر اپنے چاروں پیروں پر کھڑا ہوگیا اس منی سائز چوپائے کے کھڑے ہونے کی دیر تھی ہمارا دل بیٹھنے لگا۔۔۔ ایم۔ ایل۔ اے مہاشے نے اس مختصر آفت کے بالوں بھرے وجود پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس طرح فرمایا جیسے کوئی سیاسی بیان دے رہے ہوں۔۔۔ "اگرچہ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے میں اپنے کتوں کی طرف پہلے کی طرح خصوصی توجہ نہیں دے پا رہا ہوں تاہم اس شکاری جیسی بلے کو جیبی جنتری جیبی گھڑی اور دستی بم کی طرح ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔۔۔"

ہم نے فوراً لقمہ دیا۔۔۔ "گویا کتے کا یہ پلا میرا مطلب ہے یہ گل گوتھنا جسے آپ نے جیبی جنتری، جیبی گھڑی سے تشبیہہ دی ہے اور بجا دی ہے اسے میں ایک قدم آگے بڑھ کر اگر آپ کا وزیٹنگ کارڈ کہوں تو زیادہ

صحیح ہوگا ــــ!" ہماری اس مکھن باری کی چکنائی پر پھسلتے ہوئے بولے ـــ "اہاہا ـــ کیا نکتہ نکالا ہے وزیٹنگ کارڈ۔ یعنی کہ تعارف نامہ، پر ہیچ۔ واقعی کتے ہی تو میری شناخت ہیں، میری پہچان ہیں، بلکہ میں یہاں تک کہوں گا کہ اگر الیکشن کمیشن اجازت دے تو اگلے الیکشن میں کتے ہی کو اپنا انتخابی نشان منتخب کرو" مسٹر نوپرابلم نے دو ہاتھ آگے بڑھ کر فرمایا "واہ واہ مہاراج بڑا نیک خیال ہے اگر ایسا ہوگیا، کتا آپ انتخابی نشان منتخب ہوگیا تو سیاست کی دنیا میں، نوپرابلم، تہلکہ مچ جائے گا اور اس کے ساتھ دنیا کو معلوم ہوجائے گا کہ آپ کو کتوں سے کتنا پیار ہے۔!"

ایم۔ایل۔اے مہاشے ہماری اور مسٹر نوپرابلم کی بہائی ہوئی مکھن کی ندی میں بہتے ہوئے پر جوش لہجے میں بولے۔ "میری زندگی کا مقصد ہی کتوں کے حقوق کے لیے لڑنا ہے، میں ان کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں مجھے کتوں سے کوئی دور نہیں کرسکتا ان کی فلاح و بہبود کے لیے لڑنے سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا، میری دو بیویاں اس کوشش میں دار فانی کو لبیک کہہ چکی ہیں، لیکن میرا شعلہ، عشق تادم گفتگو اسی طرح روشن ہے اور آئندہ بھی روشن رہے گا ـــ!" ایم۔ایل۔اے مہاشے اپنے بیان کے کلائمکس پر پہنچ کر اچانک خاموش ہوگئے البتہ ان کی آنکھیں خلا میں کہیں دور شاید کتوں کے روشن مستقبل کے تانے بانے۔ میں مصروف ہوگئیں، یعنی جنہیں عوام نے اپنے بہتر مستقبل کے لیے چن کر اسمبلی میں بھیجا تھا وہ کتوں۔ مستقبل کو بہتر بنانے کے منصوبے بنارہے تھے۔ !!!

(جاری)

افسر کاظمی
کریم سٹی کالج
جمشید پور (بہار)

بس میں برسات

گرمی کی چھٹی ختم کر کے میں جیسے ہی جمشید پور پہنچا ایک عزیز اظہار ہاشمی کی شادی کا کارڈ ملا۔ وہ بھی ایسے وقت جب شادی کو صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ میں نے تمیم کو فون لگایا کہ تمہارے دوست کی شادی ہونے جا رہی ہے اگر شادی میں شرکت کرنی ہے تو کل کی تیاری کر لو۔ وہ بھی میرے اس مشورے کو مان گیا اور چلنے کو تیار ہو گیا۔ ٹاٹا نگر اسٹیشن سے ٹاٹا۔ چھپرہ ایکسپریس پکڑ کر دونوں سمستی پور پہنچے۔ سمستی پور سے دربھنگہ جانے کے لیے بس پکڑنا تھا لیکن بارش کسی بیوہ کے آنسو کی طرح رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کسی طرح دربھنگہ بس اسٹانڈ پہنچے تو ایک عجیب منظر دیکھنے کو ملا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بارش کا پانی اوپر اور دربھنگہ شہر نیچے آگیا ہو۔ بس اسٹانڈ پر گھٹنے تک کیچڑ اور اسی کیچڑ میں لت پت دو عدد بسیں کھڑی تھیں۔ بس کو مکھن دار کیچڑ کا میک اپ دیکھ کر ہندوستانی عورتوں کی حالت پر ترس آنے لگا کہ کس طرح گھر کے اخراجات سے کٹوتی کر کے میک اپ کا سامان جٹاتی ہیں۔

سنا ہے ہمارے ریل منتری نے دربھنگہ شہر کو خوبصورت بنانے کے لیے کئی کروڑ روپیہ دیا ہے۔ دربھنگہ شہر تو خوب صورت نہیں بن سکا ہاں ان لوگوں کا بنگلہ اور بھی خوب صورت بن گیا جن کو یہ کام کرانا تھا۔ پہلے ان لوگوں کے پاس سائیکل بھی نہیں تھی۔ اب تو وہ دو ٹاٹا سومو کے مالک ہیں۔ امید ہے کہ دربھنگہ شہر ان ٹھیکیداروں کے کاغذ پر خوب صورت ضرور بن گیا ہوگا۔

ہاں تو بات اظہار ہاشمی کی شادی کی چل رہی تھی۔ ہم لوگوں کو جس گاؤں میں جانا تھا۔ اس کا نام بھی کافی چن کر رکھا گیا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے "بنول" اب جس گاؤں کا نام ہی بنول ہوگا۔ بھلا وہاں کے لوگ کیسے ہوں گے۔ کافی انتظار کے بعد فراٹے بھرتی کیچڑ اڑاتی، دل دھڑکاتی ایک بس آئی تو میں نے ایک صاحب سے پوچھا، بھائی صاحب! کیا یہی بس بنول جائے گی؟ وہ صاحب ہاں۔ ہاں کہتے ہوئے اسی بس کی طرف لپکے۔ ہم دونوں نے بھی جگہ لینے کے لیے بس کی طرف دوڑ لگائی۔ بڑی مشکل سے کودتے پھاندتے کچھ مداری کے بندر کی طرح کرتب دکھاتے ہم دونوں بس پر سوار ہوئے اور ایک خالی سیٹ پر قبضہ جمایا۔ اب میں نے ایک نظر پوری بس پر ڈالی تاکہ پتہ چلے کہ بس میں ساتھ کیسے لوگ سفر کر رہے ہیں۔ لوگوں کا اندازہ تو نہیں ہو سکا مگر بس کا اندازہ پورا پورا ہو گیا کہ بس کے اندر آپ کسی بھی طرف سے داخل ہو سکتے ہیں یا باہر جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ چاروں طرف کے شیشے غائب تھے۔ بس میں داخل ہونے کے لیے ہر طرف دروازے ہی دروازے تھے۔ کچھ ہی دیر میں عورتوں، بچوں اور لڑکیوں سے پوری بس بھر گئی۔

خلاصی کے ذریعہ مخصوص انداز میں بس پیٹنے کے بعد بس اپنی منزل کی طرف کسی طرح روانہ ہوئی۔ میں نے خدا

کا شکر ادا کیا کہ بس چلی تو سہی۔ ورنہ اس بس کو چلانا ڈرائیور کے بس کی بات نہ تھی۔ ورنہ یہ بس رام بھروسے ہی چل سکتی ہے۔ ابھی وہ چار کیلو میٹر کا سفر ہی طے کر سکی تھی کہ پھر زوردار بارش شروع ہو گئی۔ چاروں طرف سے بارش کا پانی بس کے اندر داخل ہونے لگا۔ بس چل کیا رہی تھی کس طرح آگے بڑھ رہی تھی کبھی کبھی تو زوردار ہچکولے بھی کھاتی۔ مانو اس کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہو۔ ڈرائیور بریک لگاتا تو پوری چھت آگے کی طرف جھک جاتی اور جب چھوڑتا تو چھت واپس اپنی جگہ پر آجاتی۔ بس کی بے بسی دیکھ کر میں ڈر گیا کہ کہیں میرے سامنے بیٹھی ہوئی حاملہ عورت کے ساتھ کوئی واقعہ نہ پیش آجائے۔

بارش اپنی اسی رفتار سے جاری تھی اور بس کی سست رفتاری اپنی جگہ قائم۔ کبھی کبھی بس کو چھینک بھی آتی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے تیز بارش میں دیر تک بھیگنے سے بس کو سردی زکام ہو گیا ہو۔ بارش کے پانی سے بچنے کے لیے بس میں سوار لوگوں نے اپنی اپنی چھتری کھول لی۔ جس کے پاس چھتری نہیں تھی وہ دوسروں کی چھتری کا سہارا لینے کی کوشش میں لگے تھے۔ ایسی حالت میں فیملی والوں نے بھی اپنی عورتوں کو آزاد کر دیا۔ تاکہ وہ کسی کی چھتری میں پناہ لے سکیں۔ اور پھر کسی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کون چھتری میں کس کی فیملی ہے تبھی اچانک بس سڑک چھوڑ کر نیچے ڈھلان کی طرف جانے لگی۔ میں نے اپنی چھتری سے گردن نکال کر خلاصی سے پوچھا۔ ارے بھائی بس کو کہاں لے جا رہے ہو "خلاصی نے جواب دیا حضور یہاں سے کھیت کھیت۔ میں نے گھبراہٹ میں خلاصی کو ڈانٹ کر پوچھا کھیتے کھیت کا مطلب "اس نے کہا۔ بابو جی آگے کی سامنے والا پل ٹوٹا ہوا ہے۔ اس لیے آدھا کیلو میٹر کھیتے کھیت۔

بس کھیت میں اترتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کبھی اچانک آگے سے اٹھتی۔ کبھی دائیں کروٹ لیتی کبھی بائیں۔ اور اس کروٹ کا پورا پورا فائدہ چھتری والے لوگ اٹھانے کی کوشش میں لگے تھے۔ اور لوگ ایک دوسرے سے گلے ملتے رہے اور چپکتے رہے جیسے عید ملن ہو رہا ہو۔ فیملی والوں کو بھی ہوش نہیں تھا کہ ان کی بہو بیٹیاں کہاں ہیں اور کس کی چھتری میں گم ہیں۔ اسی درمیان ڈرائیور کے زور زور سے گانے کی آواز آرہی تھی۔

"چل میری دھنو چنے کے کھیت میں"

کچھ دیر بعد بس پھر سڑک پر آگئی۔ تب لوگوں نے چین کی سانس لی۔ اور فیملی والوں نے اپنی اپنی عورتوں کو ڈھونڈنا شروع کیا اور چھتری والوں سے انہیں الگ کیا۔ بے چارے چھتری والے مسافر آہ بھر کر ہی رہ گئے کہ کاش یہ سفر آدھا کیلو میٹر کے بجائے زندگی بھر کا ہوتا۔

خدا خدا کر کے بس اپنی منزل تک پہنچ ہی گئی۔ میں اور شمیم دونوں بس سے اترے تو دیکھا کہ بس بارش کے پانی سے دھل کر صاف ستھری ہو چکی تھی تبھی اچانک شمیم کی آواز پر میں چونکا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ سر اس بس کا نام تو دیکھیے کیا لکھا ہے "ہندی میں لکھا تھا" گوبند کی پری بہن "میں نے ایک بار پھر خلاصی سے پوچھا۔ یہ کیسا نام ہے "خلاصی نے جواب دیا حضور! اصل میں اس بس کا نام" گوبند پری دہن "ہے۔ لیکن کسی منچلے نے اس کو رات کے اندھیرے میں ایسا کر دیا ہے۔

پیارے بھائیو! ایک بار آپ بھی "منزل" گاؤں کا سفر ضرور کریں اور "گوبند کی پری بہن" کا پورا پورا مزہ لیں۔ لیکن شرط ہے برسات میں۔

دلشاد رضوی
حیدرآباد

دیواروں کے کان

ہم نے بڑے بزرگوں سے سنا، جوانوں نوجوانوں سے سنا، حتیٰ کہ اپنی گھر والی بھی یہی کہتی آئی ہے کہ میاں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ سنتے سنتے جب خود ہمارے کان پک گئے تب ہم نے اس بات کی تصدیق کی خاطر شہر کی مختلف دیواروں کا ٹھوک بجا کر معائنہ کیا۔ نئی سے نئی اور بوسیدہ سے بوسیدہ دیواریں چھان ماریں پر کیا مجال کہ کہیں کوئی کان یا کان نما شئے پائی گئی ہو۔ تھک ہار کر اداس بیٹھے ہی تھے کہ میاں فلسفی آدھمکے اور ہمیں اس حال میں حیران دیکھ کر بے اختیار کھل اٹھے ہو سکتا ہے کہ تب ہمارے اندر بھی انہیں فلسفیانہ کیفیات دکھائی دی ہوں۔ بات کی تہہ کو پہنچنے کے لئے اداسی کی وجہ پوچھی۔ ہم تو بھرے بیٹھے ہی تھے بلا جھجک چیخ چیخ کر انہیں بتلا دیا کہ لوگ کس طرح بیکار کی افواہیں اڑاتے ہیں جسے دیکھو کہتا ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں بھلے کوئی آنکھ والا ہمیں عملاً بتلا دے کہ وہ کونسی دیوار چین ہے کہ جس میں دو نہیں نا سہی کم از کم ایک ہی کان جڑا ہوا ہو۔ ہماری بات سن کر میاں فلسفی ہنس پڑے۔ بولے "ہوتے ہیں بچو ہوتے ہیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں لیکن وہ دیوار ایسی ویسی نہیں ہوتی صاحبزادے وہ تو ہو بہو آدمی جیسی ہوتی ہے یقین نہ آئے تو کسی تیسرے آدمی کے سامنے کوئی راز کی بات کہہ ڈالو پھر دیکھو کہ وہ کیونکر دیوار میں جڑے کان لئے پھرتا ہے"۔ بات کچھ ہمارے پلے نہیں پڑی پر ہم نے سوچا کہ میاں فلسفی سے ہم کہاں جیت پائیں گے چنانچہ جب وہ چپ ہو گئے تو ہم نے بھی چپ سادھ لی۔

کچھ دیر بعد حمید میاں سے جب ہم گپ شپ ہانک رہے تھے تب وہاں قمرو میاں آگئے اور لگے ہماری باتیں سننے۔ ہمارے دل میں بھلا کونسا چور چھپا بیٹھا تھا چنانچہ ہم آپس میں دل ملا کر باتیں کرتے رہے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں جب بشیر میاں کا ذکر خیر نکلا تب بیساختہ ہم نے کہا "یار آدمی ہو تو بشیر میاں جیسا ہو، واللہ کیا دلچسپ آدمی ہے" اور بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد جب بشیر میاں ملے تو کافی اینٹھے اینٹھے سے ملے۔ ہم نے مزاج پرسی بھی کی تو کچھ روکھا سوکھا سا جواب دے دیا۔ اب صاحب کہاں ان کی وہ ظرافت اور کہاں یہ روکھا پن، ہم سے رہا نہیں گیا اور جب ہم نے وجہ جاننے کے لئے منت سماجت کی تو وہ تند لہجے میں بولے، جناب قمرو میاں کہتے تھے کہ آپ نے ہمیں مسخرہ گردانا ہے بھلا ہم آپ کو مسخرے لگتے ہیں؟ اب تو ہمارا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ہم نے کہا "بھائی توبہ توبہ ہم کان کو ہاتھ لگاتے ہیں بھلا ہم اور آپ کی شان میں یہ گستاخی! ہم نے تو سدا یہ مانا ہے کہ آپ جیسے دلچسپ آدمی کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں، جب بھی یہی کہا تھا اب بھی یہی کہتے ہیں، لو ہزار بار کہیں گے ہمیں ڈر کس کا ہے" ابھی ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ قمرو میاں تیزی سے جاتے ہوئے نظر آئے۔ ہم نے لپک کر انہیں دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا اور جب پوچھا تو وہ بڑی بے باکی سے کہنے لگے "ہاں ہاں بے شک آپ نے بشیر میاں کو مسخرہ کہا تھا" اب تو ہم سٹپٹائے اور جب مکرر پوچھا تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے

"کیا آپ نے انہیں دلچسپ آدمی نہیں کہا تھا بھلا مسخرے اور دلچسپ میں فرق ہی کیا ہوتا ہے" ۔ اتنا سننا تھا کہ ضمیر میاں بھائو اور ہم ان کا منہ تکنے لگے اور وہیں میاں ضمیر پانی پانی ہوگئے جب ہم دونوں نے مل کر قمرو میاں کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کیا تو وہ وہاں سے ایسے رفو چکر ہوئے کہ پھر پلٹ کر بھی نہ دیکھا ۔ لیکن جب میاں نظیر کی صاحبزادی سے غفور میاں کے پیغام کی بات چل پڑی تب دوبارہ قمرو میاں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ۔ ہوا یوں کہ میاں نظیر ہمارے نہایت عزیز دوست تھے اور حسن اتفاق کہ غفور میاں سے بھی ہمارے خاندانی مراسم تھے جب یہ بات نظیر میاں کو معلوم ہوئی تب انہوں نے ہمیں بلایا اور غفور میاں کی بابت راز کی باتیں دریافت کرنے لگے ۔ ہم نے کہا "بھائی یقین مانو غفور جیسا سید ھا لڑکا تمہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملے گا سوائے اس کے کہ اس کی بس ایک کمزوری ہے کہ وہ چائے بہت پیتا ہے" ہم جب "بہت پیتا ہے" کہہ رہے تھے عین اس وقت قمرو میاں وہاں سے گزر رہے ۔ اپنی بات مکمل کرکے اور غفور میاں کی تعریفوں کے پل باندھ کر بڑی دیر بعد جب ہم گھر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں غفور منہ پھلائے ہمارے دیوان خانہ میں براجمان ہیں ۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ جھپٹ پڑے بولے "آپ سے ایسی امید نہ تھی" ۔ ہم بولے "کیسی امید نہ تھی" وہ خفگی بھرے لہجے میں بولے "انجان نہ بنیئے ۔ آپ نے جان بوجھ کر نظیر صاحب سے کہا ہے کہ ہم پیتے بہت ہیں ۔ بھلا آپ نے ہمیں کونسے بار میں پیتا ہوا پایا تھا" ۔ اتنا سنتے ہی ہمارے ہوش اڑ گئے پر ہم نے جلد ہی اڑتے ہوئے ہوش و حواس کو یکجا کیا اور ان سے کہا کہ "میاں ہوش کے ناخن لو ۔ ہم اور تمہارے بارے میں ایسی بات کہیں ، ارے لاحول پڑھو لاحول" ۔ لیکن وہ مصر تھے کہ ہم نے کہا ہے اور یقیناً کہا ہے کیونکہ ان کے ہاں گواہ موجود تھا ۔ اب تو ہم سے رہا نہ گیا اور ہم ان کا ہاتھ پکڑے دوڑے دوڑے نظیر میاں کے ہاں گئے ۔ ہم دونوں کو اکٹھا آتا دیکھ کر نظیر میاں پہلے تو ہڑبڑائے پھر ہکلا کر ہماری آمد کی وجہ پوچھی ۔ جب ہم نے بلا کم و کاست سارا واقعہ سنایا تب وہ غفور میاں سے یوں مخاطب ہوئے "بھلا آپ کو ان سے ایسی امید ہے کہ یہ آپ کے بارے میں یوں بے سروپا اڑائیں گے ۔ ہاں یہ ضرور انہوں نے کہا تھا کہ آپ چائے بہت پیتے ہیں ۔ ارے چاء پینا بھی کوئی گناہ ہے یہ تو خود ہماری ہی گھٹی میں پڑی ہے پیجئے پیجئے جتنی چاہے پیجئے" یہ کہکر انہوں نے چائے کی پیالی غفور میاں کے آگے بڑھادی اور غفور میاں فوراً ہی غٹاغٹ نوش کر گئے ۔ پھر جب ہم نے غفور میاں کو ٹٹولا تو وہ بڑے پس و پیش کے بعد یوں گویا ہوئے کہ یہ تمام قمرو میاں کی زبانی انہیں معلوم ہوا تھا ۔ اب تو ہم کو بڑا غصہ آیا اور جب ہم دونوں نے قمرو میاں کو جا پکڑا تب وہ ڈھٹائی سے کہنے لگے "بھائی ہم تو راستہ سے گزر رہے تھے ۔ گزرتے گزرتے جب آپ سے سنا کہ غفور میاں پیتے بہت ہیں تو بخدا ہم سے رہا نہیں گیا اب آپ ہی بتلایئے کہ بھلا ہم کوئی غیر ہیں کہ احساس کر بھی انجان رہتے لہٰذا ہم نے اپنی دیرینہ خیر خواہی کی بنا پر انہیں ہوشیار کر دیا کہ بابا یہ پینے پلانے کا چکر چھوڑ دو ابھی ہم نظیر میاں کے جگری دوست سے تمہاری شکایت سن کر آئے ہیں وہ کہتے تھے کہ تم پیتے بہت ہو اگر یہی حال رہا تو تمہاری شادی خانہ آبادی ہونے سے رہی ۔ کہیئے کہ اس میں کونسی بری بات ہو گئی" قمرو میاں کے ان زرین کلمات کو سن ہم دونوں نے اپنے سر تھام لئے اور ہم سوچنے لگے کہ آخر ہر تیسرے آدمی کو سوجھتی کیا ہے کہ وہ اپنی ٹانگ اڑا کر لوگوں کے دلوں میں رنجش ڈال دیتا ہے اور خود دور کھڑا تالیاں بجاتا ہے ۔ ابھی ہم کسی نتیجہ پر پہنچے بھی نہ تھے کہ فلسفی نے جھک کر ہمارے کان میں یوں پھونکا کہ میاں میں نہ کہتا تھا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں آئندہ جب کبھی بات کرو تو تیسرے آدمی کو بھی دیکھ لیا کرو۔

نامور طنز و مزاح نگار ابراہیم جلیس کے دو مضامین

۱۔ میاں شوہر۔ بیوی شوفر
۲۔ لپ اسٹک سے واکنگ اسٹک تک

(۱)

کل تلک منے کو لپنے تو سلا سکتی نہ تھی
آج بندر روڈ پر موٹر چلا سکتی ہے تو

آج کل پاکستانی خواتین میں موٹر ڈرائیو کرنے لیعنی خود موٹر چلانے کا شوق دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ جب سے عورتوں میں سیلف (Self) لیعنی "خودی" بیدار ہوئی ہے وہ سیلف ڈرائیونگ کو بھی خاص ترجیح دے رہی ہیں۔ چنانچہ آج پاکستانی شہروں کی سڑکوں پر عورتوں کو موٹر چلانے کا نظارہ عام ہے

پہلے تو کار کی سواری کے لئے ہماری خواتین یا تو "شوفر" کی محتاج ہوتی تھیں یا پھر "شوہر" کی۔ لیکن خواتین میں سماجی بیداری نے جہاں عورتوں کو "شوہر" کی محتاجی سے آزاد کر دیا ہے یا کر دی ہے وہاں عورت "شوفر" کی محتاجی سے بھی آزاد ہوتی جا رہی ہے۔

اب تو عالم یہ ہو گیا ہے کہ کار میں بیوی وہاں بیٹھتی ہے جہاں پہلے شوہر یا شوفر بیٹھتا تھا اور شوہر یا شوفر وہاں بیٹھتے ہیں جہاں پہلے بیوی یا بیگم صاحب بیٹھتی تھیں۔

ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ گھما رہی ہیں تو دوسرے ہاتھ سے دوپٹہ سنبھال رہی ہیں اور جہاں ٹریفک سگنل یا ٹریفک کانسٹبل نے ٹریفک روک دی۔ بس انہوں نے فوراً اپنے وائلٹ بیگ سے لپ اسٹک نکالی اور ننھے سے "بیک مرر" میں جھانک کر ہونٹوں پر لالی لگانی شروع کر دی۔

اور بعض اوقات تو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ٹریفک کی "ہری بتی" بھی جل اٹھی مگر بیگم صاحب کی ہونٹوں کی "لالی" ٹریفک کو روکے ہوئے ہی ہے۔

کار میں ونڈ اسکرین کے اوپر جو چھوٹا سا آئینہ لگا ہوتا ہے، اس کا اصل مصرف تو یہ ہے کہ کار چلانے والے اس کے ذریعہ پیچھے سے آنے والی گاڑیوں پر نظر رکھیں، خواتین کو شاید یہ بات ابھی تک معلوم نہیں ہوئی اور وہ اسے "بیک مرر" کے بجائے "وائلٹ مرر" ہی سمجھتی ہیں اور ایک خاتون کا استدلال تو یہ ہے کہ جس کار میں "بیک مرر" ہوتا ہے وہ

دراصل "لیڈیز کار" ہے اور اگر یہ استدلال صحیح ہے تو پھر ہر کار لیڈیز کار ہے کیونکہ یہ چھوٹا آئینہ تقریباً ہر کار میں لگا ہوتا ہے اس کے علاوہ یہ استدلال ہمیں اس لئے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ استدلال میں بھی لفظ "لال" موجود ہے اور لپ اسٹک بھی لال رنگ کی ہوتی ہے اور چھوٹے آئینے بالعموم لپ اسٹک لگانے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔

عورتوں کے کار چلانے پر ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہاں البتہ شہر کے محکمہ بجلی یا ٹیلی فون کو ہو تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ سڑکوں پر جتنے کھمبے لگے ہوتے ہیں وہ یا تو بجلی کے ہوتے ہیں یا ٹیلی فون کے۔ جنھیں کار چلانے والی خواتین کار روکنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ خواتین نے ابھی نیا نیا کار چلانا سیکھا ہے یعنی انہوں نے فی الوقت کار چلانا تو سیکھ لیا ہے لیکن کار روکنا نہیں سیکھا ہے۔ ویسے مقام شکر یہ ہے کہ ہماری کار چلانے والی خواتین نے راہ گیروں سے کار روکنے میں اب تک بڑی احتیاط سے کام لیا ہے ایسے اگر کوئی اکے دکے واقعات بھی ہوئے ہیں جس میں کار چلانے والی عورت نے بریک کے بجائے راہگیر سے کار روکی ہو تو وہ معاملہ اور ہی ہے یعنی اس میں کار چلانے والی خاتون کا کوئی قصور نہیں بلکہ اس آدمی کا قصور ہے جو کار کے سامنے یا کار کے نیچے آیا۔ ایسے واقعات کے بارے میں "شعری توجیہہ" تو یہ ہے کہ

جس کو موت آتی نہیں ہے عشق کے آزار سے
دب کے مرجاتا ہے وہ لیڈی کی موٹر کار سے

خواتین میں موٹر چلانے کے دن بدن بڑھتے ہوئے شوق کے مدنظر جاپان کی ایک موٹر ساز کمپنی نے عورتوں کے لئے ایک مخصوص موٹر کار ایجاد کی ہے جس کی قیمت اکیس سو ڈالر بتائی گئی ہے اس موٹر کار میں خواتین کے سنگھار اور تبدیلی لباس کا معقول انتظام رکھا گیا ہے۔ یعنی کار چلاتے ہوئے "گیر" بدلنے کے علاوہ وہ لباس بھی بدل سکتی ہیں اور بریک لگانے کے ساتھ ساتھ وہ لپ اسٹک بھی لگا سکتی ہیں۔ بالخصوص اس کے "اسٹیرنگ" کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایسا بنایا گیا ہے کہ عورت کا اس سے وہی "تعلق خاطر" پیدا ہو سکتا ہے جو بالعموم "میریج رنگ" یا "انگیجمنٹ رنگ" "MARRIAGE RING" OR "ENGAGEMENT RING" سے ہوتا ہے۔

عورتوں کے لئے "لیڈیز کار" نہایت ضروری تھی۔ جب "لیڈیز بائیسکل" مردوں کی بائسکل سے مختلف ہوتی ہے۔ عورتوں کی کار بھی عورتوں کی طرح سبک، نازک اندام اور خوبصورت ہونی چاہئے۔ یہ بھلا کیا ہے کہ کار اتنی بڑی اور کار چلانے والی خاتون اتنی چھوٹی۔ کہ نظر ہی نہیں آئے اور لوگ سمجھیں کہ بغیر ڈرائیور کے کوئی آٹو میٹک کار دوڑی جارہی ہے یا پھر یہ ظاہر ہو کہ کار چلانے والی خاتون پردے کی سختی سے پابند ہے۔ ویسے ہم نے کراچی میں پردہ نشینی اور کار ڈرائیونگ دونوں کو اکٹھے بھی دیکھا ہے۔ کراچی میں ایک خاتون ایسی بھی ہے جو بھرپور برقعہ اوڑھ کر چہرے کو نقاب سے اچھی طرح ڈھانک کر کار چلاتی ہیں جنہیں بیک نظر دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی نقاب پوش ڈاکو کسی کی کار اڑائے لئے جارہا ہے۔ وہ خاتون ہمیں معاف کریں یہ محض نظر کے دھوکے اور ان کی مہارت کی بات ہے۔

ہم خواتین کے کار چلانے کے قطعاً مخالف نہیں بلکہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہماری خواتین صرف کار ہی نہ چلائیں بس چلائیں، ٹرک چلائیں، ریل چلائیں، ہوائی جہاز چلائیں۔ ہماری تو یہ خواہش ہے کہ پاکستان کی ہر عورت کار چلانے آپائیں بھی چلائیں، بیگم بھی چلائے اور بی بی بھی چلائے۔

زمانہ اب بہت بدل گیا ہے، اب وہ زمانہ نہیں رہا جبکہ اپنے ملک میں
"ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور باپ حقہ پیتا تھا۔۔"
اب تو وہ زمانہ آگیا ہے کہ
" باپ بچے کو گود میں لئے بیوی کے ساتھ بیٹھا ہے اور بیوی موٹر چلا رہی ہے"۔
آزادیِ نسواں کی تحریک نے جب عورت کو مرد کے برابر کا درجہ دے دیا ہے تو عورت اور مرد لفظی اعتبار سے برابر ہونے چاہئیں۔ میاں شوہر تو عورت شوفر۔

کیا مزا آئے گا یارو جب چلائے گی وہ کار
ہر سڑک ہو جائے گی چہرے سے اس کے لالہ زار

(۲)

پاکستان بننے سے پہلے جب کوئی عورت اس طرح چیختی۔ "ہائے اللہ۔ میں تو مری جارہی ہوں"۔
تو اس عورت کے رشتہ دار پریشان ہو کر ڈاکٹر یا حکیم کو بلانے دوڑتے تھے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد جب کوئی عورت اس طرح چیختی ہے۔
تو اس کے رشتہ دار اور سہیلیاں رشک آمیز نظروں سے اسے دیکھتی ہیں اور اس سے پوچھنے لگتی ہیں۔
کب جارہی ہو؟ کس کے ساتھ جارہی ہو۔؟
ہمیں بھی ساتھ لے چلو نا۔ وغیرہ وغیرہ۔
پاکستان میں جیسے ہی گرمی کا موسم شروع ہوجاتا ہے، پیسے والی عورتیں "کوہ مری" جانا شروع کر دیتی ہیں اور غریب عورتیں گرمی کے مارے "آہ مری، آہ مری" کرتی رہ جاتی ہیں۔ غریب عورتوں سے پہاڑ جیسی گرمی کاٹے نہیں کٹتی۔ اور امیر عورتیں ساری گرمی مری کے پہاڑ پر کاٹ دیتی ہیں۔
آدمی "مرنے" سے بہت ڈرتا ہے، لیکن "مری جانے" سے بالکل نہیں ڈرتا۔ بلکہ پاکستان کا ہر آدمی مری جانے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ ہر ایک دل میں مری جانے کی حسرت ہوتی ہے۔
ہر انسان ایک بار مرتا ہے۔ لیکن پاکستان کا انسان "ایک بار مری اور ایک بار مرجاتا ہے"۔ اور اگر وہ مری نہ جائے تو اس کے دل میں حسرت ضرور ہوتی ہے کہ
"ایک بار مری جائیں پھر مرجائیں تو پھر کوئی پرواہ نہیں۔"
مری جانے کی خواہش مردوں میں اتنی نہیں ہوتی۔ جتنی کہ عورتوں میں ہوتی ہے۔ عورتیں جیسے مری جانے کے لئے مرتی رہتی ہیں۔ جس بے چین عورت سے پوچھئے کہ
"کیوں مری جارہی ہے؟"

تو یہی پتہ چلتا ہے کہ
"مری جانے کے لئے مری جا رہی ہے"۔

عورت اور مری ـــ مری کی چوٹیاں اور عورت کی چٹکیاں ـــ مری کے نشیب و فراز اور ـــــ بہر نو عورت اور مری میں بڑی مناسبتیں اور مشابہتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال گرمیوں میں مری میں عورتوں کی بہتات ہو جاتی ہے چنانچہ ہر سال خبر آتی ہے کہ اس سال بھی مری کے سیاحوں میں عورتیں مردوں سے زیادہ ہیں۔ اور اس ـ تو ایک نظارہ یہ بھی ہے کہ مری میں جوان سال لڑکیاں جب سیر کے لئے باہر نکلتی ہیں تو ان کے جسم پر جلد کی ط منڈھی ہوئی قمیضیں اور تنگ مہری کی شلوار کے علاوہ ہاتھ میں ایک "بید کی چھڑی" بھی ضرور ہوتی ہے۔ یہ ایک پ رواج ہے کہ آدمی جب سیر کرنے کے لئے نکلتا ہے تو وہ ہاتھ میں ایک چھڑی واکنگ اسٹک ضرور رکھتا ہے۔ سنا ہے واکنگ اسٹک کا رواج یوں چلا کہ جب دنیا کا وہ پہلا آدمی جو سیر کرنے کے لئے جنگل میں گیا تو نہتا تھا۔ راستے میں اک سانپ نے اسے کاٹ لیا۔ اس کے بعد سے جو لوگ سیر کو نکلنے لگے، وہ احتیاطاً ہاتھ میں چھڑی لے کر نکلنے لگے۔ اور اس بعد سے یہ رواج پڑ گیا۔ سیر کے دوران سانپ ملے یا نہ ملے، ہاتھ میں "واکنگ اسٹک" ضرور ہوتی ہے اور یہ ایک رو بن گیا ہے۔

اس لئے اگر مری کی لڑکیوں نے ہاتھ میں چھڑیاں رکھنی شروع کر دیں تو نہ جانے پاکستان بھر کے اخبار وں کالم نویسوں کو کیا ہوا کہ سارے اخبارات میں اس "چھڑی" کے خلاف اعتراضات اور مذاق کی "چھڑی" لگی ہوئی ہے۔

مری کی لڑکی ـــ بلکہ یہاں لڑکی کو "کڑی" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ مری پاکستان کے اس علاقہ زیادہ قریب ہے جہاں پنجابی زبان بولی جاتی ہے۔ اور پنجابی میں لڑکی کو کڑی کہا جاتا ہے اور مری سمیت اس علاقہ لوگ لڑکی کو اتنی آسانی سے نہیں سمجھتے جتنی آسانی سے "کڑی" کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ لڑکی اردو بولتی ہے اور کڑ پنجابی وچ گل کر دی اے۔

اس کے علاوہ ہمیں یہ آسانی ہے کہ چھڑی کا قافیہ بآسانی کڑی سے مل جاتا ہے مثلاً
" مری کی کڑی کلائی پر گھڑی باندھے ہاتھ میں چھڑی گھڑی۔
گھڑی گھماتی کھڑی ہے"۔

ہمارے خیال میں مردوں کا مری کی لڑکیوں کے ہاتھ میں چھڑی پر اعتراض کرنا یا مذاق اڑانا بڑی نازیبا بات انہوں نے محض فیشن کے طور پر ـــ ہاتھ میں چھڑی رکھی ہے۔

جیسی ہونٹوں پر لپ اسٹک
ویسی ہاتھوں میں واکنگ اسٹک

اس پر مذاق یا اعتراض کا کیا جواز۔؟

یہ بھی ممکن ہے کہ مری کی لڑکیاں فیشن کے طور پر نہیں بلکہ حفظ ماتقدم کے طور پر ہاتھوں میں چھڑیاں رکھتی ہوا کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ

مری کا موسم مردوں کے لئے بڑا ہیجان خیز اور حوصلہ افزا ہوتا ہے۔ یہاں مردوں کے

حوصلے بڑھتے ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان فاصلے کم ہو جائیں۔

شادی شدہ مرد تو لڑکیوں کو نہیں چھیڑتے۔ البتہ کنوارے یعنی عرف عام میں "چھڑے" ہی لڑکیوں کو چھیڑا کرتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مری کی لڑکیوں نے "چھڑوں" کی چھیڑ چھاڑ سے بچنے کے لئے ہاتھوں میں "چھڑیاں" رکھنی شروع کر دی ہوں کہ

جہاں کسی چھڑے نے کسی لڑکی کو چھیڑا کہ لڑکی نے چھڑی سے چھڑے کو چھڑا چھڑا ایسا
مارا کہ وہ ہوٹل کے بستر سے بکھر کر اسپتال میں سڑنے لگا۔

اگر یہ وجہ نہ بھی ہو، تب بھی لڑکی کے ہاتھ میں چھڑی پکڑنے کو ہم ایک نیک فال سمجھتے ہیں۔ ابتدا اچھی ہے۔ ورنہ اپنے ملک کی لڑکی اس سے پہلے سوائے لپ اسٹک کے اور کچھ پکڑتی ہی نہ تھی۔ لپ اسٹک سے واکنگ اسٹک۔ ترقی اچھی ہے۔ آج واکنگ اسٹک پکڑ رہی ہے تو کل رائفل پکڑے گی۔ انشاء اللہ سا

مرا جشن منایا جائے

میں جو روٹھوں تو مجھے خوب منایا جائے
جب پڑھوں شعر تو مصرع کو اٹھایا جائے
ڈھول کی تھاپ پہ نغمہ مرا گایا جائے
ایک سپنا مجھے ہر روز دکھایا جائے
میں بھی شاعر ہوں مرا جشن منایا جائے

اچھی غزلوں کو رسالوں سے چرالیتا ہوں
شعر استاد سے لے کر بھی سنا لیتا ہوں
داد لوگوں سے بہر حال میں پالیتا ہوں
میرے دیوان کو شائع بھی کرایا جائے
میں بھی شاعر ہوں مرا جشن منایا جائے

جس کو دیکھو وہ نشستوں میں بلاتا ہے مجھے
کہیں دلی کہیں ممبرا نظر آتا ہے مجھے
شعر سن کر کوئی پیدل بھی بھگاتا ہے مجھے
اب سڑک پر مجھے پیدل نہ چلایا جائے
میں بھی شاعر ہوں مرا جشن منایا جائے

سیکولر ہوں مجھے ہندو نہ مسلمان کہو
میں ادب کا ہوں نگہبان نگہبان کہو
میں جو کہتا ہوں اسے وقت کا فرمان کہو
میرے منہ پر کوئی تالا نہ لگایا جائے
میں بھی شاعر ہوں مرا جشن منایا جائے

کہتے ہیں طنز و ظرافت کا مجھے سب استاد
میرے اشعار کا دیتے ہیں حوالہ نقاد
کیا کہا آپ نے کیا خوب مکرر ارشاد
ہر مہینے مجھے ٹی ۔ وی پہ بلایا جائے
میں بھی شاعر ہوں مرا جشن منایا جائے

راہ میں آئے ہیں جتنے بھی ادب کے دشمن
طنز کے میں نے لگائے ہیں انہیں انجکشن
شاعری میں مری کچھ کم تو نہیں پوزیشن
انڈیا بھر میں مجھے کیوں نہ بلایا جائے
میں بھی شاعر ہوں مرا جشن منایا جائے

مذاق جہانسوی،
نندن پورہ، سپری بازار، جہانسی۔

انور سدید
اقبال ٹاؤن
لاہور (پاکستان)

طنز و مزاح کا ایک سال

اگلے دن ایک دوست فرمانے لگے کہ مزاح لالہ خودرو کی طرح ہمارے چاروں طرف خود بخود اگتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے اور سچ پوچھیے تو یہ کائنات خالق کائنات کا تخلیقی مزاح ہے۔ لیکن طنز ہم خود پیدا کرتے اور یہ محل و مواقع کے تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مزاح توازن و اعتدال پیدا کرتا ہے اور طنز کی شکر رنجی تشنج ابھارتی ہے۔ بحث چل نکلی تو ایک اور دوست بولے مزاح ایک کیفیت کا نام ہے جو کہ لازمی طور پر عارضی ہے اور اگر یہ مستقل ہو جائے تو انسان کو بہت جلد مسخرا یا پاگل قرار دے دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مثال فلسفی کی دی جو طبیعات اور مابعد طبیعات کی گتھیاں سلجھانے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر مسئلے میں اس قدر الجھ جاتا ہے کہ لوگ اسے پاگل سمجھنے لگتے ہیں اور جب وہ اپنی ہی نکتہ آرائی پر خود بے اختیار قہقہہ مارتا ہے تو لوگ اسے مسخرا کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے میاں سعید صاحب نے کہا کہ فلسفہ بذات خود مزاح ہے یعنی فلسفی کوئی ایک مسئلہ پکڑتا ہے پھر اس کے تخیل کی اڑان ہو یا حقیقی پرواز۔ اس مسئلہ پر کئی اطراف سے یلغار کرتا ہے اور اس ایک معصوم مسئلے کو کئی مسائل میں تبدیل کر کے

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بھلا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

کے مثل خود معصومیت سے ایک طرف ہو کر کوئی اور مسئلہ پکڑ لیتا ہے اور اسے مزید الجھانا شروع کر دیتا ہے"

میاں سعید صاحب نے اس نکتے کی مزید وضاحت چھنانے خان کی گائیکی سے کی تو یہ بذات خود ایک پر لطف مزاح پارہ بن گیا وہ "راوی" لاہور میں لکھتے ہیں۔

"یوں کہہ لیں وہ فلسفی مشہور گائیک چھنانے خان کی طرح ایک سیدھے سادے مصرع کو اپنے پلپلے سے منہ میں ڈال کر بری طرح رولتے ہیں جب وہ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے تو اس میں موسیقی اور اپنی کھانسی کی آمیزش کر کے سننے والے کو پیش کر دیتے ہیں کہ اب سننے والا سنے اور سر دھنے"

میں نے یہ تمہید اس لیے باندھی ہے کہ اہل علم و ادب بالعموم شکایت کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں مزاح پیدا نہیں ہوتا اور جو پیدا ہوتا ہے کہ وہ اتنا قلیل اور ناکافی ہے کہ معاشرے میں فی کس ایک مسکراہٹ بھی تقسیم نہیں کر پاتا۔ البتہ طنز کی فراوانی ہے اور معاشرے کا ہر فرد اپنی آنکھ کے شہتیر کو محسوس کیے بغیر دوسروں کی آنکھ کے تنکے پر انگشت نمائی کرنے میں مصروف ہے۔ لیکن جب یہ بات سامنے آئی کہ یہ کائنات خالق کائنات کا تخلیقی مزاح ہے تو مجھے بڑی طمانیت

ہوس ہوئی ہم سب ایک پر مزاح معاشرے میں سانس لے رہے ہیں جس میں مزاح لالہ خود رو کی طرح اگتا رہتا ہے۔
ن طبع طناز رکھنے والے لوگ اس سے قائل ہیں اور اس کا لطف نہیں اٹھاتے۔ الٹا شکایت کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں
ح کم پیدا ہوتا ہے۔ اس ارشاد عالیہ میں یہ بات میں نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ ہم سب شاید اس معاشرے کے
احیہ عمل ہی کے مضحک کردار ہیں۔ ان کرداروں کے متنوع قسم کے مزاحیہ عمل کو شاعری میں زیادہ پیش کیا گیا
ن نثر میں طنز و مزاح کی طرف پوری توجہ نہیں دی گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادبی رسائل سے اظہار کا یہ اہم اور موثر اسلوب
ہوتا جارہا ہے۔ خالص طنز و مزاح کا ایک سہ ماہی کا ایک رسالہ "اردو پنچ" چند برس قبل ضمیر جعفری، کرنل محمد خان،
کرنل صفدر محمود اور سلطان رشک نے جاری کیا تھا لیکن اب اس کی اشاعت بند کر دی گئی ہے۔ بھارت سے ڈاکٹر سید
مصطفیٰ کمال "شگوفہ" چھاپتے ہیں لیکن یہ پرچہ پاکستان میں دستیاب نہیں ہوتا۔ ضیاء الحق قاسمی نے ایک عمدہ پرچہ
ظرافت" کئی برسوں سے جاری کر رکھا ہے اور اس کی اشاعت بھی فنون، اوراق اور نقوش کی طرح مدیر گرامی کی مرضی
کے تابع ہے۔ اشاعت کی باقاعدگی "ظرافت" کو کبھی نصیب نہیں ہوئی چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ۱۹۹۷ء کے دوران
بی رسائل میں طنز و مزاح کی بھرپور نمائندگی نہیں ہوئی اور غنیمت ہے کہ ماہنامہ "افکار" "شاعر" "صریر" "کتاب نما"، "ادب
وست"، "انشاء"، "تخلیق"، اور "ماہ نو" کے علاوہ چند دیگر رسائل میں مزاح پاروں کو مناسب نمائندگی دی جاتی رہی

مجھے ۱۹۹۷ء کے دوران مجتبیٰ حسین کے مزاح پارے پڑھنے کا زیادہ موقع ملا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ
خبارات میں باقاعدگی سے کالم لکھتے ہیں اور اس دباؤ اور ضرورت کے تحت ان کا مزاح نگار قلم رواں رہتا ہے۔ مجتبیٰ
حسین کی خوبی یہ ہے کہ وہ بالعموم زندگی کی ایسی ناہمواریوں پر قلم اٹھاتے ہیں جو ہم سب کا روز مرہ کا مشاہدہ ہیں لیکن
ہم یا تو ان ناہمواریوں کے ساتھ مفاہمت پیدا کر لیتے ہیں، یا ان پر "نظرے خوش گزرے" ڈالنے پر اکتفا کرتے ہیں، یا
نہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔... مجتبیٰ حسین ناہمواری کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اسے گدگداتے ہیں اور اس کے باطن
سے ہنسی کو بیدار کر دیتے ہیں اور اس عمل میں وہ "ادب" اور "ادیب" کو بھی نہیں بخشتے۔ مثال کے طور پر نصرت ظہیر
کی کتاب "بقلم خود" کی رسم اجراء مجتبیٰ حسین نے کی تو یہ انکشاف بھی کیا

> "میں نے آج تک جس کسی ادیب کی کتاب کی رسم اجراء انجام دی اس بچارے ادیب
> کی کوئی اور کتاب بعد میں شائع نہیں ہوئی۔ کتنے ہی ادیب ایسے ہیں جن کی پہلی
> کتابوں کی رسم اجراء میں نے انجام دی اور آج وہ خدا کے فضل و کرم سے نہایت آرام
> سے گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس راز کو میں نے مفاد عامہ کے پیش نظر آج
> تک فاش نہیں ہونے دیا کہ میرے ہاتھوں کسی کتاب کی رسم اجراء اصل میں مصنف
> کی ادبی زندگی کے تابوت کی آخری کیل کا درجہ رکھتی ہے بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک
> کہتے ہیں کہ اگر میں کسی ادیب کی کتاب کی رسم اجراء انجام دوں تو سمجھئے کہ اس
> ادیب کی "نس بندی" عمل میں آگئی..... لیکن نصرت ظہیر کی اب جو یہ تیسری کتاب
> شائع ہوئی ہے تو اس سے میرا بھرم ٹوٹ گیا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب

میں بھی "فیملی پلاننگ" کے طریقے دانا بھول گئے ہیں"

ممتاز دانشور شمس الرحمن فاروقی کو پانچ لاکھ روپیوں کی مالیت کا "سرسوتی سمان" برلا فاؤنڈیشن کی طرف سے ملا تو مجتبیٰ حسین نے ادبی انعامات کی تقسیم کی واقعاتی کیفیت سے مزاح پیدا کیا اور لکھا

"ان دنوں ادب اور ہمارے سماج میں انعاموں کی ایک دوڑ چل پڑی ہے۔ کسی زمانہ میں انعاموں کے سلسلہ میں دو ہی فریقوں کی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ ایک فریق انعام دیتا تھا اور دوسرا فریق انعام لیتا تھا۔ لیکن ادھر کچھ عرصہ سے اس کاروبار میں تیسرے فریق کا بھی اضافہ ہو گیا ہے اور وہ ہے انعام دلانے والا۔ اور تیسرا فریق اب اتنی اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ ابتدائی دو فریقوں کی نوعیت اب ذیلی ہو گئی ہے۔ اب کسی ادیب کو انعام ملتا ہے تو کوئی اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ اسے یہ انعام کس نے دیا ہے۔ بلکہ یہ پوچھتا ہے کہ اسے یہ انعام کس نے دلوایا ہے یہی وجہ ہے کہ کئی انعام یافتہ ادیب اب انعام یافتہ کم اور سزا یافتہ زیادہ نظر آتے ہیں اور انعام دلانے والے فرد کے آگے یوں محجوب و شرمسار رہتے کہ آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کر سکتے"

مجتبیٰ حسین کے اس نوع کے متعدد مضامین جن میں ادب، ادیب اور ادبی معاشرے کی ناہمواریاں ابھاگر کی گئی ہیں ۔ ۱۹۹۷ء کے دوران شائع ہوئے اور پسند کئے گئے "اردو پر مرنا، اردو میں مرنا"، "اردو یونیورسٹی اور سہرا بندی اردو شاعری اور آٹو رکشا" تو بے مثال مضامین ہیں۔

زبیر احمد گزشتہ چند برس سے ماہنامہ "مربز" میں گل کاریاں اور لطافت باریاں کر رہے ہیں، اس برس ان کا ایک عمدہ مزاح پارہ "مکان" کے عنوان سے شائع ہوا۔ مکان تلاش کرنے کا موضوع نیا نہیں لیکن زبیر احمد نے اپنے بیانیہ سے اسے ایک انوکھا اور ذاتی تجربہ بنا دیا ہے جو بے ساختہ مسکراہٹ کو جنم دے ڈالتا ہے۔ تسنیم احمد نے "قلندر صاحبان میں مسٹر فاضل اور علامہ ابن دستہ" دو مضحک کردار پیدا کیے اور ان کے قول و عمل کے وسیلے سے مرزا غالب اور مہاتما گاندھی کی مماثلتیں تلاش کیں اور متخیلہ کی فاضل قوت کو حصول بہجت کے لیے خوبی سے استعمال کیا۔ شگفتہ فرحت کے مضامین "رشتہ پہچان کا" اور سوالیہ نشان (؟) میں صورت واقعہ پر رقت اور جذباتیت غالب آگئی ہے انور شیخ کا ایک عمدہ مزاح پارہ "مسٹر رام" رسالہ انشاء کلکتہ میں شائع ہوا۔ اسے عملی مزاح کی اچھی مثال قرار دیا جا سکتا ہے جس میں معاشرتی ناہمواریوں پر رواں تبصرہ ایک طوطا جس کا نام "مسٹر رام" ہے کرتا چلا جاتا ہے۔ تاہم مزاح کی ایک جوئے نرم رو انور شیخ کے بیانیہ میں بھی رواں محسوس ہوتی ہے۔ ایک اقتباس حسب ذیل ہے

"لاہور ایرپورٹ پر سعودی عرب جانے والے مسافروں کی بھرمار تھی وہ اس طرح قطار میں کھڑے تھے جیسے نمازی خدا کے دربار میں حاضر ہوں، البتہ ان میں ایک فرق تھا وہ یہ کہ نمازیوں کو اللہ سے کچھ ملنے کی امید ہوتی ہے لیکن عرب جانے والے مسافروں کو ناامیدی کے دورے پڑ رہے تھے۔ کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ ایرپورٹ کے عملہ انہیں مختلف حیلوں سے کنگال کیے بغیر ہوائی جہاز میں سوار نہیں ہونے

> دیں گے ۔ مسافر تو سینے پر ہاتھ رکھے کھڑے ہوتے ہیں لیکن یہ مسافر اپنی جیبوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے تاکہ اپنی عنقریب لٹنے والی دولت کو جتنی دیر ممکن ہو چھو کر دل بہلا سکیں ۔ انہیں جیب کتروں کا خاص طور پر ڈر تھا اگر سارا مال وہ لے گئے تو ایرپورٹ کے اہلکاروں کو کیا پیش کریں گے ؟"

۱۹۹۷ء کے دوران ماہنامہ "انشاء" کی ایک گراں قدر عطا یہ ہے کہ اس نے مزاح نگار دلیپ سنگھ آنجہانی کے لیے ایک ضخیم اشاعت وقف کی ۔ دلیپ سنگھ اپنی طرز کے منفرد مزاح نگار تھے جنہیں موت نے وقت سے بہت پہلے جھپٹ لیا اس نمبر میں دلیپ سنگھ کی مزاح نگاری کے متنوع زاویے ف ۔ س ۔ اعجاز ، اطہر جاوید ، بلراج کومل ، یوسف ناظم ، مجتبیٰ حسین ، جوگندر پال ، غلام جیلانی اصغر اور کشمیری لال ذاکر کے علاوہ متعدد دوستوں نے دریافت کئے اور اس نمبر میں دلیپ سنگھ خود بھی اپنے مضامین "میرج بیورو" ، "اقبال جرم" ، "جوس کا گلاس" اور خطوط میں موجود ہے ۔ "افکار" میں ظفر عمر زبیری نے بظاہر "دیوان خنجری لاہوری" کی دریافت کا فریضہ انجام دیا ہے جس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل نہیں کی جاسکتی کیوں کہ اس کا شاعر زندہ ہے اور یہ ان کا پہلا مجموعہ شاعری ہے ۔ لیکن دراصل یہ ایک ناکام شاعر کا عمدہ کیری کیچر ہے ۔ زبیری صاحب نے دریافت کیا "حضرت ! ابھی تک شادی کیوں نہیں فرمائی ؟"

خنجری صاحب نے جواب دیا شادی کے بعد شاعری بے مزہ کیا ۔ بلکہ بد مزہ ہو جاتی ہے ، لہذا اجتناب برتا گیا ہے " موصوف ہفت روزہ "کوتوال" میں غزلیں چھپوانے تھے ۔ ان کی غزلیں بڑے طمطراق سے شائع ہوتی تھیں ، کاتب پورا نام لکھتا ۔ "یوسف حسین خان خنجری لاہوری" اور خنجری کی "خ" میں سے وہ ایک عدد خنجر بھی برآمد کرلیتا تھا ۔ پوچھا گیا "ہفت روزہ کوتوال" کا کیا ہوا ؟" ۔ معلوم ہوا کہ ہفت روزہ پہلے بند ہو چکا تھا ، مدیر اعلیٰ کچھ عرصے کے بعد دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے ۔ لہذا موصوف کا کلام کہیں بھی شائع نہ ہوا ۔ مدیران کرام سے تعلقات کے فقدان کو اس کا سبب بتایا گیا ۔

۱۹۹۷ء کے دوران طنز و مزاح کے جو چند اچھے مضامین نظر سے گزرے ان میں حسنین جیلانی کا مضمون "بتاکر فقیری کا ہم بھیس غالب" اشفاق احمد ورک کا "ماضی گر" اور "بائیسویں صدی کا ایک مکالمہ" وحید الرحمن خان کا "فل سٹاپ" ۔ مسرور احمد زئی کا "گردش دوراں" ۔ زوار حسنین تیمور کا "ٹریفکی ادب" ۔ اور غلام جیلانی اصغر کا "گلیاں" چند اچھے مضامین تھے ۔ مشتاق خواجہ دور حاضر کے شاید واحد اور منفرد مزاح نگار ہیں جن کا کالم "سخن در سخن" غیر ملکی ادبی رسائل میں باقاعدگی سے "قند مکرر" کے طور پر چھاپا جاتا اور ایک مضمون کی طرح پڑھا جاتا ہے ۔ ۱۹۹۷ء کے دوران خواجہ صاحب کے کالم "کتاب نما" اور "شگوفہ" میں بہجت و لطافت کی فضا پیدا کرتے رہے ۔ چند اقتباسات یہ ہیں ۔

> "پروین شاکر مرحومہ کو جب ان کے ایک مجموعے پر اکادمی ادبیات پاکستان کا چالیس ہزار کا انعام ملا ۔ تو ساقی فاروقی نے کہا "اس رقم میں سے دس فی صد میں حق دار ہوں کیوں کہ انعام یافتہ مجموعے کا فلیپ میں نے لکھا ہے" ۔ یہ بات نظیر صدیقی نے سنی تو انہوں نے فرمایا "ساقی فاروقی کا حصہ ادا کرنے کے بعد جو رقم بچے وہ مجھے ملنی

چاہیے کیوں کہ پروین شاکر کی شہرت اور مقبولیت میرے مقالے کی وجہ سے ہے"

"احمد فراز کے بارے میں جون ایلیا کا خیال یہ تھا کہ وہ بیس سال کی عمر تک کے نوجوانوں کے شاعر ہیں، جب کہ ظفر اقبال کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی کہ وہ پختہ ذہن کے نوجوانوں کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ نوجوانوں کا ذہن پختہ کس عمر میں ہوتا ہے..... ظفر اقبال نے اپنی شاعری کے بڑے حصے میں جو لسانی توڑا مروڑی کی ہے اس کے معانی خود ظفر اقبال کی دسترس سے باہر ہیں..... احمد فراز کی مقبولیت اس کے اکثر ہم عصروں کو کھٹکتی ہے اور وہ رشک و حسد کی آگ میں تپ کر ایک ہی جملہ دہراتے ہیں کہ فراز ۲۰ برس تک کی عمر کے نوجوانوں میں مقبول ہے اب وہ جس قسم کی شاعری کر رہے ہیں، وہ ستر اسی برس کے لوگوں کے لیے معجون شباب آور کا درجہ رکھتی ہے..... اپنے متعلق جون ایلیا نے کہا ہے کہ "میں ایک ناکام شاعر ہوں"..... گزارش ہے کہ اس قسم کے معاملات میں احتیاط سے کام لینا چاہیے، جہاں اہل نظر آپ کی دس باتوں سے اختلاف کرتے ہیں وہاں ایک آدھ بات سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں"

حیدر آباد (دکن) کے رسالہ "شگوفہ" کے اوراق سے پرویز ید اللہ مہدی، تابش خانزادہ، مرزا کوچ، الیاس فرحت سراج وجیہہ، کوثر صدیقی، دلشاد رضوی، تابش خانزادہ نمایاں ہوئے، میرے لیے ان میں سے بیشتر نام نئے تھے لیکن ان کی تحریروں میں مزاح کا زعفرانی رنگ بے حد نمایاں نظر آیا۔ "ظرافت" کے مدیر ضیاء الحق قاسمی اپنے قلب ظرافت نگاری کی چار بند "آرٹریز" کھلوا کر بیٹھے ہوئے تو انہوں نے ظرافت پھر جاری کر دیا اور اداریہ "میرا پیغام ظرافت ہے جہاں تک پہنچے" میں لکھا کہ "آرٹریز کھل گئی ہیں، اس لیے ہم بھی کھل کھیلیں گے" کھل کھیلنے کی مثال ان کا اپنا مضمون "مدیر ظرافت اور جراحت دل" ہے۔اس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ لاہور میں انہیں اچانک عارضہ قلب ہوا کیوں کہ سعادت سعید نے ان کی خوش خوراکی کی شہرت سن کر انہیں گائے کے پائے کھلا دیئے تھے، لیکن انہوں نے اس عارضہ قلب کو بد پرہیزیوں اور بے احتیاطیوں سے شکست دے دی، یہ مضمون "بائی پاس کرانے والوں کے لیے ایسے ہی ہے جیسے غالب پسندوں کے لیے نسخہ حمیدیہ..... ضیاء الحق قاسمی نے "ظرافت" میں لطیفہ اور حکمت کے امتزاج سے لطافت فراواں پیدا کی ہے۔انہوں نے "کارٹون" اور "کیری کیچر" سے بھی مسکراہٹوں اور قہقہوں کو بیدار کرنے کا کام لیا۔ بیشتر لطائف میں مرکزی کردار وہ خود ادا کرتے ہیں چند اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

"مشتاق احمد یوسفی مدیر "ظرافت" سے فون پر ان کے بائی پاس آپریشن کا احوال پوچھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے "دیکھا ناں..... آپ سے کہا تھا کہ بائی پاس آپریشن میں ختنوں سے بھی کم درد ہوتا ہے۔قاسمی صاحب نے کہا "مجھے تو بائی پاس کرانے میں

بہت درد ہوا، میں تو ٹخنوں کا درد بھول بھال گیا۔ یوسفی صاحب نے کہا "اگر یقین نہ آئے تو دوبارہ ختنے کرا کے دیکھ لیں۔"

"ڈاکٹر ہارون احمد کے مکان پر ایک محفل مشاعرہ میں ممتاز مزاح گو شاعر اطہر شاہ خاں جعفری اپنا کلام سناتے سناتے یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے کہ "بیٹھے بیٹھے ان کے پاؤں سوج گئے ہیں۔" مدیر ظرافت نے جو قریب ہی بیٹھے تھے ان کے پیر پر ہاتھ لگا کر کہا "پیر سوجا ہی نہیں بھاری بھی ہو گیا ہے"

"بزم تعمیر ادب کے مشاعرے سے قبل کھانے کی میز پر سب شعرا تھے اور من پسند بوٹیاں تلاش کر رہے تھے مدیر ظرافت نے کہا "یہ کام جاذب قریشی کو سونپ دیں ان کو بوٹیوں کی پہچان ہے" جاذب قریشی خود ہی بول اٹھے "ہاں، ہاں میں قریشی جو ٹھہرا"

ظرافت کے صفحات پر ڈاکٹر انور نسیم اور شاہدہ صدیقی سحر نے قہقہہ بار تحریر یں پیش کی ہیں۔

طنز و مزاح کی نثری کتابوں میں اس برس نوجوان اور تاحال کنوارے مزاح نگار ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب "مزاح پرسی" شائع ہوئی یونس بٹ کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہموار لفظ کو ناہموار کر کے مزاحی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں لیکن اس عمل میں وہ ہمدردانہ رویہ قائم رکھتے ہیں، وہ اردو زبان و ادب کے شاید پہلے مزاح نگار ہیں جن کی سابقہ شائع شدہ کتابوں مثلاً عکس بر عکس "کلاہ بازیاں" ۔ "شناخت پریڈ" ۔ شیطانیاں وغیرہ کا کلیات شائع ہوا۔ یونس بٹ کو لطیفے کے استعمال کا فنکارانہ شعور بھی حاصل ہے اور وہ جملہ تخلیق کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں ان کے بارے میں ضمیر جعفری کا یہ قول سب کلاسیکی حوالہ بن چکا ہے کہ

"ڈاکٹر یونس بٹ کنوارا ہے مگر فقرہ بڑا حاملہ لکھتا ہے"

اس برس جمال ورانی کے فکاہیہ افسانے کتابی صورت میں منظر عام پر آئے، اس طرز کے افسانے کے وہ خود ہی موجد تھے اور خود ہی خاتم...... اس نوع کے افسانے اس سے پہلے شاید کسی نے نہیں لکھے اور خاتم اس لیے کہ جمال ورانی اب اس دنیا میں نہیں ہیں وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ جمال ورانی ممتاز افسانہ نگار شمس آغا کے چھوٹے بھائی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے بھانجے تھے ہمایوں تاحال انشائیہ اور مزاح کی سرحد پر فنکاری کر رہے ہیں، ان کے مضامین کا مجموعہ "بیک ڈور" کے نام سے شائع ہوا نئے مزاح نگاروں میں سے تنویر حسین کی کتاب "شاباش" بہزاد سحر کی "وارے نیارے" اور امتیاز علی گیلانوی کی "چھوٹا منہ بڑی بات" منظر عام پر آئی، مزاحیہ کتب کی اشاعت کو پیش نظر رکھیں تو ۱۹۹۰ء کا برس سابقہ سال کے مقابلے میں زرخیز نظر نہیں آتا۔ اس افق پر یونس بٹ کا نام قطبی ستارے کی طرح روشن نظر آتا ہے۔ بھارت میں یہ امتیاز مجتبیٰ حسین کو حاصل ہے کہ انہوں نے الفاظ سے کھلواڑ کر کے اچھا مزاح پیدا کیا۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد ۳۲ شمارہ ۱۰ حیدرآباد

اکتوبر ۱۹۹۹ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز : ڈاکٹر عابد معز

قیمت فی پرچہ ۱۲ روپے زر سالانہ ۱۴۰ روپے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: ۳۱ ٹیچرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

فون (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064



اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

مال مفت (انشائیہ)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

شیطان کی آنت (قسط وار ناول)

قاضی جی دبلے (سفر نامہ)

حق تو یہ ہے (ترجمہ)

چورن (منظومات)



ڈاکٹر صاحب یہ میرے دل کی نہیں میری جیب گھڑی کی آواز ہے



آپ کا پورا معائنہ کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے
تو آپ سے فیس پیشگی ہی لے لی جائے

مجتبیٰ حسین

ذکر خیر سید حامد کا

کچھ برس پہلے سابق مرکزی وزیر داخلہ سید سبط رضی کے گھر کوئی تقریب تھی، میں اپنی عادت کے مطابق اور سید حامد صاحب ان کی اپنی عادت کے مطابق تقریب میں بروقت پہنچ گئے۔ کسی نادان کا قول ہے کہ جو اصحاب اپنے عہد کے اعتبار سے قبل از وقت یا بعد از وقت پیدا ہوتے ہیں وہ عموماً جلسوں میں بروقت پہنچ جاتے ہیں۔ میزبان تو خیر موجود تھے ہی لیکن مہمان البتہ خال خال تھے اور تھے بھی تو ایسے مہمان کہ جن سے کم از کم میں تو اپنا منہ چھپانا ضروری تصور کرتا ہوں۔ آزمائش کی اس گھڑی میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دیکھا سید حامد صاحب دور سے چلے آرہے ہیں، جن لوگوں نے سید صاحب کو چلتے ہوئے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ سید صاحب جب سینہ تان کر چلتے ہیں تو اس سے نہ صرف ان کا قد بلند ہو جاتا ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ان کی خودی بھی بلند ہوتی ہوئی دکھائی دے جاتی ہے علامہ اقبال کی طرح وہ صرف خودی کو بلند کرنا بھی ضروری تصور کرتے ہیں۔ وہ میرے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہیں یہ اور بات ہے کہ اتنا ہی کرم فرماتے ہیں جتنا کہ ان کے مزاج کی شائستگی اجازت دیتی ہے۔ اتنا کرم نہیں فرماتے جس کا میں طلبگار یا متمنی ہوتا ہوں، میں ان کے پاس گیا تو حسب معمول بڑی شفقت، محبت، خلوص اور نرمی وغیرہ سے پیش آئے۔ ایسی چیزیں ان کے پاس ہمیشہ وافر مقدار میں موجود ہوتی ہیں، ہم دونوں ایک گوشہ میں بیٹھ گئے تو ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے یونہی وقت گزاری کے لئے مخدوم محی الدین کے ایک عملی مذاق کا قصہ چھیڑ دیا۔ اب جو سید صاحب اس واقعہ کے ایک ایک پہلو پر بے ساختہ ہنسنے لگے تو میں خود حیران رہ گیا۔ بہت دیر تک ہنستے رہے۔ بعد میں ان کی ہنسی تھمی اور محفل میں کچھ پسندیدہ مہمان آگئے تو میں کسی اور طرف چلا گیا اور وہ کسی اور طرف۔ کچھ دیر بعد ایک شناسا مل گئے تو انہوں نے بصد اشتیاق مجھ سے پوچھا "ابھی آپ کی باتوں پر جو صاحب یہاں بیٹھے بے ساختہ ہنس رہے تھے کہیں خدا نخواستہ وہ سید حامد تو نہیں ہے؟" میں نے کہا "آپ نے حد کر دی، آپ تو سید صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے"۔ بولے "وہ تو میں جانتا ہوں لیکن جس طرح وہ تمہاری باتوں پر دھاڑیں مار مار کر ہنس رہے تھے اس سے شبہ ہوا کہ شاید وہ سید حامد نہ ہوں۔ سنا ہے کہ فرشتے اور سید حامد کبھی نہیں ہنستے"۔ میں نے کہا "خدا کے فضل و کرم سے فرشتوں کو دیکھنے کی نوبت تو خیر اب تک نہیں آئی البتہ سید حامد کو ضرور دیکھا ہے اور میرا خیال ہے کہ بر وقت آن پڑے تو سید صاحب ہنس بھی لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسی صورتوں میں فرشتے بھی ایسا ہی کرتے ہوں"۔

اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ سید حامد صاحب کے بارے میں لوگوں کو کیا کیا بدگمانیاں ہیں، یہ سچ ہے کہ وہ نہایت سنجیدہ، متین، بردبار بلکہ گمبھیر انسان ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ ہنسنے سے بالکل عاری ہوں۔ میں نے انھیں جب بھی دیکھا تبسم زیر لب اور قہقہہ کے درمیان ایک شائستہ، سلیقہ مند، مہذب اور خوشگوار ہنسی کی حد پر کھڑے

ہوتے پایا۔ تبسم کو قہقہہ میں تبدیل نہیں ہونے دیتے کیونکہ ہنسی کے معاملہ میں وہ لائین آف کنٹرول کی خلاف ورزی کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ کبھی غفلت میں خلاف ورزی ہو جائے تو یہ ایک الگ بات ہے۔ ایسی ایر کنڈیشنڈ ہنسی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی۔

سید حامد، حکومت ہند کے سینئیر آئی۔اے ایس عہدیدار رہ چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں جاننے کے لئے مجھے دو اور سینئیر ترین آئی۔اے ایس عہدیداروں کی خدمات سے استفادہ کرنا پڑا۔ میری مراد خواجہ عبدالغفور مرحوم، سابق چیف سکریٹری حکومت مہاراشٹرا اور سید ہاشم علی اختر سابق سکریٹری حکومت آندھرا پردیش سے ہے۔ خواجہ عبدالغفور خود مزاح نگار تھے اور آئی اے ایس عہدیدار ہونے کے باوجود بے ساختہ قہقہہ لگانے کو اتنا برا بھی نہیں سمجھتے تھے رشتہ میں وہ سید صاحب کے سمدھی ہوتے تھے ان کے فرزند حسن غفور آئی پی ایس کی شادی سید صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔ خواجہ عبدالغفور مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی برس پہلے حسن غفور کی شادی کا جو استقبالیہ دہلی کے "کلارجس ہوٹل" میں دیا گیا تھا اس میں بھی دیکھا کہ خواجہ عبدالغفور تو اپنے دوستوں میں گھرے قہقہے لگانے میں مصروف ہیں اور دوسری طرف سید صاحب پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کرنے میں ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ دلہن کے والد ہونے کے ناتے شاید انھوں نے عارضی طور پر یہ سنجیدہ طرز عمل اختیار رکھا ہو۔ لیکن بعد کی دو چار محفلوں میں بھی انھیں اسی پوز میں دیکھا تو میں نے غفور صاحب سے پوچھا "کیا بات ہے سید صاحب ذرا کم ہی ہنستے ہیں" بولے "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ خوب ہنستے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ہنسی کی نوعیت الٹی ہوتی ہے یعنی ہم لوگ تو اپنی ہنسی کو اندر سے باہر نکال دیتے ہیں لیکن وہ اپنی ہنسی کو باہر سے اندر کھینچ کر اپنی ذات میں جذب کر لیتے ہیں" اور ان کی اس بات سے میں مطمئن ہو گیا۔

دوسرے آئی اے ایس عہدیدار جن کی وساطت سے مجھے سید صاحب کو سمجھنے میں مدد ملی، ہاشم علی اختر ہیں جنہوں نے سید حامد صاحب سے علی گڑھ کی وائس چانسلری کا جائزہ حاصل کیا تھا۔ وہ سید صاحب کے بڑے زبردست مداح معترف ہیں، (آئی۔اے ایس برادری کی بعض مجبوریاں بھی تو ہوتی ہیں)۔ ہاشم علی اختر اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر انہوں نے سید صاحب کی بجائے کسی اور سے علی گڑھ کی وائس چانسلری کا جائزہ حاصل کیا ہوتا تو شاید ان کے لئے یونیورسٹی چلانا بہت دشوار ہو جاتا۔ دیکھا جائے تو یوں بھی سید صاحب علی گڑھ کے دو حیدرآبادی وائس چانسلروں یعنی پروفیسر علی محمد خسرو اور ہاشم علی اختر کے درمیان "سینڈوچ" کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور سینڈوچ بننے کا جو کرب ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ اس وقت تک نہیں لگا سکتے جب تک کہ آپ بسوں کی تین افراد والی نشست پر خود "سینڈوچ" بن کر تجربہ نہ رکھتے ہوں، پروفیسر علی محمد خسرو نے تو اپنے "انداز خسروانہ" سے یونیورسٹی چلائی لیکن سید حامد ٹھہرے آئی۔ اے ایس عہدیدار۔ وہ سرسید کی یونیورسٹی کو خود سرسید کے بتائے ہوئے راستہ پر چلانے کے خواہش مند تھے۔ یہ کتنی غلط بات تھی۔ آپ علی گڑھ کی بات کرتے ہیں۔ بہت لمبا عرصہ گذر جائے تو بعد میں آنے والے ایک عام سے لئے بھی اپنے پیشرو سید کے بتائے ہوئے سیدھے راستہ پر چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یادش بخیر! ایک زمانہ کی علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں کسی نے مشہور کر رکھا تھا کہ اگر خود سرسید بھی دوبارہ پیدا ہو کر علی گڑھ کے وائس چانسلر بن جائیں تو شاید وہ اس یونیورسٹی کو چلانہ پائیں۔ حالانکہ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایک ہوائی جہاز چلانے والا

تک چلا سکتا ہے بلکہ ہوائی جہاز سے کہیں زیادہ بہتر طور پر سرکار چلا لیتا ہے۔ لیکن ان دنوں یونیورسٹیوں کو چلانے کے لئے ایک الگ ہی مہارت درکار ہوتی ہے۔ نواب علی یاور جنگ پر جب ان کے دور وائس چانسلری میں قاتلانہ حملہ ہوا تھا تو غالباً آر۔کے۔ لکشمن نے ایک کارٹون بنایا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مستقبل میں دانشوروں اور ماہرین تعلیم کو یونیورسٹیوں کا وائس چانسلر نہ بنایا جائے بلکہ پہلوانوں اور باکسروں (Boxers) کی خدمات حاصل کی جائیں۔

وائس چانسلروں کی بات چلی ہے تو ہاشم علی اختر یاد آگئے جو علی گڑھ کے وائس چانسلر بننے سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ انہوں نے ایک مزیدار لطیفہ بنایا تھا کہ ایک وائس چانسلر مرنے کے بعد دوسری دنیا میں پہنچا تو اس سے پوچھا گیا کہ وہ نیچے کی دنیا میں کیا کام کرتا تھا۔ وائس چانسلر نے کہا "حضور! ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا" پوچھا گیا "کتنی میعادوں یعنی (Terms) کے لئے؟" جواب ملا "جی صرف ایک میعاد کے لئے" حکم ہوا "اسے جنت میں جانے دو کیونکہ دوزخ کا عذاب یہ نیچے کی دنیا میں پہلے ہی جھیل چکا ہے۔" حسن اتفاق کہ اس وقت وہاں ایک اور وائس چانسلر جنت میں جانے کے خواہش مندوں کی قطار میں کھڑا تھا جو پہلے وائس چانسلر کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب پہلا وائس چانسلر جنت میں جانے لگا تو دوسرا وائس چانسلر بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جنت کے داروغہ کی نظر پڑی تو موصوف سے پوچھا "لئی قبلہ! آپ کہاں چلے؟" بولے "جی۔ وہ میں بھی نیچے کی دنیا میں وائس چانسلر رہ چکا ہوں" پوچھا گیا "کتنی میعادوں کے لئے؟" جواب ملا "دو میعادوں کے لئے" اس پر حکم صادر ہوا "تب تو اسے لیجا کر دوزخ میں ڈال دو کیونکہ اسے تو دوزخ میں رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

بہرحال سید حامد نے وائس چانسلری کی اور خوب دھڑلے سے کی۔ دھڑلے کا مطلب یہ کہ جب تک علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے اپنی جان کو ہتھیلی پر سجائے رکھا۔ آج تک کسی نے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھنے کا اتنا لمبا ریکارڈ قائم نہ کیا ہوگا۔ بڑے ہنگامے ہوئے گولی چلی، مفاد پرستوں کے مفادات پر ضرب کاری لگی یہاں تک کہ یونیورسٹی بند ہو گئی۔ مگر جب کھلی تو ایسے کھلی کہ بند ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ طلبہ ہیں کہ چپ چاپ پڑھے جا رہے ہیں اور اساتذہ ہیں کہ پڑھائے چلے جا رہے ہیں (پٹی نہیں بلکہ سچ مچ کی کتابیں) بظاہر مرنجان مرنج دکھائی دینے والے سید صاحب کے عزم، وصلے اور پختہ ارادے کی یہ ایک چھوٹی سی مثال تھی جو یونیورسٹی کے حق میں بہت بڑی نعمت ہوئی۔

جناب سید حامد کے بارے میں مشہور ہے کہ نہایت اصول پرست اور ایماندار آدمی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایمانداری کا کوئی سرٹیفکیٹ اپنے پاس نہیں رکھتے۔ یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ پچھلے دنوں احباب کی محفل میں ایک سیاسی رہنما کی دیانت داری اور ایمانداری پر کسی نے انگلی اٹھائی تو مذکورہ رہنما کے حامی نے برملا کہا "آپ تو ان کی ایمانداری پر کوئی شک کر ہی نہیں سکتے کیونکہ ان پر اب تک بدعنوانیوں اور گھوٹالوں کے دس مقدمے چل چکے ہیں اور ماشاءاللہ وہ ان سب سے باعزت بری ہو چکے ہیں۔ آپ کو ان کی ایمانداری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہئے"

ہمارے سید صاحب کی ایمانداری میں بس اسی بات کی کسر رہ گئی ہے کہ اپنی ایمانداری کا کوئی ثبوت اپنے پاس نہیں رکھتے حالانکہ زمانہ بڑا خراب ہے۔ ثبوت کے بغیر کسی بات کو نہیں مانتا۔ سید صاحب اصول پرست ایسے ہیں کہ کسی دوست کے کام کے لئے ان سے سفارش کرو تو پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ کہیں دوست کے کام سے ان کے کسی دشمن کو نقصان تو نہیں پہنچے گا۔ ایک بار دشمن کی طرف سے مطمئن ہو جائیں تو جب کہیں جاکر وہ دوست کے فائدے کی بابت

سوچتے ہیں۔ اللہ اللہ کیا اصول پسندی ہے۔ حالانکہ فی زمانہ اصول کو توڑ دینا ہی سب سے اچھا اصول سمجھا جاتا ہے بلکہ
شخص اصولوں کو نہیں توڑتا لوگ اسے ہی توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ سید صاحب کسی وجہ سے اب تک نہیں ٹوٹے یہ ا
الگ بات ہے پھر پائیداری بھی تو ایک چیز ہوتی ہے۔ خوب یاد آیا ایک زمانہ میں مجھے احباب کے کاموں کے سلسلہ
صاحبانِ اقتدار سے سفارش کرنے کا ہوکا سا تھا۔ دن بھر دوستوں کے کاموں کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔ جب سید صاح
اسٹاف سلیکشن کمیشن کے صدر نشین تھے تو ایک دوست نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ان کے بھائی کے تقرر کے سل
میں سید صاحب سے سفارش کر دوں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ سید صاحب سفارش کو ناپسند کرتے ہیں میں نے ا
دوست کے بھائی کی سفارش ان سے کر دی۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کاغذ میرے ہاتھ سے لے کر رکھ لیا
حسب عادت کوئی وعدہ نہ فرمایا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے دوست کا تبادلہ ترویندرم ہو گیا اور بعد میں وہ وہاں سے
خلیجی ملک میں چلے گئے۔ گویا برسوں ان سے کوئی ربط ضبط نہ رہا۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے ان سے اچانک ملاقا
ہو گئی تو دنیا جہاں کی باتیں ہوئیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں ان کے بھائی کے تقرر کی بات کو تقریباً بھول چکا تھا۔ خود
یاد دلایا "بھئی! آپ کو یاد ہوگا کہ کئی برس پہلے آپ نے میرے بھائی کے سلسلہ میں سید حامد صاحب سے سفارش کی تو
میں نے کہا "مگر میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سید صاحب سفارش کو سخت ناپسند کرتے ہیں میں کیا کر سکتا ہ
اس پر میرے دوست نے کہا "آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ بھئی! میرے بھائی کا تقرر تو تبھی ہو گیا تھا۔ گرد
روزگار نے مہلت ہی نہ دی کہ آپ کو یہ خوشخبری سناتا۔ ماشاء اللہ اب تک اسے چار ترقیاں بھی مل چکی ہیں۔ کبھی
صاحب سے ملاقات ہو تو شکریہ ادا کر دیجئے" میں نے کہا "بھیا! اب تو تمہارا بھائی چند برسوں میں ریٹائر ہونے والا
ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اب تو اس کے ریٹائر ہونے کے بعد ہی سید صاحب کا شکریہ ادا کرنا مناسب ہوگا" ۔ ڈاکٹر خلیق
کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس تہنیتی تقریب کے انعقاد کے ذریعہ مجھے سید صاحب کا شکریہ ادا کرنے کا موقع عطا فر
ورنہ میرے دل میں ایک خلش سی رہ جاتی۔ بہرحال یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ سید صاحب کسی کی سفارش نہیں
۔ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مجھے کتابی چہروں، کتابوں، باتوں اور کتابی حوالوں سے ہمیشہ انس رہا ہے۔ مگر مجھے آ
تک ایسا کوئی فرد نہیں ملا جو زبانی گفتگو بھی کرے تو یوں معلوم ہو جیسے کتاب پڑھ کر بول رہا ہے۔ میں نے سید صاح
کے علاوہ کسی اور کو مطبوعہ گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ خدا جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں چاہے وہ انگر
میں ہو یا اردو میں ایسی نپی تلی، مرصع اور کچی سچائی زبان بولتے ہیں کہ مجھے تو ان کی تقریر میں جابجا فل اسٹاپوں
کاماؤں (Comas) سے لے کر سیمی کولنوں (Semi Colons) تک کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس لئے تو
ہوں کہ سید صاحب کے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ جو زبان وہ بولتے ہیں وہی زبان لکھتے بھی ہیں۔
اور بات ہے کہ ہر دو صورتوں میں ان کے قاری یا ان کے سامع کو بسا اوقات ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت بھی پیش
ہے (کم از کم مجھے تو آتی ہے) کتاب پڑھتے وقت ڈکشنری دیکھنے کو میں برا نہیں سمجھتا لیکن یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ ا
شخص تقریر کر رہا ہو اور لوگ اس کے سامنے بیٹھے ڈکشنریوں کے صفحات الٹتے پلٹتے رہیں۔ اس سے تقریر کی روانی بھی م
ہوتی ہے۔ لگے ہاتھوں اس بات کا انکشاف کر تا چلوں کہ پچھلے دنوں میں نے سید صاحب کا ایک ایسا مضمون پڑھا
پڑھنے کے دوران مجھے ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ مرحوم نے اپنے ایک دوست سے کہا "مجھے لگتا

کہ یا تو میری بھی لیاقت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے یا پھر سید صاحب ہی عام فہم مضامین لکھنے لگے ہیں۔ سو لے۔ مجھے تو اول الذکر کا اندیشہ بالکل ہی کم اور موخر الذکر کا امکان زیادہ نظر آتا ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

سب سے آخر میں، میں اس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا ذکر اصولاً سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے سید صاحب نہایت بے لوث، بے نیاز اور صوفی منش انسان ہیں۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے نہ تو گورنر بننے کی کوشش کی اور نہ ہی سفیر بننا گوارا کیا۔ حد تو یہ کہ پارلیمنٹ میں جانے کی کوشش بھی نہیں کی حالانکہ ایرے غیرے تک وہاں اب جانے لگے ہیں۔ علی گڑھ کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہوئے تو حکیم عبدالحمید کی سرپرستی میں ہمدرد کے تعلیمی پروگرام سے وابستہ ہوگئے۔ اب ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک اور ملت کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں صرف ہوتا ہے اور یہ ان کی کوئی معمولی دین نہیں ہے۔ ایک بار وائس چانسلر بننے کے بعد انہوں نے دوبارہ وائس چانسلر بننا بھی پسند نہ کیا۔ اس لئے کہ ہاشم علی اختر کے بتائے ہوئے لطیفہ کو انہوں نے اپنی گرہ میں کس کر باندھ لیا ہے۔ مانا کہ اب وہ ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہوگئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے ان کی عام تعلیمی تحریکوں اور سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ وائس چانسلری چلانے کے لئے آدمی میں جن بے پناہ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے شاید وہ چانسلری چلانے کے لئے درکار نہیں ہوتیں۔ بلکہ صلاحیتوں کے نہ ہونے کو اور بھی مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

سید صاحب نے ملت کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا ہے وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی طرف دھیان دینے کی ہم جیسوں کو کبھی توفیق عطا نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ گھاٹے کا سودا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گھاٹے کے اس سودے میں قوم کا فائدہ مضمر ہے لیکن ہم جیسوں کو قوم کے فائدے سے کیا مطلب۔ خدا تا دیر سید صاحب کو ہمارے درمیان تندرست و توانا اور سلامت رکھے تاکہ ہم لوگ تو پوری بے فکری کے ساتھ کرنسی والی دولت سمیٹتے رہیں اور سید صاحب علم کی دولت آنے والی نسلوں میں بانٹتے رہیں۔ تقسیم کار ہمیشہ اچھی چیز ہوتی ہے۔ ذرا دیکھئے تو یہی مضمون ختم ہونے لگا ہے تو سید صاحب کے تعلق سے کتنی ہی اچھی اچھی باتیں ذہن میں آنے لگی ہیں مگر وہ جو غالب نے کہا ہے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

شاعرِ اعظم

ظفر کمالی
(سیوان)

شاعرِ اعظم ہمارے آدمی ہیں کام کے
ہر طرف جھنڈے گڑے ہیں آپ ہی کے نام کے

علم کا جیسے سمندر شاعری کی کان ہیں
آپ تنہا میر ہیں غالب ہیں مومن خان ہیں

اضطرابی کیفیت ہو یا کہ ہوں آفات میں
دوڑتا رہتا ہے رہوار سخن ظلمات میں

آسماں کو چیر دے وہ تلہ بے باک ہیں
مختصر یہ ہے ادب کی آپ ہی ناک ہیں

خامہ فرسائی کریں گے بکریوں کی شان میں
بیٹھی ہوگی برآمد چین میں جاپان میں

مثنوی ہو یا قصیدہ مرثیہ ہو یا غزل
کرتے ہیں مشق سخن جیسا کہ ہو موقع محل

کام پھنس جائے قصیدہ اک نیا تیار ہے
دیکھیے پھر چٹکیوں میں ان کا بیڑا پار ہے

شاعرِ قوال کے بھی نام سے مشہور ہیں
سائکلوں کے ہیں چہیتے شاعرِ مزدور ہیں

ہو کہیں شادی دکھاتے ہیں یہ سہرے کی بہار
کاغذی پھولوں پہ کرتے ہیں ثریا کو نثار

رخصتی سن لیں اگر ان کی ہو سینہ چاک چاک
اور تا حد نظر اڑنے لگے ذلت کی خاک

ہولیوں میں گاتے پھرتے ہیں جو گیرا جھوم جھوم
بارہ ماسہ میں بھی ان کے نام کی مچتی ہے دھوم

بزم سیرت میں سناتے ہیں وہ جب نعت شریف
کھا کے غش گرتا ہے اس دم ہو اگر واعظ نحیف

کوئی موذن میں جو آجائے بلانے کے لئے
چل پڑیں گے ٹھمریاں اپنی سنانے کے لیے

چھیڑتے ہیں بھیرویں جب دادرا کی تان میں
ایک ہل چل سی مچا دیتے ہیں قبرستان میں

رفتہ رفتہ نرخ ان کا یوں گراں ہونے لگا
تھا زمیں پہلے وہی اب آسماں ہونے لگا

گلف کی تقریب ختنہ میں بھی اب جانے لگے
جا کے امریکہ میں زچہ گیریاں گانے لگے

ہو اگر لندن میں کن چھیدن پڑھیں قطعات وہ
خاندانی بھاٹ کو دینے لگے ہیں مات وہ

اس طرح اردو کو بخشا عالمی شہرت کا تاج
ڈالروں کی شکل میں ملتا رہا جس کا خراج

تیری اجڑی زندگی میں اے ظفر آئے بہار
شاعرِ اعظم کی پیروی تو کر لے اختیار

نریندر لوتھر
(آئی اے ایس ریٹائرڈ)

میری آخری تصویر

آج کل بہت سے لوگ مر رہے ہیں، ہر روز کسی نہ کسی کی موت کی خبر آجاتی ہے، پرسہ دینے کے لئے جانا گویا ہمارا معمول ہوگیا ہے، موت کی اس رفتار کو دیکھ کر یہ لگتا ہے کہ شاید ہمیں بھی ایک دن اسے لبیک کہنا پڑے گا۔

بیشتر موتوں کی خبریں ہمیں اخباروں سے ہی ملتی ہیں، جتنے زیادہ اخبار پڑھے جائیں گویا اتنے ہی زیادہ لوگ مرتے ہیں، اس لئے قوم کی عافیت اسی میں ہے کہ اخباروں کی تعداد نہ بڑھے۔

ادھر کچھ عرصہ سے ہم سب سے پہلے اخبار کا وہ صفحہ دیکھتے ہیں، جہاں موت کی خبریں اور اشتہار ہوتے ہیں تاکہ اس دن کا پروگرام اسی کے مطابق بنایا جاسکے۔ اشتہاروں سے پتہ لگتا ہے کہ مختلف مذہبوں کے لوگ کس طرح مختلف راستوں سے اپنی آخرت کو پہنچتے ہیں، کوئی جنت کو جاتا ہے، کوئی سورگ باش ہوجاتا ہے اور کوئی سیدھا اپنے خالق کی گود میں جاکر سو جاتا ہے۔

بیشتر اخبار والے لاپرواہ ہوتے ہیں موت کے اشتہارات کے بیچ تہنیت اور مبارکباد کے اشتہار بھی چھاپ دیتے ہیں۔ ایک صاحب کی تصویر کے نیچے ان کی ناگہانی موت کی خبر چھپی ہوئی ہے تو ساتھ ہی دوسری تصویر کے نیچے کسی حضرت کو بیرونی ممالک کے کامیاب دورے سے واپسی پر خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اس سے کئی بار سنگین غلط فہمی بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ ایک بار ہم ایک ایسی ہی تصویر دیکھ کر ان صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ ان سے ہماری کوئی خاص دوستی نہیں تھی۔ صرف علیک سلیک تھی، لیکن بے وقت موت پر پرسہ دینا تو اخلاقی فرض بنتا ہے۔ موقع کے مطابق ہم نے اپنی صورت رونی بنالی۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ لیکن سب خوش تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ہمیں یہ اچھا نہیں لگا، موڈ ماحول کے مطابق ہونا چاہیے، نہ جانے آج کی نسل کے دلوں کو کیا ہوگیا ہے، چند لمحوں کے لئے بھی سنجیدہ نہیں رہ سکتے۔ ہمارے بزرگ تو ہمیشہ سنجیدہ ہی رہتے تھے، کبھی کبھار لک چھپ کر ہنسی مذاق کرلیتے تھے۔

خیر! سب سے پہلے وہاں جو شخص ملا وہ ہمارے دوست کا داماد تھا۔ ہم نے اسے دلاسا دینے کے انداز میں کہا "بڑے اچھے آدمی تھے"۔ اس نے بڑے رازدارانہ لہجے میں ہم سے کہا "آپ انہیں اچھا سمجھتے ہیں؟ ہم سے پوچھئے!" یہ کہتے کہتے وہ ہمیں بازو سے پکڑ کر اپنے خسر کے پاس لے گیا وہ بڑی گرمجوشی سے ہم سے بغل گیر ہوا اور ہمارا شکریہ ادا کرنے لگا۔ پھر مٹھائی آئی اور چائے کی پیالی لے کر اس نے اپنے دورے کی تفصیلات سے لوگوں کو بور کرنا شروع کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد ہم فوراً محتاط ہوگئے۔ اب ہم موت کی خبر دو تین بار پڑھتے ہیں، پھر بیوی سے پڑھواتے ہیں اور اس کے بعد متوفی

کے گھر فون کر کے تصدیق کرواتے ہیں کہ تصویر ان کی ہی ہے یا کسی اور کی۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ عموماً متوفی کی تصویر اس کی عمر کے مطابق نہیں ہوتی۔ اسی سال کے بوڑھے کی موت کے اشتہار کے ساتھ اس کی چالیس سال والی تصویر ہوتی ہے۔ ایسی جواں مرگی کی تصویر دیکھ کر غم اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ کئی بار جب متوفی کی کوئی پورٹریٹ نہیں ہوتی تو لوگ گروپ فوٹو ہی چھاپ دیتے ہیں اور نیچے وضاحت کر دیتے ہیں کہ مرحوم بائیں طرف سے تیسرے نمبر پر ہیں، لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ بائیں طرف دیکھنے والے کی یا تصویر کی۔

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اکثر مرحوم اپنی تصویر میں ہنس رہا ہوتا ہے۔ موت کی خبر اور اشتہار کے ساتھ ایسی تصویر مناسب نہیں لگتی۔ کیا کوئی شخص اپنی موت پر ہنستا ہے؟ دوسروں کی موت پر ہنسنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے، چاہے وہ جگری دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ مرنے والے کی تصویر اس کی موت کے وقت کی عمر کے مطابق ہو اور دوسرے تصویر غمگین موڈ میں ہو۔ اگر ہو سکے تو بہتر ہے کہ موت کے فوراً بعد لاش کی تصویر لی جائے اور اشتہار کے ساتھ اسے چھاپا جائے۔ آج کل تو فٹافٹ فوٹو والے مل جاتے ہیں۔ ادھر تجہیز و تکفین کے انتظامات شروع کئے جائیں، ادھر ایک جھٹ پٹ فوٹو گرافر کو بلایا جائے۔

اس معاملہ میں آپ کی رائے کچھ بھی ہو ہم نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہماری موت کی خبر کے ساتھ عین موزوں تصویر ہی چھاپی جائے گی۔ ہر سال جب ہم اپنا طبی معائنہ کروانے جاتے ہیں تو ساتھ ہی ایک تصویر بھی کھنچوا لیتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ ہم عوام کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے کہ ہم بے وقت موت مرے ہیں یا ہم اس دنیا سے ہنسی خوشی گئے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ ہم روتے ہوئے پیدا ہوئے تھے، اس لئے مناسب ہے کہ ہم مرتے وقت بھی روئیں۔

ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ ہماری موت کی خبر میں یہ ہرگز نہ کہا جائے کہ ہمیں جنت نصیب ہوئی ہے یا ہم سورگ باش ہوئے ہیں۔ اس کی تصدیق ہم بعد میں کریں گے کہ ہم کہاں ہیں اور کیسے ہیں اور اگر اخبار والوں کو اس میں کوئی دلچسپی باقی رہ گئی ہو تو وہ اس کو چھاپ سکتے ہیں، تاکہ ہمارے دوستوں اور دشمنوں کو خوشی یا افسوس ہو سکے۔

ویسے آج کل کے بڑھیا کیمرے ہماری ایسی اچھی تصویر نہیں نکالتے، جیسی ہماری جوانی میں معمولی کیمرے بھی نکال دیتے تھے۔ ٹکنالوجی نے کیا خاک ترقی کی ہے کہ ہماری شکل بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کیمرہ جھوٹ نہیں بولتا، یہ جھوٹ ہے۔ ہم نے بارہا کیمرے کو جھوٹ بولتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہماری والدہ مرحومہ جب پچاسی برس سے بھی آگے نکل گئی تھیں تو ان کے پاسپورٹ کے لئے ایک تصویر کی ضرورت پڑی۔ جب فوٹو گرافر تصویر لایا تو انہوں نے تورے در شتگی سے کہا کہ آپ کے کیمرے نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ فوٹو گرافر نے بڑے ادب سے کہا "ماں جی' آپ کو انصاف کی نہیں، رحم کی ضرورت ہے۔" آج کل کے کیمروں میں نہ انصاف ہے علاوہ نہ رحم۔ پرانے کیمروں سے لی گئی ہماری ماں کی تصویریں آج بھی اتنی ہی خوبصورت لگتی ہیں۔ خیر ہم نے اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ ہماری بعد از مرگ تصویر کھینچئے جس سے عوام الناس کو ہماری ہیجان، ہماری بحث اور ہماری ناگہانی موت پر صدمے کا پورا احساس ہو سکے وہ بڑے متذبذب ہو گئے اور کہنے لگے کہ آج تک کسی نے مجھ سے ایسی فرمائش نہیں کی اور یہ کام میرے بس کا نہیں۔ پھر کچھ غور کر کے اعلان کرنے لگے کہ کچھ ٹولیوں کی ضرورت ہے۔ ہم نے کہا زیادہ دیر مت لگاؤ۔ کچھ تو زندگی اور موت

دونوں کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کس وقت ایک چلی جائے اور دوسری آجائے۔

ابھی ہم اسی انتظار میں تھے کہ ہمیں ایک خط ملا۔ لکھا تھا کہ الیکشن کمیشن کے حکم کے مطابق ملک کے تمام رائے دہندوں کے لئے شناختی کارڈ بنائے جارہے ہیں، اس کے لئے ایک مقررہ تاریخ کو ایک مقررہ جگہ پر آپ کی تصویر لی جائے گی۔ آپ وہاں حاضر ہوجائیے (نوٹ کیجئے! ہمیں تشریف لانے کے لئے نہیں بلکہ حاضر ہونے کے لئے کہا گیا۔ وہاں پہنچے تو ایسا جم غفیر کہ ہم نے واپس آجانے کا فیصلہ کیا۔ پھر کسی نے کہا کہ الیکشن کمیشن کے حکم کی خلاف ورزی کی تو ہمارا ووٹ منسوخ کر دیا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ ہمیں قید کی سزا بھی دی جائے۔ ان دنوں ٹی این سیشن الیکشن کمشنر تھا، وہ سروس میں ہمارا ہمعصر اور دوست بھی ہے۔ اس لئے قید کا خطرہ اور بھی زیادہ تھا، سیشن اپنے دوست اور دشمن میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔

ہم چپ چاپ کیو میں کھڑے ہوگئے۔ کافی عرصہ بعد ہماری باری آئی۔ ایک ویڈیو گرافر نے ہمیں سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کو کہا ہم ابھی پوز بنا کر اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے والے ہی تھے کہ اس نے ہمیں "تھینک یو" کہہ کر اگلے شخص کو بلالیا۔

ہم اس واقعہ کو بھول گئے۔ کوئی دو مہینے کے بعد ڈاکیہ ایک رجسٹرڈ لفافہ لایا۔ ایسے لفافوں میں عموماً چیک آتے ہیں، ہم نے بڑے اشتیاق سے لفافہ کھولا۔ اس میں ایک کارڈ تھا اور اس پر ایک تصویر چسپاں تھی۔ صورت کچھ جانی پہچانی سی لگتی تھی، ایک بے ڈھنگی سی لاش کا چہرہ۔ ہم نے سوچا کوئی بزرگ چل بسا۔ لیکن کون؟ پھر دیکھا تو اس کے نیچے غلط حرفوں میں ہمارا نام لکھا تھا اور اوپر الیکشن کمیشن کی مہر تھی۔ ہم نے دو اور دو جمع کئے اور زندگی میں پہلی بار چار کا ہندسہ نکلا۔ تب یہ عقدہ کھلا کہ یہ الیکشن کے لئے ہمارا شناختی کارڈ تھا اور وہ تصویر ہماری ہی تھی۔

ہمیں بلکہ ہماری بیوی کو بھی یہ یقین ہے کہ یہ کارڈ لے کر اگر ہم کسی دفتر یا الیکشن بوتھ میں جائیں تو وہ یقیناً باور نہیں کریں گے کہ یہ ہمارا ہی کارڈ ہے۔ لیکن الیکشن ایک ایسا عمل ہے، جس میں ہر چہرہ ہر کیریکٹر اور ہر شناخت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے، اس اعتبار سے یہ تصویر موزوں تھی۔

ہماری الجھن الیکشن کمیشن نے حل کر دی۔ ہم نے فوٹو گرافر کو دیا ہوا آرڈر کینسل کر دیا۔ اب ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہماری وفات کی صورت میں اسی تصویر کو چھپوایا جائے گا۔ اس کی کاپیاں بنا کر مختلف اخبارات کو بھیج دیں گے اور یہ ہماری آخری تصویر ہوگی۔

(پس نوشت: اس واقعہ کے ایک مہینہ بعد بلدیہ کے ایک افسر کا فون آیا، کہنے لگا کہ الیکشن کے لئے شناختی کارڈ کی تصویر کے لئے ہم آپ کے گھر ایک فوٹو گرافر بھیجنا چاہتے ہیں۔ اپنی فرصت سے آگاہ کریں تو عنایت ہوگی۔ ہم نے جواب دیا کہ وہ کام تو ہو چکا ہے۔ اس نے کہا آپ کو وہاں جانے کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو ہم نے عوام کے لئے الیکشن کمیشن کے احکام کی تعمیل کے لئے ٹینڈر (Lowest Tender) پر کام کروایا تھا۔ یہ سن کر ہمیں ڈھارس ہوئی کہ ہم ابھی زندہ ہیں۔ اب الیکشن کے لئے اسی تصویر کا استعمال کریں گے جو خاص طور پر کھینچی گئی تھی اور جس سے ہم پہچانے جاسکتے ہیں۔

کوثر صدیقی۔ بھوپال

مزاحیے

میں آؤں گی میلے میں
شام کو مندر پہ
مل جانا کیلے میں

☆☆☆

اب کیسے ملن ہووے
نند بڑی نٹ کھٹ
بستر میں مرے سووے

☆☆☆

کھسیانہ ہلا ایسے
ساس تو جاگت ہے
آؤں میں پیا کیسے

☆☆☆

وہ کہہ کے گئے آنا
ساس کہے مجھ سے
تو کھیت پہ مت جانا

☆☆☆

مارا تھا مجھے کنکر
چوک گیا لیکن
سادھو کے لگا سر پر

☆☆☆

مجھ کو نہ بھلا دینا
شہر کی لڑکی سے
شادی نہ رچا لینا

☆☆☆

آئی ہے کہاں ہو کر
لال نشاں کیسا
گوری ترے گالوں پر

☆☆☆

آنکھوں کے پیالوں سے
پیاس نہیں بجھتی
ان کی مرے ہونٹوں سے

☆☆☆

پایل جو کرے جھن جھن
چوڑی کرے چغلی
کیا میری خطا ساجن

☆☆☆

داڑھی نہیں بنوائی
ریچھ سا لگتا ہے
کیا مر گئے سب نائی

☆☆☆

نیا نہ چلا پاؤں
گہری بہت ندیا
کیسے میں بلم آؤں

☆☆☆

کنگن مرا کھنکاوے
رات بلم آکر
پایل مری جھنکاوے

☆☆☆

ساجن سے کہوں جاکر
دیر ہے شادی میں
منگنی تو کرے آکر

خامہ بگوش

کراچی میں جو ادب پیدا ہوتا ہے اس کا بڑا حصہ کھاد کے کام میں آسکتا ہے

ادب اور شجر کاری: رفیق چوہدری بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ پود کیاری (نرسری) کا شغل بھی فرماتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کی بیل تو منڈھے نہیں چڑھی، البتہ نرسری خوب پھل پھول رہی ہے۔ حال ہی میں انھوں نے ایک نئی جگہ پر "چوہدری نرسری" کو منتقل کیا ہے۔ افتتاحی تقریب انھوں نے خاصی دھوم دھام سے منعقد کی۔ شہر کے بہت سے ادیبوں کو جمع کیا اور چند خاص خاص ادیبوں کو پودے لگانے کی زحمت دی، جن ادیبوں نے پودے لگائے ان میں ادا جعفری، جمیل الدین عالی، شوکت صدیقی اور ہاجرہ مسرور شامل تھے۔ اس موقع پر شہزاد منظر، کرار نوری اور عتیق احمد وغیرہ موجود تھے۔ ان لوگوں نے خود تو کوئی پودا نہ لگایا، بلکہ دوسروں کے لگائے ہوئے پودوں کے بار آور ہونے کا انتظار کرتے رہے کہ ادب میں بھی ان لوگوں کا کام اسی نوعیت کا ہے۔

رفیق چوہدری کی نرسری سے متاثر ہو کر مرزا ظفرالحسن کو بھی "غالب پود کیاری" بنانے کا خیال آیا ہے۔ غالب لائبریری سے متصل ایک قطعہ زمین خالی پڑا ہے۔ مرزا صاحب اس میں نرسری قائم کریں گے کہ زمین اور کاغذ دونوں کے خالی پڑے رہنے کو وہ اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ یہ نرسری ہر اعتبار سے خالص ادبی ہوگی، یہاں تک کہ کھاد کی جگہ بھی ادب ہی کو استعمال کیا جائے گا کہ کراچی میں جو ادب پیدا ہوتا ہے اس کا بڑا حصہ اسی کام آسکتا ہے۔ اس نرسری میں پودوں کے نام پودے لگانے والوں کے ناموں پر یا ان کی ادبی فتوحات کے مطابق رکھے جائیں گے۔ مثلاً فیض احمد فیض کوئی ایسا پودا لگائیں گے جو دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت بن جائے گا۔ اس درخت کی شاخوں پر مختلف رسالوں کے فیض نمبر اور فیض کے بارے میں مرزا ظفرالحسن، ڈاکٹر ایوب مرزا اور عبداللہ ملک کی تصانیف لٹکائی جائیں گی۔ البتہ مصنفین کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوگا۔ درخت کی ایک نازک شاخ پر ایک آشیانہ بھی بنایا جائے گا جو احمد فراز سے منسوب ہوگا۔ جمیل الدین عالی دوہے کی پھولدار بیل لگائیں گے جس کے پھول پرتو روہیلہ کے سوا کسی کو توڑنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ قمر جمیل جو پودا لگائیں گے اس کا نام "نثری نظم" ہوگا۔ اس پودے کے لئے آب و ہوا کا ایسا انتظام کیا جائے گا کہ ہفتے میں چھ دن یہ پودا مرجھایا رہے گا، ساتویں دن تر و تازہ اور شاداب دکھائی دے گا۔ تابش دہلوی روایتی غزل کا پودا لگائیں گے جس کی جڑیں زمین سے اوپر ہی رہیں گی۔ محشر بدایونی نئی اور پرانی غزل کی پیوند کاری کرکے ایسا پودا لگائیں گے جو چھوئی موئی کی طرح ہاتھ لگتے ہی مرجھا جائے گا۔ صہبا لکھنوی کھجور کا درخت لگائیں گے تاکہ

اس پر ترقی پسند ادب کو اگایا جاسکے۔ صہبا اختر جو پودا لگائیں گے اس میں پتوں کی جگہ لفظ لگے ہوں گے جو ذرا سی بھی ہوا چلے گی تو ٹوٹ کر بکھرنے لگیں گے۔

کراچی سے باہر کے ادیبوں کو بھی پودے لگانے کی زحمت دی جائے گی۔ انتظار حسین جو پودا لگائیں گے اس کی جڑوں میں صرف انیس حاگی اور انور سجاد کو پانی دینے کی اجازت ہوگی۔ ڈاکٹر وزیر آغا الطاف کا پودا لگائیں گے جس کے پھول سونگھنے کی اجازت صرف ساکنان سرگودھا کو ہوگی۔ اگر کوئی دوسرا یہ شوق فرمائے گا تو اپنے نقصان کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ عبادت بریلوی کے لگائے ہوئے پیڑ کے سائے میں صرف وہی لوگ بیٹھ سکیں گے جو ایم اے (اردو) کے امتحان کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ قدرت اللہ شہاب ایک گھنا درخت لگائیں گے جو کرشنوں کے ذریعے قالب نثر میں لایا جائے گا۔ اس درخت کی دو شاخیں باہر کی طرف نکلی ہوں گی اور اس دو شاخہ پر ممتاز مفتی اور اشفاق احمد بیٹھے ہوں گے۔

اداکار مسرت شاہین کی نثری غزل:

فلمی اداکارہ مسرت شاہین کے بارے میں ایک انکشاف کیا گیا ہے کہ وہ فرصت کے اوقات میں شعر کہتی ہیں۔ اخبار میں ان کا ایک شعر بطور ثبوت پیش کیا گیا ہے جو یہ ہے:

یوں تو ہزاروں سانپ راہ زندگی میں ملیں گے
خدا کرے کوئی زیر آستین نہ ملے

بعض عروضی قسم کے شعراء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس شعر کے دونوں مصرعے ناموزوں ہیں۔ معترضین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ نثری نظم کی طرح ایک چیز نثری غزل بھی ہوتی ہے جس میں عروض کی پابندی نہیں کی جاتی یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مسرت شاہین نے رائٹرز گلڈ کی رکنیت کے لئے جو درخواست بھیجی تھی۔ اسے منظور کر لیا گیا ہے۔ یہ درخواست اس بناء پر منظور کی گئی ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی گلڈ کے رکن ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں ایک مصرعہ بھی نہیں لکھا اور مسرت شاہین تو اکٹھے دو مصرعوں کی مصنفہ ہیں۔ اکیڈیمی آف لیٹرز نے بھی اعلان کیا ہے کہ نئے مصنفین کی حوصلہ افزائی والے پروگرام کے تحت مسرت شاہین کا یہ شعر کتابی صورت میں عنقریب شائع کیا جائے اس کتاب کی اشاعت کے بعد توقع ہے کہ شاعری اسی زمین میں مزید شعر بھی تصنیف فرمائیں گی۔

پروفیسر یا گلوکار:

پچھلے دنوں مشہور گلوکار مہدی حسن نے مطالبہ کیا تھا کہ گانے والوں کو "استاد" کی بجائے "پروفیسر" کہا جائے۔ جامعہ بلوچستان کے پروفیسر مجتبیٰ حسین نے اس مطالبے کو ناجائز قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر یہ مطالبہ منظور کر لیا گیا تو ہم لوگوں کی شہرت خراب ہوگی۔ مہدی حسن کے طرفداروں نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ جہاں شہرت کی خرابی کے بہت سے اسباب پہلے سے موجود ہیں وہاں ایک اور سہی۔ جب اس بات کی وضاحت طلب کی گئی تو معاملہ سلیم احمد کے ایک کالم تک جا پہنچا جو ۲۲ فروری کے روزنامہ "حریت" میں شائع ہوا ہے۔ یہ کالم پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ افسوس کہ ہم پورا کالم نقل نہیں کر سکتے۔ بطور نمونہ اس کا آخری پیرا گراف ملاحظہ فرمائیے۔

"آدمی اپنی محرومیوں کا بھی کس کس طرح انتقام لیتا ہے۔ایک زمانہ تھا کہ یہ صاحب نہ جانے کیا کچھ بننے میں مصروف تھے۔شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، انشا پرواز، سیاسی مفکر نظریاتی رہنما، اس کے لئے ساری زندگی نجانے کیسے کیسے پاپڑ بیلے۔نیاز فتحپوری صاحب کی سند تو حاصل ہی تھی سجاد ظہیر صاحب کا سرٹیفکیٹ بھی منگوایا۔مگر بات بننے کی بجائے بگڑتی چلی گئی ہے۔اب بجائے صرف دوسروں کا منہ چڑانے پر گزر اوقات کر رہے ہیں، اور وہ بھی آئینہ خانے میں"۔

سلیم احمد نے کسی کا نام لئے بغیر بات کی ہے۔اس لیے ہم بھی نام لینے کی جسارت نہیں کر سکتے۔شاید پروفیسر مجتبیٰ حسین بتا سکیں کہ یہ باتیں کن صاحب کے بارے میں ہیں۔

شاعروں کے حقوق:

مشہور شاعر قتیل شفائی نے مطالبہ کیا ہے کہ شاعروں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے کہ ریڈیو والے ان کا کلام تو نشر کرتے ہیں لیکن رائلٹی ادا نہیں کرتے۔تمام ادبی حلقوں نے اس مطالبے کی تائید کی ہے لیکن بعض لوگوں نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ شاعروں کی رائلٹی کا آدھا حصہ ریڈیو کے غزلیں سننے والے سامعین کو ملنا چاہیئے تاکہ ان کے نقصان کی تلافی بھی ہو سکے۔

شاعری اور دیہی ترقی:

راولپنڈی میں ۴/ فروری کو شاعر ناصر زیدی کے ساتھ ایک شام منائی گئی تھی جس کی روداد پورے ایک مہینے بعد ہمیں اشاعت کے لئے وصول ہوئی ہے۔تقریب کی صدارت وفاقی وزیر بلدیات و دیہی ترقی سید فخر امام نے کی۔جناب صدر نے فرمایا کہ "بائرن، شیلے اور کیٹس کے ہاں محبت کا جو تصور ملتا ہے اس کی واضح جھلک ناصر زیدی کے کلام میں ملتی ہے۔جمیل ملک، مسعود قریشی، کرم حیدری، پروین فنا سید اور بہت سے دوسرے مقررین نے بھی اظہار خیال کیا اور کئی بڑے بڑے شاعروں کے کلام کی جھلک ناصر زیدی کی شاعری میں دیکھی لیکن خود ناصر زیدی کی کوئی جھلک اس کی شاعری میں نظر نہ آئی۔یہ تقریب گروپ آف پروموٹرز کی طرف سے منعقد کی گئی تھی۔تقریب کے آخر میں شیفرز قلم کا ایک سیٹ ناصر زیدی کو تحفتاً پیش کیا گیا تاکہ وہ صحیح معنوں میں اہل قلم کہلا سکیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تقریب کی صدارت کے لئے دیہی ترقی کے وزیر کو اس لئے منتخب کیا گیا کہ ناصر زیدی کا کلام دیہی ترقی کے لئے بھی ایک موثر حربے کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔

گھریلو ادبی نشستیں:

لاہور میں کئی ادبی حلقے اور محفلیں ہیں جن کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس باقاعدگی سے ہوتے رہتے ہیں۔کراچی میں اس قسم کا کوئی ادبی حلقہ نہیں ہے۔ایک زمانے میں جب ضیاء جالندھری یہاں تھے تو حلقہ ارباب ذوق کے جلسے ہوتے تھے کچھ دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام پر بھی تنقیدی نشستیں ہوتی رہیں لیکن یہ شوق زیادہ دن تک نہ چل سکا۔اس ادبی جمود کو ختم کرنے کے لئے لوگوں نے اپنے گھروں پر ادبی نشستیں منعقد کرنی شروع کر دی ہیں۔اس کام کا آغاز

جمیل زبیری نے کیا تھا جن کے گھر پر ہر مہینے نشست ہوتی تھی جس میں ہر مرتبہ جمیل زبیری افسانہ ضرور سناتے تھے اور اگر وقت بچ جاتا تھا تو کوئی اور شخص بھی اپنا کلام (نظم یا نثر) سنا دیتا تھا۔ زبیری صاحب کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا تو یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب یہ کام سلطان جمیل نسیم نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اس مہینے ان کے گھر پر ایک ادبی نشست ہوئی جس میں کچھ لوگوں نے افسانے سنائے اور باقی لوگوں نے غزلیں پڑھیں۔ سلطان جمیل واحد سامع تھے۔ وہ اپنا افسانہ سنانا چاہتے تھے لیکن امراؤ طارق.... نے انہیں سمجھایا کہ صاحب خانہ کو مہمانوں کے ساتھ شائستگی سے پیش آنا چاہیے۔ سلطان جمیل نے شائستگی کا مزید یہ ثبوت یہ دیا کہ نشست کے اختتام پر مہمانوں کی پرتکلف دعوت کی۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ آئندہ ہر نشست کا اختتام عشائیے پر ہوگا۔ بعض احباب نے یہ مشورہ دیا ہے کہ نشست کا آغاز عشائیے سے ہونا چاہیے تاکہ جن لوگوں کو کھانا کھاتے ہی سو جانے کی عادت ہے۔ انہیں اس عادت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے

مختصر مختصر: گزشتہ مہینے کی ۲۰ تاریخ کو جیکب آباد کے سالانہ میلہ مویشیاں کے کل پاکستان مشاعرے میں شرکت کے لئے کراچی سے جو شعرا تشریف لے گئے تھے ان میں سے بعض ابھی واپس نہیں آئے۔

000 محسن بھوپالی نے کہا ہے کہ بعض لوگ نام کی یکسانیت سے دھوکا کھا کر سید سیدان ظہور الحسن بھوپالی کے بیانات مجھ سے منسوب کرتے ہیں، حالانکہ میں نثر میں کوئی سیاسی بیان بازی نہیں کرتا۔

000 سب رنگ ڈائجسٹ والے شکیل عادل زادہ نے "چاندنی" کے نام سے ایک اور ڈائجسٹ نکالا ہے جو خواتین کے لئے ہے۔ نیا ڈائجسٹ مقبولیت کے اعتبار سے جاڑے کی چاندنی ثابت ہوا ہے۔

000 احمد ہمدانی آج کل نئے افسانہ نگاروں میں بہت مقبول ہو رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جدید افسانے پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے وہ جدید شاعری پر ایک کتاب لکھ کر ان شاعروں میں نامقبول ہو چکے ہیں جن کا ذکر اس کتاب میں نہیں ہے۔

(بشکریہ روزنامہ "جسارت" ۵ مارچ ۱۹۸۲ء)

اظہر احسن صدیقی
کراچی

وقت کی پابندی ضروری نہیں

اکثر دعوت نامے جو آپ کو ملتے ہیں ان میں ایک چیز بڑی باقاعدگی سے مشترک ہوتی ہے اور وہ ہوتے ہیں اس سم کے فقرے یا ہدایتیں "پابندی وقت کا خاص خیال رکھیں" یا "پابندی وقت ملحوظ خاطر رہے" یا وقت کی پابندی روری ہے یا تقریب ٹھیک فلاں وقت شروع ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان ہدایتوں پر کس حد تک عمل ہوتا ہے اس سے پ خود ہی اچھی طرح واقف ہیں۔ ان ہدایتوں پر عمل نہ کرنے والوں میں نہ صرف منتظمین پیش پیش ہوتے ہیں بلکہ ن کو اس سلسلے میں مہمانوں کا بھی پورا تعاون حاصل ہوتا ہے اسی طرح ہر دعوت نامے میں پروگرام یا نظم الاوقات بھی ڑی پابندی سے دیا جاتا ہے گویا اس پر عمل بھی ہوگا۔ دعوت نامہ اگر شادی بیاہ کا ہو تو بڑی باقاعدگی کے ساتھ آمد بارات کا وقت نکاح کا وقت اور پھر کھانے کے اوقات بھی درج کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر دعوت نامہ کسی اور تقریب ہے تو اس میں تقریب منعقد ہونے کے وقت سے لے کر مہمان خصوصی کی آمد تقاریر اور عصرانے تک کے لئے علحدہ علحدہ وقت مقرر ہوں گے اور اگر ثقافتی پروگرام یا عرف عام میں کلچرل شو ہے تو اس کے بھی ہر آئیٹم کے لئے گھنٹہ اور منٹ مخصوص کئے گئے ہوں گے۔ لیکن نتیجہ کیا نکلتا ہے اس سے ہم اور آپ سب بخوبی واقف ہیں۔

ہمارے پاس ایک ہی چیز کی تو فراوانی ہے اور وہ ہے وقت۔ پانچ پانچ دن تک ہم بے مقصد کرکٹ میچ دیکھتے ہتے ہیں۔ سڑک چلتے اگر کسی گاڑی میں پنکچر ہو جائے تو بیسیوں آدمی کام چھوڑ کر اس کو دیکھنے لگتے ہیں۔ پچھلے دنوں جب آسمان پر دمدار ستاروں کی افواہ زوروں پر تھی ہم نے خود کئی جگہ پر دسیوں آدمیوں کو اکٹھا ہو کر آسمان کی طرف منہ اٹھائے دیکھا ہے اور جب کسی سے پوچھا کہ بھئی کیسے کھڑے ہو تو اس نے نہایت معصومی سے جواب دیا کہ سب کھڑے تھے ہم بھی کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ ان حالات میں پابندی وقت کی بات بڑی مضحکہ خیز لگتی ہے۔ اور ابھی تو ہم نے آپ کو اپنے اوپر پابندی وقت کے سلسلہ میں گزرنے والے مصائب سے آگاہ نہیں کیا ہے۔

ہمارے ایک دوست کی بچی کی منگنی تھی اور بلاوا آٹھ بجے کا تھا کیونکہ یہ لوگ ہر کام نہایت آرام سے کرنے میں مشہور تھے اس لئے ہم نے اپنی طرف سے یہ طے کیا کہ کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے پہنچا جائے تاکہ صحیح وقت پر پہنچ ہو جائے۔ چنانچہ ہم ساڑھے نو بجے جب اس جگہ پہنچے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مہمانوں میں آئس کریم تقسیم ہو رہی تھی ور یہ اس بات کی علامت تھی کہ کھانا ختم ہو چکا ہے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ چلو دعوت تو ختم ہوئی اب جلد ہی تمام رسمیں ہونگی اور پھر تقریب ختم۔ مگر ہماری خوشی بہت ناپائیدار ثابت ہوئی جب یہ معلوم ہوا کہ یہ تو لوگوں کو بہلانے اور مشغول رکھنے کا بہانہ تھا۔ کھانا تو ابھی باقی ہے اور اس سے پہلے رسمیں ہونگی اور یہ سب کچھ دولہا والوں کے آنے پر ہوگا

جواب تک نہیں آئے تھے۔ جب بھی ہم جانے کا نام لیتے فوراً تسلی دی جاتی کہ۔ بس اب کھانا لگ رہا ہے کھانا کھا کر جائیے گا۔ ہمارے ایک دو ساتھیوں کو سخت بھوک لگ رہی تھی لیکن گلوخلاصی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ کیوں کہ عورتوں کا علیحدہ انتظام تھا اور ان کا بلانا میزبان کی مدد کے بغیر ناممکن تھا۔ میزبان قطعی مدد کے موڈ میں نہیں تھے۔ کسی نہ کسی بہانے میزبان سے تھوڑی دیر کی اجازت اس شرط پر ملی کہ بیگمات وہیں رکیں اور ہم تھوڑی دیر بعد واپس آجائیں اس وقت تک رات کے بارہ بج چکے تھے اور اس علاقے کے تمام ہوٹل بند ہو چکے تھے۔ ناکام و نامراد واپس لوٹے۔ اس کے بعد بھی کھانے کے لئے کافی انتظار کرنا پڑا کیونکہ کھانا رات کے پورے ایک بجے دیا گیا اور پابندی وقت کا مزا آگیا۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس دعوت نامے میں بھی وقت کی پابندی کی استدعا کی گئی تھی مگر کس سے پتہ نہیں۔ اس سلسلے میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ ٹھیک وقت کا تعین کرنے میں مار بھی کھا جاتے ہیں۔ ایک صاحب نے اپنے بیٹے کے ولیمہ کے سلسلہ میں ایک ہوٹل میں چھ بجے عصرانہ کا اہتمام کیا تھا ہم اپنی طرف سے صحیح وقت کا اندازہ کر کے سات بجے پہنچے تو معلوم ہوا کہ صرف والدین موجود ہیں جو عصرانہ ختم ہونے کے بعد ہوٹل کا بل ادا کرنے کے لئے رکے ہوئے تھے اور ہوٹل والے اگلی دعوت کا اہتمام کر رہے تھے۔ ایک اور شادی میں ہمیں بارات کو بھی لے کر جانا تھا کیونکہ نوشہ میاں ہمارے کالج کے پرانے ساتھی تھے۔ دولہا کو غالباً سسرال پہنچنے کی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی انہوں نے حکم صادر کیا کہ ۳ بجے دوپہر ان کے گھر پہنچ جائیں۔ ہماری بدقسمتی ہمیں اتنا قریبی دوست سمجھا گیا کہ دعوت نامہ تک نہیں دیا گیا۔ قہر درویش برجان درویش کے مصداق ٹھیک دوپہر کو تیار ہو کر حسب الحکم جا پہنچے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بارات کی تیاری تو اب شروع ہوئی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ واپس بھی نہیں آسکتے تھے خدا خدا کر کے پانچ بجے تک بارات روانہ ہوئی۔ دولہن کا گھر کیونکہ زیادہ دور نہیں تھا اس لئے جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ نکاح سے فارغ ہونے تو چائے ناشتہ کا انتظار ہونے لگا مگر وہاں اس قسم کے کوئی آثار نہیں دکھائی دیئے۔ ناچار بے حیا بن کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ رات کا کھانا ہے۔ سخت کوفت ہوئی۔ یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر نکاح کی ایسی کیا جلدی تھی جو بارات کو دوپہر سے بلا کر بٹھا لیا گیا۔ شاید دولہا کا اعتبار نہ ہوگا یا پھر عین موقعہ پر ظالم سماج کے حائل ہونے کا اندیشہ ہو۔ بہر حال جو بھی وجہ ہو، ہماری بڑی خواری ہوئی۔

یہ تو خیر ایک شادی کا قصہ تھا۔ ایک دفعہ ہمیں ایک دن میں تین شادیوں میں جانا تھا۔ ویسے آپ تعجب نہ کریں ہم چار پانچ جگہ تک ایک شام میں نمٹا لیتے ہیں۔ اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو طریقہ بھی بلا فیس بتا دیتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک طرف سے داخل ہوئے دولہا یا دولہن کے لواحقین کو حسب موقعہ مبارکباد دی اور دوسری طرف سے باہر چلے گئے۔ البتہ جہاں کھانا لگا ہو وہاں ہم تکلف نہیں کرتے۔ ذکر ہو رہا تھا تین شادیوں کا جب پہلی جگہ ہم پہنچے تو حالانکہ مقررہ وقت کے گھنٹہ بھر بعد پہنچے تھے مگر وہاں بارات ابھی تک نہیں آئی تھی۔ چنانچہ ان سے یہ کہہ کر ہم ابھی آتے ہیں دوسری جگہ جا پہنچے وہاں دولہا بھی موجود تھا مہمان اور میزبان بھی مستعد تھے مگر معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کہیں دوسری جگہ گئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ شادیوں کا موسم تھا اور وہ بھی حسب توفیق ایک ایک روز میں کئی کو بھگتا رہے تھے۔ یہاں بھی کیونکہ دیر تھی اس لئے سوچا کہ چلو تیسری جگہ ہو آئیں وہاں پہنچے تو یہ معلوم ہو کر بہت خوشی ہوئی کہ نکاح بھی ہو گیا ہے (جس کو پروگرام کے مطابق دو گھنٹے پہلے ہو جانا چاہیے تھا) مگر مہمان خصوصی کا انتظار ہے جو اس وقت کے بہت اہم

ذوی تھے۔ کیونکہ بڑے آدمی کو آنا تھا اس لئے مجمع بہت زیادہ تھا ہم نے سوچا کہ اگر یہاں کھانا شروع بھی ہو گیا تو اتنے آدمیوں میں اپنی دال گلتی نظر نہیں آتی اس لئے پہلی جگہ چلنا چاہیے۔ وہاں پہنچ تو دیکھا کھانا ہو چکا ہے اور رخصت کی تیاری ہو رہی ہے۔ یہاں سے بھاگم بھاگ دوسری جگہ گئے تو وہاں ہو کا عالم تھا ٹینٹ شامیانے والے اپنے کام میں مشغول تھے۔ اس کے بعد تیسری جگہ جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ گھر جا کر کس منہ سے کھانا مانگتے کہ وقت کی پابندی کی وجہ سے تینوں شادیوں میں سے ایک میں بھی کھانا نہیں ملا۔ قریب ہی ایک دوست رہتے تھے ان کے ہاں چلے گئے اور جب ان کی بیگم نے چائے یا کافی کے بارے میں پوچھا تو نہایت بے حیائی سے ہم نے کچھ کھلانے کی فرمائش کر دی جو انہوں نے پتہ نہیں کن دشواریوں سے اس وقت پوری کر دی۔

یہ تو وہ جگہیں تھیں جہاں پر وقت مقررہ پر پہنچنے کے بعد کم از کم یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ شادی ہو رہی ہے۔ ہمیں دو تین شادیوں میں ایسی جگہ جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے کہ جہاں مقررہ وقت کے کافی دیر بعد تک بھی نہ صرف میزبان غائب تھے بلکہ شامیانے کرسی والے بھی ہمارے جانے کے بعد پہنچے تھے۔ اب آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ تقریب کس وقت شروع ہوئی ہو گی اختتام کے وقت کا تو ذکر ہی فضول ہے۔

یہ تو عام تقریبات کا ذکر ہے لیکن سبھی لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے ہم نے دو ایسی یادگار تقریبات میں بھی شرکت کی ہے کہ جہاں وقت کی پابندی مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک کرم فرمانے اپنی بچی کی رسم بسم اللہ میں ہمیں مدعو کیا تھا اسی روز ہمیں ایک شادی میں کافی دور جانا تھا۔ دونوں تقریبات میں گھنٹہ بھر کا فرق تھا۔ اس لئے ہم نے اپنے کرم فرما سے معذرت چاہی کہ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم شرکت نہ کر سکیں گے۔ صاحب خانہ نے فرمایا کہ آپ گھنٹہ بھر کی بات کرتے ہیں ہم آپ کو ۴۵ منٹ میں اپنے ہاں کی تقریب سے فارغ کر دیں گے۔ ان کی بات کچھ دل کو لگی نہیں کیونکہ پروگرام کے مطابق ساڑھے سات بجے تقریب بسم اللہ ہونی تھی سات چالیس پر وعظ تھا اور آٹھ بجے کھانے کا انتظام تھا۔ ہم نے جب اپنے خدشات کا اظہار اپنے عزیز سے کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل ہو گا اور وقت کی پابندی کی بدولت محض رسمی نہیں ہے۔ آپ آکر دیکھئے تو سہی چنانچہ ہم مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے جا پہنچے اس وقت تک بہت کم مہمان آئے تھے اور لگتا تھا کہ تقریب کم از کم آدھ گھنٹہ دیر سے تو ضرور شروع ہو گی مگر جب ہم نے صاحب خانہ کے ہاتھ میں جیبی گھڑی دیکھی تو کچھ کچھ شک ہونے لگا کہ شاید زیادہ دیر نہ ہو۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے باوجود اتنے کم مہمانوں کے بسم اللہ کی تقریب عین وقت پر شروع کرا دی اور اسی طرح ٹھیک وقت پر وعظ بھی شروع ہو گیا۔ لیکن مولانا جس روانی سے بول رہے تھے اس سے لگتا تھا کہ ان کی تقریر ایک گھنٹہ سے کم میں کیا ختم ہو گی لیکن ٹھیک پندرہ منٹ بعد حاضرین میں ایک پرچہ تقسیم کیا گیا کہ ناگزیر حالات کی بنا پر کھانا دس منٹ دیر سے شروع ہو گا اور واقعی کھانا دس منٹ بعد لگا دیا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد بھی دوسری جگہ جانے کے لئے ہمارے پاس پندرہ منٹ باقی تھے مگر ہم وہاں سے فوراً ہی روانہ ہو گئے۔ اس ڈر سے کہ کہیں میزبان گھڑی دکھا کر یہ نہ کہنے لگیں کہ حضرات پروگرام کے مطابق تقریب کا وقت ختم ہو گیا ہے لہٰذا مہمانوں سے گذارش ہے کہ وہ تشریف لے جائیں۔

وقت کی پابندی کی دوسری مثالی تقریب کے میزبان بھی ہمی کرم فرما تھے۔ ان کے بیٹے کے ولیمہ کی دعوت کا وقت دعوت نامہ میں آٹھ بجے درج تھا اور کھانا ساڑھے آٹھ بجے دیا جانا تھا۔ ہم پچھلے تجربہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے

ٹھیک وقت پر ہوٹل پہنچ گئے۔ اس وقت تک مہمانوں کی ایک قلیل تعداد موجود تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے تک کے کچھ لوگ بھی نہیں آئے تھے مگر ہوادری وقت کی پابندی کو ٹھیک وقت پر کھانا لگوا دیا گیا۔ جب ایک دو لو صاحب خانہ سے کچھ دیر انتظار کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے بہت عمدہ جواب دیا کہ آخر جو لوگ ٹھیک وقت پر ان کا کیا قصور ہے کہ ان کو دیر سے آنے والوں کے انتظار میں بٹھایا جائے۔

افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے آدمیوں کی تعداد ہمارے معاشرے میں بہت تھوڑی ہے۔ آج تک یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ جب مہمانوں کی خواہ وہ کسی وقت آئیں خاطر مدارت ضروری ہے تو پھر یہ وقت کی پابندی پر اصرار کیوں کیا جاتا ہے۔ مہمانوں کی خاطر کی رسم نہ صرف گھروں پر منعقد ہونے والی تقریبات میں نبھائی جاتی ہے بلکہ ہوٹلوں اور دیگر جگہوں پر منعقد ہونے والی تقریبات میں بھی دیر سے آنے والے مہمان اپنے میزبانوں کے لئے تکلیف کا پورا سامان مہیا کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں اس بات پر اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ دیر سے آنے والے حضرات یہ کہ اپنی حرکت پر شرمندہ یا نادم نہیں ہوتے بلکہ باوجود دیر میں آنے کے اپنے میزبانوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ کھانے پینے کا پورا پورا انتظام کریں۔

ان تجربات سے گزرنے کے بعد اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر کبھی اللہ نے ہمیں لوگوں کو مدعو کرنے کی توفیق عطا فرمائی تو ہم اپنے دعوت نامے پر جلی حروف میں یہ عبارت ضرور لکھو "وقت کی پابندی ضروری نہیں" دیکھیں شاید کسی کو شرم آجائے۔

رشید الدین
حیدر آباد

الیکشن

ہمارے وطن ہندوستان جنت نشان میں عموماً تین قسم کے موسم پائے جاتے ہیں۔ سرما، گرما اور بارش لیکن اب جمہوریت کی دین سے ایک اور موسم کا اضافہ ہوا ہے۔ الیکشن کا موسم نئے موسم کا یہ تحفہ اسی جمہوریت کا عطا کردہ ہے جس کے بارے میں شاعر مشرق علامہ اقبال نے کہا ہے۔

اس راز کو ایک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

علامہ مرحوم کے قطعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جمہوریت کی صحیح تعریف ایک مرد فرنگی نے کی ہے۔ فرنگی کا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ کسی زمانے میں جب یہاں انگریز بہادر کی حکومت ہوا کرتی تھی تو یہ ایک گالی تھی جسے ہندوستانی دل ہی دل میں انگریزوں کو دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے۔ لیکن اب اس دور میں یورپ میں رہنے والے کو فرنگی کہا جاتا ہے۔ ویسے ہمارے ملک میں اب بھی ایسے خدا کے بندے ہیں جو بیشتر ہندوستانیوں کو فرنگی یا غیر ملکی کہتے ہیں جن کے آباو اجداد کسی زمانہ میں یہاں آئے تھے۔ دوسرا بھید یہ کھلا کہ جمہوریت ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں گھوڑے اور گدھے سب برابر ہوتے ہیں۔ یعنی اس میں قابلیت کی کوئی قید نہیں۔ ایک پروفیسر بھی ایک ووٹ ڈالتا ہے اور ایک غیر پڑھا لکھا اور جاہل بھی ایک ووٹ ڈال سکتا ہے یعنی محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس میں انسانوں کے سر گنے جاتے ہیں۔ سر میں کتنا بھیجا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا نہ اس کی پرواہ کی جاتی ہے۔

پہلے الیکشن کا موسم پانچ سال میں ایک بار آتا تھا مگر اب سال ڈیڑھ سال میں بھی آرہا ہے۔ الیکشنوں کی اس بہتات سے بارش کا موسم نہیں کے برابر رہ گیا ہے۔ کیونکہ بہر حال موسموں میں بھی تو توازن ہونا چاہیے۔ معاشیات کا اصول ہے کہ ہر چیز کی بہتات سے اس کی اہمیت میں کمی آجاتی ہے۔ سو یہ الیکشن کے ساتھ بھی ہوا۔ ایک اور دلچسپ بلکہ افسوسناک بات یہ ہوئی کہ ہر ۱۸ سال کے نوجوان لڑکے اور لڑکی کو ووٹ دینے کا حق دے دیا گیا جس کی آڑ میں ۱۵، ۱۵ سال کے بچے بھی ووٹ ڈالنے لگے ہیں کیونکہ ووٹنگ لسٹ میں ان کا نام ہوتا ہے اور کسی امیدوار کا ایجنٹ یا پولنگ آفیسر اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔

پہلے لوگ انتخابات کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔اب خوف کھانے لگے ہیں۔کیونکہ الیکشن کا مطلب دھینگا مشتی مار کٹائی، سر پھٹول اور فساد ہوتا ہے۔جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا سا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔نوبت قتل و خون اور آتش زنی میں بم اندازی تک پہنچ جاتی ہے۔ بم بنانا ایک گھریلو صنعت بن گئی ہے اور اس کا استعمال بازیچہ اطفال ہو گیا ہے غالب مرحوم کی اس ترکیب پر یاد آیا کہ الیکشن پر ان کا یہ شعر بہت صادق آتا ہے۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

الیکشن کا نام سنتے ہی لوگ باگ اپنی جانوں کی خیر منانے کی سوچتے ہیں۔مگر صاحب الیکشن سے مفر کہاں۔ ہمارا جمہوری حق جو ٹھہرا۔

الیکشن کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں حصہ لینے کے لئے کسی تعلیمی لیاقت کی قید نہیں ہوتی۔آپ دفتر میں چپراسی کی نوکری کے لئے بھی جائیں (اب تو یہ نوبت بھی نہیں آ رہی ہے) تو پوچھا جاتا تھا کہ کہاں تک پڑھے ہو۔اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ بی۔اے پاس، کلرک بھی بن نہیں پا رہے ہیں اور میٹریکولیٹ کو چپراسی کی نوکری بھی نہیں مل رہی ہے۔مرکزی حکومت سے لے کر ریاستی حکومتوں تک نئی بھرتی پر پابندی لگا دی گئی ہے۔لیکن محکمہ کے سب سے بڑے عہدہ دار یعنی وزیر کے لیے کسی تعلیمی قابلیت کی قید نہیں۔ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ انگوٹھا لگانے والے منسٹر بن گئے کیونکہ انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے لڑائی لڑی تھی یعنی مجاہد آزادی تھے۔ کشتیوں کے دنگل میں بھی تو کوئی قواعد ضوابط ہوتے ہیں جن کی نگرانی کے لئے رنگ میں ایک ریفری ہوتا ہے لیکن الیکشن میں ایک چھوڑ تین ریفری ہوتے ہیں اس کے باوجود کوئی قواعد کی پابندی نہیں کرتا۔

سارے الیکشن کی نگرانی کرنے اور قواعد و ضوابط کے مطابق الیکشن منعقد کرانے کے لئے الیکشن کمشنر بھی ہیں مگر ان کی وہ حالت ہوتی ہے جو نقار خانہ میں طوطی کی آواز کی ہے۔الیکشن کے جوش و خروش میں قواعد و ضوابط کی فکر کسے ہو گی۔ہمارے دوست خاں صاحب کا کہنا تھا کہ قواعد اسی لئے بنائے جاتے ہیں کہ انہیں توڑا جائے ہم نے یہاں ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال کیا ہے کہ ہمارے وہ دوست اب اس دنیائے آب و گل میں نہیں رہے خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے اور عمر بھی ساٹھ سے اوپر ہی پائی تھی مرتے مرگئے مگر کبھی ووٹ نہیں ڈالا۔کہا کرتے تھے کہ بھئی اتنی دور پولنگ بوتھ جانے کا بکھیڑا کون کرے۔کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ ویسے بھی ہمارا ووٹ ڈال دیتا ہے۔یہ تو ہوئی عام قواعد کی بات۔ الیکشن کمیشن کے قواعد کی تک بڑی بری گت ہوتی ہے۔الیکشن کمیشن ایگزٹ پول یا اوپنین پول پر نتائج سے پہلے پابندی عائد کرتا ہے تو ملک کی سب سے بڑی عدالت اس پابندی کو برخاست کرنے کا حکم دیتی ہے۔

نتائج سے قبل قیاس آرائیاں تو خیر دور کی بات ہے الیکشن کے نتائج سے قبل سٹہ بازی کا بازار گرم رہتا ہے کہ کون امیدوار جیتے گا یعنی الیکشن کے امیدوار نہ ہوئے ریس کے گھوڑے ہو گئے۔خیر سٹہ بازی یا شرط لگنے کو ہم تو بھی غنیمت جانتے ہیں جب کہ الیکشن میں دماغی کی بجائے جسمانی طاقت کا مظاہرہ ہونے لگا ہے۔ایسے موقعہ پر بے چاری پولیس کی عجیب حالت ہو جاتی ہے کہ کچھ کرتے بنے اور نہ کچھ کہا کرتے بنے۔کیونکہ پولیس نے ذرا سی سختی کی یا ہلکا سا بید چارج کر دیا تو اس کی تحقیقات اور پولیس کے نوجوانوں کی معطلی اور برطرفی تک کے مطالبات شروع ہو جاتے ہیں۔

یعنی لڑیں سیاسی پارٹیاں اور شامت آئے پولیس کی۔
پولیس والوں کا تو یہ حال ہے کہ

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

یعنی آگے قانون اور اس کے ضابطے اور پیچھے ہجوم جو پولیس کو گالیاں دیتا ہے، چپلیں پھینکتا ہے اور پتھراؤ کرتا ہے

چلئے یہ بھی طوعاً کرہاً برداشت کرلیتے ہیں لیکن بموں کا کیا کیا جائے بارودی سرنگوں کا کیا مداوا ہو۔ علانیہ سڑکوں پر نوجوان گاتے پھرتے ہیں کہ بم مارو بم مٹ جائے غم۔ یعنی ایک مار دو ٹکڑے۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری، نہ امیدوار زندہ رہے اور نہ اس کا الیکشن ہوسکے۔ ظاہر ہے امیدوار کے مرنے پر الیکشن تو ہونے سے رہا۔ حال ہی میں اخباروں میں یہ معتدقہ خبر چھپی کہ ایک منتری مہودے کے گھر میں بم تیار ہو رہے تھے (الیکشن میں استعمال کرنے کے لئے) بموں کی تیاری کے دوران اتفاقاً زبردست دھماکہ ہوگیا۔ کئی لوگ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ گھر میں وزیر باتدبیر تو موجود نہیں تھے مگر ان کے چند حواری تھے جو لقمہ اجل ہوگئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو صاحب بم بنا رہے تھے یعنی بم ساز تھے وہ بھی اس کا شکار ہوگئے۔ اور تو اور اس حلقہ کے ایک آزاد امیدوار پتہ نہیں کس ضمن میں وہاں موجود تھے۔ وہ بھی بھگوان کو پیارے ہوگئے۔ اب مطالبہ شروع ہوگیا ہے کہ وزیر موصوف کو برطرف کیا جائے اور بم کے واقعہ کی تحقیقات کرائی جائے۔

یہ تو الیکشن کے پہلے کے مراحل ہیں۔ الیکشن کے بعد الگ ہی منظر ہوتا ہے اونچے پورے ہٹے کٹے پہلوان نما اشخاص پتہ نہیں کہاں سے وارد ہو جاتے ہیں اور سارے شہر میں پھیل جاتے ہیں پولنگ بوتھ کے آس پاس تو ان کا خاص ڈیرہ ہوتا ہے۔ رگنگ اور بوگس ووٹنگ کا سلسلہ جو صبح سے شروع ہوتا ہے تو دوپہر ڈھلے تک جاری رہتا ہے۔ انتخابی عملہ بائیں ہاتھ کی انگلی کے ناخن اور تھوڑی سے جلد پر انمٹ سیاہی لگاتے ہیں لیکن یار لوگ فوری اسے لیمو کے رس یا کسی کیمیکل سے صاف کرکے پھر ووٹ دینے پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ محلے کے کتنے افراد شہر سے باہر یا غیر ممالک میں مقیم ہیں ان کے سارے ووٹ یہ حضرات استعمال کرلیتے یا یہ کہنا چاہیے کہ ہڑپ کرلیتے ہیں۔ جب چارے شریف لوگ شام کے وقت معہ فیملی پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو زحمت سے بچانے کے لئے کسی اور نے پہلے ہی ان کا فریضہ ادا کردیا ہے۔ یہ نیکی کس نے کی انتخابی عملہ کیا جانے۔ جب آپ بہت اصرار کرتے بلکہ انگریزی زبان کا استعمال شروع کر دیتے ہیں تو ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ فکر نہ کریں ہمارے پاس ٹنڈر ووٹ کا بھی انتظام ہے۔ ٹنڈر ووٹ کہا جاتا ہے ایک ایسا ووٹ ہوتا ہے جو نہ دینے کے برابر ہے کیونکہ اسے اس وقت شمار کیا جاتا ہے جب دو امیدواروں کے ووٹ مساوی ہوں۔ بھلا ہزاروں دونوں کے تفاوت میں برابری کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

جب الیکشن کا نتیجہ نکلتا ہے تو ایک اور مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوجاتی ہے تمام ہارنے والے امیدواروں کے ووٹ ملائے جائیں تو وہ جیتنے والے امیدوار سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہے ہماری جمہوریت کہ ہمارے ایوانوں میں اقلیتی امیدوار حلقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہر بار انتخابی طریقہ کار میں اصلاح کی جاتی ہے مگر وہ بے سود ہوتی ہے۔ اب کی بار کمپیوٹر مشین کا استعمال کیا گیا سب کی آواز آنے کے بعد یہ سمجھا جاتا ہے کہ آپ کا ووٹ پڑ گیا۔ بہت سے

یار لوگوں نے بپ کی آواز کا انتظار ہی نہیں کیا اور پہلے سے بٹن دبا کر چلے آئے۔

اب کی بار الیکشن میں ایک نئی بات یہ دیکھنے میں آئی کہ مختلف ریاستوں اور شہروں میں ووٹنگ کے ایام میں اتنا فاصلہ رکھا گیا کہ الیکشن کا ٹمپو ہی بن نہیں پایا۔ پہلے آٹھ دس دن میں سارے ملک میں رائے دہی ہوجاتی تھی اور اس کے دوسرے دن سے ہی کاؤنٹنگ شروع ہوکر نتائج آنا شروع ہوجاتے تھے۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ ایک تیر کو تو ایک میر کو۔ سارے الیکشن ستمبر کے مہینے ہی میں ختم نہیں ہوں گے بلکہ اکتوبر کے پہلے ہفتہ تک چلیں گے۔ تب کہیں جاکر گنتی شروع کی جائے گی۔

بیسویں صدی تو دم توڑ رہی ہے اور اکیسویں صدی کی آمد آمد ہے۔ اس صدی کا یہ آخری الیکشن تھا۔ ملک کو آزاد ہوئے نصف صدی سے زیادہ گزر گئی لیکن وہ ابھی تک جمہوریت کے اہل نہیں بن سکا۔

ابھی ایک مرحلہ اور باقی ہے نتائج کے بعد جیتنے والے امیدواروں کے جلوس۔ اس میں ہڑبونگ اور لاٹھی چارج ہوگا۔ نقض امن کا خطرہ لاحق ہوگا۔ بہرحال فی الحال تو ہم جان ہتھیلی میں لئے بیٹھے ہیں کہ دیکھیں پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

بابو آر کے
(اچل پور سٹی)

سر منڈاتے ہی اولے پڑے

یوں تو ہماری زندگی میں سر منڈاتے ہی اولے ہزار ہا مرتبہ پڑے لیکن خطرناک اولوں سے اس وقت سابقہ پڑا جب ہمارے سر پہ موٹر سائیکل خریدنے کا جنون سوار ہوا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب عراقی صدر صدام حسین کویت لے چکے تھے اور ہم موٹر سیکل لینے والے تھے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دنوں ہم اور صدام حسین دونوں اپنی اپنی تگ و دو میں مصروف کار تھے۔ موٹر سائیکل خریدنے اور اسے چلانے کی تمنا، ہم ایک عرصہ سے اپنے دل میں رکھتے تھے لیکن یہ تمنا اس وقت پوری ہوئی جب کہ ہمارے مخلص دوست نے یہ خوشخبری سنایا کہ لو بھئی، آج خدا نے مجھے سرخرو کیا۔ میں تمہارے لئے موٹر سائیکل کا سودا کر ہی آیا...... لاؤ، لڈو کھلاؤ یہ سنتے ہی ہم نے اپنے آپ کو فراٹے بھرتی دندناتی موٹر سائیکل پہ سوار ہوا سے باتیں کرتا پایا۔ ابھی ہم موٹر سائیکل کے سفر کے مزے لوٹ ہی رہے تھے کہ ہمارے دوست بولے! ارے بھئی چلو، جلدی کرو دشمن سر پر منڈلا رہے ہیں کہیں کسی نے مانگ اڑائی تو سمجھو یہ موقعہ بھی ہاتھ سے گیا۔ ہم نے فوراً اپنے دوست کا منہ اپنی ہتھیلی کے ڈھکن سے ڈھانپتے ہوئے کہا، ارے یار یہ کیا بدشگونی کرتے ہو۔ اناپ شناپ مت بکو، نیک گھڑی میں شبھ شبھ بولو۔

اس طرح انتہائی راز داری بلکہ پردہ داری کے ساتھ ہم موٹر سائیکل خریدنے چل پڑے، موٹر سائیکل مالک کے گھر پہنچنے کے بعد اسے دیکھنے کے لئے دل بے چین اور نظریں بے قرار ہوئیں۔ بالآخر گھر کے ایک گوشہ میں سات پردوں کے اندر حجابوں میں لپٹی نقابوں میں سمٹی ایک شئے نظر آئی۔ بے ترتیب دھڑکنوں لرزتے ہاتھوں کے ساتھ پردے ہٹائے گئے۔ دیدار ہوتے ہی بجلی گری۔ پہلی نظر میں یہ کافرادا سائیکل سے قریب اور موٹر سائیکل سے بہت دور لگی۔ ہم نے اس کے سراپا کو اندر باہر دائیں بائیں آگے پیچھے اوپر نیچے ہر جانب سے دیکھا بھالا پھر ہمت کر کے اس کے ہینڈل کو گھمایا حرکت نہ ہوئی پھر جسم کی پوری طاقت لگائی موٹر سائیکل گھوم گئی ہینڈل جگہ پر رہا۔ اس کے بعد Spokes پکڑ کر ہم نے Wheel کو حرکت دی۔ Spokes ہاتھ میں آئے Wheel سنگ میل کی طرح کھڑا رہا۔ بعد ازاں ہم نے اسے اسٹارٹ کرنے کے لئے کک مارنی چاہی بہت تلاش و جستجو کے بعد بھی پیڈل کک نہ ملی تو..... ان صاحب نے گھر کے چپہ چپہ میں ہرکارے بھیجے اسے کھوجا نہ ملی..... تھوڑے وقفہ کے بعد ہم نے اتری ہوئی صورت اور مایوس لہجہ میں موٹر سائیکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا..... یہ کیا ہے؟ موٹر سائیکل کہاں ہے؟ اس وقت صاحب موٹر سائیکل بوکھلائے اور ہم پر برس کر بولے..... تو کیا موٹر سائیکل کو سینگ اور دم ہوا کرتے ہیں؟ ہم نے کہا موٹر سائیکل کو سینگ اور دم بھلے ہی نہ ہوتے ہوں لیکن حضور موٹر سائیکل ایسی بھی کہاں ہوتی ہے؟ پھر ہم نے نہایت نرم لہجہ میں کہا

دیکھیے صاحب آپ برا نہ مانیں تو ہم ایک بات کہیں وہ صاحب بولے کہیے۔ ہم نے کہا قسم ہے موٹر سائیکل کے موجد گولائٹ کی، آپ کے ساتھ کھلا دھوکا ہوا ہے۔ کسی شاطر نے لوہے کے آڑے ٹیڑھے ٹکڑے جوڑ کر موٹر سائیکل کہہ دی اور آپ نے لے لی۔ پھر قدرے سنبھل کر ہم نے کہا، آپ دھوکا کھا سکتے ہیں کھائیے میں نہیں کھاؤں گا۔ کوئی میری جان لے لے، جان دیدوں لیکن اسے موٹر سائیکل نہ کہوں۔ وہ بولے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ ہم نے کہا ہم اسے عان موٹر سائیکل، کہیں گے وہ بولے تو ٹھیک ہے آپ اس عان موٹر سائیکل یا Never Motor Cycle کی قیمت کیا دیں گے؟ ہم نے کہا لگتا ہے آپ تجارتی لین دین میں صفر ہیں ورنہ اس ہاتھ آئے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے اور اونے پونے دیکر راحت کی سانس لیتے۔

الغرض قصہ مختصر، ہم نے اس شئے کی قیمت اس کا وزن تول کر لوہے کی قیمت جوڑ کر ادا کی۔ موٹر سائیکل نذرانہ دینے کے بعد ہم نے اسے لوڈ گاڑی پہ لادا اور میکانک کے روبرو لا ڈالا۔ پندرہ دنوں کی محنت مشقت کے بعد میکانک نے کچھ اپنے سابقہ تجربے اور کچھ نیا تجربہ حاصل کرتے ہوئے اتنا تو ضرور کیا کہ اسے موٹر سائیکل جیسی کوئی شئے بنا دیا۔ پھر ایک مہینہ بعد دبی زبان کانپتی آواز میں ہم نے بھی اسے موٹر سائیکل کہہ ہی دیا۔ جس وقت ہماری موٹر سیکل گیراج سے سڑک پر لاکر پہلی مرتبہ اسٹارٹ کی گئی پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ کے شور سے سارا ماحول تھرا اٹھا اور فضا میں دھوئیں کے بادل تیرنے لگے۔ لوگ جوق در جوق بھاگے بھاگے موٹر سائیکل کی جانب دیوانہ وار آنے لگے۔ دو کانوں کے شٹر گرنے لگے، بھگدڑ مچ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع لگ گیا۔ خدا خدا کر کے ٹریفک سپاہی نے حالات پہ قابو پایا اور مجمع کو منتشر کر کے ہمیں وہاں سے نکالا۔ اس کے باوجود لوگوں کی چیخ وپکار بچوں کے نعرے موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ اور ہم ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ عوامی جلوس کے بیچ ابھی ہم موٹر سائیکل پہ تھوڑی دیر ہی سفر کر پائے تھے کہ اس کی پھٹ پھٹ ایک ہچکی کے ساتھ بند ہو گئی ٹھنکا نگا، ہم نیچے اترے۔ اسے اسٹارٹ کرنے کے لئے اس کے مخصوص حصوں پر ادھر ادھر ہاتھ مارے تانکا جھانکا، اس جرم کی پاداش میں آئیل کالک، کاربن اور ہم ایک جان ہوئے۔ بگوا سراپا بے حال حلیہ اور موٹر سائیکل لیے ہم گھر میں داخل ہوئے، بیگم سے کہا لو مبارک تمہیں ہم موٹر سائیکل لے آئے یہ سن کر بیگم ساڑی کے پلو سے پردہ کرتے ہوئے پس و پیش سے بولیں، یہ موٹر سائیکل ہے...... خیر جو بھی ہے میں دیکھ رہی ہوں لیکن آپ کون ہیں؟ جب جب ہم موٹر سائیکل پہ سوار واپس گھر لوٹے ہیں بیگم نے ہمیں پہچاننے سے انکار کیا۔

اسی طرح موٹر سائیکل کے دکھ سکھ جھیلتے ہوئے ابھی ٹھیک سے پندرہ دن ہی گذرے ہوں گے..... کہ اس دوران امریکہ کے صدر عزت مآب بش صاحب کو ہماری موٹر سائیکل سے تکلیف ہونی شروع ہوئی۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھا عراق پر چڑھ دوڑے اور بموں کی بارش کر کے ایک عالم کو ہلا کر رکھ دیا۔ پٹرول، ڈیزل آئیل اور کیروسین کی بلیک مارکٹنگ شروع ہوئی۔ ہماری موٹر سائیکل میں آئیل پٹرول اور ہمارا خون یہ تینوں چیزیں جلنے لگی تھیں۔ پٹرول نوشی کے معاملہ میں ہماری موٹر سائیکل بلا نوش واقع ہوئی ہے یعنی ادھر پٹرول بھروایا ادھر ٹنکی خالی۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض بعض مواقع پر یہ کفایت شعار بھی ہونے لگتی ہے یعنی سو سو کلو میٹر کا Average بھی دے جایا کرتی ہے بشرطیکہ ایسے متواتر دھکے فراہم کئے جائیں۔ کیونکہ ہماری موٹر سائیکل گاہے گاہے ہی اسٹارٹ ہو کر چلنے کی پابند ہے اور بند ہو کر ٹرافک میں خلل ڈالنا اسے زیادہ پسند ہے اس لئے رف ڈرائیونگ یا ریسنگ ڈرائیونگ میں ہمارا ریکارڈ

ایک دم صاف ہے۔ البتہ سڑک پر پڑاؤ ڈالے رہنے کے باعث محکمہ ٹرافک کے ذریعہ معتوب ہوتا اس کا اور ہمارا معمول ہو گیا ہے۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ موٹر سائیکل خریدنے کے بعد سے آج تک شہر میں ہمارا کوئی بھی دشمن نہیں ہے سوائے ان اشخاص کے جن کو ہم نے اپنی موٹر سائیکل پر کبھی کبھار لفٹ دی ہے۔ جب کہ موٹر سیکل کے ہاتھوں مسلسل ستائے جانے کے باعث شہر کے زیادہ تر لوگ ہمیں یتیم ویسر کی طرح Treat کرنے لگے ہیں۔

اسکوٹر بم اور کار بم کی وارداتوں میں اضافہ سے قبل، ہم اپنی موٹر سائیکل کو جہاں بھی یہ بند ہوتی وہیں چھوڑ کر آیا کرتے تھے۔ لیکن ان واقعات کے بعد ہماری موٹر سائیکل کا بیچ سڑک پہ استراحت فرمانا اب ذرا مشکل ہو چلا ہے۔ ابھی دو روز قبل ہی کی بات ہے۔ ہم اپنی موٹر سائیکل کو حسب معمول بند حالت میں سڑک پر چھوڑ اطمینان کے ساتھ گھر آئے راوی کہتے ہیں کہ ہمارے آنے کے بعد موٹر سائیکل کو گھنٹوں سڑک پر کھڑی دیکھ کر لوگوں میں اسکوٹر بم کی چہ میگوئیاں شروع ہوئیں پھر بازار بند ہوئے ہنگامہ ہوا فون لگے سائرن بجے، بم اسکواڈ دستہ کیل کانٹے سے لیس ساتھ میں کتا لیے آدھمکا۔ اور پھر لوگوں کے ہجوم کے ساتھ دو پولیس کانسٹبل ہمارے دروازے پر آئے اور چور اچکوں کی طرح کالر پکڑ کر ہمیں تھانے لے گئے۔ تھانہ پہنچتے ہی تھانیدار صاحب، دہاڑے "دیکھو آج کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی تمہاری موٹر سائیکل سڑک پہ بند حالت میں ملی..... تو میں انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت تمہیں اور تمہاری موٹر سائیکل دونوں کو حراست میں رکھ لوں گا سمجھے"

الغرض موٹر سائیکل کے ہاتھوں بے انتہا ستائے جانے اور پولیس محکمے کے ذریعہ ڈرائے جانے کے باعث ان دنوں ہم اپنی قسمت کو روتے ہیں کہ لاکھوں منتوں مرادوں کے بعد موٹر سیکل پانے کی ہماری تمنا پوری ہوتے ہی پٹرول کے دام آسمان پر چڑھے اور موٹر سائیکلوں میں بم رکھے جانے لگے اور نتیجہ میں ہم قلاش ہی نہیں رسوا اور ذلیل بھی ہوئے

ادارہ شگوفہ سے حسب ذیل مزاحیہ کتب حاصل کی جاسکتی ہیں

امریکہ میری عینک سے	یوسف ناظم	سفرنامہ	۵۰ روپے
البتہ	یوسف ناظم	مضامین	۳۰ روپے
واہ حیدرآباد	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
سگ گزیدہ	عابد معز	مضامین	۶۰ روپے
طرفہ تماشہ	مسیح انجم	مضامین	۳۰ روپے
ٹی ایم ساری	مصطفیٰ علی بیگ	کلام	۸۰ روپے
فن کے پردے میں	طالب خوندمیری	"	۳۰ روپے
شانہ بہ شانہ	اقبال شانہ	"	۵۰ روپے
گلہائے	پرویز یداللہ مہدی	"	۶۵ روپے

مرزا کھونچ نیاٹولہ، بتیا، بہار

گرمی میں

کبھی کھٹمل، کبھی مچھر کی ہے یلغار گرمی میں
ہوا ہے کھاٹ پر سونا بہت دشوار گرمی میں
بنا مرغا مسلم جان کا آزار گرمی میں
پچانے سے کیا ہے پیٹ نے انکار گرمی میں
تہیہ کرلیا میں نے وہیں شادی رچاؤں گا
جہاں سے مفت مل جائیگی اے سی کار گرمی میں
گئی مجنوں کو لو، لیلیٰ کو بھی ڈی ہائیڈریشن ہے
محبت ہوگئی ہے کس قدر بیمار گرمی میں
لٹک جاتا ہے منہ پنکھے کا، کولر، ریفریجریٹر کا
انہیں بجلی کی جب بھی پڑ رہی ہو مار گرمی میں
ادھر ہے دھوپ کی شدت ادھر چھاتا ندارد ہے
کہ مرزا کے لئے جینا ہوا دشوار گرمی میں

پانی میں

کبھی ہے دال پانی میں کبھی ہے بھات پانی میں
کسی صورت گزرتے ہیں مرے دن رات پانی میں
دیا گھوڑے نے جب جھٹکا پھسل کر گر پڑا دولہا
کہا تھا کس نے تم لاؤ میاں بارات پانی میں
ادھر برسات آئی اور اُدھر ٹپکے وہ جا بیٹھیں
کہوں کیا بہہ گئے کیسے مرے جذبات پانی میں
کہا گھڑیال نے ہاتھی سے، لاغر ہوگیا تو کیا
بہادر ہو تو آؤ کرلیں دو دو ہاتھ پانی میں
انہیں دمہ، انہیں کھانسی، ہمیں جاڑا بخار آیا
ملی ہے ہر کسی کو چھو نہ کچھ سوغات پانی میں
امیروں کی گزر جاتی ہے مرزا موج و مستی میں
مگر مفلس کے ہوتے ہیں عجب حالات پانی میں

کرقی کریم نگری

اب تو بن گئے لیڈر ہم

اب تو بن گئے لیڈر ہم
جتنا کھائے غم پر غم

اپنے پاس ہے ایٹم بم
دنیا ہم پر ہے برہم

جلنے والے جلتے ہیں
آگے بڑھتے رہیں گے ہم

سنسد سارا اکھاڑا ہے
جوتم پٹی ہے پیہم

لیڈر کے چمچوں سے ہی
سرکاریں درہم برہم

سی یم، پی یم رشوت لیں
پھر بھی عہدہ ہے اتم

بچے پیدا حد سے سوا
پڑجائے گا راشن کم

سیندھی خانے لوپن ہیں
پی لو سیندھی پی لو رم

پی کر کرقی گھر جاؤ
جوتے مارے گی بیگم

سگ لیلیٰ (آٹھویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی

بلدیہ، کھایا، پیا چل دیا

ایم۔ایل۔اے مہاشے کتوں کے بہتر مستقبل کے تانے بانے بنتے ہوئے ذرا زیادہ دور نکل گئے تھے اور اس سے پہلے کہ یہ دوری اتنی بڑھتی کہ ان کی واپسی ناممکن ہوجاتی، مسٹر نوپرابلم کو بروقت ایک ترکیب سوجھ گئی۔ انہوں نے فوراً ایم۔ایل۔اے مہاشے کے جیبی کتے کی جو ٹیبل پر لوٹیں لگارہا تھا دم مروڑدی، اور اس نے جواباً توقع کے مطابق درد سے بلبلا کر ٹیاؤں ٹیاؤں، راگ الاپنا شروع کردیا۔ اور یہی راگ ایم۔ایل۔اے مہاشے کو واپس تصور کی دنیا سے، حقیقت کی دنیا میں لے آیا اور وہ بلبلاتے ہوئے پلے کو پچکارتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولے یہ پلا میری جیب میں بیٹھ کر فی الحال اسمبلی میں جاتا ہے، لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ اور اس کے بھائی بند میرے ساتھ پارلیمنٹ میں پہنچ جائیں گے۔!"

ہم نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی۔ "آپ مستقبل کی بات کرتے ہیں میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ کے پالتو چہیتوں کے کچھ بھائی بند پہلے ہی وہاں پہنچ چکے ہیں۔"

جواب میں مہاشے جی سیاسی پینترے بازی والے لہجے میں بولے۔ "شاید آپ کا خیال ٹھیک ہو بھیڑ کی کھال میں کچھ بھیڑئیے کسی طرح وہاں پہنچ گئے ہوں، لیکن وہ دن ضرور آئے گا جب میرے پالتو کتے انہیں وفاداری کا سبق سکھانے کے لیے میرے ساتھ پارلیمنٹ میں پہنچ جائیں گے اور اس وقت گرگٹ کی طرح رنگ اور دل بدلنے والے ان نیتاؤں کی خیر نہیں جو اپنی اقتدار کی بھوک مٹانے کے لیے مادر وطن تک کا سودا کرنے سے نہیں چوکتے جن کے دلوں میں ذرا سی بھی غیرت کی بو باس ہوگی، وہ یقیناً میرے کتوں سے ملک پر جان دینے کی ادا ضرور اپنائیں گے اسی لیے تو میں نے بہت پہلے کہا ہے۔

مجھ پہ آتا ہے تو آجائے الزام طرفداری کا
سیکھیئے جاکے سبق کتے سے وفاداری کا ۔۔۔!!"

ایم۔ایل۔اے مہاشے کی زبانی بے موقع بے محل اشعار سن کر ہمارا حیرت میں پڑجانا لازمی تھا چنانچہ ہماری حیرت کو رفع کرنے کی غرض سے مہاشے جی نے آگے انکشاف فرمایا ۔۔۔ "آپ حیرت زدہ نہ ہوں میں عام

نیتاؤں کی طرح انگوٹھا چھاپ اور خالص سیاست داں نہیں ہوں لیڈری کے علاوہ شاعری بھی میری کمزوری ہے لیڈری پیٹ پالنے کے لیے کرتا ہوں، اور شاعری اپنے شوق کے لیے ، البتہ میری شاعری دوسرے شاعروں کی شاعری سے ذرا الگ ہے ایک شاعر عموماً قدرتی نظاروں، چاند ستاروں، چلتے پھرتے حسن کے شراروں سے متاثر ہوکر شعر کہتا ہے جبکہ مجھے کتوں کے عشق نے شاعر بنادیا، اور یہ دین بھی خدا بخشے استاد عالی مقام غافل گھڑیالی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔!"

ہم نے غافل گھڑیالی کا نام سنتے ہی دخل در معقولات کرتے ہوئے عرض کیا۔ "کہیں یہ آپ کے استاد غافل گھڑیالی وہی تو نہیں جو یہ فرماگئے ہیں

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی

گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی ۔۔۔! "

بولے ۔۔۔ "نہیں نہیں یہ وہ غافل گھڑیالی نہیں اس شعر سے میرے استاد کا تعلق بس صرف اتنا ہے کہ اس میں سے انہوں نے غافل اور گھڑیالی کو اپنے تخلص کے طور پر اپنالیا ، خدا بخشے بڑی خوبیوں کے مالک تھے استاد ، ردیف قافیہ وزن بحر ایطا، گربہ ، شتر گربہ جیسی شعری باریکیوں اور فنی اسرار و رموز کیساتھ کتوں سے عشق کا جذبہ بھی اپنے شاگردوں میں پیدا کردیا کرتے تھے۔!"

ہم نے ایکبار پھر مداخلت بے جاکرتے ہوئے سوال داغا ۔۔۔ "شاعری کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ کتوں سے استاد محترم کی عشق و محبت کی کوئی خاص وجہ ۔۔۔؟"

بولے ۔۔۔ "شاعری کے علاوہ استاد محترم، شہر کے صدر کانجی ہاوز ، کی چوکیداری بھی کیاکرتے تھے۔ وہ تو کانجی ہاوز کی عمارت کی عمر نے وفا نہ کی ، پچیس برس پہلے کی طوفانی بارشوں میں ڈہ گئی جس کے نتیجے میں کانجی ہاوز میں اس وقت قید آوارہ جانوروں کیساتھ استاد محترم بھی بہ گئے اور یوں اپنے چہیتے کتوں کیساتھ دار فانی سے کوچ کرگئے ۔۔۔ لیکن کتوں کے لیے پیار کا جذبہ اپنی شاعری کیساتھ اپنے شاگردوں میں چھوڑگئے ، اور یہی جذبہ میں تم میں بھی دیکھ رہا ہوں نوجوان کتوں سے تمہارا عشق بھی میر طرح بےلوث و بے انتہا ہے۔" اتنا کہہ کر ایم۔ایل۔اے مہاشے نے اپنا لیٹر ہیڈ نکالا اور اس پر ہمارے اخلاق و کردار کی شان میں لمبا چوڑا قصیدہ لکھا پھر اسے اپنے دستخط و مہر سے معتبر و مستند بنا کر ہمارے حوالے کیا، ہم نے جواباً سراپا تشکر " بننے کی جو کوشش کی تو اردو کے ہندسے " " میں تبدیل ہوگئے یہ پوزیشن چونکہ خاصی تکلیف دہ تھی لہذا فوراً سیدھے ہوگئے اور واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایم۔ایل۔اے مہاشے نے ایک عدد کارڈ جو غالباً کوئی خصوصی دعوت نامہ تھا ہمارے حوالے کرتے ہوئے فرمایا ۔۔۔ "کتوں سے آپ کے والہانہ عشق کو دیکھتے ہوئے یہ دعوت نامہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مجھے بڑا فخر محسوس ہورہا ہے ، آئندہ اتوار کو فتح میدان اسٹیڈیم میں کتوں کی کل ہند نمائش کا انعقاد عمل میں آرہا ہے ، جس کا افتتاح مرکزی وزیر انیمل ہزبینڈری کے ہاتھوں ہورہا ہے ضرور تشریف لائیے اور اپنی آتش شوق بلکہ آتش سگ " کو مزید بھڑکائیے گا ۔۔۔!!"

اس دعوت کے جواب میں جب تک ہم سے حتمی وعدہ نہیں لے لیا ، انہوں نے ہمیں رخصتی کی اجازت نہیں دی ۔۔۔!!!

کنڈکٹ سرٹی فکیٹ کیا ہاتھ آیا یوں لگا جیسے دنیا کی دولت ہاتھ آگئی بس اسے بلدیہ کے وراؤ آفس میں داخل کرنے کی دیر تھی دور بین ہمارے ہاتھ میں، انہی خوش فہمیوں میں سرشار جھومتے جھامتے بلدیہ کے دفتر ہذا کے باب الداخلہ سے ہوکر دفتر کی مرکزی عمارت کی سیڑھیوں تک پہنچے ہی تھے کہ وہی منحوس صورت بڑے میاں ہم سے ٹکرائے جنہوں نے پچھلی مرتبہ چائے پانی کے نام پر ہم سے کھلم کھلا رشوت طلب کی تھی ہمیں دیکھتے ہی بڑے میاں کی باچھیں کھل گئیں رال ٹپکاتے لہجے میں بولے ــــ "خوش آمدید ـ خوش آمدید سرکار ـ چھت پہ چلتے کیا ـ ؟"

ہم نے ہاتھ جوڑکر عرض کیا ـ "جی نہیں ـ میرا نہ پہلے خودکشی کا ارادہ تھا نہ اب ہے ـ میں فی الحال اپنی امانت، جو یہاں ضمانت کے طور پر جمع کروا کے گیا تھا، وہ لینے آیا ہوں ـ "

بڑے میاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا " امانت ـ جو ضمانت ہے ــــ اچھا ـ اچھا اچھا آپ اپنی دربن کی بات کررہیں سرکار بالکل لے جائیے اپنی امانت مگر پہلے ذرا چائے پانی ــــ " بڑے میاں جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنی ہتیلی کھجلانے لگے ہم نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا ــــ "آپ خاطر جمع رکھیے بڑے میاں کردوں گا چائے پانی ضرور کرواؤں گا لیکن پہلے ذرا حق بہ حقدار رسید میری امانت مجھے مل جانے دو ــــ "

بڑے میاں بولے ــــ " بالکل ملے گی ـ آپ آئیے میرے ساتھ دیکھتوں کون آپ کی امانت میں خیانت کرتا ہے ـ آپ آؤ میرے پیچھے پیچھے ــــ ! "

ہم بڑے میاں کے پیچھے پیچھے چل پڑے وہ ہمیں سیدھے دفتر کے اسٹور روم، میں لے گئے جہاں کے انچارج اسوقت کرسی پر بیٹھے قیلولہ، فرمارہے تھے حالانکہ اس وقت صبح کے صرف گیارہ ہی بجے تھے لیکن اس میں انچارج حماشے کا کوئی قصور نہیں تھا، اسٹور روم کا ماحول ہی خمار آلود تھا، ایک تو تہ خانے کے ایک حصے میں چار دیواریں کھڑی کر کے اسٹور روم بنادیا گیا تھا اس پر ملگجا اندھیرا چوبیس گھنٹے چھایا ہوا، ہر طرف سیلن گیلاپن بلکہ دو ایک جگہ تو چھت سے باقاعدہ پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور ان ٹپکوں کے عین نیچے فائیلوں کے انبار رکھے تھے، غالباً جن فائیلوں کو دریا برد کرنا ہوتا انہیں اسٹور روم میں منتقل کرکے ان ٹپکوں کے نیچے رکھ دیا جاتا تھا ـ ایسے یخ بستہ ماحول میں آدمی قیلولہ نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا ـ ہم نے بڑے میاں سے سرگوشیانہ لہجے میں کہا ـ "کہیں ان کے قیلولے میں خلل ڈالنے سے یہ کاٹ کھاتے تو نہیں ـ ؟"

بڑے میاں بولے ـ "آپ کاٹ کھانے کی بول رئیں سرکار انوں دوانے کتے کے ویسا سامنے والے کو بھنبھوڑ ڈالتیں، کتے کی لوگاں ان کے ہاتھوں کتے کی موت مرنے سے بال بال بچیں مگر چودہ انجکشنوں سے تیں بچ سکے دیکھو ــــ "

اس خطرناک انکشاف پر ہم نے مرے مرے لہجے میں کہا ــــ "تو پھر ٹھیک ہے ان کے اپنے آپ بیدار ہونے کا انتظار کرتے ہیں ہم تب تک ـ ! "

بڑے میاں مسکراکر بولے ــــ "انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نئیں سرکار، ان کو اٹھانے کی ایک کارگر ترکیب ہے میرے پاس ذرا آپ بازو کھڑے ہوکے تماشا دیکھو ــــ " اتنا کہکر بڑے میاں نے اپنے کان کے پیچھے ڈپازٹ کی ہوئی ایک عدد بیڑی نکالی پھر اسے جلاکر دو لمبے کش لیے اور ان کشوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا

سارا دھواں اسٹور روم کے انچارج کے منہ پر چھوڑ دیا۔ دھوئیں نے اپنا کمال دکھایا اسٹور روم انچارج کی ناک کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے پھر پیٹ سے ان کی آنکھیں کھل گئیں اور اپنے سامنے ہمیں اور دفتر ہذا کے چپراسی کو دیکھ کر ان کا منہ بھی کھل گیا لیکن الفاظ باہر نہیں نکل سکے کیونکہ بڑے میاں نے بڑی پھرتی سے جلتی ہوئی بیڑی ان کے ہونٹوں میں پکڑادی۔ وہ بیڑی کے کش لگانے لگے اور اس سے فائدہ اٹھاکر بڑے میاں نے ہمیں آگے کرتے ہوئے کہا " انچارج صاحب دس روز اول چھوٹے صاحب ان کی دربن ضبط کرلیے تھے دیکھو، اور آپ کو تاکید کرے تھے دربن کا مالک اخلاقی صداقت نامہ لے کو آئے تو واپس کردینا ہوگئے انوں دربن کے مالک ہیں، سرٹی فی کیٹ لائیں ان کی دربین واپس کردیو۔۔۔!"

انچارج بیڑی کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولے ۔۔ " کاں سے واپس کروں غفور میاں، تم کو یاد نئیں، چھوٹے صاحب خود ان کی دوربین لے کو بمبئی کو گئیں دورے پہ ۔۔ "

بڑے میاں فوراً زبان باہر نکالتے ہوئے بولے ۔۔ " ارے ہو میں تو بھول گیا تھا یہ بات، ۔۔ "

ہم نے حیرت سے پوچھا ۔۔ " میری دوربین لے گئے دورے کے اوپر ۔! مگر کیوں ۔؟ "

انچارج صاحب بولے ۔۔ " وہ کیا ہے دورے کا تو فقط بہانہ ہے اصل میں چھوٹے صاحب بمبئی گھومنے کو گئے ہیں وہاں، جو ہو، چوپاٹی کے اوپر لوگاں بولتیں، جل پریاں کم سے کم لباس میں دھوپ کھانے کو آتیں، ایسے وقت میں دوربین ساتھ رہی تو یہ چکنے چکنے جلوے، دوربین کے ذریعہ آنکھوں سے آکے چپک جاتیں ۔۔ لیکن آپ فکر نکو کرو چھوٹے صاحب آج واپس آرئیں، کل سے ان کو ڈیوٹی پہ چڑھنا ہے آپ کل آکے اپنی دوربین لے کے جاؤ ۔۔! " اس اطلاع پر ہم جی مسوسے وہاں سے لوٹ آئے اور جب دوسرے دن پھر واپس پہنچے تو معلوم ہوا کہ چھوٹے صاحب بمعہ دوربین کے واپس آچکے ہیں اور فی الحال چھوٹے صاحب تو ڈیوٹی پر موجود ہیں البتہ ہماری دوربین اس مرتبہ بڑے صاحب اپنے ہمراہ ریس کورس لے گئے ہیں تاکہ اپنے پسندیدہ گھوڑے کے دوڑنے کا نظارہ نزدیک سے کرسکیں اگلے دن ہماری دوربین ہمیں شرطیہ مل جائے گی ۔!

کنڈکٹ سرٹی فی کیٹ کے حصول کے باوجود ہماری دوربین ہماری دسترس سے اتنی ہی دور تھی جتنی کہ کنڈکٹ سرٹی فی کیٹ حاصل کرنے سے پہلے تھی ،اس سے کم از کم بلدیہ کے اربابِ مجاز کے تعلق سے برسوں سے مشہور یہ عوامی کہاوت سچ ثابت ہوئی بلدیہ کھایا پیا چل دیا ۔۔!!!

(جاری)

سید طالب حسین زیدی
حیدرآباد

جانا ہمارا پاکستان، معیشت و مساعدت میں جگندر کی (چھٹی قسط)

لاہور شہر اقبال

سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

"شاہین ایر" کا طیارہ لاہور کی پرواز کے لئے تیار تھا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ جب طیارے میں داخل ہوئے تو دہلیز پر شاہین ایر کی جانب سے ایک لالہ رخ "میزبانہ" ولآویز مگر سنتھیٹک (Synthetic) مسکراہٹ سے ہر مسافر کا استقبال کر رہی تھی ہم کو بھی اس نے اپنے مونڈھوں کو چھ انچ جھکا کر مسکراتے ہوئے "سلاملیکم" کہا، جواب میں ہم نے اپنے کندھوں کو چھ انچ اچکایا اور بغیر مسکرائے "والملیکم" کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

کھڑکی سے لگی ہوئی اپنی نشست پر بیٹھ کر جہاز کا جائزہ لیا۔ مسافر آتے جارہے تھے اور ایر ہوسٹس انہیں سیٹوں تک پہنچا رہی تھیں ہماری سیٹ کے برابر والی سیٹ ابھی خالی تھی، بائیں جانب اسی لائن میں دوسری طرف کھڑکی والی سیٹ پر ایک مہ وش زہرہ جبیں بیٹھی باہر جھانک رہی تھی ہم بھی کھڑکی سے رن وے اور عمارت کا جائزہ لینے میں محو تھے کہ یکایک ایک زور کا جھٹکا لگا اور ہماری سیٹ لرز گئی، ہڑبڑا کر مڑ کے دیکھا تو برابر والی سیٹ میں ایک ضرورت سے بہت زیادہ تنومند فربہ اندام خاتون پھنسی پھنسائی ہانپتے ہوئے اپنے آپ کو اڈجسٹ کرنے کے لئے زور لگا رہی تھیں، اسی حالت میں ہم سے پوچھا! لاہور جانا مانگتا؟۔ ہم نے جواب دیا جی ہاں، وہیں کا ارادہ ہے۔ بولیں، ہم کو بھی "ادھر چ" جانا منگتا، ہمارا میاں "سیٹھ کاسم بھائی تمبا کو والا" ادھر سے پنجاب کا تمبا کو کھریدنے (خریدنے) جانے لا ہے۔ ہم کو سٹھانی جی کے تن و توش سے ویسے ہی سہمے ہوئے تھے اب اس کاسم بھائی، تمبا کو اور جانے لا ہے، آنے لا ہے والی "گجراتی اردو" سے اور بدک گئے ان سے بچنے کی خاطر انجان بن کر پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ کہنی سے دھکا دے کر بولیں! وہ دیکھو ادھر بیٹھے لا ہے کاسم بھائی میرا گھر والا۔ ہم نے دیکھا دوسری طرف زہرہ جبین کے برابر والی نشست پر ایک مریل، ہڈیوں پہ چمڑا منڈھا ہوا "چھوارے" کی قسم کا آدمی اپنی ہم سفر سے جو کھڑکی کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی کچھ بول رہا تھا اور لگ رہا تھا کہ وہ اس کی باتوں کو سنی ان سنی کر رہی ہے۔

سٹھانی نے سر گھما کر سیٹھ سے پوچھا، اے کاسم بھائی! تم برودر بیٹھے لا ہے نا؟۔ سیٹھ نے جواب دیا بہت اچھا بیٹھے لا ہے اور تو؟ سٹھانی نے کنکھیوں سے ہماری جانب دیکھ کر فرمایا۔ "میں بھی اچھا بیٹھے لا ہے"۔ ہم سوچنے لگے ایسے ہم

سفروں کے ساتھ سفر کا سارا لطف ہوا ہو جائے گا۔ حالانکہ مجھ دار ہوائی کمپنی نے اپنے صاحب ذوق مسافروں کی تسکین کے لئے ذوق نظر کا اچھا بندوبست کر رکھا تھا اور کسی کو کوئی شکایت ہی نہ تھی سوائے ہمارے...... ہم اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے کہ جگندر کے بچے نے جلتی پر اور تیل ڈالا۔ بولا بھیا صبر سے کام لو۔

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

جہاز رن وے پر دوڑنے لگا ہم ماحول کا جائزہ لینے لگے انے ڈیکھا سن عذ تھی اسے دیکھنا سیم تن لگی سعجب کہ محض "بہ سلامت روی" کی تصنیف کی غرض سے لندن اور یوروپ جاتے ہوئے اسی روٹ پر (لاہور سے کراچی) فضاء میں مخدومی کرنل محمد خان صاحب کو "ڈائنوں" سے سابقہ پڑا تھا مگر ہم "مقدر کے سکندر" نکلے...... گل بدامنوں شعلہ رخوں کا طائفہ (Crew) تمرک تمرک کر ناشتے اور چائے کی کشتیاں مہمانوں کے آگے رکھ رہا تھا ہماری پڑوسن نے کشتی پر نظر ڈال کر اپنے میاں سے کہا، اے کاسم بھائی! بھوت اچھا ہے۔ بچاتے کا نئیں۔ پورا کھانے کا، آں.... کاسم بھائی، منمنایا، بچا ہوا سب میری کشتی میں ڈال دوں گا، کیا۔ سٹھانی خوش ہو گئیں اور کھلکھلاتے ہوئے پھس پھس ہنسنے لگیں (منہ میں سموچہ سموسہ تھا) جہاز جب زمین چھوڑ کر فضاء میں بلند ہوا تو ایک پری چہرہ ایئر ہوسٹس جو "غمزہ و عشوۂ و ادا کیا ہے" کا مرقع تھی حادثہ کے پیش آجانے کی صورت میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ترکیب اشاروں میں سمجھانے لگی۔ سبق پورا ہوا اور مسافروں کی طرف مسکرا کر اس نے دیکھا۔ ہمیں دیکھ کر بھی مسکرائی، ہم بھی مسکرائے اس کے چہرے پر اوس پڑ گئی اور پلٹ گئی۔

تقریباً سوا گھنٹے کی پرواز کے بعد لاہور پہنچ گئے۔ برادران قسیم زیدی، جاوید اور منصور زیدی (مبین زیدی کے برادران خرد) اور ہمارا بھتیجہ شاہد ہمیں لینے کے لئے ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ ان کے ساتھ گھر پہنچے سارے عزیز و اقارب جمع تھے۔ دیر تک خیریت خیر سلا اور باتیں ہوئیں۔ رات رہ گئے بستر پر دراز ہونے کا موقع ملا۔

دوسرے دن قسیم زیدی آگئے کہ چلئے۔ آپ کو لاہور کی سیر کرائیں، ہم تیار ہی بیٹھے تھے درگاہ حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویریؒ کی زیارت، بادشاہی مسجد اور مزار اقبال پر حاضری کا پروگرام تھا۔ دس بارہ سال پہلے سڑکوں پر گھیر دار شلواریں اور بھاگ دار قمیصیں سروں پر صافے اور طرے کثرت سے نظر آتے تھے مگر اب وہ خال خال یعنی آٹے میں نمک کے برابر ہو گئے ہیں۔ شرٹ اور پتلونوں، جینز اور ٹی شرٹوں کی عمل داری ہے۔ بڑے دنوں بعد تانگے کی سواری کا لطف اٹھایا حیدرآباد میں تو اب یہ شے نایاب ہو گئی ہے اور ہر طرف آٹو رکشاؤں کا راج ہے وہ ہیں تو یہاں بھی مگر بڑے بے ڈھب اور مذکر کا منہ کے بنے ہوئے۔ مولانا مودودی مرحوم نے ان پر ایک اچھا ریمارک پاس کیا تھا "بناتے تو ہیں یہ دو بندوں کو، پر شور اس قدر مچاتے ہیں جیسے سارے آسمان کو اٹھا لیا ہو"..... داتا گنج بخش پہنچے فاتحہ گزارنی اور اس چوکی کی زیارت بھی کی جس پر بیٹھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے چلہ کشی کی تھی۔ ارادت مند کثرت سے آتے ہیں اور پلاؤ کی دیگیں خرید خرید کر ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ چاروں طرف بازار میں تیار پلاؤ کی دکانیں لگی ہوئی ہیں۔ یہاں سے بادشاہی مسجد گئے۔ اس تاریخی مسجد کو اورنگ زیب نے بنوایا تھا جو بڑی حد تک جامع مسجد دہلی کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔ سکھا شاہی کے دور میں اسے اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا تھا گھوڑے بندھا کرتے تھے ایک مینار اور عمارت کے کچھ حصے کو تخریب کاری سے نقصان بھی پہنچا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے جب سر سکندر حیات پنجاب کے

وزیر اعلیٰ تھے، اس کی تعمیر کا کام ہوا۔ حیدر آباد مرحوم جو دنیا کے ہر خطے میں ایسے موقعوں پر اپنا دست تعاون ضرور دراز کرتا تھا۔ آصفجاہ سابع میر عثمان علی خان کے حکم سے نواب زین یار جنگ انجنیر کو مرمت کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا گیا تھا وہ آئے اور بجٹ بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کیا ایک خطیر رقم یہاں سے بھجوائی گئی۔ آثار شریف والے دروازے میں ایک تختی پر ساری تفصیل درج ہے یہاں سے سیڑھیاں اتر کر مزار اقبال کی زیارت اور فاتحہ خوانی کے لئے پہنچے۔ دل قابو سے باہر ہوا جارہا تھا ہاتھ پیروں میں رعشہ سا طاری تھا ہم نے جگندر کی طرف دیکھا، آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا نظر آیا۔ تھوڑی ٹھک کر سینے پر جھول رہی تھی اور زبان زمزمہ سنج تھی۔

بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد، قلندری داند!

بے کل تھا شتابی سے سڑھیاں اتر کر مقبرے میں پہنچا، مزار کے پائینتی آنکھیں بند کر کے ہاتھ باندھے ادب سے کھڑا ہو گیا۔

مقبرہ بہت بڑا تو نہیں ہے مگر صاحب مزار کے دبدبے سے "سرداروں" کے سر بھی آپ ہی آپ جھک جاتے ہیں ایک طرح کی عظمت و سطوت نظر آتی ہے۔ سننے میں آیا کہ جنرل ضیاء الحق مرحوم اس کی توسیع میں دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ جگندر نے ہم سے کہا، اگر کسی چوکھٹ پر سر جھکانے کی آرزو دل میں ہو تو یہاں جھکاؤ وہ چوکھٹ یہی ہے۔

بر زمین کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

(جس مقام پر تیرے نقش پا ثبت ہوں گے، اہل نظر کے لئے وہ مقام مدتوں سجدہ گاہ ہو جائے گا)

دل نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں سے رخصت ہوئے اور قلعہ کی سیر کے واسطے چلے جو بادشاہی مسجد کے بالمقابل واقع ہے دروازے میں سے گزرتے ہوئے لال قلعہ کی یاد آگئی، مغل دور کی ساری تعمیرات بڑی حد تک ایک دوسرے سے مشابہ ہیں یہاں سے فارغ ہوئے سکھوں کا بڑا گردوارہ بھی وہیں ہے اسے باہر ہی سے دیکھا ہندوستان اور دنیا کے دوسرے حصوں سے سکھ زائرین بھی بڑی تعداد میں نظر آئے جو یہاں اپنا "متھا" ٹیکنے آئے تھے۔ لاہور، دہلی اور حیدر آباد میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ عمارتوں کے نقشے، بازار اور گلیاں ایک سی ہیں۔ انار کلی کو دیکھئے تو یوں لگتا ہے جیسے ہم حیدر آباد کے لاڈ بازار اور چار کمان میں نکل آئے ہوں۔ اردو بازار بھی یہیں واقع ہے۔ بازار انار کلی میں گھومتے ہوئے ایک دن ایک نئی بات علم میں آئی برخوردار تحسیم نے کہا چلئے آپ کو قطب الدین ایبک کا مقبرہ دکھائیں ہم نے حیرت سے پوچھا۔ وہ یہاں کہاں۔؟ اسے تو مہرولی (دہلی) میں ہونا چاہیے انہوں نے بتایا وہ چوگان کھیلتے ہوئے یہیں فوت ہو گیا تھا۔ مگر صدیوں تک اس کے مزار کا پتہ نہ چلا۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں جب معلوم کہ وہ انار کلی میں ایک مکان کی سیڑھیوں کے نیچے سینکڑوں برس سے دبا ہوا ہے جو کبھی ایک جوہری کا ہوا کرتا تھا جنرل صاحب ہی کے حکم سے مکان

حاصل کر کے اسے توڑا گیا تب یہ برآمد ہوا اور مقبرہ تعمیر کیا گیا گیٹ پر نام اور سن وفات کی تختی بھی ہے۔ عبرت کا مقام ہے کہ خاندان غلامان کے اس پہلے بادشاہ کی قبر جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے مسلم حکومت قائم کی تھی۔ سینکڑوں برس تک سیڑھیوں کے نیچے دبی رہی اور کسی نے خبر نہ لی۔ اس کا بنایا ہوا مینار اور مسجد قوۃ الاسلام کے آثار تو بار ہا کے دیکھے ہوئے ہیں مگر اب خود اس کی قبر کو دیکھا تو عبرت حاصل ہوئی۔ یہاں سے شاہ عالمی دروازہ گئے یہ بھی لاہور کا بہت بڑا اور بارونق بازار ہے نسیم نے لکھنؤ کے کبابیے کی ایک دکان میں خستہ کباب کھلائے اور پھر ایک کیفے میں یہاں چائے بھی پلوائی۔ اس بازار میں سونے چاندی کے زیورات کی دکانوں کے علاوہ دوسری اشیا، کپڑے، جوتے، فرنیچر کی بھی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ یہاں کے کسارہٹہ (حیدرآباد کے اس بازار کا نام جہاں تانبے پیتل کے برتن ملتے ہیں جو چوک مرغاں میں مسجد کے قریب واقع ہے) سے ایک ایسا حقہ خریدا جو حضر کے علاوہ سفر میں بھی آسانی سے پیا جاسکتا ہے چاہے موٹر کی سواری ہو یا تانگے کی۔ شاہ عالمی کی سیر کے بعد شام میں شالیمار باغ بھی دیکھنے گئے یہ باغ بھی جہانگیری کے دور کا ہے۔

دہلی میں جمنا پار کا علاقہ شاہدرہ کہلاتا ہے۔ لاہور میں بھی "راوی" پار شاہدرہ واقع ہے۔ جہاں ایک بڑے باغ کے بیچوں بیچ شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کا خوب صورت مقبرہ ہے جسے ملکہ نورجہاں نے بنوایا تھا قبر کا تعویذ انتہائی قیمتی پتھر کا ہے جس پر اسماء الحسنیٰ لکھے ہوئے ہیں خود نورجہاں کا مقبرہ کچھ فاصلے پر ہے۔ سنتے ہیں پہلے یہ سنسان اور غیر آباد تھا مگر اب اچھی خاصی رونق ہے۔ چمن بندی بھی کر دی گئی ہے اور حسرت ناکی کی کوئی کیفیت باقی نہیں رہی۔ راتوں میں خوب "چراغاں" ہوتا ہے جس کے باعث پروانوں کے پر جلتے ہیں اور بلبل کی نغمہ سنجیاں بھی سنائی دے رہی ہیں۔

سڑکوں پر دوڑتی ہوئی یہاں کی بسوں کو دیکھا اور ان پر لکھے ہوئے مقولوں کو پڑھا تو حیدرآباد کے آٹو رکشہ یاد آگئے۔ یہ بسیں کیا ہیں بقول والدہ محترمہ کے "جڑاوی لچھے" ہیں بے شمار نقش و نگار سے مزین، سیروں المونیم اور نکل ان کی بوڈی پر تھوپا ہوا اور بیسیوں سیاہ جھنڈیاں ان پر بندھی ہراتی ہوئی نظر آئیں (کراچی کی بسوں کا حال بھی ایسا ہی ہے) مقولے جو ان پر لکھے ہوئے ہیں ان کا حیدرآبادی رکشاؤں کے زرین مقولوں سے کوئی مقابلہ نہیں مگر قابل ذکر ضرور ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے:

آؤ صنم اسکول چلیں

واہ لیلی واہ

خیر نال جا   خیر نال آ

خیر نال جا اور خیر نال آ یعنی خیریت سے جاؤ پھر خیریت سے آؤ یہ لاہور کی ہر بس پر لکھا ہوا نظر آنے گا۔ مگر حیدرآبادی رکشاؤں کی بات "مولوی مدن" کی سی ہے!

"کیا بولتی گے تو۔ آتی کیا کھنڈالا؟ کیا بولوں رے میں، پہلے کھنڈالا"! تو چل میں آیا۔ ہٹ کے ذرا بچ کے آیا دیکھ طوفان میل   بعض صاحب ذوق رکشہ والوں نے شاعری بھی کی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

خدا کسی کو کسی پر فدا نہ کرے

اگر خدا کرے تو قیامت تک جدا نہ کرے

میر کے رنگ کا یہ شعر کئی دنوں تک ہمارے ذہن میں تازہ رہا۔ رکشہ والے کے ذوق سلیم کی داد دیتے رہے۔

رستے بھر یہ رو رو پوچھا مجھ سے پاؤں کے چھالوں نے
بستی کتنی دور بسائی دل میں بسنے والوں نے !!

ایک شعر ایسا بھی پڑھنے میں آیا جس کے ذریعہ مسلمانوں کی حمیت کو ذرا "کھجایا" گیا تھا!

بیسویں صدی کا یہ نیا انقلاب ہے !!
بدن پر برقع ہے چہرہ بے نقاب ہے

طغرے اور تلواریں بھی ان پر خوب نظر آتے ہیں۔
کھجور کا درخت، نیچے تلوار، کلمہ شہادت اور نیچے تلوار

وما ارسلنک الا رحمتہ العالمین

بھلا غور تو کیجیے یہاں اس خون ٹپکاتی ہوئی تلواروں کا کون سا محل ہے۔ مگر یہ خون آشام تلواریں آپ کو گھروں، دکانوں اور رکشاوں پر کثرت سے نظر آئیں گی۔

مسلمانوں نے ان تلواروں کو اس بے ڈھنگے پن سے اس قدر چمکایا ہے کہ اعدا کو برملا یہ کہنے کا موقع مل گیا!
"دیکھئے یہ مذہب تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ یہ مسلمان بڑے آتنک واد اور اگر واد ہوتے ہیں جس کا ثبوت بات پر ان کی یہ تلواریں ہیں...... ایک رکشہ پر یہ بھی پڑھنے میں آیا!

"ماں کی دعا، باپ کا تھپڑ"

بے شک صاحبزادے! یہ باپ کا تھپڑ ہی تو تھا جس کے باعث تم رکشہ چلا کر آج حلال کی روزی سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر رہے ہو ورنہ! تم بھی "حکایت شیریں" والے اس چور کی طرح کسی قاضی کی عدالت میں اپنی ماں کا ...ن کتر رہے ہوتے "...... بلاشبہ "ہر باپ اپنے بیٹے کے جائز مطالبے کو بہ طیب خاطر پورا کرتا ہے مگر ماں ... اپنی مامتا کے ...وں مجبور ہو کر جائز کے ساتھ ہر ناجائز مطالبہ اور ضد کو بھی پورا کرتی ہے۔ اور فساد یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ بیٹا ...پ کے آگے کھڑا ہو جاتا ہے اس کا معصوم ذہن اسے اپنا دشمن اور ماں کو دوست باور کر لیتا ہے۔

ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

لاہور میں جمعہ کے دن جب محلے کی مسجد سے اذان کی آواز آئی تو ہم اپنے عزیزوں کے ساتھ نماز پڑھنے مسجد گئے ...وازے کے باہر آرمڈ پولیس کی جمعیت کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اپنے بھائیوں سے کہا یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ...ں کے پولیس والے بھی پانچویں ہتیاروں سے لیس نماز پڑھنے آتے ہیں۔ سن کر سب کے سب ہنسنے لگے، بولے، بھائی ...احب! یہ سپاہی نماز پڑھنے نہیں بلکہ نمازیوں کو دہشت گرد بندوق برداروں کی فائرنگ سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر مسجد ...نماز کے اوقات میں اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے تعینات ہوتے ہیں...... ساری خوش فہمی ہوا ہو گئی۔

ایں کن را چہ جواب ست تو ہم می دانی
(اس بوالعجبی کا کیا جواب ہو سکتا ہے اسے آپ بھی خوب جانتے ہیں)

ایک دن میاں محمد نواز شریف نے ان لوگوں کے لئے ایک دربار لگایا جو ملک و قوم کو فائدہ پہنچانے کے لئے

سائنس، انجینیرنگ، صنعت و حرفت اور تجارت کے شعبوں میں کوئی پلان رکھتے ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ایسے ماہرین اگر سرمایہ کی کمی کے باعث اپنی اسکیم کو روبہ عمل نہیں لا رہے ہیں اور انہیں بنکوں کا تعاون حاصل نہیں ہے تو وہ آکر اپنی اسکیم اور شکایات بیان کریں اگر اسکیم واقعی سود مند اور منفعت بخش ہو تو اس کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ایک کروڑ تا پانچ کروڑ روپے بنکوں کے ذریعہ فراہم کئے جائیں گے۔ اس دن یہ دربار چار پانچ گھنٹوں تک چلتا رہا اور وزیر اعظم نے نہایت صبر و سکون اور توجہ سے فرداً فرداً ہر ایک کی بات سنی اور متعلقہ محکموں، بنکوں کو احکام نافذ کرتے رہے۔ یہ ساری کارروائی ٹیلی کاسٹ کی جارہی تھی۔ ایک صاحب نے کہا میں نے اپنے کارخانے کے لئے بنک سے جب قرض طلب کیا تو جواب ملا اس کے لئے جن فارموں کی خانہ پری کی جاتی ہے وہ فارمس نہیں ہیں جب چھپ کر آجائیں تب آکر لے لینا۔ میں دوسری بنک گیا پھر تیسری اور چوتھی اس آنے جانے سے میری جوتیاں گھس گئیں اور کسی نہ کسی عذر سے مجھے ٹالا گیا۔ وزیر اعظم نے ہال پر نظر ڈال کر فرمایا! ان بنکوں کے ارباب اختیار اس وقت یہاں موجود ہوں تو وہ ان کی شکایت کا جواب دیں آیا ان کی شکایت درست ہے یا نہیں؟ بنکوں کے پریسیڈنٹ حاضر تھے ایک اپنی کرسی سے کپکپاتے ہوئے اٹھے اور بولے جس وقت یہ صاحب تشریف لائے تھے اس وقت درخواست کے فارمس طبع نہیں ہوئے تھے اس لئے وہ نہیں دیئے جاسکے وزیر اعظم نے فرمایا اب تو وہ طبع ہو چکے ہوں گے جواب ملا جی ہاں، آپ نے شکایت کنندہ سے کہا اب آپ جائیں اور فارم حاصل کرلیں کامیابی نہ ملنے کی صورت میں مجھ سے ملئے۔ وہ خوش ہوگئے اور شکریہ ادا کیا۔ پریسیڈنٹ صاحب بھی تھر تھراتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ جان چھوٹی لاکھوں پائے.....

ایک خاتون صنعت کار اٹھیں اور بولیں! مسٹر پرائم منسٹر" آئی مین (I mean) جناب وزیر اعظم صاحب! (اس بوکھلاہٹ پر میاں صاحب، اپنی مسکراہٹ نہ روک سکے) آئے دن حکومت کی جانب سے ایسے پروگرام ہوتے رہتے ہیں مگر فائدہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وزیر اعظم نے مسکراتے ہوئے پوچھا، بی بی! کیا آپ بتا سکتی ہیں جیسا پروگرام آج ہو رہا ہے اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا تھا؟ آپ دیکھ رہی ہیں ہر منفعت بخش اسکیم کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی منظوری دی جارہی ہے۔ اور نشستند و گفتند و برخاستند والا معاملہ نہیں ہے۔ آپ فرمائیے کیا چاہتی ہیں"

بی بی گویا ہوئیں میرا فرنیچر سازی کا کارخانہ ہے اور میرے کارخانے میں یوروپ اور امریکہ کے معیار کا فرنیچر بنتا ہے میں اسے اور ترقی دینا چاہتی ہوں تاکہ دوسرے ملکوں میں بھی اسے ایکسپورٹ کیا جاسکے۔ مگر بنک سے مجھے سرمایہ نہیں ملتا۔ اس ہال میں جو فرنیچر ہے، آئی مین، وہ بھی میرے کارخانے ہی کا بنا ہوا ہے۔ آپ خود ملاحظہ فرمائیں۔ میاں صاحب نے اپنی نشست سے اٹھ کر فرنیچر ملاحظہ کیا اور فرمایا، واقعی یہ فرنیچر تو یوروپ کے معیار کا ہے مجھے خوشی ہے کہ ہمارے ملک میں بھی ایسا عمدہ اور نفیس فرنیچر بنایا جاتا ہے۔ میں اسے "وزیر اعظم ہاؤس" کی زینت ضرور بناؤں گا۔

خاتون، وزیر اعظم سے یہ تعریفی کلمات سن کر مارے خوشی کے سرخا گئیں اور اپنے چھجاتے ہوئے سیاہ بالوں کی لٹ کو درست کرتے ہوئے شکریہ ادا کرنے لگیں۔ میں..... آئی مین..... آپ کی شکر گزار ہوں..... چار پانچ گھنٹوں تک مسلسل چل کر دربار برخواست ہوا اور سارے اہل غرض شادکام ہوئے۔

پاکستان میں ہم نے ایک بات نوٹ کی یہاں کی وہ خواتین جن کی عمریں چالیس اور پچاس کا بار ڈر کراس کر رہی ہیں ان کے بال گہرے سیاہ، چمکیلے ہوتے ہیں ہمارے یہاں بھی ہوتے ہیں مگر ان کا فی صد بہت کم ہے۔ اس کی وجہ ان کا

بہت زیادہ موڈرن اور ہمارا ایک ورڈ ہوجایا دریائے ستلج اور راوی کے پانیوں کی کرامت ہو سکتی ہے سو لیے دو نو. جگہوں پر گلی گلی موڈرن حجامنیوں نے "بیوٹی پارلر" کے نام سے اپنی دکانیں بھی کھول رکھی ہیں ۔ سیاہ اور چمکیلے پن میں ہو سکتا ہے کہ ان کا بھی کچھ ہاتھ ہو (ہم اس راز سے واقف نہیں ہیں) ان حجامنیوں کی دکانوں پر خواتین کی بھیڑ لگی ہوتی ہے شادی کے موقعوں پر مہندی لگوائے اور بال بنوائے بغیر نکاح قبول کرنے کے لئے دلہنیں شادی خانے نہیں پہنچ پاتیں ۔ دو چار گھنٹوں کی تاخیر ایک عام بات ہے ۔

ہماری قوم کی خواتین اور لڑکیاں جتنا وقت آئینے کے سامنے گزارتی ہیں اس کا کچھ حصہ اگر کچن میں بھی گزارا کریں تو روز روز کی تو تو میں میں کی جوالا مکھی پھٹنے کی بجائے گھروں کی فضا میں نسیم سحر کی سی بہار آجائے.....

لاہور میں اچھرہ ایک محلہ ہے جہاں ہمارے پرانے دوست فتح اللہ بھٹی صاحب رہتے ہیں ان سے بیس بائیس برس پہلے دہران میں تعارف حاصل ہوا تھا بڑے باغ و بہار قسم کے آدمی ہیں ۔ ایک دن صبح صبح آپ کا فون آیا ۔ فرمایا، معلوم ہوتا ہے تمہارے اخلاق کافی بگڑ گئے ہیں پتہ چلا کہ جناب کو لاہور آئے کئی روز ہوئے مگر اب تک ہماری یاد ہی نہیں آئی آج شام ڈھلے، چراغ جلے چلے آنا اور اپنا "نان نفقہ" حاصل کر لینا ۔ پنجابی زبان میں بڑا رس ہے وہ ہمیں اچھی بھی لگتی ہے کچھ کچھ سمجھ بھی لیتے ہیں خاص طور پر اس زبان کا لہجہ وہ بھی اس وقت جب کوئی "ولایتی سردار" اپنا وینٹی لیٹر (Ventilator) کھول کر بولے یا پھر فتح اللہ بھٹی ایں جناب تو "پنجابی معلی" یعنی سرائیکی کے بھی استاد ہیں ۔ ہم وقت پر پہنچ گئے خوب باتیں ہوئیں ایک دوسرے کے احوال پوچھے گئے محبت کے مارے لپٹ گئے ۔ پنجاب والے جب کسی سے محبت یا دشمنی کرتے ہیں تو ٹوٹ کر کرتے ہیں ۔ دونوں کے آگے کسی کو خاطر میں بھی نہیں لاتے ۔ نان نفقہ ہوا اصرار کر کرکے کھلاتے اور بغیر اصرار کے خود بھی دونوں ہاتھوں سے کھاتے رہے ۔ کھانے کے بعد چار گلاس پانی پیئے بے پئے پڑھا کر لمبی لمبی ڈکاریں لیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر رب کا شکار ادا کرنے لگے ہم نے انہیں پہلے ہی سے آمادہ کر لیا تھا کہ وہ ہمیں اپنی پنجابی خوب سنائیں گے چنانچہ شکر بھی پنجابی ہی میں ادا ہوا لیکن ہمیں وہ مزا نہ آیا جو ایک مرتبہ دلی میں ایک سردار دوست کے گھر دعوت میں آیا تھا ۔ ہم دونوں کے ساتھ دسترخوان پر اس کے گھر کے دیگر افراد بھی تھے جب کھانا ختم ہوا تو سردار کے کاکا (چچا) نے جو شکر ادا کیا اسے سن کر ہم پر چودہ طبق روشن ہوگئے تھے ۔ ان بڑے سردار نے مذکر کاٹھ کی ڈکار لینے کے بعد اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور آسمان کی طرف دیکھ کر اس انداز سے "شکر طراز" ہوئے تھے "بے ربا تیرا شکر، تو بھی حرامی نوں وکھ وکھ نیمتاں کھلانداے (طرح طرح کی نعمتیں کھلاتا ہے) ہے تجھے پاتشا! تو بھی بدماش نوں کیہو جیہاں نیمتاں کھلانداے (کیسی کیسی نعمتیں کھلاتا ہے) سب تیری مہر ۔ سب تیرا کرم......

اس سادہ لوحی اور بے ریائی پر اس کی رحمت کیوں نہ مسکراتی ہوگی ۔؟

(جاری)

آئندہ! چھانگا مانگا، زندہ دلان پنجاب کا ہتیلی میں جنگل اگانا ۔

راولپنڈی ۔ شہر کرنل محمد خان

گاؤں کی سیر ۔

سید اسد اللہ حسینی چکر
(لاس اینجلیز)

چکر

یاں محبت کا کال ہے چکر
زندگی اب محال ہے چکر

ہیں جوانی کے ولولے باقی
عمر گو ساٹھ سال ہے چکر

مفت خوری میں اور کیا مانگیں
گرم روٹی ہے دال ہے چکر

مغربی حسن کو نہ پرکھو تم
یہ بہت چیپ مال ہے چکر

ان کے ڈیڈی ہیں کون مت پوچھو
یہ تو ٹیڑھا سوال ہے چکر

اہل مغرب میں سچے عاشق کی
ایک تو ہی مثال ہے چکر

بوالہوس کہہ سکے تجھے کوئی
ایسی کس کی مجال ہے چکر

ان کے چکر میں آکے بچ نکلا
تو بڑا باکمال ہے چکر

کردے نیلام ملک و ملت کو
یہ سیاست وہ چال ہے چکر

جو پھنسا اس میں مر کے ہی نکلا
عشق ایسا ہی جال ہے چکر

اس کو تم باؤلا سمجھتے ہو
یہ تو مہمل خیال ہے چکر

محبوب مانبھومی

غزل

آپ محبوب، مجھے آپ کا کتا محبوب
آپ کے چمچے کے چمچے کا ہے چمچہ محبوب

حضرت شیخ کو تسبیح و مصلا محبوب
اور برہمن کو ہے زنار وقشقہ محبوب

عشق و الفت کے بھی انداز نرالے دیکھے
حضرت مجنوں کو تھا لیلی کا کتا محبوب

بینک بیلنس پہ بس میرے نظر ہے اس کی
جانتا ہوں مری محبوب کو ہے کیا محبوب

ٹور فارن کا بھلا لگتا ہے ہر موسم میں
لیڈروں کو ہے فقط سیر سپاٹا محبوب

آپ فینانس منسٹر ہیں ہمارے، ان کو
گھاٹا ہر سال بجٹ میں ہے دکھانا محبوب

اتنا ہی شیخ حرم بھر تعارف ہے بہت
سالے کے سالے کے سالے کا ہے سالا محبوب

کرشنا کالرا
انگریزی سے ترجمہ
ڈاکٹر میر گوہر علی خاں (حیدرآباد)

مصیبتیں ہوائی سفر کی

ہوائی سفر ان حضرات کے دلوں میں گدگدی پیدا کرتا ہے جنھوں نے اب تک اڑان نہیں بھری ہے لیکن جن کا یہ اوڑھنا بچھونا ہو وہ تو نئے نئے شہر دیکھنے، اچھی غذائیں اور مشروبات سے لطف اندوز ہونے اور جواں سال، صحت مند اور خوبصورت ایر ہوسٹس کو تکتے رہنا ہی اس کا حاصل سمجھتے ہیں!

مجھے "اکارا" سے "لاگوس" تک کا ایک ہوائی سفر ابھی تک یاد ہے۔ اپنا Confirmed ٹکٹ، کوٹ کے جیب میں رکھے ہاتھ میں بریف کیس ہلاتے ہوئے وقت سے کچھ پہلے ہی میں ہوائی اڈہ جا پہنچا۔ میری چیکنگ بڑی سہولت سے ہوئی اور مجھے لونج میں جانے کا اشارہ دیا گیا۔ وہ لونج کیا تھا ایک ٹین کا شیڈ تھا۔ جہاں مجھ سے قبل کچھ مسافرین جمع ہو چکے تھے وہ سب ہاتھوں میں بیگ تھامے نظریں آسمان پر جمائے، حیران و پریشان تھے۔ گرمی میں یوں تپتے ہوئے ایک دو نہیں پورے چار گھنٹے گزر گئے۔ کس کو توفیق نہیں ہوئی کہ کولڈ ڈرنک تو کجا ٹھنڈے پانی کے ایک گلاس کے لئے پوچھتا۔ آخر کار بادلوں کے دوش پر سوار ہوائی جہاز آتا دکھائی دیا۔ جوں ہی اس نے لینڈنگ کی ہم سب اس کی طرف بھاگے۔ جب تمام مسافرین اس میں سے اتر پڑے تو میرے ساتھی ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے خالی سیٹوں پر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں براجمان ہو گئے۔ ہر ایک کی یہی خواہش تھی ہوائی جہاز کی کھڑکی والی جگہ انھیں ملے ان مسافروں میں کچھ عملہ کے پورٹر بھی جگہ جگہ سیٹوں پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ جو مسافروں سے بیس ڈالر کی رقم لے کر اپنی جگہیں خالی کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری سیٹیں پر ہو گئیں۔ مگر خاصی تعداد میں مسافرین ابھی بھی باہر کھڑے ہوئے تھے اپنے بورڈنگ پاس لیئے ہوئے! پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ تو یہاں کی پرانی رسم ہے کہ ہمیشہ سیٹوں سے زیادہ ٹکٹ فروخت کر دیئے جاتے ہیں۔ اب کسی کو ہوائی جہاز میں سیٹ حاصل کرنا ہو تو اس کو اولمپک رنر ہونا پڑے گا۔ یا پورٹر کی جیب گرم کرنی پڑے گی۔ اپنی جیب سے بیس ڈالر نکال کر۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ میں اور میرے ایک دوست جنوبی افریقہ کے کسی ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہے تھے وہ لنچ کے ساتھ بیر کے کئی جام لنڈھا چکے تھے۔ جس کے نتیجے میں انھیں "چھوٹی طہارت" کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ اپنی سیٹ چھوڑ کر ہوائی جہاز کے پچھلے حصہ تک گئے۔ پھر لوٹے تو اگلے حصہ تک بھی ہو آئے۔ مگر TOILET نام کی کوئی چیز بھی انھیں نظر نہیں آئی۔ ان کی بیچارگی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ پلین کے ایک اسٹیورڈ نے ان کی ضرورت بھانپ لی۔ غصہ میں بھرا ان کے پاس آیا "آپ شاید نہیں جانتے کہ اس ہوائی جہاز میں طہارت خانہ نہیں ہے"۔ جب ہم دونوں نے ان سے خوشامد کی تب کہیں جا کر اس نے جہاز کے پچھلے حصہ میں کچھ بہلا کر ستیوں کو ایک کنارہ میں

تھمادیا۔ اخبار کے کاغذات سے ایک اوٹ بنادیا اور میرے دوست کے ہاتھ میں ایک خالی بوتل بھی تھمادی۔
گرم قیمتی سوٹ پہنے، ہاتھوں میں بریف کیس لیئے، گھنٹوں ٹین شیڈ میں کھڑے رہنا پسینے میں شرابور ہوتے رہنا اور ایسے ہوائی جہاز میں سفر کرنا جہاں باتھ روم نہیں ہوتے تیسری دنیا کے ملکوں ہی کی خصوصیات نہیں بلکہ ایک بڑے ملک کے ہوائی جہاز میں ایک مرتبہ اپنی سیٹ پر براجمان ہو کر اطمینان کا لمبا سانس لے کر جب میں نے STEWARD سے ایک ٹھنڈا مشروب مانگا تو مجھے جواب ملا۔ "ٹھیرو ہوائی جہاز جب اڑان لے گا تب دیکھا جائے گا"۔
اس اکھڑے جواب سے جو خوشی ہوائی سفر میں ہونی چاہیے تھی وہ جاتی رہی۔ جب جہاز ہوا میں اپنا راستہ بنانے لگا تو میں نے ملتجانہ نظروں سے انھیں پھر دیکھا۔ ان کے چہرے پر وہی روکھا پن تھا۔ بڑی لاپرواہی سے مجھے ایک ٹن تھمادیا۔ ہاتھ لگتے ہی یوں لگا کہ اس کے اندر گرما گرم کافی ابل رہی ہے۔ پھر نظریں ان کی جانب اٹھائیں تو الٹا انھوں نے ہی مجھے کھاجانے والی نظروں سے گھورا۔ "یہاں ایسا ہی شربت ملے گا۔ پینا ہے تو پیو نہیں تو ڈبہ پھینک دو۔" ایک جھٹکے سے انھوں نے وہ ڈبہ میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ جنت ارضی امریکہ کی ایک کہانی بھی سن لیجئے۔ اپنا ٹکٹ پکا کرنے جب آپ ہوائی جہاز کے دفتر کو فون کریں گے تو آپ کو جواب ملے گا "برائے مہربانی ذرا انتظار کیجئے تمام لائینس مصروف ہیں"۔ یہی الفاظ بار بار دہرائے جائیں گے۔ اور آپ تنگ آکر اپنا فون کریڈل میں دے ماریں گے۔

اب آخر میں، میں اپنے وطن عزیز کا ایک واقعہ سنا کر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں حیدرآباد بمبئی کے ہوائی راستہ پر آنا جانا میرا معمول سا بن گیا ہے۔ اس سفر میں ایک ایر ہوسٹس PERSIS PATEL سے میری اچھی شناسائی ہے۔ آگے بڑھیں تو آپ اسے ہم دونوں کی دوستی بھی کہہ سکتے ہیں۔ P.P. ایک حسین اور سمجھدار ایر ہوسٹس ہے۔ ایک سفر کے دوران وہ بہت پریشان نظر آئیں۔ چہرہ لٹک گیا تھا اور ان کے خوبصورت ہونٹوں سے مسکراہٹ بالکل غائب تھی۔ میرے قریب بیٹھا ہوا ایک مسافر انھیں کسی نہ کسی بہانے سے اپنے نزدیک بلاتا اور تنگ کرتا۔ اس نے کافی شراب پی رکھی تھی۔ حد یہ ہو گئی کہ ناشائستہ الفاظ P.P. کی شان میں کہنے لگا۔ ایک بار تو ان کے بازو کو چھونے کی کوشش بھی کی۔ بیچاری ان حرکتوں سے بڑی روہانسی ہو گئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ بس اس کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر کوئی راستہ نہیں نکل رہا تھا جب اس بدمست نے گرم چائے کا P.P. سے مطالبہ کیا تو اچانک میں نے اپنے دوست کی آنکھوں میں ایک خاص شرارتی چمک دیکھی۔ P.P. نے مجھ سے کانا پھوسی کی۔ "دیکھو کہ شاہ صاحب میں اس کی کیا حالت بناتی ہوں۔ عمر بھر یاد رکھے گا"۔ جب وہ ٹی۔ پاٹ سے گرما گرم چائے اس کی پیالی میں انڈیل رہی تھی تو قصداً P.P نے چائے دان اس کی گود میں اس کی قیمتی سوٹ پر گرادی۔ اب جو واویلا اس شخص نے مچایا ہے وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ موٹی موٹی گالیاں دے رہا تھا، کود رہا تھا، اچھل رہا تھا۔ یہ معاملہ دیکھ کر جہاز کے کپتان کو اطلاع دی گئی اس بدمست شخص نے کہا کہ وہ ایر ہوسٹس کو عدالت میں گھسیٹے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ P.P. مجسم معذرت بنی اس سے کہہ رہی تھی "میں معافی چاہتی ہوں یہ بالکل ایک اتفاقی حادثہ تھا" پھر اس شخص کے پاس اپنا منہ لے جا کر آہستہ سے کہا "تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسی نامعقول حرکت کے لئے تم ہی نے مجھے مجبور کیا ہے او شرابی، او کبابی چپ رہ"۔ اور پھر اونچی آواز میں ہم لوگوں کو سنانے کہا۔ "ہاں اب بے شک میں آپ کے کپڑوں کی ڈرائی کلینگ کا بل اپنی ذات سے ادا کروں گی"۔

سلطان بھارتی
ہندی سے ترجمہ
ف۔م۔سلیم

اکیسویں صدی

آج کل جہاں دیکھئے اکیسویں صدی کے چرچے ہیں۔آخر کیوں؟ بچے، بوڑھے اور جوان سبھی اکیسویں صدی میں جانے کے لئے بے چین ہیں۔اکیسویں صدی یعنی سب کے سپنوں کی منزل۔جب کہیں اکیسویں صدی کی بات چلتی ہے منہ سے رال ٹپک پڑتی ہے اور دل ناداں بے قابو ہونے لگتا ہے۔

مگر سکے کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیں۔آج کے دور میں جرم، سیاسی بدنظمی، آلودگی، محکمہ پولیس کی بگڑی شکل، مہنگائی اور بے شرمی کا جو عالم ہے، اس کی شکل اکیسویں صدی میں کیسی ہوگی؟ ذرا تصور کریں کہ آج سے پچاس سال بعد ہماری پولیس کیسی ہوگی، سیاست دانوں کا کردار کیسا ہوگا۔سبزیوں کے دام کیا ہوں گے اور انسانی اقدار کی سماج میں کیا حالت ہوگی۔

آئیے اکیسویں صدی کے ایک پولیس تھانے میں چلتے ہیں۔تھانے کا ایک ایس۔ایچ۔او سیلولر پر کمشنر سے بات کر رہا ہے۔"سر! سر میں تھانیدار خان بول رہا ہوں۔ڈکیتی کا منظر پھر دنگا والا کے نام کھلا۔اس کا ریٹ واجب تھا اور آفر شاندار۔فی ڈکیتی پانچ قتل تک کی چھوٹ پر سائن کیا گیا ہے"

"خان ڈکیتی کو مارو گولی میں اگلے مہینے ہونے والے چناؤ سے فکر مند ہوں۔اوپر سے حکم ہے کہ مصرا کو ہی جتانا ہے۔اور بلاتکار کے کیس میں ان کی امیج خراب ہو چکی ہے۔اگر وقت پر شہر میں دنگے نہیں ہوئے تو منتری کی عزت دھول میں مل جائے گی۔"

"دنگے میں وقت کیا ہے سر؟"

"پڑوس کے شہر میں جو دنگا کرا دیا گیا تھا۔اس میں بھیجے گئے گودام کے ہتھیار اور قیدی ابھی نہیں لوٹے۔میں منتری جی کو کیا جواب دوں گا۔چناؤ کو ۱۸ دن رہ گئے ہیں۔اب اتنی جلدی نئے منظر بھی تو نہیں کھولے جاسکتے ہیں"

"آپ بے فکر رہیں سر! دنگے ٹھیک ٹائم پر ہوں گے۔میں فلائٹ سے بہار جا رہا ہوں۔وہاں سے آدمی آجائیں گے تھانے کے ہتھیار اور وردی بانٹ کر کام چلا لونگا۔"

"گڈ! تم نے وردی کی لاج رکھ لی۔میں تمہارے بارے میں منتری جی کو ضرور لکھوں گا۔مقدموں کے بارے میں نئی اسکیم سنی تم نے؟"

"دس دس سال سے پینڈنگ مقدموں کا سنٹرل جیل میں کی ذرا نکالا جائے گا۔کمپیوٹر سے نکالے گئے۔خوش

قسمت قیدیوں پر مقدمہ چلے گا۔ باقی چھوڑ دیئے جائیں گے۔

اکیسویں صدی میں آلودگی کی حالت اور خراب ہوجائے گی۔ پچاس سال بعد ہریالی اور تارے دونوں نایاب ہوجائیں گے۔ ہر بچہ اسکولی بیگ کے ساتھ آکسیجن کا سلینڈر بھی لاد کر نکلا کرے گا۔

اکیسویں صدی کے میوزیم میں کئی نئی چیزیں آجائیں گی۔ مثلاً عزت، خودداری، شرم و حیا، ایمان داری جیسی چیزیں میوزیم میں رکھ دی جائیں گی۔ اکیسویں صدی کی مجوبہ اولادیں اپنے اپنے اباجان سے کچھ اس طرح گفتگو کریں گی

"ڈیڈا یہ ایمان داری کیا ہوتی ہے؟"

بیٹا انسان پہلے بندر تھا۔ جیسے جیسے تہذیب آتی گئی ویسے ویسے شرم و حیا، ایمان داری، خودداری اور اپنے سے بڑوں کو عزت دینا جیسی دقیانوسی رسمیں ختم ہوگئیں۔ آج سے پچاس سال پہلے پورا کپڑا پہننے کی گندی تہذیب تھی۔

۲۱ ویں صدی کے سیاست داں اور مجرم آپس میں "ہم بنے تم بنے ایک دوجے کے لئے" ہوچکے ہوں گے۔ ٹکٹ دینے سے پہلے امیدوار کی زبردست چھان بین ہوگی۔ "بایو ڈیٹا" کو باریکی سے پرکھا جائے گا۔ کچھ اس طرح۔

"تمہاری عمر ۲۲ سال ہے۔ چار سال کہاں لگائے۔؟"

قتل، ڈکیتی، اغوا اور بلاتکار کی ٹریننگ کے لئے سرحد پار چلا گیا تھا۔ یہ رہے میرے سرٹی فیکیٹ۔"

"ہوں مگر دنگا اور گھوٹالا والا کالم خالی ہے؟"

"وہ کمی اقتدار میں آنے کے بعد پوری ہوگی۔"

"میں تمہیں ٹکٹ دے دوں گا بدلے میں تم مجھے کیا دوگے؟"

"اسمگلروں کا ایک انٹرکانٹینینٹ ایکٹ پانچ سال کے لئے لیز پر دے دونگا۔ سالانہ دو ہزار کروڑ روپیہ کا ٹرن اوور ہے۔ سات نسلیں تر ہوجائیں گی۔"

انتہا پسندی، دنگے، بھونچال، بم بلاسٹ اور جنگ کے بڑھتے گرد و تہ رسٹ سے کفن کی قیمت ساٹھ ستر سال بعد کیا ہوگی؟ ہوسکتا ہے اکیسویں صدی میں لوگوں کو کفن کے لئے قطار میں کھڑا ہونا پڑے۔

دکاندار اور گاہک کے درمیان بات چیت شاید کچھ اس طرح ہو۔

گاہک "ایک انڈرویر لینا ہے؟"

دکاندار "بھائی صاحب یہ کفن کی دکان ہے۔ ہم نے سیل لگا رکھی ہے دو کفن ایک ساتھ خریدنے پر ایک انڈرویر فری دے رہے ہیں"

"مگر مجھے کفن کی ابھی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"کل کرے سو آج کر...... ابھی لے لوگے تو فائدہ میں رہوگے اگلے مہینے انتخابات ہیں کفن بلیک میں بھی نہیں ملے گا۔"

"مگر!"

"اگر مگر مت کرو۔ کفن اور انڈرویر ساتھ، ساتھ کہاں ملتے ہیں۔ کل کو کفن کی جگہ انڈرویر سے بھی کام چلانا

پڑ سکتا ہے۔یہ دیکھئے تو سہی۔"

"کفن کچھ چھوٹا لگتا ہے!"

"آج کل چھوٹے کفن کا ہی فیشن ہے۔مردوں میں یہی کفن پاپولر ہے۔زمانے کے ساتھ چلنا سیکھو۔کفن لمبائی جتنی ہو اتنے ہی پیر پھیلاؤ۔"

"پیک کر دیجیے۔"

ہمارے کفن خراب نہیں ہوتے۔بڑے ڈیوریبل ہیں۔

دادا خریدے، پوتا برتے، آپ سڑ جائیں گے۔کفن خراب نہیں ہوگا۔بائی دی وے، آپ کی عمر کتنی ہے۔

"تیس سال۔"

"وقت کے حساب سے تیس سال اور جئیں گے مرنے کے بعد بھی آپ کو کفن سے شکایت نہیں ہوگی۔گڈ لک"

اگر آج ہم بے خبر ہوں تو کل کی ۲۱ ویں صدی ایسی بھی ہو سکتی ہے۔

ہنسراج رتن

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب کی پرورش جس ماحول میں ہوئی وہ ہندوستانی روایات، اخلاقی رواداری اور عقیدے کی پختگی کا مظہر تھا۔ اس کے پس منظر میں تحمل و توہمات اور دیہی زندگی کے معصوم آسیب زدہ اور قدامت پسندانہ عقائد تھے۔ ان کی طویل ادبی زندگی کے پس منظر کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ان کے یہاں سادہ دلی و منکسر المزاجی، مندر و مسجد کے لئے یکساں احترام، انسانیت کے لئے ہمہ گیر محبت اور حفظ مراتب کو بڑا دخل رہا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ رشید صاحب نے اپنی تمام تر ادبی زندگی میں ہندو مسلم، سکھ یا عیسائی کسی کے مذہبی عقیدہ کو طنز و مزاح کا موضوع نہیں بنایا۔ ان کے پیش نظر ان مذاہب کے متوالوں کی وہ کوتاہیاں رہیں جن سے ان مذاہب کی خوبیاں پوشیدہ تھیں۔ اس نکتہ رسی اور عقیدہ محکم نے ان کے طنز و مزاح میں گہرائی و گیرائی پیدا کی۔

انسان کو اگر ایک طرف تہذیب و تمدن سے لگاؤ ہو اور دوسری جانب جن محافظوں سے توقع ہو کہ وہ اس کی حفاظت کریں گے اور وہی اس کی بیخ کنی پر اتر آئیں تو وہ انسان کس قدر کبیدہ خاطر ہوگا۔ رشید صاحب کے اکثر مضامین میں جہاں وہ اس موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں وہاں ماحول کی دورنگی پوری شدت سے ابھر کر سامنے آجاتی ہے بلکہ اسی دورنگی نے ان کے مخصوص طرز نگارش کی بھی پرورش کی ہے۔

دوسری چیز جس نے رشید صاحب کی زندگی کی ساخت میں بہت اہم پارٹ ادا کیا ہے وہ بے پناہ جذبہ توقیر و احترام ہے جو انہیں بچپن ہی سے ملا۔ ان کی استعداد و صلاحیت کی توقیر کی گئی۔ یہ اس زمانے کے بزرگوں کی بلند اخلاقی تھی کہ رشید صاحب جدھر گئے محبوب و مقبول ہوئے۔ طنز و مزاح کے نشتروں کے باوجود انہوں نے کسی کی پگڑی نہیں اچھالی یا یوں کہیے کہ انہوں نے اردو کے طنز و مزاح کی کسی بری روایت کو نہیں اپنایا۔ سودا کی رکاکت، زٹلی کا ابتذال، مصحفی اور انشاء کی چشمکیں اور ذاتی رنجشیں رشید صاحب کے پاس سے ہو کر گزر گئیں لیکن ان میں سے کسی عنصر نے ان کے دامن خیال کو داغدار نہیں بنایا۔ فارسی ادب پر عبور حاصل ہونے کے باوجود انہوں نے فارسی کے طنز و مزاح کے پیش پاافتادہ ورثے کو سرے سے ہی رد کر دیا۔ انہوں نے دوسروں کا ادب کیا اور بدلے میں جہاں بھر کی محبوبیت پائی۔

اس کے ساتھ رشید صاحب کی ایک نفسیاتی افتاد کا ذکر کر جانا بھی ضروری ہے انہوں نے اردو کو ایک زبان کے علاوہ "بہت کچھ اور بھی" سمجھا۔ یعنی ان کے نزدیک یہ ایک قیمتی ورثہ ایک قابل قدر روایت، ایک قابل فخر کارنامہ، تمدن کی نشانی، علم کی علامت، شرافت کا زیور اور اظہار کردار کا اعلیٰ ذریعہ ہے۔ جس شخص کا اپنی زبان کے بارے میں یہ تاثر ہو اس سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں ثقافت کا نچوڑ پیش کرے گا اور اس زبان کے نام لیوا اس کے محبوب ہوں گے۔ ان کی "گنج ہائے گرانمایہ" اور "ذاکر صاحب" جیسی تصانیف ان کے اسی جذبے کی مظہر ہیں۔

مختصر یہ کہ اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی شعر و ادب کے مطالعہ، معقولیت پسندی و رواداری، ہر مذہب و

عقیدے کی توقیر و تعظیم، احترام پانے اور دوسروں کا احترام کرنے کے جذبے نے مل کر رشید صاحب کی شخصیت کی تکمیل کی جس نے اردو ادب کو ایک نئے اسٹائل، ایک نئے انداز اور ایک نئے کردار سے روشناس کرایا جو طنز و مزاح کے پردے میں کسی دقیق حقیقت کا متلاشی رہا۔

رشید احمد صدیقی نے طنز و مزاح کو شعریت اور شرافت کی فضا اور معیار عطا کیا اور موضوع کی اہمیت اور فکر و فن کے جن آداب کو ہم ثقافت کی جان سمجھتے ہیں ان سے ہمیں روشناس کرایا۔ رشید صاحب چونکہ دوست پسند اور حلقہ احباب کے گرویدہ ہیں اس لئے وہ حلقہ احباب کے بغیر نہیں رہ سکے۔ جب وہ علی گڑھ آئے تو ان کو دوستوں کا ایک ایسا گروہ ملا جس میں ذاکر صاحب، اقبال سہیل اور آغا حیدر ایسے لوگ تھے۔ یہی نہیں رشید صاحب کو افراد کی اجتماعی کوششوں پر یقین ہے لیکن وہ اس کے ساتھ ہی اس پر زیادہ یقین رکھتے ہیں کہ صاحب دل، صاحب دماغ اور صاحب علم و عمل افراد منتشر اور متفرق رہنے کی بجائے اپنا ایک حلقہ۔ اثر بنا کر کام کریں۔

رشید احمد صدیقی کے ابتدائی مضامین اس قسم کا حلقہ اثر بنانے کی ایک دلپذیر اور لمانداارانہ کوشش ہے اور اس کوشش نے اردو ادب کو ایک نئی طرز تحریر سے آشنا کرایا۔

رشید صاحب اپنے دکھ میں اپنے دوستوں کو نہیں بھولتے اور اپنے سکھ میں تو ان کو برابر کا شریک رکھتے ہیں۔ شیطان کی آنت دراصل اپنے گردے کی قربانی کا کام ہے لیکن اس میں ڈاکٹر بھاٹیہ اور ڈاکٹر صدیقی بھی زندہ ہوگئے ہیں۔ یہ احسان مندی ہی۔ لیکن ادب میں احسان فراموشی کا ذکر اگر فردوسی سے آیا تو احسان مندی کا رشید صاحب کے ہاتھوں۔

رشید صاحب نے ان پامال اور فرسودہ مضامین کو نہیں چنا جو اکثر و بیشتر مزاح نگاروں کا موضوع بنے رہے ہیں مثلاً نئی تہذیب کے عام مضحک پہلو، بیوی، پردہ یا جسمانی خامیاں اور کوتاہیاں، بلکہ انہوں نے اپنے ماحول کے زندہ کرداروں کی متعدی اور اڑ کر لگ جانے والی خام عادات کو ہندوستان کے مخصوص ماحول میں دیکھا اور علی گڑھ کی پیار بھری تبلیغ و اصلاح کی نظر سے شعر و ادب کے سانچوں میں ڈھال دیا۔

یہ ایک قدرتی بات ہے کہ رشید صاحب کے مضامین میں انسان کو وطن اور اس کے ماحول کی تاریک اور ہولناک فضاؤں کی بے پناہ گہرائیوں سے دوچار ہو کر فلسفیانہ انداز میں سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ وہ پطرس کی طرح آپ کے ساتھ مسکرا کر آپ پر کوئی احسان نہیں کرنا چاہتے۔ وہ آپ کو گدگدا رہے ہیں تو اس لئے نہیں کہ آپ ہنس دیں یا آپ روٹھے ہوئے ہیں تو مان جائیں بلکہ وہ آپ کو ان حقائق کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جن میں سے آپ گذر تو رہے ہیں لیکن یا تو آپ آنکھیں موند کر جا رہے ہیں یا کسی بلند تصور میں ان کی پوری شدت محسوس نہیں کر رہے ہیں یا ان کو پس پشت ڈال کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ رشید احمد تسلیم کرلیتے ہیں کہ آپ نے غلطی نہیں کی ہوگی لیکن شائد سوچا غلط ہے۔

رشید صاحب بہت خلوص سے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اور نفس مضمون کو ہر پہلو سے اجاگر کرتے ہیں بالکل اسی انداز میں جس میں ایچ جی ویلز سائنس کی ایجاد کے ایک مفروضے کے بعد اس ایجاد کے اثر کو ہر طرف سے دیکھتے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض نقاد یہ اعتراض کرتے ہیں کہ رشید صاحب بہت بہک جاتے ہیں لیکن یہی بہکنا ان کا کمال فن ہے وہ سنجیدگی سے بہکتے ہیں اور اسی سے مزاح پیدا ہوتا ہے۔ وہ موضوع کے گرد ساری عبارت کو رقص کراتے ہیں اور نقطہ عروج پر پھر موضوع سے اتنا گہرا تعلق پیدا کرتے ہیں کہ قاری تڑپ کر رہ جاتا ہے نفس مضمون کے

انتخاب کے ساتھ رشید صاحب کو جو کمال آغاز مضمون پر حاصل ہے وہ کسی دوسرے انشاپرداز کو نصیب نہیں ہوا۔ وہ اس انداز سے اپنے کرداروں اور متعلقہ ماحول کا تعارف کراتے ہیں کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور ذہن پوری طرح اس موضوع پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے مضمون کے پرت کھلتے جاتے ہیں رشید صاحب کا میدان وسیع اور تجربہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ فکر بلیغ اور انداز بیان رنگا رنگ ہوتا جاتا ہے۔ زندگی ایک مجموعہ ضدین ہے اور زندگی کا ماحول اس سے بھی زیادہ بے ہنگم۔ لیکن اس میں پھر بھی ایک استحکام ہے، قرار ہے ثبات ہے۔ وہ کیوں اور کیسے ؟ رشید صاحب ہمیں ان حقائق سے روشناس کراتے ہیں۔ آپ مسکراتے بھی ہیں کسک بھی محسوس کرتے ہیں۔ غمزدہ بھی ہوتے ہیں اور تلملاتے بھی ہیں لیکن مجموعی طور پر آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بہت عمیق اور بہت وسیع جس میں خامیاں اور کوتاہیاں ڈوب جاتی ہیں اور ان پر وضع داری اور رواداری کی روا پھیل جاتی ہے۔ یقین ہونے لگتا ہے کہ وہ فلاسفر ہیں جو پر لطف انداز سے کڑوی گولی کھلاتے ہیں لیکن مٹھاس کے ساتھ۔

رشید صاحب نے اردو ادب کو خوجی یا ببلول ایسی خیالی شخصیتیں نہیں دیں بلکہ ایسے زندہ کردار دیئے ہیں جو ہمارے زندہ سماج کے روح رواں ہیں۔

ایک مثال ذاکر صاحب کی ہے جو رشید صاحب کے مرشد تھے بلکہ یوں کہیے کہ جو علی گڈھ میں مرشد کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کے کردار کی خوبیاں ہیں فقیرانہ انداز، حق پرستی، قربانی اور بلند حوصلگی، عوام پرستی، جمہوریت نوازی، دوست داری اور رواداری، ذرا ان خوبیوں کا اظہار رشید صاحب سے سنیئے۔

"چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جس سال نان کو آپریشن کا حملہ ایم۔اے۔او کالج پر ہوا ہے مرشد اور میں ہم نوالہ و ہم پیالہ، ہم سبق اور ہم خیال تھے۔ مرشد ان طلبا میں سے تھے جن سے کالج کے ارباب حل و عقد بجا طور پر مرعوب تھے اور شائد اس کا سبب یہ تھا کہ مرشد کی حاضری ہمیشہ کم رہتی اور یونی ورسٹی میں اچھے سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتے تھے وہ یونین کے بے پناہ مقرروں میں سے تھے، کرتہ، پاجامہ اور ڈاڑھی شرعی، شیروانی حیدرآبادی، غذا، ڈائننگ ہال کی، ناشتہ دوسروں کا اور دوا دلی کی۔ مرشد کو ہمیشہ اس کا اندیشہ رہا کہ ان کی تندرستی خطرے میں ہے اور اسی فکر میں وہ آس پاس کے تمام اطبا سے رجوع کرتے رہتے تھے۔ ان میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی شامل تھے اور ایسے حکیم اور ڈاکٹر بھی جن کا نام سوائے ان کے سائن بورڈ یا خود مرشد کے کسی اور کو معلوم نہ تھا یا پھر۔

آں راکہ خبر شد خبرش باز نہ آمد

بعض مزاح نگار محض لفظوں کے ہیر پھیر یا ان کے عجیب و غریب استعمال سے بھی لطف پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ رشید احمد اس فن کے ماہر ہیں لیکن جس انداز سے انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے وہ پطرس کو اس لئے نصیب نہ ہو سکا کہ ان کے پاس یہ خزانہ نہیں تھا اور فرحت اللہ بیگ یا عظیم بیگ چغتائی اس لئے پیچھے رہ گئے کہ ان کے پاس خلوص اور موضوعات کا وہ زور نہ تھا جو رشید صاحب کے حصے میں آیا۔

رشید صاحب کے طنز و مزاح کا ایک اور کمال یہ ہے کہ انہوں نے قدیم کلاسیکی ادب کو روایت کے طور پر استعمال کر کے اس کو نئے ادب کا ایک جزو لاینفک بنا دیا ہے اور اس طرح ہمارے قدیم بہترین سرمائے کو اپنے وسیع نگار خانے میں محفوظ کر دیا ہے۔ عروضی سمرقندی کا قول ہے کہ ہر ادیب یا شاعر کو اپنی جوانی کے عالم میں دس بیس ہزار اشعار یاد ہونے چاہیں۔ وہ ان اشعار کی گہرائیوں اور لفظی اور معنوی صفات سے بخوبی واقف ہو لیکن جب وہ خود طبع آزمائی کرنا چاہے تو یہ تمام اشعار اور ان کی تمام تر خوبیاں اس کے تحت شعور میں محفوظ ہوں۔ دوسرے الفاظ میں وہ اگر

چاہے تو ان اشعار کے اصلی الفاظ کو بھلا دے۔ لیکن ان اشعار کی روح سے اپنے خاکوں میں جان ڈالے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ بھی نئے ادب میں قدیم ادب کی روایات کو سمو دینے کو فن کار کا کمال تصور کرتے ہیں۔

رشید صاحب نے کلاسیکی ادب کے جواہرات کو جس طریقے سے اپنے فن میں پرو دیا ہے وہ انہیں ہمارے ادب کا بہترین محافظ بنا دیتا ہے۔ انہوں نے ادب میں ایک نیا مذاق پیدا کیا، نئی دھن دی، نیا دل دیا اور یہ بات کسی کو بھی زندہ جاوید بنا سکتی ہے۔ کلاسیکی اشعار کے استعمال سے دوسرے مزاح نگاروں نے بھی بہت فائدہ اٹھایا ہے لیکن رشید صاحب کی عبارتوں کے کئی جملے کسی نہ کسی مشہور و معروف شعر کی یاد دلاتے چلے جاتے ہیں لیکن ان پر یہ الزام لگانا کج فہمی ہے کہ انہیں شعر تو سوجھا پہلے اور اس شعر کی شوخ تشریح یا تلمیح کے لئے انہوں نے کوئی واقعہ گھڑ لیا۔ انہوں نے اشعار کو واقعہ اور کردار کی مزید چمک کا ذریعہ تو بنایا ہے لیکن ان اشعار سے اپنے تخیل کو بھکنے نہیں دیا۔ اشعار ایسے ہی آتے چلے گئے ہیں جیسے دوسرے خوبصورت جملے، دلچسپ استعارے یا دلنشیں تشبیہیں۔

یوں کہنے کو تو رشید صاحب محض ادیب ہیں لیکن انہیں اپنے دور کی سیاست، عدالت اور حکومت کے ہر نفس کی پہچان ہے۔ انہوں نے سماج اور اس وقت کے رہنماؤں کی عدم صلاحیت بے راہ روی یا کمی۔ لمان کو زندہ کرداروں کے آئینہ میں ترچھی نظر سے دیکھا ہے اور زمانے کی نبض پر ان کا اس طرح ہاتھ رہا ہے جیسے کسی فلسفی طبیب کا ہو جو نشتر چلانے سے پیشتر مرض کی شدت سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے مریض کی دلجمعی کے لئے مسکرا کر اسے حوصلہ دلا رہا ہو

رشید احمد کا ماحول بھی ایک زندہ طنز ہے۔ کچی بارک پر بارش برسے یا کھچڑی پکے، شعر و سخن کی انجمن جمے یا الیکشن ہوں۔ پکی بارک سے لفظی چپقلش ہو یا علمی مباحثے سبھی زندہ ماحول کی تازگی اور شگفتگی کا سامان مہیا کرتے ہیں اور ایک خاص تہذیب اور بود و باش کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں علی گڈھ اپنی تمام تابناکیوں اور پیاری پیاری کوتاہیوں کے ساتھ رشید صاحب کے ہاں زندہ ہو گیا ہے یا یوں کہئے کہ انھوں نے تاریخ و تمدن کی طویل داستان ایک ہلکے پھلکے یاد رہنے والے انداز میں بیان کر دی ہے۔ سنجیدہ ہو جائیے تو کئی کروٹیں بدنے گا اور نہ سمجھ میں آئے تو یہ کہہ کر گذر جائیے گا کہ "پرانے لوگ ہیں یہ"۔ یہی نہیں رشید صاحب نے اردو ادب پر ایک اور احسان عظیم بھی کیا ہے وہ غالباً پہلے باخبر مزاح نگار ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کو ایک باقاعدہ فن کی اہمیت دی ہے۔ رشید صاحب سے قبل کی طنز و مزاح کی تاریخ کوئی بہت طویل تو نہیں۔ لے دے کے سودا، مصحفی، انشا۔ غالب اور اکبر رہ جاتے ہیں یا ان کے ہم عصروں میں ملا رموزی، سرشار، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ ہیں لیکن کسی فنکار نے اپنے فن کے مختلف پہلوؤں پر اس قدر گہری نظر نہیں ڈالی جس قدر رشید صاحب نے ڈالی ہے۔ رشید صاحب کی طنزیات و مضحکات" طنز و مزاح کا حق ادا کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر رشید صاحب اردو ادب کے ایک ایسے مزاح نگار ہیں جو اس فن کو محض رونق محفل بننے یا دوسروں کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ سماج، سیاست، مذہب اور ادب میں ایک خاص نظر پیدا کرنے کے لئے بروئے کار لائے۔ ان کی یہ شعوری کوششیں انھیں اس خاص صنف سخن میں ایسے مقام پر لے جاتی ہیں جہاں کسی کا گذر نہیں ہوا۔

نظر برنی (دہلی)

اِدھر اُدھر

اِدھر "فکرِ دفتر" ، اُدھر "فکرِ راشن"
اِدھر بھی ہے "ٹینشن" اُدھر بھی ہے "ٹینشن"
"غریبی کی ریکھا" پہ پہونچایا کس نے ؟
الیکشن الیکشن ، الیکشن ، الیکشن
وطن کی ہے پہچان کس کی بدولت؟
کرپشن ، کرپشن ، کرپشن ، کرپشن
بتاؤ وطن میں ہے کیا چیز سستی؟
تجیشن ، تجیشن ، تجیشن ، تجیشن
ملا جب سے عہدہ ہوئی دھن کی بارش
کھناکھن ، کھناکھن ، کھناکھن ، کھناکھن
کھلائی جو رشوت تو ٹھیکہ ملا ہے
اِدھر "ایکشن" ہے اُدھر "ری ایکشن"
یہ ہے حال "صاحب" کی معروفیت کا
ہر اک دن ہے میٹنگ ہر اک دن ہے فنکشن
اُدھر ساس برہم اِدھر میری بیوی
اُدھر بھی ہے دشمن اِدھر بھی ہے دشمن
کہاں تک میں روکوں گا بمباریوں کو ؟
مرے گھر پہ آئی ہے سسرالی پلٹن
لو بیگم کی "آنی پریلشا" بھی ہوگی
جو میری "پی اے" تھی وہ ہے ان کی "سوتن"
یہ شادی بیاہ بھی ہیں قسمت کی باتیں
وہ ہیں آج تک "مس" مگر عمر پچپن
"وِد آوٹ ٹکٹ" ہم جو پکڑے گئے ہیں
"نہ ہے جائے ماندن نہ ہے پائے رفتن"
جسے دیکھ کر لوگ کانپے ہیں "کنی"
نظر کو ہوئے آج اس کے ہی درشن

منہ پھٹ (ناگپوری)

قوم کو ابھرنا ہے

قوم کو ابھرنا ہے ، چار پیسے والوں سے
احتیاط کرنا ہے ، چار پیسے والوں سے

کس کی مہربانی سے مدرسوں میں گری ہے
علم کا یہ جھرنا ہے ، چار پیسے والوں سے

کاروبار ان سے ہے ، اقتدار ان سے ہے
آدمی کو ڈرنا ہے ، چار پیسے والوں سے

ناچ اور گانے کی ، حمد اور ترانے کی
محفلیں سنورنا ہے ، چار پیسے والوں سے

انتخاب آیا ہے ، انقلاب آیا ہے
اپنی جیب بھرنا ہے ، چار پیسے والوں سے

موت کا معین ہے ، ایک دن مگر پل پل
آدمی کو مرنا ہے ، چار پیسے والوں سے

اونچ ، نیچ ، مذہب کے بیج کس نے بوئے ہیں
یہ سوال کرنا ہے ، چار پیسے والوں سے

ہوں ہزار با راہیں ، پر تمام راہوں کو
ہو کے ہی گزرنا ہے ، چار پیسے والوں سے

کل کی بات جانے دو ، منہ پھٹ اب تو بچ بچ کے
مستقل گزرنا ہے ، چار پیسے والوں سے

زندہ دلان حیدر آباد کا ترجمان ماہنامہ

شگوفہ

جلد ۳۲ شمارہ ۱۱ حیدر آباد نومبر ۱۹۹۹ء

سوونیر۔ تقاریب زندہ دلان، حیدر آباد

سرورق: طالب خوندمیری — کمپیوٹر کمپوزنگ SAN کمپیوٹر سنٹر، چنچل گوڑہ — طباعت: دائرہ پریس مچھلی کمان بازار، حیدر آباد

قیمت فی پرچہ ۱۵ روپے — زر سالانہ : ۱۴۰ روپے — بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل کا پتہ : ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدر آباد

فون (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064

زندہ دلان حیدر آباد

سرپرست
نواب شاہ عالم خان صاحب

صدر
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

نائب صدر
جناب کے۔ وی۔ رمنا چاری
آئی۔ اے۔ ایس

معتمد عمومی
طالب خوندمیری

نائب معتمدین
رشید الدین
روف رحیم

خازن
ڈاکٹر وہاب قیصر

ارکان
حمایت اللہ
ڈاکٹر مصطفیٰ کمال
مرزا مصطفیٰ علی بیگ
ڈاکٹر حبیب ضیاء
ڈاکٹر عباس متقی
اسلم فرشوری
حبیب احمد خان

زندہ دلان حیدر آباد

کل ہند سالانہ تقاریب ۱۲ اور ۱۳ نومبر

بہ تعاون محکمہ سیاحت، حکومت آندھرا پردیش

کل ہند ادبی اجلاس .... جمعہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۹ء ساڑھے پانچ بجے شام

صدارت: مجتبیٰ حسین

مضمون نگار ☆ جناب فیاض فیضی ☆ جناب نصرت ظہیر
☆ ڈاکٹر عباس متقی ☆ جناب برہان حسین

کنوینر: ڈاکٹر بیگ احساس

محفل لطیفہ ...... جمعہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۹ء ساڑھے سات بجے شام

صدارت: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

مہمان خصوصی: جناب جی کشن راؤ۔ آئی۔ اے۔ ایس مینیجنگ ڈائرکٹر سیاحت۔
☆ ڈاکٹر شمس بابر (صدر بزم اردو جدہ)

اس محفل میں مشہور و مقبول لطیفہ گو حصہ لیں گے

رسم اجرا ...... ”ہنسے ہنسائیے“ ”لطیفوں کا مجموعہ“ جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ
بہ دست نواب شاہ عالم خاں صاحب

بمقام: نمائش میدان، مکرم جاہی روڈ، حیدر آباد — کنوینر: حمایت اللہ

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ

ہفتہ ۱۳ نومبر ۱۹۹۹ء ساڑھے آٹھ بجے شب۔ بمقام قلی قطب شاہ اسٹیڈیم سٹی کالج، حیدر آباد

مہمان شعراء کرام ☆ جناب غوث خواہ مخواہ (ممبئی) ☆ سنیل کمار تنگ (سیوان) ☆ بانغ بہاری (کلکتہ) ☆ عظمت بھلاواں (ناندیڑ) ☆ اسرار جامعی (دہلی) ☆ انور اسحاقی (دمام) ☆ قیسی قمر نگری ☆ فرید انجم ☆ سراج زلفی

میزبان شعراء کرام ☆ محمد حمایت اللہ ☆ مصطفیٰ علی بیگ ☆ طالب خوندمیری ☆ صنعت اللہ بمباث، اقبال ہاشمی، روف رحیم، اجیت گپتا، منور علی مختصر ☆ وحید پاشا قادری ☆ وینو گوپال بھٹ

صدر مشاعرہ: نواب شاہ عالم خان

مہمانان خصوصی: جناب جی کشن راؤ۔ آئی۔ اے۔ ایس
مینیجنگ ڈائرکٹر سیاحت، حکومت آندھرا پردیش
☆ جناب زاہد علی خان، ایڈیٹر روزنامہ ”سیاست“ (حیدر آباد و بنگلور)

صدر زندہ دلان: راج بہادر گوڑ — کنوینر: مصطفیٰ علی بیگ — معتمد عمومی: طالب خوندمیری

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مال منت (انشائیہ)

شیطان کی آنت (قسط وار ناول)

بال کی کھال (تبصرہ)

چورن (منظومات)



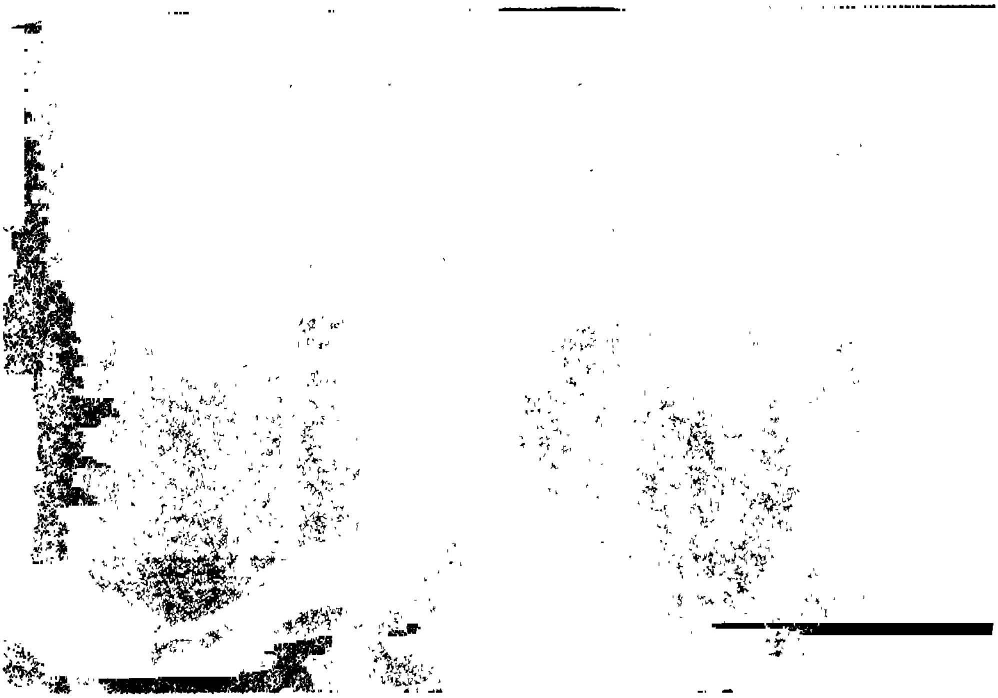
نواب شاہ عالم خاں صاحب (سرپرست)



ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (صدر)



زندہ دلان کے ایک ادبی اجلاس میں نواب شاہ عالم خاں صاحب
مجتبیٰ حسین کی گلپوشی کرتے ہوئے۔ دلیپ سنگھ اور مسیح انجم بھی
دیکھے جا سکتے ہیں



جناب زاہد علی خاں مدیر سیاست اور غوث خواہ مخواہ

(کل ہند مزاحیہ مشاعرہ ۱۹۹۶ء کی ایک تصویر)

محفل لطیفہ کی ایک یادگار گروپ فوٹو

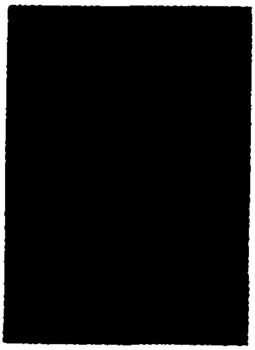
زندہ دلانِ حیدرآباد



جناب مجتبیٰ حسین   صدر ادبی اجلاس



طالب خوندمیری   (معتمد عمومی)



جناب مصطفیٰ علی بیگ   کنوینر مشاعرہ

جناب حمایت اللہ   کنوینر محفل لطیفہ





نا   (نائب معتمد)

ڈاکٹر حبیب ضیاء   رکن

رؤف رحیم   (نائب معتمد)

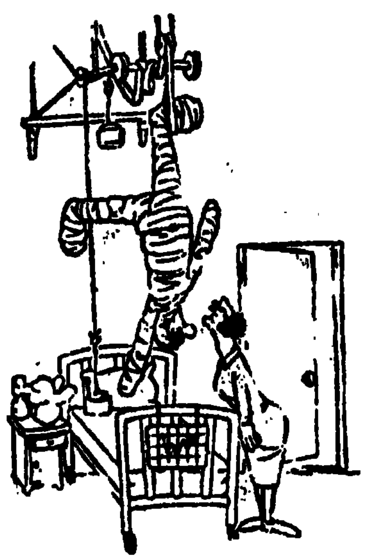




جناب واحد اللہ

جناب مختار یوسفی

جناب سنیل کمار منگ



آپ نے چیخ ماری تھی ـــــ کہئے کیا بات ہے



معلوم ہوتا ہے منیجر صاحب اپنی لڑکی کی شادی تم سے کرنا چاہتے ہیں
تب ہی تمہیں کوئی کام نہیں دیا جا رہا ہے



مجتبیٰ حسین

باتیں ابراہیم جلیس کی

26 اکتوبر کو ابراہیم جلیس کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بائیس برس بیت گئے۔ ابراہیم جلیس نے لمبی عمر نہیں پائی اور 53 برس کی عمر میں ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ لیکن عمر کی اتنی کم نقدی رکھنے کے باوجود وہ اتنا کچھ کر گئے جو برسوں کے ریاض کے بعد بھی بہت سے لوگ نہ کر پائے۔ دکن کے اس سپوت نے 1948ء میں جب پاکستان ہجرت کی تو اس وقت ان کی عمر صرف 24 برس تھی اور اس وقت تک ان کی پانچ تصانیف شائع ہو چکی تھیں اور بحیثیت طنز نگار سارے برصغیر میں ان کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ ابراہیم جلیس کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہ نواز جلیس کا ایک مضمون پاکستان کے ایک رسالہ میں ابھی حال میں ہماری نظر سے گزرا ہے جس میں انہوں نے اپنے والد کی زندگی کے چند واقعات قلمبند کئے ہیں۔ ابراہیم جلیس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آج ہم اس مضمون کے چند اقتباسات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے پاکستان کے بے مثال شاعر، مزاح نگار اور کالم نگار ابن انشاء کے اس مضمون کا ایک اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے جسے انہوں نے ابراہیم جلیس کے انتقال کے فوراً بعد لکھا تھا۔ ابن انشاء ابراہیم جلیس کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ افسوس کہ ابن انشاء بھی صرف 51 برس کی عمر میں ابراہیم جلیس کے انتقال کے دو مہینوں بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

"سقوط حیدرآباد کے بعد ابراہیم جلیس لاہور آئے تو ہمارے ہی گھر پر قیام کیا جو ڈیڑھ کوٹھری کا گھر تھا۔ ہم نے سامنے کے برآمدے پر پردہ ڈال کر اپنے لئے کمرہ بنا رکھا تھا جس میں ٹھنس ٹھنسا کر دو چار پائیاں آتی تھیں۔ ان دنوں کا احوال انہوں نے اپنی کتاب "دو ملک ایک کہانی" میں لکھا ہے۔ ہمارے چھوٹے بھائی محمود ریاض ان کے لئے سستے سے سستے سگریٹ تلاش کر کے لاتے تھے اور اس خدمت کا معاوضہ یوں وصول کرتے تھے کہ افسانے لکھتے تھے اور زبردستی ان کو سنایا کرتے تھے۔ جلیس کا بیان ہے کہ ایک روز تو میں سائیکل پر بیٹھ کر فرار ہو گیا لیکن افسانے کا ربط نہ ٹوٹا کیونکہ محمود ریاض اچک کر سائیکل کے کیریر پر سوار ہو گئے تھے۔ جلیس کی گفتگو میں جھوٹ اور سچ کو الگ کرنا آسان نہ تھا۔ کبھی خالص سچ بولنا ہو تو ان کو بڑی کاوش کرنی پڑتی تھی اور کہتے تھے کہ بعد میں ضمیر کی ملامت بھی سننی پڑتی ہے۔ بعضوں کا تکیہ کلام ہوتا ہے: "خدا جھوٹ نہ بلوائے"۔ یہ فرمایا کرتے تھے: "خدا سچ نہ بلوائے"۔ سبھی جانتے ہیں کہ یہ ان کے مزاج کا ایک بے ضرر خاصہ تھا۔ ان کی زندگی لطیفے پیدا کرتے گزری۔ تحریر سے بھی زیادہ تقریر میں، عام زندگی میں، گھر میں، محفل میں۔ اگر کسی کے لئے باغ و بہار کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے تو وہ میاں جلیس تھے"۔

ابراہیم جلیس بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بات سے بات پیدا کرنے اور نت نئے لطیفے اختراع کرنے کا گر انہیں خوب آتا تھا جن میں وہ اپنا مذاق آپ اڑایا کرتے تھے۔ 1960ء میں وہ آخری بار حیدرآباد آئے تھے۔ واپسی کے سفر میں ممبئی میں وہ اپنے عزیز ترین دوست ساحر لدھیانوی سے بھی ملے۔ پاکستان جا کر انہوں نے اس ملاقات کا حال کچھ اس طرح بیان کیا تھا: "میں نے بڑے فخر کے ساتھ ساحر لدھیانوی سے ان سہولتوں اور مراعات کا ذکر کیا جو پاکستان میں صحافیوں اور ادیبوں کو حاصل ہیں۔ میں نے ساحر لدھیانوی کو بتایا کہ پاکستان میں صحافیوں کو ریل کا ٹکٹ آدھی قیمت پر ملتا ہے"۔ اس پر ساحر لدھیانوی نے کہا: "جلیس پیارے! یہ کونسی بڑی بات ہے ہمارے ہاں بھی یہ سہولت نابالغوں کو حاصل ہے۔ ان سے آدھے ٹکٹ کا کرایہ ہی لیا جاتا ہے"۔

اب پتہ نہیں ساحر لدھیانوی نے یہ بات کہی بھی تھی یا نہیں یا یہ صرف ابراہیم جلیس کے ذہن کی اختراع تھی۔ انہیں تو ایک ایسے موقع کی تلاش تھی جس میں وہ پاکستانی صحافیوں کو نابالغوں کے زمرے میں کھڑا کردیں۔ ایسی باتیں وہ اپنے آپ ہی گھڑ لیتے تھے۔

آئیے اب وہ چند واقعات ملاحظہ فرمائیے ۔ جن کا ذکر شاہ نواز جلیس نے اپنے والد پر لکھے گئے مضمون میں کیا ہے:

"ابراہیم جلیس نے جب اپنا ہفتہ وار اخبار "عوامی عدالت" نکالنا شروع کیا تو ایک دن میں ان کے دفتر میں موجود تھا۔ اتنے میں ایک ردی پیپر خریدنے والا آوازیں لگانے لگا "ردی پیپر۔ ردی پیپر" اچانک جلیس صاحب نے مجھے آواز دی اور کہا کہ میں جلدی سے ردی پیپر والے کو بلا کر لے آؤں۔ ہمارا دفتر بہادر شاہ مارکیٹ میں تیسری منزل پر واقع تھا۔ بیچارہ اپنی پیٹھ پر ردی پیپر کی بھاری بوری لادے اوپر آیا تو جلیس صاحب نے اسے دس روپے کا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا: "بھائی میرے خدا کے واسطے میرے دفتر کے سامنے ردی پیپر کی آواز مت لگایا کرو۔ اس سے میرے پرچے کی ساکھ پر برا اثر پڑتا ہے"۔ اور بیچارہ حیرت سے جلیس صاحب کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

اردو ڈائجسٹ کے مدیر الطاف حسین قریشی نے ایک انٹرویو کے دوران ابراہیم جلیس سے سوال کیا: "جلیس صاحب آپ نے اپنی زندگی میں کتنے لطیفے تخلیق کئے ہیں ؟" جلیس صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "میں نے بحیثیت مزاح نگار کل سات لطیفے پیدا کئے ہیں جن میں سے چار مذکر اور تین مونث ہیں یعنی چار بیٹے اور تین بیٹیاں"۔

ابراہیم جلیس نے سندھ کے وزیر بلدیات جام صادق علی مرحوم سے خواہش کی کہ وہ بندر روڈ کا نام بدل کر "عوامی عدالت روڈ" رکھ دیں (ابراہیم جلیس کے رسالہ "عوامی عدالت" کا دفتر بندر روڈ پر واقع تھا) جب جام صادق علی نے نام کی اس تبدیلی کی وجہ دریافت کی تو جلیس صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: "نام کی اس تبدیلی کا ایک فائدہ مجھے یہ ہوگا کہ میرا پرچہ چلے نہ چلے کم از کم یہ روڈ تو چلتی رہے گی"۔

ایک دن جلیس صاحب ناظم آباد کے کرائے کے مکان کے لان میں اپنے دوست ابن انشاء مرحوم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کرایہ کے اس مکان کی خصوصیت یہ تھی کہ مکان تو بہت چھوٹا تھا لیکن اس کا لان بہت وسیع و عریض تھا اور آخر میں اس کی دیوار (Boundary Wall) تھی۔ ایک مرحلہ پر جلیس صاحب کی نظر اس دیوار پر پڑی تو جلیس صاحب باتیں کرتے کرتے اچانک خاموش ہوگئے اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ابن انشاء نے ان کی اس گہری سوچ کی وجہ دریافت کی تو جلیس صاحب نے کہا: "یار! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ لان، جو چلا ہی جارہا ہے اگر اسے اس دیوار نے روک نہ لیا ہوتا تو چلتا ہی چلا جاتا۔ رکنے کا نام نہ لیتا"۔

جلیس صاحب نے آٹھ ہزار روپے خرچ کر کے جب ایک سکنڈ ہینڈ فیٹ موٹر کار خریدی تو ان کی جیب پر بہت بھاری پڑی۔ یہ گاڑی اکثر چلتے چلتے رک جاتی تھی اور اسے دھکا لگانا پڑتا تھا۔ ایک دن جلیس صاحب نے تنگ آکر کہا جہاں میں نے اس موٹر پر آٹھ ہزار روپے خرچ کئے ہیں وہیں میں ایک ہزار روپے اور خرچ کردیتا تو یہ گاڑی کبھی نہ رکتی لوگوں نے پوچھا: "وہ کیسے ؟" نہایت متانت سے بولے: "آپ کو شاید پتہ نہیں کہ مویشیوں کی مارکیٹ میں ایک اچھا گدھا ایک ہزار روپیہ میں آتا ہے۔ اگر میں اس گدھے کو خرید کر اس گاڑی کے آگے باندھ دیتا تو یہ کبھی نہ رکتی"۔

گاڑی رکنے کے بعد وہ عموماً اپنے ساتھ اپنے چار ادیب دوستوں کو ضرور گاڑی میں بٹھا کر لیجاتے تھے اور ان سے برملا کہتے تھے: "آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کی شہرت سے مرعوب ہو کر آپ کو اپنی گاڑی میں بٹھاتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میری گاڑی جب بند ہوجاتی ہے تو اسے دھکا دینے کے لئے چار آدمیوں کی ضرورت پیش آتی ہے"۔

پروفیسر احمد علی خان پاکستان کے بے حد ممتاز صحافی تھے اور ان کی اہلیہ خدیجہ مستور اردو کی بہت مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ایک دن

کسی نے جلیس صاحب سے پوچھا: "جناب! ادب اور صحافت میں کیا رشتہ ہے؟" جلیس صاحب نے بے ساختہ کہا: "وہی رشتہ ہے جو بھائی احمد علی سے بھابی خدیجہ مستور کا ہے یعنی میاں بیوی کا رشتہ" جلیس صاحب نے جب اپنا اخبار جاری کیا تو ان کے حوالے سے یہ لطیفہ بھی بہت مشہور ہوا کہ ایک شخص خود کشی کرنے کی غرض سے ریل کی پٹری پر لیٹا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک شخص کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے پٹری پر لیٹے ہوئے آدمی سے خود کشی کرنے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے جب زندگی سے تنگ آنے کی وجہ بیان کی تو راہ گیر نے کہا: "بھلے مانس! خود کشی تو اسلام میں حرام ہے۔ اگر خود کشی کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو تم کوئی اخبار کیوں نہیں نکال لیتے۔ اس طرح تم اپنی موت آپ مرجاؤ گے"۔

صاحبو: تین چوتھائی صدی پہلے ایسی باتیں تخلیق کرنے والے کا جنم اس دکن میں ہوا تھا اور ابھی نصف صدی پہلے تک اس کی ایسی البیلی باتوں کی گونج حیدر آباد میں سنائی دیتی تھی۔ اب اس کی باتیں ادب کی تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔

طالب خوندمیری

ماں کا خط......این، آر، آئی بیٹے کے نام

آج بیٹے ملی ہے فرصت بھی　　اور لکھنے پہ ہے طبیعت بھی
ساتھ پہنچے تمہیں دعاؤں کے　　میری شفقت، مری محبت بھی
یاد ہر دن تمہاری آتی ہے　　تم گئے، ہوگئی ہے مدت بھی
اپنے گھر کے سدھار میں بیٹے　　ہے تمہاری بڑی اعانت بھی
ہر مہینہ ڈرافٹ بھجواکر　　کردیا تم نے گھر کو جنت بھی
پورے ہوتے ہیں کام گھر بیٹھے　　پٹرو ڈالرس کی بدولت بھی
ویڈیو، کار، فیکس، کمپیوٹر　　اب تو حاصل ہے ہر سہولت بھی
کرکے "ای میل" پوچھ لیتی ہوں　　کیا ہے لندن میں گڑ کی قیمت بھی

یہ تو سب ٹھیک ہے، مگر بیٹے!　　اب تو کھلتی ہے یہ فراغت بھی
جو فقیرانہ بے نیازی تھی　　چھٹ گئی ہم سے اب وہ عادت بھی
گھر میں اپنا نہیں رہا کوئی　　کیا کریں لے کے اتنی دولت بھی
اب تو بستی کے حال سے بیٹے　　ہم کو ہونے لگی ہے وحشت بھی

یاد ہے تم کو اپنے پچھواڑے　　ایک رہتی تھی بوڑھی عورت بھی
یوں تو اچھا سا نام تھا لیکن　　اس کو کہتے تھے سب "قناعت" بھی
تھی تو مفلس، مگر سلیقہ مند　　صاف ستھری تھی اس کی فطرت بھی
روکھے سوکھے میں تھی وہ آسودہ　　حرص پر بھیجتی تھی لعنت بھی
اب سنا ہے، بہت علیل ہے وہ　　کیا پتہ ہوچکی ہو رخصت بھی

کل کسی نے خبر یہ دی مجھ کو　　اب ہیں کوما میں "بی دیانت" بھی
ہاں وہی جن کے نام کی کل تک　　لوگ دیتے رہے ضمانت بھی
اب یہ ڈر ہے کہیں نہ ہوجائے　　ایک دو دن میں ان کی رحلت بھی

اپنے ہمسایہ اک بزرگ جو تھے　　یاد تو ہوگی ان کی صورت بھی
صاف گوئی میں بے مثال تھے وہ　　پاک باطن تھے، نیک طینت بھی
ہر برائی سے روک دیتے تھے　　کرتے رہتے تھے وہ نصیحت بھی
نام جن کا "ضمیر صاحب" تھا　　جاں بحق ہوگئے وہ حضرت بھی

" میر انصاف" یاد تو ہوں گے؟　　اونچے پورے تھے پُروجاہت بھی
قوتِ فیصلہ تھی متوازن　　ان کی آنکھوں میں تھی صداقت بھی
تم کو معلوم ہے ؟ وہ کرتے تھے　　صرف سچّائی کی حمایت بھی
ایسی تبدیلی آگئی ان میں　　جو سنے اس کو ہوگی حیرت بھی
ان کے کرتوت دیکھ کر بیٹے !　　لوگ کرنے لگے ہیں نفرت بھی
اب تو بیماریاں بھی ہیں ان میں　　ایک تازہ مَرَض ہے رشوت بھی
ہے یہ دھڑکا : کہیں نہ اٹھ جائے　　اب عدالت سے ان کی مَیّت بھی

ایک "قانون خاں" بھی ہوتے تھے　　جن کی چھائی ہوئی تھی ہیبت بھی
"میر انصاف" کے وہ بھائی تھے　　ایک جیسی تھی ان کی فطرت بھی
وہ بھی اتنے بدل چکے بیٹے !　　اب نہیں کوئی ان کی وقعت بھی
اب تو ہر وقت ان پہ طاری ہے　　ضعف ، رعشہ ، غشی ، نقاہت بھی
یہ سنا ہے کہ ان کے مرنے کی　　آرزو مند ہے سیاست بھی

یہ قلم اب جو لکھنے والا ہے　　ہے بہت تلخ یہ حقیقت بھی
علم کا اک مقام تھا پہلے　　اب کہاں اس کی قدر و قیمت بھی
حال تعلیم کا بیان کرنے　　اتنی مجھ میں نہیں ہے ہمت بھی
اپنی بستی میں جو مدارس تھے　　ناساعد ہے ان کی حالت بھی
یہ خبر ہے کہ درس گاہوں میں　　اب پڑھاتی ہیں " رسِ جہالت" بھی

آگے اب اور کیا لکھوں بیٹے!　　ختم کرنے کی دو اجازت بھی
بس دعا ہے یہ اپنے مالک سے　　تم پہ آئے نہ کوئی آفت بھی

تندرستی کے ساتھ صدیوں تک
تم کو رکھے خدا سلامت بھی

طالب خوندمیری

روحِ حضرتِ غالبؔ سے معذرت کے ساتھ

غزل

(دیوان غالب کی پہلی کی زمین میں)

کارنامہ ہے یہ کس کی شوخیِ تحریر کا
ہے ندارد پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

روز و شب کی سخت محنت سے تھی اتنی تشنگی
دودھ سارا پی گیا فرہاد جوئے شیر کا

دھار کیا دیکھی کسی کے ابروئے خمدار کی
سینۂ شمشیر میں دم گھٹ گیا شمشیر کا

مانگ ناقص، پوپلا منہ، پھر خطابت کا جنوں!
مدعا کیا خاک ہوگا عالمِ تقریر کا

اس لئے اپنی اسیری کا مجھے کچھ غم نہیں
پاؤں سے بھی ہے بڑا حلقہ مری زنجیر کا

خواب ہو اچھا تو اظہارِ خوشی اچھی نہیں
آنکھ کھلتے ہی پلٹ جاتا ہے رخ تعبیر کا

وہ پکاتے وقت شیریں لب سے گر چکھتی نہیں
دال میں ان کی، مزا آتا ہے پھر کیوں کھیر کا

ایک اک تدبیر اپنا سر پٹک کر رہ گئی
فیصلہ اتنا اٹل تھا کاتبِ تقدیر کا

تم تو طالبؔ! صرف غالبؔ ہی کے پیچھے پڑ گئے
ایک لہجہ اور بھی تو ہے غزل میں میر کا

غزل

(دیوان غالب کی دوسری کی زمین میں)

بچپن میں ایک کام فقط کھیل کود تھا
بھیگیں مَسیں تو عشق کا دل میں درود تھا

عاشق کو فکر تھی کہ شبِ وصل ٹل نہ جائے
معشوق غرق فلسفۂ ہست و بود تھا

نہلا دیا شراب میں غیروں کے سامنے
ساقی کا ہم پہ لطف برائے نمود تھا

عشاق ان کی بزم میں سب منحنی سے تھے
جو سب سے پُرکشش تھا عدو کا وجود تھا

ہم ان کے گھر میں جاتے ہی بے ہوش ہوگئے
بس اتنا یاد ہے کہ انگیٹھی میں عود تھا

قرضہ کی اصل رقم تو باقی ہی رہ گئی
اب تک جو ہوچکا تھا ادا، صرف سود تھا

گرمی سخن میں آئی ہے طنز و مزاح سے
ورنہ مزاجِ شعر پہ طاری جمود تھا

کُل کائنات، اس کی گلی کے سوا نہ تھی
یعنی خیال تک بھی اسیرِ حدود تھا

طالبؔ پسندِ خاطرِ غالبؔ تو دیکھئے
وہ شغلِ مَے کشی جو خلافِ قیود تھا

فیاض احمد فیضی (ممبئی)
101 Azad House, Red Cross Lane,
Agripada, Mumbai -400011.

ماہر تعلیم بننے کا آسان نسخہ

ایک زمانہ تھا جب ہمارے ملک میں ماہرین تعلیم کی بڑی قلت تھی اور ان کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر مجیب، خواجہ غلام السیدین، عابد حسین وغیرہ۔ لیکن جیسے جیسے ہمارا تعلیمی معیار گرتا گیا، ماہرین تعلیم کی تعداد بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر ہمارے ملک میں ماہرین تعلیم کی تعداد کچھ کم ہوتی تو تعلیم کے مسائل اتنے زیادہ نہ ہوتے۔ پرانے وقتوں میں تعلیمی صورت حال بالکل مختلف تھی اور ہر ادنیٰ یونیورسٹی سے بڑی بڑی عظیم ہستیاں درآمد ہوجایا کرتی تھیں شائد اس لئے کہ اس زمانے میں تعلیم، داخلوں کے بھاری ڈونیشن اور طلبہ کے وزن دار بستوں سے بوجھل نہیں ہوتی تھی۔
اس زمانے کے ماہرین تعلیم بھی اتنے سادہ لوح ہوتے تھے کہ نہ صرف پیشہ تدریس سے دل و جان سے وابستہ ہوتے تھے اور ایمانداری سے فرائض کو انجام دینے کی دھن میں غیر تدریسی آمدنی سے محروم رہتے تھے بلکہ وہ تعلیم کے مسائل پر گہری نظر بھی رکھتے تھے جس کے نتیجہ میں ان کی آنکھیں کمزور ہوجایا کرتی تھیں۔ وہ نوجوان نسل کی نفسیات سے بھی واقف ہوتے تھے اور عالمی سطح پر تعلیمی میدان میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگہی بھی رکھتے تھے اور خود اپنے گھر میں فاقہ مستی کے مزے لوٹتے تھے۔ انہیں شعر و ادب سے بھی لگاؤ ہوتا تھا اور اپنے بے پناہ مطالعہ کے سبب وہ اپنی ذات میں خود ایک اسکول ہوا کرتے تھے جہاں سے علم حاصل کرنے کیلئے طالب علموں کو ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا جب کہ آج کے ماہرین تعلیم اپنی ذات میں خود ایک کوچنگ کلاس ہوتے ہیں جہاں تک پہونچنے کیلئے ہر طالب علم کے منہ میں چاندی کا چمچہ ہونا لازمی ہوتا ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں جیسے جیسے سائنس، صنعت و حرفت اور تجارت نے ترقی کی، ماہر تعلیم ہونے کیلئے ان اوصاف کا ہونا غیر ضروری قرار دیا گیا اور نئی قسم کے ماہرین تعلیم کی فصل اگنے لگی۔
پچھلے دنوں شہر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہمارے ایک کسٹم آفیسر دوست کے پانچ سالہ بچہ کی سالگرہ کی تقریب میں ہماری ملاقات ان جدید ماہرین تعلیم سے ہوئی۔ ہمارے دوست نے ان کا تعارف یوں کرایا: "ان سے ملئے تیواری جی ہیں، یہ کالج ایجوکیشن کے ایکسپرٹ ہیں"۔ ہم نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا: "آپ کا تعلق کس کالج سے ہے؟" کہنے لگے "ممبئی کا ہر کالج اپنا ہے۔ آپ کے بچے کا کتنا ہی خراب رزلٹ کیوں نہ ہو میں اسے کسی بھی کالج میں ایڈمیشن دلاسکتا ہوں۔ کبھی خدمت کا موقع دیجئے گا"۔ آگے بڑھے تو ایک اور ماہر تعلیم سے تعارف ہوا۔ "یہ مسٹر مائیکل ہیں، بڑے مشہور سوشیل ورکر ہیں اور ممبئی کے تمام اسکولوں کے ماہر تعلیم ہیں"۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ کیا خدمات انجام دیتے ہیں اس لئے خاموش ہی رہے۔ اس کے بعد ہمارے دوست نے ایک بہت بڑی توند والے پہلوان سے ہمیں ملایا "یہ کلن بھائی ہیں۔ یہ ممبئی کے سب سے بڑے ماہر تعلیم ہیں"۔ ہم سمجھے یہ مناسب قیمت پر پی ایچ ڈی کرانے کا کام کرتے ہوں گے۔ میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں کے دلال ہوں گے۔ دریافت کیا تو ہمارے دوست زور سے ہنسے اور کہنے لگے "ارے بھئی پی ایچ ڈی تو بہت آسان ہے اور اس کا بھاؤ بھی کم ہے اور میڈیکل اور انجینئرنگ کیلئے کسی ماہر تعلیم کی ضرورت نہیں اس کے لئے صرف کھلے منہ کی

تھوڑی ہونا کافی ہے۔ ہمارے کلن بھائی کا کام تو سب سے زیادہ مشکل ہے۔ یہ نرسری اور کے جی داخلے کے ایکسپرٹ ہیں۔ آج کل جو آدمی یہ کام کرا سکتا ہے وہی سب سے بڑا ایجوکیشنل ایکسپرٹ ہے "۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ کو یہ واقعہ سن کر ہنسی آئی ہو یا نہ آئی ہو حیرت بالکل نہیں ہوئی ہوگی۔ اس لئے کہ تجارت کا یہ اصول ہے کہ وہ جس میدان میں قدم رکھ دیتی ہے وہاں بروکرز اور دلال خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب تو سنا ہے کئی اردو اکیڈیمیاں بھی ان ہی کے سہارے بحسن و خوبی چلائی جارہی ہیں۔ خیر یہ بھی کوئی حیرت ناک واقعہ نہیں ہے اس لئے کہ ہر ریاست میں برسر اقتدار سیاسی پارٹی اسی مقصد کے تحت اردو اکیڈیمی کی تشکیل کرتی ہے کہ اردو والے اس کھلونے سے دل بھی بہلاتے رہیں اور ان کی پارٹی میں جتنے غیر تعلیم یافتہ ماہرین تعلیم ہیں انہیں روزگار بھی میسر آجائے اور وہ اکیڈیمی کے ممبر بن کر علم و ادب کی خدمت کے ذریعے اپنے خاندان کی کفالت کرتے رہیں۔

لیکن پچھلے ہفتہ ہمیں سچ مچ حیرت اس وقت ہوئی جب ہماری بیگم کسی نئی پارٹی سے لوٹ کر آئیں تو ان کا منہ پھولا ہوا تھا۔ آتے ہی پھٹ پڑیں۔

"میں آپ سے کتنے زمانے سے کہہ رہی ہوں کہ دفتری کام کے علاوہ بھی کچھ کیا کیجئے جس سے شہرت اور دولت حاصل ہو۔ یہ خالی خولی مروت سے کب تک کام چلے گا؟ اب یہی دیکھئے میری ہر سہیلی کا شوہر پارٹ ٹائم سیاسی لیڈر ہے یا ماہر تعلیم"۔

"لیکن بیگم، سیاست کے لئے غنڈہ گردی کے جو گر سیکھنے پڑتے ہیں ہم اس سے نابلد ہیں اور اسکول اور کالج کے داخلے کرانا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے اس لئے ہم ماہر تعلیم بھی نہیں بن سکتے" ہم نے اپنا دفاع کیا۔

بیگم کہاں ماننے والی تھیں۔ کہنے لگیں: "آپ طنز و مزاح لکھنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اسکول کی درسی کتابوں کے اسباق نقل کر کے اخبارات میں اپنے نام سے شائع کرائیں تب ہی آپ ماہر تعلیم بن سکتے ہیں"۔

ہم نے عرض کی "آج اردو اخبارات بڑے بوڑھے بھی نہیں پڑھتے تو اسکول کے طالب علم کیا پڑھیں گے۔ وہ تو اپنا سبق درسی کتاب میں بھی نہیں پڑھتے۔ اس کے لئے کوچنگ کلاسز اور پرائیوٹ ٹیوشن ہی کافی ہوتے ہیں"۔

بیگم نے پھر کوشش کی اور فرمایا: "پھر آپ کسی سوشیل ادارے کی بنیاد ڈالئے اور اس کے تاحیات صدر بن جائیے۔ مسز حسین کے شوہر نے یہی کیا اور اپنے ادارے سے غریب طلباء کے لئے مفت کلاسس جاری کردیں۔ اب انہیں اسمگلروں اور تاجروں سے عطیات بھی مل جاتے ہیں اور وہ خود ماہر تعلیم بھی مانے جاتے ہیں"۔

ہم نے مایوسی سے سر ہلایا اور جواب دیا: "کسی سوشیل ادارہ کو قائم کرنا تو بہت آسان ہے یوں بھی ہماری قوم میں مسائل اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنی فلاحی انجمنیں ان مسائل کو حل کرنے کے لئے موجود ہیں۔ لیکن یہ اسکول کالج کے طلباء کے لئے مفت کلاسس چلانا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے"۔

وہ پھر بھی نہیں مانیں اور میز پر مکا مارتے ہوئے کہنے لگیں: "پھر آپ آئی اے ایس، ایم بی بی ایس اور انجینئرنگ کے طالب علموں کے لئے مفت کلاسس چلائیے"۔

ہم حیرت زدہ ہوگئے "بیگم ہم ایسا معمولی شخص اعلیٰ تعلیم کی کلاسس کیسے چلا سکتا ہے؟" وہ خفا ہو گئیں۔ "مسز خان کے شوہر تو نان میٹرک ہیں۔ دن میں ٹیکسی چلاتے ہیں اور رات میں آئی اے ایس بننے کے خواہش مند طلباء کے لئے مفت کلاسس چلاتے ہیں۔ آپ اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ جو لوگ نوبل پرائز ہر سال طے کرتے ہیں وہ خود نوبل انعام یافتہ تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ بھارت رتن، پدم

بھوشن اور پدم شری دینے والے سیاست دانوں کے پاس تو کوئی خطاب یا ایوارڈ نہیں ہوتا ہے۔ پھر ماہر تعلیم بننے کے لئے تو آج ضروری ہے کہ آپ کم پڑھے لکھے ہوں۔ میرے خیال سے تو آپ اس معیار پر پورے اترتے ہیں"۔

ہم ان تعریفی کلمات سے خوش تو ہوئے پھر بھی ہم نے ہمت نہیں ہاری، بیگم آپ کے پاس یا آپ کی سہیلیوں کے پاس یا ان کے شوہروں کے پاس ماہر تعلیم بننے کا کوئی اور آسان نسخہ نہیں ہے؟"

جھنجلا کر کہنے لگیں: "پھر آپ صرف چندہ جمع کیجئے اور ہر سال اپنے فلاحی ادارے کی جانب سے اسکول اور کالج کے گمنام اساتذہ کو "بہترین ٹیچر" کا ایوارڈ تقسیم کیا کیجئے۔ ہر انعام یافتہ ٹیچر آپ کو اس خطا کا معقول معاوضہ بھی دے گا اور آپ چند برسوں ہی میں ماہر تعلیم کہلائے جانے لگیں گے"۔

ہم نے اپنی قابل بیگم کے مشوروں پر کتنا عمل کیا یہ تو ہم آپ کو بعد میں بتائیں گے۔ لیکن پہلے یہ سنئے کہ ان کی باتیں سن کر ہمیں ایک تاریخی واقعہ یاد آگیا۔ علامہ اقبال سے ایک مرتبہ انگریز وائسرائے نے پوچھا تھا کہ شمس العلماء کا خطاب کسے دیا جائے تو انہوں نے فوراً اپنے استاد کا نام لیا تھا۔ چوں کہ انگریز وائسرائے علامہ اقبال کے استاد سے واقف نہیں تھے اس لئے اس نے دوبارہ پوچھا کہ وہ کیا ان کی کوئی تصنیف، کوئی کتاب ہے؟" اس پر علامہ اقبال نے فوراً جواب دیا کہ میرے استاد کی تصنیف، ان کی لکھی ہوئی کتاب میں خود ہوں"۔

آج کل شمس العلماء پیدا ہونے اس لئے بند ہوگئے ہیں کہ ان کی جگہ جدید ماہرین تعلیم نے لے لی ہے۔ اسی لئے اب کوئی علامہ اقبال بھی نہیں بنتا لیکن آج کسی طالب علم سے یہ پوچھا جائے کہ امسال بہترین استاد کا انعام کسے دیا جائے تو وہ فوراً اپنے کوچنگ اسکول کے لکھ پتی پرنسپل کا نام لے گا۔

بہر حال چلتے چلتے ہم یہ بتادیں کہ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تو ماہر تعلیم نہیں بن سکتے لیکن اگر ہمارے بچوں کو گرایجویشن میں امتیازی نمبر نہ ملے اور انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی بھی اچھے کورس میں داخلہ نہ ملے تو ہم انہیں ضرور ماہر تعلیم بننے کی ترغیب دیں گے!

مصطفیٰ علی بیگ

یہ آرزو عجب ہے دلِ بے قرار میں
پٹرول کی طرح سے جلوں اُنکی کار میں

مجھ سے رہے ہیں آپ سیپریٹ[1] عمر بھر
مرنے کے بعد کیوں نہ رہیں اِک مزار میں

شاعر نے لائف[2] مانگ کے لائی تھی فورڈیز[3]
دو عاشقی میں کٹ گئے ٹوڈیز بار[6] میں

جب سے ہمارے شہر میں سیلنگ[4] لگ گئی
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

جانے ڈیسیز[5] کونسی گلشن میں آگئی
مرجھا رہے ہیں پھول بھی فصلِ بہار میں

کرفیو سے کچھ زیادہ ہی فکر ہے مجھے
گھر بھی مرے رقیب کا ہے کوئے یار میں

چندہ جو عُرس کا تھا وہ سجادے کھاگئے
مرشد تڑپ کے رہ گئے اپنی مزار میں

آنیسٹ خود کو پوز کریں بھی تو کیا ہوا
رشوت کی بُو تو آنے لگی ہے ڈکار میں

کچھ دلبروں کے نام بھی ہونٹوں پہ آگئے
یوں راز کھل گئے ہیں ہمارے بخار میں

(1) SEPERATE (2) LIFE (3) FOUR DAYS
(4) SEALING (5) DISEASE (6) BAR

بازغ بہاری (کلکتہ)

تری شان جل جلالہ

ترے بس میں ہے مری آبرو تری شان جل جلالہ
مجھے چاہے جیسے نچائے تو تری شان جل جلالہ
میں ہوں شاعروں میں جو خوش گلو تو مشاعروں میں ہوں سرخرو
تو نے بخشی عزت و آبرو تری شان جل جلالہ
یوں تو شیخ اہل زبان ہے وہ سراپا فن کی دکان ہے
مگر عضو کو وہ پڑھے غضو ، تری شان جل جلالہ
وہ جو سر پہ تاجِ خطاب ہے تو وہ بازغ عالی جناب ہے
ہے گدھا بھی وہ مدظلہ ، تری شان جل جلالہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سنیل کمار تفّ عنایت پوری
سیوان (بہار)

قطعات

(۱)

اے تفّ آپ ذکر روایت چھوڑیئے
دورِ جدید میں وہ مقولہ نہیں رہا
ہم فارسی تو پہلے ہی پڑھنے سے رہ گئے
اب تیل بیچنے کا بھی دھندا نہیں رہا

(۲)

مرغ بریانی بھلا کھائے گا اپنے گھر میں کون
اس گرانی میں ترستے ہیں سبھی آہار کو
پیاز کی قیمت بڑھی تو صبح کے ہر بانگ میں
مرغ دیتے ہیں دعائیں ان دنوں سرکار کو

(۳)

اک حسینہ اس طرح پوشیدہ اس کے دل میں ہے
جیسے پاکستان کا گھس پیٹھیا کرگل میں ہے
عشق کا بم پھینک کر بولا کنوارا ٹائیگر
"دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے"

نیتا جی سلام

سنیل کمار تنگ عنایت پوری
سیوان (بہار)

ایک نیتا کو گدھا میں نے جو محفل میں کہا
سن کے یہ موصوف کے غصے کا پارہ چڑھ گیا

کان کچھ اسٹیل کے چمچوں نے ان کا بھردیا
جاکے نیتا نے عدالت میں مقدمہ کردیا

میں ہوا حاضر تو منصف نے کیا مجھ سے سوال
کیا کسی نیتا کی عزت کا نہیں تم کو خیال

اس عدالت میں جواب اب دو سمجھ کر سوچ کر
کوئی نیتا کیسے آتا ہے گدھا تم کو نظر

میں نے نیتا کے عمل کی کھول کر رکھ دی کتاب
پھر بھی منصف کو پسند آیا نہیں میرا جواب

تب عدالت نے کہا تم نے جو کی ہے یہ خطا
اس لئے میں دے رہا ہوں جیل کی تم کو سزا

میں نے منصف سے یہ پوچھا اپنے سر کو کر کے خم
کیا گدھا نیتا کو کہہ دینا خطا ہے محترم

مجھ سے منصف نے کہا ہاں! ایسی حرکت جرم ہے
اک بھلے انسان کی توہین عزت جرم ہے

تب یہ پوچھا کیا گدھا کو نیتا کہہ سکتا ہوں میں
ایسا کہنا چاہتا ہوں ایسا کہہ سکتا ہوں میں

تھا جواب ان کا کہ ہاں تم شوق سے ایسا کہو
چھوٹ ہے تم کو گدھے کو بے جھجک نیتا کہو

کورٹ کے انصاف کا پھر یہ ہوا مجھ پر اثر
ہر گدھا آنے لگا تب سے مجھے نیتا نظر

میں نے سوچا کیوں رکھوں کدو پہ میں چاقو جناب
رکھ دوں چاقو پر ہی کدو دیکھ کر اپنا حساب

جیل جاتے جاتے نیتاجی سے میں نے یہ کہا
آپ کو الٹا سمجھ بیٹھا تھا میرے رہنما

اب کسی نیتا کو میں ممکن نہیں کہہ دوں گدھا
میں گدھے کو ہی بھلے نیتا کہونگا بار با

سامنے آکر گدھے کے میں ہوا یوں ہم کلام
اور ادب کے ساتھ یہ بولا کہ نیتا جی سلام

محبوب الرحمن فاروقی
مدیر آج کل (دہلی)

اردو پروفیسروں کی داستان غریب حمزہ

جی ہاں! میں یونی ورسٹی میں شعبہ اردو کا پروفیسر اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ ہوں ۔ میرے نام اور عہدے سے فائدہ اٹھاکر سیمناروں کی اہمیت بڑھانے کے لئے میری فیس صرف پانچ سو روپے ہے ۔ باقی آپ کی اس تنظیم کے لئے میرا نام اور میرا عہدہ جس حد تک فائدہ مند ہو سکتا ہے اسی حساب سے میری فیس بھی مختلف کاموں کے لئے مختلف ہو سکتی ہے ۔ مثلاً آپ کے یہاں ہر ماہ ہونے والی دس پندرہ غیر ضروری میٹنگوں میں شرکت کے لئے DA، TA اور لنچ کے ساتھ جو فیس آپ دیتے ہیں وہ قابل قبول ہوگی ۔ کتابوں کے لئے مضامین لکھنا تو میرے لئے باعث شرم ہوگا لیکن ابتدائیہ ، پیش لفظ اور اس طرح کی دوسری چیزیں لکھ سکتا ہوں ، میری مرتب کردہ کتابوں کی اشاعت کے لئے میرے عہدے کے مطابق اگر آپ جائز معاوضہ دیں گے اور اسی طرح کی اور دوسری چیزوں کے لئے اگر آپ مجھے برابر استعمال کرکے مالی فائدہ پہنچاتے رہیں گے تو اس میں آپ کا بھی متناسب کمیشن شامل ہوگا ۔ یہ نہ بھولیے کہ میں اس بڑی یونی ورسٹی کا نہ صرف پروفیسر بلکہ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ بھی ہوں ۔ ہندوستان کی سبھی یونیورسٹی کے پروفیسروں ، ریڈروں اور لکچراروں سے میری ذاتی دوستی ہے ۔ میں ان سب کو وقتاً فوقتاً مختلف طریقوں سے مختلف کاموں کے ذریعہ مالی فائدہ پہنچاتا رہتا ہوں ۔ مثلاً کبھی امتحان کی کاپیاں جانچنے کے لئے ، کبھی امتحانات کے پرچہ بنوانے کے نام پر ، کبھی ماڈریشن اور نصابی کتابوں کے جائزے کے لئے کمیٹی میں شامل کرکے ، کبھی ایم فل اور پی ایچ ڈی کے Viva کے لئے ، کبھی تھیسیس کا ممتحن بناکر ، کبھی شعبہ کی طرف سے ہونے والے سیمناروں اور دیگر کمیٹیوں میں بلاکر میں انہیں مالی فائدہ پہنچاتا ہوں اور بدلے میں وہ بھی مجھے مالی فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں ۔ اس طرح میرے تعلقات وسیع ہیں آپ کوئی کتاب کوئی مضمون شائع کریں گے یا میٹنگوں میں ہونے والی روداد شائع کرائیں گے تو میرے یہ سارے دوست و احباب آپ کی تعریف میں ہزاروں خطوط لکھیں گے اور جو کتابیں آپ کے یہاں سے شائع ہوں گی ان پر ایسے شاندار تبصرے شائع ہوں گے جن سے آپ نہ صرف اپنے عہدے پر ایک عرصے تک برقرار رہیں گے بلکہ وزارت میں بھی آپ کو کافی شاباشی ملے گی ۔ میں آپ کو فائدہ پہنچاؤں اور آپ مجھے ۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے ۔ یہی دنیا کا دستور ہے ۔ ہمارے شعبے میں بلکہ ہر جگہ شعبہ اردو میں لگا ہوا پروفیسر ، ریڈر اور لکچرر یہی کام کرتا ہے ۔ ہمارے پاس ریسرچ اسکالروں کی ایسی فوج ہوتی ہے جنہیں جب جہاں اور جس طریقے سے چاہیں استعمال کر سکتے ہیں ۔ رہی بات شعبوں میں پڑھانے کی تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ جہاں اتنے اہم کام در پیش ہوں وہاں پڑھنے میں اپنا وقت کون برباد کرے ۔ جب کوئی طالب علم تنگ کرتا ہے تو ہم کلاسوں میں جاکر وہی اپنی طالب علمی کے زمانے کے نوٹس جنہیں ہمارے استاد نے لکھایا تھا انہیں بھی لکھا دیتے ہیں ۔

باقی جو وقت بچتا ہے وہ ہم شعبہ میں ایک دوسرے کے خلاف سازش کرنے، ٹانگ کھینچنے اور مزید مالی فائدے کے لئے کس پر ڈورے ڈالے جائیں اس طرح کے منصوبے بنانے میں خرچ کرتے ہیں سچی ہاں! کیونکہ یہ سارا کام اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے کے حساب سے چلتا ہے اس لئے طالب علم امتحان کی کاپیوں میں جو لکھتے ہیں اور ایم فل یا پی ایچ ڈی کے لئے جس طرح کی وہ تھیسس ادھر ادھر کی کتابوں سے نقل کر کے جمع کرتے ہیں انھیں پڑھنے اور جانچنے کے لئے ہم میں سے کسی کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ ہم میں اور طلباء کے درمیان ایک غیر تحریری سمجھوتا ہوتا ہے کہ جو طالب علم ہمیں مختلف طریقوں سے فائدہ پہنچائیں گے یا ہمارے گھروں پر کام کاج کریں گے ان کے بارے میں ہم اپنے طے شدہ ممتحن کو خط لکھ دیتے ہیں یہ اسے اسی حساب سے نمبر ملتا ہے یا اس کی تھیسس Approve ہو جاتی ہے۔

جی ہاں میں دہلی کی ایک قدیم ترین یونیورسٹی کا پروفیسر ہوں۔ اگر چہ میں اس وقت شعبہ کا ہیڈ نہیں ہوں لیکن بوقت ضرورت، گر سیمناروں کے لئے میرے نام کی ضرورت ہو تو آج بھی میرے نام کے آگے آپ ہیڈ لکھ سکتے ہیں سچی ہاں! میں بہت مذہبی آدمی ہوں اس لئے اس طرح کی دروغ گوئی کو میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میرے نام سے کسی شخص کو مالی فائدہ پہنچ رہا ہے تو یہ میرا عین مذہبی فرض بنتا ہے کہ میں اس کی مدد کروں (کیونکہ اسمیں میرا بھی فائدہ ہوگا) رہ گیا سوال کہ موجودہ ہیڈ اس کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم لوگوں نے ان کے خلاف سازش کر کے ان کا جینا حرام کر دیا ہے۔ اب اس بے چارے کی کیا ہمت ہوگی۔ ساتھ ہی میں یہ بھی بتادوں کہ خود ہمارے شعبہ کے ایک ساتھی نے غیر تدریسی حلقے کی ایک خاتون کو اسٹیج پر بلا کر ان سے پیپر پڑھانے کے خلاف کس قدر واویلا مچایا تھا۔ مگر آپ نے خود ہی دیکھا کہ جب میں نے آپ کو ایم فل کے Viva کے لئے بلایا تو وہ شخص ہاتھ باندھ کر آپ کی حاشیہ برداری کر رہا تھا۔ کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس بات کے خلاف احتجاج کرتا۔ آپ نے دیکھا شعبہ میں آج بھی میری کتنی چلتی ہے۔ لہذا آپ سال میں اگر میرا مختلف طریقوں سے پچاس ہزار کے قریب فائدہ کر دیں تو میں آپ کے سامنے دو زانو ہو کر سر بہ سجدہ ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار ملوں گا۔

جی ہاں! میرا تعلق دہلی کے قریب مسلمانوں کی ایک بڑی مرکزی یونیورسٹی سے ہے۔ میں وہاں پروفیسر ہوں۔ پہلے میں اور پھر میرے ایک دوست ایک خود ساختہ پروفیسر کے حاشیہ بردار رہے ہیں اب آپ کا حاشیہ بردار بننے کو بخوبی تیار ہوں کیونکہ خود ساختہ پروفیسر سے ہمیں جو کچھ ملنا تھا وہ حاصل کر چکے اور آپ کی حاشیہ برداری کے ثبوت کے طور پر میں وہ خط پیش کر سکتا ہوں جسے آپ نے اپنے کالم اردو میں شائع کیا ہے۔ آپ نے خود ہی دیکھا ہوگا کہ آپ کے دو صفحے کے مضمون کی میں نے کس حد تک قصیدہ خوانی کی ہے۔ بس آپ مجھے میٹنگوں اور مختلف کاموں کے لئے بلاتے رہیں میں آپ کے لئے کسی درباری مصاحب سے کم نہیں ثابت ہوں گا۔

جی ہاں! میں ایک مشہور یونی ورسٹی کا نہ صرف پروفیسر بلکہ صدر شعبہ ہوں۔ میں نے گزشتہ سال دو بین الاقوامی سیمنار کرائے ہیں۔ ان کی رپورٹ آپ کو مل چکی ہوگی۔ میرا کارنامہ یہی نہیں کہ میں نے اس سیمناروں کے لئے مختلف جگہوں سے لوگوں کو بلا کر جمع کیا بلکہ میں نے تو کسی کو خرچ بھی نہیں دیا۔ نہ آمد و رفت کا نہ ہی پیپر پڑھنے کا۔ اس کے بعد بھی میری کتنی واہ واہی ہوئی۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ اس طرح کا سیمنار کرانے کا میرا جو تجربہ ہے وہ کسی اور کے پاس نہیں۔ میں آپ کے لئے اس طرح کے تمام کاموں میں بہت مددگار ہو سکتا ہوں۔ دیکھئے آپ ایسے پھنچر

مضامین کی اشاعت پر نہ جائیے ۔ جن میں شمالی ہند میں اردو زبان کی کسمپرسی کی داستان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا ۔ ایسا ایک مضمون حال ہی میں ایک روزنامے میں شائع ہوا ہے جس میں مضمون نگار نے اردو پڑھنے پڑھانے پر طنز کیا ہے ۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اب داغ اور امیر مینائی کی شاعری کو پڑھ کر بچوں کو کیا حاصل ہوگا ۔ آپ ہی بتائے اگر اسی طرح کی سازش چلتی رہی تو اردو کے شعبوں میں داخلہ کون لے گا اور شعبہ کیسے چلے گا ۔ جی ہاں میں تو اس معاملے میں احتیاط کرتی ہوں کہ ہمارے یہاں جرنلزم کا جو کورس چلتا ہے اس میں داخلے کے لئے ایک ایسے ادارے سے ایک خاتون تشریف لائی تھیں جہاں میرے شاگرد جو میرے وفادار نہ ہو کر دوسروں کے وفادار ہیں ، بھی کام کرتے ہیں ۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس خاتون کے مضامین تمام بڑے چھوٹے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں اور اس نے اردو میڈیم سے بی ۔ اے اور ایم ۔ اے کے امتحانات بھی پاس کئے ہیں لیکن چونکہ اس نے بی ۔ اے میں اردو ادب بطور اختیاری مضمون نہیں لیا تھا اس وجہ سے میں نے ان کا داخلہ نہیں لیا ۔ اس طرح اپنے ان نالائق شاگردوں سے بھی انتقام لیا ۔ دیکھا آپ نے میں کس طرح لوگوں سے انتقام لیتا ہوں ۔ یہ اس کی ایک جھلک تھی ۔ میرے رہتے ہوئے کس کی مجال ہے کہ آپ کے خلاف کوئی دبی زبان سے بھی کچھ کہہ سکے ۔ لہٰذا میری اس وفاداری کا معاوضہ آپ اسی حساب سے ادا کریں ۔ رہ گئی بات ہم سب کو ماہانہ ملنے والی تیس پینتیس ہزار تنخواہ کی تو وہ ہمیں صرف اس جوڑ توڑ اور سفارش کی بدولت ملتی ہے جو ہم نے یونیورسٹی میں تقرری کے وقت کیا تھا ۔ آپ اطمینان رکھیں ہم نے اسی لئے اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دی کیونکہ اردو سے فائدہ اٹھانے کے لئے بہت تیز طرار اور شاطر ذہن کی ضرورت ہوتی ہے ۔

حضور آپ نے ہم سب کی کارگزاری کی مختصراً الگ الگ داستان سنی ۔ اب ہم سب ملکر آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ چونکہ آپ اردو کے کمپیوٹرائزڈ پروموٹر ہیں آپ کے کمپیوٹر پر اردو کے ہر ادیب اور پروفیسر کا Bio Data موجود ہے ۔ سب کی قیمت بھی لکھی ہے ۔ آپ خود دیکھ لیں کہ ان میں سے ہم سے بہتر طریقے سے آپ کی خدمت کون کر سکتا ہے ۔ حضور آپ کا سالانہ بجٹ تو کئی کروڑ کا ہے ۔ اس میں صرف تین لاکھ ہمیں دے دیں ۔ ہمارا فائدہ ہوگا تو اردو زبان کا بھی فائدہ ہوگا ۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ آزادی کے بعد سے اردو کے نام پر ملنے والی گرانٹ کا استعمال اردو والے صرف اپنے فائدے کے لئے ہی کرتے رہے ہیں ۔ اردو والوں کا فائدہ ہی آپ کا بھی مقصد ہے ۔ ہمیں خرید لیجیے ۔ ہمارا فائدہ کرا لیجیے ۔ پھر ہماری بود و باش دیکھ کر لوگ خود ہی اردو کے نام سے فائدہ اٹھانے کے لئے آگے آئیں گے ۔

یہ ایک عمومی صورت حال تھی جو ہماری جامعات کے شعبہ اردو میں پائی جاتی ہے ۔ اب آپ اسی سے اندازہ کرلیں کہ وہ اپنے پیشے کے تیں یا رزق حلال کی طرف کتنے دیانت دار ہو سکتے ہیں ۔ انسان کی دیانت معمولی سے معمولی چیزوں سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ ڈھکی چھپی بات بھی نہیں کہ سیمناروں اور جلسوں میں شرکت کے لئے نیز ممتحن بنکر ادھر ادھر آنے جانے کے لئے یا ریڈیو یا ٹی وی پروگراموں میں شرکت کے لئے آنے جانے کے لئے آمد و رفت کا کرایہ فرسٹ کلاس کا ملتا ہے ۔ لیکن نناوے فیصد حضرات سکنڈ کلاس میں سفر کر کے فرسٹ کلاس کا کرایہ حاصل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور یہ روایت تو بزرگوں کے دور سے ہی چلی آ رہی ہے ۔

شاہاں ! ہم میں سے کوئی بھی دیانت دار نہیں ہے ۔ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں یہ تو آپ سب کو معلوم ہی ہے ، تو درس و تدریس میں کیسے کوئی دیانت دار ہو سکتا ہے ۔

جی ایم احمد خواہ مخواہ (ممبئی)

خود نوشت

مجھ سے سنئے جناب میں کیا ہوں　　　بہتے دریا میں ایک تنکہ ہوں
کل اکیلا ہی سب کے ساتھ تھا میں　　　آج بھی سب کے ساتھ تنہا ہوں

کم و بیش ۵۰ سال سے طنز و مزاح کی دشت نوردی میں مبتلا ہوں اسی آوارگی نے، عرصہ ہوا کسی ایک جگہ مستقل طور پر مقیم رہنے نہیں دیا بلکہ بر اعظموں تک کی خاک چھنوائی۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ اپنے وطن میں منعقدہ مشاعروں میں بھی مہمان شاعر کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا ہوں

یہ جانتا گر، تو وطن چھوڑتا نہ میں

ممبئی میں برائے نام مقیم رہتا ہوں۔ جب سے وطن کا آب و دانہ چھوٹا ہے تب سے مختلف ممالک کے ساگ و دانہ پر گزارہ ہے۔ میرے مداح جب میرے مستقل ٹھکانے کا پتہ پوچھتے ہیں تو انہیں یہی جواب دیتا ہوں

نہ دل میں اور نہ کسی کی نظر میں رہتا ہوں　　　نہ گاؤں میں نہ کسی بھی شہر میں رہتا ہوں
سفر ہے میرے تعاقب میں خواہ مخواہ کب سے　　　اسی کے ڈر سے ہمیشہ سفر میں رہتا ہوں

یا پھر یہ جواب کہ

شاعری نے جب مجھے اپنا نہیں رہنے دیا　　　میں نے اس کو بھی کسی در کا نہیں رہنے دیا
زندگی بھر اس نے معروف سفر رکھا مجھے　　　گھر دیا ہے مگر گھر کا نہیں رہنے دیا

تقریباً ستر بہاریں، برساتیں اور خزاں کے موسم مجھ پر گزر چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ

سفر کا نام بدل کر قیام رکھا ہے　　　ہنسی مذاق میں کیا خوب نام رکھا ہے
مرے بدن کا مکاں کب کا گر گیا ہوتا　　　اسے تو صرف ظرافت نے تھام رکھا ہے

ان دنوں عموماً جو مزاحیہ شاعری سننے میں آ رہی ہے وہ سماعت پر ہی نہیں طبیعت پر بھی گراں گزرنے لگی ہے اور یہ تلخ حقیقت طنز، ظرافت جیسی نازک صنف کے لئے نیک فال نہیں ہے

ہنگام کون سا ہے جو برپا نہیں ہوا　　　وہ کون ہے جو بزم میں رسوا نہیں ہوا
وہ راز کون سا ہے جو افشا نہیں ہوا　　　بے جا کسی کے عیب کا چرچا نہیں ہوا
اشعار بے تکے بھی پڑھے اور سنے گئے　　　طنز و مزاح کے نام پر کیا کیا نہیں ہوا
میں بھی تھا خواہ مخواہ اسی وہم کا شکار　　　اب سوچتا ہوں جو ہوا اچھا نہیں ہوا

اب آخر میں ایک گزارش ہے

عمر کے ساغر کو بھرنے دیجئے　　　چین سے اب مجھ کو مرنے دیجئے
شاعری کب تک کروں میں خواہ مخواہ　　　اب تو اللہ اللہ کرنے دیجئے

غوث خواہ مخواہ (ممی)

غزل

چھپی نادانیوں میں جو میری ہشیاریاں ہیں
کبھی آسانیاں ان سے کبھی دشواریاں ہیں

مرے اشعار معنی سے مرصع کیوں نہ ہوں گے
یہ سب میرے قلم کے ذہن کی گلکاریاں ہیں

مرے افکار تازہ یوں نظر آتے ہیں جیسے
حسیں پھولوں کی، گلزار ادب میں کیاریاں ہیں

ضرورت کے مطابق روشنی دیتے ہیں سب کو
کبھی جگنو، کبھی شعلے کبھی چنگاریاں ہیں

الگ ہو ہی نہیں سکتے کبھی، اک دوسرے سے
مزاح و طنز کی آپس میں رشتہ داریاں ہیں

ہیں آنکھوں میں مری آنسو، تو زیر لب تبسم
مری، سب کو ہنسانے کی یہی تیاریاں ہیں

سر رہ بند آنکھیں بھی بچھائی جارہی ہیں
خیال یار کی کیا خوب خاطر داریاں ہیں

سرور بے خودی میں بھی قدم، ثابت قدم ہیں
تصور کے نشے کی بھی عجب سرشاریاں ہیں

سفر میں جو مجھے مصروف رکھتی ہیں ہمیشہ
یہ میرے تین فرزندوں کی برخورداریاں ہیں

ہے صبر و شکر جیسے تندرستی کی علامت
حسد، غیبت، تعصب روح کی بیماریاں ہیں

غرض مندوں کی دنیا میں نہیں غمخوار کوئی
دکھاوے یا تصنع کی سبھی غمخواریاں ہیں

ہمارے جذبہ حب وطن پر نکتہ چینی!
صریحاً دشمنان امن کی عیاریاں ہیں

حقوق و جان و مال اقلیت کی پامالی
یہ عمداً ملک کے دستور سے غداریاں ہیں

رعایا کی کبھی حق تلفیاں ہونے نہ پائیں
حکومت ہی کے سر یہ ساری ذمہ داریاں ہیں

محبت چھپ نہیں سکتی کسی طرح کسی سے
تو پھر کیوں خواہ مخواہ یہ ساری پردہ داریاں ہیں

یہ شعر و شاعری اک جان لیوا مشغلہ ہے
کہ فرصت بھی نہیں اور خواہ مخواہ بیکاریاں ہیں

رؤف رحیم (حیدرآباد)

غزل

میرؔ اور غالبؔ کی اب کیا آبرو ہے دوستو
ہے بڑا شاعر وہی جو خوش گلو ہے دوستو

اس کی بدنامی جہاں میں چار سو ہے دوستو
وہ ہے لیڈر وصف کا وہ گوکھرو ہے دوستو

اس طرح سے ان کی میری گفتگو ہے دوستو
میرے لب پہ آپ ان کے لب پہ تو ہے دوستو

گھر مہابھارت کا میداں ہو بہو ہے دوستو
ساس کے نقش قدم پر ہی بہو ہے دوستو

محترم استاد میرے دو بدو ہے دوستو
کب کہاں خطرے میں میرے آبرو ہے دوستو

مجھ کو بھی تم جانشینِ میرؔ کیوں کہتے نہیں
میرے شعروں میں بھی تو لفظ کبھو ہے دوستو

شعر استادوں کے گا کر چھا گیا ہے بزم میں
دور حاضر میں تو چیلہ ہی گرو ہے دوستو

کیسے بدلے گا گھٹالے اور گھپلے کا چلن
یہ تو لیڈر محترم کی اپنی خو ہے دوستو

مغربی تہذیب میں بچے ہوئے ماں سے جدا
ان سے (ن) بہتر جنگلوں میں کینگرو ہے دوستو

یا تو سرقہ یا تو چربہ یا کوئی بے ہودہ بات
تھو ہی کیا اس شاعری پہ آخ تھو ہے دوستو

کیا سنا پاؤں گا اپنے شعر اب تم ہی کہو
شام تک بھی جب کہ معدہ میں خلو ہے دوستو

بھائی بھائی لڑ رہے ہیں ایک دوجے سے یہاں
کیسا یہ گندی سیاست کا فلو ہے دوستو

پاؤں تو دو ہیں مگر اوصاف چوپایوں کے ہیں
شہر سارا جیسے انسانوں کا زو ہے دوستو

باتوں باتوں میں نئی اک بات کہہ جاتے ہیں ہم
کیا ہماری شاعری بھی فالتو ہے دوستو

یہ ہے بیوٹی پارلر کی مہربانی کیا کریں
کس قدر کالی تھی کتنی سرخ رو ہے دوستو

یہ غلو مجھ کو گوارا ہے جو کہتے ہیں مجھے
خوش مزاج و خوش لباس و خوش گلو ہے دوستو

بیچ دیتا ہوں مگر آتا ہے گھر کو لوٹ کر
میرا بکرا بھی بہت ہی پالتو ہے دوستو

اس کی شادی تو کسی طراز سے کروں گا میں
میرا لڑکا واقعی اک جنگجو ہے دوستو

سن کے میرے شعر پوچھا بحر ہے یہ کونسی
اس طرح خطرے میں میری آبرو ہے دوستو

سن کے سب میرا ترنم بزم میں کہنے لگے
یہ جو گائیک ہے بہت ہی خوش گلو ہے دوستو

لوگ کہتے ہیں بڑا غالبؔ سے ہے شاعر رحیمؔ
کیا مری تعریف میں کوئی غلو ہے دوستو

پروفیسر حبیب ضیاء
(حیدرآباد)

عمر، استدلال اور انتقال

دوسروں کی عمر ایک ایسا ساز ہے جسے خواتین بھری محفل میں بیٹھ کر چھیڑتی ہیں۔ بعض خواتین کی عادت ہوتی ہے کہ ایک جگہ جمع ہوتے ہی اپنی لڑکی کو کم عمر بتانے کے لئے خاندان یا محلے کی دوسری لڑکیوں کی عمر کو بڑھا چڑھا کر بتاتی ہیں اور بے موقع موضوع نکال کر بحث شروع کر دیتی ہیں۔ ایک صاحبہ اسی طرح ایک محفل میں اپنی قریبی رشتہ دار سے بحث کر رہی تھیں۔ "تمھاری زہرہ میری شمیم سے علانیہ بڑی ہے۔" ادھر وہ حیرت زدہ ہو کر دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھی "تمھیں یاد نہیں کسی سے بھی پوچھ لو، زہرہ چھوٹی ہے"۔ جب بحث بڑھ گئی اور دوسری خواتین بھی دلچسپی لینے لگیں تو زہرہ کی اماں کو آسان ثبوت یاد آگیا انھوں نے پان کا بیڑہ چباتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ "اتنی پنچایت کیوں؟ زہرہ پیٹ میں تھی، تمھاری شمیم پاؤں پاؤں چلتی تھی"۔ اب بحث کرنے والی خاتون کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ لاکھ دلیلیں پیش کریں پیٹ میں رہنے اور پاؤں پاؤں چلنے کی دلیل سب پر بھاری ثابت ہوئی۔

ایک صاحبہ نے جو تابڑ توڑ جھوٹ بولتی ہیں، ۳۰ سالہ لڑکے کی شادی کے وقت اپنی عمر ۴۲ سال بتائی۔ حساب کی ماہر ایک خاتون نے احتجاج کیا کہ آپ بارہ سال کی عمر میں ہرگز ماں نہیں بن سکتیں۔ خدا کے لئے کچھ تو بڑھایئے اپنی عمر۔ ڈھٹائی برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے اپنی عمر تو نہیں بڑھائی بیٹے کی عمر یہ کہہ کر کم کر دی کہ اسکول میں شرکت کے وقت زیادہ لکھوادی گئی تھی۔ "دانت نزلے سے گرگئے، بال دھوپ میں سفید ہوگئے، بینائی ٹی وی کی لعنت سے کم ہوگئی" ہم تو کہتے ہیں کہ ایسے جواز پیش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ آخر عمر ہے بڑھنا اس کا کام ہے۔ اس قسم کی صفائیاں ہم خواتین کو زیب نہیں دیتیں۔ یہ سوچ کر صبر کر لینا چاہیئے کہ مہنگائی کی طرح عمر پر بھی ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ بعض خواتین ضرورت سے زیادہ ہوشیاری بتانے کے لئے خود سے کم عمر ہم جماعتوں کا بار بار حوالہ دے کر بچھڑوں میں ملنا چاہتی ہیں۔ پرانی بات ہے، بس اسٹانڈ پر ایک صاحبہ نے دو چار آمنوں سامنوں کے بعد ضروری سمجھا کہ منہ کھولا جائے۔ بی۔ اے کامیاب کرنے کا سنہ پوچھا۔ پھر تعجب میں بناوٹ گھول کر کہا So senior - "So" میں اتنی شدت تھی کہ زوردار سیٹی بج گئی۔ زنانی سیٹی تھی، قریب کھڑے ہوئے چند نوجوانوں میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ لیکن جیسے ہی سیٹی کی ندامت سمجھ میں آئی۔ ایک منچلے نے مخاطب ہو کر کہا "اتنی! آپ سیٹی تو بہت اچھی بجالیتی ہیں"۔ یہ صاحبہ بہرحال ہم سے سینئر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میٹرک کے بعد بابل کا گھر چھوڑ کر پی کے نگر چلی گئی ہوں گی۔ اور پھر ہر سالانہ امتحان کے وقت امتحان ہال کی بجائے میٹرنٹی ہوم کا رخ کرتی ہوں گی۔

بعض خواتین ماضی کی یادوں کو سینے سے لگائے دن میں خواب دیکھا کرتی ہیں اپنی عمر کے ان دنوں کو گرہ میں باندھ کر رکھنے کے لئے عجیب حرکتیں کرتی ہیں۔ شادی کی ایک تقریب میں ہم نے بازو بیٹھی خاتون سے پوچھا۔ "دلہن کی والدہ کونسی ہیں" انھوں نے ایک جانب ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا وہ۔ ہم نے پوچھا وہ جو سفید چکن کا کرتا، گلابی ساڑی پہنے بیٹھی ہیں جواب ملا۔ "وہ نہیں، ان کے بازو جو ہلتی والی"۔ ہمیں اپنے کانوں اور آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ ہم کیا

سن رہے ہیں اور کیا دیکھ رہے ہیں ۔ سرخ جوہاشیہ ، کرن پھول ، لچھا ، زنجیر ، انگوٹھیاں پہنے ہوئے مہمانوں کا استقبال کر رہی تھیں ۔ ان کا ایک ہاتھ بار بار پلو کی طرف اٹھتا تھا جیسے وہ کچھ ڈھونڈ رہی ہوں ۔ کھوج کرنے پر پتہ چلا کہ انھوں نے اپنی شادی کا جوڑا پہن رکھا تھا ۔ اور اس فرضی کھوپرے کی بٹی کو ڈھونڈ رہی تھیں جو چالیس سال قبل ان کے گھونگھٹ میں باندھی گئی تھی ۔ اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ پانچ مٹھیوں تک لڑکی کو بوجھ اٹھانے کی پراکٹس کرائی جاتی ہے کہ آئندہ زندگی میں ہر قسم کے بوجھ تمہیں اٹھانے ہی ہیں ۔ بہر حال ـــــ جوہاشیہ پہن کر انھوں نے اپنی دانست میں عمر کو باندھ دیا ۔ غمازِ چہرہ کیا گل کھلائے گا ، یہ بات ان کے ذہن میں نہ آئی ۔ مرحومین کے متعلقین کو چاہیئے کہ کم از کم مرحوم کی صحیح عمر بتائیں اور اخبار میں اشاعت کے لئے تازہ فوٹو بھیجیں ۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ کسی کے انتقال کی خبر اخبار میں شائع ہوتی ہے تو پرانی تصویر دیکھ کر اجنبی لوگ کہتے ہیں بے چارے کی بے وقت موت ہوئی ۔ یا ان کی عمر ابھی مرنے کی نہیں تھی ۔ اول تو موت کے ساتھ لفظ بے وقت کا استعمال ہی سراسر لغو ہے ۔ دوسرے یہ کہ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جان بوجھ کر جوانی کی تصویر شائع کی گئی تھی تاکہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کی ہمدردی سمیٹی جاسکے ۔ شریف لوگوں کو دھوکہ دے کر ہمدردی بٹورنے کا یہ بھونڈا انداز ہے ۔

بعض متعلقین انتقال کی خبر کے ساتھ مرحوم کی پرانی ، سائڈ پوز والی ، ہنستی ہوئی تصویر شائع کرواتے ہیں ۔ گویا قہقہہ لگا کر کہہ رہے ہوں ہا ہا ہا ـــ دیکھو ـــــ ہم نے کیسی بے جگری سے داعئ اجل کو لبیک کہا ۔ جبکہ ان کی پرانی ماما پول کھولتی ہے کہ تقریباً چھ ماہ سے صاحب ملک الموت کے ڈر سے کمرے کا دروازہ بند کئے لیٹے رہتے تھے ۔ بعض متعلقین کی زبان سے بڑے دلچسپ مکالے انجانے میں ادا ہوتے ہیں ۔ کیسے انتقال ہوا ؟ بس ـــــ یہ سوال پوچھ کر کنجی دے کر چھوڑ دیجیئے ۔ ہر پوچھنے والے کو کچھ ایسا جواب ملتا ہے " اچھے خاصے تھے ۔ دوپہر میں کھانا کھائے ، زی ٹی وی پر دم دما دم پروگرام دیکھے ، ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول تھا بس ـــــ دیکھتے دیکھتے دم نکل گیا " ۔ گویا دم دما دم نہ دیکھتے تو اور سو سال جیتے رہتے ۔ میٹھے کی شوقین خواتین مرحوم کی خواہشات ، پسند ناپسند کا ذکر کرتے ہوئے بڑے فائدے اٹھاتی ہیں ۔ ایک صاحبہ ہفتہ میں ایک دن ڈبل کا میٹھا یہ کہہ کر بناتی ہیں کہ ان کے مرحوم شوہر بہت شوق سے کھاتے تھے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سب جدھر کے ادھر ہوجانے کے بعد خود ڈٹ کر کھاجاتی ہیں ۔ غریبوں کو کھلاتی نہیں ، چکھاتی ضرور ہیں ۔

ایک پتے کی بات جس سے واقفیت ضروری ہے وہ یہ کہ اکثر شادی شدہ خواتین اپنے گھر سے زیادہ اپنے میکہ ، خصوصاً بھائی کے گھریلو معاملات میں دلچسپی لیتی ہیں ۔ بلکہ بے جا دخل اندازی کرتی ہیں ۔ اس کا مقصد بھائی کی ازدواجی زندگی کو تباہ کرنا ہوتا ہے ۔ یہ دخل اندازی روزمرہ زندگی سے لے کر خوشی اور غم ہر دو مواقع پر بھی ہوتی ہے ۔ ایک گھر میں کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا ۔ ہوا یوں کہ ساس کی برسی کے موقع پر ہونے گھر کا بجٹ دیکھ کر مناسب جانا کہ بگھارے کھانے پر فاتحہ دے دی جائے ۔ نند صبح سے بھوکی رہ کر آئی تھی بریانی کی خوشبو نہ پاکر واویلا مچادیا ۔ ہمارے مردے بگھارا کھانا نہیں کھاتے ۔ کیوں نہیں کھاتے ؟ جب لکھ پتی زندے چارہ کھاسکتے ہیں تو ہم جیسے قلاشوں کے مردے بگھارا کھانا کیوں نہیں کھاسکتے ؟

یہ بحث گھر ہی میں ختم ہوجاتی تو کوئی بات نہ تھی حضرات جب شہر خموشاں گئے تو وہاں یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ وہاں بھی الجھ گئے ۔ اس شہر کے بزرگ جوڑے نے بہت برداشت کیا ۔ جب بحث بڑھ گئی تو دونوں نے ہم آواز ہو کر کہا ۔ " لڑو مت ہم دونوں نے اپنا لنچ لے لیا ہے ، ہوٹل کرشنا اوبرائے میں ـــــــ ! "

رشید عارف
پٹنہ

غزل

لٹیرا اور صورت رہنما کی
لنگوٹی بھی نہیں چھوڑی گدا کی

بھتیجے پوچھتے ہیں خیریت یوں
اڑاتے ہیں ہنسی گویا چچا کی

تری زلفوں سے کھیلے کوئی گنجا
یہ ناقدری تری زلف رسا کی

گلی میں جب جفا پیشہ کی پہنچے
حجامت بن گئی اہل وفا کی

کچھ اتنی زور سے اک چھینک آئی
کہ گرہیں کھل پڑیں بند قبا کی ۔

دوپٹہ لے گئی ان کا اڑا کر
شرارت دیکھئے سنکی ہوا کی

ادا کردیں گے اپنی جان دے کر
بڑھی ہے اس قدر قیمت دوا کی

اچھل کر گر پڑے بونے زمیں پر
مرا قد ناپنے کی جب خطا کی

سیاست میں تو بیٹے نے بھی عارف
خود اپنے باپ سے اکثر دغا کی

اقبال شانہ

[redacted]

ہیں تصور میں آپ کے جوتے
نرم و نازک سے تنے جوتے

آپ نے پیار سے جو مارا تھا
پھول جیسے مجھے لگے جوتے

نام پوچھا جو اک پری وش کا
اس نے مجھ کو دکھا دیئے جوتے

لگ گئی ہے بری نظر شاید
چار دن میں ہی پھٹ گئے جوتے

یوں ہی چلتا نہیں وہ لنگڑا کر
کاٹتے ہیں بہت نئے جوتے

دوستو عید کی نماز کے بعد
لاکھ ڈھونڈا نہیں ملے جوتے

کام آسان ہے بہت پیارے
مسجدوں سے چرا نئے جوتے

پاؤں رستے میں رہ گئے لیکن
منزلوں پر پہنچ گئے جوتے

لوگ حیراں ہوگئے میں نے
ہاتھ میں جب پہن لئے جوتے

شرم آئی بہت مجھے میری
مفلسی پر جو ہنس دیئے جوتے

شاعری کررہا ہوں میں شانہ
سامنے سے ہٹا مرے جوتے

اقبال ہاشمی
چھاونی غلام مرتضیٰ حیدرآباد

قطعات

(۱)

یا جنازہ تو ان کا اٹھا دے خدا
یا مجھے ان کی بیوہ بنا دے خدا
میرے شوہر کو شاعر سے انسان بنا
تو خدا ہے یہ کرکے دکھا دے خدا

(۲)

بڑی بے وفا اپنی بینائیاں ہیں
یہ بینا نہیں ان کی پرچھائیاں ہیں
انہیں مفت ملتی ہے ہر چیز لیکن
ہمارے مقدر میں مہنگائیاں ہیں

(۳)

ایک ہی رٹ ہے تمہیں دن ہو کہ رات
فاعلاتن فاعلاتن فاعلات
بے تحاشا لوٹتے ہو محفلیں
گھر پہنچے ہو مگر تم خالی ہاتھ

اب تو بن گئے لیڈر ہم

جب تک مرے قبضے میں منسٹر کا پسر ہے
حالات کا ڈر ہے نہ حوالات کا ڈر ہے

قانون ادھر ہے تو ادھر طاقت زر ہے
اخلاص ادھر ہے نہ تو اخلاص ادھر ہے

جنت ہے وہی ، پھر وہی ممنوعہ شجر ہے
در پیش مجھے پھر سے زمینوں کا سفر ہے

اب اسکی تجوری میں مرا مال ہے زر ہے
یہ صرف "بلاسود" چھلاوے کا اثر ہے

رشوت ہے اِدھر اور اُدھر ترچھی نظر ہے
دل میرا اِدھر ہے تو نظر میری اُدھر ہے

چیلوں کو خبر ہے نہ تو بابا کو خبر ہے
جو حسن پہ پڑتی ہے وہی حسن نظر ہے

دنیائے سخن میں نہیں ملتا تو فقط شش
گردہ ہے کوئی ، دل ہے کوئی ، کوئی جگر ہے

ہر شخص مجھے ہاتھی دے دیتا ہے تر
یہ میرا نہیں ہے مری تکوی کا اثر ہے

[...]الدین توفیق
حیدرآباد

چچا

کبھی سڑک پر گزرتے ہوئے آپ نے ایک کرخت اور اونچی آواز میں لفظ چچا سنا ہوگا اور ساتھ میں ایک زوردار تالی بھی۔ دراصل عام طور پر جاہل اور نچلے طبقہ میں اپنے سے بڑی عمر کے جان پہچان والے شخص کو جو سڑک پر تھوڑے فاصلہ پر اچانک نظر آجاتا ہے مخاطب اور اپنی طرف متوجہ کرنے کا یہی طریقہ ہے یہ مخاطبت اس طبقہ میں بہت عام ہے مگر جب اس طبقے کے حضرات اپنے مخصوص لب ولہجے اور کرخت آواز میں چچا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو یہ عزت سے زیادہ تمسخر معلوم ہوتا ہے۔ خیر جو بھی ہو یہ انہیں تک اور وہیں تک محدود رہے تو قابل اعتراض نہیں ہے۔ متوسط طبقے میں بھی یہ طریقہ عام ہے کہ باپ کے دوستوں کو چاچا، چچا یا چچا جان وغیرہ کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور اگر باپ کا سگا بھائی یا رشتہ کا بھائی ہو تو چچا ابا یا چاچو وغیرہ کہہ کر رشتہ میں محبت گھولی جاتی ہے۔ چاچا بھتیجے کے بارے میں ایک کہاوت بھی مشہور ہے سچا چور بھتیجے قاضی۔ اس کے باوجود ہر آدمی چچا کہلانا ہی پسند کرتا ہے۔ ماموں نہیں۔ سوائے ناکام عاشق کے جو دل گرفتہ کے ساتھ اپنی محبوبہ کے بچوں کا ماموں کہلانا قبول کرلیتا ہے۔ دراصل لفظ ماموں میں ایک میٹھی سی گالی "سالا" چھپی ہوئی ہے مگر یہ گالی اس وقت میٹھی ہے جب رشتہ حقیقی یا خونی ہو۔ دوست یا اجنبی کے لئے یہ بڑی کڑوی گالی ہے۔

اب تک تین چچا بہت مشہور ہوئے ہیں ایک ابو جہل، دوسرے چچا چھکن تیسرے چاچا نہرو۔ پہلے صرف چچا یا چاچا کا رواج تھا لیکن جب سے گلی گلی انگلش میڈیم اسکول قائم ہوگئے ہیں لفظ "انکل" چل پڑا ہے۔ اس میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ بچہ ماموں کہہ رہا ہے یا چچا جب تک کہ انکل کے آگے میٹرنل (Maternal)) یا پیٹرنل (Paternal) نہ لگایا جائے ہمیں سڑک پر اکثر یہ لفظ سنائی دیتا ہے اسکول کے چھوٹے چھوٹے بچے انگوٹھا دکھاتے ہوئے انکل لفٹ، انکل لفٹ کہہ کر پکارتے ہیں۔ بچہ اگر انکل کہے تو سمجھئے وہ انگلش میڈیم کا ہے اور انکل کہے تو سمجھئے تلگو میڈیم کا ہے یا آندھرا سے آیا ہے ہم پہلے لفٹ دیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے بچوں کے اغوا کی خبریں اخبار میں پڑھنے لگے تو لفٹ دینا ہی بند کر دیا اب ہم دل مسوس کر بچوں کو مایوس کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ آخر ہماری بھی مجبوری ہے۔ کہیں اغوا کے الزام میں دھر لیے گئے تو پتہ نہیں کب چھٹکارا ملے اور کون جانے پھر ملے گا بھی یا نہیں۔

ہمارا ایک نوجوان رشتہ دار ہے مگر بہت موٹا اور بارعیش ہونے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے بڑا لگتا ہے۔ سونے پر سہاگہ وہ شیروانی اور ٹوپی پہنے سڑک سے گزر رہا تھا آٹو والوں نے پکارا "کہاں جانا ہے چچا" اس سے ہمیں شک ہوا کہ

چھوٹے طبقے کے لوگ بڑی چالاکی سے مذاق بھی اڑاتے ہیں اور اپنا مدعا بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ ہم نے اس واقعہ سے بہت لطف لیا مگر کیا پتہ تھا کہ مستقبل میں یہ ہمارے آگے بھی آئے گا۔

ہوا یہ کہ ایک دن ہم میوہ خریدنے گئے ایک سیب کے ٹھیلے پر ٹھہر کر ہم نے بھاؤ پوچھا۔ جواب ملا دس روپے تین ہم نے دس کے چار دینے کہا تو بڑی حقارت سے جواب ملا "خریدی نئیں ہے چچا" اس چچا پر تو ہمارا خون کھول گیا۔ مگر کیا کریں۔ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اس جمہوریت نے اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو مگر ہر شخص کو اس کی ذات کا عرفان حاصل ہے اور اس نے خودی کو اتنا بلند کر لیا ہے کہ اب محمود و ایاز صرف صف میں ہی نہیں ہر جگہ برابر کھڑے ہیں اور سڑکوں پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے ہیں۔ ہم نے ایک نستعلیق آدمی اور آٹو والے کو آٹو میٹر کی ریڈنگ کے مسئلہ پر لڑتے دیکھا آٹو والا کہہ رہا تھا۔ بڑے ہوگئے تو تم اپنی جگہ۔ میٹر جو بتا رہا ہے وہ کرایہ شرافت سے دے دو خیر ہم نے سیب خرید لئے اور وہی سیب کھا کر جلے ہوئے خون کی کمی پوری کر لی۔ اس طرح کی غلط مخاطبت ہمیں ہی نہیں اوروں کو بھی بری لگتی ہے۔ ایک آم کی دوکان پر ہم نے آم کا بھاؤ پوچھا تو لڑکے نے بھاؤ بتایا اور پھر دوسرے گاہکوں کیساتھ بھاؤ تاؤ میں مشغول ہو گیا اب ہم لاکھ پوچھتے رہے مگر وہ ادھر متوجہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ آخری بار ہم نے پکارا "کیا بھائی کچھ کم نہیں۔ لفظ بھائی نے بچھو کے ڈنک کا کام کیا۔ وہ فوراً ہماری طرف پلٹا اور چہرے پر بل ڈال کر طنزیہ لہجے میں لہنے لگا" کیا حضت! میں آپ کے بیٹے سے بھی چھوٹا ہوں بلکہ...... "شائد وہ پوتے کے برابر کہنے والا تھا مگر فوراً سنبھل گیا۔ اسے بڑے سیٹھ یعنی اپنے ابا کی نصیحت یاد آگئی ہوگی کہ گاہکوں سے ہمیشہ تمیز سے پیش آنا چاہیے۔ اس واقعہ سے ہمیں ایک اور پرانا واقعہ یاد آگیا جب ہم آئی ڈی بی یل گیسٹ ہاوز میں تھے تو سنٹر کے ایک منسٹر معہ اپنی بیگم ہمارے گیسٹ ہاوز میں قیام پذیر تھے۔ بٹلر وغیرہ منسٹر کی بیگم کو "اماں" کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ لفظ اماں پر "اماں" کو غصہ آگیا انہوں نے اپنے پی۔ اے کو بلا کر اس کی خبر لی اور پی۔ اے نے نوکروں کو بلا کر سرگوشی میں سرزنش کی "خبردار اپنی خیریت چاہتے ہو تو دوبارہ اماں نہ کہنا بیگم صاحب کہنا" ہیڈ بیرے نے عاجزی سے کہا ادھر آندھرا میں اماں ریسپکٹ دینے کے لئے ہی بولتے ہیں۔ اس کا مطلب قریب قریب بیگم صاحبہ ہی ہوتا ہے"۔ پی۔ اے نے کہا "اماں اُدھر کی ہیں ان کی Respect اُدھر کے طریقہ سے ہی کرو۔"

اب سنیے ہمارا روداد۔ ہمارا گولی بہت ہی پتلا دودھ سپلائی کر رہا تھا اسے دھمکایا ڈرایا۔ راتب بند کرنے کی دھمکی دی۔ پیسے بڑھانے کا لالچ دیا بلکہ اس کی مانگ کے مطابق بڑھا بھی دیئے۔ درمیان میں ایک دو دن دودھ لینا بند کر دیا مگر وہ ناہنجار راہ راست پر نہ آیا۔ جب پانی دودھ سے بونچا ہو گیا تو اس سے لینا بالکل بند کر دیا گیا۔ چونکہ کچن کا سامان خریدنے کی ذمہ داری ہمارے ہی سر ہے۔ اس لیے کیان لے کر نکلے ہمارے محلہ میں بہت سی ڈوڈیاں ہیں۔ باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں ہماری طرح بے شمار لوگ ہاتھوں میں لوٹے اور کیان وغیرہ لئے سڑک پر پھیلے ہوئے ہیں۔ گاؤں ہوتا تو ہم کچھ اور سمجھتے مگر یہ شہر ہے اس لئے ہم سمجھ گئے کہ یہ لوگ کس مقصد سے نکلے ہیں۔ ایک جگہ سے دودھ لیا پسند نہیں آیا دوسری جگہ گئے بھاؤ پوچھا تو کہنے لگا اٹھیس روپے ہے چچا بہترین مال ہے خالص اور گاڑھا۔ یہاں بھی ہمیں چچا سے چھٹکارہ نہ ملا۔ دوسرا دن خیریت سے گزر گیا بغیر لفظ چچا سنے۔ ہم یہ سوچ کر خوش تھے کہ آج بچ گئے شائد کل بھی اس نے کسی اور کو چچا کہا ہوگا۔ مگر تیسرے دن جب ہم اس کے واپس کئے ہوئے پیسے گن رہے تھے کہ اس نے لہک کر پوچھا۔

"برابر ہے چچا؟" ہمارے دل پر ایک گھونسہ لگا اور غصہ میں جیب میں پیسے ڈال کر آگے بڑھ گئے"۔ اس کی ڈوڈی کا دودھ بھی پسند نہیں آیا تو تیسرے کی تلاش میں نکل گئے۔ ایک دودھ والا ملا جس کے یہاں دودھ بھی بہت اچھا تھا اور وہ شخص بھی بظاہر شریف تھا۔ اس نے کبھی چچا کہہ کر مخاطب نہیں کیا البتہ اس کا لڑکا ہمیں انکل کہتا۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ وہ ہمیں "ڈیڑھ لیٹر والے صائب" کہتا ہے کیونکہ ہم اس کے پاس سے ڈیڑھ لیٹر دودھ لیا کرتے تھے۔ ہوا یوں کہ ایک دن ہم اس کے ہاں دیر سے پہنچے اس کا لڑکا بیٹھا تھا۔ اس نے کہا پپا ابھی آپ کو یاد کر کے گئے کہہ رہے تھے کہ "ڈیڑھ لیٹر والے صائب آج دیر کر دئے"۔ یہ سن کر ہمیں ہنسی آگئی اور ساتھ میں "ڈیڑھ پسلی" والی پھبتی بھی یاد آئی جو کسی دبلے پتلے آدمی پر کسی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں مختلف قسم کے "صائبان" یاد آگئے جیسے بڑھ کے جھاڑ والے صائب، پیلی ٹوپی والے صائب۔ "کبوتراں" والے صائب وغیرہ وغیرہ۔

جب ہم دودھ لینے جاتے تو ہمارا گزر ہمارے بھتیجے کی دوکان کے سامنے سے ہوتا چونکہ ہم بہت بامروت واقع ہوئے ہیں اس لئے ہمیں اپنی بے رخی پر بڑی شرم آتی کہ وہ کیا سوچتا ہوگا۔ ہم کیان عموماً اسکوٹر کی ڈکی میں چھپا کر لے جایا کرتے۔ تجربہ نے ہمیں بتایا کہ ان بھتیجوں سے چھٹکارہ مشکل ہے اس لئے یا تو خریداری چھوڑ دیں یا پھر بیچنے والے کی صورت شکل اور عمر دیکھ کر کہ کہیں غالباً تو نہیں ہے خریداری کریں یا پھر اپنے ہم عمر بیوپاریوں سے تاکہ چچا کہنے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ ایک دن ہمارے بھتیجے کی دوکان کے آگے ٹرافک جام ہوگئی۔ ہم ٹریفک میں پھنس گئے ایک آواز ہمارے کان میں پڑی "چچا" کچھ دیر بعد پھر آواز آئی چچا اب کے ذرا زور سے پھر تیسری بار آواز آئی "چھتک چچا" آواز میں کچھ جھنجھلاہٹ تھی۔ خیریت اسی میں تھی کہ اس پکار کا جواب دیدیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں چھتک گھوڑے سے فرعیبی بنادے۔ پلٹ کر دیکھا تو اس نے سلام کرتے ہوئے استہزائی لہجے میں کہا "چچا میں آپ ہی سے مخاطب ہوں خفا ہیں کیا دودھ لینے نہیں آرئیں بابو میاں کے پاس سے لے رئین کیا بیس روپے دیو میں بھی سامنے نتھار کر دیتا ہوں۔" ہم خاموش رہے۔ ہمارا خون بری طرح کھول رہا تھا اور بلڈ پریشر حدوں سے آگے بڑھ گیا۔ ٹریفک چھٹنے لگی تو ہم نے بھی اپنی اسکوٹر آگے بڑھائی پیچھے سے ایک تیر اور چلا۔ "چچا کچھ جواب نئیں دیئے۔"

صبغتہ اللہ بمباث
حیدرآباد

خادمِ اُردو

کیا ضروری ہے کہ ہو وہ عالمِ اُردو زباں
خادمِ اُردو زباں ہے خادمِ اُردو زباں

مرکبِ شہرت کے حق میں جیسے اک مہمیز ہے
خادمِ اُردو تو یارو دیکھنے کی چیز ہے

کانفرنس اُردو کی کہنے کو تو کرواتے ہیں وہ
کھانا مندوبین کو ہندی کا کھلواتے ہیں وہ

ولولہ انگیز تقریروں کے راتب سے سوا
دل کو بھاتی ہے انہیں اپنی صدارت کی ہوا

خادمانِ اُردو وہ پیدائشی سیاس ہیں
تلگو دیشم کانگریس دونوں ہی موسم راس ہیں

جب زبوں حالی زباں کی بد سے بدتر ہوگئی
خادمِ اُردو کی صحت اور بہتر ہوگئی

ناشتہ، لنچ اور ڈنر ہے مفت کی وہسکی بھی ہے
اور اُردو کے لیے لب پر تمکر سسکی بھی ہے

اُردو کی حالت کا ہے ان کو بڑا رنج و ملال
ہاں مگر پڑھتے ہیں انگلش میڈیم میں ان کے لال

گھر پہ انگریزی زباں میں بات کرتے ہیں یہ لوگ
گھر کے باہر اردو کی خیرات کرتے ہیں یہ لوگ

اس طرح چلتا ہے اور چلتا رہے گا کاروبار
خادمِ اُردو کا لیکن کم نہ ہوگا اعتبار

دولت و شہرت جہاں حسبِ ضرورت اس سے لی
بدنصیب اُردو کے ہر خادم نے خدمت اس سے لی

محمد برہان حسین
حیدرآباد

مصری ممی کا تابوت

ایرانڈیا کی ممبئی ۔ جدہ فلائیٹ براہ کویت پر شرفو میاں سوار تھے ۔ عمرہ کے لئے جارہے تھے اس لئے چہرہ پر روحانیت کی زیادتی تھی ۔ دو چار چھوٹے موٹے گناہ یاد کرکے قلبی توبہ جاری تھی ۔ بازو کی نشست پر نوجوان ین آر آئی مناف صدیقی بیٹھا تھا جو حیدرآباد میں سالانہ چھٹی گذار کر لوٹ رہا تھا ۔

مناف صدیقی کی نظر جیسے ہی ایرہوسٹ پر پڑی اس نے "لاحول" پڑھی اور شرفو میاں سے بولا "خدا کی قسم ہے انکل! ..... دنیا کی کوئی ایرلائنس اس جیسے گنجے ، بوڑھے ، سیاہ فام ایرہوسٹ کو برداشت نہیں کرسکتی ۔ بلکہ ہوائی سفر کرنے والے اگر ایسے باورچی کو بھی دیکھ لیں تو کھانا نہ کھاسکیں ۔ میں جب جدہ سے حیدرآباد آرہا تھا تب بھی میری فلائیٹ میں ایک بوڑھی عمر رسیدہ ایرہوسٹس تھی ۔ ساری دنیا میں ٹورسٹ کو رجھانے کے لئے اجنتہ اور کھجراہو کے مجسموں کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں جن میں ملک راج آنند کا بیان کیا ہوا معیاری زنانی حسن ہوتا ہے" ۔

شرفو میاں نے کہا "یہ جدہ کی فلائیٹ ہے اور اس میں لوگ عمرہ کرنے جاتے ہیں اگر ان کو خوبصورت ایرہوسٹس نظر آجائے تو وہ اسی طرح "لاحول" پڑھتے ہیں جیسے آپ نے اس سیاہ فام بزرگ انڈین ایرہوسٹ کو دیکھ کر پڑھا" مناف صدیقی نے کہا "ارے انکل! آپ اس کو ایک بار تو دیکھئے ایسے لگ رہا ہے جیسے ہیروئن کا باپ اور اس جہاز کو دیکھئے جیسے پطرس بخاری کی مرزا سے خریدی ہوئی سیکنڈ ہینڈ سیکل ۔ آپ نے درست فرمایا چونکہ اس فلائیٹ میں عمرہ کرنے والے بزرگ سوار ہوتے ہیں اسی لئے ایرہوسٹ بھی بزرگ رکھا گیا ہے اور جہاز بھی بزرگ رکھا جاتا ہے تاکہ "اللہ اللہ" کرتے ہوئے اڑتا رہے ۔

جہاز جب کویت پہنچا تو مائیک پر اعلان ہوا کہ اس فلائیٹ کے مسافرین دوسری اطلاع تک ایرپورٹ کی نشست گاہ میں جا بیٹھیں کیونکہ جہاز میں میکانیکل خرابی ہوگئی ہے جس کو درست کیا جائے گا ۔ یہ سن کر مناف صدیقی اور بھی بھنانے اور بڑبڑانے لگے ۔ "اللہ رحم کرے پتہ نہیں کب درست ہو اور اڑے مجھے تو کل صبح ڈیوٹی پر رپورٹ کرنا ہے ۔ اس نے سامنے سے گذرتے ایک گراونڈ اسٹاف فرد سے پوچھا "معاف کیجئے جناب! اس کی درستگی میں کتنا وقت لگ سکتا ہے" ۔ اس نے کہا "پتہ نہیں صاحب اسنا ہے جہاز کے "کاک پٹ" کا ونڈ اسکرین کا شیشہ ہل رہا ہے..... وہ دیکھئے انجینرس جارہے ہیں ۔ ان کے دیکھنے کے بعد ہی کچھ اندازہ ہوسکتا ہے" ۔

مناف صدیقی نے کہا "ارے یہ انجنیئر تو مصری ہیں یہ کیا درست کرسکیں گے" ۔ نشست گاہ میں ایک شور

برا تھا ہر مسافر اپنے اپنے تجربات بیان کر رہا تھا۔ ایک خاتون کہہ رہی تھی "میں اس سے پہلے بھی جب ممبئی پہنچی تھی تو اعلان ہوا تھا کہ جہاز کو درست کیا جائے گا دو گھنٹوں کے بعد جہاز میں سوار کیا گیا تو جہاز "رن وے" کے گوشہ آخر تک جاکر لوٹ آیا کہ جہاز مکمل طور پر پرواز کے قابل نہیں تھا اور ہم کو پھر اتار دیا گیا۔ پھر دو گھنٹوں کی درستگی کے بعد ہم سوار ہوئے تو صبح ہو چکی تھی۔ دن کی روشنی میں جہاز کو دیکھا تو ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی بوڑھی کو صبح بغیر میک اپ کے دیکھ رہے ہوں۔"

دوسری عورت نے لقمہ دیا "اس لئے تو ساری ایر انڈیا کی فلائٹس رات میں نکلتی ہیں کہ آپ کو اندازہ نہ ہوسکے کہ آپ کس قدر پرانے اور گھٹیا جہاز میں سفر کرتے ہیں"۔

مناف صدیقی نے کہا "اور یہ ایرہوسٹ اور ایرہوسٹس جو جہاز کے ساتھ ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں ان کو مرنے پر "پرم ویر چکر" دینا چاہیئے کہ ان لوگوں نے جان پر کھیل کر ان جہازوں میں کام کیا اور قوم کی خدمت بڑی بہادری سے کی

اس عورت نے بیان جاری رکھا "ارے ان جہاز کا رنگ برابر نہ توازن اکثر پرواز کے دوران اگر جہاز توازن کھو بیٹھا تو اسپیکر پر کہا جاتا ہے موسم خراب ہے اس لئے جہاز قلا بازیاں کھا رہا ہے اور تعلیم یافتہ لوگ بچوں کو بتاتے ہیں کہ چنے آسمان میں کم ہوا اور زیادہ ہوا کے "پاکٹس" ہوتے ہیں جن میں جہاز داخل ہوتا ہے تو قلا بازی کھاتا ہے"۔

ہمارے ایر انڈیا کے جہاز جب دوسری ایر لائنس کے چمکدار نئے اسمارٹ نوجوان جہازوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو شرم سے لرز جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بوڑھی، نوجوانوں کو دیکھ کر سر پر پلو ڈال لیتی ہے اور پلٹ کر خود سے کہتی ہے "ارے ادھر مردوئے ہیں شاید"

ایک گھنٹہ کے بعد وہی گراونڈ اسٹاف سامنے سے گزرا تو مناف صدیقی نے پوچھا "کیا ہوا صاحب کچھ کام شروع ہوا

اس نے کہا "آپ نے درست ہی کہا تھا کہ یہاں کے انجنیرس آپ کے جہاز کو درست نہ کرسکیں گے ابھی اطلاع ملی ہے کہ ممبئی۔نیویارک فلائیٹ ممبئی سے نکل چکی ہے اس میں دو ہندوستانی انجنیرس آرہے ہیں"۔

مناف صدیقی نے کہا "جی ہندوستانی انجنیرس ماہر ہوتے ہیں وہ ضرور اس کو درست کردیں گے"

مناف صدیقی اب ایک عرب مسافر کے بازو جا بیٹھے اور اس سے کہا "اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے انجیزس آرہے ہیں۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ مصری یا کویتی انجیزاس جہاز کو درست نہ کرسکیں گے..... یہ لوگ اپنے جہاز لندن پیرس وغیرہ میں درست کراتے ہیں..... "ہمارے انجیزس اور ڈاکٹرس تو امریکہ میں چھائے ہوئے ہیں محض اپنی فنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی وجہ سے"۔ عرب شخص نے کہا "ہاں ہم نے بھی پڑھا ہے کہ ہندوستان نے ٹکنالوجی میں صدیوں کا فاصلہ محض چند برسوں میں طئے کرلیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان اپنی آبادی کے مسئلہ کو حل کرسکے تو وہ "سپر پاور" بن سکتا ہے"۔

مناف صدیقی نے کہا "جی درست فرمایا۔ ہمارے چیف منسٹر چندرا بابو نائیڈو حیدرآباد کو "ہائی ٹیک سیٹی" بنا رہے ہیں۔ بہت جلد حیدرآباد، امریکہ کی سلیکون ویلی جیسا بن جائے گا۔

ان کی داہنی طرف بیٹھے ایک اور ین آر آئی نے کہا "ابھی ابھی ہندوستان نے غیر ملکوں کے سٹلائٹس کو اپنے

راکٹ سے خلاء میں پہنچایا ہے۔ ہم کسی وقت بھی چاند پر آدمی اتار سکتے ہیں۔ مگر اس سے فائدہ۔ ہندوستان کو اپنی توانائیاں اس طرح ضائع نہ کرنا چاہیئے۔ ٹکنالوجی کو انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کرنا چاہیئے۔ کبھی ہم کو طعنہ دیا جاتا تھا کہ ہندوستان سوئی بھی نہیں بنا سکتا۔ آج ہمارے انجنیئرنگ کے سامانوں، کپڑوں وغیرہ سے دنیا کے سبھی ملکوں کے مارکٹس بھرے پڑے ہیں"۔

اتنے میں اعلان ہوا کہ جہاز درست ہو چکا ہے اور مسافر جا بیٹھیں مسافرین میں گرمی آگئی اور اپنے اپنے بیاگس وغیرہ لے کر چل پڑے۔ باہر نکلے تو مصری اور ہندوستانی انجنیئرس سامنے سے جا رہے تھے۔ مناف صدیقی نے ہندوستانی انجینئرس کو مسکرا کر سلام کیا اور کہا "تھینک یو سرا" اور مصری انجینئرس سے کہا "کیا ہوا سر آپ لوگ کیوں ہمارے جہاز کو درست نہ کر سکے"۔

مصری انجنیئر نے کہا "دوست! بات دراصل یہ ہے آپ کا جہاز بائیس سال پرانا ہے اور یہہ ٹکنالوجی اب دنیا سے اٹھ چکی ہے اور ہمارے کالجس میں جدید ٹکنالوجی پڑھائی جاتی ہے۔ ہم ایسے جہازوں کو آثار قدیمہ کے ٹکنالوجی سکشن میں رکھے ہوئے ہیں..... اس سے تو ہمارے "پرامیڈس" کی ٹکنالوجی اسمارٹ ہے اور جدید انجنیئرس اس کو سراہ سکتے ہیں..... ساری فرینڈ! ہم آپ کی زیادہ مدد نہیں کر سکے"۔

مناف صدیقی منہ لٹکائے جہاز کی طرف بڑھنے لگے تو ان کو اپنے ایر انڈیا کا جہاز ایک مصالحہ لگی ممی کا تابوت نظر آرہا تھا۔ شرفو میاں نے ان کو دلاسہ دیا "یہہ جہاز کبھی گرتا نہیں بائیس سال سے عمروں کا ثواب کمارہا ہے"۔

غزلیں

کوثر صدیقی
گنوری روڈ، بھوپال

بن کے نیتا کچھ کماتے، ہم میں وہ خوبی نہ تھی
اپنی قسمت میں تو اک کھادی کی ٹوپی بھی نہ تھی

دے نہ پائے ہم گرفتاری کسی تحریک میں
لیڈروں جیسی علامت ہم میں کوئی بھی نہ تھی

اپنا لڑکا اس لئے ہوتا رہا ہر بار فیل
امتحاں میں نقل کرنے کی کلا آتی نہ تھی

ہم نہ پنڈت تھے نہ لیڈر تھے نہ مسجد کے امام
اپنی قسمت میں تو سادہ دال روٹی بھی نہ تھی

پھر رہے تھے پستہ قد چوہے بھی سینہ تان کر
جب تلک گھر کی منڈیروں پر کوئی بلی نہ تھی

بیٹھتے تھے گدیوں اور تخت پر راجہ نواب
ان غریبوں کے مقدر میں کوئی کرسی نہ تھی

لڑکی والوں کے گھروں پر دستکیں دیتے رہے
ہم کنواروں کے مقدر میں مگر لڑکی نہ تھی

نوٹ لے کر بھی نہ دینا ووٹ کلچر ہوگیا
کس قدر چالاک اور عیار ووٹر ہوگیا

ڈگریوں سے ہٹ کے جن کے پاس تھی کوئی تیج
ایس پی کوئی بنا۔ کوئی کلکٹر ہوگیا

ہوٹلوں میں کرتے کرتے میزبانی یار کی
کسٹرے دھیرے دھیرے میں بھی ویٹر ہوگیا

ایسا لگتا ہے کہ جیسے جنگلوں کے بیچوں بیچ
زندگی کی گاڑی کا پہیا ہی پنکچر ہوگیا

گنگوا تیلی اور راجہ بھوج جیسا فرق ہے
وہ مگر کہتے ہیں میں ان کے برابر ہوگیا

پھر رہے ہیں خوار کوئی پوچھنے والا نہیں
منتری جی کا یہ کیسا حال کوثر ہوگیا

●☆●

دھوتے دھوتے بھاری بستے روز روزانہ اسکول کے
کیا خبر تھی میرا بیٹا بھی گدھا ہوجائے گا

مجرمان شہر کے پوتے جواں ہونے تلک
دل کا مندر توڑنے کا فیصلہ ہوجائے گا

ایک لوٹا شربت دیدار پلوا دو اگر
پیاس کے مارے فقیروں کا بھلا ہوجائے گا

گھڑ سواری میں اناڑی اور کچا جان کر
کیا خبر تھی آپ کا گھوڑا خفا ہوجائے گا

کیا خبر تھی چھیڑتے ہی ان کے موتن کی غزل
میرا طبلہ تان پورا بے سرا ہوجائے گا

کیا خبر تھی قیمتی تحفے اثر دکھلائیں گے
وہ ستمگر بے وفا بھی باوفا ہوجائے گا

☆●☆

ڈاکٹر عباس متقی
حیدرآباد

"سو" میں سے "بارہ"

پیاز جب سے مہنگی ہو گئی ہے دال پر گزارہ ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ دال پیاز کے بغیر بھی پکائی جا سکتی ہے۔ پرسوں دال بھی ختم ہو گئی تو بیگم نے دال لانے بازار بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ جب بقول مہمان دال کی بیس تاریخ چل رہی ہو تو دال کوئی سیاست داں کی چال نہیں جو ختم نہ ہو۔ ہم ایک فرماں بردار شوہر ہیں۔ جہیز اور جوڑے کی رقم نے ہماری فرماں برداری میں چار چاند بلکہ چوبیس چاند لگا دیئے ہیں۔ کتنی تعجب کی بات ہے کہ ہم شادی سے پہلے آسمان سے تارے توڑ لانے کی گفتگو کیا کرتے تھے اور شادی کے بعد بازار سے دال لانے کی گفتگو سنتے ہیں۔ قصہ کوتاہ اخباری کاغذ کے لفافے میں دال لیئے گھر لوٹ رہے تھے تو لفافے کی تحریر نے ہمیں چونکا دیا۔ تحریر کیا تھی گویا ادب انشاء کی منہ بولتی تصویر تھی۔ نیز مسلمانوں کے ماضی، حال و مستقبل پر ایک مفصل نوٹ بھی تھا۔ ہم نے گھر میں گھس کر باورچی خانے کی راہ لی اور نہایت سرعت کے ساتھ ہانڈی میں دال انڈیل کر دال کے لفافے کو احتیاط سے چاک کر کے اسے پڑھنے بیٹھ گئے۔ یوں بھی ہم اخبار و رسائل کم اور کتابی چہرے زیادہ پڑھتے ہیں۔ بیگم نے ہماری اس مجنونانہ کیفیت کا کوئی نوٹ نہیں لیا۔ کیوں کہ انہیں معلوم ہے کہ ہم کتابوں کے دیوانے نہیں "پرزوں" کے شیدائی ہیں۔ اب انہیں کیا معلوم کہ بعض وقت موٹی موٹی کتابوں سے وہ چیز حاصل نہیں ہوتی جو ایک پرزے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پرزوں سے مطلب نکال لینا چلتا پرزہ شخصیتوں کا کام ہوتا ہے۔ باورچی خانے ہی میں بیٹھے بیٹھے ہم نے پرزے کا مضمون پڑھ لیا اور تحریر کی شان و شوکت اور عبارت کے حسن و لطافت سے محظوظ ہوتے رہے۔ ایک ایک جملہ تیر بن کر دل میں اتر رہا تھا۔ ہر لفظ چھا تلا۔ پختگی مشق کا مظہر۔ جملوں کی طوالت غبار خاطر کی یاد دلا رہی تھی۔ جیسے ہمارے نقاد پڑھتے کم اور اس کے متعلق زیادہ لکھتے ہیں۔ بیساختگی و آمد کی کی وہ کیفیت مانو میر نثر لکھ رہے ہوں۔ کہیں کہیں تاریخ بھی اپنی پہلوانی مونچھوں پر تاؤ دے کر داؤ آزماتے نظر آتے۔ پھر ہم نے اخبار کے تراشے پر مضمون نگار کی پھٹی ہوئی نامکمل تصویر کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا کینیڈی کی تصویر اس وقت کھینچ لی گئی ہے جب کہ کسی نے ان کے ہونٹوں سے اچانک ان کا تاریخی پائپ چھین لیا تھا۔ اور حیرت سے ان کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے لیکن کنیڈی کو مسلمانوں سے ہمدردی چہ معنی۔ ویسے ہمیں مضمون سے کام تھا نہ کہ مضمون نگار سے۔ غرض عش عش کرتے ہوئے جب ہم نے مضمون کے تراشے پر الٹی انگلیاں رسید کیں تو وہ کچھ اور پھٹ گیا۔ ہم نے اس پھٹے ہوئے اخبار کے تراشے کو جیب میں رکھ لیا کہ ممکن ہے اس کی برکت سے خود بھی اچھی اردو لکھ سکیں، لیکن کیا پتہ تھا کہ مرزا اس تراشے کی اردو کو

آڑے ہاتھوں لیں گے اور اپنی تنقیدی تراش خراش سے اس پرزے کے پرزے اڑائیں گے۔

ہم مرزا سے بہت گھبراتے ہیں۔ سنتے ہیں کہ انھوں نے اردو غدر کے مارے کسی شہزادے سے اور فارسی کسی ایرانی سے سیکھی ہے جس کا سلسلہ نسب مرزا غالب کے استاد ملا عبدالصمد سے جا ملتا تھا۔ ان کے آگے ہماری زبان نہیں چلتی۔ مرزا گھورتے ہیں تو الفاظ ذہن سے زبان تک کا فاصلہ طئے کرنے سے انکار کرنے لگتے ہیں۔ ویسے وہ ہیں تو محض منشی کامیاب لیکن ان کے مقراض تنقید میں آکر اچھے اچھوں کے پر کٹ جاتے ہیں۔ پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں کہ کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ نکتہ چینی کی عادت بد گھٹی میں پڑی ہے۔ لکھا دکھانا گناہ، کہا سنانا غضب لتنے نقائص عیاں کرتے ہیں کہ کچھ نہاں نہیں رہتا۔ ایک دن ہمارا کامل دیوان سن کر صرف ایک مصرعہ پر داد دی اور اس میں بھی عروض کی ایک غلطی نکالی۔ ہم نے سوچا مرزا کو نیچا دکھانے کا ایک بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ کیا غضب کی تحریر ملی ہے۔ یقیناً اسے سن کر مرزا مرعوب ہوں گے۔ اور ہماری آرزو بر آنے گی۔ چنانچہ نہایت شوخ و چنچل موڈ کے ساتھ ہم نے مرزا کے در پر دستک دی۔ وہ ہماری دستک کو خوب پہچانتے ہیں۔ شرارت سے کہتے ہیں نسوانی ہے، باہر نکل آئے کچھ دیر تک گھورتے رہے، جیسے وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ ان کی پرانی ادا ہے بلکہ اداکاری ہے جس سے ہم خوب واقف ہیں۔ من خوب می شناسم پیران پارسا را۔ وہ ہمیں اندر لے گئے حسب عادت شریف گاؤتکئے سے نیم دراز ہوگئے۔ دو چار گہری سانسیں لیں جیسے خود کو جینے کی مشق بہم پہنچا رہے ہوں۔ پھر گویا ہوئے تو گویا اسٹارٹ، وہ بوڑھے تھے اور بولنے کے شوقین بھی اب کیا خاک رکیں گے۔ غرض جب تقریر دل پذیر میں سکتہ آیا تو ہم سکتے سے جاگے۔ موقع کو غنیمت جانا عرض کیا مرزا!! ایک مضمون گوش گزار کرنے لایا ہوں۔ تحریر کی لطافتوں سے محظوظ ہوا تو سوچا کیوں نہ آپ کو بھی شریک لطف کرلوں۔ ارشاد۔ ہم نے تلفظ پر دھیان دیا، قواعد قرات کا لحاظ رکھا اور سارا مضمون از الف تا والسلام پڑھ دیا۔ لیکن مرزا خوش نہیں ہوئے ہم نے جب داد طلب نظروں سے انہیں گھورا تو کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب بچکانہ تحریر ہے اور نو مشق قلم کار کی لڑکھڑاہٹوں اور لغزشوں کا شاہ کار ہے۔ ہم نے کہا مرزا سنبھل کے، مضمون نگار صاحب مقام معلوم ہوتا ہے جھٹ سے بولے، صاحب مقام ہو یا مقامی کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اگر وہ گربہ مسکین ہے تو اس کی سند لے لو۔ اگر پوست گربہ مسکین ہے تو اس کے کپڑے لے لو اور اگر تمہاری طرح کوئی ڈاکٹر ہے تو اس کی جان لے لو۔ اس فقرہ پر ہماری روح کانپ گئی اور ہم سوچنے لگے اتنی خوب صورت، سلیس اور بامحاورہ عبارت میں مرقوم مضمون کو مرزا بچکانہ قرار دے رہے ہیں حواس یکجا کر کے کہا مرزا۔ ہمیں تو یہ خاصا لطف دے گئی۔ کہنے لگے بچے ہو، تم نے "اردو" پڑھی کہاں ہے۔ ویسے صحیح اردو لکھی ہی کہاں جا رہی ہے جو تم پڑھو گے۔ سارے ہندوستان میں دو چار لوگ ہیں، اک آدھ تمہارے شہر میں ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ یہ تحریر ہے کس کی۔ ہم نے کہا مرزا سچ پوچھئے تو "دال" کی ہے۔ مرزا نے کہا نہیں بے دال کے بودم کی ہے۔ تمہاری دال بھی خوب ہے اور یہ بے دال کا بودم بھی خوب ہے اور پھر دیر تک وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنستے رہے۔ ہم نے مرزا کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے یہ عرض کیا۔ اگر واقعی اخبارات میں ایسی غلطیوں سے پر تحریریں ہونے لگے تو افسوس کا مقام ہے۔ کہنے لگے میاں افسوس کرنے سے کام نہیں چلے گا سینہ کوبی کرو ماتم کرو۔ یہ دور ہی ماتم کرنے کا ہے۔ ہم نے ماتم کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے کہ مرزا نے گھور کر دیکھا اور ہم نے "چھوڑ دیجئے" مسکرا کے ہاتھ"
مرزا نے ہماری اس حرکت پر کمال درجہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بے ساختہ ہنسی کا گلا گھونٹ دیا اور عقل اعظم

کے پرتھوی راجی انداز میں حکم صادر کیا کہ مکتبی نوعیت کی غلطیوں کے اس پٹارے کو فقرہ بہ فقرہ پھر سے سناؤں۔ مرزا کے حکم پر ہم نے چھپے ہوئے اخبار کا تراشہ نکالا اور شروع ہو گئے۔

"پچاس نہ صرف ملک نے اس کشمکش میں گزارے ہیں جو ایک سیکولر جمہوریت کے استحکام کے لئے ناگزیر تھی بلکہ ہندوستانی عوام نے ان اقتصادی اور سماجی اقدار کے لیئے جدو جہد میں صرف کئے جو آزادی کا مقصود تھیں"

جملہ ختم کرکے ہم سانس لینے کے لئے رکے ہی تھے کہ مرزا شروع ہو گئے" واہ میاں! کیا اسلوب نگارش ہے پہلی قرات میں کچھ پلے ہی نہیں پڑتا کہ مضمون نگار آخر کہنا کیا چاہتا ہے۔ ایک سانس میں کہتا ہے کہ ملک نے گزارے دوسری میں کہتا ہے عوام نے صرف کئے۔ یہ تو سنگ مرمر والی بات ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کے نزدیک ملک الگ شئے ہے اور عوام الگ۔ کیا ملک میں عوام شامل نہیں۔ جب ملک کہا تھا تو عوام کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ملک الگ کوشش کر رہا تھا اور عوام الگ۔ کیا فی الواقع ایسا ہی تھا۔"

ہم نے مرزا کی تنقید پر غور کیا او صرف غور کرتے ہی رہ گئے ظاہر ہے کہ قواعد ہم نے سیکھی کہاں ہے جو ان باریکیوں سے واقف ہوتے۔ آگے بڑھے۔

"اور صحافت کا جائزہ بھی اسی کشمکش بلکہ اس کے رول کے مطابق جانچا جائے گا۔۔۔"

خاموش! مرزا کی غراہٹ پر ہم گھبرا کر واقعی خاموش ہو گئے۔ یہ کیا لغویت ہے۔" جائزہ جانچا جائے گا۔" لاحول پڑھو ایسی تحریر پر کیا یہی بکواس سنانے تم مرے پاس آئے ہو۔ ہم نے کہا مرزا" جائزہ جانچا جائے گا" میں کیا قباحت ہے۔ مرزا بولے ہاں! ہاں کوئی قباحت نہیں۔ جائزہ جانچو، مشاہدہ دیکھو، چھو کر مس کرو، چلتے ہوئے ٹہلو، اردو گھر کی لونڈی ہے جیسا چاہو استعمال کرو ہم نے کہا مرزا جانچنے والے کی مرضی۔ چاہے جائزہ جانچے یا" جائزہ لے "۔ آزادی کے بعد ہر شخص آزاد ہے۔ جو چاہے کرے ورنہ پھر آزادی کا مطلب ہی فوت ہو گیا۔ مرزا ہماری وکالت پر آپے سے باہر ہونے ہی والے تھے کہ ہم نے قراءت شروع کر دی" لیکن میں قارئین سے یہ ضرور توقع رکھوں گا کہ وہ میری اس تحریر کو ذہن میں رکھ کر خود بھی اس اخبار کی خدمات کا جائزہ لیں۔"

بکواس مرزا چلائے۔ اور ہم استفہامیہ انداز میں انھیں دیکھنے لگے۔ گویا ہوئے۔" ڈاکٹر صاحب قواعد کے اعتبار سے یہ جملہ ناقص، مہمل اور لغو ہے۔ مضمون نگار کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شاعری میں الفاظ کی ترتیب اور ہوتی ہے اور نثر میں اور۔ قارئین سے یہ ضرور یہ توقع رکھوں گا" کیا مطلب نثر میں تو ایسا نہیں کہتے۔ لکھنا چاہئے تھا" میں قارئین سے ضرور یہ توقع رکھوں گا"۔ نیز" توقع رکھوں گا" کے لحاظ سے" جائزہ لیں" چہ معنی دارد۔" جائزہ لیں گے" کا محل ہے۔ اگر ماضی تمنائی" جائزہ لیں" لکھنا ضروری تھا تو پھر جملے کا آغاز حال مطلق یعنی" توقع کرتا ہوں" سے ہونا چاہئے تھا۔ مضمون کی قراءت کرتے کرتے ہم اس شعر پر پہنچے

سلاطین سلف سب ہو گئے نذر اجل عثماں
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشان باقی

مرزا اس شعر کو سن کر معاً چونک پڑے اور زور سے" لاحول" پڑھا۔ اور فرمانے لگے۔ یہ ایک مہمل شعر ہے جو

مشہور ہو گیا ہے۔ اس شعر سے متعلق تاریخ میں کئی قصے مشہور ہیں ایک غیر تاریخی قصہ مجھ سے بھی سنو۔ "اعلیٰ حضرت دکن میر عثمان علی خاں بہادر کے دو استاد تھے۔ ایک استاد فصاحت جنگ جلیل دوسرا یہ خاکساز۔ جب شاہ دکن کی زبان معجز بیان سے یہ شعر نکل گیا تو محض اس شعر پر گفتگو فرمانے شہنشاہ والا نے بہ نفس نفیس خاکسار کے در علم و فن پر قدم رنجہ فرمایا تھا۔ اس شعر کو سن کر مجھے بہت غصہ آیا لیکن وہ دور جمہوری دور تو تھا نہیں کہ بلا جھجک فن کا اظہار کیا جاسکے۔ چنانچہ میں نے ترکش طنز سے ایک تیر چلے پر چڑھایا اور دست بستہ عرض کیا۔ حضور پر نور نے اپنی ذات والا صفات کو صرف مسلمانوں سے منسوب فرماکر اقطاع عالم کے غیر مسلموں پر ظلم فرمایا ہے بلکہ اس ظلم شدید کے گنہہ گار امریکہ، جاپان، انگلستان کے وہ افراد بھی ٹھہرتے ہیں جو والا تبار کے دامن مقدس سے دائمی وابستگی کا دم بھرتے ہیں۔ اجازت مرحمت فرمائی جائے تو جہاں پناہ کے شعر میں لعل و گوہر کو قدرے تبدیل کر کے اس بے نظیر و بے مثال شعر میں چار چاند لگائے جائیں۔ شہنشاہ نکتہ سنج نے جنبش ابرو سے اجازت مرحمت فرمائی بندے نے جب ایک لفظ کی تبدیلی سے شعر یوں پڑھا۔

سلاطین سلف سب ہوگئے نذر اجل عثماں
اب انسانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

تو حضور والا نے اتنی زور سے اپنے زانوئے مبارک پر ہاتھ مارا۔ مبادا کہیں بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ یہ حضور والا کے داد دینے کا خاص انداز تھا۔ سنا کہ عرصہ دراز تک اس داد ضرب شدید کی بدولت زانوے مبارک لال رہی اور خادمین خاص کو مدت دراز تک زانوے مبارک کو سینکنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ چونکہ ہر دربار میں حاسد اور سازشی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس راز پر آج تک دبیز پردے پڑے ہیں۔ چنانچہ تاریخ کی کسی کتاب میں اس تاریخی واقعہ کا کوئی ذکر نہیں اتنا کہہ کر مرزا ماضی کے دھندلکوں میں کھوگئے۔ ہم سوچنے لگے کہ آخر وہ کون سی مجبوری تھی جو مرزا نے اس درجہ احمقانہ لطیفہ گھڑا ہے۔ خیر دروغ برگردن مرزا ہمیں مرزا کے دروغ سے نہیں ان کے فروغ سے کام تھا۔

"اور تنگ نظر ہندو بھی بادشاہ کے مذہب سے جوڑ کر پوری سلطنت اور اس کے نظام کو ... نور سے وابستہ کرتے رہے ہیں۔ یہی معل دور حکومت کے ساتھ ان عناصر نے کیا"۔

مرزا ... انداز سے لاحول پڑھی۔ ہم سراپا بن گئے۔ مرزا بڑبڑا اٹھے "مذہب سے جوڑ کر" کس قدر بے ہودہ اور بھدا پیرایۂ اظہار ہے شاید وہ "مربوط کر کے" کہنا چاہتے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کو قلم سے زیادہ رندے اور بسولے سے علاقہ رہا ہے ورنہ یہاں اس طرح جوڑ نہ بٹھاتا۔ مزید براں "بادشاہ کے مذہب" کے پیش نظر لکھتا تو عبارت اتنہ ہوجاتی۔ نیز جملے کے آخر میں مبتدا خبر کے بعد آرہا ہے جو از روئے قواعد درست نہیں "یہی مغل دور کے ساتھ ان عناصر نے کیا" کمزور انشاء ہے، کہنا چاہیئے تھا "یہی عمل ان عناصر نے مغل دور کے ساتھ بھی کیا" ... عبارت خوانی کی اسپیڈ میں جو بریک لگایا تھا، ہم اسے الانگ کر آگے بڑھے۔

"حکومت آصفیہ کے سہاروں کے طور پر زمیندار نظام قائم کیا گیا...."

رکو رکو مرزا نے مضمون کے راستے میں ایک اور "اسپیڈ بریکر" حائل کر دیا۔ ہم رک گئے مرزا بولے "میاں زمین داری نظام سے مراد ایک نظام ہے یا کئی نظام ہیں" ہم نے علمیت بگھارنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ زمینداری نظام

واحد ہے "مرزا بدلے اگر یہ واحد ہے تو پھر "سہاروں" کا کیا محل ہے۔ سہارے کے طور پر لکھنا چاہیئے تھا۔ مرزا ... برہان قاطع کا جواب نہیں ہمیں کسی قاطع برہان کا سہارا نہ مل سکا۔ لاچار آگے بڑھے۔

"پھر جاگیرداروں کے خاتمے کی وجہ سے محکمہ کروڑ گیری کے بند کر دیئے جانے کی وجہ سے"

کیا وجہ سے، وجہ سے کی تکرار لگا رکھی ہے مرزا جھلا اٹھے۔ حرف ربط "اور" کے ذریعہ جاگیرداروں اور محکمہ کروڑ گیری کو یکجا کر لیا جاتا تو صرف "ایک وجہ سے" کام نکل جاتا اور جملے میں تنفر پیدا نہ ہوتا۔ ہم پھر چل پڑے۔

"مخدوم محی الدین کے سیاسی افق پر آجانے نے.....؟

"سبحان اللہ کیا انشا ہے۔ مرزا کی داد میں، طنز، حقارت، استہزا، تمسخر سب پوشیدہ تھے۔ واللہ ایسی اردو شبلی و آزاد بھی کیا کھا کر لکھیں گے۔ آجانے نے، کھاجانے نے، مرجانے نے۔ افسوس آج خواجہ حسن نظامی نہ ہوئے ورنہ مصنف کو اپنے خامہ القاب بخش سے "رئیس انشا" کا لقب ضرور عطا کرتے"

بس بس بس۔ مرزا چلائے۔ اس سے زیادہ کا مجھے دماغ نہیں۔ اس طرح کی بے ربط باتیں یا تو حالت ہذیان میں نکلتی ہیں یا عالم جذب میں۔ مضمون نگار یا تو مجذوب ہے یا اس نے سرسام کی حالت میں یہ جملے لکھے ہیں کہ مدعا عنقا ہے اپنے عالم تحریر کا۔ کوئی اس شخص کو میرے سامنے لے آئے۔ مرا دل چاہتا ہے کہ اسے اکڑوں بٹھاؤں اور اس کے سامنے اردو قواعد کی تمام کتابیں نذر آتش کر دوں۔

ہم مرزا کے اس آتشیں ارادے سے قدرے سہم گئے لیکن جب انہوں نے آگے پڑھنے کا حکم دیا ہے ہوئے لہجے میں سلسلہ قراءت آگے بڑھایا۔

"سیاست کا مقصود ہی یہ ہے کہ اقلیت ایک پچھڑی پچھڑی اقلیت کی طرح رہے گی تو اس میں ساری قوم کا نقصان ہے۔ تنگ نظری اگر اکثریت میں آتی ہے تو اقلیت کو بھی اور اپنے دائرہ میں محدود ہو جانے کی راہ بتاتی ہے"

مرزا یہ تحریر سن کر کم عمر بچوں کی طرح تالیاں بجا کر ہنسنے لگے۔ اور مجبوراً ہمیں ان کا ساتھ دیتے ہوئے چھوٹے بچوں کی طرح ناچنے کی تمہید باندھنی پڑی۔ کہنے لگے کم سواد قلم کار کو اگر مضمون نگاری کا اتنا ہی شوق تھا تو پہلے اردو سیکھ لی ہوتی۔ مرزا مر نہیں گیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے جوش میں آکر سینہ ٹھونکا اور نتیجے میں دیر تک کھانستے، کھنکارتے رہے۔ جب ذرا افاقہ ہوا تو گویا ہوئے۔ شاید اس مضمون کے ختم تک میرا بلڈ پریشر بڑھ جائے گا۔ میں اپنے آپ پر ظلم و ستم برداشت کر سکتا ہوں پولیس ایکشن کے نام پر ملٹری ایکشن کے بعد سے یہی تو کر رہا ہوں لیکن اردو پر ظلم و ستم برداشت نہیں کر سکتا۔ بابا۔ اردو چیخ رہی ہے، زبان رو رہی ہے۔ اسلوب ماتم کر رہا ہے۔ وہ دیکھو، وہ سنو یہ کہہ کر مرزا خاموش ہو کر کچھ سننے لگے۔ ہم نے بھی ان کی اتباع کی۔ ممکن ہے واقعی اردو رو رہی ہو لیکن اردو زبان کوئی پاگل ہے جو روئے۔ وہ تو ہنستی ہے ان لوگوں پر ہنستی ہے جو محض اپنی پست ذہنیت اور تنگ نظری کے سبب اردو کو بدیسی زبان کہتے ہیں۔ مرزا کے توجہ دلانے پر ہم نے عبارت خوانی کے سلسلہ کو جوڑا۔

"مسلمانوں کے بلاشبہ ایسے مسائل ہیں جو ملک کی بہت بڑی اقلیت کے ناطے نہ صرف اہم ہیں بلکہ ملک کی سمت رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے انھیں قومی تحریک کی صحیح اور اصلی ... بنایا ...

شامل کرنے کے لئے ضروری ہے"

یہ سن کر مرزا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور یکبارگی شرارت بھری نظروں سے ہمیں گھورا اور ارشاد فرمایا صاحب زادے یہ "آگے کی سست رفتار" کیا ہوتی ہے۔ یہ سن کر ہم تھوڑے جھینپ سے گئے۔ اور غور کرنے لگے کہ واقعی یہ "آگے کی سست رفتار" کیا بلا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا یہ کیا زبان ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ ہم نے مرزا کو مضمون سنانے کی مصیبت مول لی۔ نہ ہم مضمون سناتے اور نہ مرزا اپنی تنقید کے تیر و نشتر سے فاضل مضمون نگار کے مین ہمارے حسن ظن کو یوں پارہ پارہ کرتے۔ ہمارے جذباتی شکست و ریخت کو بھانپتے ہوئے مرزا نرمی سے بولے۔ اچھا تم ہی بتاؤ اس جملے کے آغاز و اختتام میں کیا ربط ہے۔ ایک جملے میں دو "مرتبہ کرنے کے لئے" کی تکرار مسائل جمع کا صیغہ اور اس کی رعایت سے "ضروری ہیں" پر جملہ ختم ہونا چاہیئے تھا لیکن پھر بھی معنوی اعتبار سے جملہ تشنہ اور مہمل ہی رہتا۔

عافیت اسی میں تھی کہ مضمون کا آخری حصہ سنا کر بخیر گزشت کی راہ سے رخصت ہولیں۔ لیکن ہمارے ارادے سے پہلے مرزا نے فرار کی تیاری شروع کر دی۔ ہم نے کہا مرزا آپ کے خیال میں اس مضمون کو بلحاظ ادب و انشاء کتنے نمبر ملنے چاہیں۔ مرزا نے کہا اگر میں ممتحن ہوتا تو ایسے لائق مضمون نگار کو سو میں سے بارہ نمبر دیتا اور پھر مرزا یہ جادہ جا۔

غزل

لحن کے بستر پہ سوئی شاعری
گنگناتا بھی ہے کوئی شاعری
گر پڑے لہجے کے موتی ٹوٹ کر
جب ترنم میں پروئی شاعری
بن گئے قوال شاعر تھے کبھی
تالیوں میں پٹ کے روئی شاعری
ہم کو تحت اللفظ کی دھرتی ملی
اور ہم نے خوب بوئی شاعری
کر دیا برباد گا کر اے اسد
میرے گانے پر بھی روئی شاعری

قاضی اسد ثنائی
ریاست نگر، حیدر آباد۔۵۹

رشید الدین
حیدرآباد

ہمارا بھی ایک گھر ہے

جی ہاں ! ہمارا بھی ایک گھر ہے اگر آپ اسے گھر کہہ سکیں۔ اور کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے کیونکہ ہندوستان کے بیشتر گھر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور ان ہی گھروں کے حصول کے لئے لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ جس میں مرد کی ایڑی گھس جاتی ہے بلکہ بعض صورتوں میں پاؤں سے الگ بھی ہو جاتی ہے اور نتیجہ میں عورت کی چوٹی ہاتھ آتی ہے۔ اس چوٹی کے بارے میں مرد ابتدا میں بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ ان چوٹیوں کے تعلق سے شاعروں نے جو تشبیہات و استعارے استعمال کئے ہیں۔ وقت بے وقت ان کے حوالے بھی دیتا ہے۔ لیکن بچے پیدا کرنے اور مسلسل گھر کا کام کاج کرتے رہنے سے عورت کی یہ چوٹی بھی چلی جاتی ہے تو وہ بازار سے اک وگ لاکر اس کی کو پورا تو کر لیتی ہے لیکن مرد کو اب تشبیہ یاد آتی ہے اور نہ کوئی استعارہ۔ چوٹی کی چوٹ کھا کر وہ زندگی کی گاڑی ڈھکیلتا رہتا ہے۔ یہ گاڑی کب تک چلتی رہے گی اس کے بارے میں بہ وثوق کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اسی طرح بیسویں صدی تو دنیا کو الوداع کہہ رہی ہے اور اکیسویں صدی کی آمد آمد ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ عقل مند ہندوستانی یہ کہتے ہیں کہ زندگی کی گاڑی اسی طرح چلتی رہے تو بھی غنیمت ہے کیونکہ ہندوستانی سماج اس سے بھی بدتر صورت حال سے دوچار ہو سکتا ہے اس لئے تھوڑے ہی کو بہت جاننے میں عافیت ہے۔

تو میں آپ کو اپنے گھر کا حال سنانے والا تھا۔ وہی گھر جس میں میں گذشتہ ۴۰ سال سے مقیم ہوں۔ میرا گھر بھی بیشتر ہندوستانیوں کی طرح کرائے کا ہے جس کی بہتری کی آج تک کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی لیکن کرائے میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اگر اب بھی میں اسے خالی کر دوں تو کوئی اللہ کا بندہ کئی گنا زاید کرایہ پر اسے حاصل کر لے سکتا ہے۔ اس لئے میں اسے خالی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ حالانکہ ہمارا گھر کیا ہے۔ ایک ویرانی سی ویرانی ہے اور دشت تو رہے نہیں جن کو دیکھ کر یہ گھر یاد آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب کسی بھی حالت میں گھر یاد نہیں آتا۔ پھر ہم روزانہ گھر سے جس طرح نکلتے ہیں اسی طرح لوٹتے ہیں۔

آپ نے دن میں تارے نظر آنے کا محاورہ تو سنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایک محاورہ ہی ہے جس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن میرے مکان میں آپ لیٹے لیٹے واقعی تارے دیکھ سکتے ہیں کیونکہ اس کے کویلو جگہ جگہ سے ہٹ گئے ہیں۔ چھت کی سوراخوں سے دن میں تاروں کا سا منظر رہتا ہے۔ بارش کے موسم میں تارے نظر آنا بند ہو جاتے ہیں اور ان سوراخوں کے ذریعہ پانی مکان میں چلا آتا ہے۔ ایک بار بیوی کے شدید اصرار پر جب میں نے مالک مکان کو اپنے گھر کا حال زار سنایا تو وہ کمال سنجیدگی سے بولے "آپ ایک کام کیجئے" یہ سن کر ہم ہمہ تن گوش ہو گئے کہ پتہ نہیں یہ

کیا کام کی بات بتانے والے ہیں۔ اس پر انہوں نے ذرا رک کر اور پان کا پیک نگلتے ہوئے کہا کہ "آپ بلا ضرورت پال لیجیے۔ گرانی کے زمانے میں کچھ زائد آمدنی ہو جائے گی"۔ میں نے کہا "میں اس وقت مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔ میری جان پر بن آئی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے"۔ اس پر انہوں نے واقعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا کہ "دیکھیے صاحب! میں نے آپ کو یہ مکان جہاں ہے جیسا ہے کی بنیاد پر دیا ہے۔ آپ کو پسند ہے تو رہیے ورنہ خدا حافظ۔ آپ کو دس مکانات مل جائیں گے اور مجھے بھی دس کرایہ دار"۔ ان کے جملے کا صرف دوسرا حصہ صحیح تھا کہ انہیں دس کرایہ دار مل جائیں گے۔ پہلا حصہ بالکل غلط تھا۔ کیونکہ مجھے دس تو کیا سردست ایک مکان بھی نہیں مل سکتا وہ بھی ایسے شرفا کے محلہ میں۔ اب سنجیدگی اختیار کرنے کی میری باری تھی۔ وہ دن اور آج کا دن۔ پھر میں نے مکان کے تعلق سے مالک مکان سے کوئی شکایت نہیں کی۔

بانی شہر حیدرآباد محمد قلی نے اس شہر کی آبادی کے بارے میں جب دعا کی تھی تو شاید وہ عین قبول دعا کا وقت تھا کیونکہ آج قلی قطب شاہ کا شہر انسانوں سے اس قدر بھر گیا ہے کہ جدھر نظر اٹھایئے انسان ہی انسان نظر آتے ہیں اور نظر جھکانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ادھر آپ نے نظر جھکائی اور ادھر آپ ٹریفک حادثہ سے راہی ملک عدم ہوئے اس شہر کے بارے میں پہلے زمانے کے لوگوں سے جو کچھ سنتے ہیں اس پر افسوس ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ ہم نے پیدا ہونے میں دیر کر دی۔ اگر پچاس ساٹھ سال قبل پیدا ہو جاتے تو ہمارے نام بھی مجلس آرائش بلدہ کے دفتر سے ایک خط آجاتا کہ آپ کے نام محلہ ملے پلی میں ایک عدد مکان الاٹ کیا جاتا ہے۔ کرایہ بالکل واجبی ہے۔ اس کا قبضہ آپ کو لینا ہوگا ورنہ مکان میں اندھیرا رہے گا اور اس کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

اس کے بعد بھی سنا ہے کہ لوگ ان مکانوں کا جو سرکاری مکان کہلاتے تھے، قبضہ نہیں لیتے تھے کہ سرکاری مکانوں میں رہنا اس زمانے کے اہل حیدرآباد کسر شان سمجھتے تھے۔ اب اس محلے کا عالم یہ ہے کہ اگر آپ وہاں کرایہ کے مکان کا پوچھنے جائیں تو لوگ آپ کو اوپر سے نیچے دیکھتے ہیں۔ آپ کے حسب و نسب کی دریافت ہوتی ہے اور آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا آپ کسی گاؤں سے تو تشریف نہیں لائے (بلدہ حیدرآباد میں ضلع کو اور اچھے خاصے شہر کو بھی گاؤں کہا جاتا ہے) آپ سے انکم ٹیکس ادا کرنے کی صداقت نامہ پوچھا جاتا ہے۔

تو ذکر ہمارے مکان کا چل رہا تھا اس کے بارے میں خدارا یہ مت سمجھیے کہ اس میں ہم بڑے کروفر سے رہتے ہیں بلکہ ہر وقت ہمیں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ یہ کوئی مکان نہیں ہے۔ دفتر والوں نے رحم کھا کر ہمیں ایک لاکھ روپے قرض بھی دیئے کہ ہم کوئی اچھا سا مکان خرید لیں لیکن صاحب آج کل مکانوں کی قیمت اتنی بڑھ چکی ہے کہ اتنی رقم میں اچھا تو کیا برا مکان بھی نہیں آسکتا۔ البتہ ایک دالان ضرور آسکتا ہے۔ اب ہم صرف دالان کو لے کر کیا کریں گے۔ اس لئے ہم نے رقم بنک میں جمع کر کے خاموشی اختیار کی کہ ذاتی مکان کرایہ کے مکان سے تو اچھا ہو۔ ہماری اہلیہ کا خیال ہے کہ ہم پچھلے دنوں جو شہر میں اتراتے پھرتے تھے اس کی وجہ یہی ایک لاکھ روپے ہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ ہم نے نظیر اکبر آبادی کی طرح پیسوں کی طرف کبھی رغبت سے نہیں دیکھا کہ یہ چیز جہنم میں لے جانے والی ہے بلکہ ہر مہینے جب ایک اچھی خاصی رقم تنخواہ سے کٹ جاتی ہے تو ہمارے دل سے ایک آہ نکلتی ہے کہ کاش ہمیں مکان کا قرض نہ ملا ہوتا۔ اندر کی بات یہ ہے کہ وہ ایک ایک لاکھ روپے بھی آہستہ آہستہ خرچ ہو گئے اور ہم حیدرآباد کے محاورہ کے مطابق "چھا ہو کے

چھابورہ گئے۔

مکان کا ذکر بہت ہو چکا اب مکینوں کا بھی ہو جائے۔ کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے کہ مکان کی رونق مکینوں سے ہے ہمارے گھر کی رونق ایک عدد بیوی، پانچ بچوں، تین مرغیوں، دو کبوتروں اور ایک بلی پر مشتمل ہے۔ جو ہے اس لئے نہیں ہیں کہ بلی موجود ہے اور کتا اس لئے نہیں پالا کہ ایک گھر میں کتا اور بلی ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔ رہا طوطا تو ایک بار پالا تھا جو ایک دن پنجرہ کا دروازہ کھلا دیکھ کر اڑ گیا۔ ہماری اہلیہ کا آج تک ہم پر یہ الزام ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر طوطے کو اڑا دیا۔ سچ تو یہی ہے کہ جس وقت طوطا اڑا اس وقت خود ہمارے ہاتھ کے طوطے اڑ رہے تھے ہاتھوں کے طوطوں پر ہمارا بس نہیں چلا تو پنجرے کے طوطے کی کیا نگرانی کرتے۔

ہمارے گھر میں ہر بات کی تان ہماری ذات ناتوان پر آکر ٹوٹتی ہے۔ مثلاً پرسوں بلی نے کبوتر کو زخمی کر دیا اور یہ سب ہمارے میز کے قریب ہوا لیکن ہم لکھنے میں اتنے محو تھے کہ نہ بلی کی شہ زوری کا احساس ہوا نہ کبوتر کی بے چارگی کا البتہ ہمیں ہوش اس وقت آیا جب گھر کے سارے لوگ ہماری میز کے قریب جمع ہو گئے اور کبوتر کو پانی پلایا جانے لگا اور ہماری مضمون نگاری کو صلواتیں سنائی جانے لگیں۔ کچھ دن قبل کوئی مرغی چور ہماری مرغی چرالے گیا۔ باتیں ہم کو سننی پڑیں کہ آپ تو اپنے کمرہ سے باہر نکلتے ہی نہیں۔ نہ بچوں کی فکر ہے اور نہ جانوروں کی۔ بھلا اکیلی عورت کیا کیا دیکھے گی۔ ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ غنیمت ہے جو ہم اپنی فکر کر لیتے ہیں۔ ایک دن کچھ لوگ (جنھیں محلے کے بچے بلی پکڑ کہتے ہیں) سامنے کی دیوار پر بیٹھی ہماری بلی کو اس کا پھندا ڈال کر پکڑ لے گئے۔ مگر اس معاملہ میں ہم راست ملوث نہیں تھے کیونکہ جس وقت یہ واردات پیش آئی ہم دفتر میں بیٹھے قلم گھسیٹ رہے تھے۔ لیکن گھر کی فضا کو مغموم دیکھ کر ہمیں ایک دوست کے گھر جاکر ایک بلی کا بچہ لانا پڑا جو اب بفضل تعالیٰ ایک بڑی بلی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم پر یہ الزام ہے کہ ہم گھریلو معاملوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔

ویسے یہ بات صحیح ہے کہ جس طرح اور لوگ گھریلو معاملوں میں دلچسپی لیتے ہیں ہم نہیں لیتے یا لینا نہیں چاہتے۔ اکثر لوگوں کو ہم نے دیکھا کہ دفتر یا کام سے گھر واپس آنے کے بعد اسے غور سے دیکھتے ہیں۔ دیواروں کو ٹھوک بجا کر اطمینان کر لیتے ہیں کہ کہیں پلاسٹر کمزور تو نہیں ہو رہا ہے۔ تمام بچوں کو بلا کر گن لیتے ہیں۔ بچوں کو ایک دوسرے کے بازو کھڑا کر کے ان کے قد دیکھتے ہیں اور بیوی سے محلہ بھر کی روئیداد پوچھتے ہیں۔ اگر یہ سب گھر یلو معاملات کی تعریف میں آتا ہے تو ایسے گھر اور اس کے معاملات کو ہمارا دور ہی سے سلام۔

ٹی وی اور بیوی کے فرق کو ایک دانشور نے یہ بتایا کہ ٹی وی کو جب چاہے بند کیا جاسکتا ہے لیکن بیوی کو نہیں پھر ٹی وی کوئی زیبائش نہیں کرتا بلکہ الٹا ہم کو فرمائشی پروگرام دکھاتا ہے۔ جب کہ بیوی کے بارے میں ایسی کوئی گیارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ بچوں کا معاملہ بھی اس سے جدا نہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا رہتا ہی ہے۔ کوئی کتاب گنوا کر آتا ہے تو کوئی کھیل کے میدان پر جوتے چھوڑ آتا ہے اور تو اور پچھلے ہفتہ ہمارے بڑے صاحبزادے کاضی پیٹھ کے عرس کو گئے تو اپنے ایک پیر کا انگوٹھا وہیں چھوڑ آئے۔ بس کے فٹ بورڈ پر کھڑے تھے کہ سفر کے دوران ان کے انگوٹھے کا حصہ باقی جسم سے الگ ہو گیا۔ ہماری بیوی کا خیال ہے کہ ان تمام چیزوں کی ذمہ داری ہمارے سر ہے۔

"... کلرک ہوں"

محبوب مانجھوی
بلاسپور، ایم پی

گردش میں ہوں مدام، ابھی تک کلرک ہوں
عبرت کا ہے مقام، ابھی تک کلرک ہوں!

دن ماہ کا ہے آخری اور جیب میں مری
پیسہ ہے نہ چھدام، ابھی تک کلرک ہوں

جھڑکی بھی روز سنتا ہوں، کھاتا ہوں ڈانٹ بھی
ہوں باس کا غلام، ابھی تک کلرک ہوں

کولھو کے بیل کی طرح چلتا ہوں صبح و شام
آرام ہے حرام، ابھی تک کلرک ہوں

دو دن سے ہے بخار بھی، کھانسی بھی ہے مگر
کرتا ہوں پھر بھی کام، ابھی تک کلرک ہوں

ٹیوشن فری پڑھاتا ہوں بچوں کو باس کے
ہے یہ مرا مقام، ابھی تک کلرک ہوں

رشوت کی ساری مے تو اڑاتا ہے میرا باس
خالی ہے میرا جام، ابھی تک کلرک ہوں

ہے دال بھات سبزی مقدر بنی ہوئی!
نے دودھ ہے نہ جام، ابھی تک کلرک ہوں

"شمشیر آبدار" اگر باس ہیں مرے
میں خالی ہوں "نیام" ابھی تک کلرک ہوں

دی آئی پی نہ ہوسکا اک عمر ہوگئی
بس آدمی ہوں عام، ابھی تک کلرک ہوں

پرنور میری صبح کبھی بھی نہ ہوسکی
بے کیف میری شام، ابھی تک کلرک ہوں!

گھر کا پتہ بتانے میں آتی ہے شرم سی
جھگی میں ہے قیام، ابھی تک کلرک ہوں

ہندوستان میں رہتے ہیں لاکھوں مری طرح
محبوب میرا نام ابھی تک کلرک ہوں،

واحد انصاری
نعمت پورہ، برہان پور،
ایم پی

عقد ثانی

کون کہتا ہے کبھی ہم نہیں ایسا کرتے
چاند کو دیکھکر آنکھیں نہیں سینکا کرتے

تم چھپالیتے اگر کالی کلوٹی صورت
حسرت دید لئے ہم تمہیں ڈھونڈا کرتے

اپنی راہوں میں جلا کرتے سدا گھی کے چراغ
چاپلوسی کے تقاضوں کو جو پورا کرتے

دھونس رہنے دو یہ فادر سے پٹانے والی
جو گرجتے ہیں وہ بادل نہیں برسا کرتے

خیر سے گھوا نہیں بھیجہ ہمارا ورنہ
یخ چڑا ہے پہ ہم آپ کا کپڑا کرتے

تمہارے ہوتے جو کسی پیر کا دامن واقعہ
ہم خواتین میں تعویذ و فلیتہ کرتے

●☆●

سنگ لیلیٰ (نویں قسط)

پرویز یداللہ مہدی

وائلڈ لائف ایکسپرٹ سے ملاقات مکرر

اگلے روز ہم نے ہشیاری یہ کی کہ بلدیہ کے وارڈ آفس کے اسٹور روم میں جانے کے بجائے اسٹور روم انچارج اور غفور میاں کی نظر بچاکر سیدھے دفتر ھذا کے بڑے ارباب مجاز کے اجلاس میں بے دھڑک داخل ہوگئے اتفاق سے ہماری دور بین جو بڑے صاب ایک روز پیشتر ریس کورس لے گئے تھے، ان کے ٹیبل پہ پڑی تھی ۔ہم نے موقع کا پورا فائدہ اٹھایا اور کنڈکٹ سرٹی فیکیٹ ٹیبل پر رکھ کر دور بین اٹھالی اور بڑے صاب کے کچھ کہنے سے پہلے ، حتمی لہجے میں انہیں مطلع کیا ،آپ کے اسپیشل آفیسر صاحب اس اتوار کو کتوں کی کل ہند نمائش دیکھنے جارہے ہیں اور یہ دور بین انہوں نے مجھ سے ادہار مانگی ہے ۔اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو...... ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ بڑے صاب گھلاوٹ بھرے لہجے میں بولے ۔" بالکل کوئی اعتراض نہیں ہے ،آپ شوق سے اپنی دور بین لے جائیے بلکہ آفیسر صاحب کی خدمت میں میرا سلام بھی لے جائیے " بڑے ارباب مجاز کے اجلاس میں تو ہم سب کی نظر بچاکر داخل ہوگئے تھے لیکن واپسی میں غفور میاں کی عقابی نظر سے اپنے کو بچا نہیں سکے کیونکہ وہ اجلاس کے باہر ہی ہماری تاک میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ چائے پانی کے نام پر پورے دس روپے ہم سے وصول کرنے کے بعد ہی موصوف نے ہمارا پیچھا چھوڑا ۔

یہی سوچتے ہوئے ہم دفتر ھذا سے باہر نکلے کہ ایک کتے کی خاطر کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور یہ سودا اگر اسی طرح سر میں سمایا رہا تو پتہ نہیں آگے کتنا کچھ اور بھگتنا پڑے گا تو پھر کیوں نہ اس خطرناک کھیل کو یہیں ختم کر دیا جائے ترک عشق کے ارادے نے جڑ پکڑی ہی تھی کہ اچانک کسی ٹھوس چیز نے پیچھے سے ہمارا شانہ مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا ۔ پلٹ کر دیکھا تو وائلڈ لائف ایکسپرٹ پسٹن جی پالن جی دارو والا مسکراتے نظر آئے ،ان کی چھتری کا دستہ بدستور ہمارے شانے کی ہڈی میں اٹکا ہوا تھا ۔موصوف کافی پستہ قد تھے اس پر ہماری بلند قامتی ہمارے شانے تک ان کا ہاتھ کسی طرح نہیں پہنچ سکتا تھا اسی لیے موصوف نے بذریعہ چھتری ہمارے شانے تک پہنچنے کی کوشش کی تھی ۔حسب عادت پورے دو منٹ تک اپنی بے آواز مسکراہٹ کی قینچی سے بوجھل فضا کو کاٹتے رہے پھر دعا سلام کے فوراً بعد ہاتھ پکڑ کر سیدھے اپنے پسندیدہ دارو کے اڈے پر لے گئے ۔

دارو والا کے آرڈر کے نتیجے میں سارا تام جھام ٹیبل پر سج گیا تب کہیں وہ آمدم بر سر مطلب ہوئے فرمایا ۔ باوا اس دن کا بعد سے تم اپن کو ملا نئیں اور ادھر اپن سالا تمہار او اسطے ایک خوشی کا خبر ایک ہیپی نیوز (Happy News) لے کے فلم مدر انڈیا کا نرگس کا مافک نگری نگری ،دوارے دوارے تم کو ڈھونڈتا پھرتا......

ہم نے جواباً کسی قدر مایوس کن لہجے میں کہا۔"آپ کی یہ خوش خبری ظاہر ہے کتوں کے بارے میں ہوگی۔
"ایس باوا..... "موصوف نے فوراً جواب دیا پھر سوالیہ لہجے میں آگے بولے۔" پن ابھی تم اتنا ڈھیلا ڈھالا آواز میں بات کانے کو کرتا..... ؟ابھی کیا کتا لوگ سے تمہارا انٹرسٹ (Interest) خلاص ہوگیا..... ؟دارو والا نے ہمارے روکھے لہجے سے صحیح اندازہ لگایا تھا، ہم نے بے دلی سے جواب دیا "کیا کرے گا باولجی۔اس معاملے میں کوئی صحیح راہنمائی کرنے والا کوئی پکا گائیڈ ملتا ہی نہیں!"موصوف نے پھٹاک سے جواب دیا۔"ارے باوا ابھی اپن زندہ ہے، پسٹن جی پالن جی دارو والا ابھی مرا نئیں۔کیا۔؟ابھی اپن تمہارے واسطے ایسا گائیڈ ڈھونڈا ہے کہ تم کو ادھر ادھر کدھر بھی بھٹکنا نئیں پڑے گا۔
ہم نے بے تابی سے پوچھا..... کون ہے یہ گائیڈ..... ؟
بولے۔تم بھی کدھر نہ کدھر اس کا نام سنا ہوئیں گا اخبار میں پڑھا ہوئیں نا۔وائس لائف سوسائٹی آف دی ورلڈ، کا پریسیڈنٹ ڈاکٹر ڈی۔ڈی۔کتاوالا۔"
ہم نے حیرت سے یہ نام دہرایا..... "ڈاکٹر ڈی۔ڈی۔کتاوالا..... ؟
موصوف پرجوش لہجے میں بولے۔"ایس ڈاکٹر ڈی۔ڈی۔کتاوالا۔
..... لندن امریکہ، جرمنی سب جگہ سے بہت بڑا بڑا ڈگری اور چھوٹا چھوٹا میم لے کے آیا ہے نیشنل کتا لوگ سے لے کے انٹرنیشنل کتا لوگ تک سب کا ایکسپرٹ ہے بلکہ لاسٹ ورڈ Last Word ہے وہ کیا بولتا تمہارا زبان میں حرف کا آخر کہ آخر کا حرف.....
ہم نے فوراً تصحیح کی..... حرف آخر..... "
وہ بولے۔"ہاں ہاں باوا وئی۔یہ لو پکڑو اس کا وزیٹنگ کارڈ شام میں ہی اس کا ڈسپنسری پہ جانے کا کیا..... تم کو کتا لوگ کا بارے میں ایسا ایسا بات بتائے گا کہ سالا تمہارا جنرل نالج، کا جھولی پھٹ جائیں گا.....!
ہم نے کہا..... "آپ بھی تو میرے ساتھ چلیں گے نا ڈاکٹر کتاوالا کے پاس!
بولے..... سوری باوا آج شام کی گاڑی سے اپن پونا جارہیے، کائے کو بولے گا تو کل نرگس ڈارلنگ کی لوسی ڈارلنگ کا برتھ ڈے ہے۔"
ہم نے حیرت سے پوچھا۔لوسی ڈارلنگ۔! یہ لوسی ڈارلنگ کون ہے۔!"
جواب ملا۔"لوسی ڈارلنگ، ہمارا نرگس ڈارلنگ کی نوی بلی کا نام ہے باوا..... اگر لوسی ڈارلنگ کا کل برتھ ڈے نئیں ہوتا تو اپن تمہارے ساتھ ڈاکٹر کتاوالا کے پاس ضرور چلتا، ویسے گھبرنے کا نئیں اپن نے ڈاکٹر صاب سے تمہارا انٹروڈکشن کرا دیا ہے اس کو ہمارا نام بولے گا تو وہ تم کو پہچان لیں گا ابھی اپن چلتا ہے مجبوری ہے تم اپن کا بل چکا دینے کا صاحب جی۔"موصوف دارو کا بل اور ڈاکٹر ڈی۔ڈی کتاوالا کا شوشہ بلکہ فتنہ چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہوگئے..... ؟
ڈاکٹر ڈی۔ڈی۔کتاوالا کا وزیٹنگ کارڈ ہمارے حق میں اس "ٹرمپ کارڈ عرف ترپ کے پتے سے کم نہیں تھا جو ایسے نازک وقت میں امید کی کرن کا صورت ایک جواری کے ہاتھ میں آتا ہے جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینے کے بعد چٹے پھینک کر دامن جھاڑتے ہوئے اٹھ جانے کا ارادہ کر چکا ہو۔ہمارے دل کی امنگوں میں امید کی اس کی آخری کرن کو

دیکھ کر از سر نو جان پڑ گئی بلکہ اتنی زیادہ جان پڑ گئی کہ پروڈ سیکیں ہی اگلے وقتوں کی مشہور رقاصہ ہیلن کی طرح کیبرے کرنے لگے۔یہی نہیں کو لہے مٹکا مٹکا کر وہ دھکے لگائے کہ شام ہوتے ہوتے دھکیل کر ہمیں ڈاکٹر ڈی۔ڈی کتا والا کے وزیٹنگ کارڈ پر درج پتے پر پہنچا کر دم لیا۔!

ڈاکٹر کتا والا کی ڈسپنسری آبادی سے ذرا ہٹ کر شہر کے نواح میں کافی کھلی جگہ واقع تھی عمارت اگرچہ زیادہ وسیع و عریض نہیں صرف دو منزلہ تھی تاہم کپاؤنڈ کافی کشادہ اور ہرا بھرا تھا پھاٹک پر کافی بڑا بورڈ آویزاں تھا جس پر جلی حرفوں میں ڈاکٹر صاحب کا نام نامی چمک رہا تھا۔اور مخفف صورت میں نہیں بلکہ مکمل شکل میں درج تھا۔ڈاکٹر دیدار خان، ولدار خان کتا والا۔ساتھ میں ڈگریوں کا لمبا چوڑا دم چھلہ بھی تھا۔پتہ نہیں ڈگریوں کی یہ فوج ظفر موج واقعی کہیں سے حاصل کی تھی ڈاکٹر صاحب نے یا اے۔ٹو۔زیڈ انگریزی حروف تہجی کی تختی حرف بہ حرف نقل کر ڈالی تھی، ہم فی الحال اس تحقیق میں گئے بغیر ڈسپنسری میں پہنچ گئے۔

ڈسپنسری بظاہر خالی خالی نظر آ رہی تھی لیکن اس خالی پن اور خاموشی کی تہہ میں ایک عجیب شور، غیر محسوس طور پر سنائی دے رہا تھا، گویا ڈسپنسری کی عمارت اس ویرانے کے مماثل تھی جو بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن ہو۔اس تصور نے ہمیں خاصا نروس کر دیا تھا ہم لرزتے تھرتھراتے قدموں سے چلتے ہوئے ایک راہداری میں پہنچ گئے جس کے اختتام پر ایک بڑا سا دروازہ نظر آ رہا تھا جو اس وقت بند تھا غیر ارادی طور پر ہمارا رخ اسی دروازے کی طرف تھا شاید اندر کسی آدم زاد سے بھینٹ ہو جائے اور یوں ہمارے سر پر تنی خوف کی یہ چادر چاک ہو جائے۔یہی سوچتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک کسی کتے کی غراہٹ سماعت سے ٹکرائی ہم نے ہڑبڑا کر اپنے اطراف و اکناف کتے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر کوئی دم والی مخلوق نظر نہیں آئی سوائے ہمارے اپنے وجود کے، اسی اثناء میں اس نادیدہ کتے کی غراہٹ باقاعدہ بھوں بھوں، میں بدل گئی پھر اس میں دوسرے کتے کی آواز بھی شامل ہو گئی یوں لگا جیسے دو کتے duet میں بھونک رہے ہوں پھر ان کی تعداد بڑھتی گئی بقول پطرس بخاری آن واحد میں کتوں کا مشاعرہ شروع ہو گیا۔گرہیں لگنے لگیں، مصرع اٹھائے جانے لگے، داد کا شور بلند ہونے لگا ہوٹنگ کا ہنگامہ بڑھنے لگا غرض یہ کہ سارے "مشاعرانہ" لوازمات کا مظاہرہ ہونے لگا۔ ہم نے جو یہ صورت حال محسوس کی، فوراً سوچا کہ اس سے پہلے کہ کتوں کی یہ نادیدہ فوج کسی کمرے سے برآمد ہو کر ہمارا محاصرہ کرے ہمیں یہاں سے جان بچا کر نکل بھاگنا چاہیے چنانچہ فوراً دوڑنا شروع کیا، اور دوڑتے ہوئے ڈسپنسری کے بیرونی دروازے تک پہنچے ہی تھے کہ کسی سے بری طرح ٹکرائے، ٹکر اس قدر زور تھی کہ ادھر ہم اور ادھر ٹکرانے والی ہستی دونوں ہی اپنے اپنے متاثرہ عضو کو دبائے دیوار سے ٹک گئے۔جب درد کی لہر کسی قدر کم ہوئی تو ہم نے نووارد کی طرف دیکھا وردی کے اعتبار سے نووارد وارڈ بوائے معلوم ہوتا تھا، میانہ قد، دبلا پتلا نوجوان تھا، ادھر اس کے بھی درد کی شدت میں یقیناً کمی واقع ہو چکی تھی۔ٹیس البتہ باقی تھی تب ہی عجیب کربناک لہجے میں بولا... کیا حضرت اپن آدمی ہیں یا جمبو جیٹ، کیا اسپیڈ سے ٹکرائے بھئی میری ہڈی ہری کر دیئے نا، کیا صور اسرافیل پہ قیامت کا اعلان سن کے بھاگ رہے تھے یعنی کہ

ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے .... !!

کم بخت بات ختم کرتے کرتے، بغیر آرکسٹرا کے گانے لگا۔ ہم نے اسے جھنجھلا کر ٹوکا...... "کیا بھری جوانی میں تمہارے دونوں کانوں پر تالے پڑ گئے ہیں جو تمہیں کتوں کی چیخ و پکار سنائی نہیں دیتی؟" ہم نے اس کی توجہ کتوں کی چیخ و پکار کی طرف مبذول کروائی جو اب بھی سنائی دے رہی تھی لیکن اب وہ نادیدہ کتے کورس میں بھونکنے کی بجائے یوں فرداً فرداً بھونک رہے تھے جیسے ماہر گلے بازوں کے مابین کلاسیکل گائن کا مقابلہ ہو رہا ہو...... ہماری اس توجہ دہانی پر وہ ناہنجار بھاڑ سا منہ پھاڑ کر پہلے تو کچھ دیر تک ہنستا رہا پھر بولا..... "معلوم ہوتا ہے جناب کی سواری پہلی بار یہاں تشریف لائی ہے۔ یعنی کہ

بڑے ارمانوں سے رکھا ہے بلم تیری قسم
پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم ہو پہلا قدم !!

کم بخت موقع محل سے قطع نظر بات بات میں فلمی گیت گانے کے مرض میں مبتلا نظر آتا تھا۔ گیت کا ٹکڑا اور یجنل ریکارڈ پر گلوکاروں نے جتنی مرتبہ دہرایا تھا خود بھی اتنی ہی مرتبہ دہرانے کے بعد آگے بولا...... یہ وقت ڈاکٹر صاحب کے لیکچر دینے کا ہے، اس وقت انوں کلاس لے رہے ہیں یعنی کہ۔ سی۔ اے۔ ٹی کیٹ۔ کیاٹ معنی بلی۔

آر۔ اے۔ ٹی۔ رٹ، ریاٹ معنی چوہا۔ دل ہے ترے پنجے میں تو کیا ہوا۔!!

اس انکشاف پر ہم نے حیرت سے پوچھا..... مگر میاں، کتوں کے بھونکنے سے ڈاکٹر صاحب کے لیکچر اور کلاس کا کیا تعلق؟ بولا..... ہے بہت گہرا تعلق ہے، آج چہار شنبہ ہے ما آج ڈاکٹر صاحب کتوں کی بولیوں پر لیکچر دیتیں۔!

اس انکشاف پر ہم یوں جھٹکہ کھا گئے جیسے بجلی کے تار کو انجانے میں چھو لیا ہو!!

(جاری)

مجید عارف
نظام آباد

احمقوں کی جنت

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جب تک بے وقوف زندہ ہیں، عقل مند بھوکا نہیں مرتا، اپنی عقلمندی سے جہاں خوش پوشاک نوجوان گداگری کے ذریعہ اس ملک کی بے روزگاری کا گلہ گھونٹنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں وہیں کچھ چالاک قسم کے لوگ بھی بنجر زمین سے روپیوں کا پیڑ اگانے کی کامیاب کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنی اس غیر معمولی صلاحیت کے ذریعہ عوام کو لالچ کے جال میں اس طرح جکڑ رہے ہیں کہ بظاہر معصوم لیکن احمق لوگ اس جال کو سائبان سمجھ کر جوق در جوق چلے آرہے ہیں۔ کاروبار کے نام پر یہ خانگی مالیاتی اداروں کے مالک اخباروں کی زینت اس طرح بنتے ہیں کہ اپنے "منہ میاں مٹھو" بننے والا کوئی سیاسی لیڈر بھی ان کے سامنے شرمندگی محسوس کرتا ہوگا۔

مٹی کو سونا بنانے کا گر تو کوئی ان خانگی مالیتی اداروں سے سیکھے۔ نت نئے جاذب نظر دل کو لبھانے والے اشتہارات نہیں ہیں بلکہ اخبار میں روز شائع ہونے والے "سیر و تفریح" کے کالم ہیں کوئی منہ زور مہنگائی پر قابو پانے کا دعویٰ کرتا ہے تو کوئی عالم وجود میں آنے سے قبل ہی لڑکی کے ہاتھ پیلے کرانے کا سہرا اپنے سر لیتا ہے یا بہترین فلیٹ کے مالک بننے کے سنہرے خواب دن میں دکھاتا ہے۔

ایک رییل اسٹیٹ کے نمائندہ نے ہمیں ایک پمفلٹ دکھایا جس میں درج تھا۔ "یہ سنہری موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیں ضروریات زندگی کی تمام سہولیات کے ساتھ ساتھ بہترین گارڈن بھی ہے۔ یہ فلیٹ حاصل کرکے آپ محسوس کریں گے کہ "جنت" میں داخل ہوگئے ہیں" مذکورہ نمائندہ کو ہم نے بتایا کہ جیتے جی ہم جنت میں داخل نہیں ہوسکتے اس کے لئے مرحوم کی شرط ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم جنت کی آرزو تو کرسکتے ہیں مگر بذات خود اس میں داخل ہونے کی حماقت کبھی نہیں کرسکتے...... بعد میں پتہ چلا کہ آسان اقساط پر فلیٹ کا جھانسہ دے کر یہ کمپنی راتوں رات فرار ہوگئی ہے اور یہ حقیقت بھی ہم پر منکشف ہوئی کہ جنت میں داخل کرنے کا جو وعدہ کمپنی نے کیا تھا وہ صد فیصد درست تھا۔ چونکہ اس پراجکٹ میں سرمایہ کاری کرنے والے جیتے جی تو کئی مرگئے اور قرض کے بوجھ تلے جو واقعی مرگئے ہیں یقیناً وہ کمپنی کے مطابق جنت میں داخل ہوگئے ہیں...... کم از کم احمقوں کی جنت میں......"

ہماری آنکھیں حیرت و تعجب سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ اس ترقی یافتہ دور میں انسان چاند پر تک ڈیرا ڈال رہا ہے (اس اطلاع کے ساتھ ہی یہ اشتہار بھی آئندہ آپ کی نظروں سے گزرے گا کہ چاند پر بھی آسان اقساط پر پلاٹس فروخت کئے جارہے ہیں)

کمپیوٹر کی روز افزوں ترقی نے انسانی ذہن و فکر کے زاویے بدل دیئے ہیں۔ایسے ماحول میں کچھ لوگ حقیقی دنیا سے زیادہ خوابوں و خیالوں کی دنیا میں خوش و خرم نظر آتے ہیں۔

تن آسانی کے عادی اور محنت و مشقت سے دور بھاگنے والے جلد دولت مند بننے کا خواب دیکھتے ہیں اور اس خواب کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے انہیں اپنے زور بازو سے زیادہ فینانس کمپنیوں پر بھروسہ ہوتا ہے جو ان کو رجھانے کے لئے اس طرح انعامات تقسیم کرتی ہیں جیسے کوئی عام آدمی نکاح کے بعد کھجور تقسیم کرتا ہے۔دراصل یہ فینانس کمپنیاں اپنے سرمایہ کاروں کے خوابوں کے توسط سے اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھتے ہیں۔گویا احمقوں کی اس جنت میں عقل مند عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں..... لالچ کے سہارے ہی ہی لوٹنے کا بھی ہنر چاہیے نا.......؟؟

مرزا تخیل بیگ آنسو کے مطابق لالچ ایک ایسی بلا ہے جو اس کے پیچھے بھاگنے والوں کو ننگی کا ناچ نچاتی ہے۔لالچ کے ذریعہ کسی چیز کا حاصل کرنا ایسا ہے جیسے چلتی کشتی میں سوراخ کرکے سمندر کا پانی اس مقصد کے تحت حاصل کرنا کہ سفر کے دوران وقت ضرورت کام آئے۔

عقل مند شخص اپنی دانائی سے مخصوص افراد کو بڑی باریکی سے بے وقوف بناتا ہے ہر عقلمند کے بے وقوف بنانے کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں یہ لوگ قانون کے دائرے میں رہ کر احمقوں کا دائرہ حیات "تنگ" کردیتے ہیں۔ ایک ایسے ہی عقلمند نے اخبار میں اشتہار دیا کہ "آپ پانچ ہزار روپے منی آرڈر کرکے ایک عجیب و غریب چیز بذریعہ ڈاک حاصل کر سکتے ہیں۔جس سے آپ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا البتہ آپ ہر کسی کو دیکھ سکتے ہیں...... یہ کارآمد چیز آپ کی ہر مشکل میں کام آئے گی اور اس سے آپ کروڑوں روپیوں کے مالک بن سکتے ہیں......

ظاہر ہے اشتہار پڑھ کر احمق اچھلنے میں پڑ گئے..... لاکھوں احمقوں نے پانچ پانچ ہزار روپے منی آرڈر کردیئے..... اور بذریعہ ڈاک انہیں جو چیز ملی.....وہ "برقع" تھا۔

آخر میں ہم صرف اتنا کہہ کر رخصت ہونا چاہتے ہیں کہ جو دوسروں کے بہت زیادہ کام آتی ہے وہ صرف اور صرف "بے وقوفی" ہے۔اس بے وقوفی کی بدولت ہی کئی لوگ "حلال" کمانے کے لئے "حلال" ہوگئے ہیں..... ٭

فراق کے لطیفے

ٹکراؤ

فراق گورکھپوری الہ آباد میں اپنی رہائش گاہ پر ہر شام اپنے دوستوں کے درمیان بے تکلفانہ گفتگو کرتے اور لطیفے سنایا کرتے تھے۔ ایک بار الہ آباد ہی کے ایک شاعر اپنا کلام سنا رہے تھے۔ ان کے ایک شعر کا مصرع فراق صاحب کا تھا۔ فراق نے ٹوکا تو شاعر صاحب کہنے لگے "کبھی کبھی خیالات ٹکرا بھی جاتے ہیں"۔ فراق نے برجستہ جواب دیا۔ "بھئی سائیکل سے سائیکل ٹکراتا تو درست ہے۔ مگر سائیکل سے کبھی ہوائی جہاز نہیں ٹکرا سکتا"

جواز

کانپور کے ایک مشاعرہ میں، جب فراق اپنا کلام سنا چکے تو ان کے بعد ناظم مشاعرہ نے جن شاعر سخن کو دعوت دی۔ انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا: فراق صاحب جیسے بزرگ شاعر کے بعد، اب میرے پڑھنے کا کیا محل ہے۔ فراق نے برجستہ جواب دیا۔ "میاں جب تم میرے بعد پیدا ہو سکتے ہو تو میرے بعد شعر بھی پڑھ سکتے ہو"

آئینہ

الہ آباد کے ایک مشاعرے میں فراق صاحب کو اپنی عادت کے خلاف کافی دیر بیٹھنا پڑا۔ اور دوسرے شاعروں کو سننا پڑا۔ فراق صاحب کی موجودگی میں جن شاعروں نے پڑھا، وہ سب اتفاق سے موٹے تازے، پاٹ دار آواز والے اور گلے باز تھے۔ وہ باری باری آئے اور پھیکی غزلوں کو سر و تال پر "گا" کر چلے گئے۔ فراق صاحب بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ پہلو بدلتے اور منہ بناتے رہے۔ ان کا بس چلتا تو وہ اٹھ کر چل دیتے۔ مگر بانیان مشاعرہ انہیں کسی نہ کسی طرح روکے رہے..... جب فراق صاحب کا نام پکارا گیا، وہ سب شاعر ایک قطار سے ان کے سامنے ہی بیٹھے تھے۔ فراق صاحب مائک پر آئے اور ان شاعروں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر اعلان کیا۔ "حضرات! آپ اب تک قوالی سن رہے تھے..... اب شعر سنیے۔

انتقام

فراق گورکھپوری جن لوگوں سے ناراض ہوتے تھے۔ ان کے بارے میں لطیفے گڑھ کر اور انہیں مشہور کر دیتے

اپنا غصہ نکال لیتے تھے۔ یونی ورسٹی کے ایک بہت سینیئر پروفیسر سے وہ ناراض ہوئے تو ہر آ۔ نہ جانے والے سے یہ لطیفہ بیان کرتے تھے۔ وہ دیکھئے۔ وہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ وہ میرے لان میں جو آنولے کا پیڑ ہے، صاحب۔ کیا بتاؤں۔ جب سے اس میں پھل آئے ہیں تو سارے محلے کے لڑکے سر شام ہی اس پر ہلہ بول دیتے ہیں۔ اینٹ پتھر چلاتے ہیں کئی بار میں نے ان کو ڈانٹ کر بھگایا۔ مگر صاحب۔ وہ کب ماننے والے ہیں ابھی کل شام مجھے غصہ آگیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ ایک آدھ کو پکڑ کر میں بہت ماروں گا۔ ایک ڈنڈا ہاتھ میں لے کر میں نے ان کو دوڑایا۔ سب بھاگ نکلے، مگر ایک میرے ہاتھ آگیا۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ اندھیرا بڑھ چلا تھا۔ میں نے اس کی گردن پکڑی۔ اور جب چہرہ قریب لاکر میں نے پہچاننے کی کوشش کی تو معلوم ہوا یہ پروفیسر ہے"

منشی پریم چند کا عشق

منشی پریم چند پر فراق صاحب کی ایک تقریر سے سامعین پر جادو سا چھا گیا۔ فراق صاحب نے اپنی تقریر کے اختتام پر ساری محفل کو گل و گلزار بنا دیا۔

فراق صاحب نے فرمایا۔ تب میں بہت چھوٹا تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے اندر ہمت بٹوری اور ایک روز پریم چند صاحب سے یہ پوچھ لیا کہ کیا آپ نے کبھی عشق بھی کیا ہے؟...... تقریر کرتے ہوئے فراق صاحب ذرا ٹھہرے اور اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے سارے سامعین کو دیکھا۔ ان میں تجسس پیدا کیا اور پھر ذرا سا رک کر بولے..... منشی پریم چند میرے منہ سے یہ سوال سن کر تھوڑا سا شرمائے ہلکی سی لالی ان کے چہرے پر آئی اور پھر بولے "ہاں بھئی جس میدان کی طرف میں شام کو سیر کرنے جاتا تھا وہاں ایک گھسیارن گھاس چھیلنے کے لیے آیا کرتی تھی۔ وہ مجھے اچھی لگنے لگی تو میں اس کے پاس جاتا تھا اور کہتا تھا۔ یہاں بھی گھاس ہے۔ یہاں بھی گھاس ہے

سہائے نہیں ہائے

فراق صاحب لال قلعہ کے مشاعرے میں گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی رہائش گاہ پر مدعو کیا۔ جواہر لال جی نے پوچھا "کہیے مسٹر سہائے کیا حال ہے" فراق صاحب نے جواب دیا "پنڈت جی سہائے کہاں اب تو صرف ہائے ہو کر رہ گیا ہوں"

درشنی مشاعرہ

بھلائی اسٹیل پلانٹ کا مشاعرہ تھا۔ فراق صاحب اور شوق مرزا پوری الہ آباد سے ذریعہ ٹرین روانہ ہوئے۔ ماہر نے یونہی برسبیل تذکرہ ان سے پوچھا..... "فراق صاحب آپ وہاں کون سی غزل پڑھیں گے۔ انہوں نے خفگی کے ساتھ جواب دیا" کیا میں پہلے سے سوچ کر کوئی غزل پڑھتا ہوں۔ ماہر سہم کر خاموش ہو گئے۔ غصہ کم ہونے پر ان کی طرف دیکھا اور پھر بڑی نرمی اور بذلہ سنجی کے ساتھ کہا" بھئی ماہر یہ بھلائی کا مشاعرہ۔ اوپر کا اسٹاف مدراس اور نیچے مدھیہ پردیش کے جنگلی مزدور۔ انہوں نے مجھے دیکھنے اور درشن کرنے کے لئے بلایا ہے۔ غزل کون سنے گا۔ کون سمجھے گا۔"

کلام اور کھانسی

آل انڈیا ریڈیو کا ریکارڈنگ اسٹاف بڑی مستعدی سے آواز یں محفوظ کر رہا تھا۔ فراق نے دوران کلام ایک نہایت لطیف فقرہ ان لوگوں پر چست کر دیا جس کی گونج دیر تک رہی "کھانسی چھوڑ کے سب ریکارڈ کر لو"

گیان پیٹھ العام

فراق ہی کے الفاظ میں ایک لطیفہ سنیئے۔ "گیان پیٹھ والوں نے مجھے ایک بڑی رقم اور ایک سرسوتی کی مورتی پیش کی اور اس کا بڑا جشن ہوا۔ تحریک شکریہ کے طور پر میں اپنا فرض نباہنے کھڑا ہوا تو ایک صاحب نے جو کہ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے ماتحت خاص تھے کسی کے اکسانے پر مجھ سے سوال کیا کہ فراق صاحب آپ اتنی بڑی رقم اور سونے کی مورتی کیا کریں گے؟ تو میں نے جواباً کہا کہ ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں ایک ٹین کا بکس نما ڈبہ (سرکاری جگہ) کئی برسوں سے لگا ہوا تھا اس میں ایک سیلڈ قفل لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا (Donate for Widows) کسی وکیل نے ان سے پوچھا حضور آپ یہ چندے کا بکس نہیں کھلواتے ہیں یہ کس دن کھلے گا۔ مجسٹریٹ نے جواب دیا میرے مرنے کے بعد میری بیوہ کیا کرے گی۔؟

روشن علی کرنل، کریم نگر

غزل

میں کیسے کھاؤں یہ سالن بنا دتی کا ہے
دوائی میں میرے پرہیز تو اسی کا ہے
پیو تو میٹھا ہے کپڑے بھی صاف دھلتے ہیں
یہ خاص پانی تو مانیر کی ندی کا ہے
ہمارے دونوں سے ، کھلواڑ کررہا ہے بہت
بلاک لسٹ میں داخل ہوا ابھی کا ہے
سلامتی سے گذرنے دو بیسویں ہی صدی
"سوال بعد میں اکیسویں صدی کا ہے"
امنڈ کے آنے لگا ہے جو پیار گنتے پہ
یقیں ہے مجھ کو یہ معشوق کی گلی کا ہے
جہیز تج کے کمانے کا یہ یقین کرو
نہ نوکری کا ہے دلہا نہ چاکری کا ہے
بڑا ہے بھائی تو گھر کا تو دیکھ بھال کے چل
یہ مال باپ کا تیرا نہیں سب ہی کا ہے

تحقیق و تجزیہ

مصنف: وہاب عندلیب

تبصرہ از: پروفیسر لئیق صلاح

وہاب عندلیب گلبرگہ اور اردو ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ انجمن ترقی اردو (گلبرگہ) کی وہ ایک فعال ہستی ہیں "نرم دم گفتگو گرم دم جستجو" کی عملی تعبیر وہاب صاحب گذشتہ کئی سالوں سے انجمن کے پلیٹ فارم سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے آرہے ہیں۔ اردو ادب کا رشتہ عصری علوم سے جوڑنے میں وہ پیش پیش ہیں۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ وہ باوجود بے شمار مصروفیات کے تصنیف و تالیف کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

وہاب عندلیب کی دو کتابیں "غیاث صدیقی فن اور شخصیت" اور "قامت و قیمت" نظر سے گذر چکی ہیں۔ زیر نظر تصنیف "تحقیق و تجزیہ" متنوع مضامین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ان موضوعات کی تشریح و توضیح، مصنف کے علمی تبحر اور وسیع مطالعہ کی غماز ہے۔

مضمون "اردو زبان و ادب کی ابتداء اور حضرت خواجہ بندہ نواز" میں شمال اور جنوب کی تخصیص کے بغیر ادبا و شعراء کی گراں بہا خدمات پر روشنی ڈالی ہے اور "معراج العاشقین" کے تعلق سے کھل کر تحقیقی انداز میں بحث کی گئی ہے۔

وہاب عندلیب کا تعلق فلسفہ سے بھی رہا ہے۔ اس لئے ان کی تحریروں میں فکر کا عنصر نمایاں ہے "غالب کے تصور عشق" میں اردو کے دیگر شعراء سے ان کا موازنہ کیا ہے۔ تصورات عشق کی نیرنگیوں کا ذکر کرتے ہوئے غالب کے عشق کے اعلیٰ و ارفع تصورات کو پیش کیا ہے۔

مضمون اردو ادب میں نعت گوئی کی روایت میں دکنی شعراء کے یہاں سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہوئے عصر حاضر کے شعراء کے کلام سے بھی نمونتاً شعر نقل کئے ہیں۔ حتیٰ کہ غیر مسلم شعراء کے نذرانہ عقیدت کو بھی فراموش نہیں کیا۔ انتخاب کلام ان کے ذوق اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خلوص اور خوش عقیدگی کا ترجمان ہے۔

وہاب عندلیب نے پریم چند کے افسانوں سے مذہبی رواداری اور یگانگت کی موزوں مثالیں پیش کی ہے اور فرقہ واریت کا ہمنوا سمجھنے والوں کی غلطی کا ازالہ استدلالی انداز میں کیا ہے۔

"ابراہیم جلیس کا سماجی شعور" میں ان کے افسانے، خاکے، ڈرامے، رپورتاژ اور کالم وغیرہ کا بڑی خوبی کے ساتھ احاطہ کیا ہے

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ان کے مختلف مجموعوں کا جن میں الشایئے، مرقعے اور سفر نامے شامل ہیں وہاب عندلیب نے بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے جہاں کسی تصنیف کا تعارف کرایا ہے وہاں اس کے اقتباسات بھی پیش کئے ہیں جس سے فن پارے کی شگفتگی شوخی و طراری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے تخلیقی سفر کا

ذکر سنین کے حوالے سے کیا ہے ممکن ہے مجتبیٰ کی یادداشت میں بھی وہ زمانی ترتیب کے ساتھ محفوظ نہ ہوں۔

مجتبیٰ حسین کے مختلف مرقعوں اور ان سے متعلقہ شخصیتوں کا اجمالی ذکر کیا ہے اور مظفر حنفی کے حوالے سے خاکہ نگاری کے بارے میں جو بات کہی ہے ممکن ہے وہ احساس درپردہ خود وہاب صاحب کا بھی ہو۔ یعنی جی چاہتا ہے کہ وہ ہم پر خاکہ لکھیں اور ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ ہمارا خاکہ نہ لکھ دیں"۔ اردو میں خاکہ نگاری آزادی کے بعد" میں مختلف خاکہ نگاری کے مجموعوں اور اس فن پر لکھی گئی تنقیدی تصانیف کا مکمل جائزہ ہے۔

"علی گڑھ تحریک اور اردو ادب" میں علی گڑھ تحریک کے مقاصد، سرسید اور ان کے رفقائے کار کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔اس عہد کی ایک ممتاز ہستی محمد حسین آزاد کے کارناموں کا ذکر بھی کیا ہے، جو اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔

۱۸۰۰ء سے ۱۸۶۲ء تک کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے وہاب عندلیب نے فورٹ ولیم کالج دلی اور غالب کی نثر کے تعلق سے اظہار خیال لکھا ہے اور اس کا اختتام سرسید کی ادبی خدمات پر کیا۔مگر سرسید سے قبل ۱۸۳۷ء میں حیدرآباد کے ایک امیر شمس الامراء نواب فخرالدین خاں کا ذکر نہیں کیا۔

"امیر خسرو اور ہندوستانیت" "کنڑا ادب کے اہم رجحانات، ان موضوعات پر بھی قلم فرسائی کی ہے۔ خصوصاً مقامی ادب کے بارے میں ان کا یہ تعارفی مضمون بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

جدید دکنی کے ہم عصر شعراء اور دکنی ادب کے چارمینار میں مختصراً دکنی شعراء کو متعارف کراتے ہوئے ان کے فکر و فن کا جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زبان و ادب تغیرات، انقلابات اور رجحانات سے متاثر ہونے کے باوجود اپنے قدیم ورثے سے جڑے رہتے ہیں۔لوگ آج بھی اس کے خاص لب و لہجہ و انداز سے متاثر ہوتے ہیں۔

قومی یک جہتی کے تعلق سے وہاب عندلیب نے ایک نئے موضوع کو پیش کیا ہے۔اخبار شعور کی بیداری میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔اردو صحافت کے اس کرشمے کو ترتیب زمانی کے ساتھ قلمبند کرکے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔

مصنف نے محققین کی توجہ تحقیق طلب امور کی بازیافت اور متنازع مسائل کی یکسوئی کی جانب مبذول کرائی ہے۔اس میں شک نہیں کہ تحقیق نئی جہات سے آشنا ہو رہی ہے لیکن تحقیق کی تشنگی کو دور کرنا بھی ایک اہم فریضہ ہے

اداریہ

☆ زندہ دلان حیدر آباد کی سالانہ تقاریب ۱۹۹۸ء میں منعقد نہیں ہو سکی تھیں۔ لیکن اس مرتبہ ۱۲ اور ۱۳ نومبر ۱۹۹۹ء کو اپنی روایتی شان اور اہتمام کے ساتھ منعقد ہو رہی ہیں۔ نواب شاہ عالم خان صاحب کی سرپرستی میں دو روزہ تقاریب یقیناً کامیابی سے ہم کنار ہوں گی۔ لیکن یہ احساس شدید ہے کہ کاروان مزاح کے بعض قدیم ساتھی آج ہم میں نہیں ہیں۔ بھارت چند کھنہ، رشید قریشی اور مسیح انجم نے اپنی پر لطف تخلیقات کے ذریعہ نثری اجلاسوں کو زندگی بخشنے میں اہم حصہ لیا تھا۔ اسی طرح فکر تونسوی اور دلیپ سنگھ کی بھی یاد آتی ہے۔ جنہیں حیدر آباد اور حیدر آباد کی مزاحیہ ادبی محفلوں سے خاص دلچسپی تھی۔ شعرائے کرام میں بیرون حیدر آباد کے بعض نامور شاعروں کے علاوہ دکنی کے منفرد شعراء سلیمان خطیب، گلی نلگنڈوی اور بعد میں اشرف خوند میری نے مقامی لب ولہجہ میں طنز و مزاح کی چاشنی پیدا کی۔ نثر ہو کہ نظم ان روایتوں کا تسلسل ٹوٹتا نظر آرہا ہے۔ نوجوان نسل جب اردو لکھنے پڑھنے کی طرف ہی مائل نہ ہو تو ادب و تہذیب کی ان شاندار و منفرد سرگرمیوں کا سلسلہ کیسے قائم رہ سکتا ہے؟

☆ شگوفہ کے زیر نظر شمارہ کی کاپیاں پریس جارہی تھیں کہ محبی طالب حسین زیدی کا، جو ان دنوں کراچی میں ہیں، خط ملا۔ جس کے ذریعہ انہوں نے کرنل محمد خان کے انتقال پر ملال کی اطلاع دی ہے۔ اس خط کے بموجب ۲۳ اکتوبر کو شام میں ٹی وی پر کرنل محمد خاں کے سانحہ ارتحال کی خبر سنائی گئی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک بھی ہندوستان کے اُردو اخباروں میں اس منفرد طنز و مزاح نگار ادیب کے انتقال کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ کرنل محمد خان پچھلے کئی ماہ سے سخت علیل تھے، چلنا پھرنا، لکھنا پڑھنا ممکن ہی نہ تھا۔ گذشتہ سال ہم نے کوشش کی تھی کہ کرنل محمد خاں کے لیے ایک خصوصی شمارہ شائع کریں۔ لیکن موصوف نے زیدی صاحب کی وساطت سے اس ضمن میں معذرت چاہی کہ وہ کسی طرح کے قلمی تعاون کے موقف میں نہیں ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ بہت جلد اس قد آور طنز و مزاح نگار کے فن اور شخصیت پر شگوفہ کا ایک خصوصی شمارہ شائع کریں۔

زندہ دلان حیدر آباد کا ترجمان ماہنامہ

شگوفہ

جلد ۳۲ شمارہ ۱۲ حیدر آباد ڈسمبر ۱۹۹۹ء

سرورق : سعادت علی خاں

کمپیوٹر کتابت : SAM کمپیوٹرس، مغلپورہ، 4568373 طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدر آباد

قیمت فی پرچہ ۱۲ روپے زر سالانہ : ۱۴۰ روپے بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل کا پتہ : ۳۱ ٹیچرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدر آباد

فون : (آفس) 4745716 (رہائش) 4576064

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

شگوفہ کا آئندہ شمارہ

سالنامہ

ہوگا

☆ برصغیر کے نامور طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات

☆ انشائیوں، خاکوں، منظومات، ڈرامہ، لطیفوں، کارٹون

☆ منتخب تصاویر اور دو رنگی سرورق پر مشتمل ایک منفرد خاص نمبر

صفحات : ایک سو سے زائد قیمت : بیس روپے

یوسف ناظم

یہ صدی دانشوروں کی صدی ہے

آپ کسی بھی نقطۂ نظر سے غور کریں تو ہماری یہ جانفزا بیسویں صدی پچھلی تمام صدیوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اہم، وقیع اور قابلِ قدر نظر آئے گی۔ یہ نظر کا دھوکا نہیں حقیقت ہے۔ اس صدی کا سب سے اہم اور تازہ ترین واقعہ ہے کہ دنیا میں ہم انسانوں کی آبادی چھ ارب ہو گئی۔ (ہم خواہ برائے نام ہی انسان ہوں کہلائیں گے تو انسان ہی) اس میں شک نہیں کہ چھ ارب کے ہندسے تک پہنچنے کے لئے اور اس کے بعد دنیا کے چند خطوں میں کافی تعداد میں لوگ مارے بھی گئے کچھ بم کے ذریعے اور کچھ حبسِ دم کی بنا پر لیکن ان کی رحلت چھ ارب کے ہندسے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی کیونکہ دنیا میں انسانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ تو جاری رہتا ہی ہے۔ یہ یک رخی ٹریفک نہیں ہے۔ مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ چھ ارب آبادی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا کارنامہ اولادِ نرینہ نے انجام دیا ورنہ پچھلے چند دہوں سے تو ہر معاملے میں لڑکیاں ہی لڑکیاں، لڑکوں کو زیر کرتی نظر آ رہی تھیں۔ بی اے میں اول، بی ای میں اول لڑکی، بینک کا امتحان ہو یا کہیں بھی کسی رینک کا اول نمبر لڑکی ہی کا ہوگا اور تو اور آہنی گولہ زیادہ دور تک پھینکنے میں بھی محترمہ ہی آگے۔ اچھا ہوا اس نومولود فرزند نے ساری دنیا کو بتا دیا کہ نشانے پر پہنچنے کا کام ابنِ آدم ہی انجام دے سکتا ہے۔ اس فرزند کی پیدائش کی خبر سن کر یقین ملتے ہمارا سینہ فخر سے پھول گیا اور سر مردانہ انا کے زیرِ اثر اور اونچا ہو گیا۔ (وہ تو اچھا ہوا کہ گھر کے دروازے سے گزرتے ہوئے ہم نے سر جھکا لیا تھا ورنہ زخمی سر لئے لئے ہمیں پتہ نہیں کہاں کہاں گھومنا پڑتا) کھیل کے میدان میں عورتیں اب مردوں سے نبرد آزما ہونے کیلئے وائلڈ کارڈ (Wild Card) طلب کرنے لگی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ وائلڈ کارڈ برطانیہ کے مشہور شاعر آسکر وائلڈ کی یادگار کے طور پر جاری کیا گیا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ بیابانی کارڈ ایک فخریہ کارڈ ہے اور چونکہ آدمیوں کو دیا جاتا ہے اس لئے اسے جنگلی کارڈ کا نام دینا مناسب نہیں ہے (انسانوں کی کچھ نہ کچھ عزت تو اب بھی ہوتی ہے)۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ بیسویں صدی سے پہلے کی صدیاں اہم واقعات سے خالی گزری ہیں۔ خاصی تعداد میں اہم واقعات پچھلی صدیوں میں بھی ہوئے ہیں اور ان صدیوں میں تو کافی دراز قد اور بلند قامت آدمی بھی پیدا ہوئے ہیں بلکہ بعض بڑے آدمی تو ایسے اولوالعزم اور عالی ظرف تھے کہ ایک صدی میں پیدا ہوئے اور اس کے بعد کی صدی میں بھی کئی سال زندہ رہ کر عالمِ بالا کو سدھارے حیات و موت کے یہ واقعات عام آدمیوں کے ساتھ بھی ہوئے لیکن وہ تاریخی واقعات نہیں تھے۔ عام آدمیوں کی کیا تاریخ پیدائش اور کیا تاریخ وفات۔ تاریخ پیدائش کے تعلق سے جو بھی تشویش اور فکر ہوتی ہے وہ بڑے آدمیوں کی پیدائش کے بارے میں ہوتی ہے یہ لوگ کبھی ایک تاریخ کو نہیں پیدا ہوتے۔ ان کی وفات کے بعد بھی برسوں بلکہ صدیاں گزر جاتی ہیں تب بھی ان کی تاریخ پیدائش مشتبہ ہی رہتی اور محققین مصروف رہتے ہیں جو بھی محقق صحیح تاریخ پیدائش بتاتا ہے کسی نہ کسی "سمان" کا مستحق قرار پاتا ہے اس لحاظ سے بھی بیسویں صدی اہم رہی ہے۔ پچھلی صدیوں میں یہ "سمان" کہاں تھے۔ (ہاں سماں باندھ دینے والے موسیقار ضرور تھے)۔ پچھلی صدیوں میں دانشور بھی پیدا ہوئے لیکن ان دنوں میں بڑے لوگوں کی قدر و منزلت کا رواج نہیں تھا۔ یہ لوگ ایک عام آدمی کی طرح آتے اور چلے جاتے مثلاً ایک صاحب تھے بہت بڑے دانشور، ایسے زبردست دانشور کہ خود ان کے شاگرد بھی بعد میں سقراط کے دانشور ثابت ہوئے۔ ان کا نام تھا سقراط کافی دن تک زندہ رہے۔ صحت بھی ان کی اچھی تھی۔ ہم نے ان کی تصویریں دیکھی ہیں اور ان کی سوانح حیات بھی (ذیل لاگر) جیسی

ہے اور ہمارا اکثر مرتبہ جی یہ چاہا ہے کہ کاش یہ صاحب ہمارے زمانے میں پیدا ہوتے اور ہم ان کا انٹرویو لے کر ان کی تصویر اپنی تصویر کے ساتھ اخباروں میں چھپواتے۔ ان کا ایک خاکہ لکھتے اور ان کے اعزاز میں منعقدہ کسی جلسے میں پڑھ کر سناتے۔ ہم نے خود بھی جلسوں میں لوگوں کے خاکے پڑھ کر سنانے اور بخوبی داد حاصل کی ہے۔ کاش ہم سقراط کا خاکہ لکھنے اور پڑھنے کا اعزاز بھی حاصل کر سکتے۔ خیر جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ افسوس یہ ہے کہ تہنیتی جلسہ اور کوئی عمدہ سمینار تو ایک طرف بیچارے سقراط کو کسی ناکردہ گناہ کی پاداش میں زہر کا پیالہ پینے کی سزا دی گئی۔ یہ عجیب و غریب قسم کی زہر خورانی تھی۔ سزائے موت لیکن طریقہ کار خودکشی۔ پچھلی صدیوں میں دانشوروں کی درگت اسی طرح بنائی جاتی تھی۔ یہ طریقہ آج بھی رائج ہے۔ لیکن اسے درگت بنانا نہیں کہا جاتا۔ ایک تربیت یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر مجرم کو انجکشن دیتا ہے ایک بڑا پیالہ بھر کر زہر نہیں پلاتا۔ شرافت سے کام لیتا ہے۔ ایک واقعہ ہمیں اور بھی یاد آ رہا ہے۔ وہ شاید پندرہویں صدی عیسوی تھی۔ جب اس خطہ ارضی پر گلیلیو نام کا ایک شخص نمودار ہوا۔ یہ شخص صرف دانشور نہیں دانشمند بھی تھا۔ بالکل اپنے پیشرو نیوٹن کی طرح۔ نیوٹن کی فراست کا قصہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ یہ شخص ایک دن کسی باغ میں گھوم رہا تھا۔ گھومتے گھومتے جب تھک گیا تو ایک درخت کے سایے میں بیٹھ گیا۔ وہ یونہی خالی الذہن بیٹھا تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے ایک سیب کسی درخت سے ٹوٹ کر زمین پر آ گرا۔ یہ معمولی بلکہ معمولی سے بھی کم قسم کی بات تھی۔ پھل ٹوٹ کر زمین ہی پر گرتے ہیں اس میں انوکھی بات کیا ہوئی لیکن نیوٹن چونکہ دانشور تھا اس لئے اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک نظریہ مرتب کیا جو آگے چل کر زمین کی کشش ثقل کے عنوان سے مشہور ہوا۔ اس نظریے کی وجہ سے چونکہ لوگوں کے روزمرہ معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑا، اس لئے نیوٹن کی زندگی عافیت سے گزر گئی لیکن غریب گلیلیو اتنا خوش قسمت نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جو واردات ہوئی وہ الگ نوعیت کی تھی۔ نیوٹن نے ایک بے ضرر قسم کا نظریہ پیش کیا تھا جسے لوگوں نے ہنسی خوشی قبول کر لیا لیکن اس گلیلیو نے تو اہل دنیا کی فہم و فراست پر راست حملہ کیا تھا۔ یہ نظریہ نہیں ایک یلغار تھی۔ ٹھیرئیے ہم اس واردات کی تفصیل بیان کئے دیتے ہیں۔ گلیلیو شاید کسی دن شارع عام پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ چہل قدمی اور وہ بھی تیز قدموں سے اس کی عادت تھی جو غالباً موروثی تھی۔ موروثی عادتیں اس زمانے میں عام تھیں اور بچے آنکھ بند کر کے والدین کی عادتوں کا آموختہ کیا کرتے تھے۔ پندرہویں صدی میں دنیا میں اتنا پولیوشن نہیں تھا۔ ہوا صاف ستھری تھی سڑکوں پر ہجوم بھی نہیں ہوتا تھا اس لئے لوگ ورزش جسمانی، دوڑ دھوپ، چہل قدمی اور دیگر ۔ سی اور قدرتی ضروریات کے لئے شہر کی سڑکیں ہی استعمال کرتے تھے۔ یہ مشغلہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا تھا بلکہ سورج نکلتا ہی اس لئے تھا کہ یہ دیکھے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ گلیلیو نے ایک دن صبح کی تفریح کے دوران اچانک یہ محسوس کیا کہ زمین اس کے قدموں کے نیچے سے کھسک رہی ہے۔ اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اچھا ہوا کہ واکنگ اسٹک اس کے ہاتھ میں تھی اس کا سر گھومنے لگا۔ آدمی چونکہ سمجھدار تھا اس لئے اس نے چہل قدمی کو ۲۰۰ قدموں ہی کی حد تک رہنے دیا اور فوراً اپنا بلڈ پریشر چیک کروانے ایک دوست کے گھر بھاگا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور اس کی خوب خبر لی کہ صبح سویرے گلیلیو نے اسے خواب خرگوش سے جگا دیا۔ ڈاکٹر نے کہا تمہارا دماغ خراب ہے۔ نئے نئے خیالات تمہارے بھیجے میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ گلیلیو نے لیکن ڈاکٹر کے سامنے زبردستی اپنا نظریہ پیش کر دیا اور کہا دیکھو ڈاکٹر تم ہو گے اپنے فن کے ماہر لیکن یہ ارضیات یعنی جیولوجی کا مسئلہ ہے۔ زمین گھومتی ہے۔ میری بات مان لو کہ ہماری زمین گھومتی ہے۔ ڈاکٹر نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ گلیلیو کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے یا تو اس کے معدے میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے یا اس کے اعصاب میں کوئی رخنہ پڑ گیا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے بتلائے بغیر ایک گولی پانی میں گھول کر پلا دی اور اسے دو گھنٹے آرام کرنے کا مشورہ دے کر رخصت کر دیا۔ لیکن گلیلیو اب آرام سے نہیں بیٹھ سکا۔ اس نے گھر جا کر ایک مقالہ لکھا۔ اس زمانے میں اسے مقالہ ہی کہا جاتا تھا۔ (شرافت کا تقاضا تھا) گلیلیو نے اپنی تحریر کسی اخبار میں اشاعت کے

لئے بھی بھیج دی۔ اخبار والوں کو تو روزانہ کوئی نہ کوئی مسالہ چاہئے ہی۔ جونہی یہ تحریر چھپی سارے شہر میں ہنگامہ مچ گیا۔ ہنگامہ کیوں یوں سمجھئے کہرام مچ گیا۔ لوگ غم و غصہ میں مبتلا ہوگئے کہ ہائیں یہ زمین کیسے گھومنے لگی۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ زمین پر اتنا بوجھ ہے۔ ۲ ارب آدمی تو اس وقت بھی ہونگے ہی۔ اتنے آدمی، پہاڑوں کی بہتات، مکانوں، درختوں اور جانوروں کی کثرت۔ انہوں نے طے کرلیا کہ اتنے وزن کو اپنے سینے پر لئے یہ زمین گھوم ہی نہیں سکتی اور یہ کہ آسمان ہی گھوم سکتا ہے۔ اس پر کوئی بوجھ نہیں۔ فرشتوں میں افزائش نسل ہوتی نہیں ہے اور زمین سے ادھر اگر کوئی چیز گئی بھی تو وہ صرف روح ہے جسم نہیں اور روح میں وزن ہی کیا ہوتا ہے۔ اوس کی ایک بوند سے بھی کم۔ اس لئے آسمان کو گھومنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ عوام نے گلیلو کے خلاف ایک محاذ بنالیا اور اس محاذ نے رفتہ رفتہ اتنی ترقی کی کہ اس وقت کی حکومت کو بھی گلیلو کے خلاف قدم اٹھانے پر مجبور ہونا پڑا۔ ورنہ عام طور پر حکومتیں کم ہی قدم اٹھاتی ہیں۔ پہلے بھی یہی ہوتا تھا کہ جو بھی حکومت ہوتی حلف اٹھانے کے بعد اتنی تھک جاتی کہ بار دوسر پہ پڑا ہے کہ اٹھائے نہ بنے کی کیفیت پیدا ہوجاتی لیکن چونکہ گلیلو کا نظریہ نہایت خطرناک بلکہ دہشت ناک تھا اس لئے حکومت پر یہ لازم ہوگیا کہ وہ اسے مجرم قرار دے۔ حکومت وقت اگر یہ نہ کرتی تو ایک فوجی حکومت کا قائم ہوجانا یقینی تھا خیر ہمیں سیاست سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ ہم تو صرف یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ پچھلی صدیوں میں ایک تو دانشور مشکل سے پیدا ہوتے تھے اور جو بھی پیدا ہوتے تھے ان کے ساتھ عوام اور عوام کے علاوہ خود حکومتوں کا سلوک اچھا نہیں ہوتا تھا۔ دانشور اس لئے بھی جب بھی پیدا ہوئے ڈرتے ڈرتے پیدا ہوئے اور برسوں تک سہمے سہمے رہے۔ وہ بھی کوئی زندگی تھی۔ ان کا دانشور ہونا ان کے لئے ایک عذاب تھا۔

ہم نے کئی دانشوروں کے حالات حیات و ممات پڑھے ہیں۔ زندگی ان کی بند کمروں میں گزری ہے۔ ایسے بند کمرے، جن کے قریب سے آسائش، عیش اور تعیش نام کی کوئی چیز نہیں گزری۔ ہمیں آج بھی اس کا افسوس ہے۔ اب تو ان کے ورثاء بھی نہیں رہے۔ جنہیں ہم یا ہمارے نمائندہ وزراء صاحبان میں سے کوئی وزیر پرسہ دینے ان کے گھر جاتا اور معاوضے کی یکمشت رقم ان کے لرزتے ہاتھوں پر رکھ کر ٹیلی ویژن کے ذریعے عوام سے داد و تحسین حاصل کرتا۔ ہم نے کئی دانشوروں کو اپنے ملک سے راتوں رات چھپ کر کسی دوسرے ملک میں داخل ہوتے دیکھا ہے، دیکھا ہے کا مطلب خبریں سنی ہیں اور پھر جس ملک میں یہ دانشور پناہ گزیں کی حیثیت سے داخل ہوا اس ملک کا ایک دوسرا دانشور یہ ملک چھوڑ کر اس پناہ گزیں دانشور کے وطن میں اسی حیثیت سے داخل ہوا۔ (جنگی قیدیوں کا تبادلہ بھی اسی طرح عمل میں آتا ہے لیکن اس عمل کے لئے برسوں خط و کتابت اور مخاطبت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جنگی قیدی تو زندہ حالت میں واپس ہی نہیں آتے صرف پوسٹ مارٹم کے لئے ان کے زرہ و خستہ جسم واپس آتے ہیں ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہے۔ ان کی اس حالت میں ان کے محافظین ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کرتے)۔ دانشوروں کی اصل صدی تو اب آئی ہے یا تو آچکی ہے یا آرہی ہے۔ کہا جاتا ہے ان چھ ارب انسانوں میں کم سے کم ۲ ارب دانشور بہرحال موجود ہیں۔ کیا تعجب ایک آدھ ارب زیادہ ہی ہوں۔ یہ سب آرام سے یعنی ہمارے آرام سے ہیں تکلیف تو اب عوام کو ہے جو صرف اس لئے زندہ ہیں کہ دانشوروں کے کئے ہوئے وعدوں کو وہ جھوٹ مانتے ہیں۔ سچ جانتے تو کب کے خوشی سے مرچکے ہوتے۔ ان میں سے کچھ عوام ہوں گے جنہیں وعدوں کی وجہ سے شادی مرگ ہوگئی ہو۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ جب کئی دانشور ایک ساتھ کہیں بیٹھتے ہیں تو یہ انتظار کرتے ہیں کہ کاش کوئی عام آدمی آئے تو ہم اسے اپنی دانشوری سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ اب شادیوں کی محفل میں بھی دانشوروں کو مہمان خصوصی اور مہمان اعزازی و غیر اعزازی کی حیثیت سے مدعو کیا جانے لگا ہے اور محفل عقد میں بھی ان کی وہ عزت و تکریم ہوتی ہے اور ان کی گردنوں میں اتنے ہار ڈالے جاتے ہیں کہ غریب نوشہ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ شادی اس کی ہورہی ہے یا ان مہمانان اعزازی کی۔ اسے فکر یہ ہوتی ہے کہ یہ مہمان رخصت کب ہوں گے تاکہ اس کی رخصتی کی کوئی سبیل پیدا ہو۔ یہ نہ سمجھئے کہ دانشوروں کا یہ اژدحام صرف مردانے میں ہے!! قنات کی دوسری سمت میں کیا ہورہا ہے اس کی روداد کون بیان کرے گا۔ ناطقہ سر بگریباں ہے۔

ضرورت ہے ایک دیوانے کی

ڈاکٹر محبوب راہیؔ
بارسی ٹاکلی، اکولہ

ضرورت ہے کسی سچ بولنے والے دیوانے کی　　جسے کچھ فکر اپنی ہو نہ ہو پروا زمانے کی
جو سچائی پہ مرتا ہو جو سچائی پہ جیتا ہو　　جو سچ کا ذکر ہر لمحہ لمحہ صبح و شام جپتا ہو
جو کچھ بھی بولنے کے واسطے وہ اپنا منہ کھولے　　تو سچ بولے فقط سچ کے علاوہ کچھ نہ وہ بولے
مگر سچ اس کا جو ہو کورٹ والا سچ نہ ہو ہرگز　　کہ اس کے دل میں کوئی خوف کچھ لالچ نہ ہو ہرگز
چلے اس پر منسٹر کا نہ افسر کا کوئی قابو　　کہے ہر چور کو وہ چور ڈاکو کو کہے ڈاکو
جو جھوٹا ہے اسے جھوٹا کہے اور برملا کہہ دے　　گدھا ہر اک جو ہے انساں نما اس کو گدھا کہہ دے
فلک کو وہ فلک کہہ دے زمیں کو وہ زمیں کہہ دے　　جو ہے اسکو کہے "ہے" جو نہیں اس کو "نہیں" کہہ دے
جو شیشے کو کہے شیشہ جو پتھر کو کہے پتھر　　نہ یوں کہ خار کو گل اور گل تر کو کہے پتھر
رکھے تہمت کسی پر اور کسی کو دے نہ گالی جو　　کہے داداؤں کو دادا ، موالی کو موالی جو
جو سمجھے خود کو شوہر اور جو بیوی ہے اسے بیوی　　رکھے خوش باپ ماں کو اور بھائی کو ، بہن کو بھی
کہے رشوت کو رشوت وہ نہ ڈونیشن کہے اس کو　　جو دشمن ہے کوئی تو صاف پھر دشمن کہے اس کو
نہ رکھے کام راہیؔ کی طرح جو استعاروں سے　　الجھتا ہے جو ہر سچائی کے نوکیلے خاروں سے

ہمیں کو کیا زمانے بھر کو اب اس کی ضرورت ہے
سنیں کیا ان دنوں سچ کی زمانے بھر میں قلت ہے

عابد معز

دل ملے یا نہ ملے، فون ملاتے رہیئے

چند دن قبل شہر کے پررونق بازار میں ایک قریبی دوست سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ سلام و دعاء کے بعد میں نے انھیں بتلایا، "پچھلے چھ ماہ سے آپ کے گھر ملاقات کیلئے آنے کی کوشش کررہا ہوں لیکن کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ خوش نصیب کہ آج سر راہ ملاقات ہوگئی۔"

جواب میں میرے دوست نے خوشی کا اظہار کرنے کے بجائے ایک مفید مشورہ دیا۔ گھر آنے کی تکلیف اور تکلف میں وقت یوں ہی نکلا جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم فون پر رابطہ رکھیں، بہت فائدے ہیں۔ پھر انھوں نے اپنے دفتر، گھر اور موبائل فون کے ڈھیر سارے نمبرات دیئے اور جیسے فون پر خدا حافظ کہہ کر چلتے بنے۔

موصوف کے رویہ پر میں ہکا بکا فون نمبرات والا کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑے سوچنے لگا کہ فون پر بات کرنے کے کیا فوائد ہوسکتے ہیں۔ فون پر بات کرنا خط و کتابت سے کسی قدر بہتر اور افضل ہے۔ خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے اگر حساب کیا جائے تو فون پر بات کرنا تین چوتھائی یا پون ملاقات ہوئی۔ پھر بھی پوری ملاقات تو نہ ہوئی۔ شاید مصافحہ معانقہ نہ ہونے سے بہتر ہے کہ فون پر تین چوتھائی ملاقات ہی ہوجائے۔ اس دن کے بعد سے میں فون پر ملاقات کے فائدوں کے بارے میں غور کرنے لگا تو مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ کئی فوائد نظر آئے۔ فون پر ملاقات کرنے سے آپ سفر کی صعوبتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ سفر کی مشکلات اور مصیبتیں جھیل کر آپ منزل مقصود پہنچتے ہیں وہاں پتہ چلتا ہے کہ موصوف گھر پر نہیں، ہوا کھانے باہر گئے ہیں۔ آپ اپنی اس وقت کی حالت کا اندازہ لگائیے۔ بے بسی سے در و دیوار کو تکتے ہوئے انتظار کی زحمت اٹھائیے یا پھر خود بھی ٹھنڈی ہوا پھانکتے ہوئے واپسی کا سفر کیجئے۔

آپ خوش قسمت ہیں اگر آپ کی ملاقات مکینوں سے ہوگئی لیکن پتہ چلتا ہے کہ آپ کے دوست کے سر میں درد ہے، اب آپ ان کا سر دبایئے یا سر درد میں اضافہ کا باعث بنئے۔ وہ اگر بیمار ہیں تو تیمار داری کیجئے یا انھیں ڈاکٹر کے پاس لیجائیے۔ وہ بچوں کو پڑھا رہے ہیں تو آپ بھی زانوئے ادب تہہ کیجئے۔ وہ ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہیں تو آپ بھی ٹی وی گھوریئے یا ٹی وی دیکھنے والوں کو دیکھئے۔ وہ کمپیوٹر سے الجھے ہوئے ہیں تو آپ بھی ادھر ادھر کمپیوٹر میں جھانکئے۔ گھر کی صفائی ہورہی ہے اور گھر میں بیٹھنے کیلئے مناسب جگہ نہیں ہے تو آپ کسی کونے میں کھڑے ہوجایئے یا صفائی کرنے میں مدد کیجئے اور اگر گھر کے مکین باہر جانے کیلئے پر تول رہے ہیں تو آپ بھی الٹے قدم لوٹ پڑیئے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ آپ کو کس صورتحال کا سامنا ہوگا۔

مان لیتے ہیں کہ آپ حد درجہ خوش قسمت ثابت ہوئے ہیں۔ گھر والوں نے آپ کو خوش آمدید کہا اور آپ سے باتیں کرنے بیٹھ گئے۔ دوران گفتگو آپ محسوس کرنے لگے کہ وہ اتنی گرمجوشی نہیں دکھلا رہے ہیں جتنی کہ آپ کو توقع تھی۔ بچوں نے سلام نہیں کیا۔ کھانے کے وقت چائے پر ٹرخا دیا۔ ٹھنڈی چائے اور گرم پانی سے تواضع کی گئی۔ آپ امیدیں لیکر گئے تھے اور مایوس ہوکر لوٹے۔ ایسی غیر متوقع صورتوں سے بچنے کیلئے فون کرلیا کیجئے۔ میرے ایک بزرگ، لوگوں سے فون پر رابطہ رکھتے ہیں۔ فون کے دوران جب ہم ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں تو فوراً پوچھ لیتے ہیں: "کیا تمہارے یہاں کوئی تقریب ہے؟"

ایک کام دو کاج کی طرح آپ فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے کوئی دوسرا ڈھنگ کا کام بھی کرسکتے ہیں۔ کانوں میں ائیر فون

ٹھونس کر اپنے ہاتھوں اور پیروں کو کمیں اور مصروف رکھ سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ فون پر میری تیز اور گہری سانسوں کو سن کر دوسری جانب سے سوال ہوا: "تم اس وقت کیا کر رہے ہو۔" "جاگنگ اور تم؟" میں نے جواب کے ساتھ سوال پوچھا: "میں کپڑے استری کر رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی: "بعض لوگ خطرات سے کھیلنے کے عادی ہوتے ہیں"۔ ایسے لوگ فون پر بات کرتے ہوئے کار چلاتے، سڑک پار کرتے یا کرکٹ اور فٹبال کھیلتے نظر آتے ہیں۔

فون پر بات بگڑ جائے تو اس کا انجام فون بند کرنے پر ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ فون کو پھینک دیا جاتا ہے۔ فون کو پھینکنے کا امکان کم ہی رہتا ہے۔ اس عمل سے خود اپنے نقصان کا احتمال رہتا ہے۔ اس کے برخلاف آمنے سامنے اگر بات بگڑ جائے تو بات بڑھ کر آسانی سے ہاتھا پائی تک جا پہنچتی ہے۔ کمزور اور نحیف و ناتواں لوگوں کو اس بگڑی ملاقات کا بخوبی اندازہ رہتا ہے۔ میرے ایک دوست کو جب غصہ آتا ہے تو خاموشی سے وہ اپنے گھر چلے جاتے ہیں اور گھر پہنچ کر فون پر اپنے غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ "تمہاری حرکت سے مجھے بہت غصہ آیا اور میں صبر اور احتیاط کا دامن تھامے چلا آیا۔ تم اسے میری کمزوری نہ سمجھنا۔ تم بچ گئے ورنہ معلوم نہیں میں تمہارا کیا حشر کرتا۔" اور جواب سنے بغیر فون بند کر دیتے ہیں۔

بعض لوگ جب سامنے ہوتے ہیں تو ان سے بات نہیں ہوتی۔ مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ "تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں" والی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے بلکہ تکتے رہ جاتے ہیں اور دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ بعد میں فون پر دل کی بات بتلائی جاتی ہے۔ بعض اوقات فون پر بھی دل کی بات کا اظہار نہیں ہو پاتا۔ کہنا کچھ چاہتے ہیں اور کہتے کچھ اور ہی ہیں۔

ایک عاشق نے اپنی محبوبہ کو فون کر کے کہا: "میں تمہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ تمہارے حسن میں کھو گیا اور کہنا بھول گیا کہ... کہ... تم آج چپل پہن کر آئی تھیں۔" محبوبہ نے جل کر جواب دیا: "احتیاطاً میں اونچی ایڑی کی سینڈل گھر پر چھوڑ آئی تھی۔"

ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سامنے والا بات ہی نہ کرنے دے۔ اکثر شوہروں کو ایسی ہی صورتحال کا سامنا رہتا ہے۔ بیگم باتیں کرتی جاتی ہیں جبکہ شوہر جماہی لینے اور کبھی گہری تو کبھی ٹھنڈی سانس لینے کیلئے اپنا منہ کھولتا ہے۔ اسے ضروری باتیں بھی فون پر کرنی پڑتی ہیں۔

بعض لوگ بالخصوص خواتین مخاطب شخص کا تنقیدی جائزہ لینے میں ملاقات کا وقت ضائع کر دیتی ہیں۔ ملاقات کے دوران خواتین پتہ لگا لیتی ہیں کہ ملاقاتیوں نے کیا کپڑے اور زیور پہنے تھے۔ انہیں کہاں سے، کب اور کتنے میں خریدا تھا۔ میک اپ کیسا تھا، چال کیسی تھی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ملاقات کے بعد انہیں ڈھیر ساری باتیں یاد آتی ہیں۔ ایسے وقت فون بہت کام آتا ہے اسی لئے یہ شکایت عام ہے کہ خواتین فون پر گھنٹوں گفتگو کرتی ہیں۔

ملاقات کی راہ میں دشواریاں، مجبوریاں اور رکاوٹیں حائل ہو سکتی ہیں۔ دو دلوں کے درمیان زمانہ دیوار بن سکتا ہے۔ دوستوں کے بیچ فاصلہ طویل سے طویل تر ہو سکتا ہے لیکن فون کرنے میں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ بس انگلیوں کو جنبش دینی پڑتی ہے۔ جب میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ آپ میرے گھر سے کتنی دور رہتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔ "زیادہ دور نہیں۔ بس سات ہندسوں یعنی ایک ڈائل کی دوری ہے۔"

فون پر غلط نمبر لگ جانے یا رانگ کال آنے سے دلچسپ اور تفریحی صورتحال پیش آتی ہے۔ غلط اور اجنبی لوگوں سے ملاقات کی سہولت صرف فون پر ہی حاصل ہوتی ہے۔ بالمشافہ ملاقات میں الٹی سیدھی گفتگو کا امکان نہیں رہتا۔

ایک مرتبہ فون اٹھانے پر دوسری جانب سے سلام دعا، اور اپنا تعارف کروائے بغیر ایک نسوانی آواز نے تجسس آمیز لہجہ میں پوچھا: "کیا یہ شکیلہ کا فون نمبر ہے؟"۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو غصہ سے سوال ہوا: "پھر یہ نمبر کس کا ہے؟"

میں نے اپنا تعارف کروایا: "یہ ایک ۵۰ سالہ شریف النفس، خوش شکل و خوش پوش، خوش گفتار اور خوش اخلاق، خوشاد حسین کا مکان ہے۔ کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" جواب میں فون منقطع کر دیا گیا۔

آپ کے ساتھ بھی اس طرح کے دلچسپ واقعات پیش آئے ہونگے۔ رانگ کالز سے بعض لوگ اس حد تک لطف اٹھاتے ہیں کہ رانگ کالز کرنا ان لوگوں کیلئے وقت گزارنے کا مشغلہ اور دوسروں کیلئے سردرد بن جاتا ہے۔

فون پر آپ اپنی شناخت پوشیدہ رکھ سکتے ہیں۔ یوں بھی فون پر آواز تبدیل ہوجاتی ہے۔ آپ نے وہ لطیفہ نما واقعہ سنا ہوگا۔ ایک صاحب کو دفتر کی جانب سے یورپ کے دورے پر روانہ کئے جانے کی اطلاع ملی۔ موصوف نے سب سے پہلے اپنی بیگم کو یہ خوشخبری کچھ سسپنس کے ساتھ سنانا چاہی۔ انہوں نے فون پر بیگم سے پوچھا: "کیا آپ یورپ جانا پسند کریں گی؟" جواب ملا: "ضرور، بصد شوق لیکن آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔" فون پر آپ لہجہ اور آواز بدل کر دوسروں کو پریشان کر سکتے ہیں۔

کسی سے ملاقات کیلئے آپ کو مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جبکہ آپ فون جب چاہے کر سکتے ہیں۔ فون وقت اور اب تو مکان کی قید سے بھی آزاد ہے۔ غلط وقت پر اگر فون ہو جائے تو صرف فون بند کرنا ہی کافی ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک کال کا نقصان ہوتا ہے۔ اس تعلق سے میرا ایک تجربہ سن لیجئے:

فون پر سلام و دعا کے بعد سوال ہوا: "کیا آپ کو میری آواز صاف آرہی ہے، لائین میں کوئی خلل تو نہیں ہے۔"

میں نے جواب دینے کے ساتھ پوچھا: "نہیں لائین بالکل صاف ہے، آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔"

جواب ملا: "آپ مجھے نہیں جانتے میں اپنا فون چیک کر رہا ہوں۔"

مجھے غصہ آیا اور میں نے ان سے کہا: "نیند کے وقت دوسروں کو ڈسٹرب کرنا کسی صورت شریفانہ فعل نہیں۔"

جواب میں پوچھا گیا کہ: "کیا بجا ہے"

میں نے وقت بتلایا: "جی سہ پہر کے تین بج رہے ہیں۔" دوسری طرف سے یہ کہہ کر فون بند کیا گیا کہ "یہ سونے کا مناسب وقت نہیں ہے۔ شرفاء کو صرف رات میں سونا چاہئے۔"

آپ سے ملنے والوں میں کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پسند نہیں آتے۔ کسی کا رنگ نہیں بھاتا، کسی کے قد سے چڑ ہوتی ہے، کسی کی آواز سے کام کے پردے پھٹنے لگتے ہیں تو کسی کے قہقہے ناگوار گزرتے ہیں۔ کسی کے ملنے سے سردرد ہوتا ہے تو کسی کو زیادہ دیر تک برداشت کرنے سے قبض کی شکایت ہوتی ہے۔ لیکن بہرحال سب سے ملاقات ضروری ہوتی ہے۔ تعلقات برقرار رکھنے پڑتے ہیں۔ لوگوں سے قطع تعلق کر کے اکیلے تو رہا نہیں جاسکتا۔ ندا فاضلی نے آپسی تعلقات کی برقراری کیلئے مشورہ دیا ہے:

"دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیئے"

لوگوں سے ملاقات کے دوران دل نہ ملنے کی تکلیف کو کم کیا جاسکتا ہے۔ نسخہ آسان ہے۔ ہاتھ ملانے کے بجائے فون ملائیے۔ میں نے ہاتھ ملانے سے بہتر اور سودمند فون ملانے کو پایا ہے۔ چند فوائد جو میں نے محسوس کئے وہ آپ کے گوش گزار کر دیئے ہیں۔ آپ نے بھی فون کو مفید پایا ہوگا۔ اسی لئے میں نے اس مصرعہ میں تصرف کرنے کی جسارت کر کے اپنے مضمون کی سرخی لگائی ہے۔

"دل ملے یا نہ ملے فون ملاتے رہیئے"

باذغ بہاری، کلکتہ

متاعِ شکر و صبر

جوڑا خدا کے فضل سے ایور گرین تھا
بد شکل اہلیہ تھی تو شوہر حسین تھا

بیوی سے ایک دن کیا شوہر نے یہ سوال
میرے حسیں کہو تو ذرا اپنے دل کا حال

بولی • خدا کا شکر میں کرتی ہوں بار بار
شوہر عطا کیا ہے مجھے جس نے ذی وقار

احسان ہے یہ مجھ پہ خدائے کریم کا
پھر اک ادائے ناز سے شوہر سے یہ کہا

للہ ! اب بتائیے اے میرے ہم سفر
محسوس آپ کرتے ہیں کیا مجھ کو دیکھ کر

بولا • خدا کے نام پہ کرتا ہوں صبر میں
اللہ کے نظام پہ کرتا ہوں صبر میں

شوہر کی بات سنتے ہی بیوی نے یہ کہا
صد آفریں و مرحبا • اے میرے دلربا

کرتی ہوں میں جو شکر تو کرتے ہیں آپ صبر
پھر کیوں نہ آسمان پہ ہوگی ہماری قدر

ہم آج ایک ساتھ ہیں گلزار زیست میں
مر کے بھی ساتھ ساتھ رہیں گے بہشت میں

☆●☆

کوثر صدیقی
گنوری روڈ، بھوپال

مزاحیے

بن ٹھن لے آجا
مست مہینا ہے
ساون کا مرے راجا

●☆●

ساون کی گھٹا چھائی
رات گزرتی ہے
لیتے ہوئے انگڑائی

●☆●

اپنی کہاں باری ہے
دیر ہے شادی میں
آپا ابھی کنواری ہے

●☆●

بستر میں بچھے کانٹے
نیند نہیں آتی
سوؤں میں پیا کیسے

●☆●

یہ کہہ کے سکھی چھیڑے
گاؤں میں تو گوری
کب بانٹے گی اب پیڑے

●☆●

گھر سے نہ نکلنے دے
آؤں سجن کیسے
کتیا موئی بھونکے ہے

●☆●

اک کالی کلوٹی کو
شہر سے لے آیا
میرے لئے سوتن کو

●☆●

کھلوادے مجھے لڈو
عید کے میلے میں
کھچوادے سجن فوٹو

●☆●

دولہا ہے ترانٹ کھٹ
گوری ترے بالو سے
مانگے ہے بڑی پھٹ پھٹ

●☆●

گوری ترے میکے میں
کون ہے وہ پاگل
پھرتا ہے جو میلے میں

●☆●

پایل مری باجے ہے
آؤں پیا کیسے
ساسوا بھی جاگے ہے

●☆●

سید طالب حسین زیدی
بی ۰۰۔ ۱۳ ڈی۔ I۔ گلشن اقبال
کراچی۔ ۷۵۳۰۰ (پاکستان)

استاذی کرنل محمد خاں مرحوم

۲۳ اکتوبر کی صبح ۱۵ اے، عسکری II راولپنڈی کے پتے پر خط کے ذریعہ اپنی آمد کی اطلاع دیتا ہوں لیکن طالع نحس کی ستم رانی کا ملاحظہ کیجئے اسی شام خبر نامے میں سنایا جاتا ہے:

"برصغیر کے ممتاز و نامور مزاح نگار کرنل محمد خاں نوے سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔"

جب بھی خط میں اپنی شدید علالت، ضعیفی اور بینائی سے بڑی حد تک محرومی کا ذکر فرماتے تو دل کی گہرائیوں سے ان کی صحت و سلامتی کیلئے دعا نکلتی اور ساتھ ہی بارگاہ رب العزت میں یہ بھی التجا کرتا۔ الہٰی! مجھ گنہ گار بندے کو یہ موقع نہ دے کہ کبھی میں انہیں مرحومین کی فہرست میں شامل کر کے مغفرت طلب کروں مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ کس کو اس سے یارائے مفر ہے؟

اب جو ۲۴ اکتوبر کی دعائے صبحگاہی کیلئے بارگاہ غفور الرحیم میں ہاتھ بلند ہوئے تو دوسروں کے معمول کے خلاف کرنل صاحب کی صحت و سلامتی کے بجائے پہلی مرتبہ مغفرت طلبی کیلئے اٹھے، جس کے خیال ہی سے دل کانپ جاتا تھا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

تا حر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا
یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

بینائی کی کمزوری اور ناتوانی کے باعث طویل عرصے سے قلم کو ہاتھ میں لینے تک سے عاجز ہو گئے تھے۔ بہ ہزار دقت جب بھی خط لکھتے (بلکہ میری زور زبردستی سے) اپنی معذوری و مجبوری کیلئے معذرت چاہتے اور فرماتے: "اس کو میری کوتاہی یا لاپرواہی نہ سمجھئے۔ ضعیفی کی بھی کیا کیا سوغاتیں ہیں۔ یہ میں خود نہیں جانتا کیوں زندہ ہوں؟"

اپنے بھانجے کی شادی کی تقریب (۱۰ اکتوبر) میں شرکت کیلئے پاکستان آنے کے بارے میں جب حیدرآباد دکن سے میں نے خط لکھا (اگست ۹۹ء) تو ناتوانی کے باعث خود تو نہ لکھ سکے مگر اپنی نواسی "تازیہ سلمہا" سے جواب لکھوایا۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کرنل صاحب کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہونے اور جلد سے جلد راولپنڈی جانے کیلئے میں کس قدر پر شوق تھا کچھ نہ پوچھئے۔ مجھے وہ الفاظ نہیں آتے جن سے اس جذبے کا اظہار کر سکوں۔ شادی خانے میں جب محترمی مشتاق احمد یوسفی صاحب نے استفسار فرمایا "راولپنڈی بھی جاؤ گے؟" مجھے یاد ہے میں نے کہا تھا "پاکستان آنے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ کرنل صاحب سے ملے بغیر واپس چلا جاؤں۔"

اپنے خط میں تازیہ نے لکھا تھا۔ "نانا جی اب بیمار رہنے لگے ہیں۔ بقول آپ کے احساس شکست اور کچھ بار ضعیفی نے شدت کے ساتھ انہیں باور کرا دیا ہے کہ شاید وہ زندگی کی مزید بہاریں نہ دیکھ پائیں۔ نانا جی آپ کے آنے سے بہت خوش ہوئے تھے (کم دسمبر ۹۸ء)۔ آپ دوبارہ ہمیں میزبانی کا شرف بخشیں۔ میں آپ کو نانا جی سے ملتے اور ان میں زندگی کی امنگ پیدا کرتے دیکھوں کہ اب ان کا سرمایہ اور سامانِ زندگی ان کے ہم خیال لوگ، انمول اور خوبصورت یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ وہ آپ کی آمد کی خبر سن کر بے حد خوش

اور جلد سے جلد ملنے کے مشتاق ہیں۔"

میں تہی دست علم و آگہی ایک تیسرے درجے کا لکھنے والا مگر اردو کا فدائی ہوں لیکن کرنل صاحب کے بڑے پن کا ملاحظہ کیجئے ہمیشہ اپنے خط کے ذریعہ میری رہنمائی فرماتے۔ مفید مشوروں سے نوازتے اور ہمت و حوصلہ بڑھا کر مجھ میں خود اعتمادی پیدا فرماتے اور یہ سلسلہ و تعلق تقریباً چھ سات سال کے طویل عرصے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایک مرتبہ خط کا جواب دیر تک نہ ملنے پر مجھ تنگ ظرف نے گمان کیا کہ شاید آپ اپنی شان میں میرے قلم کی بے احتیاطیوں کے باعث مجھ سے ناراض ہیں۔ آپ کی مجھ سے محبت، تعلق خاطر اور اعلیٰ ظرفی کا اندازا ذرا ملاحظہ کیجئے۔ اس ہیچمدان کے خط کے جواب میں فرماتے ہیں!۔

"آپ سے ناراض ہونے کے متعلق تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ جیسی پیاری شخصیت مجھے ہندوستان بھر میں آپ ہی کے روپ میں میسر ہے۔ آپ اپنی آشفتہ سری کی بات نہ کریں۔ آپ کی باتیں میرے دل کو لگتی ہیں۔ آپ کی تحریر کی کشش ہمیشہ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کے مضامین نہایت دلکش ہوتے ہیں۔ پڑھتے ہوئے جی چاہتا ہے ختم ہی نہ ہوں۔ انداز بیان کے علاوہ مطالب کی پختگی دل کو لگتی ہے۔ مضمون لکھنے سے پہلے اپنے "معلقات" سے وجدان حاصل کرنا نہایت نیک اور مفید شگون ہے۔ یہ عادت آپ کی تحریر کو شروع ہی سے دوران مطالعہ آپ کے "ذہین" قاری جا بجا محسوس کرتے ہیں کہ یہ کسی خاص وجدان کا فیض ہے۔ سو اللہ نے آپ کو خوبصورت طرز تحریر دیا ہے اسے جاری رکھیں۔ اشعار پر مبنی فکاہیہ مرقعے (شعر کی شوخی) بہت دلچسپ ہیں۔ اس مجیز خوباں سے چلی جائے اسد والے شغل کو جاری رکھئے شاید کسی دن ایک پورا البم تیار ہو جائے۔

میرے عزیز! "آپ کہیں یہ لکھ لیں بلکہ اپنے لوح سینے پر نقش کر لیں کہ آپ مجھے دل سے عزیز ہیں۔"

حیدرآباد دکن اور راولپنڈی کے درمیان تقریباً دو ہزار سنگ میل نصب ہیں اور بیسیوں رکاوٹیں و مواضعات حائل ہیں مگر جہاں خلوص، ہم خیالی اور جذبہ صادق کی کارفرمائی ہو تو وہ ان ساری رکاوٹوں اور ناقابل تسخیر سرحدوں اور دیواروں کو بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ اللہ نے ہمیں اسی جذبے کے باعث فکری اور ذہنی اعتبار سے ایک دوسرے کے اس قدر قریب کئے رکھا کہ دوئی کا ہر نشان مٹ گیا۔

نومبر کے پہلے ہفتہ میں کراچی سے راولپنڈی جانے اور اپنے ممدوح سے ملنے کا پروگرام طے پاچکا تھا اور بے چینی سے دن گن رہا تھا مگر مجھ سوختہ بخت کی یہ کیسی محرومی ہے۔ اب جاؤں تو کس کے لئے جاؤں اور جا کر کس سے ملوں؟

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

کرنل صاحب!

مانا کہ آپ کو "ہندسوں" سے بڑا پیار تھا اور اسی پیار نے آپ کو ہاتھ سے قلم رکھ دینے پر مجبور بھی کر دیا اور دنیائے اردو ایک ادا "بجنگ آمد" کی گل افشانی کی بہار آفرینیوں سے محروم ہو گئی۔ کاش! آپ نے اپنے "عزیز" اور شیدائی کا تھوڑا تو انتظار کر لیا ہوتا۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی ؟ "نوے" کے ہندسے کے اوپر چند ہی دنوں کا تو اضافہ ہوتا۔ مجھے یہ موقع تو عنایت فرماتے کہ میں اپنی تمام تر کم مائیگی ہائے علم و ہنر کو ناتوانیوں کے باوصف آپ کو احساس تنہائی کے اس عفریت سے نجات دلانے کی سعی مسعود کرتا جسے میں نے یکم اسمبر ۹۸

کے دن آپ کو ڈستے دیکھا تھا.....

حیدرآباد سے روانہ ہوتے ہوئے یہ مصمم ارادہ کرچکا تھا کہ آپ سے تقریباً دو سال پہلے لکھے ہوئے اس خط کے بارے میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ اس خاک ظلمات رنگ کی ناسازگاریوں اور دلِ خانہ خراب کی محرومیوں کے تذکرے کے درمیان اچانک آپ کو غالبِ خستہ جاں کی یاد کیوں آئی؟

گردہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب

رسم امید ہما ناز جہاں بر خیزد

یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہ گئی کہ ہم نشینی کا موقع ہاتھ آنے پر صرف ہندو پاک ہی نہیں بلکہ دنیا کے سب سے عظیم۔ صاحب طرز۔ مزاح نگار "اسد اللہ خاں کی باتیں اور قصے سنا سنا کر اتنا گدگداتا کہ آپ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہوجاتے اور چہرے پر خوشی کے باعث صحت و تندرستی کی سرخی عیاں ہوجاتی اور آپ اپنی ساری نقاہتوں کو بھول کر چاق و چوبند نظر آتے اور میں احساس کامیابی سے مسرور و شاد کام ہوکر درونِ سینہ خوش کامیوں کے ایک دریا کو موجزن پاتا اور فرطِ انبساط سے مخمور و سرشار ہوجاتا۔

دس مہینے پہلے جب رخصت ہورہا تھا تو کرنل صاحب اٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے لپک کر اپنے ہاتھوں سے انہیں اس زحمت سے باز رکھا اور یہ جتا کر واپس ہوا! ۔

"کرنل صاحب! یاد رکھئے میں بھلادینے والی چیز نہیں ہوں۔"

چہرے پر آخری نظر پڑی تو لبوں پر مسکراہٹ کی دلآویزی اور آنکھیں بھیگی ہوئی نظر آئیں۔ خانساماں سراج کو اشارہ کیا وہ باہر تک رخصت کرنے ساتھ ہولیا۔

میں نے منع کرتے ہوئے کہا: "واپس جاؤ وہاں تمہاری موجودگی کی زیادہ ضرورت ہے"...

واحسرتا! کاش کوئی مجھ سے تعزیت ادا کرے

ہا! اسد اللہ خاں، یہ کیا قیامت ہے۔

کاو کاو سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ

صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا!

پاگل عادل آبادی

غزل

جو بھی ان کے مرید ہوتے ہیں
وہ جہنم رسید ہوتے ہیں

بعد شادی کے ہم نے یہ جانا
لوگ کیوں زن مرید ہوتے ہیں

جوتیاں جو چرا کے لاتے ہیں
حاصل روز عید ہوتے ہیں

گر کریں اختلاف بیگم سے
سر پہ جوتے رسید ہوتے ہیں

دور ہوگا کبھی تو پاگل — پن
آپ کیوں نا امید ہوتے ہیں

●☆●

اسرار جامعی
جامعہ نگر دہلی

شاعر اعظم

خبط مجھ کو شاعری کا جب ہوا
دس منٹ میں ساٹھ غزلیں کہہ گیا

سب سے رو رو کر کہا سن لو غزل
تاکہ میں ہوجاؤں پھر سے "نورمل"

رحم لوگوں کو نہ جب آیا ذرا
تو پریشاں ہوکے ہوٹل میں گیا

تا کہ مل جائے اک ایسا آدمی
چائے پی کر جو سنے غزلیں مری

جا کے بیٹھا سات گھنٹے جب وہاں
اک معزز شخص آکے ناگہاں

دیکھتے ہی ہوگیا دل باغ باغ
اب تو ہوگا پیٹ ہلکا اور دماغ

بعد از آداب اور تسلیم کے
میں نے ان سے یہ کہا تعظیم سے

آئیے ! تکلیف اتنی کیجئے
چائے میرے ساتھ ہی پی لیجئے

آکے بیٹھے ساتھ جب کی التجا
آپ کا جو حکم ہو، منگوادوں کا

مسکرا کر پھر تو بولے آنجناب !
مرغ، یخنی، قورمہ، نرگس کباب

شیر مال و شاہی ٹکڑہ فیرنی
اور اگر مل جائے تو "چورن" کوئی

توس، مکھن دودھ کافی رائتا
الغرض جو کچھ کہا منگوالیا !

ناک تک جب کھا چکے میں نے کہا
ہو تعارف اب ہمارا آپ کا

نام ہے اسرار میرا محترم !
ساری دنیا جانتی ہے بیش و کم

"شاعر اعظم" ہوں میں حرمت مآب
وہ یہ بولے میں تو بہرا ہوں جناب

●☆●

احمد جمال پاشا (مرحوم)

اسلم عظیم آبادی

ممتاز نقاد، انشائیہ نگار اور ادیب پروفیسر سید محمد حسنین کا 10 اکتوبر کو کراچی میں انتقال ہوگیا۔ حسنین صاحب کو (پیدائش 2 اکتوبر 1920ء) بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ خاکوں کے علاوہ ایک ڈرامہ، ایک تنقیدی اور ایک تحقیقی کتاب کے مصنف تھے۔ ہلکی پھلکی تحریروں سے انہیں خاص دلچسپی تھی ان کے انشائیوں کا مجموعہ "انشاء خاطر" کے زیر عنوان شائع ہوا تھا۔

صنف انشائیہ کے اولین نقادوں میں سے تھے۔ ان کی کتاب "صنف انشائیہ اور انشائیے" بے حد مقبول کتاب تھی۔ جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ طنز و مزاح اور انشائیوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ حسنین صاحب کے انتقال پر ڈاکٹر ظفر کمالی نے احمد جمال پاشا مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مضمون اشاعت کے لئے ارسال کیا ہے۔ جو ان کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔

مدیر

ڈاکٹر سید محمد حسنین سے ملاقات سے پہلے نہ ہم ان کے اسلم عظیم آبادی ہونے سے واقف تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ حسنین اور اسلم ایک ہی سکے کے دو پہلو واقع ہوئے ہیں۔ اسلم کی حد تک ہم "خستے" قلمکار سوائے ایم اسلم اور اسمٰعیل میرٹھی کی "اسلم کی بلی" کے آشنا تھے۔

ہوا یوں کہ ہم نے کوئی بیس سال پہلے "اودھ پنچ" کا احیاء کیا تو ڈاک کے پلندے سے بلی کے بجائے اسلم صاحب برآمد ہوئے۔ جواب میں تاخیر ہوئی تو حسنین صاحب نازل ہوگئے۔ ہم نے جواباً انہیں تسلی دی کہ "ہم اسلم صاحب کو بھی خط لکھیں گے مگر اس کے لئے آپ اتنا پریشان کیوں ہیں؟"

بولے، "واہ واہ! پریشان کیوں نہ ہوؤں؟ آخر اسلم بھی تو میں ہی ہوں"۔

حسنین صاحب سے اس کے بعد خط و کتابت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جس میں خط کم اور کتابت زیادہ ہوتی۔ اکثر ٹائپ تک کی نوبت آجاتی۔ اس طرح حسنین نے گیاسے بیٹھے بیٹھے ہم پر ڈورے ڈالے۔ یہ خطوط مکاتیب غالب کی طرح کبھی فرمائشی ہوتے کبھی فہمائشی۔ ان خطوں سے ہم بڑے متاثر ہوئے۔ بڑے مختصر خط، کوئی پھڑکتا شعر، کڑکتا مصرعہ یا بولتا فقرہ، ایک آدھ بریکٹ، دو ایک سوالیہ نشان، اللہ اللہ خیر صلا۔ ایک اندازہ ہوگیا کہ آدمی ضرور بے حد سلیقے طریقے کے ہوں گے۔ جب خط جیسی بے ترتیب شے میں یہ ترتیب ہے تو پھر زندگی خود کتنی باترتیب ہوگی۔

ہاں تو ان حضرت نے ہمیں پھانس پھونس کر ہم سے اپنی کتاب پر مقدمہ لکھوالیا۔ جب کوئی ادیب کسی ادیب سے مقدمہ لکھوالیتا ہے تو اس کا درجہ رفیقِ حیات کا ہوجاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ یعنی ہمارے خط نہ لکھنے کی عادت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے

انھوں نے مکتوبی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رکھا۔

ہم دونوں کو انشائیہ سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ مفصل خط و کتابت، صلاح و مشورہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران یونیورسٹی ٹیچرز کانفرنس میں حسنین نازل ہوئے۔ لوگ نوجوانی میں دل کے عارضے میں مبتلا ہوجاتے ہیں مگر یہ جوانی میں ترقی کے عارضے میں مبتلا ہوگئے۔ یعنی اتنی محنت کی کہ صحت برباد کرلی۔ ہم گھر سے نکل رہے تھے کہ ایک صاحب بڑی مریضانہ نزاکت کے ساتھ ہم سے بغل گیر ہوئے۔ معلوم ہوا کہ آپ ہی ہمارے چوتھائی صدی پرانے دوست حسنین ہیں اور مریضِ دل ہونے کے سبب زینے پر نہیں چڑھ سکتے۔ ہم نے لاکھ کہا کہ اسے بھی ترقی کا زینہ سمجھے مگر زینہ پہچانتے تھے۔ چنانچہ ہونے ملاقات کا سلسلہ تادیر جاری رہا۔

اس ملاقات سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ "ہواز ہو" پر جب روشنی پڑی اور پدرم سلطان کا خوشگوار سلسلہ دراز ہوا تو معلوم ہوا کہ نہ صرف پروفیسر محسن کے یہ بھائی ہیں بلکہ ہمارے دوست ڈاکٹر منصور الہدیٰ اور ڈاکٹر عابد حسین صاحبان کے قریب ترین سسرے بھی ہیں اور خاندانی اعتبار سے قابل رشک حد تک محترم ہیں یعنی علمائے صادق پور اور تذکرہ صادقہ سے ان کا براہ راست سلسلہ ملتا ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد جن کے یہ نہ صرف نیاز مند بلکہ عاشقِ صادق ہیں، ان کا بڑی دھوم دھام سے انھوں نے مگدھ یونیورسٹی میں جشن منایا۔ مجھ کو بھی کھینچ بلایا۔

گیا میں، اسلم عظیم آبادی ثم گیاوی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا۔ بنگلہ نما، آراستہ و پیراستہ نہایت خوبصورت کوٹھی جس کی ہر ہر اینٹ ان کی صحت کی گواہی دیتی نظر آتی۔ نایاب کیکٹس کی قطاریں، پھولوں پھلوں اور بیلوں کی کیاریاں، سبزہ، جدید طرز کا کمرہ ملاقات، کمرہ طعام و قیام۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپی سے جو چیز دیکھی وہ یہ کہ ان کا پڑھنے کا کمرہ جو ان کی بیگم کے کمرے سے بھی بڑا ہے۔ اس میں الماریوں میں سلیقے سے نادر و نایاب کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ چاہے حساب کتاب ہو یا شعر و ادب، ہر چیز کی باقاعدہ فائل۔ کیا مجال جو کسی شئے کو تلاش کرنے کی نوبت آجائے۔ ہر الماری میں کتابوں کے اشاریے کا کارڈ، ہر خانے کا علٰحدہ کارڈ یہاں تک کہ جوتے چپل تک کا اشاریہ موجود تھا۔

ان کے گھر میں ان کے حسنِ نفاست و ترتیب اور کتابوں کے بعد سب سے زیادہ کشش ان کی بیگم میں ہے۔ تعریف اس ڈر سے نہ کروں گا کہ میری بیگم نہ بھڑک اٹھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس گھر کو اتنا باقاعدہ بنانے میں یہ برابر کی شریک ہیں۔

حسنین کو کھانے سے زیادہ کھلانے کا شوق ہے۔ جب گیا گیا تھا تو غالباً صحت بنانے کے شوق میں چنوں پر خاص زور تھا۔ لہٰذا شوربے میں چنے، چٹنی میں چنے یہاں تک کہ دودھ میں چنے۔ چنوں کی اتنی عزت افزائی ڈپٹی نذیر احمد کے بعد انہی کے یہاں پائی۔

اسلم کو اچھی کتابوں، اچھے لوگوں، اچھے مال اور اچھے کاموں کا بڑا شوق ہے۔ تحقیق کے اعتبار سے یہ بہار کے پہلے ڈاکٹر ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ نزلے تک کا علاج نہیں کرسکتے۔ بہار میں انشائیہ کے پہلے علمبردار ہیں۔ بچوں کی نفسیات پر انتظار حسین کی طرح انوکھے افسانے لکھنے میں بھی انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

انہیں کام کا سلیقہ ہے۔ ہمیشہ بساط سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ کام شروع کیا بھی تو "سفینۂ نثر" پر یعنی پوری اردو نثر کی گولڈن ٹریزری کا بیڑا اٹھالیا۔ یہی کافی تھا عشق کے لئے مگر کلیم الدین احمد پر ایک یادگار مجلہ تیار کرکے شائع کردیا۔ اب سنا ہے کہ پروفیسر حسن عسکری کی تمام تخلیقات کئی جلدوں میں مرتب کردی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا کلیات مرتب کر ڈالا۔ ایک علمی و تحقیقی مجلہ "نوید" نکالا جو صحت و ضخامت کے اعتبار سے ان کا مثنیٰ معلوم ہوتا ہے مگر زعفران کی پڑیا ہے۔ دو ایک شمارے پڑھ لیجئے، معلوم ہوجائے گا کہ اردو ادب میں کیا ہوچکا ہے یا کیا ہورہا ہے۔

حسنین بے حد باخبر انسان ہیں۔ مشاہیر ادب سے ان کے گہرے مراسم ہیں۔ جو لوگ ادب کے میدان میں ہیں ان کے دوست ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ آپ گوشہ نشین ادیبوں اور عالموں کے بھی دوست ہیں اور ادب کی خفیہ کارروائیوں تک سے واقف ہیں۔

داپڑادوں کی جو نسل تیزی سے ختم ہو رہی ہے اور ہر پرانے بڑے ادیب کی جگہ جو نیا ادیب لیتا ہے۔ تو ایسا نظر آتا ہے کہ ایرانی قالین کی جگہ ٹاٹ کی بوری بچھادی گئی ہے۔ ایسی حالت میں جو دو چار چہرے نظر آتے ہیں ان میں اسلم عظیم آبادی کی شکل بہت نمایاں ہے۔ انہیں دنیا کسی حیثیت سے یاد رکھے یا نہ رکھے مگر انشائیہ نگار کی حیثیت سے ان کا بلند و بالا قد ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ تاریخ ادب ہمیشہ انہیں یاد رکھے گی کیونکہ وزیر آغا کے بعد اس صنف کو جس سلیقے سے حسنین نے برتا ہے اس کی ہندوستان و پاکستان میں دور دور تک کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی۔ اس لئے اسلم اسی طرح ہمیشہ لوگوں کو یاد رہیں گے جیسے کہ اسلم کی بلی اور ایم۔ اسلم۔

ایک لنڈورے کی دعا

روشن علی کرنل —
کریم نگر

بیوی اک بے مثال دے یارب
اس کو حسن و جمال دے یارب

خوب صورت ہو خوب سیرت ہو
رنگ گورا گلال دے یارب

سرو قد اور بدن بھی نازک سا
لمبے تہہ دار بال دے یارب

آنکھیں اس کی تو آہو جیسی ہوں
سیب کے جیسے گال دے یارب

اس کا چہرہ گلاب جیسا ہو
ہونٹ بھی لال لال دے یارب

اس کی آواز ہو لتا جیسی
مادھوری کی سی چال دے یارب

عمر اس کی نہ کم نہ زیادہ ہو
ایک کم بیس سال دے یارب

رات کو دن کہوں تو بس کہہ دے
مجھ کو وہ ہم خیال دے یارب

ہر سے مجھ پہ وہ نثار رہے
میری الفت میں ڈھال دے یارب

گائے جیسی وہ بھولی بھالی ہو
عقل ہے تو نکال دے یارب

عیش بیوی کو میں کراؤنگا
خوب سسرے کا مال دے یارب

روز کرنل کے چائے پانی کو
کم سے کم سو ریال دے یارب

تضمین بر کلام دلاور فگار

نظر برنی
دلی

محرکات غزل

قلم ہو اور ستم ہو تو غزل ہوتی ہے
کسی "غنڈے" کا کرم ہو تو غزل ہوتی ہے
ورنہ رشوت کی رقم ہو تو غزل ہوتی ہے
" اک دوات ایک قلم ہو تو غزل ہوتی ہے
جب یہ سامان بہم ہو تو غزل ہوتی ہے "

ہائے دفتر میں ہے افسر کی مسلسل "بیداد"
اور گھر میں ہے مرے سر پہ یہ بیوی "جلاد"
میں وہاں بھی ہوں پریشان یہاں بھی برباد
" مفلسی ، بھوک ، مرض ، عشق ، بڑھاپا ، اولاد
دل کو ہر قسم کا غم ہو تو غزل ہوتی ہے "

" رنگ و روغن " کے لئے اور " تبدل " کے لئے
" نالہ دل " کے لئے " نالہ بلبل " کے لئے
ہم نے رشوت میں "تحائف" لئے ، کھل کھل کے لئے
" تندرستی بھی ضروری ہے تغزل کے لئے
ہاتھ اور پاؤں میں " دم " ہو تو غزل ہوتی ہے "

مفلسی میں تو نظر آتے ہیں " جوہر " بیکار
جیب خالی ہے تو پھر عقل بھی سکی بیمار
" کورے برتن " سے کہیں سنتا ہے کوئی جھنکار
" صرف نخرے سے تو قطعات ہی ممکن ہیں فگار
ہاں اگر " وہسکی " و " رم " ہو تو غزل ہوتی ہے "

علیم خان فلکی

شرطِ وطن لوٹنے کی

بائیس سال قبل سعودی عرب میں قدم رکھتے ہوئے ہم نے طے کیا تھا کہ جس دن ایک لاکھ روپئے جمع ہوجائیں گے۔ اس کے بعد ایک دن بھی یہاں نہیں رہیں گے۔ ماں باپ بھائی بہنوں کو چھوڑ کر غیروں کے در پر دھکے کھانے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی وطن میں بھوکا مرجائے۔ سوچو تو وطن میں کیا نہیں صرف دولت نہیں تو کیا ہوا لوگ تو اپنے ہیں زمین اپنی زبان اپنی اختیار اپنا۔ یہاں تو ایک قیدی کی سی زندگی ہے بلکہ اس سے بھی بد تر۔ لیکن کیا کرتے۔ ویزا و ٹکٹ جو خرید کر آئے تھے وہ قرض تو اتارنا ہی تھا۔ اگر ان حالات کا پہلے سے اندازہ ہوجاتا تو ہرگز نہ آتے۔ آنکھوں پر پردہ جو پڑ گیا تھا۔ ہر باہر جانے والے کو پھول پہنتے اور دعوتیں اڑاتے دیکھ کر بس سر پر باہر جانے کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔ چھٹی پر آنے والوں نے ہمیں یاس و محرومی کا پتلا بنادیا تھا وہ اپنے لئے تو چار چار بیگ بھر کر لاتے اور ہمارے لئے صرف ایک مدد مدینہ کا کھجور اور ایک گلاس "آبِ زم زم کا پانی"۔ جی ہاں ہمارے ہاں اسے آبِ زم زم کا پانی ہی کہتے ہیں۔

ایک دن کے لئے کبھی ٹیپ ریکارڈ مانگ لو تو کہا جائے گا "وہ آج ہی بچے نے خراب کردیا"۔

ہم نے اپنی شان خود داری کی وجہ سے دوبارہ نہیں مانگا۔ ہمیشہ یہ سوچتے رہے کہ بس ایک لاکھ روپئے جمع ہوجائیں پھر ان تمام ندیدوں کو دکھائیں گے کہ ہم پیسہ رکھتے ہوئے بھی اس نمود و نمائش سے کتنے بے نیاز ہیں۔ ہم جس سے بھی ویزا کی بات کرتے وہ یوں ظاہر کرتا جیسے ہم سے بھی زیادہ پریشان حال ہے۔ یہی روتا روتا کہ "اب پہلے جیسے حالات نہیں ہیں حکومت نے سخت رویہ اختیار کرلیا ہے۔ ہزار پندرہ سو سے زیادہ تنخواہ کی نوکریاں ملتی کہاں ہیں۔ کفیل بہت ستاتے ہیں، قانون بہت سخت ہے بغیر اقامہ کے باہر نکلو تو پکڑ کر بند کردیتے ہیں اور بند کرکے بھول جاتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

جی تو چاہتا کہ ایسے جھوٹوں کے منہ پر طمانچہ رسید کرکے نکل جائیں صاف نہیں کہہ دیتے کہ مدد کرنا نہیں چاہتے بلکہ بہانے بنا کر معصوم عربوں کو بدنام کررہے ہیں۔ دنیا کو اسلام اور اخلاق کی تعلیم سکھانے والی، قرآن و حدیث کو راست عربی میں پڑھنے والی قوم کے بارے میں جب کوئی اس طرح دروغ گوئی کرتا تو ہمیں بڑا غصہ آتا۔ ان کی بہادری و شجاعت، تنگدستی میں شرافت اور امیری میں سخاوت اور سادگی میں کفایت شعاری کے بے شمار واقعات پڑھ کر ہم نے تو بچپن میں ہی یہ سوچ لیا تھا کہ چاہے تنخواہ نہ ملے لیکن اسی مردانہ قوم کے ساتھ رہ کر زندگی گزار دیں گے۔ اور خدا نے ہماری سن لی ہم بہر حال باہر آگئے۔ یہاں اپنے ہم وطنوں کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ نوکری ملتے ہی لوگ اپنے گھر بار کو اس طرح بھول جائیں گے اور دن رات نوکری و ڈیوٹی یا پھر دوست احباب میں گزارنے لگیں گے۔

بار بار یہ خیال آتا کہ کہیں ہم بھی نوکری ملتے ہی ان ہی کے راستے پر نہ چل پڑیں۔ امی ابو یاد آتے۔ منی اور بھیا یاد آتے تو جی چاہتا کل ہی لوٹ جائیں ایسی دولت کا کیا فائدہ جو اپنوں کے پیار سے دور کردے۔ دادا ابا مکہ کے وقت کی باتیں یاد آجاتیں کہ ابو نے کہا تھا "بیٹا جلد سے جلد لوگوں کا قرض لوٹانے کی کوشش کرنا"۔

چنانچہ ہم نے جی کڑا کرکے ارادہ کرلیا کہ چاہے جو بھی ہو جیسی بھی گزرے جلد سے جلد قرض لوٹائیں گے اور اپنے لئے صرف ایک لاکھ جمع کرکے دو تین سال میں وطن لوٹ جائیں گے۔

ہم ان لوگوں میں سے نہ تھے جو ایک لاکھ جمع ہونے کے بعد دو لاکھ کی آرزو کرتے ہیں اور جس دن دو لاکھ جمع ہو جائیں اس دن چار لاکھ والوں کو دیکھ کر احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور اگر چار لاکھ کا انتظام ہو جائے تو آٹھ لاکھ والوں کی ترقی کا غم اس غم سے بھی بڑھ جاتا جس سے بیروزگاری کے زمانے میں دیزا نہ ملنے کی وجہ سے دوچار تھے۔ ہم نے جلد سے جلد لوٹ کر ملک و قوم کی خدمت کرنا طے کر لیا تھا۔

خدا نے پھر وہ دن دکھایا کہ سارے قرض ادا ہو گئے اور ہم نے پورے ایک لاکھ روپے جمع کر لئے اب نہ ہمیں کسی کفیل کی نوکری کی ضرورت تھی نہ کسی باہر سے آنے یا جانے والے کو دیکھ کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کا خدشہ تھا۔ صرف یہ فکر تھی کہ خالی ہاتھ کیسے جائیں لتے عرصے بعد جب جا رہے ہیں تو منتظرین کیلئے کم سے کم اتنا تو لے جائیں کہ وہ بھی یاد رکھیں۔ اس لئے سب کیلئے حسبِ مراتب شاپنگ کرنی پڑی۔ حتیٰ کہ ان کے لئے بھی جنھوں نے ہمیں ایک "کھجور اور " آب زم زم کے پانی " پر ٹرخایا تھا۔ پتہ چلا کہ شاپنگ میں جمع رقم کا بڑا حصہ ختم ہو چکا۔ خیر ہمارے حوصلے ابھی بلند تھے ارادہ کر لیا کہ ایک بار اور آجائیں گے اور اگلے سال مستقل لوٹ جائیں گے۔

اس طرح بجائے خروج نیائی کے خروج دخول حاصل کیا ابھی گھر پہنچ کر ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ طبیعت خراب ہونے لگی۔ نہیں لوگ وہاں کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ ایک تو گرمی دوسرے گھنٹوں بجلی غائب۔ ایک ہاتھ سے اخبار کو پنکھا بنائے دوسرے ہاتھ سے مچھروں کو بھگاتے اور جسم کو کھجاتے پوری رات گزاری جاتی۔ بغیر فریج کے پانی حلق سے نہ اترتا۔ پڑوسیوں کے گھر سے ان کے فریج کا ٹھنڈا پانی منگوایا لیکن بار بار منگوانے پر وہ بھی بہانے بنانے لگے۔

ہم نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ چاہے قرض کیوں نہ لینا پڑے ہم پہلے ایک اے سی اور فریج خرید کر ہی جائیں گے۔ ابا جان نے شرمندلائی کے پہلے ایک آر۔ سی سی کا پختہ گھر تو بنالو ٹپکتی چھتوں اور بوسیدہ دیواروں والے گھروں میں اس قسم کی چیزیں رکھنا ان الکٹرانکس کی توہین ہے۔

واللہ ہم نے یہ نکتہ سوچا ہی نہیں تھا واقعی ہمیں حیرت ہے۔ ہم باہر ہوتے ہوئے ایسے مکان میں رہتے ہیں اگر مستقبل میں ملک و قوم کیلئے کچھ کرنا ہو تو پہلے ایک سلیقے کا مکان بنانا ضروری ہے ورنہ ہماری آواز تو مسجد کے امام صاحب کی طرح بنے اثر رہ جائے گی۔

ہم نے تہیہ کر لیا کہ پہلے مکان پھر ایک لاکھ۔ چاہے اس کے لئے دس سال کیوں نہ باہر گزارنے پڑیں۔

ہم جتنی رقم بھیجتے رہے رسید میں اتنی ہی مزید رقم کی ضرورت کا احساس دلایا جاتا رہا۔ خدا خدا کر کے پچیس لاکھ میں مکان تعمیر ہوا۔ اب وہ وقت آیا کہ مزید ایک لاکھ جمع کر لیں اور واپس چل پڑیں۔

مکان بنانے کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اعلیٰ و شریف گھرانوں سے رشتے آنے لگے ورنہ کمزور بوسیدہ مکانوں میں تو عام طور پر کر کٹ کلرکوں کے ہی رشتے آتے ہیں لیکن الحمدللہ! ڈاکٹروں انجینیروں نے شاندار مکان دیکھتے ہی پیامات بھجوائے۔ کسی لڑکے کو جہیز میں کار درکار تھی کسی کو فلیٹ کسی کو صرف پانچ چھ لاکھ نقد۔

ایک ڈاکٹر یا انجینیر کو اگر پانچ چھ لاکھ میں خریدنا پڑے تو سودا برا نہیں اور یوں بھی ہم تو خدمت خلق کیلئے پیدا ہی ہوئے ہیں اور یہ بہنوں کی خوشی کا معاملہ تھا۔ لہٰذا ہم نے ارادہ کر لیا کہ پہلے بہنوں کی شادی پھر ایک لاکھ کا بینک بیلنس۔

خدا خدا کر کے بہنیں وداع ہوئیں پھر ہمارے بھی سہرے کے پھول کھلے۔ ابھی دل بھر کر دلہن کو دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ چھٹی ختم ہو گئی۔ سوچا کہ جاتے ہی پہلے بیوی کو بلالیں گے تاکہ اسے بھی باہر کی دنیا نہ دیکھنے کی شکایت نہ رہے۔ لیکن خیر خواہ بہنوئی نے شرم دلائی کہ والدین کو حج کروا ئیے پھر بیوی کو بلائیں۔

اللہ کا شکر کہ والدین نے حج کرلیا، بیوی ساتھ رہنے لگی۔ اللہ نے دو بیٹیوں سے نوازا اور ایک لاکھ بھی جمع ہوگئے۔ بیوی نے بتایا کہ اب ایک خاندان کیلئے وطن میں گزارا آسان نہیں رہا۔ کم سے کم بیس ہزار روپئے ماہانہ درکار ہیں۔

اگر ہم ایک لاکھ لے کر آج لوٹ جائیں تو چار ماہ کے بعد پھر کہیں کے نہ رہیں گے۔ نہ ہمیں کوئی نوکری دے گا نہ قرض دے گا اور نہ ویزا۔ اس لئے ٹھنڈے دماغ سے سوچ کر فیصلہ کیا کہ پہلے ایک مناسب کاروبار تلاش کرلیں پھر ایک لاکھ جمع کر کے لوٹ جائیں۔

اب بیوی کو لڑکیوں کے مستقبل کی فکر ستانے لگی۔ اس نے یہ نکتہ بھی ہمیں بتایا کہ بچیوں کے نام پر کم سے کم ایک ایک فلیٹ ہونا چاہئے تاکہ کل خدا نخواستہ ہم نہ رہیں تو بچیوں کے لئے کسی سے مانگنے کی ضرورت نہ پڑے۔ جو شخص بیس سال باہر گزار چکا ہو اس کی بیٹیوں کے لئے رشتے بھی اس کی کمائی کے تناسب سے ہی آئیں گے۔ ہم نے ماں باپ، بہنوں اور بھائیوں پر بے پناہ خرچ کیا اب ہمارا فرض بنتا ہے کہ اپنی اولاد کیلئے بھی کچھ کریں۔

اب ہم یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں کہ چاہے ہمیں دس سال اور باہر رہنا پڑے پہلے بیٹیوں کے بہتر مستقبل کے لئے کچھ کریں گے۔ پھر ایک لاکھ اپنے لئے جمع کر کے وطن غیر کو خدا حافظ کہہ دیں گے۔ لیکن ہماری ماہر معاشیات بیوی نے سمجھایا کہ دس بیس سال قبل ہم ایک لاکھ جمع کر کے لوٹنا چاہتے تھے۔ روپے کی قیمت کے اعتبار سے اب ہمیں کم از کم بیس لاکھ روپئے جمع کرنے ہوں گے!

اب ہم سوچتے ہیں کہ اس کے لئے مزید کتنے سال ہمیں دیار غیر میں مقیم رہنا پڑے گا؟۔

غزل

فرید سحر
نرسا پور

ان کے دل میں میری عزت رہی تو کیا نہیں رہی تو کیا
سر پہ پگڑی بھی سلامت رہی تو کیا نہیں رہی تو کیا

نام دولت خاں رکھا ہے میں نے بیٹے کا مگر
پاس میرے تھوڑی دولت رہی تو کیا نہیں رہی تو کیا

ہم تو آپس میں ہی لڑ کے مرتے ہیں اب رات دن
اب سکوں سے اپنی ملت رہی تو کیا نہیں رہی تو کیا

لوگ عادی ہوگئے ہیں اب تو رشوت کے یہاں
چاہے ان کے گھر میں برکت رہی تو کیا نہیں رہی تو کیا

بات پر مرشد کی ہر اک لاتے ہیں ایماں مرید
ان کی باتوں میں حقیقت رہی تو کیا نہیں رہی تو کیا

گوری چمڑی پر ہی خود کو کہتے ہیں بیوٹی کوئین
نازنینوں میں نزاکت رہی تو کیا نہیں رہی تو کیا

آستانوں پر سحر بھی اب سر جھکاتے ہیں مگر
آستانوں سے عقیدت رہی تو کیا نہیں رہی تو کیا

غوث خواہ مخواہ
(ممبئی)

ایسے تھے خمار صاحب

۲۱ فروری ۹۹ء کی شب جدہ میں جناب محسن باعزال کے دولت خانے پر جناب کلیم عاجز صاحب کی وداعی تقریب میں مشاعرے کے دوران کسی نے کہا: "خمار صاحب کا انتقال ہوگیا۔" اس سے قبل کہ میں ان کے انتقال سے متعلق مزید معلومات حاصل کرتا مائیکروفون پر میرا نام پکارا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے وہاں کیا پڑھا یا کیا سنایا، اس لئے کہ اس وقت میرے ذہن کے پردے پر جناب خمار صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے یادگار لمحات کی فلم چل رہی تھی۔

کم و بیش بارہ (۱۲) سال قبل دوبئ کے ایک بین الاقوامی مشاعرے میں مجھے پہلی بار خمار صاحب کے ساتھ شرکت کا موقع ملا۔ اس وقت انہیں شراب چھوڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مشاعرے سے قبل دو گھنٹوں تک اسٹیج کے پیچھے جہاں ہندو پاک کے مشہور و معروف شعراء شغلِ مئے نوشی میں مصروف تھے وہیں ان کے ساتھ بیٹھے خمار صاحب صرف وِلفرس اور کاجو سے لذت کام و دہن کا کام لے رہے تھے۔

ایک ایسے رند بلانوش کا جو ایک عرصہ دراز تک بنتِ عنب کی زلفوں کا اسیر رہ چکا تھا اور کچھ عرصہ قبل ہی اس کافرہ کو اپنے منہ سے چھٹکارہ دلانے میں کامیاب ہوا تھا، ایسی توبہ شکن محفلِ مئے نوشی میں اس سے برملا کنارہ کشی کرتے دیکھ کر ان کے ضبط و تحمل کی داد دینی ہی پڑی۔ بلانوشی کے باعث نیم مدہوش شعراء کے ہاتھوں مشاعرے کا جو حشر ہوا سو ہوا لیکن قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ خمار صاحب نے اس باقی ماندہ مشاعرے کو اپنے کلام بلاغت نظام اور دلنواز ترنم سے پوری طرح ڈوبنے سے بچالیا۔

میں نے اس وقت ان سے شرارتاً پوچھا: "قبلہ ایک طویل عرصہ تک شراب کے عادی رہنے کے بعد جب آپ نے اسے عاق کردیا تو اب دو گھنٹے ان بلانوشوں کو پیتے پلاتے دیکھ کر دوبارہ اس کافرہ کو اپنے منہ لگانے کی خواہش نہیں ہوئی... ؟"

مسکراتے ہوئے فرمایا: "میاں مت پوچھو کہ کتنا صبر و تحمل سے کام لیا ہے۔ لگ رہا تھا کہ صبر کا دامن اب چھوٹا کہ تب چھوٹا۔ بس یہ سمجھو کہ پیغمبری وقت گزار کر آیا ہوں۔" پھر بطور لطیفہ ارشاد ہوا: "مجھ سے جب بھی میرے بہی خواہ کہتے کہ آپ شراب پینا کیوں نہیں چھوڑ دیتے تو میں ان سے کہتا کہ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ شراب چھوڑنا تو اتنا آسان ہے کہ میں خود بیسوں بار چھوڑ چکا ہوں۔ مگر اب الحمد اللہ ایک بار صدقِ دل سے توبہ کرلی ہے تو اب اس کا میرے منہ لگنا مشکل ہے۔" میں نے عرض کیا: تو قبلہ یوں کہئے کہ:

اللہ کا کرم ہے کہ عرصہ سے اے خمار
لگتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر چھٹی ہوئی

پھر مختلف مشاعروں میں ان کی صحبت نصیب رہی۔ جب بھی ملتے مجھے اپنے قریب بٹھاتے میری مزاحیہ شاعری کی خواہ مخواہ تعریف کر کے میرے حوصلے بڑھاتے۔ ایک بار ممبئی کے دور افتادہ ضلع کے ایک مشاعرے میں تشریف لے آئے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا جیسا کہ عموماً ہوتا آیا ہے اکثر مشاعروں میں منتظمین اور مشہور و معروف شعراء کو ہوٹلوں میں نہ صرف ٹھہرانے اور آرام دہ کرنے فراہم کئے جاتے

ہیں بلکہ ان کی فرمائش پر ان کی دوسری ضروری اور غیر ضروری ضروریات کی فراہمی کا معقول انتظام کیا جاتا ہے۔ اسی لئے مجھ جیسے غیر معروف اور مزاح گو شاعر کو اتنا چھوٹا کمرہ دیا گیا تھا کہ پلنگ بھی اس سے کافی چھوٹا ہی ہوگا۔ یوں سمجھئے؛

اس قدر تنگ میرے حصے میں کمرہ آیا
پاؤں پھیلاتا تو دیوار سے سر لگتا تھا

خیر! افطار سے کچھ دیر قبل ایک سفاری بیگ لئے ہوٹل کے اس قبر نما کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا جس کا دروازہ میں نے ہوا کی آمد و رفت کیلئے کھلا چھوڑا تھا۔ مجھے اکیلا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر فرمایا؛ "چلو اچھا ہوا کہ تم یہاں ہو۔ یہاں سکون سے رہ سکوں گا۔"

میں نے عرض کیا؛ "قبلہ، محترم! یہ کمرہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ بہت ہی چھوٹا ہے بلکہ پلنگ بھی ایک نفری ہے۔ اب آپ آہی گئے ہیں تو کچھ دیر سستا لیں میں منتظمین سے مل کر آپ کیلئے بہتر کمرے کا انتظام کروادونگا۔"

کہنے لگے؛ "یہ اگر واقعی کمرہ ہے تو بھی تمہارے نام سے بک ہے، اس لئے پلنگ پر تم ہی سوؤ گے، میں نیچے کہیں بھی پڑا رہونگا۔ مجھے جس بڑے کمرے میں ٹھہرایا گیا ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں چار پلنگ موجود تو ہیں مگر وہاں مقیم شعراء حضرات رات کے مشاعرے میں شرکت سے قبل دوپہر ہی سے بطور ریہرسل پئے جارہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ کم بختو! کم از کم افطار کے وقت تک تو احترام کرو لیکن میری کون سنتا۔ پھر پتہ چلا کہ تم بھی یہیں کہیں ٹھہرے ہو تو ڈھونڈتا ڈھانڈتا یہاں آگیا ہوں۔ اب اگر تم بھی اپنے ساتھ نہ رکھنا چاہو تو ٹھیک ہے، میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔"

میں نے انہیں پلنگ پر لٹا دیا تو بولے؛ "میں اس عمر میں اتنا طویل سفر کرتے ہوئے بھی روزہ دار ہوں۔"

تو ایسے تھے خمار صاحب۔ عمر کا بیشتر اور بہتر حصہ شراب کو اپنی شاعری سے مخمور کرنے میں گزار دیا اور جب شراب نے ان کو ترک کر دیا تو خود اشعار سہل ممتنع کے کبھی نہ ٹوٹنے والے خمار میں غرق رہے۔

بظاہر دبلے پتلے اور کمزور لیکن عزائم اور ارادوں میں مضبوط اور مستحکم۔ کسی طرف سے بھی شاعر نظر نہ آتے اور نہ خود ساختہ شاعروں جیسی خود نمائی میں مبتلا رہے لیکن اپنی قادر الکلامی سے اپنی شاعری کو ایک ناقابل فراموش عہد کی تاریخ بخش دی۔ جن لوگوں نے انہیں زندگی گزارتے دیکھا ہے وہی ان کے اس شعر کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں؛

کہنے کو زندگی تھی بہت مختصر مگر
کچھ یوں بسر ہوئی کہ خدا یاد آگیا

منکسر المزاجی ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ چاہتے تو اپنی بین الاقوامی وسعہ گیر شہرت پر بجا طور پر فخر کرسکتے تھے۔ لیکن جتنے اچھے شاعر تھے اس سے کہیں زیادہ اچھے انسان بھی تھے اور اک اچھے انسان کی پہچان اور خصوصی صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کبھی نہیں کرتا۔ مشاعروں میں بھی وہ سب کی پرواہ کرتے لیکن خود سے لاپرواہ رہتے۔ بلاشبہ وہ ایک ایسے رنگین صفت انسان تھے جو اپنی شاعری کے تمام رنگ اپنے چاہنے والوں، مداحوں اور سخن فہموں کی دلبستگی کے لئے دنیا میں چھوڑ گئے۔ مگر اپنے جینے کا منفرد رنگ اپنے ساتھ لے گئے۔

صدیوں بعد بھی جب کوئی مورخ اردو شاعری کے کسی ملبے سے غزل کو وقت اور زمانے کے گرد و غبار سے جھاڑ پھونک کر جو حق

نا باہر نکالے گا تو خمار صاحب کا نام ایک طلسمی چراغ کی طرح روشنی بکھیرتا نظر آئیگا۔

خمار صاحب اب ہم سے پھر کبھی نہ ملنے کی غرض سے رخصت ہوچکے ہیں۔ وہ خمار صاحب جنہوں نے اپنی شاعری کو اظہار محبت کا

ہ اور وطیرہ بنایا تھا، وہی خمار صاحب جن کی دبیز چشمے کے پیچھے سے دلوں میں راہ بنالیتی اور کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہتی ہوئی چھوٹی ں آنکھیں اب خاموش ہو گئی ہیں۔ وہ ہونٹ جن سے سدا خوبصورت اشعار کے سوتے پھوٹتے ہیں، اب چپ ہو چکے ہیں۔ لیکن مرتے تے بھی انھوں نے اپنی محبوبہ غزل کی بکھری ہوئی زلفوں کو جس محنت، جانفشانی اور عرق ریزی سے سنوارا ہے وہی غزل ان کی عدم ندگی میں ان کی شاعرانہ عظمت کی یاد دلاتی رہے گی۔ جب تک اردو زندہ ہے، اردو شاعری زندہ ہے، غزل زندہ ہے، خمار صاحب بھی ہ رہیں گے۔

کریں کیا اب کسی پہلو قرار آتا نہیں ہے
وہ اب ہم میں نہیں اعتبار آتا نہیں ہے
خمار اٹھے ہیں جو میخانۂ شعر و سخن سے
شرابِ شاعری میں اب خمار آتا نہیں ہے

مرزا کھونچ
میاٹولہ ، بیتیا (بہار)

چائے خانہ

معاشیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں تین ہیں، روٹی، کپڑا اور مکان ۔یہ بات نصاب کی کتاب میں بھی لکھی ہوئی ہے ۔اور نصاب کی کتاب میں غلط سلط بات نہیں لکھی ہوتی ہے ۔اگر نصاب کی کتاب میں ہی غلط سلط باتیں لکھ دی جائیں تو اخلاقی گراوٹ جو بہت بعد میں آتی ہے ، بہت پہلے ہی آنا شروع ہو جائے گی ۔ہاں ، آج کل تواریخ کی کتابوں میں موقع محل کے لحاظ سے واردات میں بہت سی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں ۔کہیں کردار بدل دیئے گئے ہیں تو کہیں واقعات بدل دئے گئے ہیں ۔یعنی وہ کردار جو اب تک غیر جانبداری کی کمی کی وجہ سے اندھیرے میں تھے انہیں اجالے میں لایا گیا ہے اور جس کردار پر ضرورت سے زیادہ روشنی ڈالی جا رہی ہے ، اس روشنی کا وولٹیج تھوڑا ڈاؤن کر دیا گیا ہے ۔ہاں ، تو میں بنیادی ضرورتوں کی بات کر رہا تھا ۔اس کے متعلق کتابوں میں جو لکھا ہے وہ بالکل درست ہے ۔لیکن جب اہل علم حضرات نے ضرورتوں کی پیمائش کی ہوگی اس وقت پینے کے لئے صرف ایک چیز ہوا کرتی تھی ، وہ ہے پانی ، پانی کے علاوہ بھی چیزیں تھیں لیکن اسے ہر کوئی استعمال نہیں کرتا تھا ۔پانی کے لئے قیمت نہیں دینی پڑتی ہے اور جس چیز کی قیمت ادا نہیں ہوتی ہے اس چیز کو ماہرین معاشیات ضرورت کی فہرست میں نہیں رکھتے ۔اس طرح پانی ضرورت نمبر ایک ہوتے ہوئے بھی بنیادی ضرورت کے زمرے میں نہیں آتا ہے ۔جس وقت بنیادی ضرورتوں کی بات چل رہی ہوگی اس وقت ممکن ہے چائے نے اپنی پہچان نہ بنائی ہو ۔اس کی افادیت اور اہمیت دریافت نہیں ہو پائی ہو ۔اس لئے اسے بنیادی ضرورتوں کی فہرست میں نہیں رکھا گیا ہوگا ۔لیکن آج چائے ہماری بنیادی ضرورتوں میں شامل ہے اب خیریت کے بعد کسی کی بات ہوتی ہے تو وہ ہے چائے کی بات کہیں بھی جایئے پہلے چائے بعد میں کام کی بات ، مہمانی میں جایئے تو کھانا کے ساتھ چائے ۔شادی میں جایئے تو نکاح اور پھر چائے ۔مشاعرہ میں جایئے تو واہ واہ سے پہلے چائے ۔دفتر میں جایئے تو کام سے پہلے چائے (حالانکہ دفتروں میں چائے کے مفہوم بدل جاتے ہیں) صبح چائے ، شام چائے ، وقت کی چائے ، بے وقت کی چائے ، اس طرح بنیادی ضرورتوں کو چائے نے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا ہے ۔اب ساری ضرورتوں کی ماسٹر کی چائے کے ہی پاس ہے ۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ چائے اب بنیادی ضرورتوں میں سرفہرست ہے تو بھلا چائے خانہ سے کیسے انکار ہوگا ۔کیونکہ چائے کی عظمت چائے خانہ سے ہی ہے ۔گھر کی بنی چائے اور چائے خانہ کی چائے میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔سب سے پہلی بات یہ کہ چائے خانہ کی چائے میں ہمیں مساوات ملتی ہے ۔لیکن گھر کی چائے میں نہیں ملتی ۔شوہر اور بچوں کے لئے خالص دودھ کی چائے بنتی ہے تو ساس سسر کے لئے دودھ میں پانی کی آمیزش ہو جاتی ہے کیونکہ بوڑھاپے خالص دودھ نہیں پچا پاتا اور نوکرانی کو تو بنا دودھ کی ہی چائے ملتی ہے ۔لیکن وہ نوکرانیاں جن کی پہنچ باورچی خانہ کے چولہا تک ہوتی ہے ان کے تو وارے نیارے ہوتے ہیں ۔وہ جو چائے بنا کر پی لیتی ہیں ویسی چائے گھر کے مالک یا مالکن کو نصیب نہیں ہوتی ہے لیکن چائے خانہ کی چائے میں ہمیں وافر مقدار میں مساوات ملتی ہے ۔وہاں ایک قسم کی پیالی یا گلاس ہوتا ہے ایک قسم کی چائے ملتی ہے اور دودھ میں پانی کی آمیزش بھی سبھی گاہکوں کے لئے برابر ہوتی ہے ۔سبھی کو

ایک جیسی چالو چائے ملتی ہے اور اسپیشل چائے پینے والے کو بھی ایک جیسی چائے ملتی ہے۔ رتی برابر بھی فرق نہیں۔ سبھی چائے پینے والوں کو وہی کھٹملوں سے بھرا بنچ بیٹھنے کو میسر ہوتا ہے۔ یہ آپ کی قوت برداشت پر ہے کہ آپ کتنی دیر اس بنچ پر بیٹھ سکتے ہیں۔ گھر میں تو آپ چائے پیجئے اور فوراً کام پر جائیے۔ دفتر میں چائے پیتے پیتے اگر باس کا بلاوا آجائے تو چائے چھوڑ کر فوراً چلے جائیے۔ مہمان داری میں اگر پھیکی چائے مل جائے تو اسے زہر مار کیجئے، سبکی کے ڈر سے کچھ کہئے مت، لیکن چائے خانہ میں اگر چائے میں چینی کم ہے تو مانگنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔ اپنے گھر میں اگر چائے میں چینی کم ہے تو مانگئے مت ورنہ...... اخیر چھوڑئیے۔ گھر میں چائے کا رنگ اترے یا نہ اترے، بیگم نے جب لاکر رکھ دیا ہے تو پینا ہی پڑے گا۔ اگر آپ نے ذرا بھی احتجاج کیا تو بیگم صاحبہ آپ کا رنگ اتارنا شروع کر دینگی۔ لیکن چائے خانہ میں چائے کا رنگ اترا ہوا نہیں ملے گا چاہے جتنی بار جوش دینا پڑے لیکن دکاندار چائے کا رنگ اتار کر ہی دم لے گا ورنہ پینے والے اس دکان سے رابطہ توڑ لیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ چائے کو بار بار ابالنے اس میں نیکوٹین پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ سب کہنے کی بات ہے۔ دکاندار یا گاہک کے نزدیک اس بات کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ نیکوٹین پیدا ہو رہی ہے تو ان کی بلا سے۔ اگر دکاندار بار بار چائے کو جوش نہیں دے گا تو وہ چائے کڑک ہو ہی نہیں سکتی اور جب تک چائے کڑک نہ ہو پینے میں خاک مزہ آئے گا۔ وہ چائے نہ ذہن کو سکون بخش سکتی ہے اور نہ تھکاوٹ ہی دور کر سکتی ہے۔ اسی کڑک چائے کو پینے کے لئے انسان گھر چھوڑ کر چائے خانہ میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی دفتر کے نزدیک کچھ ملے یا نہ ملے چائے خانے ضرور مل جاتے ہیں۔

ہمارے یہاں بیکاری کا مسئلہ سینہ تانے کھڑا ہے۔ حالانکہ اس سے چھٹکارا پانے کے لئے بڑی بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس بحث میں ہم کو نہیں پڑنا ہے کہ کون کون سی کوششیں ہو رہی ہیں۔ بیکاری میں وقت کاٹے نہیں کٹتا ہے لیکن وقت کو کسی طرح کاٹنا ہے۔ اس کے لئے بہترین اور سستی جگہ ہے چائے خانہ۔ چائے خانہ سے اچھی کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔

یہاں تک کہ سینما گھر بھی نہیں۔ چائے خانہ میں کم دام پر بھی وقت کٹ جاتا ہے اور اگر آپ چاہیں تو چار پانچ کو پلا کر بھی وقت کاٹ سکتے ہیں۔ ایک پیالی چائے پیجئے اور جتنی دیر چاہے گپ کیجئے یا دوسروں کے گپ سے لطف اندوز ہوئیے۔ دو تین پیالی چائے نے آپ کا پورا دن بنا کسی پریشانی کے کاٹ دیا۔ گپ میں الجھے رہنے کی وجہ سے بیکاری کا درد زیادہ نہیں ستاتا ہے۔ جن بیکاروں کو چائے خانہ کی عادت نہیں ہوتی انہیں جھلاہٹ میں ماں باپ اور پڑوسیوں سے بنا مقصد لڑتے دیکھا گیا ہے۔ آپ ریڈیو یا اخباروں سے جتنی خبریں حاصل کر سکتے ہیں ان سے کہیں زیادہ خبریں ایک چائے خانہ میں مل جائیں گی۔ مقامی سے لے کر عالمی خبریں، صرف ایک پیالہ چائے کی یہ دولت حاصل ہو جاتی ہیں۔ جس طرح کی خبریں چاہئیں وہاں دستیاب ہوں گی۔ زاہد حضرات کو زہد و تقویٰ میں آئی گراوٹ کی خبریں مل جائیں گی۔ اور منچلے حضرات کو عشق میں ہوئے تجربات کا پتہ بھی چل جائے گا۔ شرفاء کی گلیوں کی وہ خبریں جو اخبار کی زینت بننا نہیں چاہتی ہیں، وہ بھی وہاں وافر مقدار میں مل جائیں گی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر کوئی چاہے کہ وہاں اپنی معلومات کا پٹارہ الٹ کر خالی ہاتھ چلا آئے تو یہ ممکن نہیں۔ اسے دوسروں کی علمیت سے دو دو ہاتھ کرنا ہی پڑے گا۔ آپ کی معلومات کو کوئی نہ کوئی چیلنج کر ہی دے گا۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک عالم کا جواب عالم ہی دے۔ ایک انگوٹھا چھاپ بھی آپ کی علمیت کا امتحان لے سکتا ہے۔ وہاں ایک رکشہ والے کی خبر ایک اخبار بین سے زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ کیونکہ رکشہ والا گلی گلی رکشہ دوڑاتا ہے وہ بعض اطلاعات کے لئے بطور چشم دید گواہ خود کو پیش کرتا ہے۔ بلا

سے وہ رکشہ والا واردات والی گلی میں نہ گیا ہو۔ لیکن دوسرے رکشے والے نے جو اسے خبر بتائی ہے وہ جھوٹ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس نے تیسرے رکشہ والے سے یہ خبر سنی تھی جو اس وقت اس گلی کی بغل والی گلی سے گزر رہا تھا، جب یہ واقعہ رونما ہوا۔ اس طرح آپ کی اخبار بینی وہاں دم توڑ دے گی۔ اس لئے چائے خانہ میں یہ جان کر بحث کیجئے کہ وہاں آپ سے بھی بڑے عالم موجود ہیں۔ کبھی کبھی وہاں کی بحث پگڑی کا راستہ بھی دکھا دیتی ہے۔ وہاں کی بحث کی پہلی شرط یہ ہے کہ آپ جذباتی نہ ہو جائیں۔ ٹھنڈے سے دل و دماغ گفتگو کریں۔

چائے خانہ میں موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ جہاں سے چاہے شروع ہو جائیے۔ جنگ سے لے کر صلح تک، اخلاقیات سے لے کر واہیات تک، گاؤں کی پنچایت سے لے کر اسمبلی اور پارلیمنٹ تک۔ پردے کے پیچھے سے لے کر پردے کے باہر تک کی خبریں وہاں ہاتھ باندھ کر کھڑی ہیں۔ کون کس کے ساتھ بھاگے گی، کون سی فلم کب ریلیز ہوگی کون سا گانا ہٹ ہوگا۔ جنگ میں کون جیتے گا اور جیتے گا تو کیوں جیتے گا، بڑھاپے میں کسے شادی کا شوق چرایا ہے کون شاعر ہے اور کون متشاعر ہے، اس سال اتنے گرہن کیوں لگے۔ کس کا بیٹا باپ سے بغاوت کرنے والا ہے۔ ان سب باتوں پر بحث کرنے کا وہاں بھرپور موقع ملتا ہے۔ جن سے دماغ کے ساتوں طبق روشن ہو جاتے ہیں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور وقت بھی آسانی سے گذر جاتا ہے۔ چائے خانہ ستائے گئے شوہروں کی جائے پناہ ہے۔ گھر میں رہیں گے تو خواہ مخواہ بات آگے بڑھ جائے گی۔ دفتروں میں کام کرنے والے حضرات جب اپنے کام سے سبکدوش ہوتے ہیں تو اس وقت لے کر آخری سانس تک یہی چائے خانے ان کے کام آتے ہیں وہ دن میں ناشتہ کرکے گھر سے دفتر نہ جاکر سیدھے چائے خانے کا رخ کرتے ہیں۔ دفتر میں بھی وہ گپ کرتے تھے یہاں بھی گپ کرتے ہیں۔ اکثر بے وقت ہی مہمان آتے ہیں۔ ایسے وقت یہی چائے خانہ ان کی تواضع کے کام آتا ہے۔ بسکٹ چائے سے نوازکر انہیں وہیں سے چلتا کریں۔ کسی محلے کے چائے خانہ کو دیکھ کر اس محلے کے رہنے والوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر چائے خانہ میں روزانہ اخبار آتا ہو، ریڈیو بھی ہو تو سمجھ لیں اس محلے کے لوگ زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ چائے خانوں نے ادب کے فروغ میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔

تمہارے شعر اچھے یا مرے اشعار بہتر ہیں
چلیں ہم چائے خانہ میں وہیں پر فیصلہ ہوگا

شاعر کو اچھے خاصے سامعین دستیاب ہو جاتے ہیں، جو ان کی ہمت بڑھا بڑھا کر انہیں زیادہ سے زیادہ شعر کہنے کو مجبور کرتے ہیں۔ افسانوں کے پلاٹ جتنے وہاں مل جاتے ہیں اتنے کہیں نہیں ملتے۔ اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ ادب کے فروغ میں چائے خانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

تو جناب میری سمجھ میں جتنی باتیں آئیں وہ میں نے لکھ دی ہیں۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ چائے خانوں کی افادیت کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو بہت کچھ باتیں اور سامنے آسکتی ہیں۔ جواب بھی صیغہ راز میں ہیں۔ چائے خانوں کا جا بجا کھلنا عوام کے لئے نیک فال ہے۔ اگر آپ نہیں مان رہے ہیں تو آپ بھی ایک عدد چائے خانہ کھول کر دیکھ لیجئے یا کسی چائے خانہ کے مستقل اور دیر تک بیٹھنے والے گاہک بن کر دیکھئے، میری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔

دانت، جسم پر گچھے جیسے گھنے مگر سلیقے سے تراشیدہ بال، یہ نئی آفت اس جیبی کتے سے کچھ ملتی جلتی ہوئی تھی جس کے دیدار سے ہم ایم ایل اے صاحب کے ہاں مشرف ہوچکے تھے ۔

کتوں کے معاملے میں ہمارا یہ خیال ہے کہ چاہے گدھے کی سائز کا ہو یا چوہے کی سائز کا، کتا ہر حال کتا ہوتا ہے جس کے کاٹنے پر پورے چودہ انجکشن لگوانے پڑتے ہیں۔ انجکشنوں کا خیال ہونا تھا کہ ایک چیخ ہمارے حلق سے نکلی اور اس کے ساتھ ہم نے جو اڑان بھری تو لیکچر روم کی عقبی کھڑکی کے اوپری روشندان کے فریم کا نچلا حصہ ہاتھوں میں آگیا۔ اگر ہوا تیرے کی ذرا سی غلطی، ذرا سی چوک ہوجاتی تو کھڑکی کی سلاخیں توڑ کے سیدھے لیکچر روم میں پہنچ گئے ہوتے ۔ ہم سے یہ جو اچانک حرکت سرزد ہوئی تھی اس نے چینیا کتے کو بوکھلا دیا تھا جس کے ردعمل کے طور پر نہ صرف وہ بھونکنے لگا تھا بلکہ اپنے چھوٹے چھوٹے پیروں پر اچک اچک کر ہماری لٹکی ہوئی ٹانگوں پر منہ مارنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ ادھر ہمارے ہاتھوں کی گرفت چونکہ روشندان کے فریم پر مضبوط نہیں تھی اس لئے پھسلنے لگے تھے اور پھر اس سے پہلے کہ ہم پھسل کر، تڑواپے کی صورت کتے کے قدموں میں ڈھیر ہوجاتے ایک نسوانی آواز کانوں سے ٹکرائی "ہنی مائی ڈارلنگ وہیر آر یو"

(Honey My Darling where are you)۔

اگرچہ کہ سماعت سے ٹکرانے والے فقرے کے ایک ایک لفظ میں "ہنی ڈارلنگ" کے لئے شہد گھلا ہوا تھا وہ بھی ایک دم گاڑھا شہد، کیوں کہ ہر لفظ میں حرف "ر" کی جگہ "ڑ" نے لے رکھی تھی ہم اس گاڑھے شہد کی لذت سے کانوں کے ذریعہ لطف اندوز ہورہے تھے کہ اچانک آنکھوں کے سامنے شہد کی سربہ مہر بوتل بہ نفس نفیس نمودار ہوئی، اس کا سراپا اسکی آواز ہی کی طرح "گاڑھا" تھا اور پھر جیسے ہی اس کی نظر "ہنی ڈارلنگ" پر پڑی ۔ اس کے نپے تلے قدموں کو جیسے برف پر پھیلنے والے پہیے لگ گئے وہ پھسلتی ہوئی ہنی ڈارلنگ تک پہنچی اور اسے اٹھاکر پیار کرنے لگی ۔ اوہ مائی پوڑ ہنی ڈارلنگ وڑی کدھر کھوگیا تھا تم ..... آئی مس یو ڈارلنگ ..... موصوف کی "سوڈی" اور مختصر سے لباس کو توڑتا ہوا شباب دونوں ہی انھیں "سندھی" ثابت کررہے تھے ۔

ہنی ڈارلنگ کو پیار کرنے سے جیسے ہی محترمہ کو فرصت ملی اچانک ان کی نظر ہمارے چمگادڑ کی طرح لٹکے ہوئے وجود پر پڑی، ہمارا خیال تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اس خود ساختہ صلیب سے اترنے میں ہماری مدد فرمائیں گی ہمدردی کے دو بول بولیں گی لیکن افسوس یہ محض ہماری خام خیالی تھی، مدد کرنا تو در کنار الٹا وہ ہسٹریائی انداز میں چیخیں مارنے لگیں ۔ معین میں دیکھتے ہی دیکھتے ہم کانٹ چینی ڈارلنگ نے بھی اپنی بے سری راگنی شامل کرکے ماحول کا سینہ شق کر ڈالا ۔ اس چیخ و پکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پکے آم کی طرح سیدھے فرش پر آرہے ۔ کتے اور اس کی مالکن کی ملی جلی جگل بندی، نے چینیا لیکچر روم میں موجود طالب علموں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا تھا چنانچہ ایک ایک کرکے وہ تمام بھی موقعہ واردات پر پہنچ گئے ۔ ہنی ڈارلنگ کی مالکن نے انھیں دیکھتے ہی واویلا مچانا شروع کردیا ۔ "وڑی یہ آدمی، بیاٹ میان" (BAT MAN) کا ماٹک ادھر کھڑکی کے اوپر لٹک کر میرے ہنی ڈارلنگ کو ڈراتا تھانی ۔

انٹا کہہ کر وہ ہم سے براہ راست مخاطب ہوئیں:

"وڑی میرے ہنی ڈارلنگ کا ہارٹ فیل ہوجاتا تو تم دوسرا ہنی ڈارلنگ [illegible] کدھر سے لاکے دیتا تھانی ؟"

ہم نے موصوف کی [illegible] تراشی پر جھنجلا کر جواب دیا، "تم کو اپنے ہنی ڈارلنگ کی پڑی ہے، اگر یہ خبیث مجھے کاٹ کھاتا اور میری جان چلی جاتی تو ؟"

"وڑی تمہارے ہنی ڈارلنگ کو جنگلی جانور سمجھتا ہے وڑی مائی ہنی از اے جنٹلمین ڈاگ"

[illegible]

کا اگر بھوت ہو، لیکن کتا بہر حال کتا ہوتا ہے جس کی نہ کوئی کل سیدھی ہوتی ہے نہ دم۔!!!"

ہماری اس کھلی چوٹ پر محترمہ طالب علموں کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے بلبلا کر بولیں "ذرا سنا تم لوگوں نے یہ میرے ہی ڈارلنگ کی دم پر "اٹیک" (Attack) کرتا اس کے دل کے اندر کتا لوگ کے واسطے کتنا زہر بھرا ہے نی۔!"

ہنی ڈارلنگ کی مالکن کے اس واویلے کے نتیجے میں سارے طالب علم ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگے اور ہم فرار کی راہ ڈھونڈنے لگے!!"۔ (جاری)۔

شگوفہ کا ضخیم

ہندوستانی مزاح نمبر

☆ تمام ہندوستانی زبانوں کے مزاح کا جائزہ نمونوں کے ساتھ

☆ مہمان مدیر: یوسف ناظم ☆ قیمت: ۵۵ روپے

☆ محصول ڈاک علیحدہ

عابد معز کے مضامین کے دلچسپ مجموعے

واہ حیدرآباد

قیمت: ۶۰ روپے

اور

سگ گزیدہ

قیمت: ۶۰ روپے

ناشر: زندہ دلان حیدرآباد

محمد بلال بھارتی
یو جی سی ریسرچ فیلو
شعبہ اردو، کلکتہ یونیورسٹی۔ ۳۰

ہارٹ اٹیک

حال ہی میں دل کے ماہرین نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ہارٹ اٹیک عورتوں میں مردوں کے مقابلے میں اوسطاً کم ہوتا ہے اس کا جواز انھوں نے یہ پیش کیا ہے کہ عورت کا دل چونکہ سخت ہوتا ہے اس لئے اس وادیٔ سنگلاخ میں دل کے حملے کا امکان کم، اور دوسرے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بات بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے، مگر غور کیجئے تو اس کی گرہیں خود بخود کھلتی جائیں گی اور یہ سمجھنا آسان ہوجائے گا کہ واقعی عورت کا دوسرا نام صلابت یعنی سختی ہے، کیونکہ عورت کا وجود پسلی سے ہوا اور پسلی کی شان کج کلاہی سے کون واقف نہیں۔ وہ مطالبۂ حیات کو ہنس ہنس کر پیتی ہے اور بقول شاعر:

"اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے" کے مصداق ہر موج حوادث سے ہنستی کھیلتی گزر جاتی ہے۔ زندگی میں دوران تخلیق متعدد بار بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرتی ہوئی زندگی اور موت کی کشمکش کو جھیل جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عورت صبر و ضبط اور قوت برداشت کی خوگر بن جاتی ہے، جبکہ اللہ نے مردوں کو اس لذت خیر مترقبہ سے محروم رکھا ہے۔ ظاہر ہے، مردوں کو دل کے کمزور ہونے کے باعث دل کا دورہ پڑنا طبعی امر ہے۔ مرد دل کا نرم اور نازک ہوتا ہے۔ پتّی کی سرسراہٹ بھی اسے ایروپلین کی گھڑگھڑاہٹ معلوم ہوتی ہے۔ وہ محبوب کے ستم کو کرم اور غم جاناں کے ڈیزیز کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ محبوب کی عشوہ گری کو دل کے تھیلے میں ڈھوتا پھرتا ہے اور اس کی قاتل اداؤں پر اپنی جان چھڑکتا ہے۔ اس کی چشم ناز سے دل کے ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھتا ہے، مگر زبان پر حرف شکایت نہیں لاتا۔

نگاہ یار نے اک دم میں دو ٹکڑے کیے دل کے
نہ دیکھی ہم نے کاٹ ایسی، کسی شمشیر براں کی

مرد کی اسی نرمی بلکہ کمزوری سے عورت خوب فائدے اٹھاتی ہے۔ مطلب نکالنا ہو تو اس کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہوتا ہے کہ:

دل چیز کیا ہے؟ آپ مری جان لیجئے
بس ایک بار میرا کہا، مان لیجئے

اتنا سنتے ہی مرد فلک سے چاند، ستارے توڑنے کی تابڑتوڑ کوشش کرتا ہے اور اس نادانی کو وہ حد درجہ دانائی تصور کرتا ہے۔ حضرت حافظ شیرازی تو محبوب کے محض ایک عدد "تل" کے عوض سمرقند و بخارا تفویض کرنے پر تل گئے تھے۔ بادشاہ وقت نے انھیں یاد دلایا کہ حضرت! یہ سمرقند و بخارا آپ کے دل کی ملکیت نہیں، قومی اثاثہ ہیں اور ہم قومی اثاثے کو "بابری مسجد" بننے نہیں دیں گے۔ بات فائدے کی تھی، دل میں اتر گئی اور حافظ اپنے اس ارادے سے باز آگئے، مگر انھیں ہر لحہ اپنے دل کے راز سربستہ کے فاش ہونے کا ڈر ستاتا رہا اور کہتے رہے:

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا
درد ا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

عورت کو "ناقص العقل" کہا گیا ہے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے فی الحال اس کو زیر بحث لانا "کشمیر اشو" کا حل ڈھونڈنا ہے لیکن یہ حقیقت دن کی طرح روشن ہے کہ کرہ ارض پر اب تک کوئی عظیم فلسفی، ریفارمر یا مفکر عورت نہ بن سکی، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کی عظیم اور نامور ہستیوں کو اسی نے جنم دیا ہے۔ عورت کے ناقص العقل ہونے کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اس میں ارتکاز کی قلت اور ارتحال کی علت ہوتی ہے۔ اس کی زندگی سیالی ہوتی ہے، جس میں موجوں کی روانی اور سمندر کی طغیانی چھپی ہوتی ہے۔ وہ ہر وار کو دل پر نہیں زبان پر لیتی ہے اور دل کے مارے بخارات کو زبان کے وسیلے سے فضائے بسیط میں تحلیل کرتی رہتی ہے۔ اس طرح دل کے تمام میل دھواں بن کر اڑ جاتے ہیں۔

اس کے برعکس مرد ہر وار کو دل پر لیتا ہے۔ کسی بات پر گھنٹوں سوچتا ہے، اچھلتا ہے، کودتا ہے اور بات شمشیر و سنان تک جا پہنچتی ہے، مگر اتنا ہونے پر بھی اس کے دل کا غبار نہیں چھٹتا، بلکہ رفتہ رفتہ سطح دل پر اس کی پرتیں گہری ہوتی جاتی ہیں اور دل کے بلب سنگنے لگتے ہیں۔ اس وقت دل کے حملے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ شاعر دل کے معاملے میں اور بھی نازک واقع ہوا ہے۔ وہ دل کی واردات کو سلیقے سے ظاہر کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شاعر دوسری برادری کے مقابلے میں زیادہ اختلاج قلب کا شکار نظر آتا ہے۔ جہاں محبوب کی نظر پڑی، دل تھام کر بیٹھ گئے۔ وہ محبوب کی ایک ایک ادا پر دل کو لخت لخت کر دینے پر تیار ہو جاتا ہے اور ان ٹکڑوں کو مہ وشوں اور گل رخوں میں بانٹ دینا موجب فخر سمجھتا ہے، مگر کیا کیجئے کہ چشم یار ہر بار ایک نئے دل کو طلب کرتی ہے۔ یہ لمحہ شاعر کے لیے لمحہ فکریہ بن جاتا ہے اور وہ مشوش ہو اٹھتا ہے:

ہر بار مانگتی ہے نیا چشم یار ، دل
کس طرح ایک دل کو بناؤں ہزار دل

عورت کو "صنف نازک" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ خیال جس نے بھی پیش کیا ہے، دراصل اس نے عورت کو دور سے دیکھا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے صحرا میں، دور سے پانی کا گمان ہو، چاند پر کاندھی بی چرخہ کاتتے دکھائی دیں۔ جہاں تک عورت کے دل کی سختی کا سوال ہے تو بس اور ٹراموں میں دیکھ لیجئے۔ اگر کوئی مرد عورت کی متعلقہ خالی نشست پر بیٹھنے کی جرات کرے یا اس کی طرف منہ کر کے کھڑا بھی ہو جائے تو وہ اس طرح آنکھیں نچا کر دیکھتی ہے جیسے پاکستان "غوری" میزائل داغ کر بھارت کو۔ اس کے برعکس مرد بیچارہ جہاں اپنے سامنے کسی عورت کو دیکھتا ہے، موم بن جاتا ہے، خوش خلقی کا بے پناہ مظاہرہ کرتا ہے، جبکہ وہ کسی لاغر اور ضعیف العمر آدمی کو دیکھ کر کرتس سے مس نہیں ہوتا۔

روز ازل سے عورت اہل نظر کا مرکز نظر اور حضرت شاعر کی محبوب نظر رہی ہے۔ اس پر آئے دن کچھ نہ کچھ تحقیقی کام ضرور ہوتا رہتا ہے، مگر مردوں پر تحقیقی کام کا بیڑا اب تک کسی نے نہیں اٹھایا۔ عین ممکن ہے، مستقبل قریب میں کوئی محقق اس پر کام کرے اور اس کے خد و خال اور مرئی و غیر مرئی رموز و علائم کو منکشف کرے، جس سے اس کو سمجھنے میں آسانی ہو، کیونکہ اکثر اوقات آدمی کو سمجھنے میں دھوکہ ہوتا ہے۔ ہوتا کچھ ہے، دکھائی کچھ اور دیتا ہے۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے:

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جو دیکھنا کسی کو تو سو بار دیکھیے

کچھ لوگ اوپر سے متین اور اندر سے مہین ہوتے ہیں، اور ان کو سمجھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا بھارت کے ہندو مسلم اتحاد کو۔ بہر حال ہارٹ اٹیک سے کئی فائدے ہیں۔ جس طرح زلزلہ آنے سے ناہموار اور غیر مسطح زمین ہموار ہو جاتی ہے۔ لیڈروں میں بالیدگی آتی ہے اور

وہاں کی مٹی قابل کاشت بن جاتی ہے۔ اسی طرح ہارٹ اٹیک خودی کی تعمیر و تشکیل میں مدد و معاون ہے۔ اس سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ تقویٰ اور پرہیز گاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر چیز کو ایمانی پیمانے سے ناپنے کا ہنر آتا ہے۔ اپنے گناہوں سے توبہ کر کے از سر نو زندگی کا سفر طے کرنے کا ارادہ ہوتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ہارٹ اٹیک آدمی کے لیے بے حد سودمند ہے۔ اسے ہر کسی کی زندگی میں کم از کم ایک بار ضرور آنا چاہئے، بلکہ دعوت دے کر بلانا چاہئے!

در حقیقت یہ ایک الارم ہے جو آدمی کو متنبہ کرتا ہے کہ:

"ہوشیار! خبردار! طبل جنگ بج چکا ہے۔ اپنے اعمال کی تلوار کو صیقل کر لو اور اخلاقی ہتھیار سے لیس ہو جاؤ تاکہ میدان کارزار میں پیٹھ دکھانے کی نوبت نہ آئے، اور اپنے کمانڈر کی نگاہ میں سرخرو بن سکو۔"

نصرت ظہیر

حیدر آباد کے شگوفے

پیارے خارئین! موسم خوشگوار ہے اور میں اپنا ٹمبل فیان آف کر کے ٹی وی کی اسپورٹس چیانل پر کرکٹ میاچ دیکھ رہا ہوں۔ ابھی ابھی باہر سڑک پر بس اسٹانڈ کی طرف سے ایک میاینج بیانڈ کسی کی تخریب شادی کا بینڈ...

معاف کیجئے بیانڈ بجاتا ہوا گزرا ہے اور میں... قلم خود میں یہ عجیب زبان پڑھ کر آپ دم بخود ہوں گے اور سوچ رہے ہونگے کہ آج میاں جی کو کیا ہو گیا۔ ایک پیارا گراف معاف کیجئے پیراگراف میں اتنی ساری کتابت کی غلطیاں!

جی نہیں یہ غلطیاں کاتب یا پروف ریڈر کی نہیں بلکہ خادم سے سرزد ہوئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بندہ حال ہی میں چند روز حیدر آباد میں گزار کر آیا ہے جس سے شین خاف ... میرا مطلب ہے تلفظ کچھ متاثر ہو گیا ہے۔

مگر یقین کیجئے جو مزا تلفظ کی یہ غلطیاں کرتے ہوئے اس وقت آرہا ہے اس "مزے" کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ حیدر آبادی تلفظ کے تلذذ کا اندازہ کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جو حیدر آبادیوں کی معصومیت اور شرافت کے شکار اور ان کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ ناچیز اس وقت اسی نشہ میں ہے!

بار بار فلیش بیک شروع ہو جاتے ہیں۔

ایک منظر: نام پلی ریلوے اسٹیشن سے اتر رہا ہوں۔ پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی زندہ دلان حیدر آباد کی زندہ دلی اور مرعوب کن مہمان نوازی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک صاحب سر پر کنٹوپ جیسی گرم ٹوپی اوڑھے، گلے میں مفلر ڈالے اور کوٹ جیسی کوئی چیز پہنے ملتے ہیں اور علیک سلیک کے بعد کپکپاتی آواز میں پہلا ہی سوال یہ کرتے ہیں۔ "دلی میں کتنی ٹھنڈ پڑ رہی ہے"۔

یہ صاحب ہیں انگلو انڈین اردو میں اپنی مزاحیہ شاعری سے لوگوں کو لوٹ پوٹ کر دینے والے مصطفیٰ علی بیگ۔

میں عرض کرتا ہوں۔ "کوئی خاص نہیں۔ ابھی تو نومبر شروع ہوا ہے۔ بس رات کو کچھ خنکی سی ہو جاتی ہے"!

"خنکی" کا لفظ سنتے ہی وہ اور ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔ "جی ہاں یہاں بھی سر شام سے خنکی شروع ہو جاتی ہے"۔

اس کے بعد وہ موبائیل فون پر اپنی بیگم کو غالباً دلی کے تازہ ترین موسم کا حال سناتے ہیں اور انہیں فوراً گرم شال اوڑھ لینے کی ہدایت دیتے ہیں اور میں حیرت سے سوچنے لگتا ہوں یا الٰہی! اگر ٹی شرٹ اور پتلون والے درجہ حرارت پر حیدر آبادیوں کا یہ حال ہے تو جس بائیس ڈگری پر تو یہاں برف گرنے لگتی ہوگی۔

ان کے ساتھ ایک اور صاحب ہیں۔ طالب خوندمیری! شہرت سے بڑے معرکے کے مزاحیہ شاعر۔ پیشہ سے آرکیٹکٹ اور شوق سے کارٹونسٹ! لہٰذا انہیں صاحب نہیں صاحبان کہنا چاہئے۔ اس وقت تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ ورنہ ملتے ہی تین مرتبہ آداب کرتا۔

دونوں حضرات سے یہ پہلی ملاقات ہے۔ اس لئے جب طالب صاحب، بیگ صاحب کا تعارف مصطفیٰ صاحب کہہ کر کراتے ہیں تو انہیں مزاحیہ رسالہ "شگوفہ" کا مدیر مصطفیٰ کمال پاشا سمجھنے لگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ "شگوفہ" کا مدیر بھی کیا ایک شگوفہ ہے مگر کتنا بھولا اور معصوم سا شگوفہ کہ دیکھتے ہی پیار ہو جائے۔

[illegible] صاحب سے ملاقات ہوئی [illegible] کر قطب

مینار کی یاد آگئی۔ یہ سوچ کر حیران ہوتا رہا کہ پتہ نہیں اپنا سینٹر آف گریویٹی کیسے قائم رکھتے ہوں گے۔ آنکھوں میں کچھ سرخ ڈورے بھی نظر آئے۔

لہذا احتیاطاً ان سے چند فٹ دور رہ کر بات کی۔ مگر یہ احتیاط فضول تھی۔ کیونکہ بعد میں دیکھا ان کی آنکھیں ہر وقت ایسی ہی رہتی ہیں۔

یہ حمایت اللہ صاحب تھے۔ ایک ذات میں کئی صفات کے حامل۔ اسٹیج فلم اور ٹی وی کے اداکار، ہدایت کار، اردو اور دکنی زبان کے دلچسپ مزاحیہ شاعر، اور زندہ دلان حیدر آباد کی تحریک شروع کرنے والوں میں سے ایک!

کرسی پر بیٹھ کر جب انہوں نے بے خیالی میں سر سے اپنی کیپ اتاری تو بادلوں کے بیچ سے آدھا چاند کمرے میں اتر آیا۔ جو بلب کی روشنی میں خود بلب سے کہیں زیادہ چمک رہا تھا۔ پتہ چلا، کبھی تو ایک دو انچ اور بلند رہا ہوگا۔ مگر اب استدادِ زمانہ کے ہاتھوں اوپر سے کچھ گھس چکا ہے۔

ابھی تک جو حیدر آبادی حضرات ملے تھے وہ شستہ اردو لہجے میں اپنا دکنی پن چھپائے ہوئے تھے، مگر حمایت اللہ صاحب نے تکلف طاق پر رکھ کر حیدر آبادی اردو کے گلابی لہجے سے ملاقات کو اور بھی مہکا دیا۔ سیدھے "قاف" سے "خ" پر اتر آئے۔

اگلی شام اصلی مصطفیٰ کمال بھی مل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال۔ قاعدے کے آدمی۔ "شگوفہ" کو باقاعدہ تیس بتیس سال سے ماہ بہ ماہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان پاکستان کیا پورے اردو جگت میں اب یہ طنز و مزاح کا واحد ادبی رسالہ باقی بچا ہے۔ انگریزی کا پنچ (PUNCH) بند ہونے کے بعد "شگوفہ" اردو طنز و مزاح کا گویا سرپنچ ہے۔ حیدر آبادی فسادات اور کرفیو کے دوران بھی ڈاکٹر کمال نے اس کی اشاعت میں فرق نہیں آنے دیا۔ ابتداء میں یہ "ڈیڑھ ماہی" تھا۔ مگر ڈیڑھ پن میں جو ٹیڑھ چھپا تھا اس نے جلد ہی زندہ دلان حیدر آباد کو (جن کا یہ رسالہ ترجمان ہے) اسے ماہنامہ بنانے پر مجبور کر دیا۔ تب سے یہ ماہ نامہ، ماہ نامہ ہی ہے۔ سہ ماہی یا ششماہی نہیں بنا جو آج کل اردو کے بہت سے ماہ نامے بنے ہوئے ہیں۔ "شگوفہ" وہ ماہنامہ ہے، جس نے معیار کے معاملے میں کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا ہے اور آج بھی لوگ بے تابی سے اس کے اگلے شمارے کا انتظار کرتے ہیں۔

ان سبھی حضرات کا کچھ ذکر آگے بھی جاری رہے گا۔ فی الحال میرا مسئلہ سن لیجئے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب نے اتنے سارے شگوفوں سے میرا دامن بھر دیا ہے کہ میں انہیں سنبھال نہیں پا رہا ہوں۔ شگوفہ کے خاص نمبروں کے مطالعہ کا سلسلہ کئی روز سے جاری ہے اور اس مطالعہ سے اندر ہی اندر ایک روشنی پھیلتی جا رہی ہے۔

مگر ایک بات حیدر آباد کے ان رسائل اور بعض اردو اخبارات کو پڑھ کر میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی ہے کہ ان کے یہاں اردو املا میں آخر انگریزی الفاظ پر تشدد کیوں کیا جاتا ہے۔ فین کو فیان، میچ کو میاچ، بینڈ کو بیانڈ اور فیکس کو فیاکس لکھنے کا سبب کیا ہے اور یہ کہ صرف انگریزی کی ہی ٹانگ کیوں توڑی جاتی ہے؟۔

علامہ اسرار جامعی، جو اس سفر میں خادم کے ہمراہ تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ بندہ ان کے ہمراہ تھا، اس سلسلہ میں یہ وضاحت کرتے ہیں کہ انگریزوں نے ڈیڑھ سو برس تک ہندوستانیوں کی ٹانگ توڑی، اس دوران حیدر آباد والے اپنے نظاموں کی محبت میں انگریزوں کی ٹانگ تو نہ توڑ سکے البتہ انگریزی کی ٹانگیں توڑ کر اپنا جی ضرور ہلکا کرتے رہے اور ہر چند کہ نظام ختم ہو گئے مگر حیدر آبادیوں کا انتقام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ قومی آواز دہلی)

ایم۔اوپندرا (حیدرآباد)
ہندی سے ترجمہ: ایف۔ایم۔سلیم

چارمینار کی بڑیاں

حیدرآباد کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ چارمینار کی "بڑیاں" کیا ہوتی ہیں لیکن جن کا تعلق حیدرآباد سے نہیں ہے وہ شاید کچھ حیران و پریشان ہوں گے کہ آخر یہ چارمینار کی "بڑیاں" کس چڑیا کا نام ہے۔ باہر والوں کو چارمینار سگریٹ کا ہی علم ہے۔ وہ سوچیں گے کہ ہواباں ہرڑے کی طرح یہ بھی کوئی بدہضمی کی گولیاں ہوں گی۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ چارمینار کی بڑیاں "ہواباں ہرڑے، یا "رامباں" کی گولیوں سے بھی زیادہ متاثر کن ہیں۔ اور صدیوں سے سارے دکن پر چھائی ہوئی ہیں۔ ہندوستان یا دنیا کے کسی بھی شہر میں جب کچھ گپیں مشہور ہو جاتی ہیں، تو انہیں کچھ نام یا عنوان دیا جاتا ہے۔ حیدرآباد کے ساتھ چارمینار اور چارمینار کے ساتھ حیدرآباد کچھ ایسے جڑے ہوئے ہیں جیسے جسم کے ساتھ روح سوال یہ ہے کہ چارمینار کے لئے حیدرآباد شہر بنا یا حیدرآباد کے لئے چارمینار؟ یہ سوال "مرغی اور انڈے" کے سوال جیسا ہی ہے۔ اس سوال کا جواب تو شاید محمد قلی قطب شاہ ہی دے سکتے تھے۔ لیکن ایک بات تو ماننی ہی پڑے گی۔ چارمینار اپنی اصلی شکل میں صدیوں سے ایک ہی مقام پر کھڑا ہے۔ جب کہ حیدرآباد دن بدن پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ اس لئے حیدرآباد میں جتنی "گپیں" اڑائی جاتی ہیں، انہیں چارمینار کی بڑیاں کہا جاتا ہے۔

پھر ایک سوال اٹھتا ہے، حیدرآباد کی "گپوں" کو چارمینار کی بڑیاں ہی کیوں کہا جاتا ہے۔ گولکنڈے کی بڑیاں کیوں نہیں کہا جاتا۔ حالانکہ گولکنڈہ، چارمینار سے کافی پرانا ہے اور قطب شاہوں کی مملکت کا صدر مقام رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ افواہوں کو گولکنڈہ قلعے سے شہر تک آنے میں کافی مشکل ہوتی ہوگی۔ ایک تو گولکنڈہ پہاڑ پر تھا اور نیچے آنے کے لئے راستے بھی اچھے نہیں تھے۔ جبکہ چارمینار بیچ شہر میں بنا اور اس کے چاروں طرف کھلے اور صاف راستے بنائے گئے۔ جس کی وجہ سے بڑیوں کے پھیلنے میں آسانی ہوئی ہوگی۔ اتنا ہی نہیں گولکنڈے سے جو شاہی بڑیاں نکلتی تھیں، وہ ایک سرنگ سے ہو کر پہلے چارمینار آتی تھیں اور پھر وہاں سے سارے شہر میں پھیلتی تھیں۔ چارمینار کی بڑیوں میں ایک "سرتاج بڑی" ہے گولکنڈہ سے چارمینار تک کی سرنگ۔ عرصہ سے حیدرآباد میں یہ بڑی مشہور ہے کہ چارمینار سے ایک سیدھا راستہ اندر ہی اندر موسیٰ ندی کے نیچے سے گولکنڈہ تک گیا ہے۔ آج تک کسی حیدرآبادی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے لیکن یہاں کا بچہ بچہ یہاں تک کہ سرکاری "گائڈ" بھی اس بات کو دہراتے ہیں شاید چارمینار کی بڑیوں کی بنیاد یہ سرنگ ہی ہے۔

افواہوں کو چارمینار کی بڑیاں کیوں کہتے ہیں، اسے جاننے کے لئے ہمیں کچھ اور مشہور بڑیوں کی طرف دیکھنا ہوگا

جن کا تعلق بھی چارمینار سے ہے۔

چارمینار کے بارے میں ایک، بڑی کافی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ چارمینار کی تعمیر کا کام بہت دھیرے، دھیرے چل رہا تھا۔ قلی قطب شاہ نے مستری سے اس کی وجہ پوچھی۔ اس نے کہا۔ سرکار چونا بہت سخت ہے۔ سختی سے چپک جاتا ہے۔ مزدوروں کو بہت ہی ہشیاری سے کام کرنا پڑتا ہے۔ بات سرکار کی سمجھ میں نہیں آئی۔ مستری نے ایک مزدور سے کہا کہ چونے میں وہ اپنا ہاتھ رکھے۔ مزدور نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر بعد اسے ہاتھ نکالنے کے لئے کہا گیا۔ پر ہاتھ نکل نہیں پا رہا تھا۔ کئی مزدوروں نے مل کر ہاتھ نکالنے کی کوشش کی مگر چونے نے ہاتھ کو نہیں چھوڑا۔ کہتے ہیں کہ مزدور کو چونے سے الگ کرنے کے لئے اس کا ہاتھ کاٹنا پڑا۔ قطب شاہ یہ دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور اس نے کٹے ہوئے ہاتھ اور چونے کو نمائش کے طور پر ہاتھ کے سڑ جانے تک رکھا۔ اس قصے سے چارمینار کی بڑیوں کا سلسلہ اور آگے بڑھا۔

جب گولکنڈہ کی سلطنت ختم ہوئی اور آصفیہ سلطنت قائم ہوئی تو چارمینار پورے رنگ پر تھا۔ اس لیے نظام نے بھی اپنا محل چارمینار کے نزدیک ہی بنایا۔ اب بڑیوں کو سرنگ کے راستے سے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ وہیں سے نکلنے لگیں۔ ان پر اب سرکاری مہر بھی لگ جاتی تھی۔ نظام اور ان کے نوابوں کے بارے میں تو اتنی بڑیاں ہیں کہ ان پر ایک پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ابھی ہم چارمینار کی کچھ بڑیوں کے بارے میں ہی بڑی ماریں۔

چارمینار کی ایک اور بڑی بہت مشہور ہے۔ یہ آصفیہ دور کی بڑیوں کا "آکا" ہے۔ کہتے ہیں کہ مشہور فلک، نما محل میں ایک ایسا قد آدم آئینہ ہے جس میں دیکھنے والے کا عکس عریاں نظر آتا ہے۔ اگرچہ کہ وہ پورے کپڑے پہنے ہوئے رہتا ہے۔ یہ بڑی صدیوں سے اتنی مشہور ہے کہ حیدرآباد کا ہر شخص کا اس پر یقین کرتا ہے اور زندگی میں ایک بار اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے۔ یہ بڑی تو حیدرآباد کے باہر بھی کافی مشہور ہے۔ جب باہر کے ایک شخص نے مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا تو میں نے بڑی کو "بڑا" بناتے ہوئے کہا۔ "اس میں دیکھنے والا صرف عریاں ہی نہیں نظر آتا بلکہ اس کے جسم کا ہر حصہ دو گنی جسامت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک انگریز رزیڈنٹ اس آئنہ میں اپنے آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ مگر جب اس کی بیوی کو اس آئینے کے سامنے لاکر کھڑا کیا گیا۔ تو وہ اپنی جسامت کو دیکھ کر اس قدر چڑ گئی کہ اس نے آئینے کو توڑ دیا!

چارمینار کی ایک اور بڑی دریائے موسیٰ سے تعلق رکھتی ہے۔ پرسوں، پرسوں یعنی ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں زبردست طوفان آیا تھا۔ اگرچہ کہ جو لوگ موسیٰ ندی کو آج کی حالت میں دیکھتے ہیں ان کے لئے موسیٰ کی ندی میں طوفان کا آنا بھی ایک بڑی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ "بڑی" نہیں حقیقت ہے۔ کیونکہ اس وقت موسیٰ ندی آج کی طرح نہیں تھی بلکہ وہ حقیقی معنوں میں ندی تھی اور اس میں پانی بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ طوفان کے نتیجہ میں ندی کا پانی سارے شہر میں پھیل گیا اور چارمینار کی سڑھیوں تک آگیا۔ دن گزرتے گئے طوفان کا پانی اتر ہی نہیں رہا تھا۔ نظام پریشان ہوئے۔ کئی لوگوں نے انہیں کئی مشورے دیئے۔ ایک مشورہ انھیں بہت پسند آیا۔ اس کے مطابق انہوں نے ایک پکے برہمن کی طرح ندی میں اشنان (غسل) کیا تھا (مولوی طرز کی تب "الشان کے لائق تھی) اور گیلی دھوتی پہن کر پیدل چلتے ہوئے رسومات ادا کی

کہتے ہیں رسومات کے ختم ہونے کے کچھ ہی لمحوں بعد موسیٰ ندی کا پانی تیزی سے اترنے لگا اور چند منٹوں میں اس میں اتنا ہی پانی رہ گیا جتنا کہ آج ہے۔ رضاکاروں کے دور میں مجاہد اعظم قاسم رضوی نے چارمینار کے دامن میں کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ کچھ دنوں میں وہ دہلی کے لال قلعے پر آصف جاہی جھنڈا لہرائیں گے۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ چارمینار کی پڑی بن کر ہی رہ گیا۔

کچھ ہی سال پہلے ایک چارمیناری نے ایک زبردست پڑی چھوڑ کر سارے شہر کو پریشان کیا تھا۔ اچانک بات پھیل گئی گنڈی پیٹ (جہاں سے سارے شہر کو پینے کا پانی سپلائی ہوتا ہے) کا ڈیم ٹوٹ گیا ہے۔ اور پانی شہر میں آرہا ہے۔ آزادی کے بعد یہ چارمینار کی سب سے بڑی پڑی تھی۔ اس پڑی کی وجہ سے کتنا ہنگامہ ہوا اور کتنی نئی پڑیاں جنم لے سکیں اس کے بارے میں ریسرچ کی سخت ضرورت ہے۔ دو گھنٹوں کے لئے تو سارا شہر بدحواس ضرور ہو گیا تھا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ چارمینار کی پڑی میں کتنی زبردست طاقت ہوتی ہے۔ اگر کوئی ہشیاری سے اس کا استعمال کرے تو چھتیس لاکھ لوگوں کو الو بنایا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگ چھوٹے پیمانے پر یہ کام بھی کرتے ہیں۔

ہندی اور اردو کے کئی شاعر چارمینار کے علاقے میں رہتے ہیں۔ وہ کس حد تک چارمینار کی پڑیاں مارنے میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ تو انہیں کو معلوم ہوگا۔ اس کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاعری پر میرا حق نہیں ہے۔ ایک، اور مزے کی بات دیکھئے۔ حیدرآباد کے نامی گرامی صحافی بھی چارمینار کے علاقے میں ہی رہتے ہیں اور صحافی پڑیاں مارتے ہی نہیں بلکہ ان کی پیدائش و افزائش میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ جس کی مثال آپ دہلی کے "دن مان" سے لے کر حیدرآباد کے "حیدرآباد سماچار" تک میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے شاید ایک صحافی اپنے اخبار کو زیادہ سچا ثابت کرنے کے لئے اپنے دفتروں کو چارمینار سے ہٹا کر نئے علاقے میں لے آئے ہیں۔

لیکن یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ چارمینار کی پڑیاں صرف اسی علاقے میں رہنے والے ہی مارتے ہیں۔ چارمینار سارے حیدرآباد کی نشانی ہے۔ اس لیے چارمینار کی پڑیاں بھی حیدرآباد کی گلی گلی میں پیدا ہوتی ہیں اور اپنی قوت اور وزن کے مطابق پھیلتی جاتی ہیں۔ تلنگانہ تحریک میں تو چارمینار کے سپوتوں نے اتنی پڑیاں ماریں کہ ان کے اثر میں آکر کئی لوگوں نے اپنی جانیں گنوا دیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آج کل چارمینار کی پڑیوں کا اثر کچھ کم ہو رہا ہے اور قطب مینار کی پڑیوں کا اثر بڑھ رہا ہے۔

آخر کیوں نہ بڑھے؟ ہندوستان کے بھی بڑے بڑے پڑی مار ان دنوں دہلی میں جو جمع ہوگئے ہیں!

اقبال شانہ

قلمی دوستی

دامنِ مجنوں کبھی ہوتا نہ یارو تار تار
کاش ہوجاتی کسی درزن سے قلمی دوستی

وہ جو خط لکھتے ہیں شاید میں سمجھ سکتا نہیں
ہوگئی یارو عجب الجھن سے قلمی دوستی

چور قلمی دوست میرا قید کھٹمنڈو میں ہے
کر رہا ہوں میں بھی واشنگٹن سے قلمی دوستی

آرہے ہیں ساجنا پردیس سے اب کے برس
چل رہی ہے آج کل ساون سے قلمی دوستی

مفت کھل جاتے تمہارے خوشنما سہرے کے پھول
کاش ہوجاتی کسی مالن سے قلمی دوستی

سانپ کے بل میں تمنا ہی اگر گھسنے کی ہے
کیوں نہیں کرتے میاں ناگن سے قلمی دوستی

ہم نہیں لیتے ہیں اکثر ریل کا شانہ ٹکٹ
ہے ہماری ریل کے انجن سے قلمی دوستی

☆●☆

منہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

عجب ہے کھلا رکھنا اپنے گھر کا دروازہ
ہم نے بارہا بھگتا اس خطا کا خمیازہ

ڈھیلے ڈھالے کپڑوں سے ہورہا ہے اندازہ
آدمی یہ آیا ہے شہر میں ابھی تازہ

ایسے غیرے کیا جانیں بات سادگی والی
تیرے قدرداں ہم ہیں اے جمال بے غازہ!

جس کے پیدا ہوتے ہی، گھر میں بٹ گئے بھائی
نام اس کا رکھا ہے دوستوں نے شیرازہ

سر جھکا کے چلنا بھی آئے بال بچوں کو
چار فٹ کا رکھئے گا گھر میں ایک دروازہ

میٹھی میٹھی باتوں سے اصلیت نہیں کھلتی
واسطے سے ہوتا ہے راستی کا اندازہ

سامنے نہیں آیا کوئی مہرباں بن کر
کھٹکھٹا کے گزرا ہوں ایک ایک دروازہ

کیا شباب ہے اسکا، کیا جمال ہے اسکا
وہ بہشت کا جیسے کوئی پھول تر و تازہ

●☆●

اقبال شانہ

سوچئیے

بند کمرے میں بہت سوچا کئے
اب ذرا باہر نکل کر سوچئے

سوچنے پر کوئی پابندی نہیں
جب بھی جی چاہے ٹہل کر سوچئے

ایک کروٹ پر غزل ہوتی نہیں
دوسری کروٹ بدل کر سوچئے

جیت ہوگی کھیل کے میدان میں
گیند سے زیادہ اچھل کر سوچئے

جان جاؤگے حقیقت قیس کی
پیار کے چولھے میں جل کر سوچئے

وادیوں میں سوچ کی لے جاؤنگا
آپ میرے ساتھ چل کر سوچئے

میں بھی افلاطون سے کچھ کم نہیں
میرے بارے میں سنبھل کر سوچئے

جلد ہی بقراط بن جائیں گے آپ
سوچ کے سانچے میں ڈھل کر سوچئے

سارا گلشن سوچتا رہ جائے گا
باغ میں شانہ ٹہل کر سوچئے

☆●☆

رمیسہ محمد
حیدرآباد

میچنگ

میچنگ کا یوں تو ہر دور میں بڑا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ لیکن آج کل تو یہ ایک ہنر ہے۔ سلیقہ مندی کی علامت ہے۔ یہ فن اتنا ترقی کر چکا ہے کہ میچنگ میں تھوڑا سا فرق بھی آجائے تو وہ قابل قبول نہیں ہے۔ آج کل کئی میچنگ سنٹر کھل چکے ہیں۔ بابا میچنگ سنٹر سے لے کر بی بی میچنگ سنٹر تک مختلف ذوق اور مختلف نمونوں کے میچنگ ڈھونڈنے کے لئے پہلے کی طرح مشکلات کا سامنا کرنا نہیں پڑتا لیکن تھوڑی سی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہمارے ماموں جان کو ممانی جان کے لباس کا خاص خیال رہتا تھا اس لیے وہ ہمیشہ ہی میچنگ کا بیڑہ خود ہی اٹھاتے رہے اور جس حد تک ہوسکے اس کو پوری کامیابی کے ساتھ نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی اچھی ساڑی ممانی جان خرید لیتیں تو اس کی میچنگ کے مراحل بے چارے ماموں جان کو طے کرنے پڑتے۔ ممانی جان تو اپنی جان کو دھکا بھی نہ لگنے دیں۔ اب اس میچنگ کے لئے ماموں جان کو ساڑی لئے بازار جانا پڑتا تھا۔ اگر ساڑی بھاری اور اگر کلر بھی کوئی نادر ہو تو کوئی نیچرل چیز ہی کو ساتھ لے جانا پڑتا مثلاً ساڑی کا رنگ انتہائی ہلکا بسکٹ کلر ہو تو پھر بسکٹ کو ہی ساتھ لے جایا کرتے۔ ایسے حالات میں ماموں جان کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ایک دفعہ کسی شریر لڑکے نے سارے بسکٹ ہضم کر لیے۔ ساڑی کی میچنگ ادھوری رہ گئی۔ آخر کنٹراسٹ کلر پر بلا ٹلی۔ اتنا ہی نہیں ایک دفعہ گلاب کی پتی کے کلر کی میچنگ کی ضرورت تھی۔ چونکہ گھر میں گلاب کے پھول بہت سارے تھے۔ بے چارے ماموں جان نے اس خیال سے کہ میچنگ بہت کامیاب رہے گی گملے سے گلاب کا ایک پھول ساتھ لے لیا۔ لیکن وائے رے قسمت دھوپ کی شدت اور جیب کی گرمی سے پھول کا رنگ بالکل بدل گیا۔ اب کیا تھا میچنگ کا واٹولہ ہو گیا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ یہاں تک کہ گملوں کے تمام گلاب میچنگ کی نظر ہو گئے۔ آخر آخری گلاب پر کامیاب میچنگ وصول ہوئی۔ کبھی کبھی میچنگ کے لئے کاغذ (بشرطیکہ رنگ ملتا جلتا) کافی کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ موز کے پتے کا رنگ بھی بڑا خوشنما ہوتا ہے۔ ممانی نے اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں موز کے پتے کے رنگ والی بڑی خوب صورت ساڑی لے ڈالی اور اس پر رنگین موتی اور چمکی کا کام کروایا۔ اس خوبصورت رنگ پر اتنا عمدہ کام ساڑی کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے۔ اب میچنگ کا مرحلہ تھا ساڑی کی خوبصورتی اور اس کی نزاکت کے لحاظ سے اسے لئے پھرنا تو قطعی مناسب نہ تھا۔ لہٰذا ہم نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ ایک موز کا پتا ساتھ لے لیا جائے۔ موز کے پتے کے لئے ہم نے سارے محلے میں کہلوایا لیکن کہیں بھی موز کا پتا نہ ملنا تھا سو نہ ملا۔ کسی نے کہا کہ ہم موز کے درخت کیوں لگائیں گے روزانہ یہاں ہنڈیاں جو گذرتی ہیں۔ ایسی بھی کیا کفالت ہے کہ ہم موز گھر میں اگائیں۔ ابھی تو بھارت کی معاشی حالت اتنی بدتر نہیں ہوئی ہے۔ ایک صاحبہ نے فرمایا ہمارے ہاں تو موز کا جھاڑ لگانا بالکل ہی راس نہیں آتا۔ اس لئے کہ پچھلے سال ہمارے لڑکے نے بمبئی والے موز کا جھاڑ لگایا تھا تو اس کے دادا گذر گئے تھے جب سے ہم تو نہ موز کا جھاڑ لگاتے ہیں اور نہ ہی کدو کی بیل اس لئے کہ کدو کی بیل

سے تو ہماری سا سوچ ہی گذر گئی تھیں۔ خیر جناب لے دے کے ایک برہمن دوست کے گھر میں موز کے بہت سارے پودے تھے۔ ہم نے وہاں سے موز کا پتا حاصل کیا اور میاچنگ کے لئے روانہ ہوگئے۔ موز کے پتے کو ایک پولی تھین کے بیاگ میں تھوڑا سا پانی ڈال کر بڑی ہی احتیاط کے ساتھ ہم نے اسے ساتھ رکھا۔ جہاں بھی ہم رکتے وہاں مجمع جمع ہو جاتا اس لئے کہ لوگ اس عجیب و غریب میچنگ انداز کو دیکھنے کے لئے بے چین ہو جاتے تھے۔ خیر سے ہم نے ایک میچنگ سنٹر میں اپنی میچنگ ڈھونڈ ہی لی لیکن دوکاندار صاحب کا دماغ ساتویں آسمان پر تیر رہا تھا۔ جیسے جیسے ہم رنگ کو غور سے دیکھتے اور میاچنگ تلاش کرتے تھے وہ دام میں دس دس روپے کا اضافہ کرتے جاتے۔ یہاں تک کہ کچھ کمی کرنے کی التجا پر وہ بہت زیادہ مشتعل ہوگئے۔ اور فوری دام دوگنے کر دیئے۔ خیر پھر بھی ہم نے کسی طرح اس مشکل مرحلہ کا حل ڈھونڈ لیا اور آخر میں فائنل کرنے کے لئے جیسے ہی کپڑے کو موز کے پتے کے ساتھ بجائے ٹیوب لائٹ کے سورج کی روشنی میں لے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بکری کا بچہ اچانک نمودار ہوا اور موز کا پتا چھین کر چلتا بنا۔ اب تو ہمارا دماغ ماؤف ہو گیا اور وہیں کافی دیر تک بیٹھ گئے کہ اب کریں تو کیا کریں۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ قریب ہی ایک پارک ہے آپ کیوں نہ وہاں سے ایک کینا کا پتا حاصل کر لیں اور پھر میچنگ کا سلسلہ جاری رکھیں۔ بس پھر کیا تھا ہم لپک کر پارک گئے اور کینا کا پتا حاصل کر کے دگنی بلکہ چوگنی قیمت پر میچنگ کا مسئلہ حل کر لیا۔

ماموں جان تو ہماری محنت سے بہت خوش ہوئے لیکن ہماری یہ ہمدردی بڑی مہنگی پڑی۔ ممانی صاحبہ پر تو میچنگ کا بھوت سوار رہتا تھا۔ انہیں ہماری اس پتا پر رحم نہ آیا۔ اس مرتبہ انہوں نے ایک ہینڈ لوم ساڑی جس پر زری کا کام تھا خریدی تھی۔ اب رہا سوال میچنگ کا وہ تو ہمیں میچنگ ماسٹر سمجھ چکی تھیں اور اب کی بار تو صرف دھاگے کے گچھے پر ہی اکتفا کر لیا اور یہ کہہ دیا کہ بس تقریباً یہی کلر ہونا چاہیے اور ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہمارے ہاتھوں میں اکثر پسینہ آتا رہتا ہے۔ تاگے کے گچھے نے رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ گویا گرگٹ ہاتھوں میں ہوں۔

بہرحال میچنگ سنٹر پہنچے اور جو گچھا ہم نے بڑی احتیاط سے ایک کاغذ میں رکھ کر اس میچنگ سنٹر کے لڑکے کو دیا کہ بھائی اس کلر کا کپڑا چاہیے گچھے کا رنگ کچھ عجب ہو گیا تھا وہ لڑکا لاکھ تلاش کے باوجود ناکام رہا اور وہ گچھا یہ کہتے ہوئے ہمارے ہاتھوں میں تھما دیا کہ یہ فارن کا کلر ہے۔ اس کا ملنا بڑا مشکل ہے۔ لہذا بہتر ہے آپ اس کے لئے Opposite کلر کا انتخاب کر لیں۔ آج کل اس کا بہت رواج ہے لیکن ہم نے بیزار ہو کر ملٹی کلر کا انتخاب کر لیا کہ ممانی کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔

دلشاد رضوی
(حیدرآباد)

بڑے میاں ٹیلی فون والے

ادھر سامنے والے بانکے نواب کے فلیٹ میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی، ٹرن ٹرن، ٹرن ٹرن، ادھر مقابل کے فلیٹ میں مسعود میاں کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ درخواست دیئے ہوئے تین سال ہوگئے کم بخت ٹیلی فون کا سارا محکمہ یوں چپ سادھے ہوئے تھا جیسے سارے ڈپارٹمنٹ ہی کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ سوچتے کہ کاش وہ ایسے گھر نما فلیٹ ہی میں نہ رہتے کہ جس کا نہ فرش ہی پورا اپنا نہ چھت ہی پورا ذاتی، اس پر طرہ یہ کہ دروازہ کے سامنے بانکے نواب کا دروازہ، اب بانکے نواب کھانستے تو مسعود میاں کی نیند اڑ جاتی اور وہ چھینکتے تو ان کا دل دہل جاتا۔ آخر بانکے نواب کو کس لئے یہ حق بھی دے دیا ہے کہ وہ اپنے ٹیلی فون کی گھنٹیاں سناسنا کر مسعود میاں کے پہلے ہی سے دھڑکتے دل کو مزید زور و شور سے دھڑکائیں۔ ابھی وہ اس سنگین مسئلہ پر غور کر ہی رہے تھے کہ سامنے پڑے ہوئے اخبار پر نظر پڑی۔ خبر پڑھ کر مسعود میاں یوں اچھل پڑے جیسے انہیں بجلی کا شاک لگا ہو۔ آخر وہ کیوں نہ اچھلتے، خبر بھی تو ویسی ہی اچھالنے والی تھی نا۔ لکھا تھا "راتوں رات ٹیلی فون کے مالک بن جائیے، دل کی مراد پوری کرنی ہو تو آؤ دیکھئے نا تاؤ بس پندرہ ہزار جیب سے نکالئے اور گھر میں ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجائیے۔ بن پیسہ ہرگز نہ ملئے۔ پیسہ ہو تو ہمارا پتہ ہے گوری گلی، عقب کالی دیوار، ٹیلی فون والے بڑے میاں فون نمبر ایک دو تین چار پانچ چھ" مسعود میاں کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یوں چٹ پٹ بھی دل کی مرادیں پوری ہو جائیں گی، وہ فوراً سامنے والے بانکے نواب کے ہاں لپکے دل میں تو لڈو پھوٹ ہی رہے تھے لبوں پر بھلا مٹھاس کیسے نہ رہتی۔ میٹھی سریلی آواز نکالتے ہوئے بولے "نواب غریب خانہ میں اب ٹیلی فون داخل ہوا ہی چاہتا ہے بس ایک بار میں آپ کو تکلیف دیتا ہوں آپ کے فون پر ذرا دریافت کر لوں کہ آخر کنکشن دینے میں دیر کیوں ہو رہی ہے" بانکے نواب کی پان کی گلوری منہ سے نکلتے نکلتے دوبارہ اندر چلی گئی حیرت سے بولے "آپ کو بلا کسی دھوم دھام کے فون کیسے مل گیا"۔ مسعود میاں جھوم کر بولے "اجی بس مل گیا۔ صرف کنکشن ملنا باقی ہے وہی تو پوچھنے آیا ہوں کہ آخر اب دیر کس بات کی ہے" بانکے نواب نے کانپتے ہاتھوں سے ٹیلی فون سیٹ کو آگے کھسکا دیا اور مسعود میاں کی انگلیاں فون پر یوں حرکت کرنے لگیں جیسے کسی ماہر ٹائپسٹ کی ٹائپ مشین پر کرتی ہیں ایک دو تین چار پانچ چھ "گوری گلی" آواز آئی "ہاں گوری گلی"۔ مسعود میاں بولے "عقب کالی دیوار" پھر آواز آئی "ہاں عقب کالی دیوار" وہ بولے "کیا آپ ٹیلی فون والے بڑے میاں بول رہے ہیں" ادھر سے آواز آئی "جی ہاں میں ہی ٹیلی فون والا بڑے میاں بول رہا ہوں" مسعود میاں جوش میں بولے "کیا ٹیلی فون تیار ہے" آواز آئی "کیا رقم تیار ہے" مسعود میاں نے سر ہلا دیا لیکن وہ ناکافی تھا کیونکہ بات ٹیلی فون پر ہو رہی تھی۔ پھر آواز آئی "کیا رقم تیار ہے" مسعود میاں نے سر کے ساتھ زبان بھی ہلائی "ہاں بڑے میاں تیار ہے تیار ہے" آواز آئی "تب تو سمجھئے ٹیلی فون تیار ہے تیار ہے آپ رقم لے کر فوراً گوری

گلی آجائیے وہاں آپ کو کالی دیوار نظر آئے گی بس سمجھئیے کہ آپ منزل پر پہنچ ہی گئے کیونکہ خاکسار ٹیلی فونوں کے کاروبار کی بدولت سارے شہر میں شہرت رکھتا ہے اب تک درجنوں لوگوں کی مرادیں بر آچکی ہیں آپ آرہے ہیں حاضر ہیں خدمت کے لئے منتظر رہوں گا" کھٹ! اور ٹیلی فون کٹ گیا۔ مسعود میاں کا ایک دل خوشی سے یوں بلیوں اچھلنے لگا جیسے ان کے سینے میں درجنوں بلیاں اچھل کود رہی ہوں۔ دھڑام سے رسیور پٹکا اور وہاں سے یہ جا وہ جا بینک سے رقم نکالی اور سیدھے گوری گلی کا رخ کیا۔ انہیں کالی دیوار ڈھونڈنے میں دیر نہیں لگی دیکھا کہ وہیں ویران سی گلی میں ایک سفالی مکان پر بڑا سا بورڈ لگا ہے "بڑے میاں ٹیلی فون والے" مسعود میاں اپنے مقدر پر رشک کرتے ہوئے دروازہ میں جونہی داخل ہوئے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک لمبا پورا بڑی بڑی وحشت ناک قسم کی مونچھوں والا مسٹنڈا اجوڑی چکنی کرسی میں پھنسا بیٹھا کسی سے ٹیلی فون پر محو گفتگو ہے "جی ہاں جی ہاں۔ صرف پندرہ ہزار اور مدت پندرہ یوم بس ٹیلی فون آپ کا۔ جلدی کیجئے اسٹاک تھوڑا سا بچ گیا ہے۔ کیا کہا رقم شام تک لائینگے ترمیں لینا ہے، کوئی بات ک نہیں کوئی بات نہیں، ٹھیک کام ہیں سب چلتا ہے میں انتظار کروں گا۔ اتنا کہہ کر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا اور بولا " فرمائیے" مسعود میاں سمجھے کہ وہ بڑے میاں کا کوئی نمائندہ ہے بولے "جی آپ سے بالکل نہیں، مجھے تو صرف بڑے میاں سے ملنا ہے" وہ چہرہ پر لمبی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا" ہر نووارد یہی کہتا ہے بات یہ ہے کہ میں ہی اپنے ماں باپ کا سب سے بڑا لڑکا ہوں باقی آٹھ کے آٹھ مجھ سے چھوٹے ہیں پیار سے جب میری ماں نے مجھے بڑے میاں کہنا شروع کیا تب سے اس کم عمری ہی میں خاکسار بڑے میاں کہلانے لگا" مسعود میاں نے گلہ صاف کرتے ہوئے مدعا بیان کر دیا اور بڑے میاں نے گھنٹی بجا کر ملازم کو لالہ کے ہاں سے دو چائے لانے کا آرڈر دیا پھر مسعود میاں سے یوں مخاطب ہوا" دیکھئے صرف خدمت ہی کا جذبہ کارفرما ہے ورنہ اس زمانہ میں بھلا پندرہ دن میں ٹیلی فون کون فراہم کر سکتا ہے۔ اس میں دس ہزار تو ٹیلی فون والوں کے نذر کرنے ہیں اپنے تو صرف پانچ ہزار ہی ہیں نکالئے رقم اور مسعود میاں نے جلدی جلدی دس دس کے پندرہ نوٹوں کے بنڈل میز پر رکھ دیئے۔ بڑے میاں نے پورے سکون کا مظاہرہ کرتے ہوئے جملہ رقم ڈرائر میں انڈیل لی اور مسعود میاں کا پتہ یوں نوٹ کر لیا جیسے پوسٹ کے ذریعے ٹیلی فون ارسال کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اتنے میں چھینکے میں رکھی دو گلاسوں میں لالہ کے ہاں سے چائے آگئی مسعود میاں نے گرم جوشی سے گرم گرم چائے یوں حلق میں انڈیل لی جیسے کچھ دیر پہلے بڑے میاں نے ڈرائر میں نوٹ انڈیلے تھے۔ اور خوش خوش وہاں سے رخصت ہوگئے۔ دس دن تک تو بڑے میاں سے خوشگوار گفتگو کا سلسلہ جاری رہا پر گیارہویں دن سے بڑے میاں کا ٹیلی فون انگیج ہلانے لگا کیوں نہ ہو شہر میں ٹیلی فون کی مانگ ہی کچھ ایسی تھی لیکن...... لیکن جب وہ فون ملاتے ملاتے تھک گئے تب ان کا ماتھا ذور سے ٹھنکا اور وہ دوڑے دوڑے گوری گلی میں کالی دیوار کے عقب پہنچ ہی گئے۔ پہنچنے پر کیا دیکھتے ہیں کہ دس پندرہ شریف زادے آپس میں کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ مسعود میاں نے مداخلت کی تو وہ ان پر جیسے جھپٹ پڑے "لو آپ اپنا راستہ لیں ہم تو لٹے بیٹھے ہیں اور آپ آئے ہمیں شاید تسلی دینے" مسعود میاں تو خود تسلی کے لیے آئے تھے۔ دینے کا بھلا کہاں سوال تھا گھبرا کر بولے " بات کیا ہے" ان میں کا ایک بولا "لو بات کیا ہوگی جانے کون پردیسی تھا بڑا آیا تھا فلاحی کام کرنے والا، ٹیلی فون دینے کے بہانے سارا پیسہ ہضم کر کے پردیس بھاگ گیا" اتنا سنتے ہی مسعود میاں کے پیروں تلے جتنی بھی زمین تھی وہ انہیں کھسکتی محسوس ہونے لگی۔

گوشت ملے تو مفت نہ لوں...

ڈاکٹر ایس ام معین قریشی (پاکستان)

ہم نے گوشت کے موضوع پر لکھنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے... اسی لئے کہ نام کی وجہ سے لوگ بلاوجہ ہمارے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ تاہم اب جبکہ قصائی کی چھری بکرے کے حلق سے ہوتی ہوئی بندے کے حلق تک پہنچ گئی ہے۔ ع

قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

ایک سپر مارکٹ کے گوشت سیکشن میں خاتون اپنے دو بچوں کے ساتھ داخل ہوئیں اور اپنی پسند کے اسٹال پر آکر قدرے جلدی میں قیمے کا آرڈر دیا۔ قصائی نے جواب میں وہی روایتی بات کہی کہ "بیگم صاحبہ! ان صاحب کا بھیجا نکال لوں! ان محترمہ کی نلیاں توڑدوں پھر آپ کا قیمہ بناؤں گا۔" بچے یہ جواب سن کر سہم گئے لیکن ان کی ماں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا: "ابھی سے ڈر رہے ہو؟ ابھی تو اس نے قیمت بھی نہیں بتائی!"۔ اشیائے صرف میں یوں تو ہر چیز مہنگی ہے لیکن گوشت کی قیمتیں گویا ٹیکسی کا میٹر بن گئی ہیں، جب دیکھو اوپر ہی اوپر۔ شہروں میں گھر کا سودا سلف عموماً خواتین خود ہی لاتی ہیں کیونکہ مردوں سے انہیں شکایت رہتی ہے کہ وہ مہنگی چیز خریدتے ہیں اور دوکاندار دو نمبر کا مال آسانی سے ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ صرف اس ایک حقیقت کی بنیاد پر کہ قیمتوں کے وار براہ راست عورتیں برداشت کرتی ہیں ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط اعصاب کی مالک ہوتی ہیں۔ اسی لئے وہ مرد کے دل اور بنک بیلنس دونوں پر راج کرتی ہیں (سنا ہے اردن میں دوسری قسم کے راج کو قانونی تحفظ حاصل ہے اور بیوی اپنے شوہر کے بنک اکاؤنٹ سے پیسے نکلوا سکتی ہے)۔

اب جہاں تک گوشت کا تعلق ہے کم از کم مسلمان کا اس کے بغیر گزارہ نہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف کراچی کے شہری ایک دن میں اوسطاً ۲۰ ہزار مرغیاں، ۵۰۰۰ ہزار گائے بھینس اور ۲۰ ہزار بھیڑ بکریاں چٹ کر جاتے ہیں۔ یہ شادی بیاہ میں کھانوں پر پابندی کے بعد کی صورت حال ہے۔ جب شادی کے کھانے رواتھے تو گوشت کے خرچ اور اس سے زیادہ اسراف بے جا کی کوئی حد نہ تھی۔ لوگ باگ کھانے کی ڈشوں پر اس طرح ٹوٹتے تھے جیسے یہ نعمت انہیں آخری بار میسر ہو رہی ہوں۔ ع۔ دوبارہ پھر "کباب" آئے نہ آئے

جب کبھی مقامی انتظامیہ کی جانب سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ گوشت کی قیمتوں کو کنٹرول کیا جائے گا تو شہریوں کے ہوش و حواس کنٹرول سے باہر ہوجاتے ہیں۔ دوسری طرف انجمن قریش کے ارکان خوشی سے بے قابو ہوجاتے ہیں۔ قیمتوں پر کنٹرول کا مطلب ان پر نظر ثانی ہوتا ہے اور "نظر ثانی" کا سیدھا سادا مطلب اضافہ ہوتا ہے۔ نئی قیمتیں صارف کو نئی دھڑکنیں فراہم کرتی ہیں لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اعلان کردہ نظر ثانی شدہ قیمتوں کا اطلاق کبھی نہیں ہوتا۔ دس بارہ روپے فی کیلو کا جو اضافہ قصاب پرانی قیمتوں پر کرتے تھے وہ نئی قیمتوں میں ہوجاتا ہے۔ اس طرح قصاب تو نظر ثانی کے نتیجہ میں خوشحال ہوکر "عقد ثانی" کے قابل ہوجاتا ہے جبکہ بے چارہ صارف اگر کنوارہ ہے تو پہلے کی طرح "لاثانی" رہتا ہے اور شادی شدہ ہے تو اس کیلئے پہلے سے سوا پریشانی۔ یہ بات بھی طے ہے کہ کوئی سمجھدار شخص قصائی سے الجھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس لئے کہ اشیائے صرف کے دکانداروں میں سب سے جلد بھڑک جانے والی مخلوق یہی ہے جسے بغیر لائسنس کے مہلک ہتھیار رکھنے کا قانونی حق بھی حاصل ہے۔ نیپال میں ہم نے "بہ چشم خود" دیکھا کہ قصاب کا کام عموماً عورتیں کرتی ہیں اور مرد ان کے سامنے بھیگی بلی کی طرح باادب، باملاحظہ کھڑے رہتے ہیں۔ شروع میں اس بدذوقی پر ہمیں خاصی حیرت ہوئی تھی۔ ہم صنف نازک کے غمزوں کے آگے تو ڈھیر ہوسکتے ہیں، اس کے ہاتھ میں آہنی ہتھیار دیکھ کر مردانہ جلال عمر کے اس حصے میں بھی ابال کھاجاتا ہے۔ اکبر الہ آبادی بھی اسی مسلک کے پیرو تھے۔ کہتے ہیں؛

اکبر کبھی دبے نہیں سلطان کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بیگم کی نوج سے

اردو شاعر جو عورتوں کیلئے نظر کے تیر، ابرو کے خنجر اور سرمے کی شمشیر جیسے استعاراتی ہتھیار تجویز کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں اصلی چھری، بغدا اور سلاخ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہمارے شاعر خیالی عورتوں کو گوشت کاٹتے، ہڈیاں توڑتے اور قیمہ بناتے دیکھ لیں تو شاعری سے توبہ کرکے کوئی شریفانہ پیشہ اختیار کرلیں۔ اس سال عید الضحیٰ کے موقع پر ڈیڑھ سو روپئے کا زندہ سلامت بیل ہم نے صرف ڈیڑھ سو روپئے میں خریدا تھا۔ قبل ازیں ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ایک اچھی خاصی بکری ۲۰ سے ۲۵ روپئے میں مل جاتی تھی۔ آج اس کے صرف ایک کیلو گوشت کی قیمت سوا سو روپئے ہے۔ یاد "بکری" عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

قیمتوں سے قطع نظر گوشت کا معیار جس تیزی سے نیچے گر رہا ہے اتنی تیزی سے تو شاید درخت سے ٹوٹا ہوا سیب بھی نیوٹن کے سر پہ نہ گرا ہوگا۔ اس پر یاد آیا ماہرین آثار قدیمہ نے ۳۰۰ سالہ قدیم وہ درخت دریافت کرلیا ہے جس کے سیب نے صحیح وقت اور صحیح نشانے پر گر کر نیوٹن کے دماغ میں کشش ثقل کا اصول اچھی طرح بٹھا دیا تھا۔ خیر اس کو چھوڑیئے، ایک پرانی کہاوت ہے کہ کنجڑے (سبزی فروش) کے پاس اول وقت سبزی تازہ مل جاتی ہے اور شام کے قریب گوشت بڑی حد تک چھچھڑوں اور ہڈیوں سے پاک اور خشک ہو کر کم وزن ہو جاتا ہے لیکن صاحب، قصائی نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں، وہ الگ رکھے ہوئے چھچھڑے بڑی مہارت کے ساتھ آپ کی بوٹیوں میں ملا دیگا اور تو دیکھتے رہیو۔ آج کل اگر آپ غیر معیاری گوشت سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ گوشت کی مارکٹ میں نہ جائیں۔ یہی مشورہ ہم نے گزشتہ روز حضرت دل گیر کو دیا تھا جو سر راہ ملاقات میں ہم سے مہنگے اور گھٹیا گوشت پر احتجاج کر رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ اول تو ہم بد قسمتی سے وہ والے قریشی نہیں ہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں اور جانوروں کے ساتھ ساتھ گاہکوں کی کھال اتارنے لگے ہیں۔ دوسرے ہمارے یہاں معیار کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں۔ "تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں سبزی خور ہو جاؤں؟" انہوں نے طنز کیا۔ "آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔" ہم نے سرسری رائے دی۔ دل گیر صاحب بولے "میں ہرگز اس شخص جیسا نہیں ہونا چاہتا جس کا نقشہ دلاور فگار مرحوم نے اپنے شعر میں اس طرح کھینچا تھا کہ:

اک صاحب سبزیاں کھا کر جو اب تک زندہ تھے
اپنی صورت آئینے میں دیکھ کر شرمندہ تھے

کیا کوئی شخص پروٹین کے بغیر اس شرمندگی سے بچ سکتا ہے؟"۔ ہم نے کہا "آپ دالوں سے بھی پروٹین حاصل کرسکتے ہیں اس پر انہوں نے پہلے یہ شعر پڑھا: گو پروٹین دال میں بھی ہے
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اور پھر کہنے لگے "گوشت تو گوشت میں تو ہڈی سے بھی "بقدر ضرب" پروٹین حاصل کرلیتا ہوں۔ بھلا بتایئے تو آپ کس طرح گزارہ کرتے ہیں؟" ہم نے کہا "میاں لاحول ولاقوۃ" گوشت ملے تو مفت نہ لوں ہڈی کی کیا ہستی ہے؟"۔ اس حقیقت پسندانہ تبصرے پر اظہار ناپسندیدگی فرماتے ہوئے بولے "بھاڑ میں جائے پروٹین" میں مسلمان ہوں اور گوشت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ میری قومی شناخت کا مسئلہ بھی تو ہے۔"۔ بالآخر ہم نے ہتھیار ڈال دیئے اور ان سے اجازت چاہی چلتے وقت انہوں نے آنکھ مارتے ہوئے پوچھا "کہاں جارہے ہو؟"۔ ہم نے انہیں چھیڑنے کی غرض سے کہا "ایمپریس مارکٹ جہاں میری شناخت ہک پر لٹک رہی ہے"۔

ترجمہ: ڈاکٹر میر گوہر علی خاں
H.No: 19-2-81/3/B, Khaja Pahadi,
Mir Alam Tank Road, Hyd.264.

بور بچہ اور ہینڈ بیگ

ٹیچر کی حیثیت سے جو زندگی میں نے گزاری ہے اس میں سب سے زیادہ اعزاز (اپنی دانست میں) اس وقت ملا کرتا تھا جب مجھے اپنی طالبات کو تعلیمی تفریح کیلئے شہر سے باہر لے جانے کی ہدایت ملتی اور انچارج بھی بنادیا جاتا تھا۔

ایک دفعہ میں چند استادنیاں اور چالیس (۴۰) طالبات دل میں کولمبو کے نئے نئے مقامات دیکھنے کی تمنا اور امنگ لئے ہوائی جہاز میں سوار ہوئے۔ وہاں کے بیشتر مقامات کی سیر کرنے کے بعد ہمارے گائیڈ نے کہا کہ کل وہ ہمیں کولمبو کا خوبصورت، مشہور و معروف چڑیا گھر دکھائے گا۔ گائیڈ نے مبالغہ سے کام نہیں لیا تھا۔ یقیناً چڑیا گھر بڑا ہی خوبصورت تھا۔ ہرے بھرے درخت، سر سبز لان، پھولوں سے لدی جھولتی ہوئی ڈالیاں، فضاؤں میں خنکی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، صحت مند جانور، خوش رنگ اڑتے پھدکتے پرند... مگر جانوروں کے پنجروں کے اطراف حفاظتی ریلنگ Railing کا نہ ہونا مجھے بہت کھلا۔ تھوڑی سی رقم کی بچت کی خاطر احتیاط کو نظر انداز کرنا ناسمجھی نہیں تو اور کیا کہلائی جاسکتی ہے۔ درجنوں چھوٹی چھوٹی تختیوں پر لکھے ہوئے یہ الفاظ "خبردار پنجروں کے نزدیک نہ جائیں" بے معنی سے لگے۔ احتیاطاً میں نے ساری طالبات کو شدید ترین وارننگ دے دی کہ وہ پنجروں سے ذرا دور کھڑے ہو کر ہی جانوروں کا نظارہ کریں۔

گھومتے گھامتے آخر کار ہم لوگ زو کے سب سے مشہور جانور "سیاہ تیندوے" Black Panther کے پنجرے کے پاس پہنچ گئے۔ بڑا صحتمند جانور تھا۔ سیاہ چمکتا ہوا رنگ، گٹھیلا بدن، اپنے پنجرے میں بے مقصد مسلسل ٹہل رہا تھا مگر جب اس کے چہرے پر میری نظریں پڑیں تو جاندار جبڑوں اور خونخوار سرخی لی ہوئی آنکھوں سے ایک انجانا خوف جاگ اٹھا۔ اگر اسے Hound of the Baskerville کہیں تو یہ تمثیل غلط نہ ہوگی۔ چڑیا گھر کے بہت سے ناظرین اور میری طالبات کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس خونخوار مگر خوبصورت بور بچے کے ساتھ اپنی تصویریں کھنچوائیں۔ مجھے ان کی اس خواہش میں صاف خطرہ نظر آرہا تھا۔ مزید احتیاط کے طور پر انہیں آگاہ کردیا کہ وہ بہت ہوشیاری سے کام لیں اور اس بور بچے کے پنجرے سے ڈیڑھ دو فٹ کی دوری سے تصویریں لیں۔ یکے بعد دیگرے ان سب لڑکیوں کی تصویریں اتاری گئیں۔ آخر میں ایک لڑکی رہ گئی جو بالکل فلمی انداز میں اپنی تصویر کھنچوانے پر بضد تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اس کی پتلی کمر پر اور دوسرا رنگین ہیٹ پر تھا۔ اس کی کمر پر رکھے ہوئے ہاتھ ہی نے غضب ڈھایا۔ پتہ نہیں کس جھپکے میں بور بچہ نے اس کا طاقتور پنجہ پنجرے کی سلاخوں کے درمیان سے نکالا، لڑکی کے ڈھیلے ڈھالے آستین کی دھجیاں اڑا ڈالیں اور اس کے کندھے سے لٹکتے ہوئے لمبے strap والے ہینڈ بیگ کو اپنی بھرپور قوت سے اندر کی جانب کھینچ لیا۔ ساتھ ہی لڑکی بے چاری بھی اس کے حملے کی زد میں آجاتی اگر میں اپنی حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس کے ہینڈ بیگ کے تسمے کو توڑ نہ ڈالا ہوتا۔

ایک شور و غل اٹھا۔ لڑکی کی چیخیں، ادھر بور بچے کا دھاڑنا، ان ساری لڑکیوں کا اس بے چاری لڑکی کے اطراف جمع ہوجانا۔ وہاں موجود سارے کے سارے سیاح کا بھی اس جگہ اکٹھا ہوجانا۔ ان کے ہمدردی سے بھرے جملے، اس حادثے پر ان کے بجا اور بے جا تبصرے، بس ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ ہمارا گائیڈ بڑی پھرتی سے اس جم غفیر سے ہم سب کو بچاتا ہوا باہر کی گیٹ کی طرف لے چلا۔ جاتے

ہوئے جب میں نے بور بچے کی طرف نظریں دوڑائیں تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ بیگ کے ٹکڑے بنا چکا ہے اور اس کے منہ سے بے تحاشہ جھاگ اڑ رہی ہے۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد ہم سب شانت ہوگئے۔ سوائے اس لڑکی کے ! وہ اب تک برابر روئے جارہی تھی۔ غصے سے بے قابو ہو کر میں نے اسے ایک طمانچہ رسید کردیا۔ اس کے جادوئی اثر سے اس کے آنسو اور ہچکیاں بند ہوگئیں۔

اس ہی دن شام ہوٹل کے ورانڈے میں کرسی میں اپنی دوسری ٹرپ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ایک مردانہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "معاف کیجئے میڈم، میں چڑیا گھر کا ایک افسر ہوں۔ کیا آپ ان لڑکیوں کے گروپ کی انچارج ہیں۔"

ایک لمبے قد کا سیاہ فام شخص جس نے بہت عمدہ لباس پہن رکھا تھا مجھ سے مخاطب تھا۔

"میں اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں، جو آج صبح بور بچے کے حادثہ میں بال بال بچ گئی۔"

سری لنکا کے سرکاری عہدہ دار کے اس اخلاق نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس شخص میں ہمدردی کتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ وہ اس بے وقوف اور نافرمان لڑکی کی خیریت دریافت کرنے خود بہ نفس نفیس یہاں چل کر آیا ہے، جس نے میری ہدایت کو بالائے طاق رکھ کر ہم سب کے ہوش اڑا دیئے تھے۔

میں نے لڑکی کو آواز دی: "شاہین! دیکھو تو چڑیا گھر سے تمہاری خیریت پوچھنے کون آیا ہے؟"

"خیریت! کس کی خیریت؟" وہ شخص تقریباً چیخ پڑا اور آناً فاناً خود اس کی آنکھیں بھی اس بور بچے جیسی لال پیلی ہوگئیں۔ وہ کڑک دار آواز میں بولا۔ "میڈم۔ مجھے صرف اپنے سیاہ بور بچے کی فکر ہے۔ اگر اس ہینڈ بیگ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی اس بور بچے نے نگل گیا ہے تو اس کی موت یقینی ہے۔ اگر ایسا ہو تو چڑیا گھر آپ پر ہرجہ و خرچہ کا دعویٰ کردیگا اور آپ کے اسکول اور اس تفریحی ٹولی کے انچارج کو اس بور بچے کے پورے کے پورے دام چکانے پڑیں گے۔"

The panther in the bag
by: T.A.Rana.

جعفر رضوی
Po.Box: 3354, Riyadh 411211.

"ایک شاعر کا انٹرویو"

س: آپ کی جائے پیدائش؟

ج: آج کے اس پر آشوب دور میں جہاں ہر طرف صوبائیت اور لسانی چپقلشوں کا دور دورہ ہے اپنے آپ کو کسی صوبے یا علاقے سے منسوب کرنا ادبی خود کشی کرنے کے برابر ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ:

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

ویسے پیدائش تو حیدرآباد دکن کی ہے۔ لڑکپن کراچی میں گزرا، جوانی واشنگٹن میں بسر ہوئی اور اب ادھیڑ عمر میں خدا یاد آیا اور ریال کی ضرورت پڑی تو شہر ریاض میں آبسا۔ موروثی قبرستان دار الشفاء، جام باغ میں واقع ہے۔ وہیں دفن ہونے کا ارادہ ہے گویا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

س: شاعری کا شوق کب اور کیسے پیدا ہوا؟

ج: جس طرح ہر شاعر یا شاعرہ کی ادبی نشو نما میں کسی نہ کسی خاندانی بزرگ کا ہاتھ ہوتا ہے بالکل اسی طرح جب میں نے ہوش سنبھالا تو اردگرد والد، چچا، ماموں، دوست احباب کو شاعری کی لت میں گرفتار پایا۔ جب اوائل عمری میں ایسا ماحول ملے تو انسان کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ سب کی دیکھا دیکھی میں نے بھی تک بندی شروع کردی جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

س: ادبی سفر میں کسی سے اصلاح لی؟

ج: اخلاقاً شوہر سے تنخواہ، عورت سے عمر اور شاعر سے اصلاح کے بارے میں پوچھنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر میں بتانے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتا۔ ویسے بھی چند بزرگ شعراء نے میرے استاد ہونے کا دعویٰ کردیا ہے۔ مجھے اپنا شاگرد سمجھ کر فخر کرتے ہیں۔ سلسلہ یوں ہے چونکہ مشاعرے وغیرہ کے انعقاد کی وجہ سے تمام بڑے چھوٹے شعراء سے رابطہ رہتا ہے اور اگر آپ منتظم مشاعرہ ہیں تو پھر سونے پر سہاگہ۔ جو کچھ بھی تک بندی کرلیتا ہوں ان حضرات کی خدمت میں پیش کردیتا ہوں۔ وہ نہ صرف نوک پلک درست کردیتے بلکہ دوچار اشعار بھی عطا فرمادیتے ہیں۔ اس لئے میرے کلام میں ہر دفعہ مختلف شعراء کا مختلف رنگ جھلکتا ہے۔ بعض دفعہ غزلیں اتنی باوزن ہوجاتی ہیں کہ [illegible] کے اشعار لگنے لگتی ہیں۔

س: آپ نے مزاح نگاری کو کیوں کر اپنایا؟

ج: دراصل پرانے طرز کی یا جدت پسندیدہ غزلیں لکھنے والے تو ان گنت ہیں مگر مزاح نگار کئی شاعروں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مزاح نگار عموماً کوتاہ عمر ہوتے ہیں اور جلد ہی اس جہاں فانی سے کوچ کرجاتے ہیں۔ مثلاً ضیاء الحق قاسمی نے پچھلے سال بارہ مزاح نگاروں کی نشاندہی کی ہے جو ایک سال میں فوت ہوچکے ہیں۔ تو یہ Demand & Supply کا مسئلہ ہے۔ ویسے بھی شاعری کی تحریک اس وقت ہوئی جب میں ٹریفک میں گھنٹوں پھنس جاتا تھا۔ بوریت دور کرنے کے عام طریقے تو یہی تھے کہ ریڈیو با آواز سنا جائے۔ ایک دوسرے پہ گالیاں جھاڑی جائیں یا پھر ذہن کو مصروف رکھنے کیلئے شاعری کی جائے۔ رومانیت کی طرف طبیعت اس لئے مائل نہیں

ہوئی کہ عموماً ایسے وقت بیگم بھی ہم سفر ہوا کرتی تھیں۔ تو ذہنی آسودگی کیلئے شاعری اور مزاح نگاری کو ترجیح دی۔

س: آپ کا کلام دنیا بھر کے ادبی رسالوں، جرائد اور اخبارات میں چھپتا ہے، کوئی خاص وجہ؟

ج: پہلی وجہ تو تعلقات عامہ، دوسری میں خود ادبی رسالے کا مدیر ہوں اور پھر مشاعروں کا منتظم اعلیٰ۔ ویسے احتیاطاً چھوٹی بحر کی غزلوں پر اکتفا کرتا ہوں، وہی غزلیں، قطعات وغیرہ جو چیک کے پیچھے آجائیں۔ عموماً طویل نظموں یا غزلوں سے گریز کرتا ہوں۔ وہ سودا مہنگا پڑتا ہے۔

س: آپ کے پسندیدہ شاعر؟

ج: مجھے ہر وہ شخص جو کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے یا کسی رسالے یا اخبار کا مدیر ہو اس کا کلام پسند آتا ہے۔

س: نئی نسل کے مزاح نگاروں کیلئے کوئی مشورہ؟

ج: پہلے روٹی کپڑے مکان کا بندوبست کریں۔ Public Relation کے کورسیز لیں۔ صاحب استطاعت ہوں تو کوئی اخبار یا رسالہ نکالیں، مشاعرے کروائیں، کسی بھی اخبار یا رسالے کی مجلس ادارت یا مجلس مشاورت میں اپنا نام درج کروائیں۔ صحت کا خیال رکھیں۔ اپنے والدین اور زوجہ کی دعاؤں میں شامل رہیں۔

س: بزرگ شعراء کے لئے کوئی پیغام؟

ج: مشاعرے میں وقت پر پہنچ کر نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کریں۔ صدارت کیلئے سفارش، دھمکی سے گریز کریں اور ہٹ دھرمی سے باز رہیں۔ اگر کوئی غزل یا شعر شاگرد کو عطا کر چکے ہوں تو اس کی مقبولیت کے بعد اس پر اپنا حق نہ جتائیں۔

R.N NO. 15822/68
SHUGOOFA
HYDERABAD
Postal Regd. No. H/HD-
Vol. 32 Copy : 12
Ph : 4745716
Dec 199